اِسلامی معاشیات

اسلامی علوم کی فہرست میں ایک جدید فن کا اضافہ،
... نظام کا ایک تحقیقی مرقع، روئے زمین کے
... کا بروقت جواب۔ مولٰنا
گیلانی ... قرآنی آیتوں اور نبوی حدیثوں
کے ایسے نئے تشریحی پہلو جو اِس کتاب میں پہلی دفعہ
پیش کیے گئے ہیں

سَیّد مناظر احسن الگیلانی
صدر الشعبۃ الدینیۃ فی الجامعۃ العثمانیۃ

الرزاق
مالک ادارہ اشاعت اُردو
عابد روڈ۔ حیدرآباد دکن

Rs 15.00

طبع اوّل ــــــــــــــــ ایک ہزا

۵ مئی ۱۹۴۷ء
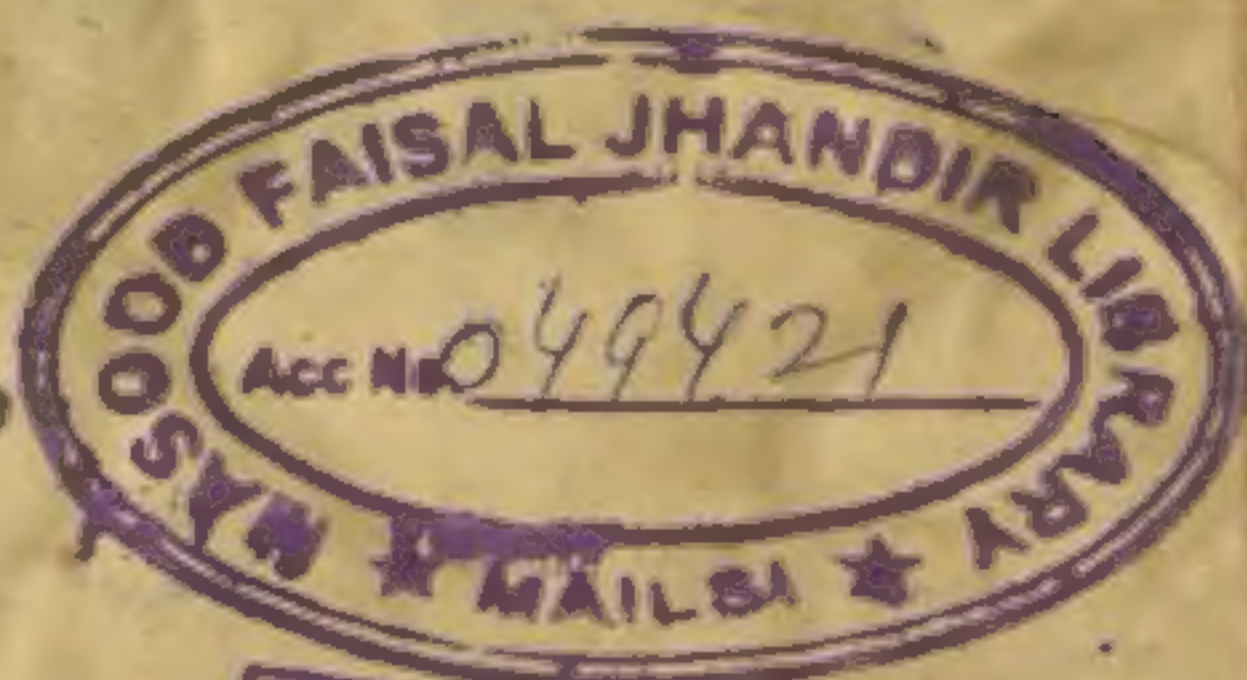
پروپرائٹر

سیّد عبدالرزاق تاجر کتب
مالک ادارۂ اشاعت اردو

عابد روڈ حیدرآباد دکن

مطبوعہ رزاقی مشین پریس حیدرآباد دکن

فہرس

باب اول

اسلامی معاشیات

باب دوم

حکومت کی آمدنی اور اس کے مصارف و اغراض

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فاتحۃ الکتاب

الحمد للہ وکفیٰ والصلوٰۃ والسلام علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ۔

"اسلامی معاشیات" کے نام سے وہی کتاب آپ کے سامنے پیش ہو رہی ہے، جس کے متفرق [illegible]ب مختلف مقالوں کی شکل میں ہندوستان کے بعض علمی مجلات (معارف اعظم گڈھ، سیاست [illegible]اد دکن وغیرہ) میں بھی شائع ہو چکے ہیں۔

بجز چند مختصر مقالوں یا کسی مختصر رسالے کے سوا جہاں تک میں جانتا ہوں اس موضوع پر اردو [illegible]عربی یا اسی قسم کی دوسری زبانوں میں بھی غالباً اب تک کوئی مستقل کتاب اس موضوع پر نہیں لکھی [illegible]گئی ہے، گویا ایک بالکل نئی راہ تھی جس پر چلنے کا ارادہ کیا گیا تھا۔ بہ ظاہر مضمون کی ندرت ہی کا یہ نتیجہ ہے کہ عموماً اہلِ علم و نظر کی طرف [illegible] مقالات کے اس سلسلہ کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھا گیا۔ قدیم و جدید [illegible]ں حلقوں سے [illegible]یاں ہوئیں۔ بلکہ ان مقالات کو کتابی شکل میں شائع [illegible]کرنے کی ہمت ان ہی حیر[illegible] سے پیدا کی۔

[illegible]ن مسائل و مباحث کو اس کتاب میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ہیں تو یہ ساری [illegible] کتابوں ہی میں۔ لیکن اسلام اور اسلامیات کے بحرِ محیط سے ان ہی موتیوں کا چننا اور چن کر [illegible]س طریقہ سے ان کو مرتب کرنا کہ انسانی معاشیات کے دوسرے نظاموں کے مقابلہ میں اسلام کا بھی ایک مستقل معاشی نظام لوگوں کے سامنے آجائے، یہ ظاہر آسان نہ تھا اور سچ تو یہ ہے کہ [illegible]باوجود اس کوشش کے جو اس راہ کی پہلی اور ابتدائی کوشش ہے۔ مجھے اعتراف کرنا چاہیئے کہ [illegible]س کی دشواریاں باقی ہیں اور بہت زیادہ باقی ہیں۔ صحیح معنوں میں وہی آدمی اس راہ [illegible] کامیاب ہو سکتا ہے جو ایک طرف فنی طور پر عصرِ حاضر کے جدید علم (معاشیات) کا ماہر حکیم ہو [illegible]دوسری طرف اسلامی حقائق و مسائل کے حقیقی سرچشموں تک اس کی رسائی ہو۔ قرآن و سنت [illegible]شتہ رہے، ائمۂ اسلام نے "اسلامی آئین" کو جس شکل میں مرتب کیا ہے، براہِ راست ان کے [illegible] افسوس ہے کہ تعلیمی نظام کی خرابی اب تک اس قسم کی جامع قابلیت [illegible] کی پیدائش میں شدید رکاوٹ کی شکل اختیار کئے ہوئے ہے۔

جامعہ عثمانیہ کا شعبۂ دینیات پہلا تعلیمی ادارہ ہے۔ جس میں اس تعلیمی مافات کی تلافی [illegible]کوشش ایک حد تک کی گئی ہے ا[illegible] چیزوں کی ضرورت ہے ان کی طرف قدم اٹھایا جا رہا ہے

اگرچہ رفتار جیسی کہ چاہیے بوجوہ مختلف نہیں ہے۔
تاہم مستقبل میں اگر کچھ توقع کی جاسکتی ہے تو اسی ادارہ کے تعلیم یافتہ افراد
کی جاسکتی ہے۔
سچ پوچھیے تو جس بُری بھلی ناقص اور ادھوری شکل میں
وہ جامعہ عثمانیہ اور اس کے شعبۂ دینیات کے تعلیمی ماحول ہی کا یہ نتیجہ ہے۔
اس کتاب کے متفرق ابواب جس وقت شائع ہونے کے لئے پریس میں دیئے گئے
اُس وقت بھی میں نے اس کا اظہار کیا تھا کہ شعبۂ دینیات کے ایم۔اے میں ایک امیدوار
عزیز مولوی محمد یوسف الدین ایم۔اے سلمہٗ نے اپنے امتحانی مقالہ کا عنوان اسی مضمون کو قرار
دیا تھا۔ اور ان کے اصرار سے خاکسار نے ان کی اس مہم کی نگرانی کی ذمہ داری
سرلی تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ اس مضمون کی طرف متوجہ ہونے کا ذریعہ میری یہی نگرانی
خدا کا شکر ہے کہ برادر موصوف نے نہ صرف ایم۔اے کے امتحانی مقالہ کے تیار کر
کامیابی حاصل کی، بلکہ ایم۔اے پاس ہو جانے کے بعد لگے ہاتھ مجلس تحقیق
علمیہ (ریسرچ بورڈ) کی زیر نگرانی اسی موضوع پر ڈاکٹریت کے لئے بھی مقالہ تیار کرنے
کی اجازت حاصل کرنے میں وہ کامیاب ہوگئے۔ شعبۂ معاشیات صدر استاد جلیل
انور اقبال قریشی صاحب پی۔ایچ۔ڈی کی خصوصی خاکسار کی
میں انھوں نے "اسلام کے معاشی نظریئے" کے عنوان دنوں میں ڈاکٹریت کے
اس مقالے کو مرتب کر کے مجلس کے سامنے پیش بھی کر دیا ہے۔ عنقریب اس کا
ہو جائے گا۔ ایک طرف تو اس سلسلہ میں ان کا یہ کام مکمل ہوگیا اور دوسری طرف خاکسار کو بھی
راہ میں جو چیزیں ملیں وہ اس کتاب کی شکل میں پیش ہو رہی ہیں۔ پس ڈاکٹریت کا وہ مقالہ جو برادر موصوف
نے مرتب کیا ہے اور خاکسار کی یہ کتاب، دونوں کے دونوں کام شعبۂ دینیات ہی کے خصوصی نظام تعلیم
ہی کے ثمرات قرار پا سکتے ہیں گویا ان دونوں کاموں کی راہ سے اردو زبان میں ایک قطعی جدید
جدید سرمایہ اور اس سرمایہ کا کافی ذخیرہ انشاء اللہ مہیا ہو جائے گا۔ اور یہ توقع
نہیں ہے کہ آئندہ اس راہ پر کام کرنے والوں کے لئے شعبۂ دینیات اور اس کے
کی یہ خدمت ایک اچھے مقدمہ کا کام دے گی۔
اس موقعہ پر اس کا اظہار بھی غالباً نامناسب نہ ہوگا کہ گو
یہ دونوں کتابیں ایک ہی موضوع پر ہیں۔ لیکن واقعہ یہ ہے
سے ہر ایک کام بجائے خود اپنی ایک مستقل حیثیت رکھتا ہے۔
ہم کہہ سکتے ہیں کہ "اسلامی معاشیات" کے مطالعہ کرنے والے ان میں سے کسی ایک
کتاب کو دیکھ کر دوسرے کے مطالعہ سے بے نیاز غنی نہیں ہو سکتے۔ برادر موصوف

صحیح مقام حاصل کرلے وان ارید الا الاصلاح ما استطعت وما توفیقی الا باللہ توکلت والیہ انیب۔

حق تعالیٰ سے دعاء ہے کہ جس مقصد کو پیش نظر رکھ کر یہ اس حقیر کام سے درست فرمائے، آرزو اس کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے ؎

دل آزردۂ مارا بہ نسیمے بنواز ‎ ‎ یعنی آں جاں زتن رفتہ بتن باز رساں

کاش! زندہ اسلام، مردہ مسلمانوں کی زندگی کا پھر اسی طرح سبب بن جائے جیسے زمانے میں بنا ہوا تھا۔ ہذا والسلام۔

خاکسار

مناظر احسن گیلانی

۲۲۔ رمضان المبارک ایک بجے شب
یکم ستمبر ۱۹۴۵ء جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن

—+——

ھدایت:۔ غیر مطبوعہ حصہ ص ۷۰ سے ۲۸۴ تک ہے ... اس کتاب کے جن اجزا کو لوگ پڑھ چکے ہیں ان کو یہ چاہئے ... حصہ کا مطالعہ ...

للرجال نصیب مما اکتسبوا و — مردوں کے لئے حصہ ہے اس میں سے جو وہ کمائیں۔
للنساء نصیب مما اکتسبن (النساء) — اور عورتوں کیلئے حصہ ہے اس میں سے جو وہ کمائیں۔

تاکہ ایک طرف تو یہ معلوم ہو کہ ان معاشی ذرائع سے استفادہ کا حق نسلِ انسانی کی کسی خاص صنف کے مخصوص نہیں ہے۔ بلکہ مردوں اور عورتوں دونوں کیلئے یہ میدان کھلا ہوا ہے۔ اور ... کر دیا گیا کہ قرآن کا مشہور قدرتی قانون

اجرت بمقدار محنت

لیس للانسان الا ما سعی — نہیں ہے آدمی کے لئے مگر وہی جو اس نے کمایا، اور
وان سعیہ سوف یری (النجم) — قریب ہے کہ دکھلائی دے اسے اپنی کمائی۔

کا تعلق جس طرح اخروی معاملات اور نتائج سے ہے، اسی طرح یہ قانون دنیاوی کاروبار پر بھی چسپاں ہے جیسے معادی زندگی میں ہر شخص اسی کے پانے کا حقدار ہوگا جو اس نے کمایا ہے اور اس کے سامنے اس کی کمائی ہی نتیجے کی شکل میں پیش ہوگی۔ یوں ہی معاشی زندگی میں ہر ایک کا نصیب اور حصہ اس کی محنت ... کاوش کی مناسبت ہی پر مبنی ہے۔ وہ جتنی محنت و جاں فشانی کرتا ہے، اسی حساب سے وہ ...

سرمایہ اور قرآن سورۃ النساء کی آیت۔

ولا تؤتوا السفھاء اموالکم التی — اور نہ دیا کرو کم عقلوں کو اپنے مال جسے
جعل اللہ لکم قیاما۔ — بنایا ... لئے سہارا۔

"اموال" یا "سرمایہ" اور "اصل" کو انسان کے ... ٹھہرا کر اور اس ... محتاط رہنے کی تاکید فرمائی، اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سلسلے میں

محنت اور قرآن

ان خیر من استاجرت القوی — یقیناً جسے تو نوکر رکھے اس میں اچھا وہ ہے جو
الامین (القصص) — قوت والا ہو، اور امانت والا۔

محنت کی اساسی شرط

کے الفاظ سے جسمانی محنت و مزدوری کی بنیاد کو دو لفظوں "القوی" اور "الامین" کے ذریعے ظاہر کرنا۔ یعنی اس قسم کے کاروبار کے لئے جس کی سرانجامی میں دماغ سے زیادہ ہاتھ پاؤں کی حرکت کی ضرورت ہوتی ہے توجہ دلائی جاتی ہے کہ صحیح نتائج کی امید اسی وقت لگائی جا سکتی ہے۔ جب ... کرنے والے جسمانی قوت کے ساتھ ساتھ اپنے فرض اور خدمت کی بجا آوری میں خیانت و بددیانتی سے کام نہ لیں۔ بلکہ "الامین" ہوں۔

تنظیم اور قرآن پھر حضرت یوسف علیہ السلام کے قصے میں بادشاہِ مصر سے ان کی گفتگو، اس گفتگو میں حضرت ... علیہ السلام کا تنظیمی کاروبار کے سلسلے میں یہ فرمان کہ

اجعلنی علی خزائن الارض انی — مقرر کر مجھے زمین کی پیداوار کے خزانوں پر میں نگہداشت
حفیظ علیم (سورۂ یوسف ع ۶) — کرنے والا اور علم والا ہوں۔

تنظیمی کاروبار کے ضروری شرائط

یعنی زمین کی پیداوار (خزائن الارض) کے نظم و ترتیب اور بندوبست کے لئے جب حضرت نے اپنے آپ کو پیش کیا، تو اس ... کاروبار کے لئے جن صفات کی ضرورت ...

سادی معیشت
بھی قرآن انسانیت کے ارتقار کی آخری منزل یعنی "نبوت" کے منافی نہیں خیال کرتا، باوجود پیغمبر اور خدا کے رسول
ہونے کے حضرت سلیمان علیہ السلام کے متعلق مختلف مقامات میں شیش محل، عرش و تخت و کرسی، محاریب
... بڑی دیگیں، صافنات الجیاد (قیمتی گھوڑے) ہر قسم کے بنّاء (معمار) غوّاص (غوطہ
زن) جنود (افواج) سب ہی چیزوں کا ذکر کرتا ہے اور ان تمام امور کو قرب الٰہی کے مقامات عالیہ کے منافی
نہیں قرار دیتا۔ تو مجھے ان پر تعجب نہیں ہے جو اپنے جہل کی وجہ سے بعض مسلمانوں کے طرز عمل کو دیکھ کر
اسلام کو بھی ایک قسم کا راہبانہ مذہب قرار دینا چاہتے ہیں۔ بلکہ حیرت ان پر ہے جو یہ جاننے کے باوجود کہ
اسلام میں رہبانیت نہیں ہے اس بدیہی دعوی کو نظری قرار دے کر اس کے ثبوت میں بلاوجہ اپنا وقت ضائع
کرتے ہیں، اور بعض کمزور یا ضعیف روایتوں سے استدلال کر کے گویا باور کراتے ہیں کہ خدانخواستہ اگر یہ چند روایتیں
نہ ہوتیں تو اعتراض کرنے والوں کا گویا اعتراض باقی رہجاتا۔ میرے خیال میں تو اسلام رہبانیت نہیں ہے۔
اس کو دعوی قرار دیکر دلیل پیش کرنے کی زحمت اٹھانی ایسی بات ہے۔ جیسے کوئی دعوی کرے کہ روشنی
تاریکی نہیں ہے۔ اور اس پر استدلال کے لئے بھی تیار ہوجائیے۔ ایسوں کے لئے جو اسلام کی طرف رہبانیت کو
کسی نہ کسی حیثیت سے منسوب کرنا چاہتے ہیں۔ ان کے خیال کی تردید کے لئے قرآن کو جہاں سے بھی کھول کر
دکھلا جائے گا۔ غالباً یہ کافی ہو سکتا ہے۔ جس کتاب کی جوہری تعلیم ہی اس پر مبنی ہو کہ قدرت نے جو کچھ بھی
پیدا کیا ہے۔ ... اس نظریہ کو مختلف پیرایہ میں بار بار ہر تھوڑی دیر کے بعد
دہرایا گیا ہو۔ اس کے متعلق یک لمحہ کے لئے بھی معاش گریز خیال کا اندیشہ کیا جائز ہو سکتا ہے؟ اگر اس کا ارادہ
کیا جائے کہ قرآن نے تفصیلاً کن کن چیزوں کے افادی پہلوؤں سے استفادہ کی طرف انسانی فطرت کو ابھارا
ہے تو شاید یہ مبالغہ نہ ہو گا کہ قرآن کے ایک تہائی حصہ کو نقل کرنا پڑے گا۔ بر و بحر و شجر و حجر، سفلیات و علویات
میں آخر ایسی کونسی اہم چیز ہے جس کے افادی پہلوؤں کی طرف قرآن نے صراحتاً یا کنایتاً اشارہ نہیں کیا ہے۔
انسان ان چیزوں سے اپنی معاشی سہولتوں کے حصول میں جن جن طریقوں سے کام لیتا رہا ہے اور لے رہا ہے
غور کیا جائے تو قرآن باوجودیکہ کوئی خاص معاشی کتاب نہیں ہے لیکن پھر بھی ان طریقوں کی طویل فہرست
قرآنی آیات کی روشنی میں بآسانی مرتب ہو سکتی ہے۔ مثلاً زراعت، باغبانی، شکار، شکار کے مختلف طریقے
یعنی آلات حیلی سے شکار، شکاری کتوں، شکاری پرندوں (باز بحری وغیرہ) سے شکار، خشکی کے شکار،
دریائی جانوروں کا شکار، مویشیوں کی پرورش، بری و بحری جانوروں، پرندوں کے مختلف اجزاء، گوشت
شہد وغیرہ سے استفادہ کی مختلف نوعیتیں، تجارت، تجارت کے سلسلے میں حیوانی

... باب دیتے ہیں ... رعیتوں پر احسان جتلاتے ہوئے جعلکم ملوکاً کو بھی خدا کا احسان ٹھیرایا گیا ہے۔ نظریۂ ملوکیت اگر غلط ہے۔ تو ان آیتوں
کی کوئی تفسیر کرنی چاہئے ... کہ جمہوریت ہو یا ملوکیت۔ اس کا حال وہی شاعری کا ہے۔ یعنی حسنہ حسن
و قبیحہ قبیح (اچھی شاعری ... چیز ہے ... شاعری بری چیز ہے، اور بھلائی و برائی کا معیار یورپ نہیں، قرآن ہے انشاء اللہ
... کتاب میں

جیسی معاش گریز زندگی والے میں نہیں سمجھتا کہ اپنے نے اس دائرے میں وہ کہاں گنجائش نکال سکتے ہیں۔ صرف یہی نہیں کہ معاشی زندگی کا جو نقشہ قرآن نے پیش کیا ہے۔ اس میں ان کے لئے گنجائش نہیں ہے، بلکہ خود قرآن نے اس فنائی مسلک کے متعلق [illegible] تاریخی حقیقت کا انکشاف کیا ہے۔ اس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کی جس قوم کو جس زمانہ [illegible] دین میں رہبانیت کے معاش گریز مسلک کا مطالبہ خُدا کی طرف سے کبھی نہیں کیا گیا۔ گویا لا رہبانیت کی صفت صرف اسلام کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔ بلکہ بنی آدم کو خدا کی طرف سے جو دین بھی ملا ہے کسی میں اس کی گنجائش نہیں رکھی گئی ہے۔ قرآن میں اس مسلک کے متعلق جو یہ مشہور الفاظ پائے جاتے ہیں

رہبانیۃ ابتدعوھا ماکتبنٰھا	رہبانیت جسے انھوں نے خود تراش لیا ہے
علیھم فما رعوھا حق رعایتھا	نہیں فرض کیا ہے ہم نے اس کو ان پر، پھر
فاٰتینا الذین اٰمنوا منھم اجرھم	نگرانی نہ کی انھوں نے رہبانیت کے (اصولوں
وکثیر منھم فاسقون (الحدید، ۲/۲)	کی) جیسی نگرانی انھیں کرنی چاہیے تھی۔ پھر

دیدی ہم نے ان کے ایمان والوں کو ان کی مزدوری۔ اور بہتیرے ان کے فساق ہیں۔

قرآن کے تاریخی بیان کا تجزیہ دیکھنے میں تو بظاہر یہ گنے چنے چند الفاظ ہیں۔ مگر میرے خیال میں اس آیت کا ایک ایک ٹکڑا "رہبانیت" کی پوری تاریخ کا حامل ہے۔ مثلاً پہلا جز "ابتدعوھا" (ان لوگوں نے خود تراش لیا ہے) ظاہر ہے کہ رہبانیت کو بجائے کسی [illegible] اور مذہب کے ان نظریات میں شامل کر دیتا ہے جو براہِ راست انسانی نظر و فکر کے مرہونِ منت ہیں [illegible] کا فلسفہ ہے، مختلف اقوام کے مختلف افراد نے مختلف زمانوں میں مختلف عوامل و مؤثرات سے متاثر ہو کر کبھی کبھی اپنی زندگی اس تخیل کے تحت گذارنی چاہی ہے۔ تاریخ اس کی شہادت ادا کرتی ہے کہ یونانیوں اور رومانیوں کے رواقیئن و اشراقیئن اسکندریہ کے فلاطونین، ہندوستان کے جوگیہ وغیرہ نے فلسفہ کے ایک مکتب خیال کی شکل میں اسے پیش کیا تھا۔

دوسرا جز "ماکتبنٰھا علیھم" (یعنی ہم نے اس نظریہ حیات کا مطالبہ ان سے کبھی نہیں کیا) جس کا یہی مطلب ہے کہ حق تعالیٰ کی طرف سے علم و عمل کا جو نظام بنی آدم کو مذہب اور دین، دھرم وغیرہ کے ناموں سے ملتا رہا ہے اس میں اس غیر فطری نظریۂ حیات کا کبھی مطالبہ نہیں کیا گیا، اس جز سے صرف اسلام ہی کی برأت رہبانیت سے ثابت نہیں ہوتی۔ بلکہ مذہب کی پوری تاریخ سے اس کی بے تعلقی کا اظہار کیا گیا ہے۔ قرآن کی اس آیت کی بنیاد پر ہر مسلمان اس کے ماننے اور یقین کرنے پر مجبور ہے کہ عیسائی مذہب ہو یا یہودی دین، ابراہیمی ملت ہو یا نوحی دعوت کسی کا رہبانیت سے کچھ تعلق نہیں ہے۔ قرآن کے اس تاریخی بیان کو پڑھنے اور ماننے کے بعد [illegible] ہوتا ہے جو کبھی عیسائی، کبھی کسی اور دین کے ساتھ اسلام کا مقابلہ کر کے دعویٰ [illegible] رہبانیت سے بے تعلقی یہ صرف اسلام کی خصوصیت ہے۔ شاید ان کا یہی مطلب ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ کی طرف سے گویا کسی دین میں کبھی کسی قسم کی راہبانہ زندگی کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ کیا قرآن کے نص صریح کی یہ خلاف ورزی نہیں ہے؟

[illegible] حق رعا[illegible]" یعنی جن لوگوں نے اس خود تراشیدہ فلسفہ کو اصولِ حیات تسلیم کر کے

زمانہ تھا، خصوصاً یورپ اور ہندوستان کا یہ وہ عہد تھا جس میں نام نہاد مذہبی پیشواؤں نے مختلف ترکیبوں سے عوام کو اپنے قبضہ میں اس طرح دبوچ لیا تھا کہ ان کی گرفت سے وہ کسی طرح باہر نہیں نکل سکتے تھے۔ یورپ میں تو "اعترافِ جرم" کا ایسا ہتھکنڈہ مذہبی پیشہ وروں کو مل گیا تھا۔ کہ ہر عامی اپنے جرائم کا پادری کے سامنے اقرار کر کے بظاہر خدا کی گرفت سے تو سمجھتا تھا کہ اسے نجات مل گئی۔ لیکن درحقیقت وہ پادریوں کی گرفت میں آجاتا تھا۔

پھر سلاطین کا کلیسا کے نیچے اس طرح دب جانا کہ گویا پوپ کے فرمان کی خلاف ورزی قریب قریب حکومت سے دست برداری کے مترادف بن چکی تھی۔ نیز خدا کی رحمت کا عام بیوپار کلیسائی نظام میں عام طور سے جو جاری تھا۔ آٹھ آٹھ آنے اور دس دس آنے سیر خدا کی رحمت کو پادری عام طور سے بیچ رہے تھے، آسمان پر وہی کھولا جاتا تھا، جسے زمین پر پادری کھولتے تھے۔ اور وہی آسمان پر باندھا جاتا تھا، جسے پادری زمین پر باندھتے تھے یہ اور اسی قسم کی بیسیوں ترکیبیں تھیں۔ جن کے ذریعہ سے عوام کی کمائی پر کلیسا اور کلیسا کے نمائندوں کا پورا قبضہ قائم تھا من مانے طور پر جس کسی سے جس قدر جس وقت چاہتے تھے، عیسائی مذہب کے یہ احبار (علماء) اور رہبان (مشائخ) وصول کر لیتے تھے۔ نتیجہ یہ تھا کہ گرجوں اور چرچوں کے خزانے شاہی خزانوں سے کہیں زیادہ وسیع ہو چکے تھے۔ معمولی معمولی گرجے میں لاکھوں کی دولت بصورت "کنز" جمع رہتی تھی، مشہور واقعہ ہے کہ ہرقل کو ایرانیوں کے مقابلے میں فوجی مصارف کی جب ضرورت ہوئی۔ اور شاہی خزانہ ان مصارف کی پابجائی میں ناکافی ثابت ہوا تو روم کے اس قیصر کو قرض کی صورت میں سب سے بڑی مالی امداد چرچوں اور گرجوں ہی سے ملی۔ تقریباً یہی حال ہندوستان میں برہمنوں، سادھوؤں، یوگیوں اور جوگیوں نے پیدا کر رکھا تھا۔ خود محمود غزنوی کو سومنات میں جو غیر معمولی سرمایہ ہاتھ آیا تھا۔ وہ ہندو مذہب کے احبار و رہبان کی کنز کی ہوئی دولت ہی تھی۔ اس زمانے میں بھی زار کی حکومت پر انقلاب برپا کر کے جب اشتراکیوں نے اقتدار حاصل کیا تو کون نہیں جانتا کہ شاہی خزانوں اور امراء کے اندوختہ دولت کے ساتھ بولشویک حکومت کو سرمایہ کی غیر معمولی مقدار روسی گرجوں ہی سے ملی۔ والقصہ بطولہا۔

بہرحال تاریخ کے ان واقعات کو پیش نظر رکھنے کے بعد دونوں آیتوں کی باہمی مناسبت کا کچھ سراغ ضرور مل سکتا ہے۔

"ترکِ دنیا" کو "حصولِ دنیا" کا آلہ بنا کر زندگی گذارنے والوں کا زور اگرچہ اب بہت کچھ ٹوٹ چکا ہے۔ لیکن پھر بھی ہر ملت و مذہب میں ایک طبقہ بے کاری سے روزگار حاصل کرنے والوں کا تقریباً دنیا کے ہر خطوں اور ملکوں میں موجود ہے اور گو "ب الذہب والفضہ" کی ریل پیل کا حال ان کے یہاں اس پیمانہ پر تو نہیں ہے۔ جو کبھی تھا۔ تاہم ان کے بعض سربرآوردوں میں عہد ماضی کے کچھ نمونے اب بھی نظر آتے ہیں۔ سب کمائیں خون کا پسینہ بنا کر کمائیں۔ اور ان کی کمائی سے محض قدیم روایات کی بنیاد پر کچھ لئے دئے کرے دھرے بغیر یہ وصول کرتے رہتے ہیں۔ اس سے صرف یہی نہیں کہ ان کی کتنا ہی قوتیں اپنے فطری اور معاشی نتائج کو ظاہر کئے بغیر مسلسل نسلاً بعد نسلٍ قبروں میں دفن ہوتی چلی جا رہی ہیں۔ بلکہ بے کاری کے اس عجیب

غریب سستے اور آسان روزگار کو دیکھ کر کتنے دنوں میں ان کی ریس کی ہوک اٹھتی ہے۔ خدا ہی جانتا ہے کہ اس ریس کے سلسلے میں مکر و فریب خدع اور دجل کے جالوں میں کتنے غریب عوام کو آئے دن پھنس پھنس کر اپنی بیوی بچوں کے منہ سے نوالوں کو چھین چھین کر ان کے شکم کی دوزخ کو بھرنے پر مجبور ہونا پڑا ہے جو کچھ اس طبقہ کے ذریعہ سے ہو چکا اور ہو رہا ہے۔ چونکہ خدا اور اس کے دین کے نام سے ہو رہا ہے۔ ان کو دیکھتے ہوئے سچ تو یہ ہے کہ جن سزاؤں کا ذکر قرآن میں ان کے متعلق کیا گیا ہے۔ اگر آخرت میں ان کے یہ مستحق ہوں تو شاید ان کے حق میں یہ زیادتی نہ ہوگی۔ آخر کچھ تو مصلحت ہے کہ احبار و رہبان کی اکثریت جس "اکل بالباطل" کی مرتکب ہے۔ اس کے ذکر کے ساتھ ان سزاؤں کا حق تعالیٰ نے یہاں کیوں تذکرہ فرمایا۔

اسلام کے مذہبی خدام کی خصوصیت

شاید قرآن کے اسی طرز عمل کا اثر ہے کہ مسلمانوں میں مذہبی خدمات انجام دینے والے طبقوں کا ایک بڑا گروہ باوجودیکہ وہ مسلمانوں کی دینی خدمت میں اپنا زیادہ وقت اخلاص اور دیانت امانت سے صرف کرتا تھا، اور اس کے جواز کا اسلامی حکومت یا عام مسلمانوں سے ان کو حق بھی تھا، یہ "اکل بالباطل" یعنی کچھ دیئے بغیر دوسروں کا مال کھانا نہ تھا۔ لیکن قرآن کی انہی دھمکیوں سے غالباً وہ اتنے متاثر تھے کہ اس امداد کا لینا بھی انھوں نے پسند نہیں فرمایا۔ اور اپنی معاشی ضرورتوں کے لئے دوسرے دھندے انھوں نے اختیار کئے۔ اکبر کے دربار میں جب فقہائے اسلام پر تنقید شروع ہوئی۔ تو مفت خور برہمنوں اور سادھوؤں کو جس دربار میں ہر قسم کے انعام و اکرام کا مستحق سمجھا جاتا تھا، اسی دربار کا مشہور وزیر ابوالفضل اسلامی فقہاء کے متعلق کہا کرتا تھا کہ یہ جوتے گانٹھنے والے، سینے پرونے والے توہم پر حجت نہیں ہو سکتے۔ اشارہ اسلام کے ان علماء و فقہاء کی طرف تھا جو عوام اور حکومت سے کسی قسم کی معاشی امداد لینا پسند نہیں فرماتے تھے۔ بلکہ مختلف دستکاریوں اور عام ذرائع معاش سے روزی حاصل کرتے تھے۔ ابوالفضل کی نگاہ میں ان کا یہی ہنر عیب **بن کر چبھ رہا تھا، فیا للعجب!!**

بہر حال احبار و رہبان کی اکثریت حالانکہ فسق کے مختلف گفتہ و ناگفتہ بہ حالات اور حوادث میں مبتلا تھی لیکن سب کی طرف (وکثیر منہم فاسقون) کے اجمالی اشارے پر کفایت کرتے ہوئے صرف ان کے اسی معاشی جرم یعنی "اکل اموال الناس بالباطل" کا کھلے کھلے صاف لفظوں میں قرآن نے جو اعلان کیا ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسلام کی نگاہ میں معاشی مہمات اور معاشی مسائل کی کتنی اہمیت ہے۔ حالانکہ جہاں تک تاریخ کی شہادتیں ہیں۔ اس طبقہ کے دوسرے جرائم کچھ کم ہولناک اور شرمناک نہ تھے۔

معاشی مسائل کی اہمیت حدیثوں میں

یہ تو معاشی مسائل کے ساتھ قرآن کے تعلق کا حال ہے۔ داعی قرآن صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات اور اس باب میں آپ کے جس طرز عمل کی تفصیل حدیث کی کتابوں میں ملتی ہے اس کا ذخیرہ تو اتنا زیادہ ہے کہ سب کا ذکر اگر کیا جائے تو ایک مستقل کتاب بن جائے گی۔

اسباب خواہ کچھ ہی ہوں، لیکن یہ واقعہ ہے کہ مذہب کے غلط نمائندوں نے مذہب کے متعلق یہ عام کیفیت جو پیدا کر دی ہے کہ ادھر مذہب کا نام آیا اور دنیا کی نفرت اور دنیاوی چیزوں کی عداوت میں ہیجان پیدا ہونا شروع ہوا۔ خیال یہی پھیلایا گیا ہے کہ دنیا اور دنیاوی امور سے اپنے

ماننے والوں کو جو مذہب جس حد تک علیحدہ رکھنے میں کامیاب ہو یہی مذہب کا کمال ہے۔ لیکن آج یہ کون باور کرنے کے لئے تیار ہوگا کہ کوئی سیاسی لیڈر یا معاشی ریفارمر نہیں، بلکہ جو اپنے آپ کو انسانی تاریخ کے تمام مذہبی داعیوں اور رسولوں کا خاتم اور اپنی تعلیم کو سارے جہان کے مذہبی ذخیروں کے صحیح عناصر کا خلاصہ اور سب کی تکمیل کرنے والا قرار دیتا تھا، دنیا کی وہی سب سے بڑی اور دینی ہستی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے ہاتھ اٹھائے ہے اور پُرنم آنکھوں کے ساتھ اپنے خدا کے سامنے اپنی امت کو پیش کرتے ہوئے التجا کرتا ہے۔

امت کی معاشی خوشحالی کے لئے پیغمبر کی دعا

اللھم انھم حفاۃ فاحملھم اللھم انھم عراۃ فاکسھم اللھم انھم جیاع فاشبعھم۔

پروردگار، یہ لوگ پیادہ ہیں (یعنی سواری نہیں رکھتے) انھیں سوار کیجئے۔ پروردگار یہ لوگ ننگے ہیں، انھیں پہنائیے۔ پروردگار یہ لوگ بھوکے ہیں، انھیں سیر کیجئے۔

مسلمانوں کی معاشی پریشانی کو دیکھ کر پیغمبر کا پریشان ہوجانا

اس کے سامنے کچھ لوگ اسی لباس میں جس میں بعض مذہب کے ماننے والے رہنا مذہبی برتری کی دلیل ہے یعنی کمبل بدن پر ڈالے ننگے پاؤں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں۔ صحیح مسلم میں حضرت جریر بن عبد اللہ صحابیؓ سے مروی ہے کہ ان کمبل پوشوں پر سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نظر مبارک کا پڑنا تھا کہ

فتمعر وجہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (مسلم)

اداس پڑ گیا چہرۂ اقدس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔

حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا بیان ہے کہ معاً ان لوگوں کے اس حال کو دیکھ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اندر زنانہ میں تشریف لے گئے (غالباً کوئی چیز نہ ملی) پھر باہر تشریف لائے اور حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بلوا کر ارشاد ہوا کہ مسلمانوں کو جمع کرو، لوگ جمع ہوئے۔ ان غریبوں کی امداد پر لوگوں کو آمادہ فرمایا گیا، اور کافی امدادی سرمایہ جمع ہوگیا، جو ان کے حوالے کر دیا گیا۔ حضرت جابرؓ ہی راوی ہیں کہ وہی چہرۂ مبارک جو ابتک ان غریبوں کے دیکھنے کے بعد اداس پڑ گیا تھا۔

فرأیت وجہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یتھلل کانہ مذھبۃ۔

پھر ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرہ کو دیکھ کر سونے کی طرح دمک رہا ہے۔

خوش حالی کو دیکھ کر پیغمبر کے چہرے کا دمک اٹھنا

چہرۂ مبارک سونے کی طرح دمکنے لگا، محض اس لئے کہ کچھ لوگ معاشی پریشانیوں میں مبتلا تھے، ان کی یہ پریشانیاں اس تدبیر سے دور ہوگئیں۔ اس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ انسانی زندگی کا یہ پہلو جس کے متعلق سمجھا جاتا ہے کہ مذہب میں اس کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ نبی الانبیا خاتم الرسل صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حساساتِ طیبہ اسی پہلو کے متعلق کتنے عمیق اور گہرے تھے۔

اپنی آپ مدد پر لوگوں کو آمادہ کرنا

اور یہ طریقہ کہ اس قسم کے لوگوں کی امداد دوسروں سے کرائی جائے۔ واقعہ یہ ہے کہ بعض خاص فوری ضرورتوں کے موقعہ پر کبھی کبھی یہ تدبیر بھی اختیار کی جاتی تھی، ورنہ اس احساس کے ساتھ ساتھ جس کا سراغ مذکورہ واقعہ میں ملتا ہے۔ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دوسری خصوصیت

عموماً یتیم کو بجائے دوسروں کے خود صاحب ضرورت کو آپ آمادہ فرماتے کہ اپنی دشواریوں کو وہ اپنی اپنی توانائیوں کے ذریعہ سے حل کرے، جو قدرت نے آدمی میں اسی لئے پیدا فرمائی ہیں، حدیثوں میں اس مشہور واقعہ کا ذکر آتا ہے کہ ایک صاحب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آئے اور کچھ امداد کے طالب ہوئے، وہی جو ابھی ایک جماعت کو کافی امداد دوسروں سے دلا چکا تھا۔ ایک شخصی ضرورت کے متعلق جو طرز عمل اختیار فرمایا جاتا ہے وہ سننے کے قابل ہے۔ یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کو نہ خود اپنے پاس سے کچھ دینے کی کوشش کی اور نہ دوسروں سے دلوایا، بلکہ ضرورت مند صاحب کو فرماتے ہیں تو یہ فرماتے ہیں کہ تمہارے پاس آخر کوئی چیز بھی ہے؟ وہ بیچارے اتنے غریب اور نادار تھے کہ جواب میں انھوں نے عرض کیا۔ میرے پاس صرف ایک ٹاٹ ہے۔ جس کے ایک حصہ کو اوڑھتا ہوں، اور دوسرے کو بچھاتا ہوں اور اس کے سوا ایک پیالہ بھی ہے جس میں پانی پیتا ہوں، ظاہر ہے کہ افلاس اور ناداری کی یہ انتہا ہے۔ لیکن جو معاشی قوتوں کو ابھارنے اور ان کی قیمت پیدا کرنے کے لئے بھی مبعوث ہوا تھا۔ اللہ کے وہی رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اس جواب پر حکم دیتے ہیں کہ جاؤ اسی پیالے اور ٹاٹ کو لے آؤ، جو دنیا کو اس کی آخری کتاب دینے آیا تھا، اگر ایک طرف اس کے ہاتھ میں وہی کتاب تھی، تو اسی دستِ مبارک میں آنکھوں نے دیکھا کہ غریب حاجتمند کا ٹاٹ اور پیالہ ہے اور ٹھیک جیسے حراج (نیلام) کرنے والے پکارتے ہیں،

من یشتری ہذین — ان دونوں کو کون مول لیتا ہے۔

کی صدا کانوں میں اسی دہنِ اطہر سے آرہی تھی۔ جو قیامت تک پیدا ہونے والی نسل آدم کو بِاَنَّ لَہُمُ الجنۃ کی بشارت سنا رہا تھا۔ ایک صاحب نے کہا۔

انا آخذہما بدرہم — میں لیتا ہوں ایک درم میں۔

نیلام کرنے والے صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پھر حاضرین کو مخاطب کر کے۔

من یزید علی درہم — ایک درم پر اضافہ کون کرتا ہے۔

کے فقرے کے ساتھ قیمت کے اضافہ پر توجہ دلائی، بالآخر دو درہم پر بولی ختم ہوگئی، خریدار کو ٹاٹ اور پیالہ دیا گیا اور دو درہم جو قیمت میں وصول ہوئے تھے، دونوں کو حاجتمند انصاری کے حوالے کر کے ارشاد ہوا،

اشتر باحدہما طعاما فانبذہ الی اہلک واشتر بالآخر قدوما فأتنی بہ۔ — ایک سے اناج خرید کر اسے تو اپنے گھر والوں کے پاس ڈال دیجیو، اور دوسرے درہم سے ایک کلہاڑی خرید کر میرے پاس لاؤ۔

حضرت انس جو روایت کے راوی ہیں، ان کا بیان ہے کہ حاجت مند انصاری نے یہی کیا، اور کلہاڑی خرید کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں پیش کی، سب دیکھ رہے تھے جو بگڑی ہوئی انسانیت کو خدا سے ملانے آیا تھا، وہی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)

ل قطعاً تمہارے لئے جنت ہے ۱۲

شد عودا بیدہ ۔ — ٹھونکی ایک لکڑی اپنے دستِ مبارک سے۔

لکڑی ٹھونک کر کلہاڑی انصاری کے حوالہ کی گئی، اور اس کے بعد تاکیداً حکم دیا گیا۔

اذھب فاحتطب وبع ولا	جاؤ اور لکڑیاں کاٹ کاٹ کر لاؤ اور بیچو
ارینک خمسة عشر یوما ۔	اور نہ دیکھوں گا میں ہرگز تمہیں پندرہ دن تک
(یعنی پندرہ دن تک ملاقات نہ کرنا)	

وہ چلے گئے۔ پندرہ دن بعد جب خدمتِ مبارک میں حاضر ہوتے ہیں۔ تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کہتے ہیں کہ حضور ان پندرہ دنوں میں دس درہم آمدنی ہوئی۔ جس میں سے چند درہم کے تو کپڑے خریدے گئے، اور چند درہم کا طعام (غلہ) مول لیا گیا۔ مفلس کے افلاس کا ازالہ جس کے مبارک چہرے کو کندن کی طرح چمکا دیتا تھا۔ انصاری کی یہ رپورٹ سن کر انھی کو مخاطب کر کے فرمانے لگے۔

ھذا خیر لک من ان تجیٔ والمسٔلة	یہ بھلا ہے تمہارے لئے اس بات سے کہ تم آؤ
نکتة فی وجھک یوم القیامة ۔	اس حال میں قیامت کے دن کہ بھیک (سوال)
(مجمع الفوائد بحوالہ ابوداؤد و ترمذی)	داغ بنا ہوا ہو تمہارے چہرے میں۔

جن ذاتی دلچسپیوں کے ساتھ حصولِ معاش کی سوئی ہوئی قوتوں کو بیدار کرنے کا نمونہ ملا سوۂ حسنہ نبویہ میں مل رہا ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نگاہ میں اس کی کتنی اہمیت تھی۔ انصاری سے جو آخری فقرہ فرمایا گیا ہے، اس میں کلی طور پر آپ نے گداگری کے متعلق جو کچھ ارشاد فرمایا ہے یہ اسلام کا ایک مستقل قانونی باب ہے جس کی پوری تفصیل آئندہ اوراق میں ہے گی۔

حاصل اس کا وہی ہے کہ حتی الوسع اسلام نہیں چاہتا ہے کہ جماعت کا کوئی فرد اپنی توانائیوں کو بے کار ضائع کر کے دوسروں کی اکتسابی قوتوں سے ناجائز نفع اٹھائے۔

معاشی سہولت کے لئے ایک فرض نماز کی فرضیت ساقط کر دی گئی۔ لوگ غور نہیں کرتے، ورنہ سچ یہ ہے کہ سورہ مزمل میں تہجد کی نماز کی فرضیت کا قانون جب مسلمانوں سے اٹھا لیا گیا۔ تو اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا تھا۔

علم ان سیکون منکم مرضی واٰخرون	جان چکا ہے اللہ کہ تم میں کچھ لوگ بیمار پڑیں گے
یضربون فی الارض یبتغون من	اور دوسرے زمین میں چلتے پھرتے رہیں گے
فضل اللہ (المزمل ۲۹/۲)	اللہ کے فضل کو ڈھونڈتے ہوئے۔

جس کا یہی مطلب ہے کہ اگر شب بیداری سب پر فرض کر دی جائے گی۔ تو فضل اللہ کے ابتغا یعنی تلاش معاش کے فریضے سے کچھ لوگ محروم ہو جائیں گے اسلام نے نماز کے فریضہ کا اٹھا لینا گوارا کیا لیکن تلاش معاش کے فریضہ سے لوگوں کو روکنا پسند نہ کیا، حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ جو اسلامی نقطۂ نظر کے سب سے بڑے عملی شارح ہیں، مختلف کتابوں میں آپ کا یہ واقعہ نقل کیا جاتا ہے کہ آپ مسجد میں تشریف لائے، دیکھا کہ مجمع کو مخاطب کر کے ایک شخص کہہ رہا ہے۔

جہاد کی تیاری میں میری کوئی مدد کر سکتا ہے۔

حضرت عمر کا ایک دلچسپ تعلیمی واقعہ

کون نہیں جانتا کہ جہاد کا شمار اسلامی شریعت کی ان ہی عبادتوں میں ہے جو خدا کی طرف سے مسلمانوں پر فرض کی گئی ہیں، سی اسلامی عبادت میں مشغول ہونے کے لئے سائل مسلمانوں سے امداد طلب کر رہا تھا، لیکن سنئے ہوا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کیا کرتے ہیں، راوی کا بیان ہے کہ آگے بڑھتے ہیں اور صدا لگانے والے کا ہاتھ پکڑتے ہیں، اور مجمع کو مخاطب کر کے صدا لگاتے ہیں -

من یستاجر منی یعمل ارضہ — کون نوکر رکھتا ہے اس کو میری طرف سے اپنی زمین میں کام کرنے کے لئے۔

ایک صاحب نے عرض کیا مجھے ضرورت ہے۔ فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ ماہوار تنخواہ طے کرنے کے بعد جہادی امداد طلب کرنے والے کا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دے دیتے ہیں، وہ لے جاتے ہیں، اور اپنے باغ اور کھیت کے کام میں لگا دیتے ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دماغ سے اس کا خیال نہیں نکلتا ہے۔ کچھ دن گذرنے کے بعد مسجد ہی میں دریافت فرماتے ہیں، اس شخص کا کیا حال ہے، جن صاحب نے نوکر رکھا تھا انھوں نے جواب دیا کہ حضور اب تو وہ بڑے مزے میں ہے۔ تنخواہ سے کافی سرمایہ اس نے جمع کر لیا ہے، ارشاد ہوا کہ اس سرمائے کے ساتھ جو اس نے اس عرصہ میں کمایا ہے، میرے پاس ذرا اسے بھیجدینا۔ ارشاد کی تعمیل کی گئی۔ گلے میں ایک بھاری تھیلی (بیگ) لٹکائے دیکھا جاتا ہے کہ مسجد کا وہی سائل حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس آرہا ہے۔ جب وہ حضرت کے پاس آگیا، تو آپ نے اس کی بھری ہوئی بوجھل تھیلی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:-

خذ ھذہ فان شئت فالآن اغزو — لے اس کو، پھر اب جی چاہے تو جہاد کرو،
وان شئت فاجلس (کنز العمال) — یا جی چاہے تو (گھر) بیٹھ!

قیامت بھی قائم ہو رہی ہو جب بھی معاشی کاروبار کو ترک نہ کرنا چاہئے

معاشی کاروبار میں مشغولیت پر اسلام کا کتنا زور ہے۔ وہ اس کی اہمیت پر کس حد تک اصرار کرنا چاہتا ہے۔ اس کا اندازہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی اس مشہور حدیث سے بھی ہو سکتا ہے۔ جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے وہ روایت فرماتی ہیں،

قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم — رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ اگر
ان قامت الساعۃ وفی احدکم — قیامت قائم ہو جائے۔ اور تم میں سے کسی
فسیلۃ فان استطاع ان لا تقوم — کے ہاتھ میں کوئی پودا ہو۔ اگر اس کے بس
حتی یغرسھا فیغرسھا — میں ہو کہ قیامت ہو جب تک کہ اس کو وہ
(کنز العمال بحوالہ احمد) — نہ بیٹھے کہ اس پودے کو بو دے۔

زمین کی آبادکاری بھی مسلمانوں کے قرآنی فرائض میں ہے،

اور سچ تو یہ ہے کہ جلیل القدر حنفی امام علامہ ابو بکر جصاص کا گر یہ استدلال صحیح ہو۔ اور بظاہر اس کی صحت میں کوئی شبہ کرنے کی گنجائش نہیں یعنی قرآن پاک کی آیت جس میں انسانوں کو مخاطب کر کے فرمایا گیا ہے۔

انشاءکم من الارض واستعمرکم فیھا (ھود ۱۲/۵)	اٹھا کر کھڑا کیا تمہیں زمین سے، اور آبادی کرائی تم سے اس زمین میں۔

جصاص رحمۃ اللہ اس آیت کے تحت میں فرماتے ہیں۔

وفیہ الدلالۃ علی وجوب العمارۃ للزراعۃ والغراس والابنیۃ (۱۲۵ ج ۳)	یہ آیت بتاتی ہے کہ زمین کا آباد کرنا، کھیتی باغبانی اور تعمیر کے ذریعہ سے واجب ہے۔

جس کا یہی مطلب ہے کہ زمین کی عمارت (آبادی) خواہ بہ شکل الزراعۃ (کھیتی) یا بشکل الغراس (باغبانی) یا بصورت الابنیۃ (التعمیرات) ہو، قرآن کی مذکورۂ بالا آیت کی بنیاد علامہ جصاص حنفی کے نزدیک جائز یا سنت ہی نہیں، واجب اور فرض ہے، گویا اس شغل کی حیثیت وہی ہے جو نماز روزہ وحج و زکوۃ کی ہے، میں نہیں سمجھتا کہ عربی زبان کے طرز خطاب سے جو واقف ہے، وہ الجصاص کے اس استدلال میں کوئی کمزوری نکال سکتا ہے۔ خصوصًا جب ہم تک ایک دو نہیں، بلکہ تقریبًا مشہور و مستفیض روایتوں کی شکل میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ حدیثیں پہنچی ہیں، جن میں آپ نے صرف اسی کاشتکاری اور باغبانی کو نہیں جس سے کاشت کرنے والے یا باغ اگانے والے کو نفع ہی پہنچے، بلکہ اس میں بھی جس سے وہ نفع گیر نہ ہوا ہو، اس کے متعلق بھی مختلف پیرایوں میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم اخروی ثواب کی بشارت سناتے ہوئے فرماتے ہیں۔

قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم مامن مسلم یزرع زرعًا اویغرس غرسًا فیاکل منہ طیر اوانسان اوبھیمۃ الاکانت لہ صدقۃ۔ (رواہ البخاری فی صحیحہ)	فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں ہے کوئی ایسا مسلم جس نے کھیتی کی ہو یا درخت لگایا ہو، پھر اس کھیتی یا درخت سے پرند کھائے یا آدمی یا جانور، مگر یہ کہ ہوگا وہ اس کی طرف سے صدقہ۔

وجہ ظاہر ہے کہ اس کھیت یا باغ لگانے والوں کو اگر نفع نہ پہنچا، تو کیا ہوا، اس نے تو اپنا فرض ادا کیا، اور جس نے خدا کے عائد کئے ہوئے فرض کو ادا کیا، ثواب کا مستحق وہ نہ ہوگا، تو اور کون ہوگا، ما سوا اس کے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ادھر بھی اشارہ فرمایا کہ کاشتکار اور باغبان نے خدا کی دی ہوئی قوتوں سے کام لے کر اس چیز کو جو معدوم تھی، وجود کے لباس میں جلوہ گر ہونے کا موقع دیا، اس سے اگر فرد کو نفع اٹھانے کا موقع نہ ملا، تو جماعت کی خدمت کا فرض تو وہ بجا لایا، اور جماعت ہی نہیں، خدا کی دوسری زندہ مخلوق، مثلاً پرند یا بہیمہ (چوپائے)، اگر اس سے مستفید ہوئے تو قصدًا نہ سہی۔ ضمنًا اپنے وجود اور اپنی توانائیوں کو اس نے مفید ثابت کیا، اور اسلام یہی چاہتا ہے کہ خدا کی عطا کی ہوئی قوتوں کو بیکار اور ضائع ہونے سے بچایا جائے۔

مذہب اور دین کے متعلق آج جو غلط خیالات پھیلے ہوئے ہیں۔ ان کو سامنے رکھتے ہوئے کون یقین کر سکتا ہے کہ اسلام بھی باوجودیکہ ایک دین اور مذہب ہے لیکن جن مشاغل و پیشوں کو عام طور پر دنیاوی مشغلوں میں شمار کیا جاتا ہے، اسلام نے ان سب پر اخروی اجر و ثواب کو مرتب کر کے ان کو دینی مقام عطا کر دیا ہے۔ جو

عام دینی فرائض و عبادات کو سمجھا جاتا ہے۔ کہاں یہ نقطۂ نظر کہ جو جس حد تک دنیوی کاروبار سے الگ ہو کر زندگی بسر کرے گا، اُسی حد تک خدا کے حضور میں بلندی حاصل کرے گا، اور کہاں یہ عقیدہ کہ دنیا کے مشغلوں میں انہماک، اور ان کے ساتھ اشتغال ہی کو خدا کی خوشنودی اور نزدیکی کا ذریعہ بنایا جاتا ہے، مذہب کے ان غیر فطری غلط رجحانات کے استیصال میں اسلام نے کیا کام کیا ہے، ضرورت ہے کہ اس پر کوئی مستقل کتاب لکھی جائے، جیسا کہ ضرورت کا اقتضا تھا، اسلام میں بھی احبار وغیرہ (مذہب کے قانونی اور تشریعی پہلوؤں کے خدام) اور رہبان (صوفیہ) یعنی مذہب کی حقیقی روح اور واقعی مقصد کے محافظوں کا گروہ قرور پیدا ہوا، اور جب تک اسلام ہے، انشاء اللہ تعالیٰ یہ دونوں طبقے باقی رہیں گے .... ، اور ان کو باقی رہنا چاہیے، لیکن نہ جاننے والے خواہ کچھ ہی کہیں، یا غلط مثالوں کو دیکھ کر ان طبقات کے صحیح نمائندوں کے متعلق غلط حیرت کیوں نہ قائم کرلئے جائیں، لیکن جاننے والے جانتے ہیں کہ اہبار اور رہبان کے وہی افراد جو دوسرے ادیان و مذاہب میں "اکل باباطل" پر گذارہ کرتے تھے، بحمد اللہ اسلامی اکابر و اسلاف کا دامن اس الزام سے پاک ہے۔ علماء کے طرزِ عمل کی طرف تو میں نے پہلے بھی کچھ اشارہ کیا ہے، لیکن "کل باباطل" یا مفت خوری میں سب سے زیادہ بدنام طبقہ صوفیہ کا ہے، جو نہ پڑھتے ہیں، وہ نہ پڑھنا چاہتے ہیں، با ایں ہمہ جہل و ناواقفیت ہر قسم کے فیصلوں پر جری ہیں، ان کو میں کیسے سناؤں کہ تمہارے غلط طعنوں سے جو گروہ اتنا مجروح ذہنی ہے۔ اسی طبقہ کا کوئی معمولی آدمی نہیں، بلکہ اساطین صوفیہ میں جس کا شمار ہے، میری مراد مشہور صوفی بزرگ حضرت شیخ ابو المکارم علاء الدولہ سمنانی[1] رحمۃ اللہ علیہ سے ہے جو تصوف و حقائق کے ایک خاص مکتبِ خیال کے پیشوا ہیں، مولانا جامی نے اپنی کتاب نفحات الانس میں ان کا یہ قول نقل فرمایا ہے۔ میں نہیں جانتا کہ کسی خالص "مادی معاشیات کی کتاب میں بھی اس قسم کا معاشی نظریہ مل سکتا ہے، میں بجنسہ فارسی الفاظ کے ساتھ ان کی اصل عبارت نقل کرتا ہوں۔

حضرت سمنانی فرماتے ہیں:-

حق تعالیٰ ایں زمین و مزارع را بحکمت آفریدہ و مقرر[2]
کہ معمور باشد و فائدہ بخلق رسد و اگر خلق بدانند کہ از
عمارتِ دنیا کہ برائے فائدہ دخل کنند، نہ بوجہ

حق تعالیٰ نے زمین اور کھیتوں کو حکمت سے پیدا
فرمایا ہے اور خدا چاہتا ہے کہ یہ (زمین اور کھیت)
آباد رہیں اور ان سے مخلوق کو نفع پہنچے۔ اگر

---

[1] تاریخوں میں یہ بھی مشہور ہے کہ حضرت [illegible] میں [illegible] جو [illegible] تھا، "کان فی [illegible]" خشبہ اور [illegible] [illegible] سے [illegible] تھے جن پر سونے کی پتلیں چڑھی ہوئی تھیں، [illegible] نے نقل کیا ہے کہ جب حریص فتح ہوا، اور جب [illegible] پر حضرت عمرو بن عاصؓ کی [illegible] ہوئی، [illegible] حضرت علی کرم اللہ وجہہ [illegible] دریائے حریص کے جہاد میں جب حریص پر پہنچے تو اس کی [illegible] [illegible] میں [illegible] کی [illegible] اُس کے مقابلہ [illegible] تھی، جن میں حضرت رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے نقد و نظر کا اس سے پتہ چلتا ہے، آج حریص کے ریگستانوں کا ذکر کیا جاتا ہے۔ لیکن جبل اخضر کو کون ذکر کرتا ہے، یورپ کا بھی یہ دجل ہے ۱۲

[2] یہاں یہ نکتہ بھی قابلِ لحاظ ہے کہ دینی غرض یا نیت ہی کی وجہ سے ثواب کا پہلو پیدا نہیں ہوتا۔ بلکہ دنیاوی نفع اور آمدنی کو نصب العین بنا کر جو معاشی کاروبار میں مشغول ہے، اس کو بھی خرد ہی ثواب کا امیدوار قرار دیا گیا ہے:

اسراف چہ ثواب ست، ہرگز ترکِ عمارت نہ کنند،

خلق اللہ کو یہ معلوم ہوجائے کہ دنیا کی آباد کاری جس سے فائدہ اور آمدنی مقصود ہو۔

یعنی فضول خرچی کے طور پر یہ آبادی نہ ہو (جیسے لوگ فخراً مکان پر مکان بنا تے چلے جاتے ہیں جس میں نہ رہتے ہیں اور نہ دوسروں کو رہنے دیتے ہیں) بہرحال نفع اور آمدنی کے لئے آباد کاری کے کام میں کتنا ثواب ہے۔ اگر لوگوں کو اس کا صحیح علم ہوتا تو ہرگز آباد کاری کے کام کو نہ چھوڑتے۔

واگر بدانند کہ از ترکِ عمارت، وگذاشتن زمین را معطل چہ گناہ حاصل می شود، ہرگز نگذارند کہ اسباب او خراب شود،

اسی طرح اگر لوگ یہ جانتے کہ آباد کاری کے کام کے چھوڑنے اور زمین کو بیکار پڑے رہنے دینے میں کتنا گناہ ہے، تو ہرگز وہ یہ نہ کرتے کہ آبادی کے جو اسباب ہیں، ان کو برباد ہونے کے لئے چھوڑ دیں۔ (مثلاً تالابوں اور کنوؤں کی خبر نہ لینا، نہروں کی مٹی صاف نہ کرانا وغیرہ وغیرہ اسبابِ آبادی جن کی بربادی کی طرف عوام کو توجہ نہیں ہوتی)

آگے تمثیل سے اس اسلامی نظریہ کی تشریح بایں الفاظ فرماتے ہیں:-

ہرکس کہ زمینے دارد کہ ہر سال ازاں زمین ہزار من غلہ حاصل می تواند کرد، اگر بتقصیر واہمال نہ صد من حاصل کند و سلبِ آں صد من از حلق خلق دور افتد، بقدر آں از وے بازخواست خواہند کرد،

(نفحات الانس جامی ص ۵۰۸ مطبوعہ کلکتہ)

جو کوئی زمین کا کوئی ایسا قطعہ رکھتا ہے کہ اس سے ہزار من غلہ سالانہ حاصل ہو سکتا ہے۔ اگر اس کی کوتاہی و کاہلی و سستی سے بجائے ہزار من کے، نو سو من غلہ اس زمین سے حاصل ہوا، اور اس کی وجہ سے سو من غلہ مخلوق کے حلق میں نہ پہنچ سکا تو (قیامت کے دن) اس سے اس سو من کی بازپرس ہوگی، اور اسی کے برابر اس سے واپس مانگا جائے گا۔

وہی مذہب، وہی ثوابِ آخرت جسے غلط کاروں نے ایک مدت تک تقریباً تمام اقوام و امم میں ترکِ دُنیا اور معاشی کاروبار سے بھگانے، نفرت دلانے کے آلے کی حیثیت سے استعمال کیا۔ یہ اسلام کا معجزہ ہے کہ کسی "سگِ دنیا" حریص نے نہیں بلکہ اسلامی رہبانِ صوفیہ کا جو سرگروہ ہے۔ وہ اسی مذہب و اسی ثوابِ آخرت کو حصولِ دُنیا اور معاشی کاروبار کی گرم بازاری کے لئے استعمال کرتا ہے، اور بغیر کسی دغدغہ کے یہ فیصلہ کرتا ہے کہ اس کے خلاف ورزی کرنے والوں بلکہ دنیاوی کاروبار میں پوری توجہ اور انہماک سے کام نہ لینے والوں تک کو "بازخواست" کی سزا کے لئے تیار رہنا چاہئے۔

آج مثلاً ہندوستان کے ان کاشتکاروں کو جنھوں نے محض اپنی آبا پرستی[1] اور قدامت پرستی کے تحت

[1] لیکن اسی کے ساتھ ساتھ تو یقیناً اس کی ذمہ داری وہ حکومت بھی ہے جو زمانے کی حد تک تو بہت کچھ دعویٰ ہی ہے کہ کنوؤں اور کاشتکاروں کی بہبود کے لئے مستقل ڈیپارٹمنٹ ہر صوبے میں لاکھوں روپیے کے مصارف سے قائم ہیں لیکن [illegible] نہیں ہیں اسی کا نتیجہ ہے کہ ہندوستان کی زراعت اس بیسویں صدی میں بھی [illegible]

کشاورزی کے جدید آلات اور طریقوں کو ترک کر کے اس ملک کی پیداوار کو تقریباً سارے جہاں کی پیداوار کے مقابلہ میں انتہائی پستی کی حالت میں ڈال رکھا ہے۔ یورپ اور امریکہ کے کسان زمین کے جس رقبہ سے سو سو من غلہ نکالتے ہیں۔ ہندی کسان اپنے باپ دادوں کے تقلیدی آسیب کا مارا ہوا کسان اسی رقبہ سے بمشکل دس من نکالنے میں بھی دشواری محسوس کرتا ہے۔ آج کس کے پاس دنیا کے کس خطہ میں کس قوم کے پاس ایسا دین اور مذہب ہے جو ہندی کسانوں کے اس طرزِ عمل کو مذہبی گناہ، دینی جرم بتا کر ان کی عملی قوتوں میں بیداری پیدا کر سکتا ہے لیکن آپ دیکھ رہے ہیں کہ اسلام میں جس گروہ کو تارک الدنیا فقیروں میں شمار کیا جاتا ہے۔ اسی گروہ کا ایک پیشوا جو یہ کہنے پر مجبور ہوا ہے کہ کسان کی کاہلی اور قلتِ توجہ کی وجہ سے پیداوار کی جو مقدار زمین سے باہر نہ آسکی، اور خلقِ خدا کے حق تک نہ پہنچ سکی۔

بقدرِ آں ازوے باخواست خواہند کرد۔ | اسی کے برابر اس شخص سے اتنا ہی دریں مانگا جائے گا۔

آخرت کی آبادی کے لئے دنیا کو آباد کرنا

یقیناً یہ اسی دین کا پیغام ہے جس نے "استعمار الارض" یعنی زمین کی آبادی کو بھی انہی فرائض میں داخل کر دیا ہے، جن کی بجا آوری پر مذاہب میں جنت کی آبادی کے وعدے کئے گئے ہیں۔ آخرت کو آباد کرنے کے لئے دنیا کو آباد کرو، بتایا جائے کہ اسلام کے سوا اس نظریہ کی دعوت کس نے دی ہے، اور کون دے رہا ہے، اپنی توانائیوں کو تعطل اور بے کاری کے عوارض سے مفلوج کر کے باندالی[1] زندگی گذارنے والے خدا جانے اپنے اس مسلک کے متعلق کیا کیا مالیخولیا پکاتے رہتے ہیں لیکن صوفیانہ نقطۂ نظر سے بھی جس نے اسلامی نظریات کی شرح کی ہے۔ وہ آخر میں اس اعلان پر اپنے مذکورہ بیان کو ختم کرتا ہے۔ حضرت علاؤ الدولہ سمنانی آخر میں فرماتے ہیں کہ اگر کوئی

از کاہلی ترک عمارت زمین کند، وآں را ترکِ دنیا وزہد نام نہد، جز متابعت شیطان چیزے دیگر نیست۔ (ص ۵۰۰ نفحات) | اپنی کاہلی سے زمین کی آبادی چھوڑ بیٹھا ہو، اور اس کا نام اس نے ترکِ دنیا اور زہد رکھا ہے۔ تو یہ شیطان کی پیروی کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔

اور قرآنی حکم سے اعراض کر کے جو دوسری مخالف راہ اختیار کرے گا۔ اگر وہ شیطان کی پیروی نہیں کر رہا تو اور کیا کر رہا ہے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ جس قرآن نے

کائنات کے جمالی پہلوؤں کی طرف چند قرآنی اشارے

انا جعلنا ما علی الارض زینۃ لہا (الکہف) | ہم نے زمین پر جو کچھ ہے، اوسے زمین کا سنگار بنایا ہے۔

کا اعلان کر کے "ما علی الارض" (یعنی روئے زمین پر جو کچھ ہے) اس کو زمین کی آرائش اور اس کا بناؤ سنگار قرار

---

[1] باندا بہاری لفظ ہے جو درختوں پر پیدا ہو جاتی ہے۔ جسے ... ہوتی ہیں شاید فرض خود کہتے ہیں ... نام پڑا ہے یعنی غذا زمین سے خود حاصل نہیں کرتا، بلکہ دوسرے درختوں پر ہوا ہو کر ان کی حاصل کی ہوئی غذا سے پیٹ پالتا ہے ۱۲

دے رہا ہے، تو پھر زمین کی پیداواروں میں دخل یعنی آمدنی اور نفع ہی کا پہلو کیوں پیش نظر رکھا جائے۔ خود اسی قرآن میں جب انسانی سواریوں تک میں یہ چاہا گیا ہے کہ نفع کے ساتھ ساتھ اس کا بھی خیال رکھا جائے کہ ان سے ایک قسم کی آرائش اور زینت ہوتی ہے۔ تو خدا نے اور جن چیزوں کو زینت کے لئے بھی پیدا کیا ہے۔ اُن سے علاوہ مادی منافع کے زینت کا کام کیوں نہ لیا جائے۔ گھوڑوں، خچروں، گدھوں کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے

الخیل والبغال والحمار لترکبوھا و زینۃ (النحل ۱۷)	گھوڑے، خچر، گدھے اسی لئے ہیں کہ ان پر سواری کرو، اور وہ آرائش ہیں۔

صبح اور شام کے سہانے وقتوں میں خصوصاً دیہات کی صبح و شام میں جو یہ منظر سامنے آتا ہے کہ گاؤں کی مویشیاں آپس میں ملی جلی صبح کو آبادی سے نکل کر چراگاہوں کی طرف جا رہی ہیں، اور شام کو واپس آتی ہیں۔

ولکم فیھا جمال حین تریحون و حین تسرحون۔ (النحل ۱۷)	تمہارے لئے ان (مویشیوں) میں جمال و حسن ہے جب تم شام کو انھیں گھر واپس لاتے ہو، اور صبح کو جب انھیں چراگاہ کی طرف لیجاتے ہو۔

کے چونکا دینے والے فقرے سے قرآن انسانی فطرت کی جمالیاتی جستجو کو ایک "لذیذ یافت" اس سہانے منظر کی طرف متوجہ کر کے عطا کرتا ہے۔

اسی طرح لباس کا ذکر کر کے ستر پوشی اور الحر والبرد (سردی و گرمی) سے حفاظت کے جو فوائد ہیں، اُن کے ذکر کے ساتھ ساتھ حُسن و زیبائی سج دھج کے جو نتائج لباس سے حاصل ہوتے ہیں، ان پر بھی متنبہ کرتے ہوئے سورۂ الاعراف میں فرمایا گیا۔

یا بنی آدم قد انزلنا علیکم لباسا یواری سواٰتکم وریشا۔ (الاعراف ۸/۲)	اے آدم کے بچو، ہم نے اتارا تم پر لباس جو چھپاتا ہے شرمگاہوں کو تمہاری اور وہ آرائش (بھی ہے)

اس کے سوا آگے،

خُذُوْا زِیْنَتَکُمْ عِنْدَ کُلِّ مَسْجِدٍ (اعراف ۸/۲)	اپنی آرائش کو اختیار کرو، ہر سجدہ گاہ کے پاس۔

کا جو حکم دیا گیا ہے، اس میں تو لباس کو زینت، و زینت کو لباس قرار دیتے ہوئے بظاہر اس طرف اشارہ ہے کہ جس [illegible] سے ستر پوشی کے [illegible] آدمی کی ہیئت اور بگڑ جائے، اسے لباس ہی نہیں قرار دینا چاہیے خود سرورِ کائنات کا [illegible] دستور تھا کہ نیا جوڑا جب زیب تن فرماتے، تو اس وقت بے ساختہ زبانِ مبارک پر یہ الفاظ جاری ہو جاتے۔

الحمد للہ الذی کسانی ما اواری بہ عورتی واتجمل بہ فی حیاتی۔	ستائش ہے اس اللہ کے لئے جس نے پہنائی مجھے وہ چیز جو چھپاتی ہے میرے ستر عورت کو اور جمال حاصل کرتا ہوں میں اس سے زندگی میں۔

مردوں کے ساتھ بھی اسلام کا جمالیاتی نقطۂ نظر

شکر کے ان الفاظ میں "فی حیاتی" کی قید تو غالباً اظہار واقعہ کے لئے ہے۔ ورنہ اسلام کا جمالیاتی نقطۂ نظر تو حیات و زندگی کے دائرے سے بھی آگے بڑھ کر موت تک کو اپنی آغوش میں لئے ہوئے ہے۔ ترمذی کی مشہور حدیث ہے کہ مسلمانوں کو خطاب کر کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یہ حکم دیتے تھے۔

اذا کفن احدکم اخاه فلیحسن — جب کوئی تم میں سے اپنے بھائی کو کفن پہنائے
کفنه (ترمذی) — تو چاہئے کہ اچھا کفن پہنائے اس کو۔

قبر تک میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نگاہِ مبارک کسی بدہیئتی اور بھونڈے پن کو برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ ایک دن کا واقعہ ہے کہ اتفاقاً کسی قبر میں کچھ رخنہ رہ گیا تھا۔ پورے طور پر جیسا چاہئے، برابر نہیں کی گئی تھی۔ حضرت انس خادمِ خاصِ نبوت کا بیان ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس رخنے کو نہ دیکھ سکے۔ کنز العمال میں ہے کہ

امر بها ان تسد۔ — حکم دیا کہ اس رخنہ کو بند کر دیا جائے۔

ایک صحابی نے جو پاس ہی کھڑے تھے، انھوں نے عرض کیا کہ حضورؐ! اس بیچارے مردے کو کیا نفع پہنچے گا۔ جہاں کے پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) نے پوچھنے والے کو سمجھایا

اما انها لا تضر ولا تنفع ولکن — بیشک اس سے نہ ضرر پہنچتا ہے نہ نفع، مگر
تقر عین الحی۔ — ٹھنڈی ہوتی ہے اس سے زندہ کی آنکھ۔

یعنی مردے کو نہیں، بلکہ زندوں کی آنکھیں اس سے خنکی حاصل کرتی ہیں، اسی کے قریب قریب دوسری روایت میں ہے۔

تطیب عین الحی — بھلا معلوم ہوتا ہے زندوں کی آنکھوں کو۔

قبر تک میں جو دین آنکھوں کی خنکی تلاش کرتا ہو، آنکھوں کو بھلا معلوم ہو، ایسی قبر بنانے کی تعلیم دیتا ہو، اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ دنیا کی اور چیزوں کے متعلق حسن کاری اور حسن پسندی میں اس کا پاکیزہ مذاق کتنا بلند اور ستھرا ہوگا۔ نیک ناموں کے بدنام کرنے والے ان چند نفوس کو آج کس میں جرأت ہے جو یہ جا کر سنائے کہ جس الجھی ہوئی داڑھی، پریشان بال، بے تکے لباس کو وہ مذہبی اور دینی شکل کا نام دے رہے ہیں۔ دین کے سب سے بڑے معلم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نظرِ مبارک میں وہی بے دینی کی علامت شمار ہوئی تھی۔ مجمع الفوائد میں امام مالک کی سند سے یہ حدیث مذکور ہے کہ

کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم — آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں تھے۔ تب
فی المسجد فدخل رجل ثائر — میں ایک آدمی داخل ہوا، جس کے سر اور داڑھی
الرأس واللحیة فاشار الیه — کے بال الجھے ہوئے پریشان تھے، آنحضرت
صلی اللہ علیہ وسلم بیده کانه — صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی طرف کچھ اشارہ
یامر باصلاح شعره ولحیته — فرمایا، گویا اسے حکم دے رہے ہیں کہ اپنے
ففعل ثم رجع فقال صلی اللہ — بال اور داڑھی کو درست کرے، اس شخص
علیه وسلم الیس هذا خیرا — نے تب ہی کیا، اور واپس پلٹ کر آیا، حضور

من ان یاتی احدکم ثائر الراس کانہ شیطان،

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، کیا یہ اچھا نہیں ہے، اس بات سے کہ تم میں سے کوئی آتا ہے سر کے بالوں کو پریشان کئے ہوئے، گویا کہ وہ کوئی شیطان (بھوت) ہے۔

بدوضع و بدہیئت شکل شیطان کی شکل ہے

"کانہ شیطان" کے آخری الفاظ بہت زیادہ قابلِ توجہ ہیں، اُن کے لئے جنھیں اپنی "ثائر الراس واللحیۃ" والی شکلوں پر ملکوتیت کا مغالطہ لگا ہوا ہے جن مسلمانوں کو اپنی داڑھی کے جنگلوں پر ناز ہے وہی جنھیں دیکھ کر بجائے مسلمان ہونے کے کبھی کبھی سکھ ہونے کا دھوکا ہوتا ہے، ان کو نبوتِ محمدیہ کے سب سے بڑے مذاق شناس فاروقِ اعظمؓ کا یہ اثر یاد رکھنا چاہیئے جسے بخاری کی شرح میں علامہ محمود بدرالدین عینی نے نقل کیا ہے۔

داڑھی کے متعلق حضرت عمر کا ایک دلچسپ واقعہ

انہ رای رجلا قد ترک لحیتہ حتی کبرت فاخذ یجذبہا ثم قال ائتونی بجلمتین ثم امر رجلا فجز تحت یدہ۔

انھوں نے دیکھا ایک آدمی کو جس نے چھوڑ رکھی تھی اپنی داڑھی اتنی کہ وہ بہت بڑھ گئی تھی، حضرت عمرؓ اسے پکڑ کر اپنی طرف کھینچ رہے تھے پھر آپ نے قینچی منگائی، اور ایک آدمی کو حکم دیا تو اس نے داڑھی کا جتنا حصہ ہاتھ کے نیچے تھا (غالباً بمقدار قبضہ چھوڑ کر) چھانٹ دیا۔

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس شخص کی داڑھی پکڑ کر کھینچ رہے تھے، یہ جملہ قابلِ غور ہے، آج ایسی داڑھیوں کو ہاتھ لگانے والا بیچارہ "کفر" کے فتوے سے کیا بچ سکتا ہے؟ اور فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ صرف اسی فعل پر بس نہیں فرماتے ہیں، اس کام کو ختم کر کے ارشاد ہوا،

درندوں کی صورت

یترک احدکم نفسہ کانہ سبع من السباع۔ (عینی ص ۲۰۵ ج ۱)

تمہارے بعض لوگ اپنے آپ کو کچھ اس طرح چھوڑ دیتے ہیں کہ گویا درندوں میں سے وہ کوئی ایک درندہ ہے

درندوں میں سے ایک درندہ بن جانا ایک بڑا معیار ہے، ان لوگوں کے لئے جن کی سمجھ میں اب تک یہ نہیں آیا کہ انسانیت کی تکمیل اور اس میں حسن و جمال پیدا کرنے والا اسلام ان سے کیا چاہتا ہے۔ میں نے پیدا کرنے کا لفظ قصداً استعمال کیا، کیونکہ شاید میری گذشتہ شہادتوں سے کسی کو یہ مغالطہ نہ ہو کہ اسلام صرف حسن پسندی اور جمال پذیرائی کے جذبات بیدار کرنے کی ہی حد تک اپنے ماننے والوں پر اصرار کرتا ہے، حالانکہ جو کچھ اب تک کیا جا چکا ہے، اس سے اگر ایک طرف حسن پسندی تو دوسری طرف حسن کاری کی حوصلہ افزائیوں پر کم روشنی نہیں پڑ رہی ہے۔ مگر آج جو اپنا سب کچھ کھو چکے ہیں، ان مسلمانوں تک اس آواز کو کون پہنچائے کہ تمہارے سلف کے فنونِ لطیفہ کا ایک بڑا شعبہ[1] جس پر آج یورپ مر

---

[1] مطلب یہ ہے کہ فنونِ لطیفہ کی بعض ایسی شاخیں جن کے بڑھنے سے انسانیت کی جڑ کٹتی تھی، اسلام نے جڑ کی حفاظت کے لئے فنونِ لطیفہ کی ایسی شاخوں کا تو کاٹ دینا ضروری خیال کیا جن میں سب سے زیادہ اہمیت تصویر کشی کو ہے۔ خرافاتی ظلمات کا وہ حیرت انگیز کارخانہ جس کا نام اصنامی نظام یا بت پرستی ہے، جس کی بدولت ساری مخلوقات کے آقا انسان کو سارے جہان کی غلامی کا طوق اپنے گلے میں ڈالنا پڑا، اور جس کی بدولت آدمی کی دولت، اس کی عزت، صحت بلکہ نسلی خصوصیتوں پر سینمائی اور عریانی تصویروں سے جو زد پڑ رہی ہے، اس کا کون اندازہ کر سکتا ہے، آئندہ قانونی ابواب میں بھی اس کا ذکر آئے گا۔

دُھن رہا ہے۔ ان کی جمالیاتی دلکشیوں میں اس دینی تربیت کو بھی بڑا دخل تھا، جو اس دین کے پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اپنی امت کی کی تھی۔ اگر صحیح مسلم کی یہ مشہور روایت صحیح ہے،

اسلام اور حسن کاری	ان اللہ کتب الاحسان علی کل شیٔ فاذا ذبحتم فاحسنوا الذبح واذا قتلتم فاحسنوا القتل	فقط اللہ نے حسن کاری ہر چیز پر واجب کی ہے، تو اس لئے چاہئے کہ تم جب ذبح بھی کرو تو اچھی طرح ذبح کرو، اور جب تم قتل کرو تو اچھی طرح قتل کرو (یعنی سلیقے کے ساتھ)

اور صحیح ہونے کی بظاہر کوئی وجہ نہیں کہ مسلم کے سوا بھی صحاح کی اکثر کتابوں میں موجود ہے۔ تو اس کا مطلب بجز اس کے، اور کیا ہو سکتا ہے کہ حسن و جمال کے قالب میں ڈھالے بغیر اسلام نہیں چاہتا کہ کسی مسلمان سے کوئی فعل بھی صادر ہو، سب سے آخری کام جس میں حسن کاری کا آدمی خیال نہیں کر سکتا، وہ قتل اور ذبح کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔ مگر جب ان افعال میں بھی پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم ہے کہ حسن پیدا کرنے کی کوشش کی جائے، تو ان صناعات اور کاریگریوں میں جن میں عموماً آدمی کی فطرت تناسب و جمال کو چاہتی ہے۔ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اسلام کا نقطۂ نظر کیا ہو سکتا ہے، بلکہ سچ تو یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ فرمانے کے بعد کہ

ان اللہ کتب الاحسان علی کل شیٔ — اللہ نے ہر چیز میں حسن کاری کو واجب کیا ہے۔

کسی مزید گفتگو کی حاجت بھی نہیں رہتی۔ نیز حدیث کے اس حصے سے یہ بھی معلوم ہوا کہ حسن پسندی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی ذاتی مذاق بھی نہ تھا، بلکہ ہر چیز میں حسن پیدا کرنے کو اسی نے بندوں پر واجب کیا ہے اور اسی کو واجب بھی کرنا چاہئے تھا، جس سراپا حسن و جمال کے متعلق ارباب مشاہدہ کا بیان ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صحیح حدیث ہے،

خدا بھی جمیل ہے جمال کو پسند کرتا ہے	ان اللہ جمیل ویحب الجمال (مسلم وغیرہ)	بلاشبہ اللہ تعالیٰ خود بھی جمیل ہیں، اور جمال کو پسند فرماتے ہیں۔

احسان کا مطلب، الاستاذ الامام مولٰنا انور شاہ الکشمیری نور اللہ مرقدہٗ نے ایمان واحسان کی شرح حدیث پڑھاتے ہوئے فرمایا تھا کہ ان مواقع میں احسان کا (حسن پیدا کر دین) لغۃ ترجمہ صحیح ہے۔ آپ کا یہ بھی دعویٰ تھا کہ قرآنِ پاک میں "المحسنین" کا لفظ جہاں کہیں آیا ہے، اس کے معنی بھی یہی ہیں کہ جو اپنے ایمان وعمل میں حسن پسند واقع ہوئے ہوں، یعنی ایمان وعمل کے ادنیٰ درجہ پر قانع نہ ہوں، بلکہ ان امور کے حسن کا جو درجہ ہے، اس کے حصول میں کوشاں ہوں گویا "المحسنون" مسلمانوں کا وہ طبقہ ہے جو زندگی کے تمام مطلوبہ شعبوں میں حسن پسند واقع ہوا ہو۔ ظاہر ہے کہ یوں سر کا بوجھ اتارنے کے لئے جو کام کئے جاتے ہیں، اس میں نہ زیادہ مشقت ہوتی ہے، نہ زیادہ وقت لگتا ہے، نہ زیادہ محنت صرف ہوتی ہے۔ لیکن اگر یہ ارادہ کر لیا جائے کہ جو کام بھی کیا جائے پورے حسن و سلیقہ کے ساتھ کیا جائے، اس کے لئے تو سب ہی کچھ کرنا پڑتا ہے۔ پھر ان حسن کاروں اور محسنوں کو جمالِ مطلق کی محبوبیت کا مقام اگر حاصل ہو، جس کا قرآن میں بار بار اعلان کیا گیا ہے، تو اپنی

محنت ومشقت، جانفشانی کی بنیاد پر یقیناً وہ اس کے مستحق ہیں، میں یہ تسلیم کرتا ہوں کہ قرآن کے "محسنین" سے مراد ان ہی لوگوں کا گروہ ہے، جن کی زندگی خالق ومخلوق کے باہمی تعلقات کی تصحیح میں حسن کارانہ مجاہدوں کے ساتھ بسر ہوتی ہے۔ اور عموماً یہی اس سے مراد بھی لیا گیا ہے، ایمان واسلام واحسان کی مشہور حدیث میں "الاحسان" کی جو شرح

تعبد اللّٰہ کانک تراہ فان لم تکن تراہ فانہ یراک۔	پوجا اللہ کو اس طریقہ سے کہ گویا تم اسے دیکھ رہے ہو۔ پس اگر نہ دیکھ پاؤ[1] اس کو (تو اتنی بات بہ حال یقینی ہے کہ) وہ تمہیں دیکھ رہا ہے۔

کے الفاظ میں کی گئی ہے، اس شرح سے بھی اسی خیال کی تائید ہوتی ہے۔ اور اسی بنیاد پر سمجھا جاتا ہے کہ مسلمانوں میں محسنوں کا طبقہ وہی ہے جسے عام محاوروں میں صوفیہ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ قول اگر واقعی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا قول ہے یعنی،

حسن کار صناعوں کا طبقہ خدا کا محبوب ہے	ان العبد اذا عمل عملا احب اللّٰہ ان یتقنہ۔ (کنز العمال)	جب بندہ کوئی کام کرتا ہے، تو اللہ تعالیٰ چاہتے ہیں، کہ اس میں اتقان پیدا کرے یعنی اس کو ٹھیک جیسا کہ چاہیئے اسی طرح انجام دے۔

تو میں نہیں سمجھتا کہ مسلمان صناعوں اور کاریگروں میں جو لوگ اپنے اپنے مصنوعات اور اپنی دستکاریوں میں اس لئے اتقان واستواری تناسب وموزونیت پیدا کرتے ہیں کہ ان کا خدا ان کے اس فعل کو محبوب رکھتا ہے، تو حسن کاروں کے اس گروہ کو بھی محبت کے اس امتیاز سے کیسے محروم رکھا جا سکتا ہے، اور سچ تو یہ ہے کہ جس دین نے اپنے ماننے والوں کے لئے مشغولیت کا ایسا نظام پیدا کیا ہے کہ اس دین کے مطابق عزم کی پوری طاقت کے ساتھ جو دین دارانہ زندگی بسر کریں گے۔ ان کے لئے کاہلی، بیکاری

---

[1] میں نے یہ ترجمہ ان لوگوں کے مطابق کیا ہے جن پر امت "فان لم تکن تراہ" کا ... کھلا ہوا ہے ... کچھ نہیں ہے، اس حدیث صحیح کا راز واضح ہو چکا ہے اور ... دیدہ آئینہ دار طلعت اوست کے مقام کو اپنا مقام بنا چکے ہیں، کسی مخلوق کو خالق کے ظہور کے بغیر ان کے لئے ناقابل تصور بات ہو چکی ہے ... احب ان افنیٰ (میں ڈھل جانے والے کو پیار نہیں کرتا) کی ابراہیمی تجلی چمک چکی ہے باقی جو عالم کو عالم کے خالق سے ٹوٹا ہوا تصور کرتے ہیں، گویا کچھ ایسا خیال کرتے ہیں کہ معاذ اللہ عالم پیدائش میں تو خدا کا محتاج ہے لیکن وجود ... بقا میں خدا کی ... اس کو ضرورت نہیں ... مخلوق کے وجود کو خالق کے وجود سے اس طرح جدا تصور کرتے ہیں جس طرح دو مخلوقوں کے وجود باہم ایک دوسرے سے الگ ہوتے ہیں، ایک کا تحقق دوسری مخلوق کے تحقق کے بغیر ہو سکتا ہے۔ اس قسم کے عامیانہ غیر قرآنی تصورات والوں کے لئے ... اس حدیث کا ایک ترجمہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ "پوجو خدا کو اس طرح کہ گویا ... دیکھ رہے ہو یعنی خدا کے ساتھ ایسا ہی تعلق رکھو جیسے کسی دیکھے ہوئے ... فرد کو مطلب یہ ہوگا کہ خدا کو اگر تم دیکھتے نہیں تو وہ تو تمہیں دیکھ ... رہا ہے ... کر رہے ہو جیسے کسی دیکھے ہوئے کے ساتھ کیا جاتا ہے بعض شراح حدیث نے اس کا یہ مطلب بھی لکھا ہے، (دیکھو نووی شرح مسلم ۱۲)

اپاہج پن اور بے روزگاری کے لئے کون گنجائش کیسے باقی رہ سکتی؟

معلم الامۃ امام الفقہ حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ جو یہ فرمایا کرتے تھے کہ

انی لاکرہ ان اری الرجل فارغا	میں اس کو ناپسند کرتا ہوں کہ آدمی کو فارغ
لا فی عمل الدنیا ولا فی الآخرۃ۔	دیکھوں، یعنی نہ دنیا کے کسی کام میں مشغول ہو
(مجمع الزوائد)	اور نہ آخرۃ کے کام میں۔

غالباً اس کا یہی مطلب تھا کہ اسلام نے مسلمانوں کی عملی زندگی کا جو دستور اور آئین بنایا ہے، اس میں اس قسم کی لغو فارغ البالی کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے، لیکن آہ کہ "دین" کن بھینسوں کے سامنے آج بجائی جارہی ہے جن کے "نظام اوقات" میں "فراغت" کے سوا افسوس کہ کوئی دوسری گنجائش باقی نہیں رہتی ہے۔ مسلمانوں کی "فارغ البالی" اور "فرصت" کے اسی عجیب وغریب ذوق کا یہ نتیجہ ہے کہ خدا کا وہ "دین" بھی آج اغیار کی محفلوں میں کاہلی کے پیغام اور بے عملی کے نظام کے نام سے بالآخر بدنام ہو کر رہا، جس کے متعلق گذر چکا کہ "ابتغاء فضل اللہ" یا معاشی جدوجہد میں مسلمانوں کے قدم دوسروں سے کسی طرح پیچھے نہ رہیں۔ سورۂ مزمل میں ایک مستقل فرض نماز کی فرضیت تک کو منسوخ کر دینا گوارا کر لیا گیا تھا۔ ممکن ہے کہ اربابِ تنقید کو طبرانی کی اس حدیث پر سنداً کچھ اعتراض ہو جس میں ہے کہ "ایک صحابی نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ میرا پیشہ اور گذر بسر کا ذریعہ شکار ہے، جنگلوں اور بیابانوں میں رہنے کی وجہ سے عموماً نماز باجماعت کی سعادت سے میں محروم رہتا ہوں، میرے متعلق کیا حکم ہے۔ ترکِ جماعت کی سزا میں جس پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) نے گھروں میں آگ لگوا دینے تک کی دھمکی دی تھی، اور ایک نابینا صحابی نے جب نابینائی کے عذر کو پیش کرتے ہوئے چاہا تھا کہ جماعت کی حاضری سے مستثنیٰ کر دیئے جائیں، تو یہ دریافت کرنے کے بعد کہ اذان کی آواز تمہارے گھر تک پہنچتی ہے، صحابی نے اثبات میں جواب دیا، تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فلا اذا (یعنی تو ایسی صورت میں تم "مستثنیٰ" نہیں ہو سکتے) فرمایا تھا۔ آج ایک معاشی عذر کے پیش ہونے پر سننے کی بات ہے۔ خدا کا وہی رسول (صلوٰۃ ہوں اُن پر اور سلام ہو اُن پر) کیا ارشاد فرماتے ہیں۔

نعم العمل . قد کانت قبلی	بہت اچھا مشغلہ ہے۔ مجھ سے پہلے جتنے پیغمبر
رسل کلہم[1] یصطاد ویطلب الصید	گذرے، سب کے سب شکار کرتے تھے اور

---

[1] اور بعد کو بھی جن بزرگوں کو ملت اسلامیہ میں انبیائے بنی اسرائیل کا مقام حاصل ہوا، مثلاً ولی الہند خواجہ بزرگ اجمیری قدس اللہ العزیز کے حالات میں پڑھیئے، اسی ذوق کا ثبوت ملے گا۔ سیدی الامام شیخنا وشیخ الہند برد اللہ مضجعہ نے گذشتہ صدیوں کے اس عمل سے حصہ پایا تھا۔ اب یاد نہیں کہ براہِ راست حضرتِ والا سے سنا تھا یا بیچ میں کوئی واسطہ ہے۔ کہ شیخ الاسلام مولانا نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق شیخ الہند فرماتے تھے کہ شکاری رزق کو اطیب الرزق اس لئے قرار دیتے تھے کہ درمیان میں کسی آدمی کا ہاتھ نہیں ہوتا، براہِ راست خدا سے روزی حاصل ہوتی ہے ۱۲

ویکفیک من الصلوٰۃ فی جماعت	اور شکار کی تلاش میں نکلتے تھے۔ باقی
اذا غبت عنہا فی طلب الرزق	جماعت کی نماز کے لئے تمہارے واسطے
حبک للجماعۃ واھلہا، وحبک	بس یہ کافی ہے کہ روزی کی تلاش میں جب
ذکر اللہ واھلہ واسع علیٰ	تم کو جماعت سے غیر حاضر ہونا پڑے۔ تو
اھلک وعیالک حلالا	جماعت کی محبت، جماعت والوں کی محبت
فان ذلک جہاد فی سبیل اللہ	اللہ کے ذکر کی محبت، ذکر اللہ میں مشغول

ہونے والوں کی محبت اور اپنے اہل وعیال کے لئے حلال روزی کی تلاش کی خواہش، الغرض یہ سب چیزیں جماعت کی عدم حاضری کی قائم مقامی کرتی ہیں۔ چاہئے کہ اپنے اہل وعیال کے لئے طلبِ حلال میں کوشش کرو کہ یہ اللہ کی راہ میں جہاد ہے۔

معاشی جدوجہد بھی جہاد فی سبیل اللہ ہے

صاحب مجمع الزوائد کا جو طبرانی جیسے محدثین کی حدیثوں میں سنداً کوئی اگر سقم پاتے ہیں، تو اس پر تنبیہ کئے بغیر نہیں گذرتے، اس حدیث کے متعلق سکوت اختیار کرنا اولاً یہ خود دلیل ہے، اس بات کی کہ کم از کم ان کے نزدیک اس کی سند قابلِ اعتراض نہیں، ثانیاً جب قرآن کا نص شاہد ہے کہ ابتغائے رزق میں حرج واقع نہ ہو، اسی لئے تہجد کی فرضیت عام مسلمانوں سے ساقط ہوئی، تو اس میں کیا تعجب ہے کہ شارح قرآن صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی ابتغائے رزق کے عذر کو پیشِ نظر رکھ کر جماعت کی حاضری جو ظاہر ہے کہ فرض ہونے کی حیثیت نہیں رکھتی اس سے کسی کو مستثنیٰ فرمادیا ہو، بلکہ ارشادِ گرامی کا آخری حصہ یعنی

واسع علیٰ اھلک وعیالک	اور چاہیئے کہ اپنے اہل وعیال کے لئے
حلالا فان ذلک جہاد فی	طلبِ حلال کی کوشش کرو کہ یہ اللہ کی
سبیل اللہ۔	راہ میں جہاد ہے۔

میرے نزدیک تو سورۂ مزمل ہی کی آیتوں سے بظاہر مستنبط و، خود ہے، اس لئے کہ تہجد کی فرضیت کے سقوط کے وجوہ بیان کرتے ہوئے قرآن میں ایک وجہ تو ابتغاء فضل اللہ اور دوسری وجہ اسی کے بعد وَآخرون یقاتلون فی سبیل اللہ (یعنی دوسرے لوگ اللہ کی راہ میں قتال اور جہاد کریں گے) بھی بیان کی گئی ہے۔ یعنی انھی دونوں عذروں کی بنیاد پر اس نماز کی فرضیت ساقط کی جاتی ہے۔ جس کا یہی مطلب ہوسکتا ہے کہ خود قرآن نے بھی معاشی جدوجہد کو جہاد فی سبیل اللہ کا ہموزن اور ہمدوش قرار دیا ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم جس وقت یہ فتویٰ دے رہے تھے کہ "اہل وعیال کے مصارف اور نفقہ کی جستجو وتلاش میں تگ ودو، یہ بھی اللہ کی راہ میں جہاد کرنا ہے۔" اس وقت سورۂ مزمل کا یہ طرزِ بیان آپ کے پیشِ نظر نہ تھا، رونے والا اگر آجکل کے مسلمانوں کو دیکھ کر ع امتی باعثِ رسوائی پیغمبر ہیں (اقبال مرحوم) کے الفاظ کے ساتھ عمر بھر روتا رہا۔ تو کیا واقعی اس کا یہ نوحہ غلط نوحہ اور اس کا یہ گریہ غلط گریہ تھا،

یاللعجب! جس سرزمین کو نزولِ قرآن کی سعادت نصیب ہوئی تھی، آج خصوصیت کے ساتھ اسی کے فرزند

ہر قسم کے معاشی کاروبار سے بے تعلق ہو کر صرف بدنِ عرب کے مسلمانوں کے سینے کے بوجھ بن کر اپنی آبرو خاک میں مل رہے ہیں،[1] اور کیا کہوں کس کی آبرو پر داغ لگا رہے ہیں ؎

لمثل ھذا یذوب القلب من کمد ان کان فی القلب ایمان و اسلام

اسلام اور کیا کرتا، اسلام کا رسول (صلوٰۃ اللہ علیہ) اور کیا کہتا۔ جو کچھ کہا جا سکتا تھا اور جو کبھی کسی سے نہیں کہا گیا تھا۔ سب تو کہہ دیا گیا تھا، پھر اگر کسی قوم کو اسی پر اصرار ہو کہ جو کچھ کہا جائے گا، ہم نے طے کر لیا ہے کہ وہ نہ

---

[1] ہنگامہ برپا کر دیا گیا ہے کہ عرب یک چٹیل ریگستانی میدان ہے، وہاں پیدا ہی کیا ہو سکتا ہے۔ مگر کہنے والوں کو کیا کہیے۔ جہاں اللہ کا گھر ہے اس میں شک نہیں وہ تو بن کھیتی کا بیابان و ردادیٔ غیر ذی زرع ہے۔ لیکن یمن و نجد یا مدو کبرتیہ وغیرہ کے سیر حاصل خطوں کو جانے دیجیے خود سرزمینِ حجاز کا واقعی ہمیشہ سے کیا یہی حال تھا، جو آج ہے۔ میں نے کسی موقع پر اسی حجاز کے تاکستان و بساتین کا تذکرہ کیا تھا، جس میں دس لاکھ بیس منڈوے پر چڑھی ہوئی تھیں۔ سی حجاز میں خیبر بھی تو ہے۔ آج بھی جن لوگوں نے اس کا معائنہ کیا ہے بھا سبعۃ اودیۃ سائلۃ ونخیلا فوق التصور (الارتسامات ص ۲۷) یعنی بہتی ہوئی سات ندیاں ہیں اور نخلستانوں کا کوئی ٹھکانا ہی نہیں ہے۔ وادی القریٰ کا بھی یہی حال ہے، مدینہ منورہ کے اطراف میں عقیقِ کبریٰ و صغریٰ کی ندیاں۔ ینبوع کے متعلق یاقوت نے لکھا ہے کہ اس میں ایک سو ستر چشمے جاری تھے۔ مشہور نومسلم لیوپولڈ صاحب جو اسد اللہ کے نام سے مشہور ہیں اور بخاری کا ترجمہ کر رہے ہیں شکیب ارسلان نے ان کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ جب میں عرب کی سیاحت کر رہا تھا تو حجاز کے جنوبی حصے میں "بیشہ" نامی وادی پر گزر ہوا۔ اس وادی میں اس کے اطراف کی زمینوں میں جو صلاحیت انھوں نے پائی، کہتے تھے کہ مکہ اور اطرافِ مکہ والوں کی خوراک سارے نہ کے لئے صرف حجاز کی یہی زمین کافی ہے۔ علاوہ نخلستانوں کے سرزمینِ عرب اپنے اندر معدنیات کی جو دولت چھپائے ہوئے ہے اس کا کون اندازہ کر سکتا ہے، سونا، چاندی، تانبہ، قلعی حتیٰ کہ اب تو پٹرول تک کے ذخیروں کا پتہ اس سرزمین میں مل چکا ہے لیکن افسوس ہے۔ اپنے عہدِ شباب میں مسلمانوں نے پورے ملک کو لاڈ اور پیار میں بگاڑ دیا، کہتے ہیں کہ مصر کی زمین کا پانچواں حصہ حرمین پر وقف ہے، سلطان محمد فاتح نے جس دن قسطنطنیہ میں پہلا قدم رکھا، اعلان کیا وقفت مدینۃ قیصر علی مدینۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم کہتے ہیں کہ کمالی عہد سے پہلے تقریباً پانچ کروڑ روپیہ ترک حرمین پر خرچ کرتے تھے۔ دنیا کے سلاطین و امرا جو کچھ بھیجتے تھے۔ اس کا کوئی ٹھکانا ہے، اسی سے اندازہ کیجیے کہ ہمنی بادشاہ محمد شاہ کی والدہ حج کے ارادے سے مکہ جانے لگیں، تو بادشاہ نے اپنی طرف سے والدہ کی خدمت میں باشندگانِ حرمین میں تقسیم کرنے کے لئے جو رقم دی تھی۔ فرشتہ اور خافی خاں وغیرہ نے لکھا ہے کہ وہ چہار صد من طلا، ہفت صد من نقرہ، تھا۔ چار سو من سونا اور سات سو من چاندی صرف ایک عورت اپنے ہاتھ سے عرب لے جاتی ہے اور سب کو وہیں خرچ کر کے واپس آتی ہے۔ آج بھی اسی دکن سے اس زمانے میں بھی کم از کم دس ہزار ماہوار سے کم رقم تو صرف حرمین کے لئے سلطنتِ آصفیہ خلد اللہ نہیں بھیجتی۔ افسوس کہ یہی خیر ایک گونہ باعثِ شر ہو گیا۔ جد و اجتہاد اور کمانے کی صلاحیت وہاں کے باشندوں سے جاتی رہی۔ آخر یہی حجاز تھا جب کوشش کی گئی تو عرفات جیسے میدان میں بھی نہر جاری ہو گئی۔ عبداللہ بن عامر کہا جاتا ہے کہ صحابی تھے۔ یعنی بچپن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر پیش ہوئے تھے۔ بصرہ سے مکہ تک انھوں نے اپنے گورنری کے زمانے میں کنواں اور سرائے بنوائی تھی، حتیٰ کہ اتخذ بعرفات حیاضا ونخلا۔ مسلمانوں کا دارالہجرت عرب ہی ہو سکتا تھا لیکن معاشی ضیق جب تک ہے۔ جانے والے آخر کہاں جائیں ۱۲

سکے تو اس کا علاج کس کے پاس ہے۔ رسول اللہ کو تو رسول اللہ کے خدا نے بھی کہہ دیا تھا،

فذکر انما انت مذکر لست علیہم	تم چونکا دو، ان پر تم کو داروغہ نہیں بنایا گیا
بمسیطر فمن تولی وکفر فیعذبہ	ہے۔ پھر جو پیٹھ پھیرے اور انکار کرے گا، تو
اللہ العذاب الاکبر۔	اللہ اس کو بڑا عذاب دے گا۔

چند انقلابی صناعات کا انتساب پیغمبروں کی طرف قرآن میں،

کہتے ہیں کہ سعودی حکومت نے بعض جدید مغربی ایجادات مثلاً ٹیلیفون وغیرہ کو عرب میں جب داخل کیا، تو نجد کے سپاہیوں نے ان کو شیطانی اعمال قرار دے کر اور یہ کہتے ہوئے کہ ان میں شیطان بولتا ہے، ان چیزوں کی سخت مخالفت کی، ہو سکتا ہے کہ نجدی سپاہیوں کی طرف اس قسم کے واقعات جو عموماً منسوب کئے جاتے ہیں، ان میں کچھ حقیقت کا حصہ بھی شریک ہو، لیکن کیا اس کی ذمہ داری ایک لمحہ کے لئے اس دین کی طرف منسوب کرنے کی جرأت کسی کو ہو سکتی ہے جس دین کی سب سے اہم اساسی آسمانی کتاب میں اپنے اپنے عہد کی بعض انکشافات کو خدا کے برگزیدہ اولوالعزم پیغمبروں کی طرف منسوب کیا گیا ہے، بلکہ سچ تو یہ ہے کہ خود حضرت حق تعالیٰ جل مجدہٗ نے ان کو اپنی تعلیم اور وحی کا نتیجہ قرار دیا ہے۔ آخر قرآن پڑھنے والوں میں کون نہیں جانتا کہ حضرت نوح علیہ السلام کی کشتی جس کی خواہ اس زمانے میں کوئی اہمیت نہ رہی ہو لیکن جس عہد میں اس جدید اکتشاف و ایجاد کو حضرت نوح علیہ السلام نے دنیا میں پیش کیا تھا، یقیناً اس وقت وہ اسی قسم کی عجیب و غریب چیز تھی، جیسے ہم اس زمانے کی جدید ایجادوں کو حیرت و تعجب کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں[1]۔ کیا اس کشتی کی ایجاد کے متعلق قرآن نے دہرا دہرا کر یہ نہیں بیان کیا ہے کہ

---

[1] بلکہ اپنے ایک مضمون میں جو مجلہ دکن ۱۹۲۹ء کے صنعتی نمبر میں شائع ہوا ہے، خاکسار نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ جن ایجادی اکتشافات کے متعلق یہ سمجھا جاتا ہے کہ انسانی تاریخ میں کسی انقلابی عہد کا ان سے آغاز ہوا، اگر سوچا جائے تو ان انقلابی ایجادوں کی فہرست میں شاید نوح پیغمبر علیہ السلام کی اس ایجاد کو بھی امتیازی مقام عطا کیا جا سکتا ہے۔ سب سے پہلی بات تو حضرت نوح علیہ السلام کی اس کشتی کے متعلق یہی خیال کرنے کی ہے کہ کشتی کے لفظ سے اردو میں جو مفہوم سمجھا جاتا ہے، یقیناً حضرت نوح کی اس صنعتی ایجاد کی حیثیت اس سے مختلف تھی۔ اتنا تو قرآن سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ کوہ پیما موجوں کو چیرتی پھاڑتی یہ کشتی آگے بڑھتی چلی جاتی تھی (قرآنی الفاظ ہیں وھی تجری بھم فی موج کالجبال کشتی جا رہی تھی، کشتی والوں کو لئے ہوئے ایسے تھپیڑوں میں جو پہاڑ جیسے تھے) اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ کشتی جس کا اردو ترجمہ ناؤ کیا جاتا ہے۔ کیا اس قسم کے تھپیڑوں کو وہ برداشت کر سکتی ہے؟ پھر قرآن سے یہ جب معلوم ہوتا ہے کہ ہر قسم کے چرند، درند، پرند وغیرہ کے ایک ایک جوڑے اس میں رکھے گئے تھے۔ اس سے اس کی وسعت و گنجائش کا کچھ اندازہ ہوتا ہے، اور بائبل میں جو تفصیلات اس کشتی کے متعلق پائی جاتی ہیں، ان کے بعد تو اس کو ناؤ یا کشتی کہنے کی کوئی وجہ ہی نہیں ہو سکتی۔ توراۃ کتاب پیدائش میں ہے "تو اپنے واسطے گوپھر (ساکوان) کی لکڑی کی ایک کشتی بنا، اس کشتی میں کوٹھریاں تیار کر اور اس کے باہر اندر رال لگا، اور اس کو ایسی بنا کہ اس کی لمبائی تین سو ہاتھ اور اس کی چوڑائی پچاس ہاتھ اور اس کی اونچائی تیس ہاتھ کی ہو، اور اس کشتی میں ایک روشن دان بنا، اسے اوپر سے ہاتھ بھر چھوڑ کر تمام کر، اور کشتی کے ایک طرف دروازہ بنا، اور نیچے کا درجہ، دوسرا درجہ، تیسرا بھی بنا۔ پیدائش باب ۶۔" کیا اس کے بعد بھی کوئی شک کر سکتا ہے کہ جہاز رانی کی صنعت حضرت نوح کے ہزاروں سال بعد ایک بال بھی ترقی نہ کر سکی؟ البتہ اسٹیم اور برق کے عہد میں بلاشبہ ترقی کی دوسری (بقیہ بر صفحہ آئندہ)

"واوحینا الی نوح ان اصنع الفلک باعیننا۔ (الاعراف)"
اور ہم نے وحی کی نوح کی طرف اس بات کی کہ بنا کشتی میری نگاہوں کے سامنے۔

اور جو حال کشتیٔ نوح کا ہے، ہم قرآن ہی میں پڑھتے ہیں کہ انبیائے بنی اسرائیل کے دوسرے اولوالعزم نبی حضرت داؤد علیہ السلام کا تذکرہ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا گیا ہے،

وعلمناہ صنعۃ لبوس لکم لتحصنکم من باسکم (انبیاء)
اور سکھایا ہم نے (داؤد) کو تمہارے لئے لباس (یعنی جسم کو ڈھکنے کے لئے) زرہ بنانا، تاکہ حفاظت کرے تمہاری لڑائیوں میں۔

آج توپ اور بندوق، بلکہ بم یا اس کی مختلف جہاں گداز، عالم سوز قسموں کے مقابلے میں یقیناً اس غریب "زرہ" کی کوئی قیمت باقی نہیں رہی ہے لیکن سوچنا چاہئے اس زمانے کو سوچنا چاہئے جب اون اور بال سے ننگے جسم رکھنے والے اس نازک اندام انسان پر بارہا[1] اور دھار والے نوکیلے ہتھیاروں سے حملہ کر دیا گیا تھا

(بقیہ صفحہ گذشتہ) منزلیں اس صنعت نے طے کی ہیں۔ میں نے جیسا کہ عرض کیا کہ حضرت نوح کی یہ صنعتی ایجاد ایک ایسی ایجاد تھی جس کے بعد نسل انسانی انقلاب کے ایک جدید دور میں داخل ہوئی، یعنی آج جو دنیا کے مختلف اقلیم اور خطوں میں انسان آباد ہیں۔ اور ہر جگہ تمدن و عمران کا تلاطم برپا ہوا۔ یقیناً اس کا امکان اسی ایجاد کے بعد پیدا ہوا اور خونخوار سمندروں، وزخار دریاؤں کو پھاند پھاند کر بنی آدم کے گھرانوں کا ایک براعظم سے دوسرے براعظم کی طرف منتقل ہونے کی اس سے پہلے صورت ہی کیا تھی۔ شاذ و نادر کوئی ایک علاقے سے دوسرے علاقے کی طرف جانا بھی چاہتا تو ہفتوں بلکہ مہینوں پانی میں تیرتے رہنا کیا آسان تھا۔ اور کسی زمانے میں مان لیا جائے کہ لوگوں میں اس کی قوت بھی ہو گی۔ جب بھی اس ذریعہ سے افراد ہی ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہو سکتے تھے۔ لیکن اہل و عیال، ساز و سامان کے ساتھ خاندانوں کے منتقل ہونے کو سچ پوچھئے تو اسی وحی ایجاد نے ممکن بنا دیا۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کے جس خطے میں بھی بنی آدم آباد ہیں کسی نہ کسی شکل میں نوح کی اس ایجاد کا تذکرہ ان میں پایا جاتا ہے۔ اگرچہ امتداد زمانہ سے واقعات کے بعض اجزاء میں رد و بدل بھی ہو گیا ہے۔ بلکہ عموماً ہر ملک والوں نے اس واقعہ کا مرکز اسی علاقے کو قرار دے رکھا ہے جس میں وہ آکر مقیم ہوئے۔ ہندوستان والے ہمالہ کی بلند ترین چوٹی کو "نوبندھن" قرار دیتے ہیں۔ اور بجائے نوح کے کشتی والے کا نام منو بتاتے ہیں۔ اگرچہ یہ ہو سکتا ہے کہ منو کا یہ لفظ مہانوح (بڑے نوح) والا لفظ ہو، جیسے بعض لوگ کہتے ہیں کہ ہندوؤں میں شیو حضرت شیث کے نام کا تلفظ ہے، کیونکہ ث کا تلفظ اب بھی عربی میں بہت ہی ہلکا ہے۔ اسی طرح وشنو کے متعلق بھی بعض کہتے ہیں۔ نوح علیہ السلام کے نام کی دوسری حیثیت ہے۔ وشنو کا لفظ شاید کوئی اختراعی لفظ جیسے حضرت یا رشی وغیرہ کی قسم سے ہو۔ افسوس ہے کہ ہندوستان قدیم میں فن تاریخ سے بڑی بے اعتنائی برتی گئی۔ اس لئے عموماً اس ملک کے رجال تھوڑے دن کے بعد میتھ یعنی دیو مالا میں جا کر شریک ہو جاتے ہیں۔ مسلمانوں کے ایک بڑے عالم عبدالکریم جیلی کا تو خیال ہے کہ ہندوؤں کا برہما دراصل حضرت ابراہیم ہیں۔ واللہ اعلم بالصواب!!

[1] بائبل اور یہودی روایات میں لوہے کی ایجاد کا تعلق جو بائبل سے معلوم ہوتا ہے، وہ عجیب ہے۔ حاصل یہ ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کے فرزند ہابیل نامی کو قابیل نے مار ڈالا۔ تو اسی قابیل پر حضرت آدم نے لعنت فرمائی، اور قابیل اس علاقے سے جہاں اس زمانے میں حضرت آدم کی اولاد آباد تھی بھاگ گیا۔ بائبل میں قابیل کا تلفظ قائن لکھا ہے۔ اس کے بعد ہے کہ قائن اپنی جورو سے ہم بستر ہوا اور (بقیہ بر صفحہ آئندہ)

یقیناً اس وقت خدا کی رحمتوں میں سے ایک بڑی رحمت یہ بھی تھی کہ لوہے جیسی کرخت وسخت دھات کا اتنا نرم پڑجانا کہ تاروں کی شکل میں اس کا کھینچنا آسان ہوگیا۔ پھر ان تاروں سے چھوٹی چھوٹی کڑیوں کے بنانے پر قادر ہوجانا۔ تا این کہ انھی کے جوڑنے سے لوہے کے ایسے لباس کے تیار ہوجانے کا امکان پیدا ہوتا کہ جس طرح جسدِ انسانی پر سوتی اور اونی کپڑے چسپت ہوکر لپٹ جاتے ہیں۔ یہی کیفیت ...... اس لباس میں بھی پیدا ہوگئی۔ قرآن میں جن امور کی طرف ان الفاظ میں اشارہ کیا گیا ہے۔ یعنی

والنا له الحدید ان اعمل سابغات	اور نرم کر دیا ہم نے (داؤد) کے لئے لوہا تاکہ
وقدر فی السرد۔	بنائیں وہ (بدن پر خوب چسپت ہوکر اترجانیوالی زرہیں)
(سبا ع اپ ۲۲)	(اور سکھایا ان کو) کہ ٹھیک اندازے کے ساتھ

جوڑیں کڑیوں کو۔

قرآن کے ضمنی اشارے کی قیمت

جیسا کہ میں بار بار اس پر متنبہ کرتا چلا آرہا ہوں کہ قرآن نہ براہ راست کوئی معاشی کتاب ہے اور نہ صنعت وحرفت وایجادواکتشافات پر بحث اس کے حقیقی مقاصد میں داخل ہیں۔ لیکن ضمناً بھی قرآن میں جس چیز کا ذکر آگیا ہے، یقیناً وہ قرآن ہی کی چیز ہے۔ ہم مسلمانوں میں اپنی آسمانی کتاب کے متعلق نفاق کا وہ رویہ بحمد اللہ اب تک

(بقیہ صفحہ گذشتہ) وہ حاملہ ہوئی اور حنوک کو جنی۔ پھر حنوک کی اولاد کا تذکرہ کرتے ہوئے آگے بیان کیا گیا ہے کہ اس کی چند پشتوں کے بعد لمک نامی آدمی اس کے خاندان میں پیدا ہوا۔ لمک کے چند بیٹے ہوئے۔ ان میں سے ایک لڑکا جس کا نام یوبل تھا۔ وہ توبین اور بانسری بجانیوالوں کا باپ تھا اور لمک کا دوسرا بیٹا توبل قین تھا، جو تانبے اور لوہے کے سب باڑھ دار ہتھیاروں کا بنانیوالا تھا (پیدائش ۴) جس کے معنی یہی ہوئے کہ گانے بجانے کے آلات اور مردم کشی کے اوزار اور ہتھیاروں کی ایجاد کا کام آدم علیہ السلام کے اسی قابیل یا قائن کی نسل والوں نے انجام دیا۔ اگر اس پر غور کیا جائے کہ مشرقی ممالک (جو نسلِ انسانی کا پہلا مولد ومنشا رہے) ان سے متصل ہوکر براہِ خشکی مغربی ممالک کی طرف جانے کا راستہ جس سرحدی علاقے سے گذرتا ہے اس کا نام اس وقت تک قفقاز ہے اور اس کا جائزہ لیا جائے کہ گانے بجانے اور مردم کشی کے آلات و اوزار بنانے کی فطری صلاحیت کن اقوام میں زیادہ پائی جاتی؟ اور اس وقت بھی ان ایجادات کا سہرا کن قوموں کے سر بندھا ہوا ہے۔ تو سوال پیدا ہوسکتا ہے کہ قائن یا قابیل کی اولاد کون لوگ ہیں۔ مردم کشی کے آلات کا سب سے بڑا مظہرہ "موجودہ جنگ عظیم" میں ہوا۔ اس جنگ میں مشرقی فوجوں کے لئے گانا بجانا تک لیا گیا۔ ... نے جو خاکہ اس کے لئے پیش کیا تھا جو ۲۲ر دسمبر ۱۹۴۴ء میں وہ شائع ہوا ہے جس میں لکھا ہے کہ فوجیوں کے لئے یورپین عورتیں مہیا کی جائیں۔ ریڈیو زیادہ سے زیادہ مقدار میں فراہم کیا جائے۔ زیادہ سے زیادہ ... گانے والی ... مہیا کی جائیں ... کی زیادہ سے زیادہ تعداد ان تک پہنچائی جائے ... اور کچھ اس عجیب و غریب سوال سے، یعنی قابیل جب اس علاقے سے بھاگ گیا جہاں اس وقت نسل انسانی آباد تھی۔ تو پھر یہ جو بائبل میں ہے کہ قائن اپنی جورو سے ہمبستر ہوا۔ یہ جورو نسل انسانی کی ... کہاں تھی؟ بعض کا خیال ہے کہ جنگلوں میں بعض ایسے جانور بھی پائے جاتے ہیں جو ... انسانوں سے بہت مشابہ ہیں ... قابیل کی بیوی ... اسی قسم کے جانوروں سے ملی تھی، واللہ اعلم۔ پچھلے دنوں انسانی نسل کے رشتے کو بعض صحرائی جانوروں سے ملانے کی کوشش بیالوجی کے بعض مفکرین نے جو کی تھی ... ان جانوروں کو دیکھ کر ان کا ذہن اس مسئلہ کی طرف منتقل ہوا ... میں کوئی ... خیال کے متعلق ... بچہ پیدا ہوتا ہے، تو ... کا ذہن گھوڑے اور گدھے دونوں کی طرف منتقل ہوجاتا ہے۔ ... مختلف نسلوں ... اس قسم کے انتقال ذہنی پر تعجب نہ ہونا چاہئے ۱۲

نہیں پیدا ہوا ہے جس کا اظہار بعض دفعہ اس زمانے کے دوسرے اربابِ مذاہب اپنی ان کتابوں کے متعلق کرتے ہیں۔ جنھیں کہنے کی حد تک تو وہ بھی آسمانی اور الہامی اور خدا کی نازل کی ہوئی کتابیں کہتے ہیں، لیکن باوجود اس کے بسا اوقات ان چیزوں کے متعلق جن کا ان کی ان ہی مذہبی کتابوں میں تذکرہ کیا گیا ہے۔ ان ہی کے متعلق یہ کہہ دیتے ہیں کہ عوام کا جو خیال اور جو عقیدہ کسی چیز کے متعلق اس زمانے میں تھا۔ اسی کی رعایت کرتے ہوئے ہماری ان کتابوں میں غلط بیانی سے بھی کام لیا گیا ہے۔ لیکن ایک مسلمان ایک لمحہ کے لئے اس عقیدہ کو برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں ہو سکتا۔ خدا کی طرف غلط بیانی کے انتساب کی بھلا کیسے جرأت ہو سکتی ہے؟ پس خواہ ایسی باتیں ہوں جن کا ذکر قرآن کا اصل مقصود ہے۔ یا جن چیزوں کا ذکر قرآن میں ذیلاً یا ضمناً آ گیا ہے، چونکہ بہرحال وہ خدا ہی کا کلام ہم مسلمانوں کے نزدیک ہے۔ اس کی وقعت اور قیمت کے لحاظ سے ہم دونوں میں کوئی فرق نہیں سمجھتے۔ آج مسلمانوں کے متعلق کہنے والے خواہ کچھ ہی کہیں لیکن جب یہی قرآن شروع شروع میں نازل ہوا تھا۔ تو ہم صحابہ کو دیکھتے ہیں کہ اصلی اور حقیقی مسائل ہی نہیں، بلکہ جن امور کا ضمناً قرآن میں ذکر آ گیا تھا۔ ان کو بھی ایک واقعہ اور حقیقت تسلیم کر کے ان سے استفادہ کی کوشش کرتے تھے۔ کھلی ہوئی بات ہے کہ قرآن طب کی کوئی کتاب نہیں ہے اور نہ اس میں مادی امراض کے علاج و معالجہ کا طریقہ بتلایا گیا ہے۔ لیکن اللہ کی مختلف نشانیوں کا تذکرہ کرتے ہوئے قرآن میں النحل (شہد کی مکھی) اور اس کی جبلی خصوصیات کا بھی ذکر آ گیا ہے۔ جن میں ایک بات یہ بھی بیان کی گئی ہے کہ

یخرج من بطونہا شراب مختلف الوانہ فیہ شفاء للناس۔[1]	نکلتی ہے شکم سے ان مکھیوں کے ایک مشروب جس کے رنگ مختلف ہوتے ہیں۔ اس میں لوگوں کے لئے شفاء ہے۔
(النحل)	

---

[1] اس موقع پر مجھے اپنی وہ تقریر یاد آتی ہے جو حیدرآباد کے یونانی طبیہ کالج میں چند سال ہوئے اطبا کی ایک جماعت کے سامنے اُن کی فرمائش پر کی گئی تھی۔ اسی زمانے میں یہ تقریر اخبار صدق (لکھنؤ) اور ہمدرد صحت (دلی) وغیرہ میں شائع ہو گئی تھی۔ تقریر کا موضوع قرآن کی یہی آیت تھی۔ خاکسار نے اطبا کو خطاب کر کے آمادہ کیا تھا کہ قرآن کے اس اشارے پر اگر وہ غور کریں۔ تو ممکن ہے کہ جہاں دنیا میں چند طبی نظامات جاری ہیں۔ ان کے مقابلے میں آپ دنیا میں ایک مستقل جدید طبی نظام اس قرآنی آیت کو بنیاد بنا کر پیش کر سکتے ہیں۔ تقریر تو لمبی تھی حاصل بطور پر یہ تھا کہ یونانی طب جس میں عموماً نباتی دواؤں سے امراض کے ازالے کی کوشش کی جاتی ہے لیکن نباتاتی دواؤں کے جوہر کا حاصل کرنا آسان نہیں ہے۔ حالانکہ شفا بخشی کا سارا دار و مدار اسی پر ہے اسی لئے عموماً طبی نسخوں میں لکھا جاتا ہے کہ "کوفتہ بیختہ در آب تازہ کردہ صباح جوشانیدہ مالیدہ صاف نمودہ بالائش فلاں دوا پاشیدہ پس نبات سفید مصری آمیختہ بنوشند" کے عمل کے لئے کم از کم آٹھ تولہ منزوں سے عموماً بردہ کے استعمال میں لوگوں کو کرنا پڑتا ہے اور پھر بھی دواؤں کی کہنگی و فرسودگی اور دوسرے اسباب کی وجہ سے صحیح شفائی عناصر کا ان سے حاصل کرنا میسر نہیں ہوتا۔ میں نے عرض کیا تھا کہ بجائے اس کے اگر نباتی ادویہ کی اسی روح یا جوہر کو قرآنی اشارے سے حاصل کریں یعنی قرآن میں النحل (شہد کی مکھی) کی جو صفت ذلولیت (سدھ جانے کی صلاحیت) بیان کی گئی ہے۔ تجربہ بھی شاہد ہے کہ جس پھول کا رس چاہئے، عادی کرنے کے بعد آپ مکھیوں سے حاصل کر سکتے ہیں۔ میں نے عرض کیا کہ قرآن کے الفاظ ثم کلی من کل الثمرات (پھر کھا ہر قسم کے نباتات کے جوہر یا مکھن کو، لغت سے ثابت کیا گیا کہ ثمر کے معنی پھل کے بھی آتے ہیں اور تثمیر مثلاً دودھ سے (بقیہ بر صفحہ آئندہ)

مشہور صحابی حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے ان کے مولیٰ اور تلمیذ رشید نافع راوی ہیں کہ

ان ابن عمر ما کانت تخرج قرحة ولا شیء الا لطخ الموضع بالعسل ویقرء یخرج من بطونها شراب مختلف الوانه فیه شفاء للناس (جمع الفوائد ص ۱۳۱)

یعنی ابن عمرؓ کا قاعدہ تھا کہ ان کے جب کوئی پھوڑا یا پھنسی یا اور کچھ چیز نکل آتی تو شہد کا اس پر لیپ چڑھاتے اور قرآن کی اس آیت کو تلاوت کرتے (یعنی یخرج من بطونہا شرابٌ مختلفٌ الوانہٗ فیہ شفاءٌ للناس)

ظاہر ہے کہ "شہد میں شفابخشی" کی اس خاصیت کا اظہار قرآن میں ضمناً کیا گیا ہے۔ لیکن آپ دیکھ رہے ہیں ابن عمرؓ نے اس کو کس نقطۂ نظر سے دیکھا؛ کیا انھوں نے یہ سمجھ کر اسے قابلِ لحاظ نہ خیال کیا کہ عربوں یا عرب کی بڑی بوڑھیوں کا شہد کے متعلق چونکہ یہی خیال تھا، قرآن نے (العیاذ باللہ) اس عامی خیال کو دہرا دیا ہے۔ یقیناً انھوں نے یہ نہیں کیا، بلکہ اسے ایک واقعہ قرار دیا۔ اور اس واقعہ سے استفادے

(بقیہ صفحہ گذشتہ)

مکھی نکالنے کو بھی کہتے ہیں جس سے معلوم ہو کہ شہد کی مکھی میں قدرت نے اس کی بھی صلاحیت رکھی ہے کہ جس نباتی چیز کا چاہا جائے وہ جوہر کھینچ کر نکال کرسکتی ہے پھر جو جوہر حاصل کرکے یہ دیتی ہے۔ قرآن نے "شراب" کے لفظ سے اشارہ کیا کہ وہ ذائقۂ انسانی کے لئے مشروب ہے یعنی ایسی خوش ذائقہ شیرینی پیدا ہوجاتی ہے کہ "نبات سفید آمیخت" کی بھی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ ان امور کو پیش نظر رکھ کر اگر دوائی نباتات کی کاشت الگ الگ قطعات میں کی جائے۔ اور ہر قطعہ کے ساتھ شہد کی مکھیوں کے ایک جھنڈ کو ثمرات کشی کے لئے معین کر دیا جائے۔ اور جو جوہر حاصل کرکے یہ مکھیاں عطا کریں۔ ان کو بوتلوں میں بھر بھر کر بجائے دواؤں کے دواخانے میں رکھ لیا جائے۔ اور مریضوں کو بجائے دواؤں کے وہی شہد استعمال کرایا جائے یعنی جس مریض کے لئے ایک ہی دوا کافی ہو۔ اسے بس اسی دوا کا شہد دیا جائے، اور جسے دو دواؤں کی ضرورت ہو۔ اس کے نسخے میں دو قسم کے شہد رکھے جائیں۔ علیٰ ہذا القیاس) جیسے مفردات سے آج کل نسخے تیار کئے جاتے ہیں بجائے دوائی مفردات کے نسخے ان مختلف دواؤں کے شہد سے مرتب کرکے مریضوں کو دیا جائے۔ یہ نئی نباتی قدرتی دوا مصنوعی ترکیبوں سے تیار کی ہوئی دواؤں سے یقیناً زیادہ مفید اور بہتر ہوں گی۔ اور سہولت یہ ہوگی کہ ... بقدر ضرورت صرف شہد لینے کی ضرورت ہوگی۔ اور چند شہدوں کا آمیزہ مریض کی دوا بن جائے گا، نہ کوٹنے کی ضرورت نہ چھاننے کی۔ میں نے علاج کے اس قرآنی نظام کے متعلق تجویز کیا تھا کہ اس کا "عسلی نظام" نام رکھا جائے۔ ہمارا فائدہ اس میں صرف اس قدر ہے کہ قرآنی الفاظ "فیہ شفاء للناس" ایک کلیہ بن جائے گا۔ اور مطلب یہ ہوگا کہ ہر مرض کے لئے اس مرض کے مناسب ... باعث شفا ہوگا۔ قرآن میں "مختلف الوانہ" کے الفاظ ہیں۔ یعنی شہد کی مختلف قسموں کے رنگ بھی مختلف ہوتے ہیں ... آج کل علاج شمسی کا ایک طریقہ دنیا میں مروج ہے، جس میں مختلف رنگ کی بوتلوں میں صرف پانی بھر بھر کر دھوپ میں لوگ رکھ دیتے ہیں۔ اور جس مرض کے لئے جس رنگ کی بوتل کا پانی مختص ہے۔ وہی استعمال کراتے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ قرآن کے ... رنگ کی ... تاثیری قوت کی طرف اشارہ ہو۔ گویا شہد کے مختلف رنگوں کو دیکھ کر مختلف امراض ... جا سکتا ہے۔ شہد میں اشیاء کے مزاج کی حفاظت کا بھی جو قدرتی خاصہ ہے اس سے بھی آپ کام لے سکتے ہیں ۱۲

کی وہ کوشش بھی کرتے تھے۔

بہرحال [illegible] انسانی تاریخ میں انقلابی ایجادات کی حیثیت حاصل ہے۔ کم ازکم یہ تو ماننا ہی پڑے گا کہ ہزاروں برس تک ان ایجادوں نے بنی آدم کی مشکلات زندگی میں آسانیاں پیدا کیں۔ جب قرآن ان [illegible] اولوالعزم پیغمبروں کی طرف منسوب کرتا ہے۔ تو اس سے اگر یہ نتیجہ پیدا کیا جائے کہ ضروریاتِ زندگی میں جن اختراعات اور ایجادوں سے آسانیاں فراہم ہوتی ہوں، ان سے لوگوں کو روشناس کرانے کی کوشش گویا ایک طرح سے پیغمبروں کا کام ہے۔ تو جو کچھ قرآن میں ہے اور قرآن نے جن الفاظ میں اس کو بیان کیا ہے۔ اس کے لحاظ سے کیا یہ۔۔۔۔ ایسی بات ہوگی، جسے خواہ مخواہ سمجھا جائے۔ کہ قرآن کی طرف زبردستی منسوب کیا جارہا ہے۔

ایجادات کے غلط استعمال کی وجہ سے خود ایجادات کی مخالفت صحیح نہیں ہے

مجھے حیرت ہوتی ہے کہ بعض لوگ جو اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں اور قرآن کو خدا کا کلام تسلیم کرتے ہیں۔ یہی حضرات محض اس لئے کہ آج یورپ والے اپنی بعض جدید ایجادوں سے غلط استعمال لے رہے ہیں۔ بجائے استعمال کی تصحیح کے سرے سے ایجادات واختراعات کے رجحان ہی کو دنیا سے مٹا دینا چاہتے ہیں اور دینی چیز جسے قرآن میں قرآن نازل کرنے والے خدا نے جلیل القدر پیغمبروں، بلکہ خدا نے اپنی تعلیم ووحی کی طرف منسوب کیا ہے۔ اسی کو علانیہ انسانیت کے لئے لعنت قرار دینے سے نہیں جھجکتے۔ اور تماشا یہ ہے کہ اہلیوں کا ایک گروہ ان لوگوں کے ان ارتجاعی خیالات کو مذہب کی طرف منسوب کرتا ہے۔ وہ خود باور کئے بیٹھے ہیں اور دوسروں کو باور کراتے پھرتے ہیں۔ کہ یہ ساری تنگ خیالیاں دنیا میں جو آج پائی جاتی ہیں، ان کا ذمہ دار مذہب ہے۔ میں ان حالات کو دیکھتا ہوں اور کہتا ہوں کہ ان لوگوں کی منطق وہی ہے کہ لڑتا تو انسان تھا۔ لیکن اتفاقاً یہی جنگ جب مذہبی طبقات میں چھڑ گئی۔ تو لوگوں نے ان لڑائیوں کی ذمہ داری بجائے انسانوں کے اس مذہب کے سر تھوپ دی۔ جو اتفاقاً ان لڑنے والوں کا مذہب تھا اس میں شک نہیں کہ ایجادات واختراعات کے خلاف بعض قلوب میں خصوصاً یورپ کے مسلسل غلط استعمال کی وجہ سے جو گرانیاں پیدا ہو گئی ہیں، ان میں اکثر مذہبی ہی لوگ ہیں۔ لیکن ان گرانیوں کے متعلق یہ خیال کہ انہیں مذہب نے پیدا کیا ہے۔ کم ازکم اسلام اور قرآن جس مذہب کو پیش کرتا ہے۔ اس کے لحاظ سے تو قطعاً غلط ہے۔ آخر تاریخ کی ایسی ہمہ گیر ایجادیں۔ جیسی کہ جہاز رانی، اور زرہ بافی کی صنعتیں ہیں۔ قرآن جب ان کو پیغمبروں کا کام بتاتا ہے۔ تو اب آپ ہی بتائیے کہ ایجادی صناعات اور اکتشافی کوششوں کی بلندی کے لئے اب اس سے بھی زیادہ بلند چیز اور کیا پیش کی جاسکتی ہے[1]

---

[1] اس موقع پر بے ساختہ حکیم الامت مرحوم حضرت مولینا اشرف علی تھانوی قدس اللہ سرہٗ العزیز کا وہ لطیفہ یاد آجاتا ہے یعنی دارالعلوم دیوبند سے حضرت کے پاس ایک زمانے میں یہ شکایت پہنچی کہ وہاں چوری کے کچھ واقعات پیش آئے ہیں۔ اور لوگ بعض طلبہ کو اس سے متہم کرتے ہیں۔ حضرت والا نے یہ سن کر فرمایا کہ بھائی طلبہ اور وہ بھی دینی (بقیہ برصفحہ آئندہ)

اب میں کہنے والوں کو کیا کہوں، دوسروں کی زبانوں کو کون روک سکتا ہے، ورنہ سچ یہ ہے کہ خود مبلغِ قرآن صلی اللہ علیہ وسلم نے جو نمونے اور اپنے جس اسوۂ حسنہ کو اس باب میں چھوڑا ہے میں نہیں سمجھتا کہ لوگ اس کا کیا جواب دے سکتے ہیں۔

جدید صنعتوں کے متعلق پیغمبرانہ نمونے

کون نہیں جانتا کہ جب مدینہ منورہ پر عرب کے جاہلی قبائل ایک کمان بن کر یہودی سرمایہ کے زور سے حملہ آور ہوئے، تاریخ میں جس واقعہ کی تعبیر غزوۃ الاحزاب یا جنگ خندق سے کی گئی ہے، اس موقعہ پر پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے سلمان فارسی کے اشارے سے مدافعت کے اس جدید طریقے کو بہ کشادہ پیشانی اختیار فرمایا جس سے عرب قطعًا ناواقف تھا، میری مراد خندق سے ہے، جو مدینہ منورہ کے اطراف میں کھودی گئی تھی، جسے دیکھ کر ابوسفیان (سپہ سالارِ قریش) نے کہا تھا۔

واللہ ھذہ مکیدۃ ما کانت العرب تکیدھا۔	قسم خدا کی اس گھات کو (اپنی جنگوں میں) عرب نے کبھی اختیار نہیں کیا تھا۔

لیکن یہ جاہلی ذہنیت تھی کہ نئی چیز کو دیکھ کر گو، اس طریقے سے اس پر اعتراض کیا گیا۔ لیکن اسلام نے جس نمونے کو اس سلسلے میں پیش کیا وہ یہی تھا کہ خود اسلام کے پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) اپنے صحابیوں کے ساتھ ایک عجمی طریقہ

(بقیہ صفحہ گزشتہ)
اسلامی علوم کے طلبہ تو کبھی چور نہیں ہوسکتے، ہاں یہ ممکن ہے کہ بعض چوروں نے طالب العلمی شروع کی ہو۔ اور یہ فعل ان ہی لوگوں کا ہوسکتا ہے۔ بعینہ یہی بات ان معاملات میں صادق آتی ہے۔ یعنی جنگ یا لڑائی مذہبی لوگ نہیں کرتے۔ بلکہ جنگ و جدال کرنے والے کبھی مذہبی بن کر لڑائی کرتے ہیں۔ یا تنگ خیال، رجعت پسند بھی مذہب والے نہیں ہوتے، بلکہ تنگ خیال یا رجعی خیالات رکھنے والے اتفاقًا اگر کسی مذہب کے بھی پابند ہوتے ہیں۔ تو بے وقوفی سے لوگ ان کے خیالات و جذبات کو مذہب کی طرف منسوب کردیتے ہیں، بس واقعہ یہی ہے کہ گو قرآن کی بحث کا حقیقی موضوع جیسا کہ اپنے مقام پر ثابت ہوچکا ہے۔ اور فقیر نے بھی اپنی متعدد کتابوں اور مقالوں میں بیان کیا ہے کہ اس کی بحث کا حقیقی موضوع تو انسان ہے۔ انسان کیسے بنتا اور بگڑتا ہے۔ بنتے ہوئے وہ اتنی بلندی حاصل کرلیتا ہے کہ ملائکہ سے بھی اونچا ہوجاتا ہے۔ اور بگڑتے ہوئے، وہ اتنا بگڑتا ہے کہ الانعام (چوپایوں سے) بھی بدتر ہوجاتا ہے۔ اصل مقصود تو قرآن کا اسی مسئلہ کو سلجھانا ہے لیکن ضمنًا اس سلسلہ میں وہ دوسری باتوں کا بھی ذکر [illegible] کسی [illegible] حیثیت [illegible] کی بحث کے حقیقی موضوع سے تعلق ہوتا ہے۔ اب ان ضمنی [illegible] کے متعلق [illegible] قرآن [illegible] ۔ شکایت کرتے ہوئے مذہبی کتابوں میں [illegible] خلاف [illegible] امور کا بھی تذکرہ کردیا جاتا ہے جیسا جنت اور دوزخ کے متعلق اس قسم کے خیالات پھیلاتے ہیں کہ حور و قصور جنات وانہار کا ہو ذکر قرآن میں کیا جاتا ہے [illegible] جنت کو ان امور کی حقیقت؟ پھر روحانی وغیرہ الفاظ جن معانی کا کوئی معین خیال خود بولنے والوں کے دماغ میں بھی نہیں ہوتا۔ بجز جنت دوزخ کی وہ تشریح کرتے ہیں جس کے دوسرے معنی یہی ہوتے کہ قرآن نے گویا (العیاذ باللہ) غلط بیانی سے کام لیا ایسی غلط بیانی جس کی وجہ سے لاکھوں انسان دھوکے میں مبتلا ہوگئے، ایک طرف تو افراط کا یہ حال ہے، دوسری طرف تفریط کی کیفیت یہ ہے کہ بعض لوگ اپنی آسمانی اور مذہبی کتابوں کے مبہم الفاظ سے ان امور کو بھی ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں جو جدید ترقیات و ایجادات وغیرہ سے متعلق ہیں۔ ان سب کا تذکرہ ہماری ان کتابوں میں موجود ہے۔ بہترین مثال اس تفریط کی ہمارے زمانے میں دیانند سرسوتی نے اپنی مشہور کتاب ستیارتھ پرکاش میں پیش کی ہے۔ انھوں نے ثابت کیا ہے کہ توپ، بندوق، ہوائی جہاز، ریل، انجن وغیرہ وغیرہ ان ساری چیزوں کا ذکر ہمارے وید میں موجود ہے لیکن صحیح راہ نہ وہ ہے اور نہ یہ ہے ۱۲

مدافعت کو اختیار کرنے میں مشغول ہیں، سب کے ہاتھ میں پھاوڑے ہیں اور سب کے ساتھ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم بھی خندق سے مٹی کھود کھود کر باہر پھینک رہے ہیں۔ بخاری میں براءبن عازب صحابی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے وہ فرماتے تھے۔

رأيت النبي صلى الله عليه وسلم ينقل معنا التراب۔ دیکھا ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہمارے ساتھ مٹی ڈھوتے تھے۔

غیر اقوام کی مفید صنعتوں کے سیکھنے پر پیغمبرؐ اور صحابہؓ کا اجماع

بلا شبہ خندق کے اس واقعہ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ غیر قوم ہی کا کوئی طریقہ کیوں نہ ہو لیکن اس میں اگر فائدے کا کوئی پہلو ہے، تو مسلمانوں کو اس کے اختیار کرنے میں قطعی پس و پیش کرنے کی ضرورت نہیں، کیونکہ پیغمبر نے خود اپنے عمل اور اپنے صحابیوں کے اجماع سے اس کی سنت قائم فرمادی ہے۔

آج اپنے عہدِ انحطاط و زوال میں مسلمانوں کے سامنے سے پیغمبر کی یہ سنت تو نکل گئی، اور یاد رہی بھی تو وہ روایت جس کی صحت میں بھی لوگوں کو کلام ہے۔ یعنی

من تشبه بقوم فهو منهم[۱] اور جو کسی قوم کے جیسا بننے کی کوشش کریگا وہ ان ہی میں سے ہے۔

اور اس بنیاد پر مسلمانوں میں ایک طبقہ پیدا ہو گیا ہے، جو مسلمانوں کو ہر ایسی چیز کے اختیار کرنے سے روکتا ہے۔ جس کا دنیا کی کسی غیر مسلم قوم سے تعلق ہے، مگر ان ہی سے میں پوچھتا ہوں کہ اس حدیث کا اگر وہی مطلب ہے

---

[۱] روایت چونکہ ابوداؤد کی ہے، اس لئے جیسا کہ سیوطی وغیرہ نے لکھا ہے کہ اسکی سند پر غالب ہو اگرچہ مقاصد حسنہ میں سخاوی نے اسکو بھی جگہ دی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ سخاوی کے خیال میں یہ روایت چنداں قابل عتاب نہیں ہے، بہر حال مان بھی لیا جائے کہ پیغمبر کا قول ہے لیکن اس کا مطلب کیا ہے؟ میں تو یہی سمجھتا ہوں کہ کسی نفع وغیرہ سے بے پروا ہو کر محض اس لئے کہ کسی کی ادا پسند آ جائے۔ اور زبردستی اس کی ریس میں اسی ادا کو اختیار کرنا تشبہ کا صحیح مطلب عربی زبان کے محاورہ کی رو سے ہو سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ کیفیت اسی شخص پر طاری ہو سکتی ہے۔ جو اس شخص یا اس قوم سے مرعوب و مغلوب ہو گیا ہو، جس کی بلا وجہ نقل اس لئے کرے کہ فلاں آدمی یا فلاں قوم کا یہ طریقہ ہے۔ اس لئے ریس کی ہو ایسی صورت میں تو یہ تقرب بلکہ قلبی تقرب کی دلیل ہو جاتا ہے یہی وجہ ہے۔ اگر یہ حدیث نہ بھی ہوتی جب بھی قرآنی آیت ومن يتولهم منكم فانه منهم اور یہود و نصاریٰ سے دوستی کرتا ہے وہ انہی میں سے ہے۔ اس کا نتیجہ وہی ہے جو حدیث کا مفہوم ہے۔ لیکن کسی فائدے کی بنیاد پر کسی قوم یا اس کے عمل یا صنعت کو اختیار کرنا جس کا نام ہے اس کو تشبہ سے دور کا بھی علاقہ نہیں۔ مثلاً تاہم اس کو یوں سمجھئے ہندوستان جیسے گرم ملک کا ایک آدمی اس بات کو استعمال کرتا ہے جو گٹھنے تک جس میں تھوڑی دیر کے بعد ہی پاؤں میں بدبو کی ایسی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے کہ جب جوتے سے پاؤں نکالا جاتا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کہیں مرا ہوا چوہا پڑا ہے، بجز اس بات کے کہ جو لوگ یورپ والوں سے مرعوب ہیں، اور ان کی ہر ادا ان کو محبوب ہو گئی ہے۔ وہی اس قسم کے احمقانہ فعل کا ارتکاب کر سکتے ہیں، اور اس کو اگر تشبہ قرار دیا جائے تو یہ صحیح ہوگا۔ لیکن مغربی اقوام کی میکانیکی وصنعتی ایجادات واکتشافات کو سیکھنا، ان کے معاشی و عمرانی علوم کو پڑھ کر ان سے استفادہ کرنا، اسے جو تشبہ قرار دے گا۔ وہ دیوانہ نہیں تو اور کیا ہے ۱۲

جو آپ لوگ بھیجا کرتے ہیں۔ تو یہ خبر سے نبیوں کے اس کیفیت، کو کیوں اختیار فرمایا۔ اور کیا یہ ایک ہی شہادت ہے۔ فتح خیبر کے واقعات پڑھیے۔ ان ہی میں ایک واقعہ آپ کو یہ بھی ملے گا کہ صعب نامی قلعہ پر جب مسلمانوں کا قبضہ ہوا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس قلعہ کے تہ خانوں کی تلاشی کا حکم دیا تو لکھا ہے

یہود خیبر کے پاس رومی دبابے

فوجدوا فی ھذا الحصن الذی ھو حصن الصعب آلة حرب ودبابات ومنجنیق۔ (سیرت محمدیہ)

مسلمانوں نے اس قلعہ میں یعنی صعب نامی قلعہ میں جنگ کے بعض آلات پائے اور دبابے و منجنیق بھی اس میں ہاتھ لگیں۔

یعنی "دبابات" اور "منجنیق" جو قلعہ کشائی کے رومی آلات تھے، یہودیوں نے رومیوں سے ان کی صنعت سیکھی تھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے جب یہ جدید آلات حرب پیش ہوئے۔ تو کیا یہ قرار دے کر کہ کافر رومیوں و یہودیوں کے یہ آلات حرب ہیں، آپ نے ان کو پھینک دینے کا حکم دیا؟ فتح خیبر ہی کے سلسلہ میں بیان کیا جاتا ہے کہ دو قلعے وطیح اور سلالم چودہ دن کے محاصرے کے بعد بھی جب فتح نہ ہوئے تو لکھا ہے

ھم علیہ السلام ان یجعل علی من فیھما المجنیق۔ (کتاب مذکور)

ارادہ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ جو لوگ اس قلعہ میں تھے ان پر منجنیق لگا دی جائے۔

اگرچہ اس کی نوبت نہ آئی، اور دونوں قلعے یوں ہی فتح ہو گئے، پھر خیبر کے بعد طائف کے محاصرے میں بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے رومیوں کے ان آلات حرب سے کام لیا جو عربوں اور مسلمانوں کے لئے ایک جدید چیز تھی۔ بلکہ بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ طائف پر جو دبابہ استعمال کیا گیا تھا۔ اسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خود ہی بنوایا تھا تاریخ کے الفاظ یہ ہیں

رومی دبابہ رسول اللہ صلعم نے خود بنوایا تھا!

اول دبابة صنعت فی الاسلام دبابة صنعت علی الطائف حین حاصرھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ (الکتانی ص ۲۷۵)

سب سے پہلا دبابہ جو اسلام میں بنایا گیا، وہ وہی دبابہ تھا جو طائف پر لگانے کے لئے بنایا تھا جس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے طائف کا محاصرہ فرمایا تھا۔

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ طائف کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود ہی دبابے تیار کرائے تھے۔[1] اسی طائف کے محاصرے میں منجنیق کو بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے استعمال فرمایا تھا۔ کتانی ہی نے لکھا ہے۔

اول من رمی بالمنجنیق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اھل الطائف دخل نفر من اصحاب رسول اللہ

سب سے پہلے منجنیق کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے استعمال فرمایا طائف والوں پر، صورت یوں ہوئی، کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چند

---

[1] طبقات ابن سعد وغیرہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جرش نامی شہر اس زمانے میں دبابات اور منجنیق وعرادات کی صنعت میں مشہور تھا عروہ بن مسعود ثقفی اور محمود بن غیلان جو مشہور صحابیوں میں ہیں۔ ان حضرات نے جرش جا کر ان آلات کے بنانے کا طریقہ سیکھا تھا۔ طبقات ص ۲۲۱ وفد ثقیف ج ۲۔ جرش کہاں ہے؟ بعض اسے یمن کا ایک شہر بتاتے ہیں۔ اور بعض کہتے ہیں کہ شرق اردن کا کوئی شہر تھا ۱۲

صلی اللہ علیہ وسلم تحت دبابۃ ثم زحفوا الی جدار الطائف لیحرقوہ (الکتانی ص ۳۷۵)	صحابی دبابے میں داخل ہو کر طائف کی فصیل تک پہنچے۔ تاکہ اس کے دروازے میں آگ لگا دیں۔

دیکھ رہے ہیں آپ، عجمیوں کی مدافعت کا بھی ایک طریقہ خندق اور رومیوں کے اقدام کے جو مخصوص ذرائع (دبابات و منجنیق وغیرہ تھے) سننے اور دیکھنے کے ساتھ ہی پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اس کو اختیار فرما لیتے ہیں اور ان سے کام لیتے ہیں۔ لیکن پچھلے دنوں یورپ نے جو جدید آلات حرب ایجاد کئے، مسلمان اور مسلمانوں کی حکومتیں انھیں دیکھتی اور دیکھتی رہیں۔ سیکھنے اور اخذ کرنے کی توفیق کسی کو نہیں ہوئی۔ اس کا خمیازہ دنیا میں جو کچھ بھگتنا پڑا وہ تو خیر ہم بھگت ہی رہے ہیں۔ میں تو کہتا ہوں کہ آخرت میں بھی اپنے پیغمبر کو ہم مسلمان کیا منہ دکھائیں گے؟ اور لطف یہ ہے کہ نقصان پہنچ رہا ہے ہی، شماتت کرنے والے شماتت کرتے ہوئے عموماً اس کا الزام مسلمانوں کے مذہب کی طرف عائد کرتے ہیں، حالانکہ جو کچھ ہوا، مذہب کی وجہ سے ہوا، یا مذہب سے بعد ان نتائج کا ذمہ دار ہے؟

عجمی لباس اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم

اور کیا اس باب میں نمونے محض حربی مکائد و آلات ہی تک محدود ہیں۔ شلوار جسے عربی میں سراویل کہتے ہیں، ظاہر ہے کہ اس کا تعلق لباس ہی سے ہے۔ اب سنئے محدثین کیا کہتے ہیں، پوری تفصیل تو کتابوں میں پڑھیے، خلاصہ یہ ہے کہ عرب میں عام دستور لنگی (ازار) باندھنے کا تھا۔ لیکن ایرانی شلوار (سراویل) استعمال کرتے تھے۔ اتفاقاً بعض عربی تاجر ایران سے عرب سراویل لائے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر مبارک جب اس ایرانی لباس پر پڑی تو آپؐ نے اسے خرید لیا۔ ابوہریرہؓ جو اس واقعہ کے راوی ہیں، ان کا بیان ہے کہ یہ دیکھ کر میں نے عرض کیا۔

یا رسول اللہ وانک لتلبس السراویل؟	یا رسول اللہ کیا آپ شلوار پہنیں گے؟

جواب میں ارشاد ہوا،

اجل! فی السفر والحضر واللیل والنہار[1]	ہاں! میں سفر میں حضر میں دن میں رات میں ہر حال میں اس کو پہنوں گا۔

اور ایسا کیوں کروں گا، اس کی وجہ اسی کے بعد خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بیان فرمائی کہ

فانی امرت بالستر فلم اجد شیئا استر منہ (جمع الفوائد عن اصحاب السنن و الموصلی)	کیونکہ مجھے حکم دیا گیا ہے ستر پوشی کا، اور اس سے زیادہ ستر پوش لباس نہیں پاتا۔

یعنی وہی بات کہ نفع کا پہلو کسی چیز میں اگر پایا جا رہا ہو، تو محض اس لئے کہ کسی دوسری قوم کی طرف وہ منسوب ہے، اسے چھوڑنا تمدنی کی بات ہے، نقصان اس میں دو مہر والوں کا نہیں، خود اپنا ہے۔

مسجدوں کے ممبر کی تاریخ

اور مسلمانوں کو شاید یہ معلوم نہیں ہے کہ آج مسجدوں میں ہر محراب کے بازو میں جو ممبر نظر آتا ہے، یہ ممبر ان کی مسجدوں میں کہاں سے آیا ہے۔ ممکن ہے کہ اس واقعہ کے اظہار سے بعض حلقوں میں میری طرف سے کچھ بدگمانی پیدا ہو۔ لیکن ان چیزوں کو جب چھپایا جائے گا جب لوگ ...

---

[1] دوسری روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ سراویل کو گو رسول اللہ نے خرید لیا تھا لیکن پہننے کا موقع نہ ملا، اور رفیق اعلیٰ سے جا ملے ۱۲

قرار دیتے ہوئے خود پیغمبر نے آگ کے لگام کی دھمکی دی ہے[۱] اور ان ہی دھمکیوں کا نتیجہ تھا کہ مرتے مرتے بھی صحابہؓ جو کچھ جانتے تھے اسے پہنچاتے چلے جاتے تھے۔

اتنا تو غالباً سب ہی جانتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جمعہ کا خطبہ پہلے اس مشہور تاریخی ستون سے ٹیک لگا کر دیا کرتے تھے جس کا نام ستون حنانہ ہے۔ لیکن کھڑے ہو کر خطبہ دینے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب کچھ زحمت محسوس فرمانے لگے تو جیسا کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا بیان ہے یعنی وہ فرماتے ہیں کہ

كان رسول الله صلى الله عليه وسلم يخطب يوم الجمعة الى جذع في المسجد قائما فقال ان القيام قد شق علي فقال له تميم الداري الا اعمل لك منبرا كما رأيت بالشام فشاور المسلمين في ذلك فرأوا ان يتخذوه۔

(الکتانی بحوالہ ابن سعد ج ا ص ۲۸)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جمعہ کے دن ایک تھم سے لگ کر جو مسجد میں تھا خطبہ کھڑے ہو کر ارشاد فرماتے تھے۔ پھر آپ نے فرمایا کہ کھڑے ہونے میں مجھے گرانی محسوس ہوتی ہے۔ تب تمیم داری نے عرض کیا کہ کیا آپ کے لئے ہم ممبر نہ بنائیں، جیسا کہ میں نے شام میں دیکھا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابیوں سے مشورہ کیا، رائے یہی طے ہوئی کہ ممبر بنایا جائے۔

اور اس حد تک تو روایت گو نہ ابھی مبہم ہے۔ الکتانی ہی نے قلقشندی کے حوالے سے جو یہ فقرہ نقل کیا ہے کہ

اول من عمل المنبر تميم الداري عمله للنبي صلى الله عليه وسلم وكان قد رأى منابر الكنائس بالشام۔

(الکتانی صفحہ مذکور)

سب سے پہلے ممبر جس شخص نے بنایا، تمیم داری ہیں، انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے بنایا تھا اور شام کے گرجوں میں تمیم داری نے ممبروں کو دیکھا تھا۔

جس سے معلوم ہو کہ شامی عیسائیوں کے گرجوں میں تمیم داری نے اس ممبر کو دیکھا تھا اور یہ کوئی تعجب کی بات بھی نہیں جبکہ ہمیں معلوم ہے کہ حضرت تمیم داری رضی اللہ عنہ پہلے نصرانی تھے۔ ان کا آنا جانا بہ سلسلہ تجارت عیسائی ممالک میں ہوتا تھا بہرحال کچھ بھی ہو، مؤرخین کا یہ بیان اگر صحیح ہے اور نہ صحیح ہونے کی کوئی وجہ نہیں، تو حاصل اس کا اس کے سوا اور کیا ہوا کہ مسلمانوں کی مسجدوں میں آج خطیب جس ممبر پر بیٹھ کر جمعہ کا خطبہ دیا کرتے ہیں، یہ عیسائیوں کے گرجوں کی چیز ہے، جسے حضرت تمیم داری کے مشورے سے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی مسجد میں داخل کیا، اور اس پر بیٹھ کر آپ نے خطبہ ارشاد فرمایا، ظاہر ہے کہ خطبہ بالکلیہ ایک دینی کام ہے، لیکن اس دینی کام کے انجام دینے میں ممبر سے چونکہ آسانی میسر آتی تھی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے اختیار کرنے میں بھی کوئی مضائقہ محسوس نہیں فرمایا۔

مسجد نبوی میں کرسی [illegible] عہد نبوت کے بعد اس کا سراغ نہیں ملتا، لیکن صحیح مسلم اور نسائی میں جو یہ روایت پائی جاتی ہے [illegible]

---

[۱] مشہور حدیث ہے [illegible] قیامت کے دن آگ کی لگام اُسکے منہ پر چڑھائی جائے گی۔

انتهيت الى النبي صلى الله عليه وسلم وهو يخطب فقلت يا رسول الله رجل غريب يسأل عن دينه لا يدري ما دينه قال فاقبل على رسول الله صلى الله عليه وسلم وترك خطبته حتى انتهى الى فاتى بكرسي حسبت قوائمه حديدا قال فقعد عليه رسول الله صلى الله عليه وسلم وجعل يعلمني مما علمه الله الحديث

میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچا اس وقت آپ خطبہ ارشاد فرما رہے تھے، میں نے عرض کیا کہ ایک مسافر ہے اپنے دین کے متعلق دریافت کرنے کے لئے حاضر ہوا ہے، وہ نہیں جانتا کہ اس کا دین کیا ہے، ابو رفاعہؓ کہتے ہیں کہ یہ سن کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میری طرف متوجہ ہوئے اور خطبہ ترک فرما دیا (غالباً جمعہ وغیرہ کا نہ تھا) اور میرے پاس تشریف لائے۔ پھر کرسی لائی گئی، میں خیال کرتا ہوں کہ اس کرسی کے پائے لوہے کے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس پر بیٹھے اور جو باتیں اللہ نے آپ کو بتائی تھیں مجھے سکھانے لگے۔

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ممبر کے ساتھ مسجد نبوی میں کرسی بھی لاکر رکھی جاتی تھی۔ اور خود سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم اس پر تشریف فرما ہو کر تعلیم دیا کرتے تھے[1]۔

---

[1] واقعہ یہ ہے کہ دین نام اس چیز کا ہے جس کے اجزاء و عناصر کے ساتھ حق تعالیٰ کی رضامندی و نارضامندی کا تعلق ہو۔ ظاہر ہے کہ کسی قول و فعل یا عقیدہ وغیرہ کے متعلق یہ حکم لگانا کہ حق تعالیٰ کی مرضی کے مطابق ہے یا نہیں۔ اس کا علم خدا ہی سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔ ورنہ اپنے جی سے کسی چیز کے متعلق یہ حکم لگانا کہ خدا اس سے خوش ہوتا ہے یا ناخوش ہوتا ہے کھلی ہوئی بات ہے کہ خدا پر یہ جھوٹ باندھنا ہے یعنی عربی میں جسے "افتراء علی اللہ" کہتے ہیں قرآن میں ایک سے زیادہ مقامات پر اعلان کیا گیا ہے کہ "من اظلم ممن افترى على الله كذبا" (یعنی اس سے بڑا ظالم کون ہے جو اللہ پر جھوٹ باندھے) سچ پوچھئے تو بدعت اسی کا نام ہے یعنی اپنے جی سے کسی عمل یا فعل کے متعلق لوگ یہ خیال قائم کر لیتے ہیں کہ اس کے کرنے پر ثواب ہوگا۔ نہ کرنے پر گناہ ہوگا۔ جو کھلا ہوا افتراء علی اللہ ہے لیکن کسی نئے یا جدید کام کا اس طور پر اختیار کرنا جس کا تعلق نہ ثواب سے سمجھا جائے، نہ عذاب سے محض نئے ہونے کی وجہ سے اس کو بدعت قرار دینا غلط ہے۔ اسی کے ساتھ یہ بھی سمجھ لینا چاہیئے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو دین کا جو دستور سپرد کیا ہے اسکے مد مستقل دو قسم کی چیزیں ہیں بعض چیزیں تو ایسی ہیں جن کے مقاصد و اغراض کی تصریح کے ساتھ ان کی ظاہری شکل و صورت بھی مقرر کر دی گئی ہے مثلاً نماز کا جو حال ہے کہ ہر رکعت میں ایک رکوع دو سجدے مقرر کر دیئے گئے ہیں۔ اب جائز نہیں ہے کہ کوئی اپنی طرف سے بجائے دو سجدوں کے ایک سجدے کا رکعت میں اضافہ کر کے اسے تین سجدے بنا دے لیکن اسی کے مقابلے میں بعض مطالبات شریعت کے ایسے ہیں کہ ان کی کوئی خاص صورت معین نہیں کی گئی ہے، بلکہ آزادی بخشی گئی ہے کہ جس شکل میں مسلمان چاہیں اس مطالبہ کی تکمیل کریں۔ مثلاً جہاد کا حکم ہے کہ مقصود کلمۃ اللہ کا بلند کرنا اور کفر کی شوکت کا زور توڑنا ہے کسی زمانہ میں تیر اور نیزے سے اس مقصد کو حاصل کیا جاتا تھا۔ پھر جب بندوق کا زمانہ آیا ہے تو یقیناً مسلمانوں کا فرض ہے کہ اس مقصد جہاد کی تکمیل اسی شکل میں کریں جو اس زمانہ کا اقتضاء ہے۔ بحمد اللہ مسلمانوں کے ختم ہونے پر یہ نکات ہمیشہ صحیح رہے ہیں، دوسری قوموں کو تعجب ہوتا ہے کہ ایک طرف تو مسلمانوں میں تقاضہ پایا جاتا ہے کہ اپنے مذہب کے ایک ایک نقطہ پر اصرار کرتے ہیں لیکن اسی کے ساتھ ہر زمانے میں خصوصاً جب تک انحطاط کا عارضہ اس قوم کو لاحق نہ ہوا تھا پوری فیاضی کے ساتھ دنیا کی قوموں کے طور و طریقہ کو زندگی کے ہر شعبے میں یہ جذب کرتے چلے گئے ہیں۔ ان لوگوں کو مسلمانوں کا صحیح نقطہ نظر معلوم نہیں ہے۔ ورنہ ان کے اس متضاد طرز عمل پر تعجب نہ ہوتا ۱۲

اور اس سلسلے میں نظائر و امثال کی جو کثرت ہے اسے میں کہاں تک بیان کروں، کون نہیں جانتا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں تنگ آستینوں کا جبہ جسے رومی جبہ کہتے تھے ہدیۃً پیش ہوا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے محض اس لئے کہ وہ رومی (یعنی یورپ) کی طرف منسوب ہے زیب تن فرمانے سے انکار نہیں کیا، بلکہ اس کو پہن کر بسا اوقات آپ نماز پڑھتے تھے جس کا ذکر صحاح کی کتابوں میں عموماً کیا گیا ہے، مقوقس شاہِ مصر نے خدمتِ والا میں ایک بلوری پیالہ بھی تحفۃً* ارسال کیا تھا، لکھا ہے

فکان یشرب منہ (مواہب لدنیہ) اس پیالے میں رسول اللہ پیا کرتے تھے۔

انگریزی دوا اور مسلمان

لیکن آج ان بزرگوں کو کون سمجھا سکتا ہے کہ بعض دواؤں کے استعمال سے وہ محض اس لئے گریز کرتے ہیں کہ لوگ انھیں "انگریزی دوا" کہتے ہیں، یہ صحیح ہے کہ کسی انگریزی دوا میں اگر کوئی ایسی چیز شریک ہوا جس کا استعمال اسلام میں ممنوع[لہ] ہے، مثلاً شراب وغیرہ تو یہ دوسری بات ہے لیکن محض انگریز کی طرف کسی دوا کا منسوب ہوجانا، میں نہیں جانتا کہ یہ احتراز کی وجہ کیا ہوسکتی ہے۔ یقیناً دواؤں کا پیدا کرنے والے خود حضرت حق سبحانہ وتعالیٰ ہیں شفا بخشی کی اگر ان میں خاصیت ہے، تو یہ خاصیت بھی خدا ہی کی بخشی ہوئی ہے۔ اب فرض کیجئے کہ بجائے کسی مسلمان کے کسی دوا کی خاصیت کسی غیر مسلم نے اگر دریافت کی ہے۔ تو محض دریافت کرنے کی وجہ سے، کیا وہ دوا اس کی ہوجائے گی۔ خدا کی دوا باقی نہ رہے گی؟ ہم تو صحیح بخاری میں پڑھتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کو یہ حکم دیتے تھے کہ

علیکم بھذا العود الھندی[ٹہ] اس ہندی لکڑی کو اختیار کرو۔

ظاہر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جس زمانے میں اس دوا کو ہند کی طرف منسوب کرکے الہندی فرمایا کرتے تھے، یہ زمانہ ہندوستان کا وہ تھا جس میں کفر و بت پرستی، شرک کی تاریکیوں کے سوا اس ملک میں اور کچھ نہ تھا، یہ کسی غیر اسلامی ملک یا قوم کی طرف منسوب ہوجانے ہی کی وجہ سے کسی دوا کا استعمال اگر قابلِ احتراز ہوجاتا، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الہندی کی تصریح کے ساتھ اس کے استعمال پر لوگوں کو آمادہ کیوں فرماتے تھے؟

واقعہ تو یہ ہے کہ الاوائل کے علوم[سے] و فنون کو الاواخر تک پہنچاتے ہیں، یعنی مسلمانوں سے پہلے دنیا کی جس قوم

لہ بدل جب تک مل سکتا ہو، اُس وقت تک حرام چیزوں کا دوا کا استعمال بھی جائز نہیں ہے، یہ صرف امام ابو حنیفہ کا فتویٰ ہے، ورنہ ان کے سوا دوسرے ائمہ حتیٰ کہ خود امام صاحب کے تلامذہ امام محمدؒ وغیرہ کا فتویٰ یہی ہے کہ بدل ملے یا نہ ملے دوا کے لئے ان چیزوں کا استعمال جائز ہوجاتا ہے۔ حدیث صحیح میں جس کا استعمال مسلمانوں پر حرام کیا گیا ہے لیکن انگوری شراب کے سوا شراب کی دوسری قسموں کے متعلق امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے مسلک میں جو وسعت پائی جاتی ہے، اہل علم کے لئے ابتلاء کے موجودہ زمانے میں قابلِ غور ہے ۱۲

ٹہ عود ہندی ایک قسم کی لکڑی تھی جو ہندوستان سے عرب درآمد ہوتی تھی اس لئے اس کو عود ہندی کہتے تھے، نام اس کا قسط بتایا جاتا ہے اب بھی مختلف امراض میں اسے مفید بتاتے ہیں، حدیث میں یہی ہے کہ سات بیماریوں میں یہ مفید ہے۔ [illegible] سات کا عدد مخصوص نہیں ہے، بلکہ بہت سی بیماریوں میں ان کے مفید ہونے کے اظہار کا یہ ایک طریقہ ہے جو عربی محاورے پر مبنی ہے۔ سے سلامی مستقیمین ۱۲

* مقوقس کی یہ [illegible] آنحضرت صلعم کے [illegible] کو [illegible] تھا اسی کے مقابلہ میں [illegible] ہوتے تھے لیکن زمانے نے یہ رخ بدل دیا۔ [illegible] ۱۲

او رجس ملک میں بھی علم و دانش کا جو سرمایہ جمع ہو چکا تھا، اس سرمایہ کے اکثر و بیشتر حصہ پر قابو حاصل کر کے اور جس حد تک ان سے اپنے عہد میں ممکن تھا، ان میں اضافہ کر کے پچھلی نسلوں تک ان کو پہنچانے میں مسلمانوں نے جو درمیانی واسطہ کا کام انجام دیا ہے، خواہ احسان فراموشوں کی جماعتیں اس کا اقرار کریں یا نہ کریں، لیکن یقیناً یہ ایک واقعہ ہے اور کوئی وجہ نہیں کہ اس واقعہ کے وقوع میں اگر یہ سمجھا جائے کہ بہت بڑا دخل ان ہی پیغمبرانہ حوصلہ افزائیوں کو ہے، جن کا اظہار اپنے قول و فعل سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے رہتے تھے۔ تو اس کے انکار کی کوئی وجہ نہیں ہو سکتی۔ الکتانی نے عزبن عبدالسلام الامام کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ عرب جس کمان کو استعمال کرتے تھے، نسبتاً وہ ہلکی اور ان کی زد بھی زیادہ کارگر نہیں ہوتی تھی، بخلاف اس کے ایرانیوں کی کمان ہر لحاظ سے عربی کمانوں سے بہتر ہوتی تھی لکھا ہے کہ

عربی کمانوں پر ایرانی کمانوں کو ترجیح دی گئی

مدح قسی العجم وقال هم اقوی منکم رمیه۔	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہی ایرانی کمانوں کی تعریف فرمائی۔ اور فرمایا کہ تیر پھینکنے میں وہ زیادہ زوردار ہیں۔
(الکتانی ص ۸۰، ج ۱)	

یہی وجہ ہے کہ عربی کمانوں کو چھوڑ کر مسلمانوں نے ایرانی کمانوں ہی کو اختیار کر لیا۔

تاریخوں میں لکھا ہے کہ مصر کی مہم پر صدیق اکبر رضی اللہ عنہ جب خالد بن ولید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو روانہ فرمانے لگے تو وداعی خطبہ اس وقت فوج کے سامنے آپ نے جو دیا تھا، اس کا ایک فقرہ یہ بھی تھا

السہم بالسہم والرمح بالرمح والسیف بالسیف (الکتانی ص ۳۷۰، ج ۱)	تیر کا مقابلہ تیر سے، نیزے کا نیزے سے، تلوار کا تلوار سے۔

جس کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ ہر وقت اور ہر ملک و مقام کے لحاظ سے جو چیزیں بھی مسلمانوں کو ان امور میں بہتر نظر آئیں، انہیں اختیار کریں۔ یقیناً حضرت ابوبکرؓ کے اس خطبہ کی بنا پر آج مسلمانوں کو یہ خطبہ دینے والا کہ "توپ کے مقابلہ میں توپ، ہوائی جہاز کے مقابلہ میں ہوائی جہاز استعمال کرو۔" بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر اسی بنیاد پر یہ کہنا بھی اسی سنتِ صدیقیؓ کو زندہ کرنا ہوگا کہ سائنس کے مقابلے میں سائنس، کیمیا کے مقابلے میں کیمیا، ایجادات کے مقابلے میں ایجادات الغرض مقابل کی طرف سے جو چیز بھی سامنے آئے، چاہیئے کہ مسلمان بھی اسی طریقے کو سیکھیں، اور اسی سے اس کا جواب دیں، واللہ اعلم تاریخوں کی یہ روایت کہاں تک صحیح ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بعض فوجیوں نے شکایت کی کہ ریشمین لباسوں میں دشمنوں کو دیکھ کر ہمارے دل مرعوب ہوتے ہیں، باوجودیکہ عام حالات میں مسلمان مردوں کو ریشمین لباس کے استعمال کرنے کی ممانعت ہے۔ لیکن لکھا ہے کہ اس شکایت کو سن کر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان فوجیوں سے فرمایا

وانتم تلبسوا کما لبسوا (الکتانی جلد ۱ ص ۳۷۰)	تم بھی ویسا ہی پہنا کرو جو وہ پہنتے ہیں۔

فقہ حنفی تک میں یہ جزئیہ موجود ہے کہ جنگ کے موقع پر اگر ضرورت ہو تو فوجیوں کے لئے ریشمی کپڑوں کا استعمال جائز ہے غالباً اس کی بنیاد حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہی مشورہ ہے۔

الکتانی نے شاید مرجانی ایک تاتاری مؤرخ اور عالم کے حوالے سے یہ بات جو نقل کی ہے کہ

عہدِ عثمانی میں ہوائی پن چکیاں مدینہ میں

ان الرحی الهوائیة والریاح ... المدینة المنورة فی زمن	ہوائی چکیاں جو ہواؤں سے چلائی جاتی ہیں جو مختلف صنعتوں میں ...

المتعددة وكان ذلك في سنة ۲۹ بعد الهجرة في خلافة عثمانؓ (ص ٦٦ ج ٢)	کماتی رہتی ہیں ۲۹ھ میں حضرت عثمانؓ کی خلافت کے زمانے میں مدینہ میں قائم ہوگئی تھیں۔

ممکن ہے کہ بعضوں کو اس میں کچھ شبہ ہو، لیکن "نبوتِ کبریٰ" نے عرب کی سرزمین میں جو بیداری پیدا کی تھی اس کو سامنے رکھتے ہوئے میرے نزدیک تو "پون چکی" کا عہدِ عثمانی ہی میں مدینہ منورہ کے اندر مروج ہو جانا کچھ بعید نہیں ہے۔ بلکہ پھر مجھے یہ بات دہرانی پڑتی ہے کہ قرآن اگرچہ ایجادات و اکتشافات و صنعت و حرفت کی سکھانے والی یا نوامیسِ فطرت اور اس کے امکانات پر بحث کرنے والی کتاب نہیں ہے۔ اس کا ایک معین مقصد اس "الصراط المستقیم" کی طرف انسانیت کی راہنمائی ہے جس پر چلنے والوں کے ساتھ حق تعالیٰ اپنی انعامی نسبت قائم فرما دیتے ہیں مسلمانوں سے نمازوں میں پانچوں وقت اسی ہدایت اور راہنمائی کی دعا کرائی جاتی ہے۔ اور قرآن کے کسی حصے کو سنا کر امام اس کا جواب خدا کی طرف سے لوگوں کو سناتا ہے[1]۔ لیکن ضمناً جن امور کا ذکر قرآن میں کیا گیا ہے، چونکہ وہ بھی خدا ہی کا بیان ہے۔ اس لئے یقیناً وہ بھی کوئی واقعہ ہی ہوتا ہے۔ اب آپ دیکھئے حضرت سلیمان علیہ السلام کے متعلق متعدد مقامات پر قرآن کا یہ بیان کہ "ہم نے ہوا کو سلیمانؑ کے لئے مسخر کر دیا تھا" اور اس طور پر ہوا ان کے قابو میں آگئی تھی کہ

تجري بامره رخاء حيث اصاب (ص)	چلتی تھی ہو دھیرے دھیرے حضرت سلیمانؑ کے حکم سے جدھر وہ چاہتے تھے

ہوائی قوت کی طرف قرآن کا ایک اشارہ | پھر دوسری جگہ سورۃ الانبیاء میں ہے۔

ولسليمان الريح عاصفة تجري بامره۔	اور قابو میں کر دی گئی ہوا سلیمانؑ کے جو تیز و تند ہو کر چلتی تھی سلیمانؑ کے حکم سے۔

بظاہر جس سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت سلیمانؑ کے زیرِ اقتدار ہوا کچھ اس قدر آگئی تھی کہ جس رفتار سے چاہتے اسے چلا سکتے تھے۔ تیز کرنے کی ضرورت ہوتی تو تیز بھی کر سکتے تھے، "عاصفۃ" کے لفظ کا یہی اقتضاء ہے۔ اسی طرح موقعہ ہوتا تو اس کی رفتار کو دھیمی بھی کر دیتے تھے۔ "رخاء" کے لفظ سے یہی سمجھا جاتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ہوا پر حضرت سلیمان کو یہ اقتدار کسی معجزاتی رنگ میں بخشا گیا ہو، عام خیال یہی ہے۔ لیکن معجزاتی رنگ ہو یا یہ سمجھا جائے کہ ہوا کا کوئی قانون حضرتؑ کی گرفت میں آگیا تھا۔ بہرحال جب ہوا ان کے قابو میں آگئی تھی، تو اس واقعہ کا وقوع بہرحال

---

[1] اس مسئلہ کی تفصیل میری دوسری کتابوں میں پڑھنا چاہئے خلاصہ یہی کہ عمومی اصول کے لحاظ سے تو القرآن سے پوری کتاب کا نام ہے جس میں قرآن کی دوسری سورتوں کے ساتھ سورۂ فاتحہ بھی شریک ہے لیکن خود قرآن میں سورۂ فاتحہ کو السبع المثانی کے نام سے موسوم کرکے "القرآن العظیم" کا ذکر اس کے مقابلے میں کیا گیا ہے گویا اس لحاظ سے سورۂ فاتحہ اور "القرآن العظیم" دو الگ الگ چیزیں ہو جاتی ہیں یعنی ہیں تو دونوں ہی وحی اور حق سبحانہ و تعالیٰ کے الفاظ لیکن مقصد سورۂ فاتحہ کا یہ ہے کہ بندے اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کی ہوئی اس درخواست کو خدا کے دربار میں پیش کریں۔ اسی درخواست کا جواب ان کو "القرآن العظیم" کی شکل میں دیا جائے گا۔ نماز دراصل اسی درخواست اور اس درخواست کے جواب کے پڑھنے کی ایک ضابطہ شکل ہے، امام عام مقتدیوں کی طرف سے دربارِ الٰہی میں درخواست کو پیش کرتا ہے لوگ آمین کہتے ہوئے گویا اپنے دستخط ثبت کرتے ہیں۔ پھر امام اس کے بعد خدا کی نمائندگی کرتے ہوئے قرآن کا کوئی حصہ سناتا ہے یعنی درخواست پیش کی تھی اس کا یہ جواب ہے ۱۲

کسی شکل ہی میں ہوا ہوگا، آپ ذریعۂ علم میں اختلاف کر سکتے ہیں۔ یعنی الہام سے یہ علم ان کو حاصل ہوا تھا، یا عقل و فکر کا یہ نتیجہ تھا۔ لیکن ہوا کے کسی خاص قانون کا علم جس کے بعد اس سے اپنی مرضی کے مطابق کام لینا آسان ہو جائے اس کے انکار کی تو کوئی وجہ نہیں ہو سکتی۔ اور جاننے والے جانتے ہیں کہ عام طور پر علم کے جس سلسلے کو لوگ عقل و فکر کی طرف منسوب کرتے ہیں، یہ علم بھی وہیں سے آتا ہے جو الہامی علوم کا سرچشمہ ہے۔ قرآن تقویٰ کے ساتھ فجور کے متعلق بھی جب خبر دیتا ہے کہ

فالھمھا فجورھا وتقواھا۔ پھر الہام کیا اللہ تعالیٰ نے نفس انسانی

میں اس کے فجور کو اور اس کے تقویٰ کو۔

تو جو چیزیں فجور نہیں ہیں، الہام کی طرف منسوب کرنے میں اس کے متعلق آخر کیا مضائقہ ہو سکتا ہے۔ بہرحال بات خواہ مخواہ طویل ہو گئی۔ میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے ساتھ خواہ کوئی صورت بھی پیش آئی ہو لیکن قرآن کے اس اشارے سے اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح آج دنیا پر اسٹیم، پٹرول یا برق وغیرہ کی قوتوں کا راز واضح ہوا ہے، اگر توجہ کی جائے تو طاقت کا ایک بڑا ذخیرہ ہوا میں بھی ایسا مل سکتا ہے کہ اس کو قابو میں لانے کے بعد آدمی اپنی مرضی کے مطابق اس سے کام لے سکتا ہے۔ آج نہیں تو ہو سکتا ہے کہ دنیا پر کل ہوا کے اس قانون کا راز واضح ہو۔ کیا عجب ہے کہ اس راز کے طشت از بام ہونے کے بعد وہ ساری قوتیں جن پر آج دنیا کو ناز ہے۔ وہ ہوا ہو جائیں، کیونکہ جتنی آسانی کے ساتھ ہر جگہ ہوا آدمی کو میسر آتی ہے اتنی سہولت کے ساتھ نہ پٹرول ہی ہر جگہ مل سکتا ہے اور نہ اسٹیم اور نہ برقی قوتوں کو اس آسانی کے ساتھ ہم فراہم کر سکتے ہیں۔ میرے نزدیک تو قرآن کے اس اشارے میں ارباب فکر کے لئے ایک "پیغام" ہے۔ چاہیں تو قوت کے ایک نامعلوم ذخیرے کی سراغ رسانی کا اسے ذریعہ بنا سکتے ہیں، کیونکہ اس کو تو میں مسخر سمجھتا ہوں۔ جیسا کہ پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ یورپ و امریکہ سے جہاں کوئی جدید چیز ایجاد ہو کر دنیا کے بازاروں میں پہنچی تو ایک طریقہ جاری ہو گیا ہے کہ بعض لوگ اپنی پرانی کتابوں کو بغلوں میں لئے یہ کہتے ہوئے دوڑتے ہیں کہ آج سے ہزاروں سال پیشتر یہ چیز ہمارے یہاں بھی موجود تھی، کچھ لغت کے دور از کار اشاروں، کچھ اپنی ذہنی زور آزمائیوں سے مدد لے کر چاہتے ہیں کہ توڑ مروڑ کر اپنے اس مقصد کو کسی نہ کسی طرح ثابت ہی کر دیں، میرے نزدیک "پدرم سلطان بود" کے بے جا اور جھوٹے فخر کے سوا یہ اور کچھ نہیں ہے۔ لیکن اس کے ساتھ تورات و انجیل کے مغربی مفسرین نے جو یہ رویہ اختیار کر رکھا ہے کہ خدا کی طرف منسوب کرنے کے باوجود ان کتابوں کے بیانات کی وقعت ان کی نگاہوں میں بوڑھیوں کی کہانیوں سے زیادہ باقی نہیں رہی ہے۔ عام طور پر "مصلحت عام" کی رعایت قرار دے کر ان حقیقتوں کا صاف انکار کر دیتے ہیں، جو تورات و انجیل کے صریح الفاظ سے ثابت ہوتے ہیں خدا کا جو وزن ان کے قلوب سے نکل گیا ہے، سچ پوچھئے تو یہ اسی کا نتیجہ ہے۔ لیکن قرآن کو قرآن کے الفاظ کو ہم مسلمان خدا کی کتاب، خدا کے الفاظ سمجھتے ہیں۔ خود ضمناً ہی کسی چیز کا اس میں ذکر کیوں نہ کیا گیا ہو لیکن جب قرآن میں یہ ذکر آیا ہے تو یقین کرنا چاہئے کہ وہ اپنے اندر کوئی خاص معنویت رکھتا ہے۔ آج نہیں تو دنیا پر کل اس کی اصلیت واضح ہوگی۔ میں نے مثلاً آپ کے سامنے چند چیزیں پیش کی ہیں، اور میں چاہتا ہوں کہ قرآن پڑھنے والوں کے سامنے قرآنی معارف میں کا یہ پہلو بھی رہے تو اچھا ہے۔ خدا اور خدا کا کلام اس کا مستحق ہے کہ ہم اس کو اسی نظر سے دیکھیں، اور اس کی اہمیت کو محسوس کریں واللہ یقول الحق وھو یھدی السبیل۔

خالص دینی امور کے معاشی نتائج

میں اپنی اصلی بحث سے ایک حد تک کچھ دور پڑ گیا۔ چند مفید معلومات تھے، جی راضی نہ ہوا کہ مسلمانوں تک انھیں نہ پہنچایا جائے۔ بہرحال اب میں پھر اصل گفتگو کی طرف واپس ہوتا ہوں یہ کہہ رہا تھا کہ عام طور پر جن چیزوں کو لوگ خالص دنیاوی کاروبار اور معاشی جدوجہد کے ذیل میں شمار کرتے ہیں یعنی استعمار ارض، کھیتی، باغبانی، تعمیر وغیرہ۔ اسلام نے ان امور کو بھی دینی نتائج کے پیدا کرنے کا ذریعہ قرار دیا ہے میں نے کہا تھا کہ دین کو آباد کرنے کے لئے اسلام دنیا کے آباد کرنے کا مطالبہ کرتا ہے۔ اس سلسلے میں مجھے جو کچھ عرض کرنا تھا عرض کر چکا۔ اب اسی کا دوسرا رخ، یعنی اسلامی تعلیمات کے جن عناصر کے متعلق خیال کیا جاتا ہے کہ وہ خالص دینی امور اور مذہبی عناصر ہیں، اگر غور کیا جائے تو نظر آئے گا کہ اخروی منافع و ثمرات کے ساتھ ساتھ اسلام نے ان کو دنیوی اور معاشی کامیابیوں کا بھی وسیلہ قرار دیا ہے۔

ایک مغالطہ کا ازالہ

میں جو کچھ کہنا چاہتا ہوں اس کی تفصیل سے پہلے کسی کو اس مغالطہ میں نہ مبتلا ہونا چاہیئے کہ شاید میرا اشارہ اسلام کے خدائی فوجداروں کے ان فیلسوفانہ تاویلوں کی طرف ہے، جن کی تعبیر اس زمانہ میں عموماً "فلاسفی"[۱] کے لفظ سے کی جاتی ہے، اور اسی بنیاد پر نماز کی فلاسفی، روزے کی فلاسفی، حج کی فلاسفی، "و خدا جانے کن کن چیزوں کی فلاسفیوں پر پہلے تو کانفرنس کے اسٹیج اور جلسوں کی پنڈال ہی میں دھواں دھار تقریریں ہوتی تھیں، لیکن بہ تدریج اب بڑھتے ہوئے جبہ و دستار اور منبر و محراب سے بھی یا حسرتا کہ ان ہی فلاسفیوں کی آواز بازگشت آرہی ہے "الآخرت" کا یقین جن سے چھین لیا گیا تھا، اگر "الدین" کو بھی وہ "الدنیا" بنانے پر مجبور ہوں جن نتائج کا وعدہ "الآخرت" میں کیا گیا ہے، اگر "الاولیٰ" اور اسی "الحیوۃ الدنیا" میں ان کی نگاہیں آج ان ہی نتائج کو ڈھونڈھ رہی ہیں۔ تو ظاہر ہے کہ ان کے "مبلغ علم" کا یہ لازمی نتیجہ ہے۔ ذکر اللہ جو اقامت "صلوٰۃ" کا قرآنی مقصد ہے۔ جو اس ذکر اللہ کے فوائد سے اندھا بنایا جا چکا ہے۔ بتایا جائے کہ وہ بیچارہ نماز کے قیام و قعود میں گرانی معدہ کی خفت کو اگر تلاش نہ کرے تو اور کیا کرے جس کے لئے "تقویٰ"، "شکر" کے الفاظ بے معنی ہو چکے ہیں۔ وہ روزے کو جسمانی صحت کی ایک طبی تدبیر اگر قرار دے رہا ہے تو بتایا جائے کہ آخر اس کے لئے چارہ کار ہی کیا ہے؟ جس کی تنگ نگاہ میں موجودہ زندگی کی تنگیوں سے زیادہ انسانی حیات کی کوئی اور شکل سما نہیں سکتی، وہ مسلمان ہونے کے دعویٰ کو آخر کس طرح نباہے گا جب تک کہ ان ساری چیزوں کو جن کا حوالہ اخروی دور وجود میں دیا گیا ہے، انھیں کسی نہ کسی صورت سے اس زندگی میں ڈھونڈھ کر نکال لے۔ "الدین" کو بھی "الدنیا" یا "آسمان" کو بھی جو "زمین" اس لئے بنا رہا ہے کہ اس کا دل اسی "الحیوۃ الدنیا" سے راضی ہو چکا ہے، موت کے بعد اپنے آگے وہ کچھ نہیں پاتا یا کچھ نہیں پانا چاہتا۔ اس کوتاہ قسمت حرمان نصیب بیچارے کو تو خیر معذور بھی قرار دیا جا سکتا ہے لیکن دین کے منادیوں، "الآخرت" کے داعیوں کو دیکھ کر تعجب ہوتا ہے جب وہ بھی عصری ماحول سے متاثر ہو کر اسلام کے خالص روحانی عنصر، دینی ارکان کی فلاسفی بیان کرنے کے لئے بے چین نظر آتے ہیں۔

اسلامی عبادات کی فلاسفی

مجھے اس سے انکار نہیں ہے کہ نماز، روزہ، حج و زکوٰۃ وغیرہ عبادتوں کے جو فوائد فلاسفی کے

---

[۱] فلاسفی کے لفظ پر حضرت حکیم الامت کا فقرہ [illegible] کسی تقریب میں ارشاد ہوا کہ پرانے مدرسوں میں ہم نے فلسفہ کا نام سنا تھا، اب [illegible] میں فلاسفی کا چرچا جب سنتے ہیں تو خیال [illegible] کہ فلسفہ تو "فلاسفی" کا مادہ کیا پیدا ہو رہی ہے ۱۲

نام سے آج بیان کئے جارہے ہیں، وہ ان عبادتوں پر مرتب نہیں ہوتے یا نہیں ہوسکتے، اگرچہ سچ یہ ہے کہ کسی کو ورزش ہی کرنا اگر مقصود ہو، تو نماز کی چند ہلکی ہلکی اٹھک بیٹھک سے غالباً اس کے لئے زیادہ بہتر ہوگا کہ وہ ڈنٹر پیلے، مگدر ہلائے، ڈمبل کا کام کرے۔ یا طبی اغراض سے جو روزے کو استعمال کرنا چاہتا ہے، اس کے لئے مناسب ہوگا کہ فاقہ کی ان صورتوں کو اختیار کرے جن کے درمیان میں بعض چیزوں کے پینے اور استعمال کرنے کا مشورہ اطباء دیتے ہیں، مثلاً بیچ بیچ میں نمک آلودہ پانی کے چند گھونٹ بھی پیتا چلا جائے، پھلوں کا رس بھی کبھی کبھی نوش جان کرے، اس کے لئے دینی اوقات کی پابندی فضول ہے۔ سحری اور افطار کے قیود سے ممکن ہے کہ ان جسمانی منافع سے محروم رہے جو طبی مشوروں کے فاقے سے آدمی حاصل کرسکتا ہے۔

مگر بالفرض اگر اسلامی عبادات پر یہ فوائد مرتب بھی ہوتے ہوں، جب بھی ان فوائد کو ان عبادتوں کا ذاتی مقصود قرار دینا، صرف یہی نہیں کہ توجیہ القول بما لا یرضیٰ بہ قائلہ ہے۔ یعنی قائل کے قول کی ایسی توجیہ ہے، جس سے قائل خود راضی نہیں ہے۔ قرآن اور شارع علیہ الصلوٰۃ والسلام نے جو مقاصد اُن کے بیان کئے ہیں یہ اس کے خلاف ہے اور اسی لئے میرے نزدیک تو ایک حد تک اس قسم کی توجیہیں افتراء علی اللہ وعلی الرسول کے حدود تک پہنچ جاتی ہیں۔ یہ خدا پر اور اس کے رسول پر جھوٹ کے انتساب کی بے جا جرأت ہے۔

مولانا تھانویؒ کا ایک لطیفہ

یوں بھی بقول حضرت حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ ان فلاسفیوں کی ایسی مثال ہے کہ عرقِ گلاب کا استعمال کوئی یہ بتائے کہ اس سے استنجا کیا جاسکتا ہے، اپنی مائیت اور سیالیت کی وجہ سے ظاہر ہے کہ جو عرقِ گلاب سے آبدست کا کام لے گا۔ بلاشبہ اس کی نجاست کا تنقیہ ہوجائے گا، لیکن کیا عرقِ گلاب کا یہ صحیح استعمال اور اس کی یہ صحیح قیمت ہے۔ آم کی گٹھلی بونے والے سے اگر پوچھا جائے کہ تم اسے کیوں بو رہے ہو، کیا یہ جواب اس کا صحیح ہوگا کہ پتوں اور لکڑیوں کے لئے بو رہا ہوں تاکہ ایندھن میں وہ کام آئے، واقعہ یہ ہے کہ جو بھی آم کے درخت لگاتا ہے۔ اس کا اصلی مقصد تو آم کے پھل ہی ہوتے ہیں۔ ضمناً اور ذیلی لکڑی اور پتوں کا نفع بھی خود بخود حاصل ہوجاتا ہے۔ مولانا المعنویؒ فرماتے ہیں ؎

ہر کہ کارد قصد گندم بایدش　　　کاہ خود اندر تبع می آیدش

گیہوں کی کاشت کرنے والوں کا اصل مقصود تو گیہوں ہی ہوتا ہے۔ گھاس پھونس تو ذیلی نتیجہ ہے جو گیہوں کے کے طفیل میں حاصل ہی ہوجاتا ہے۔ یوں ہی اسلامی عبادات کی اصلی غرض تو وہی ہے جو قرآن و حدیث میں مذکور ہے مثلاً نماز کے مقاصد کو بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا گیا ہے

اقم الصلوٰۃ لذکری (طٰہٰ)　　　قائم کر نماز میری یاد کے لئے۔

روزے کو فرض قرار دیتے ہوئے لعلکم تتقون تاکہ تم تقویٰ حاصل کرو، لعلکم تشکرون تاکہ تم شکر کرو، ارشاد ہوتا ہے الیٰ غیر ذلک من الامور۔ پھر ہوسکتا ہے کہ ان اغراض کے ساتھ ساتھ ذیلی طور پر کسی کو وہ منافع بھی حاصل ہوجاتے جنھیں آج ان عبادات کی توجیہ میں پیش کیا جارہا ہے۔

بہرحال اسلام نے خالص دینی و مذہبی عناصر مثلاً ایمان و یقین، توبہ و استغفار، صلوٰۃ و زکوٰۃ، حج و صوم، وغیرہ وغیرہ کے متعلق یہ جو یہ دعویٰ کیا ہے کہ ان خالص دینی چیزوں سے بھی دنیوی فوائد اور ان مذہبی ارکان سے بھی

معاشی منافع حاصل کرنے کا ایک پہلو اسلام میں پایا جاتا ہے۔ اس سے میری غرض وہ نہیں ہے جسے اپنی طرف سے اسلام کے نادان دوست چست گواہوں کی شکل میں نمودار ہو کر اپنے نزدیک گویا ایک قسم کے ضعف اور سستی کا ازالہ اسلامی تعلیمات سے کر رہے ہیں۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا، میرے نزدیک اس سے اسلام کی بنیاد استوار و چست نہیں بلکہ کمزور اور سست ہوتی جا رہی ہے، آخر جب انہی اغراض کو آدمی دوسرے بہتر طریقوں سے زیادہ بہتر شکلوں میں حاصل کر سکتا ہے، جب وہ محلہ کی کمیٹیوں سے نماز کی جماعت کا، اور سالانہ کانفرنسوں سے عید و بقر عید کی نمازوں کا نفع حاصل کر سکتا ہے۔ تو خواہ مخواہ ایک جدید عصری شکل کو چھوڑ کر ان ہی دینی اغراض کے لئے ان فرسودہ پرانی شکلوں کے اختیار کرنے پر کیوں اصرار کرتے گا جب عالمگیر موتمر کا انعقاد جنیوا اور کشمیر کے سبزہ زاروں اور مرغزاروں میں ممکن ہے تو اسی کانفرنس کو وہ حجاز کے تپتے ہوئے ریگستان اور چٹیل میدان میں منعقد کر کے شرکا کی راہوں میں رکاوٹ، اُن کے آرام میں خواہ مخواہ خلل کیوں پیدا کرے گا۔

بہر حال میں جو کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ وہ کوئی میری ذاتی رائے یا میرے دماغ کا کوئی خود تراشیدہ نتیجہ نہیں ہے۔ بلکہ اسی کو اور صرف اسی کو پیش کر دینا چاہتا ہوں جس کی اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے خود واضح الفاظ میں تشریح کی ہے۔ اس باب میں قرآنی آیات کا جو ذخیرہ ہے، سب کا نقل کرنا تو مشکل ہے مثلاً چند مشہور آیتوں کا تذکرہ کر کے پوچھنا چاہتا ہوں کہ جو چیزیں اسلام کی خالص دینی عنصر شمار ہوتی ہیں، کیا ان آیتوں میں اُن ہی کو معاشی فوائد اور دنیوی منافع کے حاصل کرنے کا ذریعہ نہیں قرار دیا گیا ہے، مثلاً ارشاد ہوتا ہے

آسمان و زمین کی برکتیں اور ایمان و تقویٰ

ولو ان اھل القری آمنوا واتقوا لفتحنا علیھم برکات من السماء والارض (الاعراف ۹/۱۱)

اور یقیناً بستیوں والے اگر مان لیں اور پارسائی اختیار کریں، تو ضرور ہم کھول دیں اُن پر برکتوں کو آسمان سے اور زمین سے۔

جس کا بغیر کسی تاویل و توجیہ کے صریح مطلب یہی ہے کہ آسمان و زمین کی برکتیں جو ہمارے معاشی فوائد ہی کی دوسری تعبیر ہے، ہم ان کو ایمان و تقویٰ کی قوت سے بھی حاصل کر سکتے ہیں، ان برکات سے انسانی زندگی کتنی شگفتہ صاف و پاک، ستھری ہو جاتی ہے۔ قرآن کی اصطلاح میں جس کا نام "حیاتِ طیبہ" ہے۔ وعدہ کیا جاتا ہے، ہر مرد اور عورت کو مخاطب کر کے کہ

من عمل صالحًا من ذکر او انثیٰ وھو مؤمن فلنحیینہ حیوۃ طیبۃ۔ (النحل ۱۴/۱۴)

جو کوئی نیک کام کرے مرد ہو یا عورت بجز یکہ وہ ایمان دار ہو، تو ضرور ہم اسے جیتا رکھیں گے ستھری زندگی کے ساتھ۔

"فلنحیینہ" کے لفظ میں لام اور مشدد نون سے وعدے میں جتنی وثوقی طاقت بھری گئی ہے، اس کا اندازہ وہی کر سکتے ہیں جو عربی زبان جانتے ہیں، صاف صاف کھلے کھلے الفاظ میں اس وثیقہ کا اعلان کیا جاتا ہے کہ

مشکل کشائی تقویٰ سے

من یتق اللہ یجعل لہ مخرجا ویرزقہ من حیث لا یحتسب۔ (الطلاق ۲۸)

اللہ سے جو ڈرا (گناہوں سے) بچے گا بنا دیگا اللہ اس کے لئے نکلنے کی راہ اور روزی پہنچائے گا اسے ایسی جگہ سے جہاں سے اسے امید نہ ہو۔

کش مکشِ حیات کی دشواریوں کو "تقوی" سے حل کیا جا سکتا ہے۔ اور ایسی روزی یا رزق جس کے ذرائع کا پہلے سے سان و گمان بھی نہ ہو، الغرض قرآن کی ایسی آیتیں مثلاً

انا لننصر رسلنا والذین آمنوا فی الحیٰوة الدنیا ویوم یقوم الاشہاد۔
(مومن ع ۵)

ہم قطعاً مدد کرتے ہیں اپنے رسولوں کی۔ اور ایمان والوں کی اس حیات دُنیا میں، اور اس دن بھی جب گواہیاں قائم ہوں گی۔

یا

ان الذین قالوا ربنا اللہ ثم استقاموا تتنزل علیہم الملائکۃ الا تخافوا ولا تحزنوا نحن اولیاؤکم فی الحیٰوة الدنیا وفی الآخرۃ۔
(حم سجدہ)

یقیناً جن لوگوں نے یہ کہا کہ ہمارا رب اللہ ہے پھر اس پر ڈٹ گئے۔ اترتے ہیں اُن پر فرشتے یہ کہہ کر کہ نہ ڈرو، اور نہ کڑھو، ہم تمہارے یار و پشت پناہ ہیں دنیا کی زندگی میں بھی اور الآخرۃ میں بھی۔

یا پیغمبروں کو جب اہلِ کفر نے وطن سے باہر کر دینے کی دھمکی دی، تو قرآن میں ہے کہ

ایمان والوں کو زمین پر کفر والوں کے مقابلے میں بسایا جائے گا

فاوحی الیہم ربہم لنہلکن الظالمین ولنسکننکم الارض من بعدہم ذلک لمن خاف مقامی وخاف وعید۔ (ابراہیم)

پس پیغمبروں پر اُن کے خدا نے وحی کی کہ ہم ظلم کرنے والوں کو قطعاً برباد کر دیں گے۔ اور ضرور بسائیں گے ہم تمہیں زمین میں اُن کے نیست و نابود ہونے کے بعد یہ (وعدہ) ان کے لئے ہے جو میرے مقام سے ڈرا اور ڈرا میری دھمکی سے۔

ظاہر ہے جس زمین (الارض) کے متعلق پیغمبروں پر خُدا نے وحی کی وہ اس دُنیا ہی کی زندگی والی زمین تو ہے۔ اعلان کیا گیا ہے کہ حق تعالیٰ کے مقام اور خُدا کی دھمکیوں سے جو بھی ڈرے گا۔ اسی کو زمین میں بسایا جائے گا۔ مشہور آیت استخلاف میں بھی جنت ہی نہیں زمین میں بھی تمکن کا وعدہ ایمان والوں سے کیا گیا ہے۔ بشرطیکہ وہ شرک نہ کریں اور اللہ ہی کو پوجتے چلے جائیں۔ قرآن ہی میں ضمانت دی جاتی ہے کہ تقویٰ سے اس معاشی سہولت کو بھی جو چاہے حاصل کر سکتا ہے۔ بلکہ قرآن کی آیت

الذین آمنوا وکانوا یتقون لہم البشریٰ فی الحیٰوة الدنیا وفی الآخرۃ لا تبدیل لکلمات اللہ۔
(یونس ۱۱/پ)

جو ایمان لائے اور ڈر کر گناہوں سے بچا کرتے ہیں اُن کے لئے بشارت ہے "الحیوۃ الدنیا" میں بھی اور "الآخرۃ" میں بھی۔ اللہ کی باتوں میں تبدیلی نہیں ہو سکتی۔

میں تو اسی ایمان اور تقویٰ کو اخروی منافع کے ساتھ ساتھ دنیاوی کامیابیوں کی بشارت کا ذریعہ قرار دے کر حق تعالیٰ نے اس کو اپنا ایک ایسا کلمہ یا ایسی بات یا ایسا قانون قرار دیا ہے جو کبھی ٹل نہیں سکتا، یعنی ایسی اٹل بات ہے جو اپنے مقررہ نتیجہ سے جُدا نہیں ہو سکتی، مطلب یہی ہوا کہ ایمان، تقویٰ کسی میں پایا جائے اور اس کی زندگی ان نتائج سے محروم رہ جائے ایسا نہیں

ہو رہا ہے اور جو قوتیں اور طاقتیں ہمارے اندر پیدا ہو رہی ہیں۔ سب جانتے ہیں کہ قرآن ان کے متعلق صرف یہی علم نہیں عطا کرتا ہے کہ ان سب کی تخلیق اور اُن سب کے عملِ پیدائش کا تعلق حق تعالیٰ کی تنہا ذاتِ مبارک اور صرف اسی کے ارادہ قاہرہ سے ہے، بلکہ اس نے تو بار بار اس کا بھی اعلان کیا ہے کہ اس تخلیقی توحید کے علم و یقین کا نقش ہر اس فطرت پر کندہ اور کھدا ہوا ملے گا، جس سے یہ پوچھا جائے کہ ان سب کا پیدا کرنے والا کون ہے۔ قرآن کبھی اسی سوال کو یوں دریافت کرنے کا حکم دیتا ہے۔

ولئن سألتهم من خلق السماوات — اگر ان سے پوچھو گے کس نے پیدا کیا آسمانوں

والارض۔ (زمر، زخرف، لقمان) — اور زمین کو۔

یعنی آسمان و زمین کے نظام کے متعلق اگر پوچھو گے کہ اس کو کس نے پیدا کیا، پھر خود خبر دیتا ہے۔

لیقولن اللہ۔ — (جن سے بھی پوچھا جائیگا وہ جواب میں) قطعاً کہیں گے کہ "اللہ"

پھر اسی سوال کو ذرا وسعت دے کر یوں دریافت کرایا جاتا ہے۔

ولئن سألتهم من خلق السماوات والارض — اور اگر پوچھو گے ان سے کس نے پیدا کیا آسمانوں اور زمین کو

وسخر الشمس والقمر (لقمان، زمر، عنکبوت) — اور مسخر کیا آفتاب و ماہتاب کو۔

یعنی اس نظام کی تخلیق ہی نہیں، بلکہ آفتاب اور اس کی روشنی و حرارت سے اسی طرح ماہتاب اور اس کی روشنی سے جو فائدے پہنچائے جا رہے ہیں، یہ کون کر رہا ہے، خبر دیتا ہے کہ جواب میں وہی۔

لیقولن اللہ۔ — قطعاً وہ یہی کہیں گے کہ اللہ۔

اسی دائرے کو اور کشادہ کر کے سوال کی صورت یہ قائم کی گئی ہے

ولئن سألتهم من نزل من السماء ماء — اور اگر پوچھو گے اُن سے کس نے اتارا آسمان

فاحیا به الارض بعد موتها۔ — سے پانی اور جلایا اس سے زمین کو اس کے

(عنکبوت ۲۱) — مر جانے کے بعد۔

یعنی صرف علوی اجرام کے منافع ہی نہیں، بلکہ سمندروں سے ابخرات بنا کر پانی کا اڑانا منجمد کر کے پھر اسی کو بارش کی شکل میں کھیتوں اور باغوں میں پہنچانا، مردہ زمین کو اس ذریعہ سے ہر سال نئی زندگی بخشنی۔ یہ سارا معاشی کاروبار کون انجام دے رہا ہے۔ قرآن یقین دلاتا ہے کہ اس سوال کے جواب میں بھی وہی

لیقولن اللہ۔ — قطعاً وہ یہی کہیں گے کہ اللہ۔

اور آخر میں تو صاف صاف الرزق جو "معاشی فوائد" کی گویا قرآنی تعبیر ہے، اس کو بھی سوال کا جزء بنا کر یوں پوچھوایا جاتا ہے۔

قل من یرزقکم من السماء والارض — پوچھو کہ کون روزی پہنچاتا ہے تمہیں آسمان سے

ومن یملک السمع والابصار ومن — اور زمین سے اور کون مالک ہے شنوائی اور بینائی

یخرج الحی من المیت ومن یخرج — اور کون نکالتا ہے زندہ کو مردہ سے اور نکالتا ہے

المیت من الحی ومن یدبر الامر — زندہ کو مردے سے، اور کون ٹھیک ٹھاک

(یونس ۴) — کرتا ہے کام کو

یعنی آسمان و زمین کے موجودہ نظام اور اُن کے باہمی تعلقات سے رزق، یا معاشی فوائد کو کون پیدا کر رہا ہے۔ اور یہ تو باہر کا سوال ہوا، پھر جن اندرونی قوتوں مثلاً بینائی و شنوائی، دانائی کی اعانت سے آدمی ان چیزوں کو حاصل کر رہا ہے اور اس سے بھی آگے بڑھ کر خود یہ حیات اور زندگی جو ہماری تمام اندرونی قوتوں کا سرچشمہ و منشاء ہے۔ دونوں کو ملا کر "من یدبر الامر" کا سوال جس کا ترجمہ ہے کہ (ہر کام کو ٹھیک ٹھاک کر کے کون درست کرتا ہے) مطلب یہ ہے کہ اندر کی قوتوں سے ہو یا باہر کی طاقتوں سے ہر چھوٹے اور بڑے کاروبار کو سوال میں داخل کر کے قرآن دریافت کراتا ہے کہ یہ سب کس کے حکم اور ارادے سے ہو رہا ہے۔ یہ سب کون کر رہا ہے جواب کے متعلق پھر وہی ایک خبر کا اعلان کیا جاتا ہے۔

فسیقولون اللہ۔ (ان سارے سوالات کے جواب میں بھی)

وہ قطعاً یہی کہیں گے کہ "اللہ"۔

یہ اقرار انسانی فطرت میں کس طرح گھر کئے ہوئے ہے۔ قرآن ہم کو اس ایمان و ایقان پر مجبور کرتا ہے کہ سب کچھ اللہ کر رہا ہے، صرف یہی واقعہ نہیں ہے، بلکہ یہ بھی واقعہ ہے کہ ہر فطرت کے خمیر میں اس واقعہ کا علم اور یقین بھی پیوستہ و سرشتہ ہے۔ پھر جن راہوں اور قدرت کے جن قوانین و ضوابط کے تحت یہ چیزیں پیدا ہو رہی ہیں، جب ان کے متعلق صحیح معلومات فراہم کر کے اسی کے مطابق طریقہ عمل کے اختیار کا نام حکیمانہ (سائنٹفک) طریقۂ عمل قرار دیا گیا ہے۔ تو جو پیدا کر رہا ہے اسی سے ان پیداواروں کو حاصل کرنے کے لئے اس کی باتوں کا ماننا، تاکہ ہماری مرضی پوری ہو۔ اس کی خلاف مرضی باتوں سے بچنا اپنی استطاعت و وسعت کی حد تک اس کی مرضی پر حسب غلطی سے ہٹ جانے کے بعد معافی مانگتے ہوئے پھر اسی کی مرضی کی طرف پلٹنا اور ان تدبیروں کے ساتھ ساتھ جو وہ پیدا کر رہا ہے۔ گڑگڑا کر اس سے مانگنا جس کی دوسری تعبیر ایمان و عمل صالح، تقویٰ، توبہ و استغفار، دعا، الحاح وغیرہ کے الفاظ سے کی جاتی ہے۔ بتایا جائے کہ آخر کس وجہ سے حصولِ معاش کی یہ تدبیر صحیح حکیمانہ تدبیر نہیں ہے، اگر عمل کا پہلا طریقہ علم کی صحیح روشنی میں اختیار کیا جاتا ہے تو کیا عمل کا دوسرا طریقہ جہل کی تاریکی میں اختیار کیا گیا ہے، اگر عمل کے پہلے طریقہ پر علم اور مشاہدہ تحقیق و تجربے کی قوتیں ہمیں مجبور کرتی ہیں، تو کیا دوسرے طریقے پر بھی وہی یقین وہی علم ہمیں نہیں مجبور کرے گا جس کے متعلق بتایا جا چکا کہ قرآن انسانی جبلت کا اُسے لازوال علم قرار دیتا ہے کیسی عجیب بات ہے کہ قرآن سے ہم اس علم کو بھی حاصل کرتے ہیں کہ

قل اللھم مالک الملک تؤتی الملک من تشاء وتنزع الملک ممن تشاء وتعز من تشاء وتذل من تشاء بیدک الخیر انک علی کل شیءٍ قدیر۔ تولج اللیل فی النھار وتولج النھار فی اللیل وتخرج الحی من المیت وتخرج المیت من الحی وترزق من تشاء بغیر حساب

(آل عمران پ ۳)

کہو اے اللہ آپ ہی مالک ہیں ملک کے دیتے ہیں جسے آپ چاہتے ہیں، اور چھین لیتے ہیں جس سے چاہتے ہیں، آبرو بخشتے ہیں جسے چاہتے ہیں، اور رسوا کرتے ہیں جسے چاہتے ہیں۔ "الخیر" (ساری بھلائیاں) آپ ہی کے ہاتھ میں ہیں۔ بلاشبہ آپ ہر چیز پر قادر ہیں، آپ ہی رات کو دن میں گم کرتے ہیں اور دن کو رات میں گم کرتے ہیں۔ نکالتے ہیں آپ ہی زندہ کو مردے سے اور نکالتے ہیں مردے کو زندہ سے، اور روزی پہنچاتے ہیں جسے چاہتے ہیں، حساب کے بغیر۔

کس قدر عجیب ہے کہ اپنی رحمت سے مایوس ہونے والوں کو جو کافر قرار دیتا ہے۔ اللہ کے ان بندوں سے جو خدا تے نہیں۔ بلکہ خدا کے بندوں سے کبھی مایوس نہیں ہوتے۔ اُن سے کون پوچھے! آخر کس بنیاد پر تم نے اپنے خالق سے اپنے آپ کو ہمیشہ کے لئے مایوس بنا لیا! خدا نے تو کہا ہے کہ

لا ییئس من روح اللہ الا القوم الکافرون۔	نہیں ناامید ہوتا کوئی اللہ کی رحمت سے مگر جو کفر والے ہیں۔

کیا دعا صرف طفل تسلی ہے

اس کا یہی مطلب ہے کہ کافر ہوئے بغیر کوئی حق تعالیٰ کی رحمتوں سے مایوس نہیں ہو سکتا لیکن لوگ ہیں جو ایمان و اسلام کے دعوے کے بعد بھی اس کی رحمتوں سے ناامید ہو کر دعا و استغفار کو مشکلاتِ حیات کے حل کی راہ میں العیاذ باللہ جھوٹی طفل تسلی تک قرار دینے کی جسارت کر جاتے ہیں۔ علانیہ کہتے ہیں کہ دعاؤں سے کیا ہوتا ہے جو ہونا ہے وہ ہو کر رہے گا۔ زیادہ سے زیادہ اس کا اگر کچھ فائدہ ہو سکتا ہے تو یہی کہ اضطراب و بے چینی کی حالت میں آدمی کو اس سے گونہ قوت و اطمینان کی خنکی مل جاتی ہے۔ اور یہ خیال کس بنیاد پر قائم کر لیا گیا، محض اس لئے کہ دعا کی گئی تھی، چونکہ قبول نہیں ہوئی اس لئے حصول مقاصد کی اس تدبیر کی تاثیر ہی کا انھوں نے انکار کر دیا۔ جو بات جس وقت کہی جائے، اسی وقت اسی شکل میں پوری ہو جائے۔ دعا کا مطلب جنھوں نے یہ سمجھ رکھا ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ انھوں نے خدا کو خدا بھی باقی رکھا، یا اس کاربرداری کی کوئی ایسی مشین یا آلہ فرض کر لیا جس کا کھٹکا ان کے دل و دماغ اور زبانوں میں لگا ہوا ہے، گویا وہ چاہتے ہیں کہ ادھر اس کھٹکے کو دبا دیا جائے۔ وہ چاہتے ہیں کہ اُن کا آلہ اُن کے مطلوب کو ان کے سامنے لا کر حاضر کر دے۔ بعضوں کو قرآن کی آیتوں

اجیب دعوۃ الداع اذا دعان (البقرہ ۲/۲۲)	جواب دیتا ہوں میں پکار کی پکارنے والا جب پکارتا ہے وہ مجھے۔

یا

ادعونی استجب لکم (المومن ۲۲/۵)	پکارو مجھے میں جواب دوں گا تمہیں۔

بعض دعائی آیتوں کے متعلق غلط فہمی

وغیرہ سے بھی شاید مغالطہ ہوا "استجابت" و "اجابت" کا ترجمہ بجائے جواب دینے کے انھوں نے جو مانگا ہے اس کا قبول کرنا خدا جانے کس لغت کی بنیاد پر فرض کر لیا۔ حالانکہ پتھروں اور بتوں کے پوجنے والوں کے مقابلے میں یہ ارشاد فرمایا گیا ہے کہ اُن کے بہرے گونگے، مردہ بے جان معبود اپنے پوجنے والوں کی پکار اور دہائی کو سنتے ہی نہیں تو جواب کیا دیں گے لیکن جس کی ذات بینا و شنوا، حی و قیوم، سب کو محیط، سب کے قریب ہے، وہ ہر ایک پکارنے والے کو فقط جواب دیتا ہے، لیکن پکارنے والے جو کچھ مانگتے ہیں اسے دے بھی دیتا ہے، یہ مطلب ان آیتوں کا کہاں سے لیا گیا۔

پیغمبروں کی بھی ہر دعا قبول نہیں ہوتی

کم از کم میں تو اس سے ناواقف ہوں۔ آخر جس قرآن میں یہ آیتیں ہیں اسی میں تو یہ ہے کہ معمولی ہستیاں نہیں، نوحؑ و ابراہیمؑ جیسے اولو العزم پیغمبروں کی بعض درخواستوں کے قبول کرنے سے حق تعالیٰ نے انکار فرمایا۔ خود سید الانبیاء والمرسلین علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کو خطاب کر کے قرآن ہی میں فرمایا گیا کہ منافقین کی مغفرت کی درخواست اگر آپ ستر بار بھی پیش کریں گے تو اسے منظور نہیں کر سکتا۔ حدیثوں میں بھی ہے کہ

مسلمانوں کے باہمی جنگ وقتال کے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا فرمائی کہ اس سے ان کو محفوظ کیا جائے لیکن نامنظور ہوئی۔ سب جانتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نصرت کا وعدہ ہو چکا تھا، مگر باوجود وعدہ کے محض اس لئے کہ خدا خدا ہے بندہ نہیں ہے۔ سب اس کے محتاج ہیں۔ وہ سب سے غنی ہے، کیا معلوم کہ ایفاء عہد کب کیا جائے گا۔ کس حال میں کیا جائے گا۔ خدا کے وعدوں پر سب سے زیادہ بھروسہ کرنے والی ہستی کو میدان بدر میں دیکھا گیا تھا کہ سر خاک پر پڑا ہوا ہے، حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں کہ

جنگِ بدر میں آنحضرت صلعم کا دعائی اضطرار

قاتلت یوم بدر شیئا من قتال ثم جئت فاذا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول فی سجودہ یاحی یاقیوم فرجعت فقاتلت ثم جئت فوجدتہ کذلک (فتح الباری)

لڑا میں بدر کے دن ایک لڑائی پھر آیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے سجدہ میں (اے زندہ اے تھامنے والے سارے جہان کے یعنی) یاحی یا قیوم فرما رہے ہیں پس میں پلٹا اور لڑا، پھر آیا تو پاتا ہوں حضورؐ کو اسی حال میں۔

سجدے سے سر اٹھایا جاتا ہے، آسمان کی طرف ہاتھ اٹھے ہوئے ہیں، تن بدن کا ہوش باقی نہیں ہے۔ مونڈھے سے چادر مبارک ڈھلک کر گر گئی ہے، لیکن کامل انہماک واستغراق، دل کی ساری قوت، توجہ، اصرار والحاح کے ساتھ زبانِ مبارک پر یہ الفاظ جاری ہیں

اللھم انی انشد ک عھد ک ووعدک اللھم ان شئت لم تعبد اللھم ان تہلک ھذہ العصابۃ من اھل الاسلام لا تعبد فی الارض۔ (بخاری ومسلم وصحاح)

یا اللہ آپ کو یاد دلاتا ہوں اپنا عہد اور اپنا وعدہ۔ اے اللہ اگر آپ چاہیں تو نہ پوجے جائیں آپ۔ اے اللہ اگر تباہ ہو گئی یہ ٹکڑی اسلام والوں کی، تو نہ پوجے جائیں گے آپ زمین میں۔

وعدہ کے باوجود رب اور رب کی نصرت کو جس بے کلی اور اضطراب سے آج ڈھونڈھا جا رہا ہے کہ بقول حضرت عبد اللہ ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے

ماسمعنا مناشدا ینشد ضالۃ اشد مناشدۃ من محمد لربہ۔ (فتح الباری)

ہم نے نہیں سنا کہ اپنی گم گشتہ چیز کو کوئی ڈھونڈھتا ہو اس طرح جس طرح محمدؐ اپنے رب کو ڈھونڈھ رہے تھے (یعنی اس کی نصرت کو تلاش کر رہے تھے)

مالک کے قدموں پر اس لوٹنے والے کو دیکھ دیکھ کر دوسروں سے نہیں رہا جاتا، جیسا کہ بخاری میں ہے

فاخذ ابوبکر بیدہ وقال حسبک۔

تب ابوبکرؓ نے آپؐ کے دستِ مبارک کو پکڑ لیا۔ اور کہا کہ بس ہے آپؐ کے لئے۔

اسی کی تفصیل مسلم میں ہے کہ

فاتاہ ابوبکر فاخذ ردائہ فالقاہ علی منکبیہ ثم التزمہ من ورائہ

تب آئے ابوبکرؓ اور پکڑ لی چادر کو آپؐ کے اور ڈال دی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مونڈھے پر، پھر لپٹ گئے

وقال یا نبی اللہ فانہ سینجز لک وعدک۔	ابوبکرؓ پیچھے سے اور کہہ رہے تھے اے اللہ کے نبی قریب ہے کہ پورا کیا جائے آپ کے ساتھ آپ کا وعدہ۔

وعدہ جو کیا گیا تھا، اس کو تو بہرحال پورا ہونا ہی تھا اور وہ پورا ہو کر رہا لیکن حصولِ مقاصد کی اس کلی تدبیر کی تعلیم ہمیں جس ذاتِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے ملی ہے ان کے اس نمونہ میں ان لوگوں کے لئے بھی عبرت ہے جو سرے سے دعائی تاثیروں سے مایوس ہو کر ان کے منکر ہو بیٹھے ہیں اور بصیرت ہے ان کے لئے بھی جو "استجابت" کا ترجمہ "جو کچھ مانگا جاتا ہے وہ اسی وقت دیدیا جاتا ہے" اپنی طرف سے کر کے اپنی بے دو رکعت کے بعد کی دعاؤں پر امید لگا بیٹھتے ہیں کہ جو کچھ مانگا گیا ہے کارکنانِ قضاء و قدر اسے آسمانوں سے لئے آرہے ہوں گے۔ اگر یہ معاملہ اتنا آسان تھا تو اس تدبیر کے سب سے بڑے ماہر اور معلّم صلی اللہ علیہ وسلم کے اصرار و الحاح اور ان الفاظ کے کیا معنی ہو سکتے ہیں، جو اس حدیث میں ہم پڑھتے ہیں ہمیں اپنی معاشی ضرورتوں میں بھی دعائی طریقۂ عمل کو پوری قوت کے ساتھ استعمال کرنا چاہیئے، اس دعوی کے ثبوت میں چونکہ واقعاتِ بدر کے اس حصہ سے روشنی پڑتی ہے۔ اس لئے قصداً میں نے اس چیز کا تفصیل سے تذکرہ کیا خصوصاً اس لئے بھی کہ بدر کی ان دعاؤں میں جو کچھ مانگا جا رہا تھا۔ اگرچہ اصل مقصود تو دین ہی کا غلبہ اور حق و صداقت کی سربلندی ہی تھی لیکن جس معاشی دعا کا ذکر ابتدائی بیان میں آیا تھا یہی مسلمانوں کو پیش کر کے حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے تھے۔

"یہ در دہ (؟) بھوکے ہیں انھیں پر فرما، یہ پیادہ پا ہیں انھیں سواری دے، یہ ننگے ہیں انھیں کپڑے پہنا۔"

اہلِ علم جانتے ہیں کہ اس کا تعلق بھی جنگِ بدر سے ہے۔ یعنی بدر کے میدان میں کفار کے مقابلے میں جب مسلمان صف آرائی کر رہے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس وقت یہ دعا فرمائی تھی۔ تو کیا دین کے ساتھ اس دعا میں دنیا کا پہلو بھی نہ تھا؟

دعائی تدبیر کے ساتھ عقلی تدبیر

اسی جنگ کے موقع پر کامیابی کی اس کلی اور کلیدی تدبیر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک طرف اتنا انہماک تھا یعنی کامیابی کا حقیقی اختیار جس کے ہاتھ میں تھا اس سے مانگنے میں ایک طرف اتنا زور صرف ہو رہا تھا، تو جاننے والے جانتے ہیں کہ دوسری طرف جن راہوں سے حق تعالیٰ جنگ میں کامیاب ہونیوالوں کو کامیابی عطا فرماتے ہیں، جنگ کے ان ضوابط و آئین کے اختیار کرنے میں بھی آپ نے کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا تھا۔ میدانِ جنگ میں بہترین موقعہ کا انتخاب، فوج کی صف بندی، صفوں میں ترتیب، اسلحہ کے استعمال میں ترتیب، تیر کب چلائے جائیں، تلوار کب نکالی جائے، پتھروں اور ڈھیلوں سے غنیم پر کس وقت حملہ کیا جائے، ہر ایک کا ایک خاص فاصلہ مقرر فرما دیا گیا تھا، دشمنوں کی ہر حرکت و سکون کی نگرانی، مادی ذرائع سے ممکنہ حد تک ان کو قطع کرنے کی تدبیریں وغیرہ وغیرہ، ان میں سے ہر بات کی تعلیم دی اور ان پر اپنی خاص توجہ براہِ راست آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم قائم کئے ہوئے تھے یہاں تک کہ دستِ مبارک میں خود تیر لے کر صفوں کی ترتیب کو درست فرما رہے تھے۔[1]

اعتدال کے نظری نقطۂ نظر سے جن جماعت میں انحراف پیدا ہو گیا ہے۔۔۔ اس سلسلہ میں ان کا کچھ بھی مذاق ہو لیکن حق کا مزاج

---

[1] ہمارے فاضل دوست ... کتاب ... صاحب نے ... عقلی تدبیروں کو پیش نظر رکھ کر غزوات نبویہ پر ایک مضمون لکھا ہے جس سے ان کی غرض یہ تھی جیسا کہ بعضوں کو غلط فہمی ہوئی کہ ان ہی تدبیروں کے ساتھ ... لڑائیوں کی کامیابی کو منحصر ثابت کرتے ہیں، بلکہ صرف ایک پہلو کو نمایاں کرنا مقصود ہے ۱۲

خالص فطری حال پر باقی ہے۔ واقعہ تو یہ ہے کہ ان کی فطرت حصول قناعت کی راہ میں تدبیر کی اسی جامعیت کو چاہتی [illegible]
جو پیدا کر رہا ہے۔ اس سے بھی مانگا جائے اور جن راہوں سے چیزیں پیدا ہو رہی ہیں، ان میں بھی تلاش کیا جائے۔ تعلیم کی
یہی جامعیت اسلام (خدائی تعلیم) کی خصوصیت ہے۔ اسلام کو الدین القیم (لازوال سیدھی راہ) قرار دیتے ہوئے
قرآن میں جو یہ فرمایا گیا ہے

فطرۃ اللہ التی فطر الناس علیہا لا — اللہ کی آفرینش جس پر پیدا کیا اس نے آدمی کو۔
تبدیل لخلق اللہ۔ — اللہ کی پیدا کی ہوئی چیز کا بدلنا نہیں ہے۔

اس کا یہی مطلب ہے کہ جن فطری اقتضاءات و حالات پر قدرت نے انسان کو پیدا کیا ہے، مذہب ان میں تبدیلی پیدا
نہیں کرتا۔ بلکہ فطرت کے اس نقطہ سے جن کی طبیعتیں ہٹ گئی ہیں، وہ ان ہٹی ہوئی طبیعتوں کو پھر فطرت کے اسی مقام پر
واپس کر دیتا ہے جس کے بعد آدمی کے تمام فطری مطالبات بیدار ہو جاتے ہیں۔ اسی بنیاد پر میں تو یہ خیال کرتا
ہوں کہ اپنی کامیابیوں اور ناکامیوں کے سلسلے میں تدبیر و طریقہ عمل کے ان دو شعبوں میں سے کسی ایک شعبہ کو جو چھوڑ
بیٹھتے ہیں، بظاہر اس کا سبب ان کے مزاج اور طبیعت کا فطری بگاڑ ہوتا ہے۔

دونوں شعبوں کی اہمیت میں فرق

اللہ پیدا کرنے والا چونکہ ایک ہے، اور جن راہوں سے چیزیں پیدا ہو رہی ہیں، وہ بے شمار ہیں
اور یہی بے شمار کہ ان کی حد بے حساب ہے، گہر بننے کے لئے ایک ایک قطرے کو بقول غالب "دام ہر موج میں ہے حلقۂ صد کام نہنگ" کے گوناگوں پیچیدہ اور نازک قوانین سے سابقہ پڑتا ہے۔ اس لئے
تدبیر کا پہلا شعبہ دوسرے شعبہ سے نسبتاً آسان ہے۔ ایک سے تعلق رکھنا اور وہ بھی بھیک مانگنے سوال کرنے کا تعلق
رکھنا ایسا کام ہے کہ جس سے کچھ نہیں ہو سکتا ہے۔ وہ بھی بالآخر اس کام کو کر ہی لیتا ہے، اسی لئے اس کا جذبہ تو
قدرت نے ہر ایک میں رکھا ہے، اور اسی کا نام اصطلاحاً مذہبی جذبہ ہے۔ لیکن تدبیر کے دوسرے شعبہ میں عالم پیدائش
کے ان پیچیدہ قانون سے سابقہ پڑتا ہے کہ ہاتھ سے چمچہ کو منہ تک پہنچانے میں آدمی کو ہزاروں مرحلوں کا نشیب گزرنا ہے
یا جیسے غالب نے محسوس کیا کہ ایک قطرہ کو موتی کی حالت تک پہنچنے کے لئے دریا کے ہر حلقۂ موج میں نہنگوں کے سینکڑوں منہ کھلے
پڑتے ہیں سب کو بند کرنا پڑتا ہے۔ بقول کاشتکاروں کے بگڑی کے ایک پھیرے میں کام بگڑتا ہے۔ گویا

رفتم کہ خار از پا کشم منزل نہاں شد از نظر

کا خطرہ قدم قدم پر پیش آتا ہے۔ اسی لئے تدبیر کے اس جزئیاتی اور تفصیلاتی شعبہ کا حق ادا کرنا جیسا کہ چاہیے ہر شخص
کے بس کی بات نہیں ہے۔ اس پر وہی قابو پا سکتا ہے جو پیدائش کے سارے قوانین اور ان کے نازک پہلوؤں پر گہری
نظر رکھتا ہو اور عمل کی قوتوں سے بھی قدرتاً سرفراز ہو۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ تدبیر کے اس شعبہ کا مکلف ہر شخص اپنی اپنی
عقل اور قوت عمل ہی کے حساب سے ہے۔ بخلاف پہلے شعبے کے کہ وہ ایک کلی تدبیر ہے، پیدائش کی راہوں سے نہیں، بلکہ
خود پیدا کرنے والے سے اس کی پیدا کی ہوئی چیزوں کو مانگنا ہے، جیسا کہ عرض کیا گیا، مانگنا ایک ایسا فعل ہے کہ دنیا
میں [illegible] اسی کے ساتھ جب ان امور پر
[illegible] اس کو [illegible]
[illegible] فرمایا ہے

ہیں) چونکہ وہ ایک یقینی بلکہ جیسا کہ قرآن کا دعویٰ ہے کہ فطری وجدان ہے، بخلاف دوسرے شعبے کے کہ جن راہوں سے چیزیں پیدا ہوتی ہیں، اولاً ان سب کا احاطہ آسان نہیں اور احاطہ کر لیا بھی جائے تو چونکہ اس سلسلے کی ساری معلومات عقل وحواس سے حاصل ہوتی ہیں، اس لئے عقل وحواس کے حدود میں اسباب وعلل کے جو حصے داخل ہیں ان تک تو رسائی ممکن بھی ہے لیکن ان کی سرحدوں سے جو حصے باہر ہیں، ان کے متعلق اقرار جہل کے سوا عقل کے لئے کوئی چارہ کار نہیں، اسی لئے سمجھنا چاہئے کہ اس راہ کی عقلی کوشش جس حد تک بھی پہنچی ہو، لیکن جو طریقہ عمل عقل کے ان معلومات وتجربات پر مبنی ہوگا، بہرحال ناقص علم اور ناقص تجربہ ہی پر وہ مبنی ہوگا۔ الحاصل تدبیر کے ان دونوں شعبوں کے یہی نمایاں امتیازات ہیں، جس کی بنیاد پر اگر مذہب میں تدبیر کے پہلے شعبے کو زیادہ اہمیت دی گئی ہے، تو یقیناً وہ اس کا مستحق ہے، قرآن مجید میں

لله غیب السموات والارض والیہ
یرجع الامر کلہ فاعبدہ وتوکل علیہ
(۱۲/۱۱)

اللہ ہی کی ہیں آسمانوں اور زمین کی پوشیدہ باتیں
پلٹتی ہے بات سب کی سب اسی کی طرف تو اسی کو پوجے
چلے جاؤ اور اسی پر ٹیک لگاؤ۔

کی جو تعلیم دی گئی ہے اس کا یہی مطلب ہے کہ عقل سے تم زیادہ سے زیادہ پیدائش کے ان ہی آئین وقوانین کو دریافت کر سکتے ہو جو حواس وعقل کی رسائی کے حدود میں ہوں لیکن "السموات والارض" کے قوانین کا وہ حصہ جو حواس وعقل سے غائب ہے یعنی "غیب السموات والارض" ان کے متعلق تمہارے لئے چارہ کار ہی کیا ہے۔ بجز اس کے کہ وہی ذات جس کے ساتھ تمام چیزوں کی پیدائش وابستہ ہے، سارے کاروبار کی جس پر انتہا ہے اسی کو اپنا وکیل بنا کر اسی کو پوجتے اسی سے مانگتے چلے جاؤ اور اسی پر ٹیک لگا کر بیٹھ جاؤ۔ گویا عقل وحواس کی راہوں سے جو معلومات حاصل ہو سکیں ان کا جو اقتضا ہو اس کو پورا کرلینے کے بعد واقعہ یہی ہے کہ آخری پناہ آدمی کے لئے پیدا کرنے والے کی پناہ اور اس پر توکل اعتماد کے سوا اور کہاں مل سکتی ہے۔ جب ساری باتیں اسی کی طرف لوٹ کر جاتی ہیں اور وہی منتہا کل ہے، تو کیا وجہ ہو سکتی ہے کہ اپنے اوپر ٹیک لگانے والوں کو وہ بے ٹیک اور بے سہارا کر دے گا۔

من یتوکل علی اللہ فھو حسبہ (الطلاق ۲/۱)

جس نے ٹیک لگایا اللہ پر بس وہ بس ہے اس کو

کا یہی مطلب ہے کہ بہرحال ایسا آدمی بے سہارا نہیں ہو سکتا۔ اور یہی مقصد ہے اس کا کہ

ومن یکفر بالطاغوت ویومن
باللہ فقد استمسک بالعروۃ
الوثقی لا انفصام لھا۔
(البقرہ ۲/۳۴)

اور طاغوت (یعنی ہر وہ چیز جو خدا سے طغیان وسرکشی پیدا کرے) اس کا جس نے انکار کر دیا اور اللہ کو مان لیا تو اس نے پکڑا مضبوط کڑے کو نہیں ہے مسک بھی اس کے لئے۔

کیونکہ جن راہوں سے چیزیں پیدا ہو رہی ہیں، اگرچہ وہ بھی خدا ہی کی بنائی ہوئی راہیں ہیں اور اسی لئے قرآن میں ان کا نام سنۃ اللہ (اللہ کی راہ ہے) اور یہ حق تعالیٰ کی مہربانی ہے کہ بدلنے کی قدرت کے باوجود بندوں کی سہولت کے لئے جس چیز کی پیدائش کا جو طریقہ جاری فرما دیا گیا ہے، عموماً سنت بدلا نہیں جاتا۔ سنۃ اللہ کی اسی عدم تبدیلی پر ہمارے تمام عقلی قوانین کی قانونیت اور کلیت مبنی ہے اور ان ہی کلیات پر سارے کاروبار کا مدار ہے۔ ورنہ پیدائش کی راہیں اگر روز بدلتی رہتیں تو

کیسے بھروسہ ہوسکتا تھا کہ جو چیز جس طریقہ اور جس راہ سے آج پیدا ہوئی ہے۔ کل بھی اسی طریقہ سے پیدا ہوگی، خدانخواستہ ایسا ہوتا تو زراعت ہو یا تجارت، صنعت ہو، یا حرفت، دنیا کا کوئی معاشی کام کیا سرانجام پا سکتا تھا؟

مگر ظاہر ہے کہ پیدائش کی عام راہوں کے متعلق ہماری جو معلومات ہیں، سنۃ اللہ کے تمام گوشوں پر ان کے حاوی ہونے کا تو دعویٰ نہیں کیا جا سکتا۔ آگ جلاتی ہے بیشک عام آدمیوں کے لئے یہی اللہ کی سنت ہے جو آگ میں کود کے گا جلے گا۔ لیکن کون مدعی ہوسکتا ہے کہ اپنے رسولوں اور برگزیدوں کے ساتھ بھی خدا کی یہی سنت اور اس کا یہی برتاؤ ہے۔ پانی میں آدمی ڈوب کر مرجاتا ہے۔ خدا کی یہ سنت ہے۔ لیکن مچھلی اسی پانی میں ڈوب کر زندہ رہتی ہے۔ کیا یہ خدا کی سنت نہیں ہے۔ الغرض سنۃ اللہ کی عدم تبدیلی کے یہ معنی نہیں ہیں کہ جو علم سنت اللہ کے متعلق ہمیں حاصل ہوا ہے۔ اس میں بھی تبدیلی نہیں ہوسکتی، مگر اسی کے مقابلہ جو پیدا کر رہا ہے۔ وہ خود بھی غیر متبدل اور اس کے متعلق جو ہمارا علم ہے وہ بھی غیر متبدل ہے، پس اسلام کو ان تدبیروں کا بھی احترام کرتا ہے، جو تغیر پذیر معلومات پر مبنی ہیں یعنی ہم جنھیں عقلی تدبیریں کہتے ہیں، اصرار کیا گیا ہے کہ حتی الوسع ان معلومات کے مطابق طریقہ عمل اختیار کرنے میں سستی اور غفلت نہ برتی جائے۔

ولیاخذوا حذرھم واسلحتھم	اور چاہئیے کہ اٹھالیں وے اپنے بچاؤ کے سامان کو
ود الذین کفروا لو تغفلون عن	اور اپنے ہتھیاروں کو۔ چاہتے ہیں وہ لوگ جنھوں
اسلحتکم وامتعتکم فیمیلون علیکم	نے کفر کیا کہ اگر تم غافل ہو جاؤ اپنے ہتھیاروں کی
میلۃ واحدۃ ولاجناح علیکم	اور اپنے ساز و سامان سے تو ٹوٹ پڑیں وہ تم پر
ان کان بکم اذی من مطر او کنتم	ایک دفعہ اچھی طرح سے ٹوٹ کر، اور اس میں
مرضیٰ ان تضعوا اسلحتکم وخذوا	مضائقہ نہیں اگر بارش کی وجہ سے کچھ ناگواری
حذرکم (النساء ۱۵)	ہو، یا تم بیمار پڑ جاؤ، یہ کہ اتار دو اپنے ہتھیاروں

کو، اور لئے رہو، بچاؤ کے سامان کو۔

اسی قسم کی قرآنی ہدایات کو اگر جمع کیا جائے، تو ان کا ایک ذخیرہ تیار ہوسکتا ہے، ظاہر ہے کہ ان آیتوں میں تدبیر کے اسی شعبہ کے اختیار کرنے کا حکم دیا گیا ہے جنھیں ہم عقلی تدبیریں کہتے ہیں۔ بیماری وغیرہ میں ہتھیار اتار نے کی اجازت دے کر پھر

خذوا حذرکم (النساء ۱۵)	اپنے بچاؤ کے سامان کو پکڑے رہو۔

کے حکم کو بحال رکھنا، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ تدبیر کے اس شعبے کو بھی اسلام میں کتنی اہمیت ہے، ابوداؤد و ترمذی کی مشہور حدیث

من بات وفی یدہ ریح غمر	جو رات کو اس طرح سو جائے کہ اس کے ہاتھ
فاصابہ شیئ فلا یلومن الا	میں آلائش کی بو ہو، اور اسی وجہ سے کوئی اذیت
نفسہ۔	اس کو پہنچے، تو چاہئے کہ ملامت نہ کرے، مگر خود اپنے

آپ کو (ایسا اوقات چوہا سانپ یا اسی قسم کے حشرات سے آدمی کو نقصان اسی بے احتیاطی کی وجہ سے پہنچ جاتا ہے)

میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تصریح فرمادی ہے کہ اگر ان تدبیروں کے ترک کرنے سے کسی کو نقصان پہنچے تو اس نقصان کا وہ خود ذمہ دار ہے، پھر ناقص معلومات، ناقص تجربات پر تدبیروں کا جو شعبہ مبنی ہے۔ بے شمار پیچیدہ قوانین سے متعلق ہونے کی وجہ سے تغیر و تبدیلی کے احتمالات سے وہ پاک نہیں ہے۔ خصوصاً جب اس سلسلے کے غیبی حلقے ہماری نگاہوں سے اوجھل بھی ہیں۔ علاوہ اس کے جن راہوں سے چیزیں پیدا ہوئی ہیں۔ وہ علم و ادراک وغیرہ کے حیاتی صفات سے بھی عموماً خالی ہوتی ہیں۔ لیکن باوجود ان تمام باتوں کے جب تدبیر کے اس شعبہ کو ہم ترک نہیں کر سکتے، نہ عقلاً ترک کر سکتے ہیں نہ ہماری فطرت اس کی اجازت دیتی ہے، نہ دین کا یہ حکم ہے۔ تو تدبیر کا وہ شعبہ جو ناقص معلومات پر نہیں بلکہ علم کے لازوال ٹھوس غیر متبدل اساس پر مبنی ہے، بہتوں سے نہیں، بلکہ اس تدبیر میں صرف ایک ہی سے کہنا ہے جو کچھ کہنا ہے؛ ایک ہی سے پانا ہے جو کچھ پانا ہے، اسی کے ساتھ اگر یہی بنیادی نظریہ رکھا جائے کہ تدبیر کی اس راہ میں ہمارا جس سے تعلق ہے، وہ ایک ہی قیوم زندہ و توانا دانا و بینا ذات ہے، صرف یہی نہیں بلکہ رحم و کرم سے بھی معمور ہے ارحم الراحمین ہے۔ اپنے رسول کے ذریعہ سے اس نے خود اپنی اس خصوصیت کا اعلان کیا ہے کہ :-

من لم یسأل اللہ یغضب علیہ۔ (ترمذی) — جو اللہ سے نہیں مانگتا اللہ تعالیٰ اس پر غصہ فرماتے ہیں۔

من لم یسأل اللہ غضب اللہ علیہ۔ (حصن حصین بحوالہ مصنف ابن ابی شیبہ) — اللہ سے جو نہ مانگے۔ حق تعالیٰ اس پر غصہ فرماتے ہیں۔

جس کا کام ہی دینا ہے دینے ہی کے لئے بیٹھا ہے، پھر اسی کے حکم

رب المشرق والمغرب لا الٰہ الا ھو فاتخذہ وکیلا۔ (المزمل ۹/۱) — پالنے والا پورب اور پچھم کا، نہیں ہے کوئی الٰہ اس کے سوا بس بنالو اس کو اپنا وکیل۔

کی تعمیل کرتے ہوئے مشرق و مغرب کے اسی پالنے والے پر اپنی زندگی کی ضروریات پر ہم بھروسہ اور اعتماد کریں۔ اور اس سے ہم یہ امید رکھیں کہ بہرحال وہ ہمیں نہیں چھوڑے گا؛ ہم پر رحم کرے گا، ہماری ضرورتوں کو پورا کرے گا، تو بتایا جائے کہ عقلاً و فطرۃً، دیناً و ایماناً ہم اس کے سوا، اور کر ہی کیا سکتے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حق تعالیٰ کا یہ قول جو نقل فرمایا ہے کہ

انا عند ظن عبدی بی فلیظن بی ما شاء (متفق علیہ) — میں اپنے بندے کے خیال کے ساتھ ہوں پس خیال کرے بندہ میرے متعلق جو چاہے۔

حق تعالیٰ سے ہمیں فطرۃً جو توقع رکھنی چاہیئے۔ اس حدیث میں اسی توقع کے قائم کرنے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ بلاشبہ عقلی تدبیریں ناگزیر تدبیریں ہیں، لیکن جو اصل واقعات کے عالم ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ قطعیت کے لحاظ سے دونوں تدبیروں میں کیا نسبت ہے۔ واقعہ تو یہی ہے جس کا اعتراف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حق تعالیٰ کو خطاب کرکے ان الفاظ میں فرمایا ہے

رب لا تکلنی الی نفسی طرفۃ عین — اے میرے رب مجھے میرے حوالہ نہ کیجیے (یعنی

واصلح لی شانی کلہ فانک ان تکلنی	اپنے آپ مجھے خود اپنے بھروسہ پر نہ چھوڑیئے پل بھر
الی نفسی تکلنی الی ضعف وعورۃ	کے لئے بھی اور سنبھال دیجئے میری باتیں ساری کیونکہ
وخطیئۃ وذنب وانی لا اثق	اگر آپ نے مجھے میرے سپرد کر دیا تو آپ سونپ
الا برحمتک۔	دیں گے مجھے صرف کمزوری کو اور عورت[1] کو چوک

کو، گناہ کو، اور میں نہیں بھروسہ کرتا مگر صرف آپ کی رحمت اور مہربانی پر۔

"الی نفسی" کے الفاظ سے تدبیر کے ان ہی شعبوں کی طرف اشارہ ہے، جن کا تعلق آدمی کے ناقص معلومات، تجربات والی ناقص عقل اور اس کے ناقص اختیار و قویٰ سے ہے، اسی لئے کہا جاتا ہے کہ کرنا تو سب ہی چاہئے، تدبیر کے دونوں شعبوں کے حقوق کو ادا کرنا چاہئے لیکن اگر بالفرض ان دو میں سے کسی ایک کو چھوڑنا ہی پڑے، تو ظاہر ہے کہ دیوانوں کے سوا کون ہوگا جو پہلے شعبہ کو ترک کر کے دوسرے شعبہ کو اختیار کرے گا۔ پیدا کرنے والے سے اس کی پیدا کی ہوئی چیزوں کے مانگنے اور اسی کے ساتھ پٹے رہنے میں اگر کچھ نہیں، تو یہی کیا کم ہے کہ غلام کو آقا سے سرگوشی اور مناجات کی سعادت تو حاصل ہو جاتی ہے۔ "وابتغوا عند اللہ الرزق" "واسئلوا من فضلہ" (مانگو اللہ سے روزی، مانگو اللہ سے اس کے فضل کو) اس حکم کی تعمیل کی وجہ سے

من جاء بالحسنۃ فلہ عشر امثالہا	جو ایک نیکی لے کر حاضر ہوگا۔ اس کو اسی کے برابر

دس گن دیا جائے گا۔

کی بنیاد پر اس ایک نیکی کے صلے میں دس نیکیوں کے ملنے کا استحقاق تو پیدا ہو جاتا ہے۔ اس کی طرف اس حدیث میں اشارہ کیا گیا ہے کہ

ما من عبد یدعو بدعاء الا اتاہ	کوئی بندہ ایسا نہیں ہے کہ مانگے وہ کوئی دعا پھر
اللہ ما سأل او کف عنہ من	یا اللہ تعالیٰ اس کی اسی دعا کو پوری فرماتے ہیں
السوء او ادخر لہ فی الاٰخرۃ	جو اس نے مانگی تھی، یا کسی برائی (مصیبت بلا) کو
خیرا منہ (حصن حصین ترمذی و رزین)	روک دیتے ہیں۔ یا ذخیرہ کر دیتے ہیں اس کے

لئے الآخرۃ میں کوئی ایسی چیز جو اس کی مانگی ہوئی چیز سے بہتر ہوگی۔

جس کا یہی مطلب ہوا کہ حصول مقاصد کی یہ تدبیر کسی حال میں ضائع نہیں ہوتی۔ جس مقصد کے لئے یہ تدبیر اختیار کی گئی ممکن ہے کسی وجہ سے مانگنے والے کو وہ نہ ملے۔ لیکن کچھ نہ ملے، اس راہ میں یہ نہیں ہو سکتا، اسی لئے بعضوں نے کہا ہے کہ روپیہ مانگنے والوں کو جب روپیہ ہی مل جاتا ہے تو وہ خوش ہوتے ہیں کہ ہماری دعا قبول ہوئی۔ لیکن بجائے روپیہ کے جب دینے والا اشرفی دیتا ہے۔ تو جو نہیں جانتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں دعا قبول نہیں ہوئی۔ اور جن لوگوں کا خیال ہے کہ کوئی دعا مسترد اور نامنظور نہیں ہوتی۔ ان کے کلام کا ایک مطلب یہ ضرور ہو سکتا ہے، شاید اس بنیاد پر اگر "استجابت" و "اجابت"

---

[1] عورت ان کمزوریوں کو کہتے ہیں جنہیں آدمی ظاہر کرنا نہیں چاہتا۔ بس خود ہی جانتا ہے۔ یا اس کا خدا، اردو میں اس کے لئے کوئی لفظ نہیں ہے۔ ناگفتنی کیا جائے تو نہفتنی بھی ترجمہ ہو سکتا ہے۔ مگر عام طور پر سمجھا نہ جائے گا ۱۲

دغیرہ قرآنی الفاظ کا ترجمہ "قبول کرنا" کر لیا جائے۔ تو اس لحاظ سے اس کی تصحیح ہو سکتی ہے۔ اور فرض بھی کیجئے جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا کہ خدا بہرحال خدا ہے بندہ نہیں ہے، اس کا علم اگر ہمارے جہل کا ساتھ نہ دے، اور ہم جو کچھ مانگ رہے ہوں۔ اس کا دینا خود ہمارے لئے یا کسی دوسرے نظم کے اختلال کا باعث ہو، تو پھر بھی تدبیر کا یہ ایسا عمل ہے کہ علاوہ ان مواعید کے جن کا ذکر مذکورہ بالا احادیث میں کیا گیا ہے، یوں بھی اسلام کی یہ تعلیم ہے کہ دینے والے سے ہمارے تعلقات کی ہمیشہ یہی نوعیت رہنی چاہیئے یعنی جو مل جائے اس پر شکر کیا جائے۔ شکر کی خاصیت

لئن شکرتم لازیدنکم۔	اگر گن گاؤ گے تم، تو بڑھاتے چلے جائیں گے
(ابراہیم ۲)	ہم تمہیں۔

قرآن میں بتائی گئی ہے۔ گویا حاصل شدہ نعمتوں کی ترقی کا شکر ایک قرآنی ذریعہ ہے، اور جو نہ ملا، نہ ملنے سے ممکن ہے کچھ ضیق ہو، تکلیف ہو لیکن اپنی کوشش سے جو اس تکلیف کو ٹال نہیں سکتا اسے صبر کرنا چاہیئے۔ صبر کے متعلق

اولئک علیہم صلوات من ربہم ورحمۃ	یہی لوگ ہیں جن پر صلوات ہیں اُن کے مالک کی طرف
واولئک ہم المہتدون۔ (البقرہ ۲)	سے اور رحمت۔ اور یہی لوگ راہ یافتہ ہیں۔

کے وعدوں کے سوا صبر کا ایک بڑا عظیم ثمرہ

انما یوفی الصابرون اجرہم بغیر حساب۔	بلا شبہ پورا کر دیا جائے گا صبر کرنے والوں کو
(الزمر ۲۳)	ان کا اجر بغیر شمار کے۔

بھی بتا دیا گیا ہے اور جو حق تعالیٰ کی معیت و رفاقت کے سرور سے آشنا ہیں۔ ان کو تو

واللّٰہ مع الصابرین۔ (البقرہ)	اور اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہیں۔

کی بشارت ایک سے زیادہ مقامات پر سنائی گئی ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ تدبیر کی اس راہ میں ملے جب بھی کامیابی ہے، نہ ملے جب بھی کامیابی ہے۔ ظاہر ہے کہ ہماری تمام تدبیروں میں اس عجیب و غریب بے خطا تدبیر کا مقابلہ کون کر سکتا ہے، اپنی معاشی زندگی میں تدبیر کی اس راہ پر چلنے والوں کا سچ پوچھو تو یہی طرزِ عمل اُن کا وہ سلوک بن جاتا ہے جس کے لئے لوگوں نے خواہ مخواہ دنیا کی لذتیں کو ترک کیا، گھر سے چھوٹے، در سے چھوٹے اور پھر جیسا کہ قرآن کے حوالے سے بیان ہو چکا کہ جس مقصد کے لئے سلوک کی یہ راہ وہ اختیار کرتے ہیں، وہ بھی بیچاروں کو حاصل نہیں ہوتا۔ زندگی کی ان ہی معاشی کشمکشوں میں واقعہ تو یہ ہے کہ اسلام نے مسلمانوں کے لئے روحانی اور معادی ترقیوں کی ایک واضح راہ پیدا کر دی تھی۔ لیکن کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ معاشی ضرورتوں کے لئے مذہب کی اس راہ کا استعمال لوگوں نے کیوں ترک کر دیا۔ بدبختوں کا وہ گروہ جس پر رحمت کا دروازہ بند کیا گیا ہے اور اسی لئے دعا کے تاثیری نتائج کے متعلق اُن کے دلوں میں اتکار پیدا ہو گیا ہے۔ آخر حدیثوں میں جب آیا ہے

من فتح لہ فی الدعاء فتحت لہ	جس کے لئے دعا کی راہ کھولی جائے کھولا گیا اس
باب الرحمۃ۔	کے لئے رحمت کا دروازہ۔

تو پھر یہ بات سمجھ میں نہیں آتا، بایں ہمہ دنیوی یا اخروی تدبیروں کی یہ راہ اُن پر آسان ہے لیکن حصولِ مقصد کی جو آسان

ترین راہ تھی وہی ان کے لئے دشوار ہوگئی۔ تو اس کا مطلب مذکورہ بالا حدیث کی بنیاد پر اور کیا ہوسکتا ہے کہ اس کو نصیب پر رحمت کا دروازہ اس کے جرائم کی سزا میں بند کردیا گیا ہے۔ مگر ان کو تو خیر دور مار دیئے، تعجب تو ان پر ہے کہ جن کی ساری زندگی رحمتِ حق ہی کی تلاش میں بسر ہوتی ہے انھوں نے آخر کس بنیاد پر تمام دعائی وعباداتی، ایمانی ودینی مشاغل کا رُخ صرف "الآخرت" کی طرف پھیر دیا ہے۔ خود بھی اپنی معاشی مشکلات میں ان سے نفع اٹھانا نہیں چاہتے۔ اور ان مسلمانوں پر بھی کم ہمتی کوتاہ نظری کا الزام لگاتے ہیں۔ جو معاد دار الآخرت کے ساتھ ساتھ اپنی دینی اور دعائی زندگی کو معاشی کامیابیوں کا ذریعہ بنانا چاہتے ہیں، سن کر مجھے تو حیرت ہوئی جب مجھے یہ سنایا گیا کہ حصولِ صحت کے لئے دعا مانگنے سے بعضوں نے اس لئے انکار کردیا کہ اتنے بڑے خدا سے اتنی چھوٹی چیز یعنی دنیا میں تندرست رہنے کی دعا کیا مانگوں۔ کیسی عجیب بات ہے پیغمبر سے پیغمبر کے عم محترم حضرت عباسؓ نے جب پوچھا میں خدا سے کیا مانگوں، تو جواب میں فرمایا گیا۔

یاعم سل اللہ العافیۃ۔ — چچا جان! اللہ تعالیٰ سے صحت وتندرستی مانگیے۔

یہ بھی ارشاد فرمایا گیا،

فان احداً لم یعط بعد الیقین خیرا من العافیۃ۔ — یعنی ایمان کے بعد دنیا میں صحت سے زیادہ بہتر چیز کسی کو نہیں دی گئی۔

کس قدر تعجب ہے اسلام میں ایک مستقل نماز استسقا کی صرف اس لئے رکھی گئی ہے کہ مرنے کے بعد نہیں، بلکہ مرنے سے پہلے اسی "الحیوۃ الدنیا" میں آدمی اس نماز کے نتائج سے متمتع ومستفید ہو۔ لیکن کہنے والے کہتے ہیں کہ دین کو دنیا کیلئے استعمال کرنا، کوتاہ نظری ہے۔

قرآن کی ایک پوری سورت میں حق تعالیٰ کو الہ المعاش بنانیکا مطالبہ

اب کہنے والوں کو کوئی کیا کہہ سکتا ہے۔ عموماً نمازوں میں پڑھی جانے والی چھوٹی سورتوں میں مشکل ہی سے ایسا کوئی نمازی مسلمان ہوگا، اور جو مسلمان ہے وہ نمازی نہ ہوگا تو اور کیا ہوگا۔ بہرحال کون نہیں ہے جو سورۃ القریش یعنی عوام جسے لایلف والی سورت کہتے ہیں۔ دن میں متعدد بار فرائض وسنن ونوافل میں اس سورۃ کو نہیں پڑھتا۔ جو معنی نہیں جانتے ہیں کم از کم مطلب تو اس کا سمجھتے ہیں۔ پھر اس پوری سورۃ کا کیا مطلب ہے؟ حق تعالیٰ نے اپنی عبادت کا مطالبہ اس سورۃ میں جس بنیاد پر کیا ہے وہ یہی تو ہے کہ بیت اللہ (کعبہ) کے اس رب کو پوجو جو بھوک میں کھانا کھلاتا اور خوف سے جس نے امن عطا فرمایا ہے۔ پھر ان دونوں باتوں کا تعلق معاش سے ہے یا معاد سے؟ یہی نہیں بلکہ سورۃ کا آغاز جس ربانی احسان سے کیا گیا ہے۔ یعنی جس کو "فلیعبدوا" (پس پوجو رب ہذا بیت کو) اس مطالبہ کی وجہ قرار دیا گیا ہے وہ "رحلۃ الشتاء والصیف" کا ایلاف ہی تو ہے۔ یعنی تجارتی سفر گرما وسرما کے موسموں میں قریش جو کیا کرتے تھے۔ اور بیت اللہ کے محافظ وپڑوسی ہونے کی وجہ سے بے روک ٹوک اندرون عرب اور بیرون عرب میں تجارتی سامانوں کو لے کر گھومتے پھرتے تھے۔ رومی اور ایرانی حکومت نے کعبہ ہی کی نسبت کا خیال کر کے آزاد تجارت کا لائسنس ان کو دے رکھا تھا کیا یہ ساری باتیں معاشی احسانات ہی کے ذیل کی چیزیں نہیں ہیں تو اور کیا ہیں۔ الحمد للہ کامل ایک پوری سورت میں حق تعالیٰ کو [illegible] بنانے [illegible] میں مطالبہ کیا گیا ہے۔ [illegible] مضمون کے سوا کوئی دوسرا مضمون اس میں [illegible]

بیان کیا گیا ہے، لیکن اس پر بھی کہا جاتا ہے کہ حق تعالیٰ کو الٰہ المعاش بنا کر پوجنا دونِ ہمتی ہے تنگ نظری ہے
بہرحال میں تو یہی سمجھتا ہوں کہ پیغمبروں کی دعوت کا پہلا کلمہ

یا قوم اعبدوا اللہ ما لکم من الٰہ غیرہ (سورہ) — اے میرے لوگو! پوجو اللہ کو، نہیں تمہارا الٰہ سوا اس کے۔

انسانیت کو جو قرار دیا ہے۔ اس کا یہی مطلب ہے اور یہی ہو سکتا ہے کہ جن راہوں سے عمل پیدائش کا ظہور ہو رہا ہے۔ وہ تو خیر عقل و حواس کے سپرد ہیں۔ لیکن خود پیدا کرنے والے سے استفادہ جس فطری جذبہ کی رہنمائی میں دعا و عبادت، نذر و قربانی وغیرہ مختلف اشغال و اعمال کی صورت میں کیا جاتا ہے۔ اس جذبے کے تعلق کا مستحق اللہ کی ذات مبارک کے سوا کوئی دوسری طاقت نہیں، اسی کی دوسری تعبیر یہ ہے..... کہ اللہ کے سوا تمہارا کوئی الٰہ نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ موجودہ زندگی ہو یا مرنے کے بعد جو آنے والی زندگی ہے زندگی کی ضرورتوں سے استفادہ کی اس تدبیر کا تعلق ہے۔ یعنی اللہ ہمارا الٰہ ان حاجتوں اور ضرورتوں میں بھی ہے۔ جن کے ہم اس "الحیوٰۃ الدنیا" میں محتاج ہیں، اور ان میں بھی جو "الحیوٰۃ الاخریٰ" میں پیش آنے والی ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہئے کہ اللہ جو ہمارا "الٰہ الدنیا" بھی ہے وہ "الٰہ الآخرہ" بھی۔ یقیناً پیغمبروں نے حق تعالیٰ کی الوہیت کو "الدنیا یا الآخرہ" کسی ایک کی ضرورتوں کے ساتھ محدود نہیں کیا ہے۔ بلکہ عموماً اس دعوت کا خطاب جن لوگوں سے تھا اور جن کی غلطی کی تصحیح مقصود تھی، چونکہ استفادہ کی اس تدبیر کو عموماً وہ معاشی مشکلات ہی کی راہوں میں استعمال کرتے تھے، یعنی غیر اللہ کو الٰہ بنا کر جو کچھ مانگا جاتا تھا، وہ عام طور پر اسی زندگی کی چیزیں ہوتی تھیں مثلاً بارش برسائی جائے۔ مویشیوں کا دودھ اور ان کی نسل بڑھائی جائے۔ کھیتوں کی پیداواروں میں برکت دی جائے۔ آفتوں سے محفوظ رکھ کر باغوں کو پھلوں سے بھر دیا جائے، قحط کا ازالہ ہو، بیماریوں اور وباؤں سے ملک کو محفوظ رکھا جائے، اولادِ نرینہ بخشی جائے۔ دشمنوں پر فتح حاصل ہو، الی غیر ذالک من الامور المعاشیۃ، یقیناً غیر اللہ کی پوجا پاٹ، دعا و عبادت، نذر و قربانی وغیرہ سے جیسا کہ عرض کر چکا ہوں، عموماً اسی قسم کی چیزوں کا مطالبہ کیا جاتا تھا اور غیر اللہ کو الٰہ بنا کر جو انہیں پوجتے ہیں ان کی غرض بھی یہی ہوتی تھی۔ اور اب بھی اس مسلک کے جو پابند ہیں۔ ان کی غرض بھی یہی ہوتی ہے۔

اصنامی نظام معاشی نظام ہے

اور اسی لئے میرا خیال ہے کہ مشرک قوموں کا یہ نظام جس کا دوسرا نام اصنامی نظام ہے۔ یہ اصنامی نظام بالکلیہ ان قوموں کا ایک مستقل معاشی نظام تھا۔ آج بھی دنیا میں جہاں کہیں یہ نظام موجود ہے۔ بجز معاشی ضرورتوں کے ان سے قطعاً کوئی دوسرا کام نہیں لیا جاتا۔ کسی بت پرست کو نہیں دیکھا گیا ہے کہ وہ اپنے الٰہ یا معبودوں اور دیوتاؤں سے یہ مانگتا ہو کہ اسے عذابِ قبر سے بچایا جائے، حشر کی پریشانیوں میں مدد کی جائے، جہنم سے محفوظ رکھ کر جنت کی ابدی زندگی عطا کی جائے، ان نیک کاموں کی توفیق دی جائے۔ جن سے مرنے کے بعد سکون حاصل ہو، بلکہ جو کچھ مانگا جاتا ہے، وہ اسی دنیا کی ضرورتوں کے متعلق مانگا جاتا ہے۔ ایسی صورت میں ان سے پیغمبروں کا جو یہ مطالبہ تھا کہ بجائے غیر اللہ کے حق تعالیٰ ہی کو اپنا الٰہ بناؤ۔ مخاطب کے طرزِ عمل کی بنیاد پر اس مطالبہ کی سب سے پہلی غرض یہی ہو سکتی ہے کہ جن حاجتوں اور ضرورتوں کے لئے تم

غیر اللہ کو الہ بنائے ہوئے ہو، ان ہی حاجتوں اور ضرورتوں کے لئے بجائے اُن کے حق تعالیٰ کو اپنا الہ بناؤ چونکہ وہ اپنی دُنیاوی حاجتوں اور ضرورتوں میں غیر اللہ کو الہ بنائے ہوئے تھے؛ اس لئے کھلا ہوا مطلب یہی ہوا کہ اللہ کو الہ بنانے کا اُن سے جو مطالبہ کیا جاتا تھا۔ اس مطالبہ میں یہ بات بھی داخل تھی کہ جن اغراض کے لئے تم غیر اللہ کو الہ بنائے ہوئے ہو، اُن کے لئے بھی خالق حق تعالیٰ ہی کو اپنا الہ تمہیں بنانا چاہیے۔ اور جب یہی واقعہ ہے تو پھر سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ اسی اللہ کو ان ہی دُنیاوی حاجتوں اور ضرورتوں اور معاشی مشکلات کے لئے الہ بنانا یکایک تنگ نظری اور پست ہمتی کیوں ٹھیرادی گئی، حالانکہ جیسا کہ میں نے عرض کیا دعوتِ انبیاء کے اس کلمہ کا ابتدائی اور اوّلی رُخ دنیاوی زندگی ہی کی پیچیدگیاں ہیں، لوگ کسی غلبۂ حال اور ذوق و سرمستی کے زور میں ایک بات کہہ دیتے ہیں۔ لیکن آئندہ اس کے نتائج پر ان کی نظر نہیں ہوتی، پھر جب اس کے بُرے نتائج سامنے آجاتے ہیں تو ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں اور پوچھتے ہیں کہ ایسا کیوں ہوگیا، یہی مسئلہ ہے! ابتداء میں تو بیچاری دنیائے دنی نجس دنیا پاک کی ضرورتوں کو حقیر آنی جانی فانی ناقابل لحاظ غیر اہم ضرورتیں قرار دے کر خود بخود یہ رائے قائم کی گئی کہ حق تعالیٰ کی عظیم و برتر ہستی کے سامنے بھلا ایسی ہلکی چھوٹی موٹی بلکہ چھچھوری ضرورتیں کیا پیش کی جائیں، ان کے لئے تو عقلی تدبیریں کافی ہیں، البتہ آئندہ زندگی کے ہولناک مصائب مدہش جان گسل خطرات اس قابل ہیں کہ ان کے واسطے اللہ تعالیٰ سے التجا کی جائے کہ وہی ضرورتیں اس کی شایانِ شان ہیں، لیکن معاشی ضرورتوں اور دُنیاوی حاجتوں میں پیٹا ہوا انسان بیرونی مؤثرات کے تحت کچھ دن تو ممکن ہے، دُنیاوی ضرورتوں کے حصول میں استفادہ کے اس طریقہ سے رُک جائے یعنی دنیاوی ضرورتوں اور معاشی حاجتوں میں اللہ کو اپنا الہ نہ بنائے۔ اور ان کے لئے محض عقلی تدبیروں کو کافی سمجھے لیکن آدمی کا غیب طلب سیال ذہن زیادہ دن تک ناقص عقل کے ناقص معلومات ناقص تجربات والی تدبیروں پر بھروسہ کر کے ہمیشہ کے لئے کبھی مطمئن نہیں ہو سکتا، ہر ضرورت کی پیدائش میں محسوس قوانین و ضوابط کے پیچھے اس کی فطرت اشارہ کرتی ہے کہ نامحسوس اسباب کی بھی کڑیاں ہیں، وہ پاتا ہے کہ عقل کی راہ سے قابو میں زیادہ سے زیادہ وہی حلقے آسکتے ہیں جن تک حواس کی اعانت سے عقل پہنچ سکتی ہے۔ لیکن اس دائرہ سے جو باہر ہیں، ان کے متعلق مطمئن ہونے کی کیا صورت ہے۔

یہی نازک وقت ہوتا ہے کہ معاشی ضرورتوں کے غیبی سوالات کے متعلق اس کی راہنمائی اگر واقعی الہ یعنی ان ضرورتوں کے حقیقی پیدا کرنے والے خالق کی طرف نہیں کی گئی، تو احساس ضرورت کی شدت سے بے چین ہو ہو کر گھبرا کر ان ہی چیزوں کو وہ الہ بنالیتا ہے جن کے متعلق وہ خود ہی جانتا ہے کہ پیدا کرنے کے عمل کا اُن سے قطعاً کوئی تعلق نہیں ہے، مگر باوجود اس علم کے کہ جو پیدا کر رہا ہے ہم اس سے اس کی پیدا کی ہوئی چیزیں نہیں مانگ رہے ہیں پھر بھی مانگتا اسی سے ہے۔ اصنامی نظام والوں کے سامنے اپنے علم اور عمل کے تناقض کا یہ سوال ہمیشہ آتا رہتا ہے مگر چونکہ ایک غلطی دوسری غلطی کو پیدا کرتی ہے۔ کچھ اپنی قومی روایات کی پیچ، رسم و رواج کا دباؤ، بہر حال اُن کو مجبور کرتا ہے کہ علم و عمل کے اس تضاد میں توافق پیدا کیا جائے۔ پھر اس راہ میں توجیہوں اور تاویلوں کا جو جال پھیلایا گیا، اس کا قصہ طویل ہے۔ انتہا یہ ہوئی کہ یونانیوں کے اصنامی نظام کی تصحیح کے لئے جب ارسطو آمادہ ہوا تو اس کو یا آخر یہ دعویٰ کرنا پڑا کہ خدا ایک ہے اور ایک ایک ہی چیز کو پیدا کر سکتا ہے۔ اور یہی اس کی خاص وحدت کا

نہانی گمان ہے۔ مطلب یہ تھا کہ جب ہر چیز کا وہ خالق ہی نہیں ہے تو ہر چیز اس سے مانگی کیوں جائے[ف۱]۔ مگر اسی کے ساتھ ارسطو کا یہ قول بھی تھا کہ مادہ پر تمام صورتوں کا فیضان اول حق ہی سے ہوتا ہے۔ یعنی ہر چیز کا خالق وہی ہے۔ اور یہ اس فطری علم کا زور تھا جس کی قرآن نے خبر دی ہے۔ آج کون ہے جو ارسطو کے اس دماغی خبط کو سلجھا سکے؛ اور یہ تو فلسفہ کے پُر رعب نام سے خواص کو مطمئن کیا جاتا تھا۔ مشرکین کے عوام کو تمثیل کے مغالطہ میں مبتلا کیا گیا، خدا کو انسانی بادشاہ فرض کر کے باور کرایا گیا کہ گو سب حکم و احکام بادشاہ ہی کے چلتے ہیں۔ لیکن بہرحال بادشاہ سے کوئی چیز اسی وقت حاصل ہو سکتی ہے۔ جب ماتحت حکام کو بھی خوشامدوں سے راضی کیا جائے۔ اُن کے پاس کچھ تحفے تحائف کی ڈالیاں پیش کی جائیں۔ لیکن جب پوچھا جاتا ہے کہ بادشاہ تو اہلِ غرض کے حال سے ناواقف ہوتا ہے، مجبوراً اپنے ماتحت حاکموں سے اسے علم حاصل کرنا پڑتا ہے۔ اس لئے ماتحتوں کو بھی راضی رکھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ تاکہ بادشاہ کے پاس اہلِ غرض کے حسبِ منشاء رپورٹ کریں۔ عامیوں سے پوچھا جاتا ہے کہ خُدا جو ہر چیز کا پیدا کرنے والا اور خالق ہے۔ وہ کیا کسی چیز سے ناواقف بھی رہ سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ آدمی کا فطری علم اس سوال کے جواب میں بجز استغفر اللہ کے اور کیا کہہ سکتا ہے[ف۲]۔

بہرحال باوجود ان تمام حماقتوں اور تہافتوں کے پھر بھی معاشی ضرورتوں کے لئے غیر اللہ کو لوگ اڑ بناتے ہوئے چلے ہی جا رہے ہیں اور یہ صرف ایک غلطی کا نتیجہ ہے کہ دنیاوی ضرورتوں کو اللہ کے آگے پیش کرنا اس کی شان سے بدرجہ گری ہوئی بات قرار دی گئی۔ یہی وہ راز ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خصوصیت کے ساتھ مسلمانوں کو یہ حکم دیا کہ

[ف۱] ارسطو نے اس کے بعد عقول عشرہ کے نظریہ کے ساتھ ہر ہر فلک میں ایک مجرد روح اور ایک حیوانی نفس کو ثابت کر کے گویا یونانیوں کے دیوتاؤں اور دیویوں کے وجود کو فلسفا دیا۔ اللہ میاں کو تو معطول اللہ بنا کر دھنک کی زنجیروں میں جکڑ دیا گیا مجبوراً آدمی ان ہی زندہ روحوں سے نہ مانگے تو اور کیا کرے۔ مترقیہ نے رب النوع کے نظریہ سے اصنامی نظام کی تصحیح کی۔ اس لئے میرا خیال ہے کہ الٰہیات کے نام سے اثولوجیا کا جو ترجمہ یونانی زبان سے عربی میں ہوا۔ یہ دراصل وثنیت در شرک و بت پرستی کا علم کلام تھا جس میتھالوجی (خرافیات) میں اُن کا ملک مبتلا تھا اسی کو اثولوجی (تھیالوجی) کا نام دیکر انھوں نے فلسفیانہ تعبیروں کے زور سے اُسے فلسفے کی شاخ بنا لیا ۱۲

[ف۲] وہ شفاعت جو بادشاہ کے جہل و ناواقفیت پر مبنی ہوتی ہے، چونکہ حق تعالیٰ میں اس کی گنجائش نہیں اس لئے عوام کو سکھایا جاتا ہے کہ شفاعت کے دوسرے پہلو سے فائدہ اٹھائیں یعنی ہم گنہگار ہیں حق تعالیٰ ہماری بات سن نہیں سکتے۔ لیکن ظاہر ہے کہ شفاعت کے اس پہلو میں بھی تو یہی ضرورت پیش کی ہے کہ جس کا آدمی خطاکار ہے اس کی نگاہوں میں کم از کم اتنی وقعت تو پیدا کرے کہ خود اس کے کہنے سے نہیں تو کسی قابلِ احترام معزز ہستی کے کہنے سے اس پر رحم کیا جائے۔ اور ایسی صورت میں ظاہر ہے کہ سفارش کرنے والوں کی نہیں۔ بلکہ جس کے پاس سفارش کرانا مقصود ہو۔ ممکنہ حد تک اس کو راضی کرنے کی کوشش کی جاتی ہے اور اسی کو شفاعت ماذونہ کہتے ہیں۔ قرآن میں جہل والی شفاعت اور شفاعت ماذونہ دونوں کا ذکر کر کے شفاعت کی پہلی قسم کو حق تعالیٰ کی شان سے بعید قرار دے کر دوسری قسم کی تصحیح کی گئی ہے جو حق تعالیٰ کی اجازت اور اذن پر موقوف ہے۔ اور اسی لئے اس شفاعت کے حاصل کرنے کے لئے شفاعت کرنے والوں کی عبادت و خوشامد کی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ اُسی کی عبادت اُسی کی منت و سماجت کی جس کے اذن و اجازت پر یہ شفاعت موقوف ہے ۱۲

یسأل احدکم ربه حاجاته کلها	چاہیئے کہ تم میں سے ہر کوئی اپنی حاجت خدا سے
حتی یسأل شسع نعله اذا انقطع	اپنی ہر ہر حاجت کو حتی کہ مانگے اللہ سے تسمہ
(رواہ الترمذی)	جوتی کا جب وہ ٹوٹ جائے۔

ایک دوسری روایت میں ہے کہ

حتی ملح عجینه	حتی کہ اپنے خمیر کا نمک بھی۔

مطلب یہی تھا کہ جب ہر چیز چھوٹی ہو یا بڑی۔ دنیا کی ہو یا آخرت کی سب کی پیدا کرنے والی تنہا حق تعالیٰ کی ذاتِ مبارک ہے۔ تو پیدا کرنے والوں سے ان چیزوں کے حاصل کرنے کا جو طریقہ ہے۔ اس طریقے سے بڑی ہی چیزیں، یا آخرت ہی کی چیزیں کیوں مانگی جائیں۔ بلکہ سب کچھ مانگنا چاہیئے حتی کہ خمیر میں ڈالنے کے نمک کی کنکری وہ بھی، کاش! آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اس سے جو مقصد مبارک تھا۔ وہ سمجھا جاتا تو معاشی ضرورتوں کے لئے اللہ کو اپنا بنانے کا طریقہ رفتہ رفتہ مسلمانوں میں سے مفقود نہ ہو جاتا۔ اور بڑی خرابیت اسلامیہ کے ایک بڑے طبقے نے ان ہی معاشی حاجتوں اور ضرورتوں کے لئے مختلف ناموں سے جو اللہ آج تراش لئے ہیں۔ اور جسے دیکھ کر اہلِ ایمان کا کلیجہ پھٹا چلا جاتا ہے۔ کہ ایک طرف غربت و فلاکت کے ان دنوں میں آج بھی مسلمانوں کی سب اُن کا وقت اُن کی توانائیوں کی بہت بڑی مقدار ان کا حاصل تدبیروں پر صرف ہو رہی ہے۔ اور یہ تو دنیا میں ہو رہا ہے۔ خُدا ہی جانتا ہے کہ اس جانے میں لنتوں کے سمان و افعال شرک جلی کے ان حدود تک پہنچے ہوئے ہیں جنکے بعد اخروی زندگی کی ان تباہیوں سے کوئی بچ نہیں سکتا جس کی تلافی پھر کسی وقت کسی صورت ممکن نہیں ہے۔

ان اللہ لا یغفر ان یشرک به	قطعاً خدا نہیں بخشتا یہ بات کہ شریک ٹھہرایا جائے
(النساء ع۱۸)	اس کے ساتھ کسی کو۔

قرآن کا اٹل اور قطعی فیصلہ ہے۔

<u>معذرت</u> | اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ایک "معاشیاتی مقالہ" میں شرک و توحید، عبادت و دعا کے ان مباحث و مسائل کا ذکر اور وہ بھی اتنی دراز نفسیوں کے ساتھ بظاہر دیکھنے والوں کو عجیب معلوم ہوگا۔ لیکن ظاہر ہے کہ میں اسلامی معاشیات کو بیان کر رہا ہوں۔ نہ کہ عصری معاشیات و اقتصادیات کے مسائل پر میں نے قلم اٹھایا ہے میری یہ علمی خیانت اور بد دیانتی ہوتی کہ معاشیاتی فلاح و بہبود کے سلسلے میں اسلام نے جو تدبیریں پیش کی ہیں ان تدبیروں میں سے کسی جز کو اپنا زمانہ کے مسخراو ٹھٹھوں کے خوف سے قلم انداز کر دیتا جبکہ روزی کی دوسری عقلی تدبیروں کے ساتھ ساتھ اللہ کو اپنا بنانے کی مقدس تدبیر سے آج دنوں میں جو غفلت و انحراف پیدا ہو چکا ہے۔ ظاہر ہے کہ ان پر ہماری یہ باتیں ضرور گراں گذر رہی ہوں گی۔ ان کے قلوب مجھ پر افسوس اور عقل قہقہے لگا رہی ہوگی۔ ایسوں کے آگے قرآنی آیت

امن هذا الذی یرزقکم ان	کیا یہ جو کوئی بھی ہے روزی دے
امسک رزقه بل لجوا فی عتو ونفور	اپنی روزی کو، بلکہ اڑے جاتے ہیں سرکشی
(الملک ع۲/۲۹)	اور بھڑک میں۔

پڑھ کر چپ ہو جاتا ہوں جن دلوں میں اب تک اس کا یقین باقی ہے کہ جو پڑھا گیا وہ کسی بندے کا نہیں بلکہ رزاق ذو القوۃ المتین کا کلام ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ اس کے سننے کے بعد وہ کیوں نہ لرز اٹھیں گے۔ نہ سوچنے والوں کو کیا کہیے۔ آج حصول معاش کی راہ میں تدبیر کے اس شعبہ کو غلط طریقے سے استعمال کرنے والے دنیا کے بڑے بڑے علاقوں میں لاکھوں اور کروڑوں روپے صرف کر رہے ہیں۔ ورنہ آج کیا ہمیشہ مختلف اقوام و امم کے قدیم آثار کو جب کہ دیکھا جاتا ہے۔ صنامی نظام جس کے متعلق یہ بتا چکا کہ بالکلیہ وہ ایک معاشی نظام ہے۔ اس کی بقا و استحکام، اور اس نظام کے متعلقہ معبودات و انداد کی عبادت کے مدعیوں کی اعانت و امداد میں عوام و خواص بلکہ ہر ملک کی حکومتوں نے یقیناً اس سے زیادہ اور بہت زیادہ صرف کیا ہے جتنا اس زمانے میں موجودہ معاشی تدبیروں کی پابجائی میں پبلک اور حکومتیں، بنکوں، بیمہ کمپنیوں، اتحادی انجمنوں، اور معاشیات کے پروفیسروں، کتابوں وغیرہ پر خرچ کر رہی ہیں۔ دنیا کا ایک ایک مندر موجودہ عہد کے دس دس کالجوں کی قائم مقامی کر سکتا ہے۔ اس زمانے کا ایک ایک پجاری بڑی بڑی جاگیروں کا مالک تھا، اتنی بڑی کہ عصر حاضر کے دس دس ماہرین معاشیات کی تنخواہیں اس سے ادا ہو سکتی تھیں۔ ظاہر ہے کہ صنامی نظام حصول معاش کی قطعاً بے بنیاد، بے حاصل تدبیر تھی، "اسلام اور اسلامی تعلیمات" کے سوا آج دنیا میں کس کے پاس ایسی طاقت ہے جو حصولِ معاش کے اس "غلط نظام" سے انسانیت کو نجات بخشے، اور بنی آدم کی کمائی ہوئی آمدنیاں، خدادادتو نائیاں اس راہ میں جو بلاوجہ ضائع ہو رہی ہیں، اُن کا انسداد کرے؟

یہی غرض تھی جس کی وجہ سے اس باب میں مجھے کافی طوالت سے کام لینا پڑا۔ لیکن جو کچھ کہا گیا ہے جس طریقہ سے کہا گیا ہے۔ اگر خلوص و صداقت سے اس کی اشاعت کی گئی، تو جو معاشی خدمت کسی سے بن نہیں آتی ہے اسلام کے ذریعہ ان شاء اللہ تعالیٰ اس میں ضرور کامیابی ہوگی واللہ غالب علیٰ امرہ ولکن اکثر الناس لا یعلمون۔

خلاصہ یہ ہے کہ آلہہ باطلہ (غلط معبودوں) سے انسانیت کا معاشی تعلق اس وقت تک ٹوٹ نہیں سکتا، قطعاً نہیں ٹوٹ سکتا جب تک کہ پیدا کرنے والا خالق (اللہ)، الہ المعاش بھی بن کر اس کے سامنے نہ آجائے۔ ایسا الہ المعاش جو ہر وقت ہر حال میں ہر جگہ اس کے ساتھ ہو، اس کے پاس ہو۔ اس کو محیط ہو، ظاہر و باطن اول و آخر سب پر وہی حاوی ہو جائے چھا جائے، آج فکری انقلاب اور اعتقادی ہلچل پیدا کرنے والی کتابوں میں قرآن کے سوا اور کونسی ایسی کتاب نسلِ آدم کے پاس موجود ہے جس سے بوجہ الاتم اس ناگزیر انسانی ضرورت کے حل کرنے کا کام لیا جا سکتا ہے۔ وہی انسان جو زندگی کے تمام شعبوں میں اعانت تو حق تعالیٰ سے حاصل کرتا تھا لیکن جن دوسرے

لے سی سے دیکھا جاتا ہے کہ اس نظام کے تحت زندگی گذارنے والوں کے زندگی کے پہلوؤں پر اس نظام کا کوئی اثر مرتب ہوتا ہے اور نہ خود زندگی کے عملی ولولوں میں کوئی جنبش و حرکت پیدا ہوتی ہے، اس کی وجہ ظاہر ہے کہ ان آلہہ اور دیوتاؤں کو اپنی معاشی ضرورتوں کے لئے یہ پوجتے ہیں۔ نہ ان کی طرف سے ان کو کوئی آئین حیات اور دستور اخلاق ملتا ہے۔ نہ مرنے کے بعد ان معبودوں اور ان کے پوجنے والوں میں کسی آنے والے تعلق کی اطلاع دی جاتی ہے، اسی لئے ایک خالص دہریہ پرست اور بت پرست کی زندگی میں ان حیثیتوں سے کوئی فرق نہیں ہوتا، اسی لئے میں اصنامی نظام کو بجائے مذہبی نظام قرار دینے کے ایک خالص معاشی نظام سمجھتا ہوں ۱۲

گا رہا تھا، یقیناً اسی کتاب نے ایاک نستعین (ہم تجھی سے تیری ہی پیدا کی ہوئی چیزوں سے مدد حاصل کر رہے ہیں کے اقرار کرنے والی فطرتوں، جبلتوں کو ایاک نعبد (یعنی اسی لئے تجھ ہی کو، پوجتے ہیں اور تجھ ہی سے مانگتے ہیں، کے صراطِ مستقیم پر چلا دیا، اسی کی بے لاگ، خرخشوں، دغدغوں سے بالکل پاک آسمانی آواز کا زور تھا کہ دفعتاً روئے زمین کے بڑے حصوں کی بڑی بڑی آبادیوں کا جو واقعی مستعان تھا۔ وہی ان کا معبود بھی بن گیا۔ اور خواہ دوسروں کی کچھ ہی رائے ہو لیکن میرے نزدیک تو آدمی جس کا کھا رہا ہے۔ اسی کا گن گائے۔ اس مقصد میں کامیابی اس وقت تک نہیں ہو سکتی جب تک لہ الآخرۃ (آخرۃ اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے) کے ساتھ لہ الاولیٰ (دنیا کے معاملات بھی اسی کے قبضۂ قدرت میں ہیں) کے قرآنی یقین کو بھی دلوں میں پوری طاقت کے ساتھ بیدار نہ کیا جائے اور یہ کہ

من کان یرید ثواب الدنیا فعند اللہ — جو چاہتا ہے دنیا، تو اللہ کے پاس دنیا کا

ثواب الدنیا والاٰخرۃ (النساء ۵/۱۴) — ثواب بھی ہے اور الآخرۃ کا بھی۔

کے صلائے عام کو دنیا کے آخری کناروں تک پہنچانے میں کوشش کا کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا جائے۔ جو واقعہ ہے وہ کہا جائے گا۔ اور کہنے سے مجھے کوئی روک نہیں سکتا کہ بلبلاتے بچوں، بے سہارا عورتوں کی فکر میں چور بھوکے پیٹ اور ننگے بدن والے پراگندہ روزی، پراگندہ دل۔ انسان کی تسلی نہ ان لمبے چوڑے وعدوں فقط وعدوں سے ہو سکتی ہے۔ جن کی تجارت تعلیمی حلقوں اور اشاعتی اداروں، اقتصادیات و معاشیات، اکانومی و کفایت شعاری وغیرہ مختلف پر شوکت ناموں سے اس دعویٰ کے ساتھ ہو رہی ہے کہ جو کچھ محسوس ہو رہا ہے، پیدائش کی ان ہی راہوں اور صرف ان ہی راہوں کو عقل کے قابو میں لانے کے ساتھ ہی وہ سب کچھ مل جائے گا، جس کے بغیر آدمی دل کے چین اور جان کے آرام سے محروم ہے۔ اور نہ محفل حال کی ان راہیانہ خیالی اور صرف خیالی بلند پروازیاں اس زمینی انسان کو آسمانی فرشتہ بنا کر اتنا وسیع النظر، رفیع العزم بنانے میں کامیاب ہو سکتی ہیں کہ اپنی معاشی ضرورتوں کو مذہبی جذبے کی رہنمائی میں غیب سے حاصل کرنے میں وہ شرمانے لگے۔ یقیناً نہ وہ ہو سکتا ہے اور نہ یہ، پھر دو ہی صورتیں ہیں۔ کروڑہا کروڑ روپوں کی تھیلیاں ہر سال معاشی استفادے کے بے بنیاد وہم کی شکار ہو کر باطل الٰہ وہی معبودوں، من مانے اختراعی ڈھکوسلوں کی راہوں میں قومیں جو دنیا کے اکثر حصوں میں لٹا رہی ہیں، بے دریغ انتہائی بے دردی کے ساتھ لٹا رہی ہیں۔ خدا کے لئے نہ سہی، انسانیت ہی کے تمام فرائض کو بالائے طاق رکھ کر ٹھکرا کر انھیں لٹنے دیا جائے، اقتصادی نظام اور معاشی جسد کے اس ناسور کو چھوڑ دیا جائے! انتہائی بے رحمی کے ساتھ بہنے، بہتے رہنے کے لئے چھوڑ دیا جائے صرف اس قوم کے جابرانہ اکراہی مغالطہ کے نیچے دب کر چھوڑ دیا جائے۔ جو کالر کے رنگوں اور نکٹائی کے بندشوں کی غلطیوں کے ٹوکنے کو بھی اپنا (ایٹی کٹ) یا آدابی فرض اور حق خیال کرتی ہے۔ لیکن مذہب کے نام سے خواہ کتنی ہی خطرناک مہلک ہمالیائی غلطی کا ارتکاب کیا جا رہا ہو، انہوں کو باور کرایا گیا ہے کہ اس کے متعلق لب ہلانا بھی جرم اور بدترین روادارانہ جرم ہے۔ پس اس جرم سے بچنے کے لئے خدا کے مجرم اور انسانیت کے مجرم بننے پر صبر کر لیا جائے، یا پھر پیاسے کو پانی دے کر پیشاب پینے سے، بھوکے کو روٹی دے کر کیچڑ کھانے سے روک دیا جائے، دوسرے لفظوں میں جو واقعی پیدا کرنے والا ہے اسی کو آدمیوں کا الٰہ المعاش بنا کر ان چھوٹے اور جھوٹے معاشی الٰہوں سے نجات بخشی جائے اور یوں اخروی خساروں کے ساتھ اس عظیم الشان معاشی تاوان سے انسان کے معاشی نظام کو بچا لیا جائے۔

اس دشواری کے حل کی سہولت

یوں کہنے کے لئے آدمی کی زبان جس چیز کو چاہے دشواریاں ممکن ٹھیرا لے لیکن سچ یہ ہے کہ اللہ ہی کو اپنا الٰہ مان لینا یہ غیر معمولی آسان بات تھی کہ شاید ہی دنیا کا کوئی لاہوتی یا معاشی مسئلہ اتنا آسان ہو۔ آخر اللہ کو الٰہ بنانے کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہے کہ کسی دوسرے سے نہیں بلکہ پیدا کرنے والے ہی سے اس کی پیداواروں کو مانگا جائے، بتایا جا چکا ہے کہ علم و یقین کی جس لازوال اساس پر تدبیر کا یہ شعبہ مبنی ہے یعنی یہ مقدمہ کہ ہر چیز کا پیدا کرنے والا اللہ ہی ہے، یہ ایسا دعویٰ ہے کہ جس پر کبھی بحث کیا جاتا ہے۔ وہ قدرت کی طرف سے اس دعویٰ کے "وجدان" کو اپنی فطرت کے خمیر میں گندھا ہوا پاتا ہے، معمولی تنبیہ سے اس میں یہ شعور جگ اٹھتا ہے کہ خلق و ربوبیت کی توحید کا یہ اقرار اس کی جوہر ذات میں گھلا ہوا ہے، قرآن نے اس کی خبر دی ہے، تجربہ اس کا شاہد ہے، ظاہر ہے کہ اس کا یہی مطلب ہوا کہ قدرت نے خود کافی ہو کر استدلال و احتجاج کے تمام جھنجھٹوں سے اس مسئلہ میں ہمیں بے نیاز کر دیا ہے۔ کھلی ہوئی بات ہے کہ جب ہر چیز کا پیدا کرنے والا اللہ ہی ہے تو پیدا کرنے والے سے اس کی پیدا کی ہوئی چیزوں کے مانگنے کے لئے

ان اعبدونی هذا صراط مستقیم (یٰسین ۲۲/۴)	یہ کہ پوجتے رہنا مجھ ہی کو، یہی ہے راہ سیدھی۔

کی تعمیل کے سوا آدمی کے لئے چارہ کار ہی کیا رہ جاتا ہے، اور اللہ کو الٰہ ماننے کے ساتھ ہی الٰہ باطلہ کا نظام درہم برہم ہو کر علاوہ اخروی فوائد کے معاشی خساروں اور تاوانوں کی وہ ساری راہیں دفعتاً خود بخود مسدود ہو جاتی ہیں جن کی بے حاصلی کو دیکھ دیکھ کر بصیرت والوں نے ہمیشہ خون کے آنسو بہائے۔

الملائکہ یا زندہ روحوں کے متعلق قرآن کا بیان

اب اس سلسلہ میں قرآن اور کیا کرتا، خدا کے سوا کسی دوسرے کے متعلق پیدا کرنے یا خالق ہونے کا شبہ کبھی ہوا نہ ہو سکتا تھا، لیکن یہ واقعہ تھا کہ پیدائش کے محسوس ذرائع کی چونکہ ان غیبی زندہ ذرائع اور قوتوں پر انتہا ہوتی تھی جن کا مختلف ممالک میں "الملائکہ" "فرشتے" "دیوتا" وغیرہ نام تھا، زیادہ سے زیادہ اگر الوہیت کا کچھ اندیشہ ہو سکتا تھا اور اکثروں کو ہوا، تو وہ یہی "الملائکہ" ہو سکتے تھے۔ اگرچہ ان کو خالق اور پیدا کرنے والا نہ سمجھنا ان کے الٰہ ہونے کی تغلیط و تکذیب کے لئے کافی تھا، لیکن آدم کو الملائکۃ کلھم اجمعون کا مسجود بنا کر ان لاحاصل مصارف کے دروازے جو ان کی پوجا پاٹ میں کھلے ہوئے تھے۔ قرآن نے اچانک بند کرا دیئے۔ آخر جب انسان اور اس کی انسانیت کا مقام اتنا بلند ہے کہ ان ہی دیوتاؤں یا "الملائکہ" کو آدم کے سجدے میں گرایا گیا، تو پھر سلسلۂ کائنات و مخلوقات کی اور کون سی ہستی اس کی مستحق رہ جاتی ہے جس کے آگے آدمی جھکے۔ موسیٰ علیہ السلام نے اسرائیلیوں کو مخاطب کر کے کتنی صحیح بات فرمائی تھی جسے قرآن نے بھی نقل کیا ہے

قال اغیر اللہ ابغیکم الٰھا وھو فضلکم علی العالمین۔ (الاعراف ۹/۹)	موسیٰ نے کہا کیا اللہ کے سوا تمہارے لئے کوئی اور الٰہ ڈھونڈھوں، حالانکہ اس نے تو برتری بخشی ہے تمہیں سارے جہان پر۔

ترجمان الاسلام مغفور ڈاکٹر اقبال نور اللہ مرقدہٗ نے قرآن کی اسی قسم کی آیتوں کے مفاد کی تعبیر اپنے اس مشہور شعر میں کی تھی

در دشت جنون من جبریل زبوں صیدے
یزداں بکمند آور اے ہمت مردانہ

انسانیت کے بلند مقام اور اصنامی نظام میں اس کی جو درگت بنی ہے مولینا روم نے بھی ع

مفروش خویش ارزاں کہ تو بس گراں بہائی

کے الفاظ میں اشارہ فرمایا ہے۔

ایک معاشی مسائل کی کتاب میں اس خالص مذہبی سوال پر بحث پڑھنے والوں کے لئے خواہ یک بے محل شئ ہی کیوں نظر نہ آئے لیکن کیا کروں آئندہ پیش آنے والے معادی مصائب و شدائد کے سوا میری آنکھیں جن معاشی تباہیوں کا مشاہدہ اس راہ کی غلطیوں کی وجہ سے کر رہی ہیں، بے دردی کے ساتھ اصنامی نظام کے ٹھیکیداروں نے انسانی توانائیوں کی کمائی ہوئی دولت پر دھاوا بول دیا ہے، مزورتوں اور حاجتوں میں جکڑے ہوئے انسان کی عقلی کمزوریوں وہمی میلانات سے نفع اٹھا کر ان پر ظلم روا رکھا گیا ہے۔ اور کمال یہ ہے کہ بے دینوں کا طبقہ دین اور دھرم ہی کے نام سے کر رہا ہے، جو کچھ کر رہا ہے، مذہب کا نام سن کر دنیا چپ ہو جاتی ہے۔ سب کچھ جاننے اور سب کچھ سمجھنے کے باوجود چھوڑ دیا گیا ہے کہ انسان نما درندوں کا یہ گروہ جاہل انسانوں کو پھاڑے اور پھاڑ کر کھا جائے اور نگل لے، جو کچھ سامنے آنے والا ہے، اگر دلوں میں اس سے ڈر نہیں پیدا ہوتا تو کم از کم ان معاشی تباہیوں ہی کے تدارک کے لئے انسانیت کے بہی خواہوں کو اٹھنا چاہئیے۔ بھیڑیوں کے منہ سے آدمی کے بچوں کو چھڑانا چاہئیے۔

علمائے اسلام کا وہ طبقہ جو عام مسلمانوں میں شیخ سدو کے بکروں، خواجہ خضر کی بیڑوں۔ درائیں قبیل بیسیوں واہی خرافات کو دیکھ دیکھ کر کڑھتا رہتا ہے، اور منبر و محراب کو اپنی ڈانٹوں اور جھڑکیوں سے ہلائے ہوئے ہے۔ اس سے میں پوچھتا ہوں کہ باوجود سب کچھ کہنے، سب کچھ سنانے کے آپ کی تقریروں کا اثر آپ کے مصقول سے باہر کیوں محسوس نہیں ہوتا، آپ کی دھمکیاں صرف مسجدوں اور مدرسوں کی دیواروں سے ٹکرا کر صرف آپ ہی کی طرف کیوں واپس ہو رہی ہیں، کیا بات ہے کہ تاویلوں اور توجیہوں کی آڑ میں کرنے والے وہ سب کچھ کر رہے ہیں جو وہ کرنا چاہتے ہیں۔ یہ خیال تو یقیناً غلط ہے کہ مسلمانوں کا یہ عام گروہ جو ان خرافی اوہام و رسوم کا شکار بنتا ہے۔ وہ اللہ کا منکر ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت و رسالت میں اس کو شک پیدا ہو گیا ہے۔ قرآن ان کے نزدیک خدا کی کتاب باقی نہیں رہی ہے، مسلمانوں کے اس ارتداد کا میں قطعاً قائل نہیں ہوں، وہ ضرور کے اسباب کی یہ تشخیص غلط اور قطعاً غلط ہے، مشاہدہ اور معائنہ کے خلاف ہے۔ البتہ اگر جان کی امان دی جائے تو میں کہہ سکتا ہوں کہ اللہ کے کلام اور رسول کی باتوں کے استعمال کرنے میں ان ہی بزرگوں سے شاید کچھ چوک ہو رہی ہے جنھیں ان چیزوں کے استعمال کا قدرتی حق حاصل ہے۔

آخر میں پوچھتا ہوں کہ لات و منات، ہبل و عزیٰ سے عرب کے جاہلوں کو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے جب چھڑایا تھا تو کیا اس حکم اور مشورہ کے ساتھ چھڑایا تھا کہ اپنے فرضی جھوٹے معبودوں سے وہ اپنی جن ضرورتوں کو مانگا کرتے تھے چونکہ وہ ادنیٰ درجہ کی دنیاوی ضرورتیں ہیں۔ اس لئے خالق کے آگے اپنی ان ضرورتوں کو نہ پیش کریں، بلا شبہ یہ ایک خلاف واقعہ اور غلط دعویٰ ہوگا، بلکہ بات یہی تھی کہ جو کچھ بھی اپنے معبودوں اور دیوتاؤں سے مانگا کرتے تھے، حکم دیا گیا تھا کہ ان ہی کا مطالبہ خدائے واحد سے کریں۔ جو کچھ مانگا جاتا تھا۔ اس میں کوئی تبدیلی عمل میں نہیں آئی تھی بلکہ جس سے مانگا جائے۔ صرف وہ بدل دیا گیا تھا۔ بہرحال مجھے اپنے اس خیال پر

اسرار اور [illegible] معاشی دشواریوں اور دُنیاوی حاجتوں ہی نے عام مسلمانوں کو ان ناگفتہ بہ امور میں مبتلا کر دیا ہے، عموماً ان بدعات، اور شرکی کاروبار کے پیچھے غور کیا جائے گا تو معاشی محرکات ہی پوشیدہ نظر آئیں گے۔ یہ خیال کہ ان اعمال و اشغال کی تہ میں کوئی دینی یا اعتقادی، اخلاقی یا روحانی محرکات چھپے ہوئے ہیں۔ صرف ایک بے بنیاد خیال ہے، صرف زبانی دعوے ہیں جن کا صحیح احساس شاید بولنے والوں کو بھی اس وقت نہیں ہوتا جب وہ اپنے ان اعمال و افعال کی توجیہہ میں طرح طرح کی خوش اعتقادیوں کو پیش کرتے ہیں۔ یقین مانیے خدا کو الٰہ المعاش بنا کر جب تک مسلمانوں کے سامنے آپ نہیں پیش کریں گے، اُس وقت تک صرف الٰہ المعاد والے خُدا سے وہ تعلق ان کا قطعاً قائم نہیں ہو سکتا جس کا مطالبہ قرآن میں ہر مسلمان سے کیا گیا ہے معادی خدا جو صرف الآخرۃ میں سزا و جزا، یا الجنۃ والنار کا مالک ہے۔ اُن جھوٹے خُداؤں سے کیسے بے نیاز کر سکتا ہے جن کے متعلق باور کرانے والوں نے باور کرا رکھا ہے کہ اُن میں کوئی نوکری دلاتا ہے، کوئی اولاد تقسیم کرتا ہے۔ کوئی جنوں کو بھگاتا ہے۔ کوئی دشمنوں کو شکست دیتا ہے، ہاں وہی خُدا جو الٰہ المعاد ہے۔ وہی الٰہ المعاش بنا کر بھی مسلمانوں کے سپرد جب کر دیا جائیگا تو اس وقت بلاشبہ انسان کی فطرت ان جھوٹے اور جھوٹے معبودوں کو خود بخود چھوڑ بھاگے گی ؎

تا نہ بیند کودکے کو سیب ہست　　　او پیاز گندہ را ندہد ز دست

یعنی سیب دیتے نہیں آپ اگر چاہتے ہیں کہ بچہ بدبودار پیاز کو چھوڑ دے تو آپ کا یہ ایک غیر فطری مطالبہ ہے۔ کون نہیں جانتا [illegible] کے آگے تڑپنے کے لئے منتظر، و مصیبت زدہ انسان تیار ہو جاتا ہے اور آپ دیکھ رہے ہیں، اپنی ان ہی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ تڑپ رہا ہے ان کے قدموں پر اپنا سب کچھ حتی کہ کبھی کبھی جان عزیز کے نثار کرنے تک سے دریغ نہیں کرتا۔ خیال تو کیجئے کہ ان ہی ضرورتوں کے لئے اگر اس کو واقعی مالک الملک ارحم الراحمین کے قدموں پر لوٹنے کی دعوت دی جائے۔ تو کیا وہ اس سے اعراض کر سکتا ہے۔ لیکن دین کے سارے زندہ تعلقات اس زندگی میں جب خدا سے توڑ لئے گئے ہیں تو بدقسمت حماقت پسند انسان آپ ہی بتائیے کہ آخر شدتِ تکلیف میں خود اپنے ہاتھوں کے بنائے ہوئے بتوں کے سامنے اگر کھڑا ہو گیا تو تو اس میں کیا صرف اسی کا قصور ہے؟ ہم پردیوں کی یہ انتہا ہے کہ عوام ہی نہیں، اچھے پڑھے لکھے مولویوں سے بھی جب کلمۂ دعوت لا الٰہ الا اللہ کا ترجمہ پوچھا جاتا ہے۔ تو بتا دیا جاتا ہے کہ اللہ ایک ہے۔ بس یہی اس کا حاصل ہے۔ حالانکہ یہ نہ اس کا لفظی ترجمہ ہے نہ یہ اس کا مفاد ہے، آخر اگر اللہ میاں ایک ہیں یہی اس کا مطلب ہے تو پھر اس میں غریب بندوں کا کیا فائدہ؟ کس قدر عجیب بات ہے کہ کچھ ہے ہوتا انسان کو اسی لفظ الٰہ کے حلقہ سے اپنے بچھڑے ہوئے مالک اور رب سے جوڑا گیا تھا، بتلایا گیا تھا، ہر قوم کو ہر زمانے میں، ہر ملک میں بتلایا گیا تھا۔ کہ زندگی کی تمام ضرورتوں، ورکشمکش حیات کی تمام مشکلات اور دشواریوں میں تنہائی عاجزی اور نیازمندی، مسکنت و [illegible] اور بیچارگی کی تنہائی شکلوں کے ساتھ جان و دل کی پوری قوت سے جس کی طرف نہیں بھاگنا چاہئے، ہر حال میں بھاگنا چاہئے، وہ اللہ کے سوا کوئی دوسرا نہیں ہے، لیکن ؎

وہیں پہ کھل پڑا کبوتر کا تو تو　　　جس میں نامہ بندھا تھا دلبر کا

کی روشنی سے حب و عشق، عبدیت و بندگی کی دنیا جگمگا اٹھے گی۔ جو واقع میں کسی سے کسی وقت کسی جگہ اوجھل نہ تھا اس کے بعد انسان کے "وجدانی شعور" کے سامنے بھی بے نقاب ہو جائے گا۔ الغرض جو سامنے تھا، وہی سامنے آ جائے گا۔ حصولِ معاش کی راہ کی ایک مستقل تدبیر جس کی طرف اسلام نے خصوصیت کے ساتھ راہ نمائی کی تھی چونکہ بتدریج اس سے استفادہ کا رجحان مسلمانوں میں کمزور ہوتے ہوتے قریب قریب اس نقطہ کو پہنچ چکا ہے کہ "معاشیات" کے باب میں اس کی کوئی اہمیت باقی نہیں رہی ہے، اور صرف یہی ہو کر رہ جاتا تو غنیمت تھا، استفادہ کی اس راہ سے بے تعلقی نے بعض مہیب و مہیب روحانی و اخروی خطرات کو مسلمانوں کے سامنے کر دیا ہے اور اسی کے ساتھ غربت و فلاکت کے ان دنوں میں بھی ان کی کمائی ہوئی آمدنیوں کی ایک بڑی معتد بہ مقدار لا حاصل بلکہ شدید مضرت رساں راہوں میں برباد ہو رہی ہے، دیکھ دیکھ کر ہمیشہ کڑھتا رہتا ہوں، قرآن پڑھتا ہوں، اور پھر مسلمانوں کو دیکھتا ہوں، دماغ مختل ہو جاتا ہے، روح کانپتی ہے۔ اسی کا یہ اثر ہے کہ بیقراری میں قلم چلتا گیا اور بہ مشکل اس بحث کو ختم کر کے ایک دوسرے اہم مسئلہ کی طرف متوجہ ہوتا ہوں۔ ورنہ جی تو یہی چاہتا ہے کہ کہتا جاؤں مسلسل کہتا جاؤں، اس وقت تک کہتا جاؤں جب تک کہ یقین نہ پیدا ہو لے کہ جو کچھ کہنا چاہتا ہوں مسلمان اس کے ماننے پر مضطر و مجبور ہو گئے وَاللّٰہُ مُتِمُّ نُورِہٖ وَلَوْ کَرِہَ الْکٰفِرُوْنَ ط

حق تعالیٰ کو صرف الٰہ المعاش بنانے کے نتائج

بہرحال اس مسئلہ کو ختم کر کے اب اس دوسری چیز کو بیان کرتا ہوں جس کی طرف میں نے اشارہ کیا تھا، مطلب یہ ہے کہ میرے ان اصراری بیانات سے کہیں کسی کو یہ شبہ نہ ہو کہ میں خالق و مخلوق، عابد و معبود کے باہمی تعلقات کی تصحیح کے نتائج کو یا دوسرے لفظوں میں ایمان و تقویٰ، عمل صالح، دعا و عبادات، توبہ و استغفار، توکل و تسلیم، صبر و شکر وغیرہ مذہبی حقائق اور دینی عقائد کے متعلق اس بات کا خدانخواستہ مدعی ہوں کہ ان کے ثمرات و نتائج صرف اسی زندگی تک محدود ہیں، یا مذہب کے ان ہدایات و تعلیمات کا آخری مقصد صرف اسی "الحیوٰۃ الدنیا" کی مشکلات کا حل ہے۔ گویا مذہب کا سارا نظام (العیاذ باللہ) صرف معاشی صلاح و فلاح، بقاء و ارتقاء کا ذریعہ ہے۔ یقیناً یہ غلطی اسی قسم کی غلطی بلکہ شاید اس سے بھی زیادہ سخت غلطی ہو گی جس میں حق تعالیٰ سے معاشی تعلقات کے توڑ لینے کی وجہ سے آج مسلمانوں کا ایک بڑا طبقہ مبتلا ہو گیا ہے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ ایسا مذہب مذہب ہی کب باقی رہتا ہے جس میں انسان کے لا محدود منازلِ حیات کو صرف بطنِ مادر اور شکمِ قبر کے درمیانی چند گنے گنائے دنوں تک محدود کر دیا جائے، یا یوں کہیے کہ لے دے کر انسانیت کا سارا زور اور ان ہی چند الجھی ہوئی سانسوں کے سلجھانے پر صرف کر دیا جائے، جو دوسرے سانس لینے والے جانوروں کے ساتھ آدمی کو بھی زمین کے اس محدود کرہ پر کچھ دن کے لئے عطا ہوئی ہیں، اس تنگ خیالی، تنگ دلی، تنگ نظری کی مذہب میں تو کیا گنجائش نکل سکتی ہے۔ فکر و نظر کے غیر دینی نظاموں میں بھی آدمی کی بلند فطرت، سیال ذہنیت اس کو برداشت کرنے پر مشکل ہی سے آمادہ ہو سکتی ہے۔ قرآنی آیت

قُلْ ھَلْ نُنَبِّئُکُمْ بِالْاَخْسَرِیْنَ — کہیے کیا تمہیں بتائیں کہ خسارے میں کاموں کے

اَعْمَالًا ۝ اَلَّذِیْنَ ضَلَّ سَعْیُھُمْ فِی — حساب سے کون ہے۔ یہ وہی لوگ ہیں جن کی

الحیٰوة الدنیا وھم یحسبون انھم یحسنون صنعا (الکھف ۱۲/۲) — کوشش اسی پست زندگی میں گم ہو گئی یہ لیکن وہ خیال یکار رہے ہیں کہ اچھا کام کر رہے ہیں۔

میں بجا ارشاد ہوا ہے کہ سعی و عمل، جدوجہد میں اس سے زیادہ حرماں نصیب، کوتاہ بخت، نادان زدہ، دیوالیہ اور کون ہو سکتا ہے جس نے احسن تقویم کے قالب میں بھری ہوئی خلقی توانائیوں کو

لم یرد الا الحیٰوة الدنیا ذلک مبلغھم من العلم (النجم ۲۹/۵) — نہ چاہا اس نے لیکن صرف اسی پست زندگی کو یہ ہے رسائی ان کے علم کی۔

کے تنگ دائرہ میں گم کر دیا ہو اور

رضوا بالحیٰوة الدنیا واطمأنوا بھا (یونس) — خوش ہوئے اسی پست زندگی کے ساتھ اور اسی کے ساتھ مطمئن ہیں۔

کے شکنجوں میں دب کر اپنی روحانی موت کو طمانیت و سکینت یقین کر بیٹھا ہو، [illegible] جو چاہیں کہیں جس مسلک کو چاہیں اختیار کریں لیکن "مقام محمود" کی بلندیوں پر قدم جمانے والے النبی الامی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر دین واسلام کی بیعت حاصل کر کے جنہوں نے قرآنی علم کو اپنا علم بنایا ہے [illegible] انسانی عروج وارتقاء کی آخری منزل ان الی ربک المنتھیٰ کا نقطہ [illegible] ورضوان من اللہ اکبر کی [illegible] میں جن کے سامنے جلوہ فروز ہو چکا ہے۔ فرشتہ صیدوں، پیمبر شکاروں، یزداں گیروں کا ایمانی گروہ قطعاً اپنے کو اپنے سرمایہ کو اتنے ارزاں سستے داموں بیچنے پر ایک لمحہ کیلئے بھی آمادہ نہیں ہو سکتا، قرآن کے حرف حرف نقطہ نقطہ سے جب ع

مفروش خویش ارزاں کہ تو بس گراں بہائی

کے پیغام کی مسلسل صدائیں اس کے کانوں میں گونج رہی ہوں۔ بلاشبہ ہم جب اسی معاشی دنیا میں ہیں، وہیں یہاں بھیج ہی دیا گیا ہے۔ تو یقیناً اس کی بھی ضرورت ہے کہ اللہ کو ہم اپنا الہ المعاش بھی بنائیں لیکن اس کے معنی یہ کب ہیں کہ معاد (آئندہ زندگی) کی مشکلات کے لئے اللہ کو الہ بنانے کی ضرورت باقی نہ رہی، یہ کتنی بڑی کور بختی ہوگی کہ جس کے پاس "الاولیٰ" اور "ثواب الدنیا" کے ساتھ "الآخرة" اور "ثواب الآخرة" بھی ہے، اپنی اخروی زندگی میں باوجود ضرورت شدید ضرورت کے اتنی شدید ضرورت کہ اس کے مقابلے میں تو شاید معاشی ضرورت کوئی ضرورت باقی نہیں رہتی کہ یہاں کا کام تو پیدائش کی راہوں کو عقلی قابو میں لانے سے بھی بہرحال کچھ چل ہی جاتا ہے[1] لیکن [illegible]

---

[1] سورہ زخرف کی وہ آیتیں [illegible] دنیا کی ہی نقطہ پر جمع [illegible] جن کی چھتیں اور سیڑھیاں [illegible] کی زیب و زینت [illegible] اس سے تو معلوم ہوتا [illegible] جو لوگ غریب محض [illegible] کی اولاد [illegible] معاشی [illegible] ضرورتیں بھی [illegible] قرآن [illegible] [illegible]

کی گھڑیوں میں تو پیدا کرنے والے سے مانگنے کے سوا اس کی پیداواروں کو اور کسی ذریعہ سے حاصل بھی نہیں کیا جا سکتا پھر ایسا دیوانہ کون ہوگا جو معاشی ضرورتوں میں تو اللہ کو الٰہ بنانے سے نہ شرمائے۔ لیکن معادی حاجتوں کے لئے اسی اللہ کو الٰہ بنانے اور اس کے آگے گڑگڑانے التجا و زاری کرنے میں اپنی ہتک محسوس کرے۔ جو بدنصیب ایسا کرے گا قرآن نے اس کے متعلق یہ فرما کر کہ

فمنهم من یقول ربنا اٰتنا فی الدنیا (البقرہ)	تو ان میں کچھ لوگ کہتے ہیں کہ ہمارے مالک دے ہمیں الدنیا میں۔
ماله فی الاخرة من خلاق (البقرہ)،	نہیں ہے "آخرۃ" میں اس کا حصہ۔
ماله فی الاخرة من نصیب (الشوریٰ)	نہیں ہے "آخرۃ" میں اس کا حصہ

کی دھمکی کا اعلان کیا ہے۔ تو سوچ جانے کہ ترک کا یہ چھوٹا تنگ مایہ شخص اور کس چیز کا مستحق ہو سکتا ہے۔ صرف یہی نہیں کہ ان تنگ بینوں، کوتاہ دیدوں کے لئے آخرت میں "کچھ نہیں" ہے۔ بلکہ قرآن کی آیت

من کان یرید العاجلة عجلنا له	جو چاہتا رہتا ہے جلدی والی دنیا کو، دے دیتے
فیها ما نشاء لمن نرید۔ ثم جعلنا	ہیں ہم اسی دنیا میں جتنا ہم چاہتے ہیں،
له جهنم یصلاها مذموما	اور جس کے لئے ہم چاہیں پھر بنا دیتے ہیں اس
مدحورا۔	کے واسطے جہنم، پہنچے گا اس میں درد پایا
(اسرائیل)	ہوا، دھتکارا ہوا۔

میں تو ان ناشکروں کے متعلق جنہوں نے انسانیت کے نامحدود و دائمی سرمایہ کو اس بے دردی سے ضائع کیا جس کے گلشن سدا بہار میں ہر قسم کی تنگ دامانیوں کا فیاضانہ علاج ہر اس پیمانے پر میسر آ سکتا تھا جو سوچا جا سکتا ہے لیکن چند کلیوں پر قناعت کرنے والے تنگ ظرفوں نے اپنے اسی علی کل شیء قدیر مالک کی جو "رحمٰن الدنیا" کے

(بقیہ صفحہ گزشتہ)

چھوڑ کر اللہ کے ذکر کی طرف دوڑ پڑو، یہ جو فرمایا گیا ہے کہ تجارت یا لہوی مشاغل کو دیکھ کر لوگ اس کی طرف دوڑ پڑتے ہیں جس کا دوسرا مطلب یہی ہوا کہ معادی مسائل کے مقابلہ میں معاشی مسائل کو لوگ زیادہ اہمیت جو دیتے ہیں یہ طرز عمل ان کا قطعاً غلط ہے کیونکہ مقابلہ کے وقت ظاہر ہے کہ معاد کی ابدی زندگی کے سامنے معاشی زندگی کی کوئی حقیقت نہیں رہتی۔ اسی کی طرف ما عند اللہ خیر من اللهو ومن التجارة [illegible] [illegible] معاشی مسائل [illegible] تجارت [illegible] آخرت کی زندگی [illegible] مسائل زیادہ [illegible] حالانکہ معاش یعنی الرزق کی ذمہ داری [illegible]

ساتھ "جحیم الآخرۃ" بھی ہے جب ناقدری کی ہو اس کا واقعی وزن او حقیقی وقار تھا، اپنی چھچھوری ذہنیتوں میں گر اس وزن اور وقار کے احساس کی وہ گنجائش نہیں پاتے تو تخت کے ان چھوٹوں کو در در اتے، دھتکارتے ہوئے لعنت کے تاریک گڑھوں میں اگر ڈھکیل دیا جائے تاکہ اسی میں وہ کڑھیں اور ابد تک کڑھتے رہیں، پچھتائیں، اور ابد تک پچھتاتے رہیں، دانت پیسیں اور ابد تک پیستے رہیں؛ اور یوں کئے کا خمیازہ بھگتیں اور بھگتتے رہیں تو اس کے سوا وہ کس سلوک کے مستحق ہوسکتے ہیں۔

حق تعالیٰ کو صرف الہ المعاش بنانے کا مہلک خطرہ،

جزاءً وفاقاً کے اُن آثار کا ظہور تو "الدنیا" کے بعد "الآخرۃ" کی آنے والی زندگی میں ہوگا، لیکن اُن لوگوں کے لئے جو حق تعالیٰ کی الہ المعادی شان سے بے پردہ ہو کر محض الہ المعاش ہی بنانے کا رشتہ ان کے ساتھ رکھتے ہیں، ان دو تعلقوں سے صرف ایک یعنی معاشی تعلق کو تمام کر دوسرے سے کنارہ کشی کر لیتے ہیں! اور یوں یک ہی کنارہ پر بیٹھ کر صرف اسی الحیوٰۃ الدنیا کی کامیابیوں کے لئے اس کو پوجتے ہیں، نمازیں بھی اسی لئے پڑھتے ہیں، تلاوت بھی اسی لئے کرتے ہیں، خیر و خیرات کے مدوں میں بھی اسی لئے دیتے ہیں، تاکہ مثلاً ان کی نوکری برقرار رہے، ترقیوں کی راہیں ان پر کھلیں، تجارت میں فروغ ہو، فصل پوری ہاتھ لگے، بال بچوں سے گود بھری رہے، گھر کا اقبال اونچا ہو، اعزاز بڑھے، علی حرف یعنی کنارے بیٹھ کر اس طریقہ سے اللہ کے پوجنے والوں کو قرآن میں اس سے بھی ڈرایا گیا ہے کہ کہیں "الدین" کے ساتھ وہ اپنی "الدنیا" بھی نہ کھو بیٹھیں، ارشاد ہے،

ومنھم من یعبد اللہ علی حرف	اُن میں بعض ایسے ہیں جو پوجتے ہیں خدا کو
فان اصابہ خیر اطمان بہ و	کنارے پر بیٹھ کر، پھر اگر پہنچی اُن کو کوئی
ان اصابتہ فتنۃ انقلب علیٰ	بھلائی تو مطمئن ہوگیا [illegible]
وجھہ خسر الدنیا والآخرۃ	پہنچی کوئی آزمائش تو پیٹ [illegible]
ذلک ھو الخسران المبین۔	برباد کر بیٹھا دنیا بھی اور آخرۃ بھی یہی
	ہے کھلا ہوا خسارہ۔

مطلب یہی ہے کہ معادی معاملات میں تو خدا سے اپنے آپ کو بے نیاز بنائے ہوئے تھا ہی۔ لے دیکر ایک معاشی رُخ حق تعالیٰ کی طرف اس کا باقی تھا، اس رُخ سے جب تک پاتا رہے گا، اس وقت تک تو خیر لیکن عالم کا علم اگر اس کے جہل کا ساتھ خود اسی کے فائدہ کے لئے کسی وقت نہ دے اور اس کی حکمت و رحمت کا تقاضہ ہے کہ نہ دے، تو ایسی حالت میں ظاہر ہے کہ الہ المعاش ہونے کی حیثیت سے اس وقت خدا کو الہ بنانا اس کے لئے برابر ہوجائے گا، [illegible] وقت اور کتنی گھڑی اس کے لئے یہ صورت ہوئی، خدا کا یہ یک رُخا پجاری جب [illegible] فلاح و بہبود ہی کے لئے خدا کو پوج رہا تھا، تقاضا اس راہ کی کامیابیوں کے دروازے جب اپنے اوپر بند پائے گا [illegible] عبادت [illegible] معادی منافع تو اس کے سامنے ہی نہیں، رہ گئے تھے معاشی [illegible] سوا اپنے سامنے کچھ نہیں دیکھتا تو خطرہ بہت زیادہ خطرہ ہے کہ [illegible] سودہ بھی الیعاذ باللہ

جب اس کا خاتمہ ہو گیا، تو اب بارگاہ حق میں حضوری کی کیا صورت اس کے لئے باقی رہ جاتی ہے؟ محرومی اور بڑی سخت محرومی ہوگی جس کا ایسی حالت میں وہ محض اسی لئے شکار ہوا کہ جو ہم انسانوں کا الہ المعاش ہونے کے ساتھ الہ المعاد بھی تھا، اسی ذاتِ پاک کو یہ نادان صرف الہ المعاش بنا کر پوجتا رہا تھا، بلکہ سچ تو یہ ہے کہ یاس کی تلخ کامیاں اس قسم کے یک رخی عبادت والوں کی زبانوں سے ان حالتوں میں اول فول کی جو گندگیاں اگلواتی ہیں، وہ تو شاید ان مسکینوں کے لئے بھی قابلِ برداشت نہ ہوں، جو اپنے مالک سے نہ معاشی ہی تعلق رکھنے کی ضرورت سمجھتے ہیں اور نہ معادی کی، بلکہ صرف عقلی سہاروں کے بل بوتے پر زندگی گذارتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ ذہنیت بھی نمک حرامی اور بغاوت و سرکشی کی ایک بدترین شکل ہے جس کی تھوڑی بہت تفصیل شاید آئندہ کی جائے۔ لیکن جن بدبختوں کا انجام ان سے بھی بدتر ہو، ان سے زیادہ لٹے ہوئے خسارے اور گھاٹے میں کون رہ سکتا ہے؟ کیسی عجیب بات ہے کہ [illegible] گروہ جیتا تو ہے خدا سے معاش مانگنے، لیکن کبھی کبھی اس کی راہیں [illegible] نظروں میں ہوتی ہے [illegible] کے ساتھ اپنی معاد کو بھی اپنے ہاتھوں برباد کر بیٹھتا ہے۔ درپئے دنیا ایں ہمہ رفت؟ آں ہم رفت ایں ہم رفت کی نامرادیاں اسی قسم کے لوگوں کے لئے ہیں۔ برخلاف اس کے، جو حق کو معاشی و معادی دونوں کناروں سے پکڑتے ہیں، معاش میں بھی ان کا حقیقی رخ حق ہی کی طرف رہتا ہے اور معاد میں بھی ان کی کشش حق ہی کے ساتھ بندھی رہتی ہے۔ ان کے لئے کس بات کا خطرہ ہے؟ معاشی زندگی میں بالفرض اگر ان کو ناکامی بھی محسوس ہو، اگرچہ واقعہ یہ ہے کہ وہ بھی کامیابی ہوتی ہے جس پر ظاہر ناکامی کا پردہ پڑا رہتا ہے۔ لیکن یہ ظاہری ناکامی بھی ان کو خدا سے اس لئے جوڑے رکھتی ہے کہ ان کا دوسرا رشتہ یعنی معادی رشتہ ٹوٹنے سے بہرحال باقی رہتا ہے بڑی سے بڑی معاشی محرومیاں بھی ان کو خدا کے قدموں سے دور نہیں کر سکتیں، بلکہ جیسا کہ کہا جا چکا [illegible] معاشی ناکامی کو معادی کامیابیوں کا ذریعہ، صبر و رضا، تسلیم و توکل وغیرہ مختلف قرآنی تدبیروں سے بنائے ہوئے ہوتے ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ معادی پہلو سے بے پروا ہو کر حق تعالیٰ سے صرف یک رخی معاشی نسبت اگرچہ بہتوں کے لئے آج مذہبی امتیاز اور دینی برتری کی سند بنی ہوئی ہے، لیکن قرآن نے جن عواقب اور نتائج پر متنبہ کیا ہے، کیا اس کے بعد بھی ان کی غلط مذہبی زندگی مذہبی زندگی قرار پانے کی مستحق ہو سکتی ہے؟

پس صحیح بات یہی ہے کہ اسلام نے مسلمانوں کو جو خدا وہ جو معبود اللہ کے نام سے عطا کیا ہے، وہ مسلمانوں کا الہ المعاش بھی ہے اور الہ المعاد بھی۔ اسی لئے ایک مسلمان کا صحیح دینی مقام یہی ہو سکتا ہے کہ ”الہ المعاش“ ہونے کے ساتھ جو رب بندوں کا ”الہ المعاد“ بھی ہے، اسی کے قدموں پر سر ڈالے ہوئے

ربنا آتنا فی الدنیا حسنة و	اے ہمارے رب! دیجئے ہمیں دنیا میں بھی
فی الآخرة حسنة وقنا عذاب النار	بھلائی اور آخرة میں بھی بھلائی اور بچا لیجئے
(البقرہ ۲۵)	ہمیں عذاب سے آگ کے۔

کے ساتھ گڑگڑاتا رہے۔

معاشی ضرورتوں کو خدا سے مانگنے کیا آدمی کو نکما اور ناکارہ بنا دیتا ہے؟

”الہ المعاد“ کو ”الہ المعاش“ بنانا پست ہمتی و تنزل [illegible] ہے۔ اس مغالطے کا اثر زیادہ تر قدیم مشرقی ذہنیتوں میں پایا جاتا ہے۔ اس مغالطہ [illegible]

ہیں؟ اسی کا جواب ہے کہ جو ہماری عقل و حواس کے سپرد کیا گیا ہے۔ اشیاء کی پیدائش کے متعلق انسانیت کی تحقیقی و تفتیشی ادراکی قوتیں جس جواب کو پاتی ہیں، وہی اس سوال کا حقیقی جواب ہے۔ میں نے عرض کیا تھا کہ ان معاشی پیداواروں کو خود پیدا کرنے والے سے حاصل کرنے کے لئے جو تدبیریں کی جاتی ہیں۔ اسی کی دوسری تعبیر یہ ہے کہ حق تعالیٰ کو اپنی معاشی ضرورتوں میں الٰہ بنایا گیا۔ اور جن راہوں سے یہ چیزیں پیدا ہو رہی ہیں۔ ان راہوں کا علم حاصل کر کے اپنے قابو میں لا کر ان سے مستفید ہونا۔ اسی کا دوسرا نام عقلی و حسی تدبیر، جسمانی و مادی منفعت و محنت ہے۔

میں نے کہا تھا کہ اللہ یا خالق عالم کو الٰہ بنا کر ان پیداواروں سے استفادہ کے متعلق جو تدبیر اختیار کی جاتی ہے، اس تدبیر کی بنیاد علم کے ایک قطعی اور فطری اساس پر مبنی ہے، اور تدبیر کے دوسرے شعبہ کی بھی عقل و حواس کے تجربی معلومات ہی پر بنیاد قائم ہے۔ لیکن تجربہ و مشاہدہ پر مبنی ہونے کے باوجود بتایا گیا تھا کہ قطعیت و یقین آفرینی کی وہ کیفیت اس میں نہیں پائی جاتی جس قسم کی قطعیت اس علم میں پائی جاتی ہے۔ جس پر تدبیر کا پہلا شعبہ مبنی ہے۔ مگر قطعیت کے اس فقدان کے باوجود اسلام کا نقطۂ نظر اس باب میں پیش کیا گیا تھا کہ اپنی اپنی پانت (?) اور علم کی حد تک آدمی اسی کا مکلف ٹھیرایا گیا ہے کہ فطرت کے ان قوانین سے بے اعتنائی نہ برتے جن کی راہوں سے دنیا میں خیر و شر کا ظہور ہو رہا ہے۔ کہا گیا تھا کہ جو ان سے لاپروائی اختیار کر کے کسی مصیبت کا شکار ہو جائے تو

فلا یلومن الا نفسہ۔ ملامت کرے مگر اپنے آپ کو۔

کے بغیر اس الزام سے کسی طرح بچ نہیں سکتا۔ اس باب میں قرآنی [illegible] جو پیش کئے جاتے ہیں۔ ان کے نمونے بھی پیش کئے گئے تھے۔ بتایا جائے کہ اس کے بعد اسلام اور کیا کرتا۔ کھیت جوتنے پر کسان سے اصرار کیا جائے تو محض اس لئے کہ جوتنے کی تاکید جس کسان کو کی جائے گی، کسی کو اس کا خفقان پیدا ہو کہ تخم ریزی کو وہ چھوڑ بیٹھے گا یا کھانا چھوڑ دے گا، پانی سے بیزار ہو جائے گا۔ اگر یہ صرف خفقان ہے، تو پھر خواہ مخواہ یہ اندیشہ جن لوگوں کو اندر ہی اندر ستا رہا ہے کہ معاشی ضرورتوں میں مسلمان اگر خدا سے یا ان ضرورتوں کے پیدا کرنے والے سے مانگنے کے عادی ہو جائیں گے، تو جن راہوں سے یہ ضرورتیں پیدا ہو رہی ہیں۔ ان میں غور و فکر اور ان پر قابو پانے کی تدبیریں چھوڑ بیٹھیں گے۔ ایک قسم کا غیر منطقی خفقانی اندیشہ نہیں ہے تو اور کیا ہے۔ کسی کو پاجامہ پہننے کا اگر مشورہ دیا جائے۔ تو اس کا یہ مطلب کیسے لے لیا جائے گا کہ کرتہ پہننے سے اسے روکا جا رہا ہے۔ یا پاجامہ پہننے والا کرتہ پہننا چھوڑ دے گا۔ کسی طالب العلم کو استاد اگر لکھنے کی تاکید کرے۔ تو اس کے کیا یہ معنی ہیں کہ وہ پڑھنے سے اس کو منع کر رہا ہے۔ بلکہ واقعہ تو یہ ہے کہ اپنی ضرورتوں میں خالق تعالیٰ کو الٰہ بنا کر اس کی طرف رجوع کرنا۔ اس کی بنیاد خواہ جتنے بھی قطعی اور فطری علم پر قائم ہو۔ لیکن بہ حال تعلق تو اس تدبیر کا ایک غیبی قوت سے ہے۔ اس لئے اگر لوگوں کو اس تدبیر کے اختیار کرنے پر توجہ دلائی جائے۔ تنبیہ و تاکید کی جائے تو اپنی غیبی خصوصیت کی بنیاد پر وہ اس کی مستحق ہے بخلاف تدبیر کے دوسرے شعبہ کے کہ اس کا تعلق غیب سے نہیں بلکہ مشاہدات و محسوسات سے ہے اور آدمی کا قاعدہ ہے کہ وہ غیب سے تو غافل ہو سکتا ہے لیکن مجنونوں اور دیوانوں کے سوا عام حالات میں حسی قوانین، اور مشاہداتی امور سے اعراض تقریباً ناممکن ہے۔ ان قوانین کو چھوڑنے پر کوئی کر بالفرض اگر آمادہ بھی

کیا جائے تو مشکل ہی سے کوئی اس کی تعمیل پر تیار ہو سکتا ہے۔ پھر یہاں تدبیر کے اس شعبہ کو ترک کرانے کے کیا معنی۔ اس کے متعلق تو خاموشی سے بھی کام نہیں لیا گیا ہے۔ بلکہ گذر چکا کہ تدبیر کے پہلے شعبہ (یعنی پیدا کرنے والے سے مانگنے) کے ساتھ ساتھ دوسرے شعبہ (یعنی جن راہوں سے وہ پیدا کر رہا ہے) ان کے اقتضاءات کی تکمیل کو اسلام میں اتنی اہمیت حاصل ہے کہ ان سے اعراض و انحراف چونکہ پیدا کرنے والے کی مقررہ سنتوں سے انحراف و بغاوت ہے اس لئے ان سے لاپروائی اگر سوچا جائے تو یہ خدا سے جنگ ہے۔ غالباً یہی مطلب ہے ابوداؤد۔ الحاکم وغیرہ کی اس حدیث کا جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ اطلاع دی ہے کہ

سیکون فی هذه الامة قوم یعتدون فی الاعتداء والدعاء۔ — اس امت میں کچھ لوگ ہوں گے جو حد سے تجاوز کریں گے۔ تجاوز کرنے میں اور دعا میں۔

اور امام بخاری نے قرآنی آیت

انه لا یحب المعتدین۔ — خدا کے مقررہ حدود سے تجاوز کرنے والوں کو اللہ نہیں چاہتا۔

کی تفسیر میں ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا یہ قول نقل کیا ہے۔

ای فی الدعاء وغیرہ۔ — یعنی دعا اور دعا کے سوا باتوں میں۔

اسی بنیاد پر علماء امت کا یہ اجماعی و اتفاقی فیصلہ کتابوں میں نقل کیا جاتا ہے مولینا عبدالحی فرنگی محلی مرحوم رقمطراز ہیں۔

اجمع العلماء انه لا یجوز ان یدعو الانسان ان یطلع السماء او تحول جبل القلاع فی ذهبا او یحیی له الموتی وغیرہ (الحرز الثمین بحاشیہ حصن حصین ص۲۵) — سلف کا اتفاق ہے کہ آدمی کے لئے جائز نہیں ہے کہ وہ ایسی دعا مانگے کہ آسمان پر چڑھ جائے گا یا فلاں پہاڑ کو سونا بنا دیا جائے یا مردہ کو زندہ کر دیا جائے۔

پیدائش کے مقررہ قوانین کے بدل دینے کی درخواست خود پیدا کرنے والے سے بھی کرنا مذہباً جب جائز نہیں ہے تو پیدائش کے ان معینہ طریقوں کا چھوڑنا ان لوگوں کے لئے کیسے جائز ہو سکتا ہے، جنہیں ان ہی قوانین کا پابند بنا کر حق تعالیٰ نے پیدا کیا ہے۔

سلطانی و غیر سلطانی قوانین کا فرق

البتہ ایک چیز جس کا ذکر یہاں ضروری ہے۔ وہ یہ ہے کہ پیدائش کی جن راہوں کے متعلق باور کرانے والے یہ باور کراتے رہتے ہیں کہ جو کچھ ہم نے جانا ہے، وہی واقع میں بھی خدا کی بنائی ہوئی قطعی راہیں ہیں، یہ مسئلہ اتنا آسان نہیں ہے، جتنا کہ باور کرانے والے اپنے نزدیک اسے خیال کئے ہوئے ہیں۔ ابھی عرض کیا گیا تھا کہ واقعی جو خدا کی بنائی ہوئی مقررہ راہ ہے۔ اس سے اعراض یا اس کی خلاف ورزی تو خدا کی، خدا کی مرضی کی، خدا کے قانون کی خلاف ورزی ہے، ایک ایسی چیز کے توڑنے کی یہ کوشش ہے جس کے توڑنے کی درخواست خود پیدا کرنے والے سے بھی اسلام جائز قرار نہیں دیتا۔ لیکن عام طور پر جن نظریات و مسلمات کے متعلق دعویٰ کیا جاتا ہے کہ وہ فطرت کے قوانین اور قدرت کے آئین ہیں، ظلم ہوگا اگر ہر شخص کو اس کا حق نہ دیا جائے کہ بجائے خود وہ بھی اس کی تحقیق کرے، کہ واقع میں وہ خدا کی مقرر کردہ راہیں ہیں یا نہیں

نہیں بمحض دوسروں کے قول پر بھروسہ کر کے ان کی ناقص معلومات کے متعلق یہ اصرار کرنا کہ انھیں خدائی قانون یقین کر لیا جائے۔ ظاہر ہے کہ نہ یہ عقلاً درست ہو سکتا ہے، اور نہ مذہباً۔ قرآن مجید میں متعدد مقامات پر انسانوں ہی کے مسلمات اُن ہی کے نظریات کے متعلق۔

ما انزل اللہ بہا من سلطان۔ نہیں اتارا خدا نے اس کے لئے سلطان۔

کا اعلان، یا

فاتوا بسلطان مبین۔ لاؤ کوئی کھلا ہوا "سلطان"

وغیرہ کے مطالبات جو پائے جاتے ہیں۔ ان سے میں اسی نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ مختلف چیزوں کی پیدائش کی جو مختلف راہیں اس عالم میں پائی جاتی ہیں، اور ہم اپنے معلومات و تجربات کی بنیاد پر اُن کے متعلق جو نظریات و قوانین بناتے رہتے ہیں۔ قرآنی تعلیم کے لحاظ سے ان قوانین کے ایک سلسلہ کو تو ہم سلطانی قوانین کہہ سکتے ہیں اور اسی کے مقابلے میں دوسرے سلسلہ کا "غیر سلطانی قوانین" نام رکھا جا سکتا ہے۔

لفظ سلطان اور نزول کی تحقیق "سلطانی قوانین" کا یہ مطلب نہیں ہے کہ یہ بادشاہی قوانین ہیں، یعنی حق تعالیٰ کو بادشاہ اُو سلطان قرار دے کر ان کے بنائے ہوئے قوانین کو سلطانی قوانین کے نام سے میں موسوم کر رہا ہوں، اردو میں سلطان کے معنی چونکہ بادشاہ ہی سمجھے جاتے ہیں۔ اس لئے قدرتاً لوگوں کا ذہن شاید اسی طرف منتقل ہو جائے۔ ضرورت ہے کہ عربی لغت کے اعتبار سے قرآن کی مندرجہ بالا آیتوں کی جن سے قوانین کی یہ تقسیم پیدا ہوتی ہے۔ شرح کر لی جائے۔

واقعہ یہ ہے۔ عربی زبان میں سلطان کے لفظی معنی "غلبہ" اور "تسلط" کے ہیں۔ چونکہ سلاطین کو بھی ملک پر غلبہ حاصل ہوتا ہے اس لئے سلطان کے لفظ کا ان پر بھی اطلاق ہونے لگا۔ مگر ان آیتوں میں "سلطان" کا لفظ دراصل غلبہ اور اسی تسلط ہی کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے۔ یہ تو سلطان کے لفظ کی تحقیق ہوئی، دوسرا لفظ جو یہاں قابل غور ہے وہ ما انزل اللہ میں "انزل" کا لفظ ہے۔ انزل کا مادہ نزول ہے۔ نزول کے معنی اترنا اور انزال کے معنی اتارنا ہے، عام طور پر قرآن کی طرف بھی تنزیل و انزال کے الفاظ قرآن میں چونکہ منسوب کئے گئے ہیں۔ اس سے دوسری چیزوں کی طرف بھی جب اس لفظ کو حق تعالیٰ کی نسبت سے منسوب کیا جاتا ہے، تو پہلا خیال اسی تنزیل و انزال کے معنی کی طرف ملا جاتا ہے۔ جو قرآن کے متعلق سمجھے جاتے ہیں۔ مثلاً

ما انزل اللہ بہا سلطان۔ نہ اتارا خدا نے اس کے لئے سلطان۔

کے متعلق عموماً ذہن ادھر منتقل ہو جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کے متعلق کوئی وحی نہیں ہوئی، یا پیغمبروں کو کوئی علم اس کے متعلق عطا نہیں ہوا۔ اگر اس آیت میں بھی "انزل" کے یہی معنی لئے جائیں گے۔ تو ظاہر ہے کہ اس صورت میں سلطانی قوانین سے مراد وہ قوانین ہوں گے جن کے قانون الٰہی ہونے کی تصریح قرآن میں یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث میں کی گئی ہو، اور غیر سلطانی قوانین سے، وہ باتیں ہوں گی، جن کی تصریح شریعت میں نہ پائی جاتی ہو، لیکن صحیح یہ ہے کہ محض "انزل" کے لفظ کی بنیاد پر اگر یہ سمجھا جاتا ہے تو خود قرآن سے اس کی تائید نہیں ہوتی۔ کون نہیں جانتا کہ قرآن میں "الحدید" لوہے کے متعلق بھی یہ بات پائی جاتی ہے۔

وانزلنا الحدید فیہ باس شدید۔ — اتارا ہم نے لوہے کو، جس میں بہت زیادہ زور بھرا ہوا ہے۔

ظاہر ہے کہ "الحدید" یعنی لوہے کے متعلق یہ باور کرنا کہ حق تعالیٰ نے کسی پیغمبر پر اس کی بھی وحی کی، نہ عقلاً صحیح ہے نہ نقلاً۔ بلکہ اس کا صاف کھلا ہوا سلفاً عن خلفٍ یہی مطلب سمجھا گیا ہے کہ "اللہ تعالیٰ نے لوہے کو پیدا فرمایا" جس سے معلوم ہوا کہ "انزل" کے لفظ کو صرف الہام و وحی کے ساتھ مختص کرنے پر اصرار کرنا صحیح نہیں ہے۔

اب ان لغوی تشریحات کو پیش نظر رکھتے ہوئے، بظاہر خیال میں یہی بات آتی ہے کہ اس دنیا کے کچھ قوانین تو ایسے ہیں جن میں خدا نے سلطانیت کی صفت پیدا کی ہے۔ یعنی اپنے آثار و نتائج کے لحاظ سے انسانی فطرت پر ان کا تسلط اور ان کی گرفت اتنی سخت اور مضبوط ہے کہ ان کی واقعیت کا انکار آدمی کے بس سے باہر ہو جاتا ہے۔ مثلاً آگ جلاتی ہے، مرچ تلخ ہے، سنکھیا قاتل ہے۔ آفتاب روشن ہے، گرم ہے، قدرت کے ان ہی قوانین کو قرآن کی مذکورہ بالا آیت کی اصطلاح کی بنیاد پر میں "سلطانی قوانین" قرار دیتا ہوں، اور ان کے بعد ایسی چیزیں جن کے ساتھ انسان کی فطرت کا یہ تعلق نہیں ہے۔ وہی غیر سلطانی باتیں سمجھی جائیں گی۔ اس تقسیم کے بعد اب بآسانی ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ پیدائش و تخلیق کی وہ واضح اور کھلی ہوئی راہیں جن کے آثار و نتائج کا کسی حال میں کسی طرح انکار ممکن نہ ہو، انسانی فطرت پر جن قوانین کی سلطانیت اور تسلط کی یہ کیفیت ہوگی۔ خدا کے ان سلطانی قوانین کا سنۃ اللہ ہونا یقینی ہے۔ اسی لئے اس کو چھوڑ کر کسی اور راہ سے ان چیزوں کی پیدائش اور حصول کی کوشش کرنے والے، مثلاً بغیر بیوی کے اولاد کو ڈھونڈھنے والے، جوتے بوئے بغیر، لہلہاتی فصلوں کی آس لگانے والے، سنکھیا کھا کر زندگی کی امید رکھنے والے، خدا کے مقرر کردہ قوانین کے متعلق باغیانہ اعتدائی طرز عمل اختیار کر کے گویا اس سے لڑنے اور جنگ کرنے پر آمادہ ہیں۔

لیکن معاشیات ہو، یا سیاسیات، طبعیات ہو یا عمرانیات، یا اسی قسم کے عام عقلی و ذہنی علوم، ان کے تمام نظریات و مسلمات کے متعلق یہ فیصلہ کہ ان میں سے کسی نظریہ یا کسی مسلمہ کی خلاف ورزی، خدا کی سنت یا سلطانی قوانین کی خلاف ورزی ہے۔ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ یہ کتنی بڑی زبردستی ہے۔ جزئیات تو خیر جزئیات ہیں ان عقلی علوم و فنون کے کلیات بلکہ اساسی مقدمات تک ابھی مشتبہ اور محل نظر و بحث ہیں۔ طبعیات ہی کو لیجئے جن پر ہزارہا ہزار سال سے انسانی عقل مسلسل کام کرتی چلی آ رہی ہے لیکن تفصیلات سے قطع نظر کر کے دیکھا جائے تو نظر آئے گا کہ اس علم کے مختلف دبستانوں مثلاً ایلوپیتھک، ہومیوپیتھک کے بنیادی مقدمات ہی میں آسمان و زمین کا فرق ہے، ایک میں ضد کو ضد سے دفع کرنے کا تجربہ پیش کیا جاتا ہے، اور اس کا سارا معالجاتی نظام اسی اساس پر مبنی ہے۔ دوسرے میں بالکل اس کے خلاف، علاج بالمثل کے نظریہ پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ علاج کے ان دونوں متصادم و متخالف نظاموں سے لوگوں کو شفا بھی ہوتی ہے، اور نہیں بھی ہوتی ہے۔ اب فرض کیجئے کہ ایلوپیتھک طریقہ علاج کو ترک کر کے کوئی ہومیوپیتھک والوں کی طرف رجوع کرتا ہے تو کیا اس پر یہ الزام لگانا درست ہوگا کہ وہ قدرت کے قانون سے جنگ کرتا ہے۔

سچ تو یہ ہے کہ ہمارے طبی تجربات، اور طبی نظریات اس وقت تک اپنے تاثیری نتائج کے لحاظ سے عموماً بیچ حال میں ہیں کہ ان کی غیر قطعی یا غیر سلطانی کیفیت کی وجہ سے اگر کوئی علاج و معالجہ کی نفع بخشی کا بھی منکر ہو جائے تو

جہاں تک واقعات کا تعلق ہے، ایسے آدمی پر بھی سنت اللہ کی خلاف ورزی کا الزام شاید قرین انصاف نہ ہوگا۔

ایسی صورت میں غور کرنے کا مقام ہے کہ پیدائش کی راہوں کے متعلق غور و فکر کا جو سلسلہ جاری ہے اور اس وقت تک ان ہی کو پیش نظر رکھ کر انسانی زندگی کے معاشی پہلو کے متعلق جو قوانین اور کلیات آئے دن بن رہے ہیں کبھی سرمایہ داری کے نظام میں انسان کی فردوس گم گشتہ کا سراغ لگایا جاتا ہے، اور مشورہ دیا جاتا ہے کہ سود خواری یا اولاد کبیر کی توریث۔ الغرض گنج سے گنج کھینچنے میں جس قوم کے افراد جس حد تک کامیاب ہوں گے اسی حد تک اس قوم کا معاشی نظام ترقی کی منزلوں کو طے کرے گا کبھی فیصلہ کر دیا جاتا ہے کہ انسان اگر اپنی کھوئی ہوئی جنت کو پھر پانا چاہتا ہے، تو ان تمام راہوں کو بند کرے جن سے ملک و قوم کے خاص خاص افراد کی جیبوں میں دولت سمٹتی ہو، حکم دیا جاتا ہے کہ جو ہم میں غریب ہیں۔ وہ تو خیر غریب ہی ہیں۔ لیکن آدم کی اولاد میں تھوڑے بہت امیروں کی جو مقدار ہے، بزور شمشیر ان کو بھی غریب بنا دیا جائے۔ مجھے اس سے ابھی بحث نہیں کہ سرمایہ دوستی اور سرمایہ دشمنی ان دونوں متخالف نظریات میں معاشی فلاح و بہبود کے لحاظ سے صحیح کون ہے اور غلط کس کو قرار دیا جائے۔ بلکہ کہنا صرف یہ ہے کہ جن علوم و فنون میں آئے دن ایسے متناقض نظریات بنتے اور بگڑتے رہتے ہیں۔ ان ہی نظریات کو سلطانی فیصلوں کے رنگ میں پیش کرنا، خود بھی ان پر حد سے زیادہ اصرار کرنا۔ اور دوسروں کو بھی ان کے ماننے پر مجبور کرنا۔ اور اس حد تک مجبور کرنا کہ جس بدقسمت کو تھوڑا بہت بھی ان سے کچھ اختلاف ہو، ان پر سنت اللہ کی خلاف ورزی کا الزام لگا دینا کہاں تک درست ہو سکتا ہے؛ بلکہ حکیمانہ تحقیق (سائنٹفک ریسرچ) کا اقتضا تو یہ تھا کہ لفظی سطوتوں، لسانی طنطنوں، افسانوی مغالطوں، شاعرانہ پیرایوں سے دماغوں کو بالکلیہ آزاد کر کے اعتمادی کیفیت کو قوانین کے سلطانی رنگ کے ساتھ وابستہ کر دیا جاتا، جن پیرایوں میں سلطانیت کا رنگ تیز نظر آتا۔ اسی حد تک اعتماد و وثوق کی کیفیت میں بھی تیزی پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی۔ اور جس میں جس حد تک سلطانیت کا رنگ دھیما محسوس ہوتا۔ اعتمادی کیفیت کے احساس پر بھی اسی حد تک کم زور دیا جاتا۔ اصل حقائق کی دانشمندی کا یہی اور صرف یہی محتاط اور محفوظ ترین طریقہ ہے۔ اور یہی آزاد تنقیدی ذہنیت ہو سکتی تھی۔ جسکے پیدا کرنے کے لئے قرآن میں اس قسم کی آیتوں کا مثلاً

ان هی الا اسماء سمیتموها انتم و — نہیں ہے وہ بعض چیزوں کو کن پیدائش و
اٰباءکم ما انزل الله بها من سلطٰن — تخلیق کا وسیلہ و ذریعہ خیال کرتے تھے، لیکن چند
ان یتبعون الا الظن وما تهوی الانفس — نام (یا الفاظ) جسے رکھ لیا ہے تم نے اور تمہارے باپ
دادوں نے نہیں اتارا اللہ نے ان کیلئے سلطان نہیں پیروی کرتے ہیں وہ لیکن صرف اٹکل کی اور اس کی جسے نفس چاہتا ہے

ومالهم به من علم ان یتبعون — نہیں ہے ان کو اس کی دانش (صحیح) نہیں پیروی
الا الظن وان الظن لا یغنی — کرتے ہیں وہ لیکن اٹکل کی اور اٹکل واقعہ سے
من الحق شیئا۔ — آدمی کو بے نیاز نہیں کر سکتا۔

بار بار اعادہ مختلف پیرایۂ بیان سے کیا گیا ہے، ورنہ صرف اس لئے کہ جو کوئی اچھی بکتا ہے وہ خیاطی کا بھی ضرور ماہر ہوگا، یا صنعتی دستکاریوں، میکانیکی اولوالعزمیوں میں جس نے حذاقت کا ثبوت دیا ہے کوئی وجہ

نہیں ہو سکتی کہ اجتماعی مسائل اور معاشی نظریات میں اس کی عقل غلطی کرے۔ گویا جس کے شعر اچھے ہوتے ہیں اس کے دماغ کے ریاضیاتی نتائج کو بھی یقیناً صحیح ہونا چاہیئے۔ واقعہ یہ ہے کہ سلطانیت کے قدرتی معیار سے ہٹ کر تحقیق و تلاش کے باب میں جہاں کہیں ان غیر منطقی تقلیدوں کی وبا پھوٹی ہے، یا اسی طرح اس راہ میں جہاں ناموں کو پوجا گیا ہے، بڑائی کے ساتھ جس کا چرچا کیا گیا۔ اس کی ہر بات بڑی سمجھی گئی ہے۔ خدا ہی جانتا ہے کہ قوموں کے اس طرزِ عمل نے لوگوں کو کن کن چیزوں کے ماننے پر مجبور نہیں کیا ہے۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ انھیں بے احتیاطیوں کی بدولت قوموں اور راستوں کو قرنہا قرن تک غیر سلطانی کیا افترائی[۵۱] قوانین تک کی جکڑبندیوں میں پھڑپھڑانا پڑا ہے اور کتنے ہیں جو انھیں زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں، آخر ان ہی انسانوں میں کتنے ہیں جنھیں بدھ کے دن میں مصائب کا طوفان نظر آیا۔ غریب باتیرہ کے عدد میں اتنی قوت لوگوں کو محسوس ہوئی کہ کسی سخت سے سخت حادثہ کو واقع کر دینے کے لئے وہ کافی ہے۔ فاتحانہ اقدام کو بدبختانہ انجام سے بدلتے ہوئے کتنوں نے راہ کاٹنے والی غریب کالی بلی کو دیکھا الیٰ غیر ذلک من الخرافات والاوہام[۵۲] حالانکہ سلطانی معیار سے جانچنے کا اصول اگر اختیار کیا جاتا۔ تو ایک ان دیکھے فرضی دن یا تیرہ اکائیوں کے مجموعہ میں کیا واقعی یہ کرامتیں باقی رہ سکتی تھیں، راہ کاٹ کر گذر جانے والی بلی کی مجال تھی کہ کسی فرد کو نہیں، بلکہ قوم کو حرمان نصیبی کے خندقوں میں ہمیشہ کے لئے

---

۵۱ جس طرح سلطانی کی اصطلاح قرآن سے حاصل کی گئی ہے۔ اسی طرح یہ اصطلاح بھی قرآن ہی سے ماخوذ ہے۔ جو سلطانی قوانین کے بالکل مفہوم مخالف کی تعبیر ہے یعنی ایسی باتیں جنھیں خدا نے چیزوں کے پیدا کرنے کا ذریعہ نہیں بنایا ہے۔ ان کے متعلق یہ باور کر لینا کہ اس سے فلاں چیز پیدا ہوتی ہے۔ فلاں نتیجہ اس پر مرتب ہوتا ہے۔ مثلاً بدھ کے دن کے متعلق یہ یقین کرنا کہ ہر قسم کے فوائد کو چھین کر ہر قسم کے نقصانات اس شخص کو پہنچا دیتا ہے جو سفر کے لئے اس دن اپنے گھر سے نکلے گا۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کے نقصانات کا ذریعہ خدا نے تو بدھ کو بنایا نہیں۔ اب جو غریب بدھ کے سر ان آثار و نتائج کو تھوپتے ہیں۔ دراصل خدا پر افترا اور جھوٹ باندھتے ہیں حام و وصیلہ، سائبہ وغیرہ جانوروں کی طرف عربوں نے جن آثار کو منسوب کر رکھا تھا۔ قرآن میں اس کا ذکر کر کے ارشاد فرمایا گیا ہے بل الذین کفروا یفترون علی اللّٰہ الکذب واکثرھم لا یعقلون ۱۲

۵۲ ان غیر سلطانی افترائی قوانین نے بربادیوں کے جس سیلاب کو پیدا کیا ہے۔ آج اس کا کون اندازہ کر سکتا ہے، زراعت ہو یا تجارت معاشرتی تقریب ہو یا کوئی انفرادی کام، صرف ہندوستان محض ان ہی افترائی قوانین کی بدولت ہر سال کروڑہا کروڑ روپے کا نقصان اٹھا رہا ہے۔ اور کوئی نہیں جو مصائب کے اس طوفان سے اس ملک کو نجات دلائے۔ میرا ذاتی تجربہ ہے کہ مدتوں لال رنگ کے گنوں کی کاشت سے کسانوں نے اس لئے نفع نہ اٹھایا کہ ان کو باور کرا دیا گیا تھا کہ اس گنے کو جو بوئے گا مر جائے گا جس سال میرے عزیز بھائی سید مکارم حسن صاحب نے اپنے گاؤں گیلانی میں اس گنے کی کاشت کی ابتدا کی۔ علاقہ میں شور برپا ہو گیا۔ کتنوں نے ہاتھ جوڑے پاؤں پکڑے کہ خدارا اس کی کاشت نہ کیجئے۔ اتفاق دیکھئے کہ اسی سال میرے والد حافظ ابو الخیر مرحوم کا انتقال ہو گیا۔ پھر کیا تھا۔ آگ کی طرح اطراف کے دیہاتوں میں خبر پھیلا دی گئی کہ سرخ گنوں نے آخر مولوی صاحب کے والد ہی کو ختم کر دیا۔ میں جب گھر پہنچا اور بدتمیزی کے اس طوفان پر متنبہ کو گھر لایا، تو ان کا فکر تو ان کے سامنے اپنے گھر کے مرنے والوں کی طویل فہرست پیش کی اور پوچھا گیا کہ آخر ان بیچاروں کو کس گنے نے مارا لیکن وہ بہر حال یہی کہتے رہے کہ بیکار ان گنوں کو بو کر حافظ صاحب کو آپ لوگوں نے ختم کرایا ۱۲

جھونک دے۔ لیکن کیا تماشا ہے کہ سلطانی راہوں میں معاشی پیداواروں کو ڈھونڈھتے ہوئے جو ایمان و تقویٰ، دعا و استغفار، صبر و شکر، توکل و تسلیم کے مختلف ناموں سے ان تدبیروں کو بھی اختیار کرتا چلا جاتا ہے جن سے خود پیدا کرنے والے کی رضامندی حاصل ہوتی ہے۔ حصولِ معاش کی راہ میں اس طرزِ عمل کے نتیجہ خیز ہونے پر جو بھروسہ کرتے ہیں۔ انھیں دیکھ دیکھ کر وہی طبقہ گھبرایا جاتا ہے۔ بلکہ کبھی کبھی سر پیٹ لیتا ہے۔ جس نے خدا جانے کتنی غیر سلطانی راہوں کو پیدائش کی سلطانی راہ محض اس لئے باور کر لیا ہے کہ انجن بنانے والے، ہوائی جہاز اڑانے والے ریڈیو بجانے والے یورپ کا یہی عقیدہ ہے۔

گو جی تو نہیں چاہتا کہ کہہ دوں لیکن آئندہ جو کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ یہی بیان چونکہ اس کی تمہید بن جائیگا اس لئے کہہ ہی دیتا ہوں، واقعہ یہ ہے کہ آج معاشی جد و جہد کے سلسلے میں دعا و استغفار، توکل و تسلیم وغیرہ یا دوسرے لفظوں میں وہی کہئے کہ پیدا کرنے والے سے اس کی پیداواروں کے مانگنے کی جو بہت گھٹائی جا رہی ہے، تو گو سٹیج پر قومی تیوہاروں میں تو یہی کہا جاتا ہے کہ خدا سے مانگنے کا ہمیں انکار نہیں ہے، خدا کی بات تو اپنی جگہ پر درست ہے لیکن اندیشہ ہے کہ ان رجحانات کو اگر زیادہ تیز کر دیا گیا۔ تو حصولِ معاش کے جو واقعی اسباب ہیں۔ مسلمان ان کے اختیار کرنے میں سست پڑ جائیں گے۔ مسلمانوں کے جن طبقات میں اس قسم کے خیالات واضح یا ناواضح، شعوری یا غیر شعوری شکلوں میں نشوونما پا رہے ہیں۔ چونکہ ان خیالات کی پیدائش میں، ان ہی حالات کو دخل ہے۔ جن میں آج یورپ مبتلا ہے۔ اس لئے یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی نقطۂ نظر سے، ان مغربی مؤثرات پر بھی بحث کی جائے۔ آئندہ آپ کے سامنے جو چیزیں پیش کی جا رہی ہیں۔ غور سے ان کو پڑھئے۔ دلوں کا پھیرنے والا تو وہی ہے۔ جس کی دونوں انگلیوں میں بندوں کے قلوب ہیں۔ اپنا جو فرض ہے اسے ادا کرتا ہوں وما توفیقی الا باللہ علیہ توکلت والیہ انیب۔

گذشتہ مباحث میں آخری بات جو میں نے قرآنی بینات کے حوالوں سے پیش کی تھی یعنی "حیات طیبہ" اور بہتر ستھری معاشی زندگی کی ضمانت قرآن کی رو سے اسی میں ہے کہ خالق کائنات کو "الہ المعاد" بناتے ہوئے اسی کو اپنا "الہ المعاش" بھی تسلیم کر لیا جائے۔ جن واضح اور کھلے کھلے نصوص سے یہ دعویٰ ثابت ہوتا ہے۔ آپ انھیں پڑھ چکے۔ ایک مسلمان کے لئے تو یہی کافی ہے کہ یہ قرآن کی آیتیں ہیں۔ اور یہ اس کے عطا فرمودہ ہدایات ہیں جس کے علم سے کوئی چیز پوشیدہ نہیں ہے۔ اس کے مقابلے میں ناقص مقدمات سے پیدا کئے ہوئے ناقص نتائج کی کوئی قیمت نہیں۔ خواہ بظاہر ان میں جتنی بھی معقولیت نظر آتی ہو۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا کا رسول مان کر جو طے کر چکا ہے کہ اسی ایمان پر زندہ رہوں گا اور اسی پر مروں گا۔ ایسا آدمی تو یقیناً شک و شبہ سے بلند و برتر ہو چکا ہے۔ لیکن کمزور ایمان والوں کو بسا اوقات وساوس ستاتے ہیں۔ قرآن میں چونکہ ان وساوس کے ازالے کا بھی کافی سامان کیا گیا ہے۔ اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ کتاب کے اس مقدمے کو اسی بحث پر ختم کیا جائے۔

غیر مسلم اقوام کی دنیاوی کامیابیوں کا دھوکہ

بات یہ ہے کہ کچھ آج ہی نہیں، قرآن ہی سے معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبروں کی تعلیم کو مسترد کرنے والوں میں خوشحالوں اور خوش فعلوں کا ایک خاص طبقہ ہمیشہ پایا گیا ہے، جو

اپنی معاشی کامیابیوں، بہ ظاہر کامیابیوں اور فراغ بالیوں کو دکھا دکھا کر اس دعوی کے پیش کرنے کا عادی تھا۔ قرآن میں بہ ایں الفاظ یعنی

لو کان خیرا ما سبقونا الیہ   اگر پیغمبروں کی بات بہتر ہوتی تو اس کی طرف سبقت وہ لوگ نہ کرتے جو پیغمبروں کے ماننے والے ہیں۔

جس کا ذکر پایا جاتا ہے، وہ یہ کہتے تھے کہ زندگی کے کسی اصول یا طریقۂ حیات کے خیر اور بہتر ہونے کا معیار یہی ہے کہ ہم اور ہمارے دماغ نے اس کے پانے میں سبقت کی ہو، دوسرے لفظوں میں یوں سمجھئے کہ جو بات ان کی سمجھ میں نہ آئی یا جس کے سمجھنے میں ان کے دماغ نے پیش قدمی نہ کی، یہی چیز اس کے غلط اور بے معنی ہونے کے لئے وہ کہتے تھے کہ کافی ہے۔ استدلال کرتے ہوئے ان کا بیان یہ بھی تھا جسے قرآن ہی نے نقل کیا ہے، یعنی کہتے

نحن اکثر اموالا و اولادا و ما نحن بمعذبین۔   اموال اور اولاد میں تو ہم بڑھے ہوئے ہیں، اور ہم عذاب پانے والوں میں نہیں ہو سکتے

درحقیقت یہ اسی لب و لہجہ میں گفتگو ہے۔ جسے آج ان قوموں نے اختیار کر رکھا ہے۔ جو خود بھی اپنے آپ کو متمدن اقوام اور اپنے ممالک کو شائستہ و مہذب ممالک کے نام سے مشہور کئے ہوئے ہیں، اور جو ان کے نام لیوا یادگار گو ہیں۔ وہ بھی ان ہی شاندار جباری القاب و خطاب سے ان کا تذکرہ کرتے ہیں۔ قرآن ہی میں ہے کہ جب پیغمبران کو خدا کی آیتیں سناتے ہیں تو پیغمبروں کے منکر کہتے

ای الفریقین خیر مقاما و احسن ندیا۔   یعنی مسلمانوں اور غیر مسلموں میں بلحاظ مرتبہ میں کون بہتر ہے۔ اور کس کے جلسے زیادہ شاندار ہیں۔

(ط)

امریکہ و یورپ کی کامیابیاں

سادہ الفاظ میں میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ یورپ اور امریکہ کے باشندے جو "الٰہ المعاش" تو خیر دور کی بات ہے۔ حق سبحانہٗ و تعالیٰ کو "الٰہ المعاد" بنا کر بھی پوجنے پر آج آمادہ نہیں۔ بلکہ بڑی تمدنی بلندیوں، تونگری کی بے پناہ قوتوں کو دکھا دکھا کر دنیا کو یہ باور کرا رہے ہیں کہ معادی نہ سہی، لیکن معاشی جدوجہد میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے خدا کو "الٰہ" بنانے کی قطعی ضرورت نہیں۔ اگر دنیا میں خدا کو خوش و ناخوش رکھنے ہی پر معاشی ترقیوں کا دارومدار ہوتا۔ تو یورپ اور امریکہ کے باشندوں کو چاہئے تھا کہ دنیا کے غریب ترین لوگ ہوتے۔ لیکن معاملہ بالعکس، دن کی روشنی میں ہر شخص کو نظر آ رہا ہے، فجور کی کوئی شکل فسق کوئی طریقہ، الحاد کی کوئی صورت، زندقہ و بے دینی کا کوئی پہلو ایسا نہیں ہے، جس میں یورپ کا پاپی ملک اور امریکہ کے ناستک دھرم لوگ مبتلا نہیں ہیں۔ لیکن اسی کے ساتھ دیکھا جا رہا ہے کہ معاشی عروج کا بھی کوئی زینہ ایسا نہیں ہے جس پر پہنچنے سے یہ محروم رہ گئے ہوں۔ قال سے نہ سہی لیکن زبان حال سے وہی،

نحن اکثر اموالا و اولادا و ما نحن بمعذبین۔   اموال اور اولاد میں تو ہم بڑھے ہوئے ہیں اور ہم عذاب پانے والوں میں نہیں ہو سکتے۔

کی آواز آج بھی بنی آدم کی جتنی بڑی تعداد ہے [illegible] گزر کر ادوں کی گہرائیوں میں اس حد تک

جبکہ پڑھیں اور بتدریج کرتی رہتی ہیں، یہ کچھ مجھ ہی سا کوئی دیوانہ ہو تو ہو کہ اپنے عہد کی ذہنیتوں سے بے پروا ہو کر یہ جانتے ہوئے کہ میری ہر بات میری ہی طرف واپس ہو رہی ہے، لیکن باوجود اس کے انتہائی سادگی کی راہ اختیار کر کے وہ وہی کہتا چلا جائے جس کے کہنے اور پہنچانے ہی کو اپنی زندگی کا واحد نصب العین بنائے ہوئے ہو لیکن بایں ہمہ جنون و وارفتگی، یہ واقعہ ہے کہ پیش کرنے کی حد تک تو جو کچھ میری سمجھ میں آتا گیا، پیش کرتا چلا گیا۔ مگر جو واقعہ ہے اسے کیسے چھپاؤں کہ یہ احساس بھی ساتھ ساتھ دل میں مسلسل چٹکیاں لیتا چلا جاتا تھا کہ جس موسم میں تو یہ چیزیں پیش کر رہا ہے، یہ ایسا موسم ہے جس میں تیری بات نہ صرف بہتوں پر گراں ہی گذر رہی ہوگی، بلکہ ایک بڑا گروہ ان کا بھی ہوگا جن کے جبڑوں سے باہر نکلنے کے لئے بے ساختہ قہقہے بے چین ہو گئے، بلکہ ممکن ہے کہ بعضوں کے اندر سے نکل بھی پڑے ہوں۔ اگرچہ سرگرانیوں کے اس احساس اور قہقہوں کے ان خطرات کے مقابلے میں میرا دل بھی مسلسل قرآن ہی کی ان آیتوں کی تلاوت و ورد میں مشغول ہو جاتا تھا یعنی اس قسم کے لوگوں کو خطاب کر کے مختلف الفاظ میں قرآن میں ڈانٹتے ہوئے جو ارشاد فرمایا گیا ہے۔

کلوا وتمتعوا قلیلا انکم مجرمون (المرسلات) — کھاؤ مزے اڑاؤ تھوڑے دن کے لئے قطعاً تم لوگ مجرم ہو۔

یا خبر دی گئی ہے

الذین کفروا یتمتعون ویاکلون — جنھوں نے کفر کیا اور مزے اڑا رہے اور کھا رہے
کما تاکل الانعام والنار مثوی لھم (سورۂ محمد) — ہیں اسی طرح کھا رہے ہیں جیسے چوپائے کھاتے ہیں۔ آگ ٹھکانا ہے ان کا۔

ان لوگوں کو جنھیں آج اپنے عزیز کریم (آنربیل، اسکوئر) ہونے پر ناز ہے، انھیں کو جتلا دیا گیا ہے کہ آج کچھ بھی نظر آ رہا ہو، لیکن بہرحال زندگی کے ایک ایسے دور سے انھیں دوچار ہی ہونا پڑے گا جہاں

ذق انک انت العزیز الکریم (الدخان) — اب چکھ! تو بڑی عزت آبرو والا تھا۔

کے کچوکوں سے ان کی مہمان نوازی کی جائے گی۔ بہرحال اسی قرآن میں بکثرت آپ کو ایسی آیتیں ملیں گی جن میں رعونتی استغنا کے ساتھ

وکم اھلکنا قبلھم من قرن ھم اشد منھم بطشا فنقبوا فی البلاد ھل من محیص۔ — اور ہلاک کر دیا ہم نے کتنے قرن کو جو بڑھ کر تھے ان سے سخت تھے، وہ بلاد میں گھس پڑے تھے۔ پھر ہے کیا کوئی جائے خلاص۔

ان لوگوں کو چونکایا گیا ہے جنھیں اپنی گرفت و بطش کی شدت اور بلاد اللہ میں تسخیری قوتوں کے ساتھ گھس پڑنے چھا جانے نے یہ باور کرا دیا ہے کہ ہلاکت و زوال کی راہوں کو اپنے اوپر اور اپنی قوم و ملک پر وہ بند کر چکے ہیں۔ وہی جو قسمیں کھا کھا کر مالنا من زوال (ہمارے لئے زوال نہیں ہے) کے دعووں سے آسمان کو سر پر اٹھائے ہوئے تھے، ان ہی کو خطاب کر کے اعلان کر دیا گیا ہے۔

فلا تحسبن اللہ مخلف وعدہ رسلہ ان اللہ عزیز ذو انتقام۔

ہرگز خیال کرنا کہ اپنے رسولوں سے خدا نے جو وعدے کئے ہیں۔ اُن کا خلاف کرے گا۔ قطعاً اللہ تعالیٰ غالب اور انتقام والا ہے۔

بلکہ سچ تو یہ ہے کہ نوحی، عادی، ثمودی، بابلی، مصری اور مدینی وغیرہ تمدنوں اور ان کے زوال و سقوط کے جو قصے قرآن میں بار بار دہرائے گئے ہیں، صرف ناموں کی خصوصیت سے قطع نظر لینے کے بعد جس کا جی چاہے ان تمام قرآنی قصص کو موجودہ عمرانی بغاوتوں، اور تمدنی طغیانیوں پر منطبق کر کے اپنی تسلی حاصل کر سکتا ہے۔

لیکن جیسا کہ میں نے عرض کیا۔ ان ایمانی آیات اور قرآنی مسکنات کے سوا جہاں تک میرا خیال ہے قرآن ہی میں ڈھونڈھنے والوں کو ایسی چیزیں بھی مل سکتی ہیں، جن میں غور کرنے والے اگر غور کریں گے تو اس پرانے دقیانوسی وسوسہ کا خواہ باور کرانے والے اسے جتنا بھی جدید اور عہد روشن خیالی کی پیداوار قرار دیتے ہوں بہر اسی پیش پا افتادہ عام مغالطہ کا جواب قرآن ہی میں ایسے سلجھے ہوئے الفاظ میں مل سکتا ہے جن سے ایمان ہی نہیں، بلکہ آدمی کی عقل بھی چاہے تو تسکین حاصل کر سکتی ہے۔ اور اب میں ایک خاص ترتیب کے ساتھ ان ہی قرآنی آیات کو اپنی سمجھ کے مطابق پیش کرنا چاہتا ہوں۔ بلکہ یوں بھی اس کی ضرورت اس لئے زیادہ محسوس ہو رہی ہے کہ قرآن کی مذکورہ بالا دھمکیوں کا ایک جواب بھی عام طور پر دنیا میں پھیلا دیا گیا ہے۔ باور کرایا جا رہا ہے۔ وہی جن کے سامنے بتدریج ان کے کرتوتوں کے مہیب نتائج دانت دکھا رہے ہیں۔ ان ہی کی طرف سے یہ باور کرایا جا رہا ہے کہ جیسے انسانی افراد کا بچپن، جوانی کے عہد سے گذر کر بالآخر پیرانہ سالی کے پنجہ میں گرفتار ہونا ایک قدرتی واقعہ ہے، اور بڑھاپے کے بعد موت کے آغوش میں چلا جانا ہر جینے والے کے لئے ناگزیر ہے۔ اسی طرح قومیں بھی چونکہ اسی قانون کے تحت پیدا ہوتی ہیں۔ بالآخر بوڑھی ہو کر اپنی طبعی موت کے ساتھ مر جاتی ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جن پیش آنے والے عواقب و نتائج کے متعلق قرآن الزام دے رہا ہے۔ ان نتائج کو بجائے خدائی انتقام اور ناراضی کے چاہتے ہیں کہ فطرت اور نیچر کی طرف منسوب کر دینے کا عام جواب پیش آنے سے پہلے ہی تیار رکھیں۔ اس جواب کا ڈھنڈورہ اتنی شدت سے پیٹا گیا ہے کہ خدا کا عذاب حالانکہ ان اقوام کے سامنے گویا بے نقاب ہو چکا ہے، لیکن توجیہ اور تاویل کا یہی "پتھر" ہے۔ جو صداقت کی بھوکی انسانی فطرت کے منہ میں اس لئے ٹھونسا جا رہا ہے تاکہ تلاش و جستجو کے جن جذبات میں حالات ہلچل پیدا کر رہے ہیں، جذبات کے اس تلاطم کو ساکن اور ٹھنڈا کر دیا جائے، بلکہ سچ تو یہ ہے کہ اسی پتھر سے عبرت و بصیرت کی آنکھیں بھی پھوڑ پھوڑ کر اندھی بنائی جا رہی ہیں۔ غیر تو غیر مجازاتی اور اخلاقی مکافات کی شکل میں ان واقعات کی تفسیر و توجیہ کی عادت خود مسلمانوں میں دیکھا جا رہا ہے کہ بتدریج دھیمی پڑتی چلی جا رہی ہے، اور روشن خیالی یا بلند مغزی وغیرہ الفاظ کے خول میں وہی پرانی جاہلی منطق دہرائی جا رہی ہے۔ قرآن میں جس کا ذکر ان الفاظ میں کیا گیا ہے۔ یعنی

وان یروا کسفا من السماء ساقطا یقولوا سحاب مرکوم۔

اور دیکھیں اگر وہ آسمان کے کسی ٹکڑے کو گرتا ہوا، تو کہنے لگیں یہ تو کوئی تہ بہ تہ جما ہوا بادل ہے۔

ٹوٹے ہوئے ہار کے مانند ایک انتقام کے بعد دوسرا۔ دوسرے کے بعد تیسرا مختلف شکلوں میں سامنے آتا چلا جارہا ہے۔ لیکن اب معلوم ہوتا ہے کہ بھینسوں کے سامنے کوئی بین بجا رہا ہے۔ یا ان کا حال ان بکریوں کا سا ہے جن کے سامنے ان ہی کے منڈے سے نکال نکال کر قصاب ان ہی کے بھائی بندوں کے گلوں پر چھری پھیرتا چلا جاتا ہے۔ ان کے خون سے سارا میدان لالہ زار بنا رہتا ہے۔ لاشیں تڑپتی رہتی ہیں۔ لیکن بے حس بکریوں میں اس کا کوئی احساس نہیں پایا جاتا کہ یہ کیا ہو رہا ہے، کیوں ہو رہا ہے۔ اندھی بنی ہوئی گونگی اور بہری بنی ہوئی۔ جو کچھ ہوتا رہتا ہے اسے اطمینان سے دیکھتی رہتی ہیں۔ گویا یہ طے کئے ہوئے ہیں کہ جو کچھ بھی کسی طرح سے بھی سمجھایا جائے گا۔ لیکن ہم نہ سمجھیں گے۔

خیر یہ تو جو کچھ ہو رہا ہے۔ اس سے قطع نظر کر کے اس وقت میں صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ جن قوموں کی فردوسی زندگی کو دیکھ دیکھ کر ہر خیر اور بھلائی کے پرکھنے، جانچنے کا آج ان ہی کو جو معیار بنا لیا گیا ہے۔ کیا ان کی موجودہ زندگی درحقیقت واقعی فردوسی زندگی ہے؟ ایسی زندگی جس سے محروم رہ جانے والوں کو رشک اور حسد کی آگ کے بھنبل میں جلتے رہنا چاہئے، کیا ان کے باہر جو کچھ نظر آرہا ہے، ان کا اندر بھی درحقیقت وہی ہے جو سمجھا جاتا ہے، قرآن کی روشنی میں چل کر حقیقت تک جو پہنچنا چاہتے ہیں، چاہئے کہ ذرا صبر اور معقول فکر و تامل کے ساتھ ان آیتوں پر غور کریں جو آپ کے سامنے اب لائی جارہی ہیں۔

ان آیات سے پہلے چند تمہیدی کلمات سن لیجئے۔

علم معاشیات کے متعلق ایک سرسری تاریخی تبصرہ

بات یہ ہے کہ اکانومی جو قدیم یونانی زبان کی ایک پرانی اصطلاح ہے۔ عربی میں اس کا ترجمہ "تدبیر المنزل" کیا گیا تھا۔ یونانی فلسفہ کو حکمت نظری (تھیوریٹیکل) اور حکمت عملی (پراکٹیکل) کے دو حصوں میں تقسیم کر کے ثانی الذکر یعنی حکمت عملیہ کی ایک شاخ اسی تدبیر المنزل کے لفظ سے موسوم تھی۔ سمجھایا یہ جاتا تھا کہ گھریلو زندگی کے تعلقات سے اس فن میں بحث کی جاتی ہے۔ عربی میں چونکہ گھر کو منزل کہتے ہیں۔ اسی لئے تدبیر المنزل اس فن کا نام رکھا گیا تھا۔ گھریلو زندگی کے تعلقات سے یہ مراد لی جاتی تھی کہ میاں، بیوی، بال بچے، نوکر چاکر وغیرہ کے متعلقہ مسائل و ضوابط اس فن میں بتائے جاتے ہیں۔ اسی سلسلے میں "مال اور متمول" بھی۔ فن تدبیر المنزل کا ایک جزء ان کتابوں میں ہوتا تھا۔ محقق طوسی نے اپنی کتاب اخلاق ناصری میں فن تدبیر المنزل اور جن امور سے اس میں بحث کی جاتی ہے انہی کو بتاتے ہوئے لکھا ہے

بباید دانست کہ مراد از منزل دریں موضع نہ خانہ ایست کہ از خشت و گل و سنگ و چوب کنند، بل از تالیفے مخصوص است کہ میان زن و شوہر و والد و مولود و خادم و مخدوم و متمول و مال افتد۔

جاننا چاہئے کہ منزل کے لفظ سے یہاں مراد اینٹ اور چونے، پتھر اور لکڑی کا بنا ہوا گھر نہیں ہے۔ بلکہ اس ترکیبی جمعیت کی یہ تعبیر ہے جو بیوی، میاں، ماں، باپ، لڑکے، غلام، نوکر چاکر، مال اور مال والے سے مرکب ہوتی ہے۔

گویا فن تدبیر المنزل کے چار عنوانوں یا چار اجزاء میں سے ایک عنوان بحث یا ایک جزء "متمول اور مال" کا بھی ان کتابوں میں ہوتا تھا۔ اسی لئے سمجھا جاتا تھا کہ منجملہ دیگر مقاصد و اغراض کے اس فن کی بڑی غرض

غایت یہ بھی ہے کہ "تیسیر اسباب معاش و توصل بہ کمالے کہ حسبِ شتراک مطلوب باشد" یعنی معاش کے اسباب میں سہولت بہم پہنچانا۔ اور اس کمال تک رسائی حاصل کرنا جو باہم (کسی گھر کے رہنے والوں کے اشتراک کی بنیاد پر فراہم ہو سکتا ہو) لیکن یونانی زبان کی جو کتابیں اس فن میں لکھی گئی ہیں، ان کا حال تو معلوم نہیں جس کی بڑی وجہ وہی ہے جیسا کہ یہ خبر دینے کے بعد کہ "حکماء قدما را دریں نوع اقوال بسیار است"۔ محقق ہی نے یہ لکھا ہے

نقل کتب ایشان دریں فن از لغتِ یونانی	ان حکماء کی کتابیں یونانی زبان سے عربی
بلغتِ عربی اتفاق نیفتادہ است۔	زبان میں منتقل نہیں ہوئی ہیں۔

عام طور پر اسلامی فلسفہ کی کتابوں میں جہاں حکمتِ عملیہ کی بحث آتی ہے مصنفین اس مشہور فقرہ کے استعمال کرنے کے عادی نظر آتے ہیں یعنی

قد قضت الشریعۃ المصطفویۃ	محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی روشن شریعت
الغراء الوطر عنہا۔	اس حاجت کی تکمیل کر چکی ہے۔

البتہ طوسی نے صرف اتنا پتہ دیا ہے کہ

مختصرے از سخن ابروس کہ در دست متاخران	فن تدبیر المنزل کی ایک مختصر کتاب بروس حکیم کی
موجود است۔ (اخلاقِ ناصری ص ۱۷۱)	پچھلے لوگوں کے پاس پائی جاتی ہے۔

واللہ اعلم بالصواب یہ ابروس نامی حکیم کون شخص ہے۔ کیا نیوفیثا غورثی اسکول کا مشہور معاشی ماہر و مصنف بروسن کے نام کی یہ تصحیف ہے۔ جس کی کتاب کا عربی ترجمہ حال ہی میں یعنی ۱۹۲۹ء میں بانڈل برگ جرمنی سے شائع ہوا ہے۔ سمجھا جاتا ہے کہ مسلمانوں کی کتابوں میں اس فن کے متعلق جو مباحث پائے جاتے ہیں۔ وہ بروسن ہی کی کتاب "اردیے کونومی کوس" سے ماخوذ ہیں۔ جس کا عربی میں ترجمہ ہو گیا تھا۔ ادب یورپ والوں نے تلاش کر کے اسی عربی ترجمہ کو شائع کیا ہے۔

کچھ بھی ہو، مجھے کہنا یہ ہے کہ "مال اور متمول" یعنی فن تدبیر المنزل کی اس شاخ کے مسائل اگرچہ نئے نہیں ہیں، اکانمی کا یہ لفظ ہی بنا ہے۔ اپنی اپنی حیثیت سے ہر زمانے میں ارباب نظر و فکر کا ایک طبقہ اس کے متعلقہ مسائل پر بحث و تحقیق کرتا رہا ہے۔ لیکن سچی بات یہ ہے کہ پچھلی چند صدیوں میں یوں تو دنیا کے اکثر علوم و فنون کے بڑھانے اور پھیلانے میں یورپ والوں نے جو کام کیا ہے۔ یہ تو ایک عام بات ہے۔ مگر خصوصیت کے ساتھ اس "مال و متمول" کی چھوٹی سی اکانمی کی شاخ میں مغربی دانشمندوں اور ارباب تدقیق نے جتنی وسعت پیدا کی ہے۔ اگر عمق سے قطع نظر کر لیا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ اس فن کے طول و عرض کو آج جتنا بڑھا دیا گیا ہے۔ کوئی شبہ نہیں کہ "مال و متمول" کے پرانے گنے چنے چند کلیات کے مقابلے میں یہ دعویٰ بیجا نہیں ہے کہ اس عہد کا فنِ "معاشیات" ایک نو ایجاد اور بالکل تر و تازہ فن ہے۔ گذشتہ دو تین صدیوں میں [illegible] نے اتنی ترقی کی ہے کہ اس کی کتابوں سے چاہا جائے تو ایک بڑی [illegible] تمام کرنے [illegible] شاید ہی کوئی دن گذرتا ہوگا جو یورپ کی بیسیوں زبانوں میں اس فن کی [illegible]

نتیجہ ہے کہ اس وقت تک دُنیا کا یہ علم ایک ایسے سیال رواں دواں حال میں ہے کہ بلا مبالغہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ عصری علوم میں مشکل ہی سے اس صفتِ خاص میں اس فن کے ساتھ موجودہ علوم میں کوئی علم اس کی ہمسری کر سکتا ہے۔ حال یہ ہے کہ کتابیں ادھر لکھی جاتی ہیں۔ لکھنے والے محنت اور کوشش کر کے بالکلیہ تازہ بتازہ نو بہ نو نظریات کو اپنی کتابوں میں درج کرتے ہیں، لیکن ان پر سال بھی گذرنے نہیں پاتا کہ "کالج بدر" ہونے کی رسوائی کے ساتھ علمی دائروں میں اپنی وقعت و قیمت وہ کھو بیٹھتے ہیں۔ معاشیاتی پیشہ وروں کے متعلق تو میں نہیں کہتا، شب و روز جب وہ اسی دھندے میں ڈوبے رہتے ہیں۔ تو ان پر بھی یہ حالت طاری رہتی ہے یا نہیں۔ لیکن جن بیچاروں کا "معاشیات" مخصوص مطالعاتی مضمون نہیں ہے، یہ واقعہ ہے کہ کسی وجہ سے اگر ان کو اس فن کے متعلق یا اس کے کسی نظریہ یا مسئلہ کے متعلق کچھ بھی لکھنا پڑتا ہے تو ماہرین اور فن کے ابناء الاوقات کے استہزائی قہقہوں کے خوف سے ان کا قلم کانپتا جاتا ہے۔ ڈرتے رہتے ہیں کہ استشہاد و استدلال میں جن کتابوں کے اقتباسات یا جن نظریات کو وہ پیش کر رہے ہیں۔ ان کا معاشیاتی دنیا سے "دیس نکالا" تو نہیں ہو چکا ہے۔ پھر اسی کے ساتھ "متمول و مال" یہ بحث کرنے والوں نے اس قلیل عرصہ میں باخود ہا ایسے اسی اختلافات پیدا کر لیے ہیں کہ بجائے خود ہر اختلاف ایک مستقل مکتبِ خیال کی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔ فن سے جس کو پیشہ ورانہ تعلق نہیں ہے۔ اس بیچارے کو سخت دشواری پیش آتی ہے۔ کہ جس کتاب سے وہ کام لے رہا ہے۔ یا جس مسئلہ کو وہ دلیل و شہادت میں پیش کر رہا ہے اس کا تعلق ان بھانت بھانت کی معاشی بولیاں بولنے والوں میں سے کس ٹولی سے ہے۔ معیاری معاشیات والوں سے؟ یا ترتیبی والوں سے؟ یا اقداری والوں سے؟ پھر مصنف اس کا پرولتاری معاشیات کا حامی ہے۔ یا بورژوا والوں سے اس کا رشتہ ہے، وہ لبرل ہے یا ترکی؟ کریسچینٹی معاشیات کے زیر اثر اپنے نظریات اس نے بنائے ہیں۔ یا مرکنٹائل اسکول والوں سے ساز باز رکھتا ہے۔

مگر ع۔ ہر لحظہ بہ شکل دگراں یار برآمد۔ کے بہروپ بھرنے کے باوجود جس کی وجہ سے جیسا کہ میں نے عرض کیا، اس فن کے نظریات و مسائل پر بحث کرنے والے عموماً دغدغوں اور ذبذبوں میں غلطاں و پیچاں رہتے ہیں، یہ عجیب بات ہے کہ دنیا کا وہ منطقہ بارہ جہاں عروج و اقبال کی بلندیوں پر اس فن کو پہنچایا گیا ہے یعنی سرزمین مغرب، اس علاقے کے باشندوں میں ایک خاص احساس کا اثر اتنا مستحکم اور پائیدار ہے کہ جدت طرازیوں کے اس طوفان میں بھی ان کا یہ احساس جوں کا توں اسی حال پر "ہماں ست کہ بود" کی چٹان پر قدم جمائے ہوئے ہے۔

سرزمین مغرب اور اس کے باشندوں کی ایک لازوال خصوصیت

مطلب یہ ہے کہ انسان اور انسانیت کے متعلق جب جس زمانے میں کچھ سوچنے سمجھنے یا رائے قائم کرنے یا اصول و ضوابط بنانے کا ارادہ اس ملک میں کیا گیا ہے۔ تو پہلے بھی دیکھا گیا اور اب بھی دیکھا جا رہا ہے کہ بیٹھتے تو ہیں اسی ارادہ کر کے کہ ہمیں جو کچھ سوچنا اور طے کرنا ہے۔ اس کا تعلق انسان و آدمی [illegible] سے ہے، لیکن خدا جانے کیا بات ہے اسباب اس کے کیا ہیں کہ بحث جب شروع ہوتی ہے تو وہی انسان "جو بحث و تحقیق کا موضوع بنایا جا چکا تھا، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کے انسان ہونے کا خیال حافظوں سے چھپ [illegible] ہو گیا ہو اس کے بعد یہ تو کچھ

سمجھتے ہیں، جو کچھ سمجھاتے ہیں، ہر ایک سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ ان کی بحث کا موضوع آدمی نہیں بلکہ کچھ اور ہے۔ آج تو خیر ممکن ہے کہ عین وقت پر حافظہ کی اس عجیب و غریب معکوسیت کی توجیہ کر لی بھی جائے کہ کچھ دنوں سے انسانی نسل کے شجرۂ نسب کو اسی ملک کے بعض مفکرین نے غیر انسانی خانوادوں سے جوڑ دیا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اسی کا شعوری یا غیر شعوری عکس سوچنے والوں کے دماغوں پر پڑتا ہو مگر میں تو یہ دیکھ رہا ہوں کہ آج ہی نہیں، بلکہ اُس وقت بھی جب ڈارون کی کتاب اصل انواع سے زیادہ ان کے قلوب میں مسیح علیہ السلام کی انجیل اور موسیٰ علیہ السلام کی توریت کا وزن تھا۔ ان کے مقابلے میں کسی دوسرے کی اس ملک کے رہنے والے نہ کچھ سننا ہی چاہتے تھے اور نہ ہی چاہتے تھے لیکن اس زمانہ میں بھی جب اس غریب انسان کے متعلق یہ سوال اٹھایا گیا کہ آدمی کی اصلی حقیقت کیا ہے تو اس وقت بھی بجائے آدمی ہونے کے یہی طے کیا گیا تھا کہ باہر سے وہ کچھ ہی نظر آتا ہو، لیکن اپنی اصلی حقیقت کی رو سے وہ بشر نہیں ملک ہے۔ یعنی آدمی نہیں فرشتہ ہے۔ اسی فیصلہ کا یہ نتیجہ ہے کہ مذہبی احکام کی پابندی کا آخری نتیجہ یہ قرار دیا گیا کہ آدمی فرشتہ بن جائے۔ یعنی جو "ہے" پھر وہی وہ ہو جائے۔ اسی موروثی عقیدے کا اثر آج تک یہ ہے کہ مرنے کے بعد جی اٹھنے اور اخروی سزا و جزا کے یقین کو حالانکہ ان ممالک کی عمومیت کھو چکی ہے۔ لیکن باوجود اس کے جہاں کہیں آنے والی زندگی کے متعلق اس خیال کا تذکرہ آجاتا ہے، یعنی مرنے کے بعد اس نشاۃ میں آدمی کو اپنے فطری احساسات اور مطالبات کے مطابق زندگی ملے گی۔ دوسرے الفاظ میں یوں سمجھئے کہ انہار جنات و حور و قصور والی قرآنی جنت کا ذکر ان کے سامنے اگر کبھی کیا جاتا ہے۔ تو سنتے ہی ہر یورپ زدہ فطرت تلملا اٹھتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کھینچ کر اس کی فطرت پر کسی نے کوئی پتھر دے مارا۔ قرآنی جنت کے متعلق عصری ذہنیتوں کی اس عجیب و غریب بھڑک کی اصلی وجہ میرے خیال میں یہی ہے۔ چونکہ عوام کو وجہ معلوم نہیں، اس لئے سادگی کے ساتھ سمجھنے والے بے چارے یہ سمجھ بیٹھتے ہیں کہ شاید یہ بھی سائنس ہی کے کسی نظریہ یا کیمیائی تحقیقات کا نتیجہ ہوگا جس کی وجہ سے یورپ کے باشندوں نے آئندہ زندگی میں انسانی فطرت کے ان مطالبات کی تکمیل کا انکار کر دیا ہے جن کا قرآن میں مسلسل وعدوں کی شکل میں تذکرہ کیا گیا ہے۔ لیکن جاننے والے جانتے ہیں کہ اس کی تہ میں بھی درحقیقت مغربی ذہنیت کی وہی خصوصیت پوشیدہ ہے۔ یعنی آدمی سب کچھ ہو سکتا ہے۔ بندر ہو سکتا ہے، لنگور ہو سکتا ہے، فرشتہ ہو سکتا ہے، بھوت اور شیطان[1] سب کچھ ہو سکتا ہے۔ لیکن انسان جو کچھ بھی ہو سکتا ہے وہ صرف یہی ہے کہ وہ انسان نہیں ہو سکتا۔

مذہبیت کے دور میں اس ملک کے باشندوں کا عام رجحان جیسا کہ کہا جاتا ہے۔ رہبانیت کی طرف عموماً جو پایا جاتا تھا، لذائذ حیات اور انسان کے فطری احساسات کے تقاضوں کو غلط یا صحیح طریقہ سے دبانے کی کوشش جو ان میں جاری تھی۔ تو اس میں بھی دراصل آدمی کے فرشتہ ہونے کی اسی خوش اعتقادی کو

---

[1] یہ کوئی مذاق کی بات نہیں۔ بندر اور لنگور ہونے کا مغربی نظریہ تو نسل انسانی کے متعلق عام ہے۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ نیکوں کے متعلق جیسے یہ عقیدہ تھا کہ مرنے کے بعد فرشتے بن کر اٹھائے جاتے ہیں۔ اسی طرح بدکاروں اور شریروں کے متعلق ان ہی عیسائیوں کا یہ خیال بھی تھا کہ وہ شیطان و بھوت بن کے اٹھائے جاتے ہیں۔

زیادہ دخل تھا۔ سمجھا یہ جاتا تھا کہ بہیمی اور حیوانی کثافتوں کی چادر اس غریب فرشتہ کو اوپر سے لپٹ گئی ہے۔ اس چادر کو چاک کر کے اپنی ملکوتیت کے چمکانے میں جو زیادہ کامیاب ہوگا۔ وہی اپنی اصل حقیقت سے زیادہ قریب ہوتا چلا جائے گا۔ وہی یورپ جس کا آسمان بھی آج معاش ہے اور زمین بھی اس کی معاش ہی ہے آج جو مجسم معاشیت یا کہیئے تو کہہ سکتے ہیں کہ صرف شکم ہی شکم بن کر رہ گیا ہے۔ اسی یورپ کا حال اپنے ملکوتی عہد میں اسی "معاشیات" کے متعلق یہ تھا۔ جیسا کہ اسی ملک کے ایک معاشی مورخ نے لکھا ہے۔

"معیشت ان کے (یعنی یعنی قدیم ملکوتی عیسائیوں کے نزدیک کبھی فی نفسہ قابل توجہ نہ بنی۔ مقاصد معینہ (یعنی فرشتہ بننے کی مہم اور اس کے مقدمات) کے لئے ذریعہ کی حیثیت سے قدروں کی ہمہ گیر نظام میں اس معیشت غریب کی جگہ کہیں حاشیہ پر تھی۔"

انتہا یہ ہے کہ جدید معاشی دور کا آغاز جن بزرگوں کی اصلاحی آواز کی بدولت جیسا کہ اسی ملک کے لوگوں کا بیان ہے، ظہور پذیر ہوا ہے۔ میری مراد پروٹسٹنٹ فرقہ اور ان کی اصلاحی اقدامات سے ہے دوسرے نہیں۔ اسی اصلاحی پیغام کے سرخیل اعظم یعنی جناب لوتھر تک کے مواعظ و خطبات میں اس وقت تک اس قسم کے فقرے بے جھجک استعمال ہوتے تھے جیسے لوتھر کا مشہور مقولہ ہے۔ وہ کہا کرتا تھا

"دولت ان ہی ٹھیٹھ گدھوں کو اللہ میاں دیتے ہیں جنھیں وہ کچھ ارزانی نہیں فرماتے۔"

اور ظاہر بھی یہی ہے کہ کلیسا کے مذہب سے لوتھر جتنا بھی بیزار رہو، لیکن اس مذہب کا تو وہ بہر حال معتقد بلکہ سرگرم وکیل اور حامی تھا جس کا نصب العین آدمی کو فرشتہ بنانا قرار دیا گیا تھا ایسی صورت میں گرد دولتمندوں کو لوتھر صاحب کہاں یا ٹھیٹھ گدھے کے نام سے موسوم کرتے تھے تو جس کا نصب العین ملک ہونا ہو، اس بلند نصب العین کو چھوڑ کر جس نے اپنی ساری توانائی دولتمند ہونے پر خرچ کر دی ہو اپنی اس حماقت کی وجہ سے اگر سمجھنے والے سے گدھا سمجھتے تھے تو غلط کیا سمجھتے تھے۔

لیکن خیر یہ تو پرانی بات ہے۔ صدیوں کی کشمکش کے بعد فرشتہ بنانے والے مذہب کے جوئے سے اس ملک والوں نے اپنے آپ کو آزاد کر لینے میں جب کامیابی حاصل کی تو جیسا کہ ٹاؤنی نے لکھا ہے

مذہب نے انسانی طبع پر بہت سے قیود عائد کر رکھے تھے۔ سولھویں صدی کی تجارتی ترقی کے ساتھ ساتھ اس کے (مذہب) کے اقتدار کا مقابلہ کیا گیا اور سترھویں صدی کے آخر تک مذہب آئندہ معاشیات پر حکمران نہ رہ سکا۔ تاہم اس کے اقتدار کی دھجیاں باقی رہیں ..... لیکن اٹھارھویں صدی کے پرزور مقابلہ میں طلب و رسد کے قانون اور نفع و راحت کے نام پر معاشیات اور مذہب کے درمیان طلاق واقع ہو گئی۔"

(داستان دہقان ص ۳۲۶)

یعنی وہی "تاریخی اعلان" جو حضرت شعیب علیہ السلام کے مقابلہ میں ان کی معاشی قوم نے

ان نفعل فی اموالنا ما نشاء — ہم اپنے اموال میں جو چاہیں کریں

کے الفاظ میں یہ کہتے ہوئے کیا تھا، یعنی انھوں نے شعیب علیہ السلام سے پوچھا کہ

"تمہاری یہ پوجا پاٹ (صلوات) کیا اس سے بھی روکتی ہیں کہ ہم اپنے مالیات کے متعلق جو چاہیں کریں"

گویا ان کا بھی خیال تھا کہ صلوات (مذہبی کاروبار، دنیا پوجا وغیرہ کو) انسان کے معاشی کاروبار سے کیا تعلق ہے؟ شاید وہ بھی یہی کہتے ہوں کہ مذہب محض ایک پرسنل اور شخصی مشغلہ کی حیثیت سے جینا چاہے تو جی سکتا ہے۔ لیکن زندگی کے عمومی اور اجتماعی شعبوں میں اس کی دخل اندازیوں کو برداشت نہیں کیا جا سکتا دوسرے لفظوں میں یوں کہئے کہ کلیسا (صلوات) کو وہ "اموال" یا دنیاوی کاروبار سے الگ رکھنا چاہتے تھے۔

بہرحال مجھے تو یہ کہنا ہے کہ مذہبی خوش اعتقادیوں کی پٹی اتر جانے کے بعد اور کچھ نہیں تو کم از کم اس کی امید بے جا نہ تھی کہ شاید غریب آدمی اب یورپ والوں کو آدمی نظر آئے گا۔ مگر اب اسے کیا کہئے کہ یوں سوجھنے کی حد تک تو ان کو دور کی، بڑی دور دور کی سوجھی، اتنی دور کی کہ وہاں تک جیسا کہ ان ہی کا دعویٰ ہے ان سے پہلے کسی کی نگاہ نہیں پہنچی تھی۔ لیکن ٹھیک جس وقت یہ آسمان کے ان دیکھے تاروں کو گن رہے تھے۔ پاتال کے جگر کو بھی چاک کر کے ان کی نظر آگے جا رہی تھی۔ اس وقت بھی یہی دیکھا گیا کہ جو سب سے قریب تھا، یعنی خود اپنی حقیقت ان کی نگاہوں سے اس بد اعتقادی کے عہد میں بھی اسی طرح اوجھل رہی جیسے خوش اعتقادی کے قرن میں، اس پر پردہ پڑا ہوا تھا۔ غریب انسان بجلی کی روشنی میں بھی ان کو انسان نظر نہ آیا۔ لے دے کر انقلاب اور تجدد کا اثر اس مسئلہ پر اگر کچھ پڑا تو وہ صرف یہ پڑا کہ آدمی فرشتہ باقی نہ رہا لیکن یہ بات کہ آدم زاد آدم زاد نہیں ہے۔ اس پر ان کا اصرار پھر بھی باقی ہی رہا یعنی ملکوتیت کا انکار کر کے اعلان کر دیا گیا کہ آدمی آدمی زادہ نہیں بلکہ حیوان زادہ ہے، اور اسی کو ایک فیصلہ کی صورت میں قبول کرنے کے بعد معاشی ضابطہ جو انسانوں کے لئے بنایا گیا، اس کی بنیاد بھی اس پر رکھی گئی کہ باہم انسانوں کا دوسرے انسانوں سے وہی تعلق ہے کہ اور اسی کو رہنا چاہئے۔ جو دریا کی رہنے والی مچھلیوں اور جنگل باسی درندوں، چرندوں وغیرہ حیوانات کے درمیان ہے اسی قانون کا نام تنازع للبقا کا قانون رکھا گیا۔ طے کر دیا گیا کہ جیسے چھوٹی مچھلیوں کو نگل کر بڑی مچھلیوں کا یا کمزوروں کو فنا کر کے اپنی بقا کا انتظام کرنا جنگل کے ہر زور آور جانور کا قدرتی حق ہے۔ اسی طرح آدمی بھی جب آدمی نہیں، بلکہ اسی قسم کے دریائی یا صحرائی حیوانوں میں سے ایک حیوان ہے۔ تو تنازع للبقا کی جدوجہد میں اس کو بھی آزاد ہونا چاہئے۔ معاشی دائروں میں دریا اور جنگل کے اسی قانون کی تعبیر "سرمایہ داری کے نظام" سے کی گئی۔ اور چھوڑ دیا گیا۔ ہر قسم کی انسانی پابندیوں سے آزاد کر کے چھوڑ دیا گیا، ہر اس شخص کو جو کسی نہ کسی طرح سرمایہ کی قوت پر قابض تھا کہ جو اس قوت سے محروم ہیں اپنی بقا اور ارتقا کی راہ میں جس طرح چاہے ان سے کام لے، جو سرمایہ نہیں رکھتے وہ خود ان کی بیوی، ان کے بچے، ان کی محنت، ان کی مشقت ان کا خون، ان کا پسینہ، بلکہ ان کی زندگی، ان کی موت، سب کا واحد مقصد یہ ٹھیرایا گیا کہ سرمایہ داروں کی سرمایہ داریت یا گنج دولت کے گنج کے استحکام و مزید ترقی میں جذب ہوتا رہے۔ الغرض امیروں کے لئے اگر غریبوں کو مرجانا پڑے تو یہ فیصلہ کیا گیا۔ اور رحم و ترس کھائے بغیر یہ فیصلہ کر دیا گیا کہ ان کا یہی قدرتی فریضہ ہے ان کو

موت سے اپنی زندگی پیدا کرنا یہ سرمایہ داروں کا فطری حق ہے۔ سوئے اتفاق پر سوئے اتفاق دیکھئے کہ ان ہی دنوں میں جب انسانی آبادیوں پر جنگل کے قانون کو منطبق کرنے کے لئے یا سرمایہ داری کے نظام کو فروغ دینے کے لئے جہاں حکومت اور سلطنت کی قوتوں سے لوگ امداد حاصل کر رہے تھے وہیں بیالوجی کے ایک اسکول کی طرف سے نسلِ انسانی کا وہی مخروطی شجرۂ نسب بھی مرتب کر کے پیش کر دیا گیا تھا جس میں آدم کی اولاد کا رشتہ جنگلی جانوروں سے جوڑا گیا تھا۔ مسئلہ سائنس کا تھا یا فلسفہ کا یا صرف وسوسہ کا ایک تماشہ تھا۔ اس کو تو چھوڑیئے اونگھنے والوں کو ٹھیلنے کا یہ اچھا بہانہ ہاتھ آیا۔ یعنی ضمیر کی آواز کو دبانے کے لئے ایک ڈھلی ڈھلائی یہ منطقی دلیل بھی ہاتھ آگئی کہ آخر جھاڑیوں اور غاروں کی زندگی میں باپ داداؤں نے جس کام کو قدرتی حق کی حیثیت سے انجام دیا تھا۔ کھلی زمین یا اینٹ پتھر کے احاطوں میں رہنے کے بعد ان ہی کے پوتوں اور پڑپوتوں کے لئے وہی حق غیر قدرتی کیوں ہو جائے گا۔ خلاصہ یہ ہے کہ تجدد و انقلاب، تحقیق و اکتشاف کے اس عہد میں اگرچہ سب کچھ بدل گیا۔ لیکن انسان کے متعلق یہ بات کہ وہ انسان نہیں ہے اپنے حال پر باقی رہا۔ نقطۂ نظر میں تغیر اگر کچھ ہوا بھی تو یہی ہوا کہ مذہبی عہد میں جسے فرشتہ قرار دیا گیا تھا، لامذہبی کے اس دور میں وہی جانور ٹھیرایا گیا اور اس پر اصرار کیا گیا۔ اس حد تک اصرار کہ سرمایہ داری کے نظام کے بڑے بڑے حامی بھی چیخ اٹھے۔ کتابوں میں اب تک آدم اسمتھ (ADAM SMITH) کا جو یہ مقولہ نقل کیا جاتا ہے۔

"اپنے اپنے طور پر اپنے ذاتی مفاد کے حاصل کرنے میں گو ہر شخص کو آزاد ہونا چاہیے
لیکن (اگر مذہب نہیں) تو قوانینِ عدل و انصاف میں توڑ و بدل نہ کرنا چاہئے"۔

(داستانِ دہقان ص ٣٢٦)

لیکن اس وعظ کا اثر جو کچھ ہوا وہ یہ تھا۔ جیسا کہ مشہور معاشی مورخ ٹاؤنی نے لکھا ہے۔

"اٹھارہویں صدی کے پرزور مباحث میں اس کی (یعنی آدم اسمتھ) کی تعلیم کا بنیادی اصول بھی فراموش کر دیا گیا۔"

اور کل تک جن کی فطرت کی ملکوتی لطافتوں پر قرآنی جنت کے قصور و حور کا تصور بھی کثافت کا داغ بن جاتا تھا ان ہی کے جانشینوں کو دیکھئے کہ جنگلی درندوں، ٹھیک درندوں کی طرح ان کے بڑے چھوٹوں کے نگلنے میں بغیر کسی شرم و حیا کے بے جھجک منہمک ہیں۔ ڈارلنگ نے اس دردناک نظارہ کی تصویر ان الفاظ میں کھینچی ہے۔

"ناتواں کمزوروں کی کمزوری سے اور ہوشیار جاہلوں کی نادانی سے فائدہ اٹھاتے چلے جا رہے تھے۔" (داستانِ دہقان ص ٢٤٤)

مگر ظاہر ہے کہ آدمی اگر فرشتہ نہ تھا تو واقع میں وہ جانور بھی تو نہ تھا۔ جانور ہونے کے اس خبط کا دورہ آخر کب تک ٹھیرا رہتا۔ ناداروں کا لاوارث طبقہ سرمایہ داروں، صرف سرمایہ داروں کے لئے ہے۔ اور اس طور پر ہے کہ ناداروں کا کوئی حق سرمایہ داروں پر نہیں ہے۔ ان پر صرف فرائض عائد ہوتے ہیں لیکن حقوق کے خانے میں ان کے لئے کچھ نہیں ہے حقوق کے حقدار صرف سرمایہ دار ہیں۔ انسانی فطرت جس درجہ بھی مسخ ہو گئی ہو لیکن ظلم کے اس پہاڑ کو وہ کب تک سنبھالے رکھ سکتی تھی۔ بالآخر اس یک طرفہ بار کے اٹھانے والوں کی گردنوں میں

جنبش شروع ہوئی۔ کنویتاں بدلنے لگیں جن کی آنکھیں تھیں انھیں سوجھنے لگا۔ انھیں دیکھنے والوں میں سے ایک نے لکھا ہے۔

> ''سرمایہ داری کے طوفان بے پناہ نے ہر طرف وہ سراسیمگی پیدا کر دی تھی کہ اچھے اچھوں کے قدم اکھڑے جاتے تھے۔ دولت و افلاس، ثروت و فلاکت، ترقی و تباہی، آبادی و بربادی کے محیر العقول تضاد نے بے شمار ایسے مسائل پیدا کر دیئے تھے جن کا حل کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا۔''

اسی محیر العقول تضاد کی نہ سلجھنے والی گتھیوں کو سلجھانے کے لئے لوگ جب اٹھیں گے، خیال یہ پیدا ہونے لگا کہ تب نہیں تو شاید اب جس ''انسانیت'' کے چہرے پر اس ملک میں نقاب پڑا رہا ہے وہ اٹھ جائے ہو سکتا ہے کہ آدمی جس ملک میں اب تک آدمی نہیں سمجھا گیا ہے۔ ان کو واقعی نظر آ جائے کہ وہ آدمی ہی ہے۔ آدمی ہونے کے سوا وہ اور کچھ نہیں ہے۔

لیکن قسمت کی خوبی ملاحظہ فرمائیے، پتھر پتھر ہی باقی رہا، پانی پانی ہی سمجھا گیا، ہوا ہوا ہی باقی رہی۔ درختوں کے متعلق یقین کیا گیا وہ درخت ہی ہیں۔ الغرض جو چیز واقع میں جو کچھ تھی وہ وہی سمجھی بھی گئی۔ اور یہ نہ سمجھا جاتا تو اور کیا سمجھا جاتا۔ کسی چیز کے لئے کسی دوسری چیز کا ثبوت تو دلیل کا خواہاں ہوتا ہے۔ حرکت کو زمین کے لئے ثابت کرنے میں استدلال کی ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن زمین زمین ہی ہے۔ یعنی شے کا ثبوت خود اپنی ذات کے لئے، دوسرے اصطلاحی الفاظ میں ''ثبوت الشئی لنفسہ'' یہ تو منطق کے ان مقدمات میں ہے۔ جس سے زیادہ جلی، واضح، بدیہی مقدمہ کوئی دوسرا نہیں ہے، چار چار ہی ہے، بھلا اس میں بھی کوئی شک کر سکتا ہے، مگر کیا کیجئے، سب کچھ سمجھا گیا۔ دنیا کا ہر دعویٰ پرکھا گیا، ہر رسم ہر رواج پر تنقید کی گئی لیکن مرغی کے متعلق ایک ٹانگ کا دعویٰ کسی طرح سے، کسی زمانے میں، کسی کے منہ سے جو نکل گیا تھا، یعنی وہی بات کہ ''انسان انسان نہیں ہے'' یہ دعویٰ اس ''محیر العقول تضاد'' کے حل کے زمانے میں بھی من وعن اپنے پختہ رنگ پر قائم رہا۔ جو ابتداء میں کسی نہ کسی طریقہ سے اس ملک کے باشندوں کی ذہنیتوں پر چڑھ گیا تھا یا چڑھا دیا گیا تھا۔ البتہ نظام سرمایہ داری کے مقابلے میں بجائے ان جانوروں کے جن میں بے زوروں کو زور والے اپنی خوراک بنا رہے تھے یا اب تک بنا رہے ہیں۔ یہ طے کیا گیا کہ آدمی کا شمار ان جانوروں میں ہونا چاہئے جن کے ہر فرد کو وہی گھاس چارہ، وہی دانہ پانی ملتا ہے۔ جو دوسروں کو دیا جاتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں سمجھئے کہ مارکس تو تھرنے تو صرف دولتمندوں کو انسانی قطار سے نکال کر گدھوں کے طویلہ میں ڈھکیل دیا تھا۔ لیکن فکری انقلاب کے اس دورے میں دولتمندوں کے ساتھ نادولتوں کو بھی اسی معاشی قانون کا پابند بنا دیا گیا جس کے بیچارے گدھے پابند ہیں۔ یعنی ایک گدھے کو جیسے گھاس چارے کی اسی مقدار کے لینے کا حق چراگاہ سے ہے۔ جتنی مقدار دوسرے گدھوں کو میسر آتی ہے۔ اسی طرح ایک آدمی کو بھی کوئی حق نہیں ہے کہ دوسروں کو جو کچھ ملا ہے یا مل رہا ہے اس سے زیادہ لینے کا مطالبہ کرے یا ۔ یا وہ مقدار کو اپنے اقتدار میں لائے۔ یونہی چرنے چگنے کے بعد کسی گدھے کے لئے جیسے یہ جائز نہیں ہے کہ گھاس کے کسی

گٹھے کو اپنی ذاتی ملکیت بنا کر طویلہ میں محفوظ کرالے یا اپنے بیٹوں اور پوتوں تک ان کو پہنچائے۔ مطالبہ کیا گیا کہ مساوات اور عدل کے اسی قانون کی تعمیل آدم زادوں کو بھی کرنی پڑے گی۔

اسی مضمون کو کبھی فلسفہ کی زبان میں ذرا مشکل اور پیچیدہ بنا کر اور کبھی افسانوی پیرایوں میں آسان بنا بنا کر مختلف طریقوں اور بھانت بھانت کے لہجوں میں لوگوں نے پھیلانا شروع کیا۔ زبانوں سے اپنی گویائی کی قوتوں کا مظاہرہ کیا گیا، قلم انشاء اور تحریر کا زور جتنا دکھا سکتا تھا۔ پوری طاقت سے اس نے دکھایا۔ فصاحت کے دریا بہا دیئے گئے، بلاغت کے سمندروں کو انڈیلنے والوں نے انڈیل دیا۔ اتنا ہنگامہ کیا گیا کہ لوگوں کی یہی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کہنا چاہتے ہیں۔ اور میں تو سمجھتا ہوں کہ خود کہنے والوں کی اکثریت کو اب بھی اس کی خبر نہیں کہ وہ غریب کہنا کیا چاہتے ہیں۔

مگر اب کسی کو برا معلوم ہو یا بھلا، میرے نزدیک تو سارے مباحث کا خلاصہ لے دے کر وہی ہے جو میں نے عرض کیا۔ اگرچہ سمجھنے والے سمجھ رہے ہیں یا ان کو یہ سمجھایا جا رہا ہے کہ معاشیات کا یہ مساواتی نظریہ عہد حاضر کی کوئی نئی اپج ہے جس کے پانے میں انسان کا دماغی ارتقاء اب کامیاب ہوا ہے۔ حالانکہ آپ دیکھ رہے ہیں کہ بنیادی حد تک تو پچھلوں نے وہی دہرایا ہے جو پہلوں نے کہا تھا۔ یعنی "آدمی آدمی نہیں ہے" یہی پہلوں نے بھی کہا تھا اور یہی پچھلے بھی کہہ رہے ہیں۔ البتہ اسی مقدمہ کا ایجابی پہلو یعنی پھر آدمی ہے کیا؟ ردوبدل اگر کچھ ہوا ہے تو اسی سوال کے جواب میں ہوا ہے۔ یعنی پہلوں نے تو کہا تھا کہ آدمی فرشتہ ہے، ملک ہے۔ اس کے بعد والوں نے فرشتہ ہونے کی نفی کر کے جانور ہونے کا فتویٰ دیا۔ پھر ان سے اختلاف کرنے والے جو آج اختلاف کر رہے ہیں۔ ان کا اختلاف تو بالکل معمولی ہے۔ یعنی جانور ہونے پر اتفاق کر لینے کے بعد صرف اس میں اختلاف ہے کہ وہ کس قسم کا جانور ہے۔ آیا اس قسم کا جانور ہے جن کے بڑے چھوٹوں کو نگلتے ہیں، یا ان مویشیوں میں اس کو شمار کرنا چاہیے جن کے افراد میں ضروریات حیات کے استعمال کے اعتبار سے تفوق اور برتری نہیں پائی جاتی۔ وہی بات جو گدھوں، گھوڑوں، بکریوں، کووں اور چیلوں کی معاشی زندگی میں پائی جاتی ہے۔ گویا ان دونوں مسلکوں میں وہی فرق ہے جو کسی ظریف نے کہا تھا کہ سرمایہ داری کے نظام کی جس قانون پر بنیاد قائم تھی۔ اگر اس کا نام مچھلی ازم یا بھیڑیا ازم رکھا جائے تو سرمایہ دشمنی کے اساسی قانون کی تعبیر بکری ازم، بھیڑ ازم، زاغ، زم، زغن ازم سے کی جا سکتی ہے۔ خیر میں اس وقت اس کے لئے تیار بھی نہیں ہوں کہ ان مختلف مشارب و مسالک کی تحقیق کروں اور ان میں باہمی جو امتیازات ہیں ان پر بحث کروں بلکہ مقصود صرف اس ذہنیت کا دکھانا تھا جو خصوصیت کے ساتھ بنی نوع انسانی کے متعلق کرۂ زمین کے اس خاص حصہ میں ابتداء سے پائی جاتی ہے۔ غرض اس تذکرہ سے یہی تھی کہ اس کے مقابلے میں قرآن کا جو بنیادی نظریہ ہے وہ ذرا واضح اور روشن شکلوں میں لوگوں کے سامنے آ جائے۔ کیوں کہ بات مقابلہ ہی سے زیادہ سمجھ میں آتی ہے۔ متنبی کا مشہور مصرعہ ہے

وبضدها تتبين الاشياء

آدمی بہرحال آدمی ہے | مطلب یہ ہے کہ کسی حیثیت سے ہو، معاشی حیثیت سے ہو یا معادی نقطۂ نظر سے

بہرحال میں قرآن کا اس پر اور صرف اسی پر اصرار ہے کہ "آدمی بہرحال آدمی ہے" وہ جب دنیا میں پیدا کیا جاتا ہے تو اس وقت بھی وہ انسان اور آدمی ہی بن کر پیدا ہوتا ہے۔ جب تک زمین کے اس کرہ پر جیتا ہے تو آدمی ہی بن کر جیتا ہے حتیٰ کہ مرنے کے بعد بھی دوسری زندگی کو لے کر میدان قیامت میں جب وہ آئے گا تو اس وقت بھی وہ آدمی ہی رہے گا اور جزا و سزا کے فیصلوں کے بعد جنت میں جو جائیں گے، وہ بھی آدمی ہونے کے سوا اور کچھ نہ ہوں گے، اور یہی حال ان کا بھی ہوگا جو (عیاذاً باللہ) مستحق جہنم قرار پائیں گے۔ اسی لئے ایسے تمام خیالات جن میں انسانیت کے متعلق باور کرایا جاتا ہے کہ انسانیت کے سوا وہ کچھ اور ہو جاتی ہے، اسلام نے سب کو مسترد کر دیا ہے۔ مثلاً بعض مذاہب کے متعلق مشہور ہے کہ ان میں فنا فی الاصل کا عقیدہ پایا جاتا ہے یعنی مرنے کے بعد آدمی آدمی نہیں رہتا۔ خدا جو اصل کائنات ہے، وہی وہ ہو جاتا ہے یعنی انسان خدا بن جاتا ہے۔ یہ تو نیکوکاروں کا انجام بتایا جاتا ہے اور بدکاروں کو سمجھایا گیا ہے کہ دوسری زندگی میں بجائے آدمی رہنے کے وہ ہاتھی بن جاتے ہیں، یا گھوڑے یا چوہوں کی شکل اختیار کر لیتے ہیں یا جیسا کہ ابھی ابھی عیسائیوں کے متعلق عرض کیا گیا کہ مرنے کے بعد ان کے یہاں بھی دوسری زندگی میں انسان سے انسانی احساسات و جذبات چھین لئے جاتے ہیں، پھر جو نیک ہیں وہ تو فرشتے اور جو بد ہیں وہ شیطان اور بھوت بن جاتے ہیں۔ میں نے کہا تھا کہ قرآن کی انسانی جنت کے ذکر سے دلوں میں آج کل ایک قسم کی گرانی جو پیدا ہو گئی ہے۔ اس گرانی کی تہہ میں درحقیقت انسان کے متعلق انسان نہ ہونے کا ہی مغالطہ پوشیدہ ہے، بلکہ سچ تو یہ ہے کہ قرآن میں آدم علیہ السلام کی خلافت کے تذکرے کے سلسلے میں جو یہ بیان کیا گیا ہے کہ سجدے کے مطالبے پر الملائکہ نے تو آدم کو سجدہ کیا۔ لیکن شیطان نے انکار کر دیا۔ اور انکار کی توجیہ کرتے ہوئے یہ جو اس نے کہا کہ میں آتش زادہ ہوں۔ اس لئے اس خاک زادہ سے بہتر ہوں۔ میرے نزدیک یہ قصہ جن عمیق اسرار و حقائق پر مشتمل ہے ان میں ایک اشارہ اسی مغالطہ کے ازالہ کی طرف بھی معلوم ہوتا ہے۔ یعنی شیطانی بصیرت رکھنے والوں کے سامنے سے ہو سکتا ہے کہ آدمی کی حقیقت اسی طرح کہیں اوجھل نہ ہو جائے۔ جیسے ابلیس آدم کو نہ پہچان سکا۔ اور ظاہری حالت سے دھوکہ کھا کر خاک زادہ قرار دیتے ہوئے، آدم کا جو صحیح مقام تھا اس سے ان کو گرا دینا چاہا، دوسرے الفاظ میں گویا ہم کہہ سکتے ہیں کہ انسانیت کے متعلق مختلف اقوام کو جو مغالطے لگنے والے تھے، ابتدا ہی میں اس طریقہ سے اس مغالطہ کے ازالہ کا سامان کر دیا گیا تھا۔ آخر یہی بتائیے کہ جن لوگوں نے بجائے آدم زادہ ہونے کے یہ وسوسہ دنیا میں پھیلایا ہے کہ آدمی حیوان زادہ ہے ان کے اس قول میں اور شیطان کے اس دعوے میں کہ آدم کیا ہے، صرف خاک زادہ ہے۔ اس لحاظ سے کہ انسان کو انسانیت کے صحیح مقام اور [illegible] قدرتی مرتبہ سے دونوں نے گرا دیا۔ میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ دونوں نظریات (یعنی ڈارونی و ابلیسی) میں کیا فرق ہے[1] ۔ بہرحال انسان

---

[1] میرا ہی [illegible] [illegible] ابلیس [illegible] [illegible]
[illegible]

انسان ہی ہے۔ غیر انسان نہیں ہے۔ معاشی مسائل ہوں یا معادی عقائد، اسلام نے سب کی بنیاد منطق کے اسی بدیہی مقدمہ پر رکھی ہے۔ اور میری سمجھ میں نہیں آتا کہ بنیاد اگر اس پر نہ رکھی جاتی تو آخر کیا کیا جاتا۔ شکر کے اوصاف، اس کے حالات، آثار و خواص پر جو بحث کرنا چاہے گا، ظاہر ہے کہ وہ یہی سوچ کر تو بحث کرے گا کہ شکر شکر ہے۔ نہ دیوانہ ہی ہوگا جو کسی صورت میں شکر کو بجائے شکر کے خواہ مخواہ یہ مان لے کہ وہ نمک ہے۔ اور جو ایسا کرے گا۔ اگر اس کی بیان کی ہوئی باتیں شکر پر منطبق نہ ہوں تو اس میں بحث کرنے والوں کا قصور ہوگا۔ یا بیچاری شکر مستحق ملامت ہوگی کہ اپنے اوپر نمک کے حالات، کیفیات، آثار و خواص کے بیان کو کیوں منطبق ہونے نہیں دیتی۔ جیسا کہ بارہا عرض کر چکا ہوں، اپنے اس مقالے کو میں نے معاشیات کے صرف اسلامی مسائل و نظریات کی حد تک قصداً چونکہ محدود کر رکھا ہے۔ اس لئے ان تفصیلات میں جانے کا یہ سرے سے قطعاً موقع نہیں ہے کہ انسان کے معاشی مسائل کی تدوین و ترتیب کا کام جن لوگوں نے یہ فرض کر کے انجام دیا ہے کہ وہ انسان نہیں، بلکہ جنگل کا بھیڑیا یا دریا کی مچھلی ہے۔ یا جن حضرات نے بجائے بھیڑیئے یا مچھلی کے انسان کی انسانیت کا انکار کر کے چاہا ہے کہ بکریوں اور مینڈھوں، بیلوں اور گھوڑوں، کتوں اور کبوتروں وغیرہ کے معاشی قوانین کو انسان کے معاشی قوانین پر منطبق کریں عقل کے ان ناخن تراشوں کو اپنی اس عجیب و غریب کوشش میں کن بوالعجبیوں اور ظرافتوں سے دوچار ہونا پڑا، بجائے سلجھانے کے اپنی خود ساختہ گتھیوں میں یہ کس طرح الجھ گئے کیونکہ اس کے لئے تو ایک مستقل کتاب کی ضرورت ہے، بلکہ اپنے بیان کو صرف اسلامی مسائل تک محدود رکھتے ہوئے اب صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ

"آدمی آدمی ہی ہے اور کچھ نہیں ہے"

اسی اساسی بنیاد کو پیش نظر رکھ کر قرآن میں جو چند ایسے کلیات پائے جاتے ہیں جنہیں مسلمانوں کو خدا نے اس لئے عطا فرمایا ہے کہ اپنی معاشی دشواریوں کو ان کی رہنمائی میں حل کریں۔ بس اسی کو پیش کر دوں گا لیکن ان کلیات سے پہلے یہ سمجھ لینا چاہیے کہ "الانسان" یا "البشر" یا "بنی آدم" "الناس" وغیرہ الفاظ سے جس جیتی جاگتی ہستی کی تعبیر قرآن کرتا ہے۔ قرآن کے نظر میں اس کے ایسے مخصوص امتیازی صفات و خصوصیات کیا ہیں جن کا اس کی معاشی زندگی سے براہ راست تعلق ہے۔ اور جن سے اس کی زندگی کے معاشی قوانین متاثر ہوتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہئے کہ قرآن کے معاشی انسان کے نمایاں خط و خال کیا ہیں، تمہیدی طور پر ذہن نشین کرنے کی یہ تو پہلی بات ہے۔ اسی کے ساتھ دوسری بات جس کا اس موقعہ پر جاننا ضروری ہے وہ یہ ہے کہ اپنی معاشی زندگی میں (یعنی از شکم مادر تا بہ شکم قبر) جن قدرتی پیداواروں سے آدمی مستفید ہوتا ہے۔ اور جس سے استفادہ کا یہاں اسے موقعہ عطا کیا گیا ہے۔ ان کی نوعیت اور خصوصیت قرآن نے کیا بیان کی ہے۔ آئندہ جو کچھ کہنا چاہتا ہوں، شاید میں انہیں کہہ بھی نہیں سکتا جب تک کہ ان دو باتوں کو پہلے طے نہ کر لوں۔ بلکہ سچ ہے کہ قرآن کے پیش کردہ معاشی نظام کی بنیاد ان ہی دو باتوں پر مبنی ہے۔

انسانی فطرت کی خصوصیات

بات یہ ہے کہ انسانی فطرت یوں تو قدرت کے خزانہ کا ایک لامحدود گنجینہ ہے اور قرآن نے مختلف [illegible]
[illegible]

مسائل سے تعلق ہے۔ اس سلسلہ میں ہمارے سامنے سب سے پہلے جو چیز آتی ہے وہ خُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِیْفًا[1] کی مشہور آیت کا مفاد ہے۔ مطلب یہ ہے کہ آدمی ہو یا آدمی کے سوا دوسری جان رکھنے والی ہستیاں، زندگی کی مدت جن کی جتنی بھی ہو، اس مدت کو گذارنے کے لئے جن ضرورتوں کی وہ محتاج ہوتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان کا حصول زیادہ تر جسمانی توانائیوں کے ساتھ وابستہ ہے۔ اب مقابلہ کر کے دیکھئے کہ جسمانی توانائیوں میں اس غریب انسان کا اسی جیسی زندگی رکھنے والی دوسری ہستیوں کے مقابلہ میں کیا حال ہے۔ مشاہدہ کی بات ہے۔ بے نوائی اور بے نوائی کے جس حال میں آدمی اس دنیا میں قدم رکھتا ہے۔ مشکل ہی سے دوسرے زندہ وجودوں میں اس کی نظیر مل سکتی ہے۔ آخر جو اون، بال، کھر، پر، بازو، سینگ، چنگل اور از قبیل بیسیوں قدرتی ساز وسامان کو اپنے ساتھ لے کر پیدا ہوتے ہیں۔ گویا ان میں ہر ایک اپنی چادر، اپنا اوڑھنا بچھونا، اپنا لباس، اپنی کھڑاؤں کہئے یا بوٹ، اپنی سواری وغیرہ وغیرہ لے کر ماں کے پیٹ سے پیدا ہوتا ہے۔ بھلا اس کا مقابلہ وہ غریب کیا کر سکتا ہے۔ جو ایک زندہ لوتھڑے کے سوا ابتدا میں گویا کچھ نہیں ہوتا اور ننگا، ہر قسم کے سامانوں سے خالی جسد بھی جو اس کو ملتا ہے سوا اتنا نازک وناتواں، حساس، اثر پذیر جسد ہوتا ہے کہ اپنے طبعی مسکن (کرۂ ہوا) کے موسموں کی معمولی شدت کا مقابلہ بھی بآسانی نہیں کر سکتا۔ گرمی ہو یا سردی۔ ان موسمی تغیرات کی ہلکی سی شدت آدمی کو بوکھلا دینے کے لئے کافی ہوتی ہے۔ حالانکہ زمین کے کرہ پر اسی انسان کے ساتھ کتنے رہنے والے آئے، رہے اور آباد ہوئے۔ ان کا مسکن بھی وہی ہے جو انسان کا مسکن ہے، لیکن موسمی تکلیفوں سے بچنے کے لئے ان کو ان دردسریوں میں مبتلا ہونے کی قطعاً ضرورت نہیں ہوتی۔ جن میں غریب آدمی مبتلا رہتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ عموماً جتنی بھی جان رکھنے والی ہستیاں ہیں، پیدا ہونے کے ساتھ ہی ان میں بھی وہ ساری قوتیں اچانک ظہور پذیر نہیں ہوتیں جن سے آئندہ اپنی زندگی کی ضرورتوں کی فراہمی میں وہ کام لیتی ہیں، بلکہ ہر ایک کو کچھ نہ کچھ دن اس کیلئے گذارنے ہی پڑتے ہیں۔ اسی لئے ابتدا میں قدرت کی طرف سے ان کے ماں باپ میں اس کا جذبہ پیدا کر دیا جاتا ہے کہ اپنے اپنے طریقہ سے اپنے نوزائیدہ بچوں کی پرورش ونگرانی کریں۔ مگر اس لحاظ سے بھی جب آدم زادوں کا مقابلہ دوسرے حیوان زادوں سے کیا جاتا ہے تو آسمان وزمین کا فرق نظر آتا ہے۔ ایک مرغی کے ہی بچوں کو دیکھئے، کوئی شبہ نہیں کہ مہینے دو مہینے تک ان کو اپنی ماں کی نگرانی کی حاجت ضرور ہوتی ہے۔ لیکن اس نگرانی میں جو آدم زاد کو اپنی ماں کے اعتبار سے ہوتی ہے۔ اور اس نگرانی میں جو مرغی کے بچوں کو اپنی ماں کی ہوتی ہے کوئی نسبت بھی ہے۔ انڈا کھٹکنے کے ساتھ ہی مرغی کے بچے دانہ چگنے لگتے ہیں۔ ان کی ماں کا کام صرف تلاش کرنا اور بلا کر ان کی خوراک کی طرف متوجہ کرنا ہوتا ہے۔ اس کے بعد دیکھئے کہ کتنے سلیقے سے دو دن کے بچے ان دانوں کو چگتے ہیں۔ مرغی کے ان سعید وباتمیز بچوں کو خیال تو کیجئے، گوشت کے اس لوتھڑے سے کیا تعلق جس کا نام آدمی کا بچہ ہے اور فرق اسی نقطہ پر ختم کب ہوتا ہے؟ آدمی کے سوا جتنے بھی ہیں، جتنی کم مدت میں ان کا پیدائشی ضعف قوت کے انتہائی مدارج تک پہنچ جاتا ہے۔ اس مدت کو اس طویل زمانہ سے کیا سروکار جو آدمی کے بچوں کو

---

[1] یعنی پیدا کیا گیا ہے آدمی کمزور بنا کر ۱۲

اسی قوت کے حاصل کرنے میں صرف کرنی پڑتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ جن مدارج کو دوسرے دنوں میں طے کرتے ہیں آدم زاد مہینوں میں ہی نہیں، بلکہ برسوں میں طے کرتا ہے۔ ماں باپ کی اعانت و امداد سے آزاد ہو کر خود اپنی معاش کے متکفل ہونے کے لئے آدمی کو تمام حالات میں کم از کم پندرہ سولہ سال کی مدت تو چاہئے لیکن اس سولہ سال کی مدت میں دیکھا جاتا ہے کہ انسان کے سوا تقریباً جتنے بھی ہیں خود وہی نہیں بلکہ ان کی چند پشتیں ضعف کے مدارج کو طے کر کے قوت کے اسی مقام پر ہوتی ہیں۔ جہاں پانچ پشتیں گرتے پڑتے بہ ہزار خرابی آدمی کا بچہ پہنچتا ہے۔ پھر جب اس پر غور کیا جائے کہ پیدائشی ضعف کے زوال کے بعد دوسروں میں معاشی ضرورتوں کے حصول کی جو قوتیں بروئے کار آتی ہیں عموماً آخر عمر تک ان کا ساتھ دیتی ہیں۔ ماں باپ کی نگرانی سے الگ ہونے کے بعد یہی وجہ ہے کہ زندگی گذارنے کے لئے ان میں سے کسی کو کسی دوسرے کی قطعاً حاجت نہیں ہوتی ہر ایک اپنی خود مکتفی زندگی گذارتا ہے۔ اپنی قوت بازو سے آخر وقت تک خود کما کما کر اپنی ضرورتیں پوری کرتا ہے۔ لیکن بنی آدم کا کیا حال ہے۔ ایک تو خدا خدا کر کے ان کے ضعف کا ازالہ ہی برسوں کے بعد ہوتا ہے۔ اس کے بعد حصول معاش کی جو قوتیں انسان کے دست و بازو میں نمایاں ہوتی ہیں۔ زیادہ زمانہ گذرنے نہیں پاتا کہ بتدریج دبے پاؤں پھر وہی پیدائشی ضعف مختلف راستوں سے، مختلف بھیس میں سر نکالنا شروع کرتا ہے اور بالآخر ایک ایسے نقطہ تک پہنچ کر رہتا ہے کہ تقریباً وہی حال جس حال میں آدمی پیدا ہوا تھا، دیکھا جاتا ہے کہ پھر اسی کی طرف پلٹ گیا۔ جیسے شروع میں نگرانوں کا، ماں باپ کی شکل میں محتاج تھا۔ آخر میں وہی آدمی ان ہی نگرانوں کا بیٹے اور بیٹیوں، پوتے اور پوتیوں کا دست نگر نظر آتا ہے۔ پیدائشی ضعف کی طرف جیسے قرآن میں خلق الانسان ضعیفا کے الفاظ میں اشارہ کیا گیا ہے۔ اسی طرح ظہور قوت کے بعد دوسرا ضعف جو اس پر طاری ہوتا ہے مندرجہ ذیل آیۃ کریمہ

خلقکم من ضعف ثم من بعد	پیدا کیا خدا نے تمہیں ضعف سے، پھر ضعف
ضعف قوۃ ثم من بعد قوۃ	کے بعد قوت (نمایاں ہوتی ہے) اور قوت کے بعد
ضعفا و شیبہ۔	پھر ضعف دوبارہ اور سری (آدمی پر مسلط ہو جاتی ہے)۔

میں ذکر فرمانے کے بعد قوت کے بعد والے طاری ہونے والے ضعف کے ان آثار کا تذکرہ جو آدمی کے ظاہر جسد میں نمایاں ہوتے ہیں، بایں الفاظ فرمایا گیا کہ

ومن نعمرہ ننکسہ فی الخلق	اور جسے ہم معمر کرتے ہیں۔ پلٹاتے ہیں ہم
	سے اس کی خلقت میں۔

یہ تو باہر میں ہوتا ہے کہ لمبے لمبے ہاتھ پھولی پھولی گردنیں، مچھلیاں نکلے ہوئے بازو، قوت وزور سے بھری ہوئی پنڈلیاں، پٹھوں سے جکڑی ہوئی ٹانگیں بتدریج گھٹتے گھٹاتے، گھٹتے گھلاتے ایک لپٹی ہوئی گٹھڑی کی شکل میں بدل جاتی ہیں۔ گویا وہی گوشت کا ایک زندہ لوتھڑا جیسے آدمی شروع میں معلوم ہوتا ہے۔ آخر میں بھی وہی کیفیت بلکہ شاید اس سے بھی بدتر ہو جاتی ہے۔ اس لوتھڑے پر جو ابتداء میں پیدا ہوتا ہے۔ لوگوں کو پیار آتا ہے اور اس جھری پڑے ہوئے کانپنے والے اور تھرتھرانے والے مضغۂ گوشت کے دیکھنے سے تو نگاہوں کو دکھ پہنچتا ہے

طبیعت بگڑنے لگتی ہے۔ لساا وقات دیکھنے والوں میں گھن پیدا ہوتی ہے۔ تنکیس اور پلٹا دکی یہ کیفیت تو بار خرج میں طاری ہوتی ہے، اور اندر ہیں جو انقلاب برپا ہوتا ہے، باطنی قوتوں کی ساری آبادیاں جس طرح اجڑ کر برباد ہوتی ہیں قرآن ہی نے

ثم نردہ الی ارذل العمر لکیلا	پھر پلٹ دیتے ہیں ہم اس کو بدترین سن کی
یعلم من بعد علم شیئا۔	طرف ایہ اس لئے ہم کرتے ہیں تاکہ نہ جانے
	جاننے کے بعد کسی چیز کو۔

کے الفاظ میں اس واقعہ کا اظہار کیا ہے۔ دراصل اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ شخصی حیثیت سے انسانوں کے کم ہی کام ایسے ہوتے ہیں۔ جسے وہ اپنے سامنے مکمل کر کے دنیا سے جاتا ہو۔ عام حال اس سلسلے میں وہی ہے کہ ع کارِ دنیا کسے تمام نہ کرد۔ اور اجتماعی حیثیت سے زمین کے اس کرہ پر آدم کی نسل زندگی کے جن جن شعبوں کے متعلق سہولتوں کے پیدا کرلنے کی دھن میں مشغول ہے اس میں کوئی شبہ نہیں کہ رفتار جتنی بھی سست ہو لیکن عموماً پچھلی نسلوں میں دیکھا جاتا ہے کہ اگلی نسلوں کے حساب سے بات کچھ نہ کچھ آگے بڑھتی چلی جا رہی ہے۔ لیکن جس رفتار سے انسان کی اجتماعی کوششیں اس راہ میں آگے بڑھ رہی ہیں۔ اس کا اندازہ صرف اسی سے ہو سکتا ہے کہ ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہونے کے لئے تاریخ کے نامعلوم زمانے سے آدمی جدوجہد میں مصروف ہے، سمجھا جاتا ہے کہ اس راہ میں اس نے بہت بڑا فاصلہ طے کر لیا ہے۔ خصوصاً جب سے ہوائی جہازوں کے ذریعہ سے آدمی قابو یافتہ ہو گیا ہے کہ پہاڑوں، دریاؤں، ندیوں، نالوں اور نشیب و فراز کے جھگڑوں سے گویا آزادی مل گئی، پلوں، سڑکوں، بندوں کی جھنجھٹوں کی ضرورت مسافت کے طے کرنے میں باقی نہیں رہی بلاشبہ یہ ہوا ہے لیکن بات مقابلہ سے سمجھ میں آتی ہے۔ مقابلہ کر کے جب ہم دیکھتے ہیں تو یہ سب کچھ ہو جانے کے باوجود بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان چڑیوں، طوطوں، مینوں، گِدھوں، چیلوں اور کوؤں کے برابر بھی تو نسل انسانی زندگی اس انتہائی ترقی یافتہ شعبہ میں نہیں پہنچی ہے۔ اسی نقل مکانی کے مسئلہ میں یا بالفاظ دیگر سفر کے ذرائع میں وہ نہ لوہے کے محتاج ہیں نہ لکڑیوں کے نہ پٹرول کے اور نہ ان دوسری گیسوں کے جن کے بل بوتے پر انسان نے ہوائی راستوں پر اقتدار حاصل کیا ہے، اب بھی ان اجزا میں سے کوئی چیز اگر غائب ہو جائے جو ہوائی جہازوں کو اڑانے کے لئے ضروری ہیں تو آدمی بازو ڈال دے گا۔ مگر اسی کے مقابلے میں ایک معمولی مکھی، لنگڑا مچھر، جب اس کا جی چاہتا ہے، صرف پروں کے کھولنے کی دیر ہے۔ یہ گیا، وہ گیا، فضائے آسمانی میں گم ہو گیا۔ اُف! خلق الانسان ضعیفا کی یہ کیسی کھلی تفسیر ہے۔ مچھروں اور مکھیوں کے مقابلے میں بھی جو معذور ہو، اور ان تعلیوں اور ترقیوں کے دعووں کے بعد بھی معذور ہو، اس کی ناتوانیوں اور زبونیوں کا کوئی ٹھکانہ ہے۔ اور اس پر بھی حال یہ ہے کہ جو کچھ بھی اس سے بن آیا وہ تنہا نہیں بلکہ ایک ایک کام کے لئے ہزاروں اور لاکھوں ہاتھوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ بقول شخصے کہ آدمی کے منہ میں روٹی کا ایک لقمہ بھی جو جاتا ہے تو بیسیوں ہاتھوں سے گذرنے کے بعد جاتا ہے، گیہوں کے بونے والے، جوتنے والے، پانی دینے والے، کاٹنے والے، بھوسی صاف کرنے والے، تولنے والے، بیچنے والے، بازار میں لانے والے، دکان دار

رکھنے والے، خریدنے والے، پیسنے والے، آٹا گوندھ کر لانے والے، پکنے کے برتن کو بنانے والے، ایندھن کی لکڑیوں کو لانے والے، دسترخوان پر بیٹھنے والے، جب ان سب ہاتھوں کے کام ختم ہو جاتے ہیں، تب لقمہ توڑ کر اٹھانے والے کا ہاتھ اس لقمہ کو منہ تک پہنچاتا ہے۔ اور یہ تو ایک سلسلہ کی کڑیاں ہیں، ہر سلسلہ کے ساتھ جو دوسرے سلسلے ہیں، مثلاً بن کی لکڑیوں کے کاٹنے والے، بن میں لوہے کو ٹھونکنے والے، لوہے کو کان سے کھود کر بازار میں لانے والے، اگر یوں سوچا جائے تو روٹی کے اس ایک لقمے میں کام کرنے والے ہاتھوں کی تعداد خدا ہی جانتا ہے۔ کہ کہاں تک پہنچ جاتی ہے۔ مگر اسی بے نوا بے سروسامان غریب انسان کے مقابلہ میں دیکھئے۔ ان کو دیکھئے جو اسی قسم کی جان رکھتے ہیں جیسی یہ رکھتا ہے۔ انھیں بھی چوبیس گھنٹوں میں تحلیل یافتہ اجزا کی جگہ بدن میں بدل پہنچانے یا تلافی مافات کی مسلسل ضرورت رہتی ہے، بلکہ ان میں کتنے ہیں جو دن بھر میں سیروں نہیں منوں خوراک کے محتاج ہیں۔ آخر ان ہی میں ہاتھی بھی تو ہے، وھیل مچھلی بھی، اژدہے، اور گینڈے بھی، اور کیا کیا بتایا جائے کیا کیا ہیں۔ لیکن ان میں جو بھی ہیں، یہی ساری ضرورتوں کو صرف اپنی قوت بازو سے مہیا کرتے ہیں۔ حاتم طائیوں کی منت سے ہر ایک کی گردن آزاد ہے۔ ان میں بعضوں کو اس مدت کی دگنی اور چوگنی مدت اسی زمین میں گذارنی پڑتی ہے، جتنی انسان گذارتا ہے۔ بلکہ اگر کرگس (گدھ) وغیرہ کی طول عمری کا افسانہ صرف افسانہ نہیں ہے، تو ان کی معاشی زندگی کی مدت کی طوالت کا مقابلہ انسانی افراد کیا، ان کی نسلیں اور پشتیں بھی تو نہیں کر سکتیں مگر باوجود اس کے ان میں ہر ایک کی زندگی خودمکتفی زندگی ہے۔ وہی خودمکتفی زندگی جس کے لئے آدم کی اولاد تڑپ رہی ہے، ہزاروں برس سے تڑپ رہی ہے۔ انفرادی طور پر جب اس کا حصول ناممکن نظر آتا ہے تو کرۂ زمین کے مختلف حصوں میں وہمی اور فرضی حدود پیدا کر کے ان فرضی حدود کے باشندوں کو آمادہ کیا جاتا ہے کہ ہر ایک سے ممکن نہ ہو تو کئی ایک جو ان فرضی حدود میں رہتے ہیں، وہ تو اپنی زندگی کو خودمکتفی زندگی بنالیں، یعنی ان فرضی حدود کے باہر رہنے والوں کی امداد سے تو مستغنی ہو جائیں حیوانوں کے ہر ہر فرد کو خودمکتفیت کا جو مقام عالی حاصل ہے۔ اگر وہاں تک رسائی ممکن نہ ہو تو آدمی کی ٹولیوں کو تو خودمکتفی ہونے میں کامیاب بنالیا جائے لیکن جس مقصد میں اجتماعی قوت و طاقت سے کام لینے کے باوجود آدمی کو کامیابی نہیں حاصل ہو رہی ہے، کیسی عجیب بات ہے کہ اس کے سوا ان جیتے جاگتوں میں جتنے ہیں یہ سب ہی کامیاب ہیں، اور کیوں کامیاب نہ ہوں۔ آدم کے بچوں کا ضعف اور ان کی ناتوانی خواہ سابق ہو یا لاحق، یعنی پیدائش کے بعد والی کمزوری ہو یا ظہور قوت کے بعد جو ضعف لاحق ہوتا ہے وہ ہو، کہ وہ تو خیر ضعف ہی ہے۔ لیکن زندگی کا جو عہد آدمیوں میں قوت اور زور کا عہد سمجھا جاتا ہے ایک تو یوں ہی دو ضعفوں میں گھرا ہوا ہے۔ کہتے ہیں کہ دو نیستیوں کے بیچ والی ہستی بھی ایک قسم کی نیستی ہی ہوتی ہے، عربی کا مشہور مقولہ ہے

الوجود بین العدمین عدم — دو نیستیوں کے درمیان والی ہستی بھی نیستی ہی ہوتی ہے۔

لیکن اسے صوفیانہ غلو بھی اگر قرار دیا جائے، جب بھی ہم دیکھتے ہیں کہ قوت و طاقت، توانائی

اور زور کے اس زمانے میں بھی آدمی میں قوت کے جو آثار نمایاں ہوتے ہیں، خم ٹھوکنے والے، مونچھوں پر تاؤ دینے والے اپنے متعلق اپنے اپنے گھروں میں بیٹھ کر جتنی تعلیوں اور لن ترانیوں سے بھی کام لیتے ہوں مگر اس کا راز بھی ہلکے سے مقابلہ سے کھل جاتا ہے۔ کچھ نہیں صرف غریب چیونٹیوں کو بھی لاکر مقابلہ کے اس میدان میں کھڑا کر دیکھئے، اور اندازہ لگانے والوں سے پوچھئے کہ قوت و طاقت کے اس عہد میں زور و قوت کا جو حصہ آدمی میں پایا جاتا ہے، اس کو ان غریب چیونٹیوں کی قوت سے کیا نسبت ہے۔ جواب میں ارباب تجربہ و مشاہدہ کا یہ بیان سنئے۔

"چیونٹی اپنے وزن سے تیرہ سوگنا بوجھ کھینچ سکتی ہے"۔[۱]

کیا معنی اگر چیونٹی کے مختصر قد میں قدرت جتنی قوت بھرتی ہے۔ اگر آدمی میں بھی قوت کا یہی پیمانہ ہوتا تو لکھتے ہیں کہ "اس قوت سے سات ہزار سات سو من وزنی چیز پکڑ کر وہ اٹھا سکتا تھا۔" یعنی کچھ نہیں صرف ایک چیونٹی کو قوت کا جو حصہ ملا ہے، اگر آدمی کو ملتا تو سو ایکڑ کی پیداوار کو (ایک ایک آدمی) ایک ہی دہ میں کھیت سے گھر پہنچا سکتا تھا ایک شہر سے دوسرے شہر تک جس مال کو منتقل کرنے کے لئے پوری ایک مال گاڑی کی ضرورت ہوتی ہے ایک سوداگر خود ہی تنہا اسے کھینچ کر لا سکتا تھا، اور یہ اس زور بازو کا حال ہے۔ جسے اپنے. نذر محسوس کر کرکے یہ آدم زاد کیا کیا دعوی نہیں کرتا۔ لیکن مقابلہ کے بعد پتہ چلتا ہے کہ آدم کے بچوں کو اتنا بھی تو نہیں ملا ہے جس کی غریب "مور ضعیف" حصہ دار ہے۔ ایک چیونٹی ہی کیا لکھنے والوں نے تو اسی سلسلہ میں یہاں تک لکھا ہے کہ

"پتنگوں اور پروانوں میں اچھلنے اور کودنے کی جتنی قوت ہوتی ہے۔ اگر آدمی میں بھی قوت اسی نوعیت کی ہوتی تو تین سو فٹ بلندی تک ایک چھلانگ میں پہنچ سکتا تھا۔"

بہرحال کتابوں میں پڑھئے، زندہ چیزوں کی ایک بڑی تعداد میں قوت و طاقت کا وہی معیار آپ کو نظر آئے گا، جس کے سامنے غریب انسان کی اٹھی ہوئی گردن انتہائی شرمندگی سے جھک جاتی ہے اور خدا کی بات خلق الانسان ضعیفا کے ماننے پر اپنے آپ کو وہ مجبور پاتا ہے۔

اور یہی تھی بنی نوع انسان کی وہ پہلی خصوصیت جس کا قرآن کے حوالے سے میں یہاں ذکر کرنا چاہتا تھا، میرے نزدیک انسان کے جس معاشی نظام کو اسلام نے پیش کیا ہے اس میں منجملہ دوسری چیزوں کے فطرت انسانی کی اس خصوصیت کو بھی بہت زیادہ دخل ہے۔

دوسری خصوصیت | (۲) دوسری خصوصیت اسی سلسلہ کی وہ ہے جس کی طرف قرآن ہی میں بایں الفاظ تنبیہ کی گئی ہے۔

انظر کیف فضلنا بعضھم علی بعض (بنی اسرائیل)	دیکھ تو! کس طرح ان میں بعض کو بعض پر ہم نے برتری عطا کی ہے۔

---

[۱] بعضوں کا بیان ہے کہ چیونٹی اپنے دانت سے اس چیز کو کھینچ لیتی ہے جو اس کے وزن سے تیس ہزار گنا زیادہ وزنی ہو یہ معلومات رسالہ سائنس اردو میں شائع ہوئے ہیں۔ دیکھئے اگست ۱۹۳۲ء کی اشاعت ۱۲

اسی حقیقت کی دوسری قرآنی تعبیریں

ورفع بعضکم فوق بعض درجات (الانعام)	اور برتری بخشی خدا نے تم میں بعض کو بعض پر۔

یا

رفعنا بعضکم فوق بعض درجت (زخرف)	اور ہم ہی نے اونچی کر دیا ہے تم میں بعض کو بعض پر مدارج کے لحاظ سے۔

کے الفاظ میں آپ کو ملیں گی۔

مطلب یہ ہے کہ یوں تو تماشہ گاہ عالم کی بنیاد ہی صفات و کمالات کے تفاوت پر مبنی ہے جمادات میں وہ صفات نہیں پائے جاتے جن کا نباتات کو مالک بنایا گیا ہے۔ نباتات ان صفات سے مفلس ہیں جن سے حیوانات سرفراز ہیں۔ حیوانوں کو ان کمالات سے بہرہ نہیں ملا ہے۔ جن پر انسان کی انسانیت کی بنیاد قائم ہے۔ اور صفات و کمالات کے تفاوت کا یہ نقشہ اتنا دور رس ہے کہ کہنے والوں نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے کہ گلاب کی دو پنکھڑیاں بھی باہم ہر لحاظ سے یکساں نہیں ہو سکتیں، تجربے اور مشاہدے نے ثابت کیا ہے کہ بایں ہمہ یک رنگی ایک پنکھڑی کچھ نہ کچھ خصوصیت اپنے اندر ایسی ضرور رکھتی ہے۔ جو دوسری پنکھڑی میں نہیں پائی جاتی۔ "تجلیات میں تکرار نہیں ہے"۔ تفاوت وصفات ہی کے مسئلہ کی یہ صوفیانہ تعبیر ہے۔ غالب مرحوم نے ع لوحِ جہاں پہ حرفِ مکرر نہیں ہوں میں، کے مصرعہ میں اسی واقعہ کو دہرایا ہے۔ بلکہ اس واقعہ کی واقعیت پر اتنا بھروسہ کیا گیا ہے کہ اسی پر اعتماد کر کے حکومت والوں نے ہر شخص کے ابہام (ہاتھ کے انگوٹھے) کے نشان کو دستخط کے قائم مقام قرار دیا ہے۔ سمجھا جاتا ہے کہ ہر شخص کے انگوٹھے کی لکیریں دوسرے شخص کے انگوٹھے کی لکیروں سے کچھ نہ کچھ امتیاز ضرور رکھتی ہیں، اور واقعہ بھی یہی ہے کہ صفات کے تفاوت کا اگر یہ تماشا دنیا میں نہ پیش ہوتا تو ان گنت بے شمار طرح طرح کی بوقلموں ہستیوں سے آج عالم جو بھرا ہوا نظر آ رہا ہے۔ کثرتوں کا یہ مجموعہ ظاہر ہے کہ صرف ایک واحد شخصیت کی شکل اختیار کر لیتا۔ ایک چیز کا دوسری چیز سے امتیاز کی صورت ہی اس کے سوا کیا تھی کہ صفات و کمالات میں باہم ایک کو دوسرے سے جدا کر دیا جائے۔ لیکن بایں ہمہ اختلافات و امتیازات یہ بھی ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ موجودات کی مختلف قسموں میں جو صف بندی کی گئی ہے۔ کسی سلسلہ کو نباتات، کسی کو جمادات، کسی کو حیوانات، کسی کو انسان جو ہم کہتے ہیں۔ تو اس کی وجہ یہی ہے کہ اس اختلاف کے باوجود کچھ چیزوں کے اندر ایتلاف و مجانست و مشابہت بھی یقیناً پائی جاتی ہے، اور اتنی زیادہ مجانست و مشابہت کہ اسی بنیاد پر ان کو کسی نہ کسی ایک نوع یا صنف کے نیچے ہم داخل کرتے ہیں۔ ایک ایک جنس یا ایک ایک نوع کے افراد میں باوجود صفاتی امتیازات کے وحدت کے مشترک جہات بلا شبہ اتنی کثرت سے پائے جاتے ہیں کہ بجائے دو کے ان کو ایک جنس یا ایک نوع کے نیچے اگر مندرج کیا گیا ہے تو قطعاً یہ غلط اندراج یا غلط صف بندی نہیں ہے۔ اسی بنیاد پر ہم گھوڑوں گدھوں، بیلوں کے افراد کو اگرچہ نوعیت کے اعتبار سے ایک ہی سمجھتے ہیں اور اسی نقطۂ نظر سے ان تمام

انواع میں ایک نوع کے نیچے افرادِ انسانی بھی مندرج ہیں۔ مگر عجیب بات یہ ہے کہ انسان کے سوا حیوانات کی جتنی دوسری نوعیں ہیں، مثلاً گھوڑا، ہاتھی، بیل وغیرہ، گو ان کے افراد میں بھی صفات و کمالات کا تفاوت ضرور ہوتا ہے۔ لیکن ان میں سے اگر ہر نوع کے تمام افراد نہیں تو ایک نوع کے جو مختلف اصناف ہیں مثلاً بکری ن[illegible] کی ایک ایک صنف کے افراد پر اگر غور کیجئے تو باوجود صفاتی تفاوت کے اس صنف خاص کے افراد میں اتنی یکجہتی پائی جاتی ہے کہ جو کمالات ایک فرد میں پائے جاتے ہیں۔ وہی کمالات اس صنف کے قریب قریب دوسرے فرد میں بھی آپ پائیں گے۔ مثلاً مرغیوں کی سینکڑوں نسلیں ہیں۔ ہر نسل چند خاص خصوصیتوں کی حامل ہوتی ہے۔ مشاہدہ کی بات ہے کہ ان نسلی خصوصیتوں کے لحاظ سے اس نسل کے افراد میں بھی گو کچھ نہ کچھ تفاوت ضرور ہوتا ہے۔ لیکن اتنا کم کہ اس کا ہونا، نہ ہونا، دونوں گویا کچھ برابر ہی برابر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان جانوروں کی ہر نسل کے افراد کی معاشی ضرورتیں تقریباً یکساں ہوتی ہیں۔ کھانے میں پینے میں، رہنے سہنے کی عادتوں میں۔ سب کی معاشی سطح قریب قریب برابر برابر ہی سی ہوتی ہے۔ لیکن اسی کے مقابلے میں آدمی اور اس نوع کے افراد پر غور کیجئے۔ جس کا نام انسان ہے اس کی بھی مختلف قسمیں ہیں اور مختلف نسلوں میں آدمی بھی بٹا ہوا ہے۔ لیکن حال یہ ہے کہ دو نسلوں یا دو قسموں کو تو جانے دیجئے، ایک ہی ماں باپ کے دو بچے ہوتے ہیں۔ لیکن دونوں میں پیدائشی صفات و کمالات کے اعتبار سے تفاوت اور اتنا تفاوت ہوتا ہے کہ کبھی کبھی یہ دیکھا گیا ہے اور روز دیکھا جاتا ہے کہ ان میں سے ایک کو اگر انسان کہا جا سکتا ہے تو دوسرے پر شاید حیوان کے لفظ کا اطلاق بھی مشکل ہی سے صحیح ہو سکتا ہے بظاہر دونوں ہی پر انسانوں ہی کی کھال چڑھی رہتی ہے۔ دونوں پر انسانی ہی چہرے مڑھے ہوتے ہیں۔ لیکن ذہنی، دماغی، جسمانی، اندرونی و بیرونی، ظاہری و باطنی کمالات و صفات کے اعتبار سے آئے دن دیکھا جاتا ہے کہ ایک بھائی اگر آسمان پر ہے تو دوسرا ٹھیک اس کے بالمقابل تحت الثریٰ یا پاتال میں ہے۔ ایک خوب صورت ہے، اتنا خوب صورت کہ دیکھنے والوں کی ٹکٹکی بندھ جائے۔ دوسرا اتنا زشت رو، کریہہ المنظر، بھدّی شکل کا پیدا ہوتا ہے کہ دیکھ کر جی متلانے لگے، ایک غبی ہے، دوسرا ذہین۔ ایک چست و چالاک ہے۔ دوسرا پیدائشی کاہل و سست، ایک فرشتہ خصلت ہے۔ دوسرا شیطان سیرت، کسی کو شاعری سے لگاؤ ہے تو دوسرے کو ریاضی سے، کسی کا جی بیوپار اور کاروبار کرنا چاہتا ہے۔ تو دوسرا کتابوں کا کیڑا نظر آتا ہے۔ اور ٹھیک جیسے حیوانی اصناف میں سے ہر صنف اور ہر ہر قسم کے افراد میں صفاتی تفاوت کی کمی نے ان کی زندگیوں کی سطح میں ایسا محسوس تفاوت پیدا ہونے نہیں دیا۔ جسے قابلِ لحاظ سمجھا جائے۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا۔ اسی وجہ سے ہر ایک کی معاشی ضرورتوں کی نوعیت کمًا و کیفًا تقریبًا ایک ہی طرز کی ہوتی ہے۔ اسی کے مقابلے میں افرادِ انسانی میں اندرونی و بیرونی، ظاہری و باطنی اعتبار سے کمالات و صفات [illegible]

قدر و قیمت میں جو تفاوت پایا جاتا ہے۔[1] اسی نے زندگی کے ہر شعبہ میں ان کے اندر مدارج کا یہ اختلاف پیدا کر دیا
ہے کہ انسان کے سوا مدارج و مراتب کے اس اختلاف کی نظیر مشکل ہی سے کسی دوسری حیوانی نوع یا صنف
یا نسل میں مل سکتی ہے۔ چوں کہ مدارج و مراتب کا یہ تفاوت افرادِ انسانی میں ان کمالات و صفات ہی کے
تفاوت کا نتیجہ ہے۔ جو اکتسابی نہیں۔ بلکہ عموماً اکثر و بیشتر پیدائشی ہوتے ہیں۔ کیوں کہ کسب و اکتساب سے بھی
کمالات و صفات کی کمی و بیشی ان ہی رجحانات و میلانات اور ان ہی مناسبتوں اور صلاحیتوں کے تابع
ہوتی ہے، جنھیں ہر شخص اپنی ماں کے پیٹ سے لے کر پیدا ہوتا ہے۔ شاعری کی صلاحیتوں کو محنت و کوشش
تعلیم و تربیت، اصلاح و نگرانی سے آدمی ترقی دے سکتا ہے، لیکن کیا یہ ممکن ہے کہ شاعری سے جسے قدرتی
مناسبت فطرتاً نہ ہو، زور و ظلم سے کوئی اسے شاعر بنا دے۔ حالانکہ اسی کا دوسرا بھائی بے سیکھے سکھائے
قصیدوں پر قصیدے، غزلوں پر غزلیں ڈھالتا چلا جاتا ہے۔ آج تعلیم و تربیت کے سلسلے میں بچوں کی طبعی
مناسبتوں اور نفسیاتی رجحانوں کو سب سے زیادہ اہمیت جو دی جا رہی ہے۔ اس کی وجہ اس کے سوا
اور کیا ہے کہ اکتسابی نشو و نما، ترقی و بالیدگی کی توقع ان ہی صفات کے متعلق کی جا سکتی ہے، جنہیں وہ شکم
سے بچہ اپنے ساتھ لیے پیدا ہوا، اور یوں بھی تو سوچئے ایک ہی استاد ایک ہی کمرے میں ایک ہی نصاب کی تعلیم ہر
جماعت کے طلبہ کو دی جاتی ہے، لیکن سب پر اس تعلیم کا نتیجہ ایک ہی کیوں مرتب نہیں ہوتا۔ بہر حال صفات و
کمالات کے اسی تفاوت اور اسی تفاوت سے مدارج و مراتب کا اختلاف، نسلِ انسانی کے افراد میں جو
پیدا ہو گیا ہے۔ قرآن نے مذکورہ بالا آیتوں میں اسی واقعہ کی طرف اشارہ کیا ہے، اور یہی وہ دوسری خصوصیت
نوعِ انسانی کی ہے جس سے انسانی زندگی کا نظام متاثر ہوا ہے۔ معاشی زندگی کی وہ ہمواری جو گدھوں
اور کتوں، بلیوں اور چوہوں وغیرہ جیسے مختلف حیوانی انواع اور نسلوں میں پائی جاتی ہے، بنی آدم کی
زندگی کا معاشی نظام اس سے بالکل مختلف ہے، اور اس اختلاف کو یعنی فطری کمالات کی کمی و بیشی کی وجہ
سے معاشی زندگی میں جو نشیب و فراز پیدا ہو گیا ہے۔ کوئی اونچا نظر آتا ہے، اور کوئی نیچا۔ اس قصہ کے ختم
کرنے کی صرف یہی تدبیر ہو سکتی ہے کہ پیدا ہونے والے بچوں کے اندر اسی وقت کوئی تبدیلی پیدا کی جائے
جب رحمِ مادر میں مختلف جذبات و رجحانات کی صلاحیتوں اور مناسبتوں کو وہ فراہم کرتے ہیں۔ اوروں کا تو
میں نہیں کہتا لیکن قرآن میں کائناتی حوادث کے اساسی کلیات میں جن چند چیزوں کو داخل کیا گیا ہے ان میں

---

[1] مطلب یہ ہے کہ افرادِ انسانی میں کمالات و صفات ہی کا صرف تفاوت نہیں پایا جاتا۔ بلکہ نتائج کے لحاظ سے مختلف
انسانی صفات و کمالات میں قدر و قیمت کا بھی تفاوت قدرتی ہے۔ آخر بتایا جائے کہ کسی قوم میں ایک شخص پیدا ہوتا ہے۔ اور بہت زور
لگانے کے بعد یہ کام کرتا ہے کہ لوگوں کو میزیں بنا بنا کر دیتا ہے، یعنی بڑھئی یا نجار ہے۔ اسی قوم میں ایک اور فرد پیدا ہوتا ہے جو لاکھوں
و کروڑوں انسانوں کا اپنی قوم کو مالک بنا دیتا ہے، یا اپنی قوم کو دوسری غاصب قوموں سے نجات عطا کرتا ہے، کیا ثانی الذکر
کی صلاحیت جو قیمت رکھتی ہے۔ اول الذکر کا عمل بھی کیا اسی قدر اس قیمت کا مستحق ہو سکتا ہے۔ کمالات و صفات میں بھی
قدر و قیمت کا تفاوت ہوتا ہے، اس کا یہی مطلب ہے ۱۲

ویعلم ما فی الارحام — اور جانتا ہے (خدا) اس چیز کو جو جموں میں ہوتی ہے۔

یہی ہے جس کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ ماؤں نے کن دماغوں کے بچوں کو اپنے ارحام میں محفوظ کیا ہے، پیدا ہونے کے بعد آئندہ وہ کیا ہونے والے ہیں، اسکندر و تیمور، افلاطون و ارسطو، یا ہبنقاء عرب[۵]، فسانۂ عجائب کا خوجی؟ قرآن کا دعویٰ ہے کہ یہ وہی جان سکتا ہے جو "ارحام" کہیے یا "نطفہ" میں انسانی کمالات بھرتا ہے۔ یہی وجہ ہے جو قرآن میں فضلنا بعضهم علی بعض کے ذریعے اس کا اعلان فرمادیا گیا کہ افراد انسانی میں صفات و کمالات کا یہ تفاوت کسی دوسرے کا نہیں۔ بلکہ براہ راست قدرت کا کام ہے۔ اور جس طرح یہ قدرت کا کارنامہ ہے۔ اسی طرح تفاوت صفات کی وجہ سے افراد انسانی میں مدارج و مراتب کا جو فرق پیدا ہوگیا ہے، یہ بھی کسی دوسرے کا نہیں، بلکہ صاف لفظوں میں اس کی تصریح کردی گئی ہے کہ

ورفعنا بعضهم فوق بعض درجات — اور ہم ہی نے اونچا کردیا ہے تم میں بعض کو بعض پر مدارج کے اعتبار سے۔

یعنی کسی کو ایسی صفت دی گئی جو نتیجے کے لحاظ سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی، اور کسی کو ایسا کمال عطا کیا گیا ہے جو اپنے ثمرات و آثار کے لحاظ سے انمول و قیمتی ہے۔ اور اسی لئے دونوں کو اپنی اپنی صفات کی قیمت برابر نہ ملی۔ ایک کا درجہ دوسرے سے بلند ہوگیا تو یہ بھی قدرتی دَین ہی کا نتیجہ ہے۔

اپنے کمالات و اوصاف کی زیادہ قیمت پانے والا اگر معاشی لحاظ سے اپنے آپ کو بسط اور کشادگی کی حالت میں پاتا ہے۔ اور جن کے کمالات و صفات اتنی قیمت نہ پاسکے، اور اس کی وجہ سے ان کی معاشی زندگی میں بجائے فراخی و کشادگی کے ضیق و تنگی پائی جاتی ہے، تو لازماً یہ دونوں حالتیں بھی اسی قدرت کی طرف منسوب ہوں گی، جس نے انسانوں کے سوا دوسرے حیوانات پرندوں، چرندوں، درندوں، دوندوں کے افراد میں کمالاتی و صفاتی تقارب و تساوی پیدا کرکے ایک طرف اگر ان میں سے ہر صنف کے افراد کی معاشی سطح کو قریب قریب برابر کردیا ہے۔ تو دوسری طرف انسانی افراد کو صفاتی تفاوت کے قانون کے تحت پیدا کرکے باہم معاشی اعتبار سے انھیں مختلف کردیا ہے۔ ایک جگہ نہیں بیسیوں جگہ اسی حقیقت اور اسی واقعہ کا اعلان

واللہ یبسط الرزق لمن یشاء ویقدر — خدا ہی ہے جو کشادگی عطا کرتا ہے روزی میں کسی کو اور تنگی کردیتا ہے۔ کسی کی (روزی کو)

کے الفاظ میں قرآن مسلسل کرتا چلا گیا ہے۔ بلکہ صفاتی و کمالاتی تفاوت کا جو قانون انسانی افراد کے درمیان

---

[۵] عرب کی ایک مثل ہبنقہ کی طرف منسوب ہے، کہا جاتا ہے کہ ہبنقہ ایک احمق اور خبط دماغ آدمی تھا کہ گلے میں ٹوٹے جوتوں کا ہار لٹکائے رہتا تھا، پوچھا جاتا کہ کیا بات ہے تو کہتا کہ اس علامت سے اپنے آپ کو میں پہچانتا ہوں کہ میں ہی ہوں۔ اردو میں ہبنق اسی کی ایک بدلی ہوئی شکل ہے ۱۲

پایا جاتا ہے، اس کو تو قرآن نے صرف

فضلنا بعضھم علی بعض۔ — اور ہم نے فضیلت دی ہے تم میں بعض کو بعض پر

کے اطلاقی پیرایہ میں ادا کیا ہے، یعنی صرف یہ بیان کر دیا گیا ہے کہ بعض افراد کو بعض پر ہم ہی نے برتری و فضیلت بخشی ہے۔ لیکن یہ بات کہ کن باتوں میں فضیلت بخشی ہے، اسے ابہام و اطلاق ہی کی حالت میں چھوڑ دیا گیا۔ اور ہے بھی یہی بات کہ وہ اتنے مختلف الجہات وجوہ ہیں کہ ان کی تفصیل میں غیر ضروری طوالت ہو جاتی، صرف تفاوت صفات کے اس قانون پر تنبیہ کرنے کے لئے اتنے الفاظ کافی ہیں، آدمی اس کے بعد ان کی تفصیلات کو مشاہدہ اور تجربہ کی روشنی میں خود ہی سمجھ سکتا ہے۔ مگر صفاتی و کمالاتی تفاوت کے اس قدرتی قانون کے زیر اثر انسانوں کے بعض افراد کو بعض پر نتیجۃً جو معاشی فضیلت اور برتری حاصل ہوتی ہے اور ہو جاتی ہے بجائے اطلاق و ابہام کے

واللہ فضل بعضکم علی بعض فی الرزق۔ — اور خدا ہی نے برتری عطا کی ہے تم میں بعض کو بعض پر الرزق یعنی روزی میں۔

کی آیت میں "فی الرزق" کی جو تصریح کر دی گئی ہے۔ بظاہر اس سے اگر اس کا اشارہ سمجھا جائے کہ صفاتی و کمالاتی تفاوت کے قانون سے ایک بڑی غرض قدرت کی یہ ہے کہ "الرزق" یا معاشی لحاظ سے انسانی افراد میں مدارج کا فرق پیدا ہو جائے[1] یعنی قصداً و ارادۃً اسی رزقی فرق مراتب کو پیدا کرنے کے لئے نوع انسانی کے افراد میں صفاتی و کمالاتی تفاوت کے قانون کو قدرت نے نافذ کیا ہے۔ ورنہ انسانی افراد کی معاشی سطح کو ہم سطح اور برابر رکھنے کا ارادہ اگر کیا جاتا تو جس قدرت نے ہزارہا ہزار جانوروں کی معاشی سطح کو تفاوت کے اس

---

[1] بلکہ آیت کے ان ہی الفاظ کے بعد یہ جو فرمایا گیا ہے کہ فما الذین فضلوا برادی رزقھم علی ما ملکت ایمانھم (یعنی جنھیں رزق میں برتری بخشی گئی ہے، وہ اپنے رزق کو نہیں واپس کرنے والے ہیں۔ ان لوگوں پر جو ان کے زیر دست ہیں۔ لوگ اس کا مطلب جو بھی لیتے ہوں لیکن ظاہر الفاظ سے جو بات سمجھ میں آتی ہے، وہ یہ ہے کہ رزقی برتری چونکہ صفاتی و کمالاتی برتری کا نتیجہ ہوتی ہے اسلئے اپنے کمالات کی بنیاد پر رزق کا زیادہ حصہ جن لوگوں کے قبضہ میں پہنچ جاتا ہے۔ وہ اس حصہ کو اپنے کمالات کی قدرتی قیمت سمجھتے ہیں، اور اس کا اپنے آپ کو جائز یقین کرتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ ایسا کوئی نہیں ہے جو اپنے کمالات کی قیمت کی صورت میں رزق کا زائد حصہ زیر دستوں کے اعتبار سے اگر ملا ہو تو یہ خیال کر کے کہ یہ جو کچھ مجھے ملا ہے میرا نہیں ہے بلکہ زیر دستوں کا ہے واپس کر دے یعنی اس حصہ کا جسے آپ کو حق دار قرار دے کر واپس تو کوئی نہیں کرتا البتہ یہ ہو سکتا ہے کہ اپنا جائز حق قرار دینے کے بعد دوسروں کو وہ عطا کر دے، دیدے۔ لوگ رد اور عطا میں فرق نہیں کرتے اس لئے طرح طرح کے مغالطوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ ورنہ اگر وہ اس پر غور کریں کہ رد کے معنی واپس کرنے کے ہیں۔ پس رد اور واپسی تو اس چیز کی ہوتی ہے جس کا آدمی مالک ہی نہیں ہوا۔ اور عطا یعنی دینے کا مطلب یہ ہے کہ چیز تو میری ہے۔ میں اسے نہیں ہبہ کرتا ہوں۔ قرآن میں نفی رد کی گئی ہے۔ نہ کہ ہبہ اور عطا کی اور ہبہ و عطا کی نفی کیسے صحیح ہو گی جبکہ رات دن مالداروں کو دیکھا جاتا ہے کہ وہ اپنا مال دوسروں کو عطا کرتے ہیں۔ البتہ یہ کوئی نہیں کرتا کہ جو قیمت اپنے کمال یا مہارت کی کسی کو ملی ہو اسے یہ کہہ کر واپس کر دے کہ اس کا میں حقدار ہی نہیں ہوں، بچاؤں کیسے ۱۲

قانون سے علیحدہ رکھ کر برابر کر دیا ہے۔ وہی قدرت صرف نوعِ انسانی ہی کے افراد میں اس مساوات کے پیدا کرنے سے کیا مجبور تھی؟ بہرحال اب کچھ بھی ہو، نوعِ انسان کی دوسری قرآنی خصوصیت جس کا انسان کے "معاشی مسئلہ" سے گہرا اور بہت زیادہ گہرا تعلق ہے۔ وہ صفات و کمالات کے تفاوت کا یہی قدرتی قانون ہے، قرآن بھی بنی نوعِ انسانی کے افراد کا اسے قدرتی قانون قرار دیتا ہے۔ اور مشاہدہ بھی اس کی تصدیق کر رہا ہے۔

(۳) تیسری خصوصیت اسی سلسلہ کی وہ ہے جس کی طرف میرے خیال میں آیتِ قرآنی

ان الانسان خلق ھلوعا۔ — قطعاً آدمی لالچی اور بے صبرا بنا کر پیدا کیا گیا۔

میں اشارہ کیا گیا ہے۔ ھلوع عربی زبان کا ایک لفظ ہے۔ انسانی نفسیات کی اس کیفیت کی ترجمانی کرتا ہے۔ جسے قاضی بیضاوی نے ان الفاظ میں ادا کیا ہے۔

ای شدید الحرص قلیل الصبر — یعنی سخت لالچی اور بہت کم صبر رکھنے والا۔

غالباً صحاح کی مشہور روایت

لو کان لابن آدم وادیان من مال — اگر آدم کے بچے کو دو وادی بھر مال دیا جائے

لابتغی وادیا ثالثا۔ — تو چاہے گا وہ تیسری وادی کو۔

قرآن کے اسی لفظ ھلوع کی یہ توضیح و تفسیر ہے۔ بعض صحابہؓ نے اسی بنیاد پر یعنی ھلوع کے لفظ کا جو یہی مطلب ہے۔ اسی لئے اس حدیث کو انھوں نے قرآن ہی کی طرف منسوب کر دیا ہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ بعینہ حدیث کے یہ الفاظ قرآن میں پائے جاتے ہیں۔ بلکہ مقصد وہی ہے کہ قرآن کے لفظ ھلوع کا یہ مفاد ہے۔ اسی طرح سورۂ والعادیات میں یہ فرمانے کے بعد کہ

ان الانسان لربہ لکنود۔ — قطعاً آدمی اپنے رب کا ناشکرا ہے۔

یعنی آدمی کی یہ عام عادت ہے کہ حاصل شدہ نعمتوں کی قدر و قیمت سے تو غافل ہو جاتا ہے۔ ان کے متعلق کسی قسم کے احساسِ شکر کو اپنے اندر بیدار نہیں کرتا، نعمتیں زائل ہو کر اپنی قیمت جب تک آدمی پر ثابت نہیں کرتیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا کچھ اسے ملا ہی نہیں۔ اور ان "یافتہ" سہولتوں سے بے پروا ہو کر دیکھا جاتا ہے ہمیشہ "نایافتہ" تمناؤں اور آرزوؤں میں الجھا رہتا ہے۔ صرف بینائی ہی کی ایک نعمت ہے۔ روپیہ رکھتے ہوئے مشکل ہی سے ایسا کوئی آدمی ہوگا جو سب کچھ دے کر اسی بینائی کو خریدنے پر اس وقت آمادہ نہ ہو جاتا ہو۔ جب خدانخواستہ اس کے ضائع ہونے کا خطرہ دھمکی دینے لگے، اسی پر دوسری نعمتوں کو قیاس کرنا چاہیئے۔ مگر جب تک یہ نعمتیں اس سے چھنتی نہیں ہیں، انھیں گویا وہ آنکھ بھی نہیں لگاتا۔ اور ان سب کے ہوتے ہوئے ان چیزوں کی فکر میں جو ابھی حاصل نہیں ہوئی ہیں۔ مگر چاہتا ہے کہ وہ حاصل ہوں، پریشان ادھر سے ادھر مارا مارا پھرتا ہے چہرے پر ایسی حالت طاری کرتا ہے کہ گویا اس وقت تک قدرت کی نعمتوں سے فائدہ اٹھانے کا اس حرماں نصیب کو کبھی موقعہ ہی نہیں ملا، امیر ہو یا غریب، اس باب میں سب کا عام حال یہی ہے، بہرحال فطرتِ انسانی کی اسی عام کنودیت (ناشکری) کا ذکر کرنے کے بعد اسی موقعہ پر قرآن میں

انہ لحب الخیر لشدید۔ — اور آدمی بخیر کی محبت میں بہت پختہ واقع ہوا ہے

جو فرمایا گیا ہے، یہ بھی اگر غور کیا جائے تو اسی لفظ ھلوع ہی کے مفاد کی دوسری وسیع تعبیر ہے۔

مطلب یہ ہے کہ ھلوع کے لفظ سے تو صرف یہ سمجھا جاتا تھا کہ آدمی حد سے زیادہ لالچی ہے، اور کسی نقطہ پر اس کے دل کو قرار نہیں ہوتا، جو کچھ مل جاتا ہے، اسے تو ملا ہی ہوا سمجھ کر ان چیزوں کی فکروں میں ڈوب جاتا ہے جو ابھی نہیں ملی ہیں، گویا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کی فطرت کی گہرائیوں میں کھودنے والے نے کوئی ایسی عمیق اندھی کھائی کھود دی ہے، جو کسی طرح بھرنے کو آتی ہی نہیں۔ اور اس کے بعد اور اور کا مطالبہ مسلسل بغیر کسی انقطاع کے پوری شدت کے ساتھ زندگی بھر اس پر مسلط رہتا ہے۔ پھر اس مطالبہ کا رُخ اگر ایک ہی قسم کی کسی چیز کی طرف ہوتا تو غنیمت تھا۔ اس دوسری آیت میں یہ فرما کر کہ ایک دو چیزوں ہی کی حد تک اس کا یہ مطالبہ محدود نہیں ہے بلکہ ہر وہ چیز جس پر انسانی فطرت کے لحاظ سے الخیر کے لفظ کا اطلاق ہو سکتا ہے، یعنی ہر وہ چیز جو آدمی کو بھلی معلوم ہو۔ الخیر کی ان تمام قسموں کے ساتھ آدمی کی فطرت کا ھلوعی تعلق ہے۔ اور ان کی چاہ میں وہ شدید یعنی انتہا پسند واقع ہوا ہے۔ الخیر کے چند امتیازی افراد کا ذکر ذرا تفصیل کے ساتھ قرآن ہی میں دوسری جگہ بایں الفاظ کیا گیا ہے جس کا کسی دوسری جگہ بھی ذکر آ چکا ہے، یعنی

زین للناس حب الشھوات — آراستہ کی گئی ہیں لوگوں کے لئے خواہشیں عورتوں
من النساء والبنین والقناطیر — (اور نیز اولاد یعنی) بیٹوں کی اور سونے چاندی کے
المقنطرۃ من الذھب والفضۃ — ڈھیر کے ڈھیر، اور گھوڑے نشان زدہ خوبصورت
والخیل المسومۃ والانعام والحرث[۱] — اور مویشیاں اور کھیتی۔

چھوٹے ہوں یا بڑے، مشرقی ہوں، یا مغربی، عہد قدیم کے تاریک قرون والے ہوں یا بجلی کے روشن دنوں میں زندگی گذارنے والے، ان تمام چیزوں کی ھلوعیت اور حب شدید ہر ایک کی فطرت میں راسخ ہے۔

---

[۱] جیسا کہ عرض کیا گیا آدمی "الخیر" کا دالہ و دیوانہ ہے، اسی الخیر کی چند اساسی افراد کا قرآن میں ذکر کیا گیا ہے۔ پہلے بھی یہی تھا اب بھی یہی ہے۔ تبدیلیاں اگر ہوتی چلی آئی ہیں۔ تو ان چیزوں کے قالبوں میں مثلاً پہلے آدمی اگر اچھے اچھے خوبصورت اصیل منہناتے والے گھوڑوں کا شیدائی تھا تو اب ان کی جگہ حسین و دیدہ زیب موٹروں، سائیکلوں، موٹر سائیکلوں کا دیوانہ ہے۔ زمونے کی اور بات ہے، ورنہ آج بھی مقدرت والوں کو دیکھا جاتا ہے کہ موٹروں پر موٹریں خریدتے چلے جاتے ہیں، بلکہ کارخانے والے ہر سال موٹروں کی قطع اور ہیئت رنگ وغیرہ کو جو بدلتے ہیں ان کا بھروسہ درحقیقت ہوتا تو ہے آدمی کی اسی فطری ھلوعیت ہی پر، لیکن عقل شاید یہ مشورہ دے کہ جب موٹر موجود ہی ہے تو دوسری موٹر کے خریدنے کی کیا حاجت ہے۔ اسی عقلی مطالبہ کو رد کرنے کے لئے شکل و صورت کی جدت کو جواب کی شکل میں پیش کرتے رہتے ہیں۔ ھلوعیت کے لئے اتنی بات جواز خریداری کے لئے کافی ہو جاتی ہے۔ سواری کے سوا اور جن ھلوعی تعلقات کا قرآن میں ذکر ہے۔ ان میں تو شاید قالب کی بھی تبدیلی نہیں ہوئی ہے۔ لوگوں کو پرانے بادشاہوں کے ان واقعات پر تعجب ہوتا ہے کہ ایک ایک آدمی ان میں چار چار سو پانچ پانچ سو عورتیں رکھتا تھا لیکن جب سے جدید تمدن نے جمہوری حکومتوں کے ہر باشندے کو مشرقی بادشاہوں کا درجہ عطا کر دیا ہے۔ اس وقت سے مغرب کے ان جدید بادشاہوں نے نسائی ھلوعیت کا جو مظاہرہ کیا ہے۔ اس کے سامنے تو ان پرانے شخصی بادشاہوں کے کارنامے بھی گرد ہو کر رہ گئے ۱۲

اور یہ تھی اسلام کے معاشی نظام کی میرے خیال میں پہلی بنیاد۔ لیکن یہ تو معاشی پیداواروں سے استفادہ کرنے والے یعنی نوعِ انسانی کی فطری خصوصیات کے متعلق قرآن کے وہ اشارے تھے، جن سے آدمی کی اس جدو جہد کا متاثر ہونا ناگزیر ہے۔ جسے حصولِ رزق اور کسبِ معیشت کی راہوں میں وہ اختیار کرتا ہے۔

معاشی ذخیرے کی نوعیت! مگر اب سوال استفادہ کرنے والے سے نہیں، بلکہ جن پیداواروں سے اپنی اس جدو جہد میں فائدہ اٹھایا جا رہا ہے۔ ہم یہ پتہ چلانا چاہتے ہیں کہ مجموعی حیثیت سے ان پیداواروں کی واقعی نوعیت کیا ہے۔ قرآن میں اس کے متعلق جو علم عطا کیا گیا ہے۔ اسی کو اب پیش کروں گا۔ اور یہی وہ دوسری بنیاد ہے جس پر اسلام کا معاشی نظام میرے خیال میں مبنی ہے۔

کچھ دیر پہلے قرآن ہی کے حوالے سے بھی یہ بات گذر چکی ہے، اور یہی مشاہدہ بھی ہے کہ قدرتی پیداواروں پر قبضہ کر کر کے بعض لوگ تو ہم میں رزقی حیثیت سے بسطی حالت میں ہیں۔ اور بعض قدری زندگی میں مبتلا ہیں۔ لیکن بسط و قدر کی یہ حالت تو افراد کے حساب سے ہے۔ مگر اسی سوال کو اگر اس طریقہ سے اٹھایا جائے یعنی پوچھا جائے کہ ان قدرتی پیداواروں کی نوعیت افرادِ انسانی کی مجموعی حیثیت کی نسبت سے کیا ہے؟ تو قرآن کی مشہور آیت

لو بسط اللہ الرزق لعبادہ	اگر کھول دے اللہ روزی کو اپنے بندوں
لبغوا فی الارض۔	کے لئے تو بغاوت اختیار لیں گے زمین پر۔

کا جو فحوی ہے، اس کو پیش نظر رکھتے ہوئے، اس کے جواب میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ ان پیداواروں کو جس پیمانہ پر قدرت پیدا کر رہی ہے، قرآن کا بیان ہے کہ یہ ایسا پیمانہ ہے جس سے بہ حیثیت مجموعی العباد (یعنی خدا کے بندے) بسط کی حالت میں نہیں آسکتے۔ دوسرے الفاظ میں یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ ہم میں ہر ایک شخص اگر یہ چاہے کہ موجودہ زندگی میں ایسی آمدنی پر اسے اقتدار حاصل ہو کہ خرچ کے بعد ہم میں سے ہر ایک کے پاس کچھ پس ماندہ بھی بچ جائے تو مذکورہ بالا آیت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کم از کم حیات کے جس دور سے آدمی اس وقت گذر رہا ہے اس میں تو اس کا امکان نہیں ہے، معاشی پیداواروں کو جو پیدا کر رہا ہے۔ قصداً و ارادۃً اس نے یہی چاہا کہ اس قسم کا بسط نہ پیدا ہو۔ ایسا کیوں چاہا گیا، گو اس کا جواب اسی آیت میں مذکور ہے، لیکن اس وقت میری بحث کے دائرے سے یہ مسئلہ خارج ہے کہ اس وقت تو صرف مجموعی حیثیت سے معاشی پیداواروں کے متعلق اس پیمانہ کو صرف دریافت کرنا ہے، جس پیمانہ پر یہ چیزیں اس دنیا میں پیدا ہو رہی ہیں۔ مذکورہ بالا آیت سے اس پیمانے کی یہ تو سلبی صفت معلوم ہوئی۔ یعنی مجموعی طور پر بسط کی حالت ان سے کبھی پیدا نہیں ہو سکتی۔ اسی کے بعد یہ الفاظ ہیں

ولکن ننزلہ بقدر ما یشاء	لیکن نازل کرتے ہیں ہم (اس رزق کو)
	اس پیمانے پر جس پر چاہتے ہیں۔

گویا سلبی صفت کے بعد پیدائش کے اسی پیمانہ کی یہ ایک ایجابی و اثباتی صفت کی طرف اشارہ ہے، یعنی قدرت کے نزدیک کوئی خاص پیمانہ مقرر ہے، اسی مقررہ پیمانہ کے مطابق پیدائش کا یہ سلسلہ جاری ہے جس کا مطلب یہی ہوا کہ الرزق یعنی معاشی پیداواروں کے متعلق بظاہر کبھی بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ خوب پیدا ہوئیں، اور کسی

سال محسوس ہوتا ہے کہ پیدائش میں کمی ہوئی۔ اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ ان کی پیدائش کا کوئی قانون نہیں ہے گویا الل ٹپ جزافی طور پر کام چل رہا ہے۔ یہ نتیجہ قطعاً غلط ہے۔ بلکہ پیدا کرنے والے کے سامنے کوئی خاص پیمانہ ہے، اور تاریخ کے نامعلوم زمانہ سے وہ اسی مقررہ پیمانے پر ان کو پیدا کرتے ہوئے چلا آرہا ہے۔ باقی یہ سوال کہ قدرت کے اس مقررہ جانچے ہوئے پیمانے کی نوعیت کیا ہے؟ اس منفی صفت کے سوا یعنی مجموعی حیثیت سے بسط کی حالت کی توقع اس سے نہیں کی جا سکتی۔ سورۂ الحجر میں یہ ارشاد فرمانے کے بعد یعنی

وان من شئ الا عندنا خزائنہ — نہیں ہے کوئی چیز مگر اس کے خزانے ہمارے
وما ننزلہ الا بقدر معلوم۔ — پاس ہیں اور انہیں نازل کرتے رہتے
ہیں ہم ان کو لیکن ایک مقررہ معلوم پیمانے پر۔

جس میں گویا اسی مضمون کا اعادہ فرمایا گیا ہے، جو

لکن ننزل بقدر ما یشاء — مگر ہم نازل کرتے رہتے ہیں اس کو اس
پیمانے پر جس پر ہم چاہتے ہیں۔

کا مفاد ہے۔ یعنی وہی بات کہ پیدائش کا پیمانہ جانا بوجھا، مقرر کیا ہوا ہے بخت و اتفاق کا نتیجہ نہیں ہے اس کے بعد یہ جو الفاظ ہیں

وجعلنا لکم فیہا معائش — اور زمین میں ہم نے تمہارے جینے کا سامان
ومن لستم لہ برازقین۔ — کر دیا ہے۔ اور ان چیزوں کے جینے کا بھی
جس کے روزی پہنچانے والے تم نہیں ہو۔

جہاں تک میں سمجھتا ہوں، اس میں اسی "مقررہ" اور "معلوم پیمانے" کی ایک مزید ایجابی صفت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ "معائش" کا جو لفظ یہاں استعمال کیا گیا ہے، ظاہر ہے کہ یہ ان ہی ذرائع اور وسائل کی تعبیر ہے، جن کے بل بوتے پر موجودہ زندگی گذر رہی ہے۔ گویا "معائش" "الرزق" ہی کی دوسری قرآنی تعبیر ہے، حاصل یہ سمجھ میں آتا ہے کہ نہ صرف ہمارے ہی لئے یعنی بنی نوع انسانی ہی کے لئے بلکہ ان کے لئے بھی جن کی روزی کا متکفل انسان نہیں ہے، سب ہی کے لئے، ایسے پیمانہ پر یہاں چیزیں پیدا ہوتی ہیں، جن سے آدمی کی بھی زندگی گذر رہی ہے، اور جو آدمی کے زیر پرورش نہیں ہیں، ان کی بھی۔ اور یہی معاشی پیداواروں کے معلوم و مقررہ پیمانے کی میرے نزدیک دوسری ایجابی صفت ہے جس کا سراغ قرآن سے ملتا ہے۔

اب خلاصہ یہ ٹھیرا کہ جن معاشی پیداواروں سے آدمی استفادہ کر رہا ہے۔ قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ مجموعی حیثیت سے ان میں بسط کی کیفیت کو قصداً و عمداً قدرت چاہتی ہے کہ نہ پیدا ہو، لیکن با این ہمہ ایک ایسے مقررہ و معلوم پیمانہ پر ان کی پیدائش کا سلسلہ جاری ہے کہ آدمی اور جو آدمی کے زیر پرورش نہیں ہیں ہر ایک کے لئے معائش (یعنی وہ وسائل جن پر زندگی موقوف ہے) مہیا ہوتے رہتے ہیں۔ یہی اس پیمانے کی ایجابی صفت ہے، ایسی صفت کہ خشکی و تری بحر و بر، جہاں کہیں بھی جو جی رہا ہے۔ اس کے لئے اسی کے مطابق روزی یا معائش مہیا ہو رہے ہیں، بلکہ وہ جیتا ہی اس وقت تک ہے، جب تک "معائش" اور "رزق" کے یہ

ذرائع اس کے لئے فراہم ہوتے رہتے ہیں۔

بہرحال جن معاشی ذخیروں اور پیداواروں پر اس خاک دانِ ارضی کی زندگی گذر رہی ہے۔ قرآن سے ان کے سلبی و ایجابی صفات جو معلوم ہوتے ہیں، وہ تو یہی ہیں، باقی عہدِ حاضر کی عددبافیوں، عقل لافیوں کے بھروسہ پر جو نتائج پیدا کئے جا رہے ہیں۔ شہروں شہروں، دیہاتوں دیہاتوں کے ایک ایک مرد، ایک ایک عورت ایک ایک بچہ کی خوراک ان کے لباس، ان کی دیگر ضروریاتِ حیات کے تختے بنا بنا کر روئے زمین کے کھیتوں، کارخانوں، فیکٹریوں کی پیداواروں سے مقابلہ کر کرکے کبھی رجائی[له] اور کبھی قنوطی خیالات کو اپنے اوپر لوگ جو مسلط کر رہے ہیں، پھر کبھی ہنستے ہیں، اور کبھی روتے ہیں۔ خدا ہی جانتا ہے کہ اپنے ان استخراجی نتائج پر اتنا بھروسہ لوگوں کو کیسے پیدا ہو جاتا ہے کہ ان ہی نتائج سے متأثر ہو ہو کر مصنوعی طور پر نہیں، بلکہ واقع میں یہ رو بھی دیتے ہیں، اور ہنس بھی سکتے ہیں۔

لیکن سچ یہ ہے کہ وثوق و اعتماد میں نتائج ہمیشہ ان مقدمات کے تابع ہوتے ہیں، جن کو مرتب کر کے نتیجہ پیدا کیا جاتا ہے۔ کھلی ہوئی بات ہے کہ دقیقہ سنجیوں کی انتہائی کوششوں سے کامل احتیاط کو کام میں لاتے ہوئے بھی آدمی جن مقدمات سے اس مہم میں نتیجے حاصل کر رہا ہے یا کر سکتا ہے، زیادہ سے زیادہ وہ اسی عالمِ محسوس یا عالمِ شہادت ہی کے معلومات ہو سکتے ہیں۔ لیکن قرآن میں "الغیب" کی پانچ کنجیوں (مفاتیح) کا ذکر ان الفاظ میں جو کیا گیا ہے۔

غیب کی پانچ کنجیاں

وعنده علم الساعة وینزل الغیث ویعلم ما فی الارحام وما تدری نفس ماذا تکسب غداً وما تدری نفس بای ارضٍ تموت۔

اور خدا ہی کے سامنے ہیں، الساعت (آخری گھڑی) کا علم، اور وہی برساتا ہے بارش کو، اور جانتا ہے جو کچھ ہوتا ہے ارحام (ماؤں کی بچہ دانیوں میں) اور نہیں جانتا ہے کوئی کہ کل وہ کیا کرے گا۔ اور نہیں جانتا ہے کوئی کہ کس سرزمین میں مرے گا۔

ان پانچ کنجیوں میں سے اوروں کو جانے دیجئے۔ صرف ایک بات جس کا ہمارے "معاش" یا "رزق" سے بہت زیادہ قریب کا تعلق ہے۔ یعنی "الغیث" (بارش) جو ہر سال تقریباً دنیا کے عام حصوں میں برستی رہتی ہے اور مہینوں برستی ہے۔ تاریخ کے نامعلوم زمانے سے اس کے برسنے کا سلسلہ جاری ہے۔ لیکن گذرنے والے سال کے بعد آنے والے سال کے متعلق یہ بات کہ کب کب، کہاں کہاں، کتنی کتنی مقداریں برسے گی؟ کیا غریب انسان ان سوالوں کا کوئی قطعی جواب اپنے پاس رکھتا ہے۔ حالانکہ ہمارے "رزقی نظام" کا زیادہ تر دار و مدار اسی "بارش" کے مسئلہ کے ساتھ وابستہ ہے۔ اور اسی کے علم سے آدمی جب جاہل ہے تو جہل سے جو علمی نتائج پیدا کئے گئے ہیں کیا واقعی وہ علمی نتائج کہلانے کے مستحق ہو سکتے ہیں، خیر ہمیں دوسروں سے کیا بحث، کیا کروں لاکھ چاہتا ہوں کہ صرف اپنی کہوں، قرآن میں جو کچھ ہے، پیغمبرِ اسلام کے اقوال میں جو کچھ پایا جاتا ہے اسی کو

[له] رجائی یعنی امید افزا، قنوطی مایوسانہ ۱۲

پیش کرتے ہوئے آگے بڑھتا چلوں۔ لیکن درمیان میں بعض باتوں کا خیال آہی جاتا ہے: اسی لئے آ جاتا ہے کہ قرآن ہی میں ان خیالات کے متعلق کچھ اشارے ملتے ہیں۔ جی نہیں مانتا کہ اسے یوں ہی چھوڑ دوں۔

ضمانتِ رزق کا مطلب، تو بات یہ ہو رہی تھی کہ جن معاشی پیداواروں پر آدمی اپنی موجودہ زمینی زندگی گذار رہا ہے۔ قرآن سے ان کی سلبی صفت تو یہ معلوم ہوتی ہے کہ مجموعی حیثیت سے بسط کی کیفیت ان سے پیدا نہیں ہو سکتی، پیدا کرنے والے کی یہی مشیت اور یہی اس کا طے شدہ ارادہ ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ قرآن ہی یہ بھی یقین دلاتا ہے کہ باوجود اس طے شدہ ارادے کے یہ بھی قطعی ہے کہ اتنا بہر حال پیدا ہوتا رہتا ہے اور ہوتا رہے گا۔ جس سے آدمی اور آدمی کے سوا دوسرے زندگی گذارنے والوں کو "معاش" فراہم ہوتے رہیں گے اس وقت تک فراہم ہوتے رہیں گے۔ جب تک قدرت انہیں زندہ رکھنا چاہتی ہے۔ یہی مطلب ہے ضمانتِ رزق کی ان مشہور آیتوں کا، یعنی

وما من دابۃ الا علی اللہ	اور نہیں ہے کوئی چلنے والا (زمین پر) مگر اس
رزقھا یعلم مستقرھا و	کی روزی کی ذمہ داری خدا پر ہے۔ جانتا ہے
مستودعھا۔	اس کی قیام گاہ کو بھی اور جہاں سونپا
	جائے گا اس کو بھی۔

یا دوسری جگہ ارشاد ہے

وکاین من دابۃ لا تحمل رزقھا	اور کتنے چلنے والے ہیں کہ نہیں لادے پھرتے
اللہ یرزقکم و ایاکم وھو	ہیں اپنی روزی کو، اللہ ہی روزی پہنچاتا ہے
السمیع العلیم۔	ان کو بھی اور تم کو بھی۔ وہی شنوا ہر وہی دانا ہے

آل اولاد کے بارے اپنے آپ کو ہلکا رکھنے کے لئے جاہلیت میں "عزل" (یعنی ضبط تولید) بلکہ قتلِ اولاد بھی ایک بڑا معاشی حل باور کیا جاتا تھا۔ قرآن نے قتلِ اولاد کے اس سفاکانہ فعل سے روکتے ہوئے اسی کا اعلان کیا تھا یعنی

ولا تقتلوا اولادکم خشیۃ املاق	اور نہ مار کر دینی اولاد کو محتاجی کے ڈر سے ہم ہی
نحن نرزقکم و ایاھم	تمہیں روزی دیتے ہیں اور انہیں بھی۔

بہ کثرت حدیثوں میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی قرآنی حقیقت کا اظہار مختلف الفاظ میں فرمایا ہے۔ حدیث کی کتابوں میں اس کا کافی ذخیرہ موجود ہے، حاصل سب کا یہی ہے کہ خزائن اللہ یا چاہیے تو کہہ سکتے ہیں کہ قدرتی موازنہ (بجٹ) میں اتنی گنجائش قطعاً رکھی جاتی ہے جس کی بدولت جینے کی مقررہ مدت ہر جینے والے کی پوری ہو رہی ہے اور ہوتی رہے گی۔ خدا کے انکار سے جن کے دماغ ماؤف ہیں، ان عقلی سودائیوں سے تو بحث نہیں، لیکن واقع میں عالم کے اس جیتے جاگتے نظام کو لامحدود قدرت والی قوت جو چلا رہی ہو سوچنے والے اس کے متعلق اس کے سوا اور سوچ ہی کیا سکتے ہیں۔ باوجود عدم گنجائش کے نوکروں تک کا تقرر ظاہر ہے کہ دیوانوں کے سوا جب معمولی ہوش و حواس رکھنے والا آدمی بھی نہیں کر سکتا تو اسی فعل کے انتساب کی

جرأت العیاذ باللہ، خدائے حی وقیوم، دانا و بینا، توانا کی طرف کیسے ہوسکتی ہے۔

بہرحال، اپنی موجودہ زندگی میں آدمی جن معاشی پیداواروں سے مستفید ہورہا ہے، ان پیداواروں کی پیدائش کا صحیح اور قدرتی پیمانہ کیا ہے، ایک تو یہ بات، اور خود استفادہ کرنے والے، یعنی بنی آدم کے وہ فطری خصوصیات جن سے ان کی معاشی جدوجہد، یا حصولِ رزق، کسب معیشت کی کوششیں متاثر ہورہی ہیں۔ میرے نزدیک "انسانی معاشیات" کی یہی وہ دو اساسی بنیادیں ہیں، جن کا قرآن میں سراغ ملتا ہے، اور کوئی شبہ نہیں کہ آدمی اپنی معاشی زندگی میں جن حالات سے زمین کے اس کرہ پر دوچار ہے، اگر غور کیا جائے تو تحلیل و تجزیہ کے بعد ہر سوچنے والے کو نظر آئے گا کہ ان ہی دو بنیادی حقائق کے یہ قدرتی نتائج ہیں، بات اگرچہ طویل ہوتی جارہی ہے، لیکن اختصار سے اگر کام لیتا ہوں جو کچھ سمجھانا چاہتا ہوں، اندیشہ ہے کہ اکثروں کی رسائی وہاں تک نہیں ہوسکتی

میرا مطلب یہ ہے کہ استفادہ کرنے والے یعنی انسان اور جس سے استفادہ حاصل کیا جارہا ہے یعنی کائنات کی قدرتی پیداواریں، ان کے جن خصوصیات وصفات کو قرآن سے انتخاب کرکے آپ کے سامنے پیش کیا گیا ہے۔ تھوڑی دیر کے لئے ان سے قطع نظر کرلیا جائے اس کے بعد سوچا جائے کہ صورتِ حال کیا وہی رہتی جو اس وقت ہے، بہ آسانی ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ حصول رزق یا فراہمی معاش کے وہی ذرائع اگر آدمی کو بھی میسر آجاتے جو اس کے سوا زندگی گذارنے والی دوسری ہستیوں کو زمین کے اسی کرہ پر قدرتی طور پر حاصل ہیں، یعنی وہی اسباب و ذرائع جن کے بل بوتے پر ان میں سے تقریباً ہر ایک ایک قسم کی خود اکتفائی زندگی سے بہرہ یاب ہے۔ اگر آدمی میں بھی یہی باتیں پائی جاتیں، تو یہ بے چارا ایک ایک ضرورت کے لئے اپنے ابنائے جنس کے بے شمار افراد کی رعایتوں کا جو آج دست نگر ہے، کیا یہ حال اس کا اس وقت بھی باقی رہ سکتا تھا؟ یا ان ذرائع سے محروم ہونے کے باوجود بھی اگر یہی ہوتا کہ جیسے سب اپنی اپنی ضرورتوں کی ایک خاص مقدار کے حاصل ہوجانے کے بعد مطمئن ہوجاتے ہیں۔ سیری کی اسی کیفیت سے انسان کی فطرت بھی سرفراز ہوتی، لیکن ایک طرف تو بے سروسامانی و بے نوائی کے ان حالات میں وہ پیدا کیا جاتا ہے، جن کی طرف میرے خیال میں قرآن نے مطلق ضعف اور ضعفِ سابق ولاحق کے ذریعہ سے اشارہ کیا ہے، اور دوسری طرف ماں کے پیٹ سے ہر وہ شخص جو آدمی بن کر اس دنیا میں قدم رکھتا ہے۔ الخیر کے حب شدید اور ہلوعیت کے اس اندھے کوئیں کو اپنے ساتھ لاتا ہے جسے جتنا زیادہ بھرا جاتا ہے، اسی قدر وہ اور خالی ہوجاتا ہے۔

پھر یہی عارضہ جب آدمی کی فطرت کو لگا ہی دیا گیا تھا۔ تو ھل من مزید کے اس جہنمی مطالبہ کی تکمیل ہی کا کوئی سامان یہاں کیا جاتا۔ لیکن قرآن نے یہ اعلان کرکے کہ جس پیمانہ پر قدرت یہاں "معائش" کے ذخیروں کو پیدا کررہی ہے۔ قصداً وارادۃً ان کو اسے حال میں رکھا گیا ہے اور ہمیشہ رکھا جائے گا جس پر فراخی اور وسعت کا نتیجہ مجموعی حیثیت سے کبھی مرتب نہیں ہوسکتا جس کے یہی معنی ہیں کہ موجودہ زندگی کے متعلق یہ امکان بھی ختم ہوجاتا کہ آج نہیں تو شاید کل کسی زمانے میں ہی پیاسے کو اپنی پیاس کے مطابق یہاں پانی میسر آجائے گا حالانکہ بالفرض حل اگر اس کا کوئی "حل" ہماری آئندہ نسلوں کے سامنے آ بھی جائے تو اس سے ہم آج کے گذرنے والوں کی مشکلات پر کیا اثر پڑتا ہے؟

اور خیر یہ سب کچھ اگر ہوا تھا، تو کم از کم اس کے ساتھ یہی کر دیا جاتا کہ جیسے آدمی کے سوا تمام دوسرے حیوانی انواع و اصناف کے افراد میں مدارج و مراتب کا فرق نہیں پیدا کیا گیا ہے، نوعِ انسانی کے افراد بھی ایک ہی حال پر پیدا کئے جاتے، لیکن رجحانات و میلانات یا قدرتی صلاحیتوں و مناسبتوں کے شدید اختلاف کی بدولت کمالات و صفات کے اعتبار سے انسانی افراد میں جو تفاوت پیدا ہو گیا ہے، اور کمالاتی و صفاتی تفاوت کا یہی اٹل قدرتی قانون مدارج و مراتب کے نشیب و فراز کے تماشے کو بسا اوقات ایک ہی ماں باپ کے دو بچوں میں ہر ملک، ہر شہر، ہر گاؤں بلکہ ہر گھر ہر خاندان میں جو پیش کرتا رہتا ہے۔ ظاہر ہے کہ معاشی پیچیدگیوں کے درد و کرب کے سمند کے لئے مستقل تازیانہ کی شکل تماشے کی یہ نوعیت بھی اختیار کئے ہوئے ہے۔ یہی آدمی ہے، سینکڑوں کمالات و صفات ایسے ہیں، جن سے یہ محروم ہے، مثلاً اڑنے ہی کے ایک کمال کو لیجئے، مچھر اور مکھیاں بھی اس کمال سے سرفراز ہیں، لیکن چونکہ یہ دوسری نسلوں یا انواع کے افراد کا کمال ہے، اس کمال سے محرومی کا گلہ کسی آدمی میں نہیں پایا جاتا۔ لیکن مصیبت تو یہی ہے کہ باوجود انسان ہونے کے اپنے ایک بھائی کو آدمی جب بلندیوں پر پاتا ہے۔ تو قدرتی طور پر اپنی پستیوں کا احساس کانٹا بن کر اس کے دل میں چبھنے لگتا ہے، بلکہ عموماً جس سے جتنا زیادہ قریبی تعلق ہوتا ہے اس کی بلندی، پستی میں رہنے والوں کے لئے زیادہ تکلیف دہ بنی ہوتی ہے۔ مگر کیا کیجئے کہ انسان اور انسانی افراد کو جس نے پیدا کیا ہے، ان ہی حالات میں پیدا کیا ہے۔ اور بہر حال آدمی ان ہی حالات میں پیدا ہو چکا ہے۔ پس اب سوال یہ ہے کہ مشکلات کے ان شکنجوں سے جو خود نکلنا چاہتے ہیں۔ یا دوسروں کو نکالنا چاہتے ہیں۔ ان کے لئے صحیح راہِ عمل کیا ہو سکتی ہے؟ کیا قدرت کے ان قوانین سے جنگ کا اعلان کر دیا جائے؟ کہنے تو سب یہی ہیں کہ قدرتی قوانین سے جنگ کا انجام شکست و ہزیمت کے سوا نہ پہلے کچھ نکلا ہے، نہ آئندہ نکل سکتا ہے، زندگی کا ہر تجربہ اسی کی تعلیم دیتا ہے، قدم قدم پر اسی کی شہادت آئے دن آدمی کے سامنے پیش ہوتی رہتی ہے۔ لیکن زندگی کے دوسرے پہلوؤں سے تو سر دست مجھے بحث نہیں، پر معاشی مشکلات سے نجات کی راہوں میں یہ عجیب بات ہے کہ کہنے کی حد تک تو کہنے والے جو کچھ بھی کہتے ہوں، لیکن کرنے والوں نے جب کبھی کچھ کرنا چاہا ہے تو عموماً کچھ ایسی صورتیں انھوں نے اختیار کی ہیں جن کے متعلق چاہا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ قدرت کے ان قوانین سے وہ جنگ کرنا چاہتے ہیں تفصیل کا موقع تو نہیں ہے، اور جیسا کہ مسلسل کہتا چلا آ رہا ہوں دوسروں کے عمل سے اپنے اس مضمون میں مجھے بحث بھی نہیں۔

بعض مذاہب کے معاشی نظریے

لیکن مثلاً چند چیزوں کے ذکر سے رکا بھی نہیں جاتا۔ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ مذہب یا فلسفہ کے نام سے مختلف قرون و ادوار میں بعضوں کی طرف سے جو اس قسم کی مہمیں جاری ہوئیں جن کا حاصل یہ تھا کہ آرزوؤں اور تمناؤں سے اپنے قلوب کو خالی کر لینا انسانیت کی سب سے بڑی سعادت ہے مہاتما بدھ کی جانب منسوب کیا گیا ہے کہ انسانی فطرت کو مدعاؤں سے خالی کر لینا یہی نروانا کا سب سے بڑا مقدس نصب العین ہے۔ یا یونان کے کلبی اسکول کے فلاسفر

آنچہ ما در کار داریم اکثرش در کار نیست

کا پرچار علمی و عملی مثالوں سے جو کرتے پھرتے تھے، اس عہد کے سب سے بڑے بادشاہ کے آگے، اسی مکتب خیال کے امام الائمہ دیوجانس نے "مانگ کیا مانگتا ہے" کے شاہی فرمان کے جواب میں "دھوپ چھوڑ دیجئے، اس کے سوا ہما را آپ سے کوئی مطالبہ نہیں ہے"۔ اسی کے متعلق اسی قسم کے اور لطائف جو تاریخوں میں ملتے ہیں، یا ان ہی کی دوسری تعبیروں کا نام رہبانیت یا جوگیت وغیرہ مختلف زبانوں میں جو رکھا گیا، تو ان ساری باتوں کی تہہ میں کیا تھا؟ یقیناً بلوعیّت کے اسی اندھے کوئیں کے مطالبوں سے پریشان ہو کر سوچنے والوں نے یہ تدبیر سوچی تھی کہ جو کنواں بھر نہیں سکتا، پھر اس کے منہ ہی کو کیوں نہ بند کر دیا جائے۔ جہاں تک میرا خیال ہے لا ادعائیت کا یہ سارا فلسفہ گویا ایک ڈاٹ تھی۔ جسے انسانی فطرت کے اس دہانے پر چاہا گیا تھا کہ کسی ترکیب سے کس دیا جائے۔ جو ظاہر ہے کہ قدرت ہی سے مقابلہ کی ایک شکل تھی، جبراً قہراً غیر فطری دباؤ سے کام لے کر اس ڈاٹ کے دبانے میں ممکن ہے کچھ لوگ کچھ دن کے لئے بہ ظاہر کامیاب ہوئے ہوں۔ لیکن واقعات شاہد ہیں کہ معمولی سی غفلت کے بعد ہی جیسے بوتل سے کاگ اڑ جاتی ہے۔ ہمیشہ یہ ڈاٹ بھی انسان کی فطرت سے نکل کر دور جا پڑی اوروں کو جانے دیجئے، کلیسا کے زیر اثر خود یورپ کے باشندوں کو بھی تو چاہا گیا تھا کہ رہبانیت ہی کے دباؤ کے نیچے رکھا جائے۔ لیکن اسی ملک میں ردعمل کا جب دور شروع ہوا تو انہی انسانی حرص و آز کے جن شرناک حالات کے ساتھ اس ملک میں نمایاں ہوا۔ اس "دیدہ" کے لیے تو "شنیدہ" کی بھی ضرورت نہیں۔ کلیسا کے باغیوں نے کلیسا پر الزام لگایا اور یقیناً یہ الزام بیجا نہ تھا کہ اس نے آدمی کو آدمی نہیں، پتھر فرض کر لیا تھا کہ آرزوؤں اور تمناؤں سے دست برداری کی توقع پتھروں ہی سے کی جا سکتی ہے، ان ہی کے سینے ارمانوں اور خواہشوں سے خالی ہو سکتے ہیں۔

معاشیات انسانی کے بعض عقلی نظریئے

لیکن معاشی مشکلات سے نجات کی پھر راہ کیا ہے؟ شاید اسی کا جواب ہے جو بیانی رجحانات کے مقابلہ میں جیسا کہ سنا جاتا ہے کہ راجر بیکن یا حکیم ڈیکارٹ وغیرہ وغیرہ جیسے فلاسفہ نے نظریہ قوت وافادہ کا علم بلند کیا، قوت والوں کو اپنی اپنی قوتوں میں بے روک ٹوک اضافہ پر اضافہ کرتے چلا جانا چاہیئے۔ جہاں تک میں خیال کرتا ہوں، انسانیت کے قدرتی ضعف کے مقابلے ہی میں کوشش کی یہ تدبیر تجویز کی گئی تھی، اسی طرح معاشی پیداواروں کے افادی پہلوؤں پر افادے کے غیر مختتم اضافہ کا مطالبہ شاید ان پیداواروں کی اس محدودیت کا توڑ تھا۔ مجموعی حیثیت سے بسط و فراخی کے نتائج جن پر مرتب نہیں ہو رہے ہیں۔ گویا "معائش" کے جس نظام کو قدرت غیر مبسوط حال میں قصداً و ارادۃً رکھنا چاہتی ہے۔ چاہا گیا کہ ان کو اس ترکیب سے مبسوط بنا کر چھوڑا جائے؟ لیکن انسانی اجتماعیت کے سامنے ان کے بعد سرمایہ داری کا نظام جس مہیب اور گھناؤنی شکل میں نمایاں ہوا، قدرتی قوانین سے اسی جنگ کا نتیجہ اسے ٹھیرایا جائے تو واقعات سے اس کی کیا تائید نہیں ہو رہی ہے۔ نظریہ قوت اور افادہ کے علم برداروں نے کیا کیا؟ سرمایہ کی قوت رکھنے والوں نے انفرادی محنتوں کو توسیع افادہ کے نصب العین کو پیش نظر رکھتے ہوئے اجتماعی محنتوں کی شکل میں بدل دیا۔ لیکن اس طور پر بدلا کہ اجتماعی محنتوں کے ان منافع کے

"دماغی اور جسمانی محنت کی اجرت یکساں ہونی چاہیے۔" ص ۲۷۔ اصولِ معاشیات۔

قانون نافذ کیا گیا کہ

"عمالِ حکومت کی اجرت ایک کاریگر سے زیادہ نہ ہونی چاہیئے۔" ص ۲۸۔ اصولِ معاشیات۔

قدرت اور قدرت کے قانونوں سے چوٹ کھا کھا کر چوٹ کھانے والے اب کیا کہہ رہے ہیں یا آئندہ کیا کہیں گے اِس وقت مجھے اس سے قطعاً بحث نہیں ہے۔ لیکن اترنے والے اس جنگ کے لئے جب میدان میں اترے تھے، تو اس کا انکار نہیں کیا جا سکتا کہ وہ یہی کہتے تھے اور یہی کہلواتے تھے کہ ایک جوڑی جوتی بنانے والا موچی جو کچھ پائے گا، وہی مزدوری کتاب لکھنے والے مصنف کو بھی دی جائے گی۔ لکڑی کے ایک میز بنانے والے بڑھئی کو جو صلہ اس کی میز بنانے کی محنت کاٹ کاٹ لکڑی کی وہی میز جس سے ایک یا بشکل دو آدمی مستفید ہو سکتے ہیں۔ یہی صلہ حکومت کے اس وزیر اعظم کو بھی دیا جائے گا۔ جس کی ایک ایک سوجھ اور ایک ایک تدبیر سے صدیوں کے لئے حکومت دشمنوں کے دستبرد سے محفوظ ہو جاتی ہے۔

اشتراکیت اور رہبانیت

حقیقت تو یہ ہے کہ کہنے کی حد تک ہر وہ شخص جو منہ میں زبان رکھتا ہے اور ہاتھ میں قلم رکھتا ہے جو کچھ چاہے کہہ سکتا ہے۔ جو چاہے لکھ سکتا ہے، لیکن اگر فکرِ معقول سے کام لیا جائے تو سمجھا جا سکتا ہے کہ نئوں نے بالآخر قدرتی قوانین سے جنگ کی اس مہم میں وہی کہا ہے جو پہلے کہا گیا ہے، جو پرانوں نے کہا اور کیا تھا۔ مطلب یہ ہے کہ ان کے اگلوں نے جیسے چاہا تھا کہ آخر کے جذبِ شدید جو جذبہ آدمی میں پایا جاتا ہے۔ یعنی وہی حصوعیت یا عدم سیری کا جو اندھا کنواں انسان کی فطرت میں کھدا ہوا ہے۔ کوشش کی گئی تھی کہ جب اندر سے وہ بھر نہیں سکتا، تو باہر سے اس میں لامدعائیت اور آرزوؤں سے دست برداری کی ڈاٹ ٹھونس دی جائے۔ سچ پوچھئے تو ہر پھر کر پچھلوں کی ساری ہنگامہ آرائیوں کی آخری تان اسی پرانی تجویز ہی پر آکر ٹوٹتی ہے۔ آخر کیا مطلب ہے اس بات کا کہ جیسے بکریں مینڈھے، اچھو ہے، کوتے، چیلیں وغیرہ ضروریاتِ زندگی کی ایک خاص مقدار کے مہیا ہو جانے کے بعد مطمئن ہو جاتی ہیں، اسی طرح جو یہ چاہا جاتا ہے کہ نسلِ انسانی کے ہر فرد کو بھی وہی دیا جائے جو دوسروں کو دیا جاتا ہے۔ ان میں بھی ہر ایک کو ضروریاتِ حیات کی اسی مقدار سے مطمئن ہونے پر بزورِ شمشیر جو مجبور کیا جا رہا ہے تو دوسرے الفاظ میں اس کا حاصل اس کے سوا اور کیا ہوا کہ جو کچھ جسے دیا جائے، اسی مقدار پر صبر کر کے دوامی نوعیت سے دست بردار ہو جائے جن کا طوفان ہر اس شخص میں ابلتا اور قطعاً ابلتا رہتا ہے جو انسان بن کر اس دنیا میں قدم رکھتا ہے، کیا انسانی فطرت کے ساتھ وہی بالجبر تشدد جسے اگلوں نے روا رکھا تھا، دوسرے الفاظ میں اسی تشدد کو پچھلے بھی دہرا رہے ہیں۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ اگلوں کا بالجبر تشدد صرف زبان و قلم ہی کے تشدد تک محدود تھا، لیکن پچھلوں نے چھاتیوں پر چڑھ چڑھ کر تلواروں کی دھار سے اپنے اسی غیر فطری فعل میں کامیاب ہونے کی کوشش کی۔ بلکہ صحیح سمجھ یا غلط، لیکن دنیا میں آرزوؤں سے دست برداری کی دعوت دیتے ہوئے کسی نہ کسی شکل میں آئندہ زندگی ہی میں سہی، انہوں نے ان ہی آرزوؤں کی تکمیل کا وعدہ بھی کیا تھا۔ مگر دست برداری کی اس پچھلی کوشش میں تو کوشش کرنے والوں نے اس وعدہ کی مسرت تک سے بھی دنیا کو، بلکہ ساری مسرت کیوں نہ ہو اس سے بھی محروم کر دیا۔

اور میری سمجھ میں تو اب تک یہ بھی نہیں آیا ہے کہ قدرتی قوانین کی جس جنگ نے بالآخر سرمایہ داری کی جہنم میں نسلِ انسانی کو ڈھکیل دیا تھا۔ اس میں اور یہ جنگ جو بے فطرتی و کمالاتی تفاوت سے پیدا ہونے والے مراتب و مدارج کے اختلاف سے جو لڑی جا رہی ہے، ان دونوں میں نتیجہ کے اعتبار سے فرق کیا ہے؟ سرمایہ داروں کا تو صرف یہی ظلم تھا کہ سب کو نہیں بلکہ اولادِ آدم کے صرف ایک حصہ کو غربت کی زندگی گذارنے پر انھوں نے مجبور کر دیا تھا۔ لیکن جنھوں نے یہ دیکھ کر کہ سب چونکہ امیر نہیں بن سکتے اس لئے سب کو غریب بن جانا چاہئے۔ اس اصول کو طے کر کے انھوں نے تو بجائے بعض کے بزورِ شمشیر سب ہی کو غریب بنانے کا تہیہ کر لیا ہے، بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ سرمایہ داری کے نظام میں غریب بن کر جینے کا موقعہ آدم کے جن بچوں کو حاصل تھا، سرمایہ دشمنی کے اس نظام میں تو ان بدنصیبوں کو جینے کے اس حق سے بھی محروم کر دینے کی آج دھمکیاں جاری ہیں، یا ہو سکتا ہے کہ کہیں محروم کرنے کا یہ منحوس کاروبار شروع بھی ہو گیا ہو، اور میدانِ جنگ کا جو نقشہ بنایا گیا ہے، اس کا تو یہ لازمی نتیجہ ہے۔[1]

خلاصہ یہ ہے کہ بنانے والے نے برابر برابر کر کے جن انگلیوں کو نہیں بنایا تھا، ان ہی غیر یکساں انگشت کو یکساں بنانے کی جبری کوشش جب ان لوگوں کی طرف سے ہو گی جو ان کے بنانے والے نہیں ہیں تو اس کا قدرتی انجام اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ توڑ مروڑ کر کھینچ کھانچ کر یکسانی پیدا کرنے میں جس وقت کامیابی ہو گی، ٹھیک اسی وقت یہ دیکھا جائے گا کہ برابر برابر ہونے کی حد تک تو انگلیاں برابر ہو گئیں لیکن برابر ہونے کے بعد یہ وہ انگلیاں باقی نہ رہیں، یعنی وہی انگلیاں جن کے چھوٹے بڑے ہونے ہی پر ہاتھ کا سارا کام مبنی تھا۔

آپ دیکھ رہے ہیں، قدرتی قوانین سے جنگ کی ان تمام کوششوں میں کیسی عجیب بات ہے کہ

---

[1] مقصد یہ ہے کہ ہر شخص کو صرف اس کی احتیاج کے مطابق ہی دینا چاہئے، اور ہر شخص سے بقدر استطاعت کام لینا چاہئے (اصول معاشیات ٹاسگ ص ۱۳۲) یعنی خدمت اور کام کی نوعیت پر نہیں، بلکہ معاوضہ یا اجرت کی بنیاد جب ہر شخص کے ذاتی احتیاج پر رکھی جائے گی، اور جس سے جو کام ممکن ہو، بقدر استطاعت وہی کام اس سے لینا چاہئے، گویا گھوڑوں سے گھوڑوں کا کام، بیلوں سے بیلوں کا کام لیا جائے۔ اور ہر ایک کو ان کی ضرورت کے مطابق دانہ چارہ کے تقسیم کر دینے کا نظم کر دیا جائے تو کام کرنے والوں نے اس اصول کو جب فرمایا تو معلوم ہوتا ہے ان افراد کا سوال جب ان کے سامنے پیش ہوا کہ جو بے کئے دھرے کھانا چاہتے ہیں، تو کسی زمانے میں ایسوں کی کمی نہیں رہی ہے سرمایہ داری کے نظام میں تو ان کو غربت اور فاقہ کی سزا بھگتنی پڑتی تھی لیکن سرمایہ دشمنی کے عہد میں ان کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے جب یہ پوچھا گیا تو اصول معاشیات میں [illegible] کے متعلق پہلے تو اصلاح کی کوشش کی جائے گی، کام کو ممکن حد تک خوشگوار اور دلچسپ بنا کر انھیں [illegible] اگر اس کا اثر بھی ان پر مرتب نہ ہو تو لکھا ہے کہ ان کو نظر بند کیا جا سکتا ہے، نسل بڑھانے سے ان کو روکا جا سکتا ہے، لیکن ان تدبیروں کے بعد بھی اگر وہ ناقابلِ اصلاح ثابت ہوں تو انھیں چپکے سے بلا تکلیف ختم کیا جا سکتا ہے (اصول معاشیات ص ۲۹۶ [illegible] ٹاسگ [illegible])

پروفیسر ہارورڈ یونیورسٹی (مترجمہ دارالترجمہ سرکار عالی) ۱۲

جس کے لئے یہ سارے پاپڑ بیلے جا رہے ہیں، یعنی نسانی نسل، وہ انسان باقی نہیں رہتی، معاشی مشکلات کے حل کی ان ساری تدبیروں میں یہی جوہری نقص ہے جو ہر حال میں جنگ کے ہر نقشہ کی صورت میں باقی رہتا ہے۔ اور یوں ہی باقی رہے گا۔ جو پھندا بھی کھولا جائے گا۔ انسانیت کے حلقوم کے لئے وہی دوسرے نئے پھندوں کی شکل اختیار کرتا چلا جائے گا۔ سلجھانے والے مسلسل یوں ہی نت نئی گتھیوں میں الجھتے چلے جائیں گے۔ جو پیدا کیا گیا ہے، وہ اپنے پیدا کرنے والے سے الجھ کر قسمت اسی پیدا کرنے والے کی کہ قطعی سلجھ نہیں سکتا۔ صدیوں کی تاریخ اسی کی شہادت پیش کر رہی ہے، اور اس جنگ کو بدلنے والے جب تک سلجھنے نہ دیں گے بتہا دتوں اور تجربوں کا یہ سلسلہ یونہی جاری رہے گا۔

اعلموا انکم غیر معجزی اللہ — اور جان لو کہ تم خدا کو ہرا نہیں سکتے نہ تھکا سکو گے

وان اللہ مخزی الکافرین۔ — اللہ تعالیٰ رسوا کرنے والا ہے۔

صلح کا مطلب میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ دیکھنے والوں اور تجربہ کرنے والوں نے جب جنگ کی تمام شکلوں اور تمام نقشوں اور ان کے مہیب نتائج، لاینحل عواقب کو جب دیکھ لیا، تجربہ کر لیا۔ تو کیوں نہیں تصادم و مقابلہ کی اس پُرخار وادی کو چھوڑ کر صلح کی اس راہ پر غور کرتے ہیں، جسے اسلام نے زندگی کے کسی خاص شعبہ ہی میں نہیں، بلکہ میرا جہاں تک خیال ہے، ہر اس شعبہ میں اختیار کیا ہے، جس میں قدرتی قوانین سے لڑ کر دنیا کو ہزیمت اٹھانی پڑی ہے۔ "اسلامی نوامیس" کا یہ ایک بڑا اہم گر ہے، جس سے مسلمانوں نے عملاً یوں تو ہمیشہ نفع اٹھایا ہے، لیکن علمی طور پر اس کے سمجھنے کی توفیق شاید چند ناص ہی نفوس کو میسر آئی ہے۔ مسئلہ کی اہمیت ذرا تفصیل چاہتی ہے۔

ازالہ یا امالہ مطلب یہ ہے کہ جن قوانین پر دنیا اور دنیا میں رہنے والوں کا نظام قائم ہے، یہ تسلیم کر لینے کے بعد کہ ان کا پیدا کرنے والا اور ان کو نافذ کرنے والا علم و حکمت کے ساتھ رحم و کرم کا بھی لامحدود سرچشمہ ہے یعنی علام الغیوب ارحم الراحمین کے متعلق کیا ایک لمحہ کے لئے یہ تصور کرنے کی گنجائش پیدا ہو سکتی ہے کہ اس نے کوئی غلط قانون بنایا، ایسا غلط قانون جس کی وجہ سے اس کے بندے دکھ درد، رنج و کلفت میں مبتلا ہو گئے، مسلمان ہو، یا غیر مسلمان، ہر وہ شخص جو خدا کو مانتا ہے۔ یقیناً اس تصور کی ہمت نہیں کر سکتا؟ پھر انسان کے اندر ہو یا انسان سے باہر، اصطلاحی الفاظ میں چاہیے تو کہیے کہ انفس میں ہو یا آفاق میں، ان چیزوں کا مشاہدہ کیوں ہو رہا ہے جو بری ہیں اور نتائج کے لحاظ سے جن کے شر ہونے کا فیصلہ عقل نے بھی کیا ہے اور مذہب نے بھی۔ آخر آدمی کے اندر ہی لیجئے، بیسیوں صفات خود اسی کے اندر ایسے پائے جاتے ہیں، اور ان ہی صفات کو لے کر وہ پیدا ہوتا ہے، جن سے دنیا بھی بیزار ہے اور مذہب نے بھی جن پر لعنتیں کی ہیں، یہ حسد یہ بغض یہ بخل یہ خود غرضی اور اس قسم کے سارے رذائل جو عموماً فطری طور پر لوگوں میں پائے جاتے ہیں، ظاہر ہے کہ کسی کی پیدا کی ہوئی ہیں اور اس کے سوا کس کی ہو سکتی ہیں، جس نے انسان اور انسان کی فطرت کو پیدا کیا، اور یہی حال آفاقی کائنات یا اور انسان کی موجودات کے ان بہتوں کا ہے جن سے آدمی کو دکھ پہنچ رہا ہے۔

انسانی مجاہدات اور اس کے مساعی پر اگر غور کیا جائے تو ایک بڑے حصہ کا تعلق معلوم ہوگا کہ اندر اور باہر کے ان ہی شرور اور ان ہی برائیوں سے ہے، جن کی بدولت آدمی کی موجودہ زندگی انتہائی پیچیدگیوں میں مبتلا ہوگئی ہے۔ ان ہی پیچیدگیوں کی حل کی راہوں میں کش مکشوں کا ایک لامحدود سلسلہ جاری ہے، ہمارے علوم و فنون کا ایک بڑا ذخیرہ ان ہی کے مباحث سے مملو اور معمور ہے۔

بات طویل ہو جائے گی، قصہ مختصر یہ ہے کہ عموماً کش مکش کی ان راہوں میں ایک گروہ تو ان کا ہے جنھوں نے ان شرور اور برائیوں کے ازالہ و استیصال کو اپنا نصب العین بنا کر چاہا ہے کہ اسی سے زندگی کی پیچیدگیوں کا حل پیدا کیا جائے۔ اسی راہ کے وہ مشورے ہیں، جن میں مطالبہ کیا گیا ہے کہ مثلاً حسد نہ کرو، بغض نہ کرو، خود غرضی سے باز آجاؤ، اور معاشی مشکلات کے حل کے سلسلہ میں گذشتہ تدبیروں کا جو ذکر کیا گیا تھا، در اصل اسی نہج کا وہ بھی ایک جزئیہ ہے یعنی معاشی پیداواریں جس پیمانے پر پیدا ہو رہی ہیں، اس پیمانہ کی قدرتی خصوصیت (یعنی مجموعی حیثیت سے ان کا غیر مبسوط ہونا) کبھی تو اس خصوصیت کے متعلق ارادہ کیا گیا کہ اس کو ختم کر دیا جائے، یا ان معاشی پیداواروں سے جو مستفید ہو رہا ہے یعنی انسانی فطرت کی ان خصوصیات کا ازالہ کر دیا جائے جن سے رزق کی جد و جہد کی الجھنوں کا تعلق ہے، بہ تفصیل عرض کر چکا ہوں کہ تمناؤں سے دستبرداری کا مشورہ، یا صفاتی و کمالاتی تفاوت کی وجہ سے افراد انسانی اور ان کی قیمتوں میں مراتب و مدارج کا جو قدرتی اختلاف ہے، چاہا جا رہا ہے کہ اس اختلاف کو مٹا دیا جائے۔ حاصل دونوں کا وہی ازالہ ہے۔ اخلاقیات اور تصوف کی ضخیم ضخیم کتابیں جو دنیا کی زبانوں میں ہو لکھی ہوئی ہیں، خلاصہ سب کا یہی نکلے گا کہ جن صفات و غرائز کو لے کر آدمی شکم مادر سے پیدا ہوتا ہے، ان میں رذائل کے نام سے جو موسوم کئے گئے ہیں، یعنی وہی بخل حسد، کینہ وغیرہ، ان سب کے ازالہ کی کوشش یہی انسانی سعادت کی راہ ہے، زندگی کی تلخیوں، اور سماج کی الجھنوں کا واحد علاج ازالہ کی ان ہی تدبیروں کو قرار دیا گیا ہے، تدبیروں کے طریقے یہ ممکن ہے کہ مختلف ہوں۔ لیکن آخری خاتمہ سب کا اسی قانون ازالہ کے مشورہ پر منتہی ہوتا ہے۔

اسلام کی راہ میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ دنیا کے دوسرے مذاہب و ادیان میں یہ چیز پائی جاتی ہے یا نہیں۔ لیکن اتنا ضرور کہہ سکتا ہوں کہ علاج کے جس اصول کو میں پیش کر رہا ہوں ذاتی حد تک یہ چیز مجھے اسلام ہی میں ملی، اسلام کی آسمانی کتاب اور اس کے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات ہی سے یہ روشنی میں نے حاصل کی ہے۔

اسی مسئلہ پر کہ آدمی کے باہر ہو، یا اندر، یہاں جو کچھ ہے، سب اسی کا پیدا کیا ہوا ہے، جس نے سب کچھ پیدا کیا ہے، غلطی ہو یا ظلم، جس کی ذات اس کے شائبہ سے بھی برتر و پاک ہے، اس کی پیدا کی ہوئی چیز قطعاً غلط نہیں ہو سکتی، جہاں تک میں سمجھتا ہوں اسی دینی و عقلی مسئلہ کی بنیاد پر آفاق و انفس کی ہر قدرتی صفت کو قدرت کی پیدا کی ہوئی ایک چیز ہونے کی حیثیت سے اسلام خیر اور قطعاً صحیح و درست بھی قرار دیتا ہے، اور چاہتا ہے کہ مسلمان جو اسلام کو خدا کا دین یقین کرتے ہیں، وہ بھی یہی قرار دادیں اور یہی باور کریں، اور اس لحاظ سے آدمی کے اندر ہو یا باہر، قدرتی کارفرمائیوں کے کسی اثر کے ازالہ کا سوال ہی اسلام میں پیدا نہیں ہوتا خواہ دنیا نے جن کو کچھ ہی سمجھا ہو، اور جن الفاظ سے چاہا ہے، اسے بدنام کیا ہو، رہے وہ نتائج جو ان

قدرتی آثار و قوانین سے پیدا ہو ہو کر انسانیت کے لئے تکلیف دہ اور زندگی کو تلخ بنا رہے ہیں۔ بجائے ازالہ کے اسلام کی یہ تعلیم ہے کہ ان آثار و قوانین کے صحیح استعمال کی راہیں پیدا کی جائیں، ازالہ کے مقابلہ میں استعمال کی صحیح راہوں کا دریافت کرنا اور ان ہی کے مطابق عمل کرنا اسی کا نام قانون امالہ[۱] رکھا گیا ہے۔ اور اسی کو میں اسلامی تعلیمات کی ایک بڑی اہم خصوصیت خیال کرتا ہوں۔

یوں کہنے کو تو مثلاً مسلمانوں نے بھی "خلاقیات" پر بڑی بڑی کتابیں لکھی ہیں۔ اور ان غیر انسانی غرائز و صفات کو فضائل و رذائل، اعلیٰ، ادنیٰ، اوسط وغیرہ اقسام و مدارج میں تقسیم کر کر کے نکتہ نوازیوں کے دریا بہا دیئے گئے ہیں، لیکن اسے جرأت بیجا اگر نہ قرار دیا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ اس قسم کی کتابوں میں زیادہ تر غیر اسلامی مکاتب کے افکار کی بلا وجہ تقلید کرنے اور بزورِ جبر اسلامی وثائق و شواہد پر ان کو منطبق کرنے کی لاحاصل بلکہ ناکام کوشش کی گئی ہے۔ اخلاقی مسائل جن کا بالکلیہ عمل اور صرف عمل سے تعلق تھا انھیں فلسفہ کی بھول بھلیوں میں کچھ اس طرح گم کر دیا گیا ہے کہ عمل کے لئے مشکل ہی سے ایک عامی آدمی ان کتابوں کی روشنی میں کسی لائحۂ عمل کا انتخاب کر سکتا ہے، اور اسی لئے ذاتی حد تک میں ان ہی اسلامی مصنفین کا ہم نوا ہوں، جنھوں نے اخلاقی و منزلی یا (معاشی، و سیاسی مسائل کے متعلق بغیر کسی جھجھک کے اپنے اس فیصلہ کا اعلان فرما دیا ہے۔

ان الشريعة المصطفوية	محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی روشن شریعت اور
الغراء والملة المحمدية البيضاء	ان کی تابناک ملت نے ان امور کی تکمیل
قد قضت الوطر عنها۔	کر دی ہے (اسلام کے سوا کسی دوسرے فرقہ)

مکتبِ خیال سے ان امور میں مشورہ لینے کی مسلمانوں کو حاجت نہیں)

ان مصنفین اسلام کا یہ استغنائی تغافل اگرچہ بہتوں پر گراں گذرا ہے۔ لیکن جہاں تک میرا خیال ہے یہ قومی یا علمی تعلی نہیں بلکہ درحقیقت ایک واقعہ کا اظہار ہے۔ آخر استکبار ہی اگر اس کی بنیاد ہوتی تو علم ہی کے دوسرے شعبوں میں ان ہی مصنفین نے غیر اسلامی دوائر کی چیزوں کو کیوں قبول کیا۔ علم کی دنیا میں پچھلوں کے پاس آج اگلوں کا جو موروثی ترکہ ہے، سب جانتے ہیں کہ ان ہی مصنفین اسلام کا وہ صدقہ ہے۔ خیر میں کیا کہنے لگا بات یہ ہو رہی تھی کہ بجائے ازالہ کے اس قسم کے تمام مسائل میں اسلام نے امالہ کے قانون پر اپنی بنیاد رکھی ہے۔ اور یہ اتنی مختصر، سیدھی صاف راہ ہے کہ ازالہ والوں نے جن مسائل کو مجلدات میں بیان کیا ہے، بلا مبالغہ عرض کر رہا ہوں کہ اسلام نے ایک ایک فقرہ میں ان کو ختم کیا ہے۔ یہی اخلاق انسانی کے رذائل کا مسئلہ ہے۔ صحابہؓ کے حالات بیان کرتے ہوئے

تصحیح اخلاق کا اسلامی طریقہ		
	اشداء على الكفار	کافروں پر وہ سخت ہیں۔ اور باہم
	رحماء بينهم۔	ایک دوسرے پر مہربان۔

---

[۱] جیسے ازالہ کے معنی ہیں کسی چیز کو زائل کر دینا۔ اسی طرح امالہ کے معنی ہیں کسی چیز کے رخ کو پھیر دینا۔ عرب میں یہ محاورہ مروج ہے۔ اطباء کہتے ہیں کہ مثلاً نزلہ جو آنکھ پر گرنے والا تھا اس کا امالہ ناک یا دانتوں کی طرف کر دیا گیا۔

چند لفظوں کا ایک مختصر سا جملہ قرآن میں ہے۔ مگر فطرتِ انسانی کے وہ سارے صفات جن کی شدت و صلابت سے دُنیا چیخ اٹھی ہے۔ غُصّہ، بُغض و عداوت، حسد، الغرض وہ سب کچھ جن سے دوسروں کو دکھ پہنچتا ہے بجائے اس بات کے کہ مسلمانوں کو یہ حکم دیا جاتا کہ اپنے نفس سے ان رذائل کو مٹانے کی کوشش کریں، یعنی ان کے ازالہ کا حکم دیا جاتا۔ آپ دیکھ رہے ہیں۔ کفر کی طرف ان کے رُخ کو پھیر کر شدت کے ان ہی صفات کو اسلام نے کتنا کار آمد اور قیمتی بنا دیا۔ کُفر کس چیز کا نام ہے، ان ہی چیزوں کا تو جنھیں اختیار کر کے اپنے ہاتھوں آدمی خود اپنے آپ کو اپنی توانائیوں کو خطرناک انجام تک پہنچا دیتا ہے۔ کیسی عجیب بات! جن صفات کی سختیوں سے انسانیت جاں بہ لب تھی۔ صرف ایک اشارے میں قرآن نے ان ہی کو ذریعہ بنا دیا خس و خاشاک کے اس انبار کی صفائی کا جس کا قرآن کی اصطلاح میں کفر نام ہے۔ جن سے زحمت ہو رہی تھی وہی بنی آدم کی خدمت کے وسائل بن گئے، اسی طرح

ان الشیطان لکم عدو فاتخذوہ عدوا۔ — قطعاً شیطان تمہارا دشمن ہے۔ تو تم بھی اس کو دشمن بناؤ۔

اللہ اکبر ایک مذہبی اور اعلیٰ اخلاقی کتاب میں 'عداوت' جیسے رذیلہ کے اقتدار کی تکمیل کا مطالبہ آمر کے الفاظ میں کیا جا رہا ہے، "دشمنی کرو" نیکی کے مبلغ مذہب کے منہ پر یہ بات کیسی عجیب معلوم ہوتی ہے، لیکن جس کی طرف عداوت اور دشمنی کے رُخ کو پھیر کر یہ حکم دیا گیا ہے۔ جب آدمی اس پر غور کرتا ہے تو نظر آتا ہے کہ بلا شبہ اس مصیبت سے جس کا نام "الشیطان" ہے۔ انسانیت نجات پا نہیں سکتی تھی۔ اگر عداوت کے اس جذبہ کا تخم آدمی کی فطرت میں نہ بو دیا جاتا، بلکہ ایک طرف اگر عداوت کے اس جذبہ کی قیمت اس کے صحیح استعمال سے واضح ہوتی ہے تو دوسری طرف تمام برائیوں کے آخری سرچشمہ یعنی وہی "الشیطان" کے وجود کی قیمت بھی اسی سے خود بخود ہمارے سامنے آجاتی ہے، معلوم ہو جاتا ہے کہ اپنے نصب العین تک پہنچنے کے لئے قدرت نے آدم کی اولاد کو درحقیقت "الشیطان" کی شکل میں ارتقاء کا ایک زینہ عطا فرمایا ہے کہ اسی کی ٹکر آدمی کو ہر تحتانی درجہ سے اٹھا کر فوقانی مراتب پر پہنچاتی چلی جا رہی ہے۔ آپ دیوار سے ٹکراتے ہیں۔ تو زمین پر گرتے ہیں۔ لیکن "الشیطان" سے جو ٹکراتا ہے۔ کون نہیں جانتا کہ براہ راست وہ رحمتِ حق کی آغوش میں گرتا ہے، اور یہی "الشیطان" کا اسلام میں صحیح استعمال ہے، اب بجائے ٹکرانے کے جو "الشیطان" سے بغل گیری میں مشغول ہو جائے اور اس کی یہی مشغولیت اس کے لئے وبالِ جان بنتی چلی جائے تو آپ ہی بتائیے کہ "الشیطان" کو غلط طور پر استعمال کرنے والوں کا یہ قصور ہے یا الشیطان کے پیدا کرنے والے پر اس کا الزام عائد ہوتا ہے۔ اسلام کے مشہور شیرازی حکیم نے اللہ کی اسی عجیب و غریب اسلامی قانون کی تلخیص اپنے ان دو مصرعوں میں کتنی بلاغت سے کی ہے۔ فرماتے ہیں

ترا تیشہ دادم کہ ہیزم شکن — نہ گفتم کہ دیوار مسجد بکن

سعدی ؒ

* دینے والے نے بیشک آپ کو تیشہ دیا تھا، اور اس لئے دیا تھا کہ اپنی ضرورت کے لئے اس سے لکڑی پھاڑنا،

لیکن بجائے لکڑی کے مسجد کی دیوار جو اس تیشہ سے آپ کھودنے لگے۔ تو اس الزام کا مجرم کیا تیشہ دینے والے کو ٹھیرایا جا سکتا ہے؟ سچ تو یہ ہے کہ کسی طوفانی سیلاب کے مقابلہ میں اس قسم کی تدبیریں کہ آبادی کو چاروں طرف سے سنگ بست کر دیا جائے۔ یا یہ نہیں بلکہ تلاش کر کر کے ان سرچشموں ہی میں ڈاٹیں لگانے کی کوشش کی جائے جن سے ابل ابل کر پانی آ رہا ہے، اور تباہی و بربادی کی دھمکیاں آبادیوں کو دے رہا ہے۔ کہنے کی حد تک تو یہ بھی تدبیریں ہیں، اور بڑی محنت طلب، مشقت خواہ پُرمصارف تدبیریں ہیں۔

لیکن ان دونوں گروہوں سے ہٹ کر جو آگے بڑھ گیا، اور کسی بلندی پر چڑھ کر کوئی بنجر میدان جو اسے نظر آیا۔ پھاوڑے لے کر جلدی سی ایک راہ پانی کے لئے اسی خشک غیر آباد بنجر میدان کی طرف اس نے پھیر دی۔ جس کے بعد راہ پا کر خود بخود سیلاب کا یہ پانی غراٹے بھرتا ہوا اسی میدان کی طرف چل پڑا۔ خود ہی انصاف کیجئے کہ سیلابی طوفان سے مقابلہ کرنے والوں کے ان تینوں طبقوں میں نتیجہ کے لحاظ سے کس کی کامیابی کا یقین کیا جا سکتا ہے۔ دیکھنے والوں نے سنگین سے سنگین دیواروں کو سیلاب کے تھپیڑوں سے پاش پاش ہوتے ہوئے جب دیکھا ہے اور آئے دن دیکھتے رہتے ہیں۔ یا ابلنے والے پانی کے دہانوں پر جو ڈاٹیں کسی گئی ہیں، پانی کے زور سے ان کے اڑنے اور الگ ہو جانے کا جب روزمرہ تماشا دیکھا جاتا ہے، تو اسی سے پہلے دو طبقوں کی کامیابی و ناکامی کے یقین کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ لیکن اجڑے بنجر میدانوں کے جگر کو پانی سے سیراب ہونے کا موقعہ جس نے دیا ہے۔ جو پانی غلط راہ پر جا رہا تھا، اس کی روانی کو غیر فطری طور پر روکنے کی جگہ صحیح راہ پر جس نے اس پانی کو لگا دیا ہے۔ یقیناً یہی وہ آدمی ہے جس نے ضائع ہو جانے والے پانی کو بھی بربادی سے بچا لیا۔ اور یہی نہیں بلکہ پانی کے بغیر زمین کا جو حصہ ریگستان بیڑ میدان بنا ہوا تھا۔ اس کو بھی باغ و بہار اسی طوفانی پانی کے صحیح استعمال سے اس نے بنا دیا۔ اسی کی کامیابی یقینی ہے، اور اسی کی یہ وہ تدبیر ہے جس میں نہ ناکامی کا احتمال ہے، اور نہ نقصان کا خطرہ۔ امالہ کا قانون اسی قانون کا نام ہے۔ اسلام نے زندگی کے ہر اس شعبہ میں جیسا کہ میں نے عرض کیا، امالہ کے اسی قانون کو اختیار کیا ہے۔ جہاں قدرت کے کسی قانون کے غلط استعمال سے غلط نتائج پیدا ہو رہے تھے اور لوگ استعمال کی تصحیح سے غافل ہو کر بجائے امالہ کے قدرت کے اس قانون ہی کی ازالہ کی فکروں میں الجھ گئے۔ جو درحقیقت قدرت کے قانون سے نہیں، بلکہ خود قدرت ہی سے جنگ کی ایک بے نتیجہ بلکہ خطرناک گستاخانہ شکل تھی، اور اب بھی ہے۔

معاشی راہ میں امالہ کی اسلامی تدبیر

خیر ازالہ اور امالہ کے قانون کی یہ تو عام تشریح تھی، میرا خیال ہے کہ جیسے دوسرے شعبوں میں اسلام نے ایسے مواقع پر بجائے ازالہ کے امالہ کے قانون سے الجھنوں کو سلجھایا ہے، اسی طرح معاشی راہوں کی ان مشکلات کو جو قدرتی قوانین ہی کے نتائج ہیں۔ ان کو بھی امالہ ہی کی کارگر تدبیر سے اس نے حل کیا ہے۔ دوسرے الفاظ میں جس کا مطلب یہی ہوا کہ جب تک انسان ان ناگزیر حالات کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے، اور بقول ایک مشہور معاشی فاضل کے

> انسان کو اپنی آرزوؤں کے پورا کرنے کے لئے جن مادی چیزوں کی ضرورت ہے وہ محدود ہیں۔ اور اس کی آرزوؤں کی کوئی حد و نہایت نہیں، قدرت نے اس کی فطرت میں

میری نہیں دی، اس کا ذہن، اس کا دل ہمیشہ ہر وقت نئے نئے مقاصد، نئی نئی آرزوؤں کا مولد ہے ؎

دمادم آرزو ہا آفرینی		مگر کارے نداری اے دل اے دل

(ص ۷۰، مقصد و منہاج ڈاکٹر ذاکر حسین خاں شیخ الجامعۃ الملیۃ)

یعنی مطلب وہی ہے کہ مجموعی حیثیت سے غیر مبسوط کہئے یا محدود پیمانے پر معاشی پیداواروں کے پیدا ہونے کا یہ سلسلہ جاری ہے۔ اور قرآن کے حوالے سے گذر چکا کہ الحیوٰۃ الدنیا کی موجودہ زندگی میں رہتی دنیا تک یہ سلسلہ یونہی جاری رہے گا، اور جب تک آدم کی اولاد ان فطری خصوصیتوں کو لے کر پیدا ہوتی رہے گی، جن کا تفصیل سے قرآن کی روشنی میں ذکر ہو چکا۔ اس وقت تک ہمیں جو کچھ سوچنا ہے، ان ہی حالات میں رہ کر سوچنا ہے اور یہ طے کر کے سوچنا ہے کہ جن حالات و کیفیات عوامل و مؤثرات کی زنجیروں میں ہماری موجودہ زندگی جکڑی ہوئی ہے۔ ان زنجیروں کی کسی کڑی کے ازالہ اور جدا کرنے سے ہم قطعاً عاجز و مجبور ہیں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اس مشہور قول میں یعنی

اذا سمعتم بجبل زال عن مکانہ	جب تم سنو کہ کوئی پہاڑ اپنی جگہ سے ٹل گیا تو
فصدقوہ واذا سمعتم برجل تغیر	اس کی تصدیق کر سکتے ہو لیکن جب سنو کہ کسی
عن خلقہ فلا تصدقوا بہ فانہ	شخص کی پیدائشی خصلت بدل گئی تو اس
یصیر الی ما جبل علیہ	کی تصدیق نہ کرو کیونکہ آخر وہ
(رواہ احمد)	اسی پر لوٹتا ہے جس پر اس کی جبلت پیدا ہوئی ہو

فرما کر اسی حقیقت کی توثیق فرمائی ہے[1]۔ اسی نصب العین کو سامنے رکھ کر آگے ان کی جو تدبیریں اس راہ میں میری سمجھ میں آئی ہیں آپ کے آگے پیش کرتا ہوں۔

گذر چکا کہ معاشی پیداواروں سے استفادہ کرنے والے یعنی انسان کی بعض فطری خصوصیات اور خود ان معاشی پیداواروں کی پیدائش کا وہ محدود پیمانہ یعنی ان کا مجموعی حیثیت سے ہمیشہ غیر مبسوط اور محدود ہونا، ان ہی دونوں باتوں کی باہمی آویزش سے وہ پیچیدگیاں پیدا ہوئی ہیں، جن کا نام معاشی پیچیدگیاں ہے، ہم بے درا ترتیب کے ساتھ معاشی پیچیدگیوں کے ان اسباب کو پھر درج کر دیتے ہیں، جو یہ ہیں۔

(۱) جسدی طور پر آدمی کا دوسروں کے لحاظ سے ضعیف ہونا (خواہ ضعف سابق ہو یا لاحق)

---

[1] اس قسم کی ایک اور حدیث بھی کتابوں میں ملتی ہے۔ بخاری، ترمذی، مسند احمد سب ہی کتابوں سے مشکوٰۃ میں یہ روایت منقول ہے جس کا ترجمہ ہے کہ آدمی کی پیدائش اس مٹی سے ہوئی ہے جسے خدا نے ساری زمین سے سمیٹا تھا اس لئے زمین کی مختلف [illegible] سرخ، سپید، کالا [illegible] کے درمیان [illegible] رنگ مختلف طور پر پائے جاتے ہیں۔ اسی وجہ سے بعض نرم ہیں بعض سخت بعض [illegible] فطرت [illegible] آدمی کی [illegible] خصوصیتوں کا اثر بھی پڑتا ہے جس میں وہ پیدا ہوتا ہے [illegible] پیدا ہونے والے [illegible] سختیوں اور [illegible] کے درمیان پیدا ہونے والے [illegible] کی فطری [illegible] مثالیں ہیں ۱۲

(۲) آخر ایسی یہ وہ چیز جو آدمی کو محبوب اور بعض معلوم ہوتی ہے) اس کے حب و بغض میں انسان کا شدید انتہا پسند ہونا جس کی دوسری تعبیر قرآن ہی نے ہلوعیت سے بھی کی ہے۔ ایک طرف آدمی کی فطرت میں یہ اتکاز اور دوسری طرف معاشی پیداواروں کی مجموعی حیثیت سے عدم مسولیت یا محدودیت۔

(۳) صفاتی اور ذہانتی تفاوت کی وجہ سے افراد انسانی کا مدارج و مراتب کے اعتبار سے باہم مختلف ہو جانا۔

بتفصیل اس پر بحث ہو چکی ہے کہ معاشی مشکلات کے کلی اسباب یہی ہیں۔ اگر ان حالات سے آدمی دوچار نہ ہوتا تو جیسے زمین پر دوسرے جینے والوں کے گروہ در گروہ جی رہے ہیں، کھا رہے ہیں، پی رہے ہیں، تناسل و توالد کے فرائض انجام دے رہے ہیں ہر قسم کے جھگڑوں اور جھنجھٹوں سے آزاد ہو کر مزے کے ساتھ با امن و اطمینان انجام دے رہے ہیں، راحت و مسرت کی یہی قابلِ رشک زندگی انسان کو بھی میسر ہوتی۔

پھر ان ہی الجھنوں کے سلجھانے کے لئے ازالہ کی کوششیں مختلف قرون و اعصار میں جو کی گئیں، یا اب بھی کرنے والے جو کچھ اس سلسلے میں کر رہے ہیں۔ ان کا جو کچھ انجام ہوا یا ہو سکتا ہے اس کی داستان بھی آپ سن چکے۔

لیکن بجائے ازالہ کے امالہ کی جن تدبیروں کا قرآنی تعلیمات اور اسلامی ہدایات کی روشنی میں جو پتہ چلتا ہے، آئیے اور انہیں بھی دیکھئے، بات چونکہ نئی ہے، اس لئے پڑھنے والوں سے فکر و صبر کی اگر میں توقع کروں تو غالباً بیجا نہ ہوگا۔

(۱)

پہلا سبب اس سلسلہ میں ہمارا فطری ضعف (سابق در حق) تھا۔ پہلے اسی پر غور کیجئے۔

آدمی کا جسدی حیثیت سے جیسا کہ گذر چکا ضعیف و کمزور ہونا ایک بدیہی مشاہداتی حقیقت ہے، کہنے والے انسان کو جو ضعیف البنیان کہتے ہیں، ظاہر ہے کہ اسی بنیاد پر تو کہتے ہیں۔ بنیادی طور پر کوئی شبہ نہیں کہ خاکدان ارضی کی زندگی اور زندگی کی ضروریات رکھنے والی دوسری ہستیوں کے مقابلہ بظاہر ہماری یہی سب سے بڑی کمزوری ہے، مقابلۃً [illegible] اس کا مفصل قصہ سنایا جا چکا ہے۔

لیکن [illegible] تو ہمارے بنیان (جسمانی بناوٹ) [illegible] ہٹ کر اسی آدمی کی ذہانتی اور ذہنی صلاحیتوں پر غور کیجئے، جو باہر سے [illegible] ساز و سامان معلوم ہوتا ہے۔ کیا اندر سے بھی وہی ہے جیسا باہر سے سمجھا جاتا ہے؟ جو واقعہ ہے۔ اگرچہ ہم و بیش ہر جاننے والا اسے جانتا ہے۔ لیکن میرے سامنے اس وقت صرف قرآنی اشارات ہیں۔ اس سوال کا جواب بھی قرآن ہی کی راہنمائی میں دینا چاہتا ہوں۔

عجیب بات ہے، اسلام کی آسمانی کتاب کا سب سے پہلا حصہ جو دنیا میں نازل ہوا اس حصہ میں بھی اگر غور کیا جائے تو [illegible] میں سمجھتا ہوں اس سوال کا جواب مل سکتا ہے یعنی غارِ حرا کی پہلی وحی کے ان آخری فقرے

علم الانسان ما لم یعلم — اور سکھا دیں خدا نے انسان کو وہ باتیں جنھیں وہ نہیں جانتا۔

کی طرف پڑھنے والوں کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں۔ بظاہر شاید یہی سمجھا جاتا ہے کہ اپنی لامحدود نعمتوں میں سے ان الفاظ کے ذریعے سے ایک خاص نعمت (علم) کو یاد دلا کر حق تعالیٰ نے بندوں پر اپنا احسان جتلایا ہے، ہاں یہ بھی بڑا احسان ہے اور حق ہے کہ محسن اپنے اس احسان کو جتلائے۔ لیکن یہ تو ایک عام بات ہوئی، غور کرنے کی چیز تو محل و مقام کی خصوصیت، نیز وہ الفاظ ہیں جن سے اس نعمت کا اظہار فرمایا گیا ہے، طول کلامی کے الزام سے پھر ڈر رہا ہوں لیکن جو کہنا چاہتا ہوں، اگر الزام کے ڈر سے اسی کو چھوڑتا چلا جاؤں، تو پھر لکھنے کی اس دردسری کے خریدنے کی حاجت ہی کیا تھی، قرآن میں تو سب ہی کچھ لکھا ہوا ہے، خواہ اسے سمجھا اور سمجھایا جائے یا نہ سمجھا جائے نہ سمجھایا جائے۔

میرا اپنا ذاتی خیال یہ ہے کہ قرآن کا نزول عربی زبان میں شروع ہوا تھا کہ عربی جن کی مادری زبان ہے، ان کے لئے بھی، اور جن کی مادری زبان عربی نہیں ہے، ان کے لئے بھی۔ الغرض بنی آدم کے تمام گھرانوں، ہر ملک، ہر قوم کے ہر ہر فرد کے لئے رہتی دنیا تک اس کو آخری پیغام بنایا جائے۔

اس پر لکھا ہوا سوال ہو سکتا تھا اور اسے ہونا ہی چاہیے کہ عربی جن کی زبان ہے ان کے لئے تو عربی میں اترنے والا یہ پیغام پیغام بن سکتا ہے، لیکن جن بیچاروں کی زبان عربی نہیں ہے، ان کو عربی زبان کا مخاطب بنانا کیا قرین انصاف ہو سکتا ہے۔ اسلام کے عمومی پیغام ہونے پر پہلا اعتراض یہی ہو سکتا تھا جہاں تک میں سمجھتا ہوں اعتراض سے پہلے ہی اس کا جواب پہلی وحی کے اس فقرے میں دیدیا گیا ہے۔ توجہ دلائی گئی ہے کہ انسان اور غیر انسانی انواع میں یہی تو فرق ہے کہ آدمی کے سوا جاننے والی علم و احساس رکھنے والی جتنی ہستیاں ہیں، ان کی یہ خصوصیت ہے کہ سیکھنے سکھانے یا اکتساب و تعلیم کے بغیر شکم مادر ہی سے چند خاص جبلی الہامات کہیے یا احساسات یا معلومات اپنے ساتھ لاتی ہیں۔ ان میں جو جب تک جیتا ہے، اپنی پوری زندگی ان ہی چند گنے چنے مقررہ الہامات و فطری احساسات ہی کے تحت گذارتا ہے، بط کا بچہ انڈے سے نکلتا ہے، سکھانے والوں سے قطعاً کچھ سیکھے بغیر دیکھا جاتا ہے کہ پانی میں قدم رکھنے کے ساتھ ہی تیرنے لگتا ہے۔ شناوری یقیناً ایک علمی کمال ہے، جو بط کے بچوں کو بخشنے والے کی طرف سے بخشا جاتا ہے۔ لیکن اس کے بعد دیکھئے کہ بط کی ابتدا بھی اسی کمال سے ہوتی ہے، اور بوڑھی ہو کر جب کوئی بط مرتی ہے، تو اس وہی کمال کے سوا اس کی پوری زندگی میں کسی اکتسابی کمال کا قطعاً ذرہ برابر بھی اضافہ نہیں ہوتا، اور بط تو ایک مثال ہے، ورنہ غیر انسانی جاندار اور علم و احساس رکھنے والے حیوانوں میں سب کا ہر ایک کا یہی حال اور قطعاً یہی حال ہے، ان کے لئے قدرت کا یہی قانون ہے جس چیز کے عالم بنا کر وہ پیدا کئے جاتے ہیں، خواہ وہ علم جتنا بھی دقیق، جتنا بھی پیچیدہ ہو، ان مہندسانہ چابکدستیوں ہی کا علم کیوں نہ ہو شہد کی مکھیاں جس کی مدد سے ان چھتوں اور محلوں کو بناتی ہیں، جن کی انجینئری نادرہ کاریوں کو دیکھ دیکھ کر ریاضیاتی عقول والے بھی چکرا گئے ہیں، بیا جیسی چڑیا، یا جونک جیسے کیڑوں کے وہ فطری احساسات

ہیں یعنی جن کی بدولت پیش آنے سے پہلے طوفانی ہواؤں یا بیماریوں کی نوعیت اور ان کے بہاؤ کی سمت کا ان پر انکشاف ہو جاتا ہے۔

مگر با ایں ہمہ ان میں ہر ایک کا علم انہی معلومات اور انہی احساسات تک محدود رہتا ہے قطعاً انہی تک محدود رہتا ہے جنہیں بھرنے والا پیدا ہونے سے پیشتر ہی ان کی جبلتوں میں بھر دیتا ہے اسی لئے جس وقت پیدا ہوتے ہیں۔ اس وقت بھی ان کا سرمایہ یہی ہوتا ہے اور جس دن مرتے ہیں کسی قسم کا کوئی مزید اضافہ اس سرمایہ میں نہیں ہوتا۔

لیکن اسی کے مقابلے میں بنی آدم یا الانسان کو دیکھئے، جیسا کہ میں نے عرض کیا۔ پیدا تو ہوتا ہے بے سروسامانی جہل و نادانی کی انتہائی نقائص و عیوب میں لتھڑا ہوا، لیکن اسی کے ساتھ اس کی اس عجیب و غریب حیرت انگیز صلاحیت و قابلیت کا کون انکار کر سکتا ہے، جو نہ جانی ہوئی چیزوں کے جان لینے اور سیکھ لینے کی اس میں قدرتی طور پر پائی جاتی ہے۔ بلاشبہ وہ جس وقت شکم مادر سے نکلتا ہے، شاید اس وقت کچھ نہیں جانتا، یا جو کچھ جانتا ہے۔ وہ نہ جاننے کے برابر ہوتا ہے۔ مگر جیسے جیسے وہ آگے بڑھتا ہے، جانتا چلا جاتا ہے، سیکھتا چلا جاتا ہے، انہی باتوں کو جانتا چلا جاتا ہے سیکھتا چلا جاتا ہے، جنہیں وہ نہیں جانتا تھا، قطعاً نہیں جانتا تھا، مالم یعلم (جسے انسان نہیں جانتا) انہی کے متعلق علّم (سکھاتا ہے اس کو) کے عمل کے قبول کرنے کی جو فطری صلاحیت آدمی میں پائی جاتی ہے، قرآنی آیت علم الانسان مالم یعلم میں جہاں تک میرا خیال ہے اسی کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے۔ اور یہی جواب ہے اس سوال کا کہ جو عربی نہیں جانتے ہیں وہ بھی عربی زبان میں آئے ہوئے پیغام کی صحیح مخاطب اور اس کے سمجھنے، اس پر عمل کرنے کے مکلف کیسے بنائے جا سکتے ہیں، نہ جانی ہوئی چیزوں کے سیکھنے اور جاننے کی صلاحیت ہی جس کی فطرت کی سب سے بڑی خصوصیت ہے۔ کیا بنی آدم کی اس عجیب و غریب تعلیمی قابلیت پر متنبہ ہونے کے بعد اس بیجا سوال کی جرأت وہ کر سکتا ہے؟

خیر یہ تو ایک ذیلی بحث تھی، اس مسئلہ کے خصوصی تفصیلات کا مقام دوسری جگہ ہے۔ یہاں تو صرف اتنا بتانا ہے کہ باہر سے جو ضعف اور کمزوریوں، انتہائی کمزوریوں کے حال میں پیدا ہوتا ہے۔ تعلم و اکتساب یعنی نہ جانی ہوئی چیزوں کے جاننے کی صلاحیت ہی کی بدولت دیکھا جا رہا ہے کہ سارے زور آوروں کو اپنے آگے بے زور بنائے ہوئے ہے۔ ہاتھیوں کو جھکائے ہوئے ہے، اونٹوں کو دبائے ہوئے، سانڈوں کو سدھائے ہوئے ہے، شیروں کو پھنسائے ہوئے ہے، وھیلوں کا شکار کر رہا ہے، گینڈوں کو ملتا رہا ہے، اور یہاں کون ہے جو اس کی دہائی نہیں پکار رہا ہے۔

بہرحال کوئی شبہ نہیں کہ پیدا ہونے کے وقت تو آدمی زیادہ عقل و خرد ہوش و تمیز سے بیگانہ ہو کر پیدا ہوتا ہے۔ اس کی حیثیت ابتداً گوشت کے ایک زندہ مضغہ اور ناتراشیدہ کندے ہی کی ہوتی ہے لیکن جب مرتا ہے تو ان ہونے والوں میں کب نہیں دیکھا گیا اور کب نہیں دیکھا جا رہا ہے، روزمرہ آئے دن دیکھا جا رہا ہے، ہر جگہ دیکھا جا رہا ہے کہ ان میں کتنے ہی مدبر، حکیم، ڈاکٹر و طبیب، ماہر و تجربہ کار ہو کر مرتے ہیں۔

سچ تو یہ ہے کہ انسان کی ساری سحر انگیزی کرشمہ سازیاں کائنات کے گوشہ گوشہ میں خاک و آب و آتش و باد کے ہر طبقہ میں جو نظر آ رہی ہیں یہ سارے تماشا ساری تفسیر قرآن کی آیت

علم الانسان مالم یعلم   سکھایا انسان کو وہ جو

وہ نہیں جانتا۔

ہی کے چند لفظی فقرے کی ہی ہیں۔ الفتہ لو "الفتہ" بنانے کا یہی باطنی سلیقہ ہی تو آدمی کا ہے جس میں اس کی ساری اختراعی کارفرمائیوں۔ اور ایجادی نادرہ نمائیوں کی ضمانت پوشیدہ ہے۔

علم آدم الاسماء کلھا   سکھایا آدم کو اللہ نے سارے چیزوں کے نام

کے تعلیمی عمل کے بعد الاسماء کے بتانے کا مطالبہ کر کے اور آدم سے جواب سنوا کر فرشتوں کو جو ملزم ٹھیرایا گیا تھا، تو دلوں میں یہ وسوسہ ہو کہ بتانے کے بعد امتحان امتحان کب باقی رہا۔ حالانکہ یہی تو سمجھنے کی بات تھی، آدم یا الانسان میں تعلیم کے قبول کرنے، نہ جانی ہوئی باتوں کو سکھانے کے بعد سیکھ لینے کی جو صلاحیت ہے اسی کی نمائش مقصود تھی، وہ سکھایا گیا اور اس نے سیکھ لیا، سیکھنے کے بعد سیکھی ہوئی بات کو اس نے بتا دیا، یہی تو آدمی کا کمال ہے، ایسا کمال ہے، جو صرف اسی کا کمال ہے، آدمی کے سوا اخفش ہی کا بز کیوں نہ ہو، چونکہ وہ بز ہے آدمی نہیں ہے اس لئے اخفش جیسے معلم کی تعلیم بھی اس میں علم منتقل نہ کر سکی۔ اس قرآنی حقیقت کے واضح ہو جانے کے بعد اب غور کیجئے، اس پر غور کیجئے کہ بنیادی ضعف

[illegible]

[illegible]

فاضل نے ان الفاظ میں تمنا کی ہے۔

"اگر آج دنیا میں ہر شخص کو یہ زنی کہ گا وہ اٹھا ہاتھ آ جائے جس سے وہ اپنے تمکنے کے اندر یا ٹوکرے کے نیچے سے جو چاہتا ہے نکال لیتا ہے۔" (ص ۹۹ مقصد و منہاج۔ از ڈاکٹر ذاکر حسین خاں)

یعنی خواہش، مجرد خواہش، کے ساتھ جو چاہا جاتا وہی پورا ہوتا رہتا، انسان ایسی قوت لے کر اگر دنیا میں قدم رکھتا۔ تو اس میں شک نہیں کہ دنیا بجائے دنیا ہونے کے بنی بنائی گویا جنت ہی ہو جاتی۔ لیکن سوچنے کی بات یہ ہے کہ جن انسانی کمالات کی تماشا گاہ آج یہ غیر بہشتی دنیا بنی ہوئی ہے، کیا بن سکتی تھی، واقعہ تو یہ ہے کہ کہنے کی حد تک تو اس کا نام بھی شائد دنیا ہی پڑتا۔ اور مذاہب میں بیان بھی کیا گیا ہے کہ انسان ہی کے آگے زندگی کے کسی آئندہ دور میں ایک ایسا عالم بھی پیش ہوگا، جہاں وہی ہوگا، جو چاہا جائے گا، وہی ملے گا جو مانگا جائے گا۔ لیکن کھلی ہوئی بات ہے کہ یہ انسان اور انسانی کمالات کی نمائش نہیں، بلکہ دینے والے کی قدرتوں اور قوتوں کا ظہور ہوگا۔ پر ایسی دنیا جہاں سے

تو شب آفریدی چراغ آفریدم   سفال آفریدی ایاغ آفریدم

بیابان و کہسار و راغ آفریدی　　خیابان و گلزار و باغ آفریدم
من آنم کہ از سنگ آئینہ سازم
من آنم کہ از زہر نوشینہ سازم　　(اقبال مرحوم)

کے دو متقابل کمالات کا مظاہرہ مسلسل ہو رہا ہو، ہوتا چلا جا رہا ہو، اس کا تماشا تو اسی دُنیا میں ہو سکتا تھا، جہاں بیچارگیوں میں چارہ سازیوں، مجبوریوں میں مختاریوں کی نمائش کا موقعہ انسان کو مل رہا ہے۔

اگرچہ سچ تو یہی ہے کہ خُدا کی کسی مخلوق کے کمالات کا ظہور بالآخر خُدا ہی کے کمالات کا ظہور بن جاتا ہے، انسانی کمالات بھی خُدائی کمالات ہی کی آئینہ برداری کا کام انجام دے رہے ہیں۔ مگر اس طور پر کہ آیتِ قرآنی

لقد کرمنا بنی آدم وحملناھم	ہم نے عزت عطا کی آدم کے بچوں کو اور
فی البر والبحر۔	سوار کیا ہم نے ان کو خشکی و تری میں۔

کی تفسیر بھی ساتھ ساتھ ہوتی چلی جا رہی ہے، انہی کمالات کے ساتھ ساتھ انسان کے تکریمی مقامات کا راز بھی مسلسل بے نقاب ہوتا چلا جا رہا ہے۔

اور یہ ہے آدمی کے بنیادی ضعف اور جسدی بے سروسامانی کے عیب و نقص کی تکمیل کی وہ قدرتی شکل کہ اسی کی بدولت انسان کا یہی نقص، اس کی یہی کوتاہیاں بشری کمالات کے ظہور و بروز کے ذرائع بنی ہوئی ہیں، یقیناً کوئی شبہ نہیں کہ پیدا ہونے اور رہنے کی حد تک تو یہاں سب ہی پیدا ہو رہے ہیں، سب ہی رہ رہے ہیں، قوی ہیکل، بڑے بڑے تن و توش والے، چنگلوں والے، کھروں والے، پروں والے، اور کیا کیا والے، لیکن آپ نے دیکھ لیا جو جس حال میں پیدا ہو رہا ہے اسی حال میں مر رہا ہے جس حال میں آ رہا ہے اُسی حال میں جا رہا ہے، لیکن ایک، صرف ایک آدم زاد ہے کہ جاہل پیدا ہوتا ہے ناقص پیدا ہوتا ہے، بے زور، بے نوا پیدا ہوتا ہے، لیکن جب مرتا ہے تو عالم ہو کر مرتا ہے، کامل ہو کر مرتا ہے، اور جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے تو یہ انسان کی اسی تعلیمی صلاحیت کا نتیجہ جس میں کوئی دوسرا اس کا ساجھی، شریک و سہیم نہیں، لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی واقعہ ہے کہ بنیادی ضعف کا احساس، اپنی بے سروسامانی و بے نوائی کی کیفیتوں کا تاثر آدمی میں جتنا زیادہ بڑھتا جاتا ہے، تجربہ شاہد ہے، مشاہدہ بتا رہا ہے کہ اسی نسبت سے اس کی تعلیمی صلاحیتوں کا پہلو بھی زیادہ بیدار، زیادہ اجاگر ہوتا چلا جاتا ہے اور یہی ہے انسان کے جسدی ضعف اور بنیادی کمزوریوں، ناتوانیوں کے استعمال کی صحیح راہ یا ان کے ازالہ کی صحیح تدبیر جس سے بجائے نقصان کے نت نئے منافع کے دروازے اس پر کھل سکتے ہیں، واقعات بتا رہے ہیں کہ جن قوموں میں اپنے اس ضعف کا احساس جس حد تک شدت پذیر ہوتا چلا گیا ہے، اسی حد تک اس قدرتی ضعف کی تلافی میں ان کی تعلیمی صلاحیتوں یا انجانی باتوں کے جاننے کا شوق تیز سے تیز تر ہوتا رہا ہے[1] اور یوں ہمارا یہ

---

[1] جنگلی قبائل وپسماندہ اقوام کی پسماندگیوں کی بڑی وجہ اسی احساس کی کمی ہوتی ہے، اسی نے ان کی تعلیمی صلاحیتوں کو اُبھرنے کا موقعہ نہیں دیا۔

ضعف دوسروں کی قوت وطاقت سے قیمتی کتنا زیادہ قیمتی بن جاتا ہے یقیناً وہ بڑائیاں جو نسلِ انسانی کو آج حاصل ہیں تعلیمی صلاحیت رکھنے کے باوجود بھی شاید ہی عرصہ ظہور پر جلوہ گر ہوتیں۔ اگر ہم بھی بجائے ضعف کے اسی طرح قوت لے کر پیدا ہوتے، جیسے انسان کے سوا دوسرے لے لے کر پیدا ہو رہے ہیں۔ دیکھا آپ نے امالہ کی اس ترکیب کی نادرہ نمائی کہ انسانی فطرت کی ساری کوتاہیاں اس کی حیرت انگیز اولوالعزمیوں کی گویا مقدمہ بن جاتی ہیں۔

(۲)

دوسری چیز اس سلسلہ کی رزقی سرمایہ کی محدودیت وعدم مبسوطیت کے ساتھ ہماری فطرت کی ہلوعیت یا تکثر کے حب کی شدت وانتہا پسندی تھی، عرض کرچکا ہوں کہ موجودہ زندگی کی کلفتوں میں بڑا ہاتھ عدم انطباق کی اسی کیفیت کا ہے۔ انسانی فطرت صبر اور سیری کی صفت سے محروم بنا کر پیدا کی گئی ہے۔ اور معاشی سرمایہ جس پیمانہ پر یہاں پیدا ہو رہا ہے، خواہ دیکھنے میں وہ جتنا بھی نظر آئے۔ لیکن قدرت کا یہ اٹل قانون ہے کہ مجموعی حیثیت سے بسط وفراخی کی کیفیت اس سے کبھی پیدا نہیں ہو سکتی۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ ہم میں کوئی ہو، ہر ایک یہی محسوس کر رہا ہے کہ اس کی چاہ پوری نہیں ہو رہی ہے، غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ زیادہ تر ہماری اندرونی جھنجھلاہٹوں کا تعلق اسی صورتِ حال سے ہے، جسے دیکھئے، جہاں دیکھئے، جس طرف دیکھئے یہی آواز آ رہی ہے کہ

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے — بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

اسی چیز نے انسانی زندگی کو ایک طوفان بنا دیا ہے، ایسا طوفان کہ ہر جینے والا یہی کہتے ہوئے مر رہا ہے

زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے — ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے

ہمارے شاعروں نے اسی کی تصویر مختلف الفاظ میں کھینچی ہے۔ حیات کی یہ قید ان کو کبھی غم کا پھندا اور بند نظر آتا ہے۔ اسی لئے

"قیدِ حیات و بندِ غم" اصل میں دونوں ایک ہیں

کا فیصلہ کیا جاتا ہے۔ کبھی یہی غالبؔ "زندگی" کو "سوز" اور "سوز" کو "زندگی" بتاتے ہوئے بالآخر اس حقیقت کے اعلان پر کہ

غمِ ہستی کا اسدؔ کس سے ہو جز مرگ علاج — شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

اپنے آپ کو مجبور پاتا ہے۔ "زندگی" کسی قالب اور کسی رنگ میں ہو غالبؔ کی نگاہوں میں وہ جلتی ہوئی ایک شمع ہے۔ کسی رنگ کی چمنی اس پر چڑھائی جائے۔ سبز ہو یا سرخ۔ لیکن جب تک روشن ہے جلے گی۔ اور جب تک جلتی رہے گی اسی وقت تک وہ روشن ہے، شیراز کے عارف کو تو کھل کر یہ کہنا پڑا کہ

ز بُلبل از دلِ غمت نیست ز بلبل در باغ — ہمہ را نعرہ زناں جامہ دراں می داری (حافظ)

الغرض بے چینی اور اضطراب، کرب وتکلیف کی اس کیفیت کا احساس موجودہ زندگی میں سب ہی کو ہو رہا ہے۔ انفرادی طور پر ہو سکتا ہے کہ اس میں استثناء بھی ہو جیسے ہر کلیہ میں استثنا بھی ایک کلیہ ہی، لیکن اضطراب وبے چینی، کرب وتکلیف کے عام ہنگاموں میں ٹٹولنے والوں کو عموماً یہی کانٹا چھپا ہوا نظر آیا ہے کہ سب، سب کچھ چاہتے ہیں لیکن چاہنے والوں کی چاہ کو پوری کرنے کے لئے جو سرمایہ یہاں پیدا ہو رہا ہے۔ وہ ایک ایسے مقررہ محدود پیمانہ پر پیدا ہو رہا ہے جس سے

اس امکان کے تصور کی جیسا کہ گذر چکا یہاں قطعاً گنجائش نہیں، الرزاق کی جن پیداواروں کے متعلق قدرت فیصلہ کر چکی ہے کہ عام بسط کی حالت جس سے پیدا ہو، اس پیمانے پر ان کی پیدائش یہاں نہ ہوگی۔ پھر پیدا کرنے والا جس سرمایہ کو محدود رکھنا چاہتا ہے، اسی کو وہ غیر محدود کیسے بنا سکتے ہیں، جنھوں نے نہ دنیا پیدا کی ہے، نہ دنیا والوں کو پیدا کیا ہے۔ اور بالفرض مان بھی لیا جائے کہ "آج" نہیں تو "کل" ایسا ہو کر بھی اگر رہے گا تو آنے والی نسلوں کے مطمئن ہو جانے سے یہ بتایا جائے کہ موجودہ نسلوں کی غیر تشفی یافتہ خواہشوں کو کیسے اطمینان بخشا جا سکتا ہے، زید کے تندرست ہو جانے سے غریب عمرو کی بیماری کیسے اچھی ہو جائے گی۔ مستقبل کی ان بشارتوں میں آپ ہی بتائیے کہ حال والوں یا ان کے لئے جو کڑھتے اور جھینکتے، چلاتے اور کراہتے ہوئے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر اب تک مرتے چلے گئے، مر رہے ہیں، مرتے چلے جائیں گے ان مسکینوں کا تسکین کے ان مغالطوں میں کیا حصہ ہے؟

میری تو سمجھ میں نہیں آتا کہ ہندوستان کے رہنے والوں کے مشکلات کا صحیح حل اگر یہ واقعہ نہیں ہو سکتا کہ امریکہ یا ارجنٹائن، برازیل یا ٹمبکٹو کے باشندے ان مشکلات میں مبتلا نہیں ہیں، پھر جیسے ایک جگہ کے رہنے والوں کی خوش حالیوں سے دوسرے مقام والوں کی بدحالیوں کی تلافی نہیں ہو سکتی تو ایک عہد کی نسلوں کی تلخیوں کا علاج آپ آنے والے دوسرے عہد کی نسلوں کی شیریں کامیوں یا شیریں کامیوں کے وعدوں صرف وعدوں سے کیسے کر سکتے ہیں؟ آپ جہنم میں رہنے والوں کو یہ سنا سنا کر کیا خوش کر سکتے ہیں کہ ان کے پوتے "جنت" میں پیدا ہوں گے اور دوسروں کی مسرتوں ہی سے اگر ہم اپنی کلفتوں کے ازالہ میں کامیاب ہو سکتے ہیں تو مستقبل کے مشکوک بے بنیاد اوہامی وعدوں کی کیا ضرورت ہے؟ آپ ہی کے سامنے اسی زمانے میں ہر جگہ، ہر علاقہ اور ہر خطہ میں تشفی یافتہ فطرتوں کی کیا کمی ہے، بتا چکا ہوں کہ انسان سکینت و طمانیت کی جس کیفیت کے لئے تڑپ رہا ہے یہ مرہم تو ان تمام زندہ ہستیوں کو مفت بغیر کسی کد و کاوش، دردسری اور محنت کے حاصل ہے جو انسان جن کر دنیا میں نہیں پیدا ہوئے ہیں، دوسروں کا اطمینان ہی اگر آپ کو مطمئن کر سکتا ہے تو شاخساروں پر چہچہانے والی چڑیوں، جوئباروں میں تیرنے والی مچھلیوں، اور مرغ آبیوں، مرغزاروں میں کلیلیں بھرنے والے ہرنوں کو دیکھ دیکھ کر بجائے آئندہ نسلوں کے ادھار وعدوں کے اطمینان کی اس نقد دولت کو کیوں حاصل نہیں کرتے۔ مستقبل کے "شنیدہ" مواعید سے آپ کی فطرت اگر خنکی حاصل کر سکتی ہے تو انسان کے سوا ہر دوسری زندہ ہستی "دیدہ" کی شکل میں آپ کے سامنے اسی وقت اسی کیفیت کو تقسیم کر رہی ہے، جب دوسروں ہی کا سکون آپ کا سکون بن سکتا ہے تو پھر دوسروں میں خصوصیت پیدا کرنے کے کیا معنی؟

خیر کہاں تک کہتا چلا جاؤں۔ اور جنھوں نے قرآنی صداقتوں کے مطابق زندگی گذارنے کا عہد نہیں کیا ہے، سچی بات تو یہ ہے کہ میرا ان سے خطاب بھی نہیں ہے۔ فضا میں جو مغالطے پھیلا دیئے گئے ہیں، شعوری یا غیر شعوری طور پر دیکھتا ہوں کہ مسلمانوں میں بھی ان کے جراثیم کسی نہ کسی طرح پیوست ہوتے چلے جا رہے ہیں، اس لئے جہاں تک کہہ سکتا ہوں، کہہ دیتا ہوں، ورنہ ایک سیدھے سادھے مسلمان کے لئے یہی کافی ہے کہ الرزاق یا انسان کے معاشی ذخیروں کی پیدائش کا پیمانہ قرآن کی رو سے اس دنیا میں غیر محدود نہیں

غیر محدود شکل اختیار نہیں کرسکتا، اس کی عدم مسؤلیت اور محدودیت کا جو حال آج ہے وہی کل بھی رہے گا اور جب تک یہ حال ہے۔ الخیر کے حب شدید کے روگی اور ہلوعیت و عدم سیری و بے صبری کے عارضہ میں اس مبتلا انسان کی بے چین فطرت، اپنی لامحدود خواہشوں کو معاشی پیداواروں کے محدود سرمائے پر منطبق نہ پاکر ہمیشہ بے کلی اور بے چینی کی اسی حال میں تڑپتی پھڑکتی رہے گی۔

قانون ازالہ کی راہوں سے علاج کرنے والوں نے آپ دیکھ چکے کہ معاشی زندگی کی اس پیچیدگی کو کتنی اہمیت دے رکھی ہے۔ زور آزمائیوں کی ساری تدبیروں کو وہ ختم کر چکے، اور جو باقی ہیں، انھیں بھی ختم کر رہے ہیں۔

لیکن اسلام نے بجائے ازالہ کے امالہ کی جو راہ اس سلسلہ میں بھی اختیار کی ہے۔ وہ کتنی سادہ، کتنی آسان، کتنی سہل الوصول ہے، ایسی راہ کہ سننے کے بعد ممکن ہے کہ کہنے والے کہہ اٹھیں کہ یہ تو بالکل سامنے کی بات تھی، ایسی بات جس سے کون ناواقف ہے، اور یہی میں بھی کہنا چاہتا ہوں کہ آسانیوں کو غلط کاروں اور غلط فہموں نے کیوں دشوار بنا لیا، قدرت ظالم نہیں ہے۔ اپنے بندوں کے لئے وہ رحم اور صرف رحم ہی رحم ہے، کیا یہ سمجھ میں آنے کی بات ہے، کہ سب سے زیادہ مکرم و محترم بنا کر جو پیدا کیا گیا ہے۔ تمام تقویموں میں سب سے احسن سب سے اچھی تقویم میں جو ڈھالا گیا، امانت اور خلافت کی خلعت سے جو سرفراز کیا گیا، ایک لمحہ کے لئے کوئی باور کر سکتا ہے کہ قصداً و ارادۃً ایک ایسی زندگی اسی کے گلے میں لٹکا دی گئی جو جہنم بن کر اسے لپٹ گئی، ایسی جہنم جس میں وہ جھلس رہا ہے، تڑپ رہا ہے، جل رہا ہے، بھن رہا ہے۔ اور اس طور پر جل بھن رہا ہے کہ علاج کی ساری تدبیریں اس عذاب سے نکلنے اور نکالنے میں بے کار ثابت ہو رہی ہیں۔ ذہنی ارتقاء اور عقلی عروج کا انتہائی زمانہ جس عہد کو انسانیت کے لئے ٹھیرایا جا رہا ہے، اس عہد میں بھی آئندہ نسلوں کے متعلق استقبالی وعدوں کی جھوٹی طفل تسلیوں کے سوا علاج کی کوئی دوسری تدبیر اب تک کسی کی سمجھ میں نہیں آئی ہے اور نہ آنے کی امید ہے بہر حال بجائے ازالہ کے امالہ کی جس عجیب و غریب تدبیر کو میں اسلام کی طرف جو منسوب کر رہا ہوں آپ نے سمجھا؟ میں کیا کہہ رہا ہوں، کیا کہنا چاہتا ہوں؟

حقیقت تو یہ ہے کہ میں الدین یا مذہب کے نظام ہی کو اسی امالہ کی واحد بے خطا تدبیر سمجھتا ہوں خود ہی سوچ لیجئے، مذہب کس چیز کا نام ہے؟ یہی نا کہ زندگی کے موجودہ دور کو جس کا نام قرآنی اصطلاح میں الحیوۃ الدنیا ہے۔ اسی الحیوۃ الدنیا کو لامحدود قدرت و قوت رکھنے والے خالق کی مرضی کے مطابق اس لئے گذارنا، تاکہ خالق کی لامحدود قوتیں بھی انسانی مرضی کے مطابق ہو جائیں، یعنی وہی

رضی اللہ عنھم و رضوا عنہ   راضی ہو گیا اللہ ان سے اور راضی ہو گئے وہ اللہ سے۔

جس کا قرآنی خلاصہ ہے جن لوگوں سے زیادہ اعتماد انسانیت کی تاریخ میں کسی کو حاصل نہیں ہوا یعنی حضرات رسل علیہم السلام ان ہی کی اعتمادی حقیقتوں کو ذریعہ بنا کر ہر ملک اور ہر قرن میں جو چیز مذہب کے نام سے

پیش ہوتی رہی ہے، کون نہیں جانتا کہ اس کا حاصل یہی ہے، مذہب جس چیز کا نام ہے یہ تو اس کا حاصل ہوا لیکن آپ نے یہ بھی سوچا کہ لامحدود خواہشوں سے لبریز فطرت کے ساتھ مذہب کے اس پیغام کو جوڑنے کا نتیجہ کیا نکلا؟

کوئی سمجھے یا نہ سمجھے۔ لیکن ہوا یہی کہ دنیا کی معاشی پیداواروں کی محدودیت و عدم مسوٴلیت کی وجہ سے لامحدود مطالبوں والی انسانی فطرت میں بےچینی اور بےاطمینانی کے جو انگارے دہک رہے تھے۔ مذہب کے اس پرزے کو جوڑنے کے ساتھ ہی محدود سے ہٹ کر انسانی فطرت کا رخ لامحدود کی طرف اچانک پھر گیا، انسانی فطرت کے مطالبے نہ پوری ہونے والی تمناؤں کی شکل اختیار کر کر کے آدمی کو جو تڑپا رہے تھے، شاداب بڑھتی ہوئی امیدوں، اور ارمانوں کے پھول جن بن کر وہیں جہاں آگ صرف آگ بھری ہوئی تھی، شگفتہ و تر و تازہ تختوں سے بھرا ہوا باغ بن گیا جس سے زیادہ بھروسہ کسی دوسرے پر نہیں کیا جا سکتا، حتیٰ کہ خود اپنی آنکھوں اپنے کانوں پر بھی نہیں، ان ہی غیر مشکوک قطعی علمی ذرائع (رسل اللہ) کی راہوں سے انسانی فطرت اور اس کے لامحدود مطالبوں کا امالہ ایک ایسی عجیب دعزیب شکل میں مذہب کے ذریعہ سے ہو جاتا ہے کہ اس کی ساری بےچینیاں، چین کی، اور ساری پریشانیاں، سکون و عافیت کی بیڑھیاں بن جاتی ہیں۔ فطرت کے ان لامحدود مطالبوں کے استعمال کی صحیح قدرتی راہ یہی ہے، ان مطالبوں کو ہمارے اندر بھرنے والے نے اسی استعمال کے لئے بھرا تھا۔ پھر جو ہاتھ سے پاؤں کا، اور پاؤں سے ہاتھ کا کام لے کر دکھ اور اذیت محسوس کرتا ہے۔ اس کا الزام استعمال کے غلط طریقوں کو اختیار کرنے والوں پر ہے، نہ کہ اس پر جس نے ہاتھ اور پاؤں کی نعمتوں سے ہمیں سرفراز فرمایا ہے۔ مذہب اسی امالہ کا ذریعہ اور صحیح آسمانی مشورہ ہے۔ یوں تو یہ بالکل ایک واضح اور کھلی ہوئی بات ہے۔ لیکن بدیہیات پر بھی کبھی تنبیہ کی جاتی ہے، قرآن پڑھیے، ان تنبیہوں کے اشارے بھی اس میں آپ کو ملیں گے!

قرآن مجید کی وہی آیت کریمہ جس کا پہلے بھی ذکر گذر چکا ہے، یعنی الشہوات کے حُب دگوارائی کو قدرت ہی نے انسانی فطرت کے لئے مزین و آراستہ کیا ہے۔ اسی سلسلے میں بعض اہم خواہشوں کی آیت میں تفصیل بھی دی گئی ہے یعنی النساء (عورت) البنین (اولاد نرینہ) الذہب والفضۃ (سونے چاندی) کے القناطیر المقنطرۃ (انبار)، الخیل المسومۃ (اصیل نشان زدہ حسین گھوڑے) الانعام (مویشیاں) الحرث (کھیتی باڑی)

تو جہاں ان کا ذکر ہے۔ وہیں یہ بھی بتا دیا گیا ہے کہ اخیر کی طالب انسان کی ہلوعی فطرت دنیا کے اس محدود دسرمایہ اور قلیل متاع سے تشفی یافتہ نہیں ہو سکتی۔ جیسا کہ آل عمران کی اسی آیت کے بعد ارشاد ہے

قل اؤنبئکم بخیر من ذلکم للذین اتقوا عند ربھم جنات	بولئے کیا خبر دوں تمہیں اس چیز کی جو بہتر اور خیر ہے اس سے (وہ چیز یہ ہے) یعنی

تجری من تحتھا الانھار خالدین فیھا وازواج مطھرۃ ورضوان من اللہ واللہ بصیر بالعباد۔
(آلِ عمران ع ۱ پارہ ۳)

جنھوں نے پارسائی اختیار کی، ان کے مالک کے پاس ایسے باغ ہیں جن کے نیچے نہریں جاری ہیں، ہمیشہ رہنے والے ہیں (ان باغوں میں وہ) اور (تمام عیوب و نقائص سے صاف و پاک جوڑے، اور اللہ کی رضامندی، اور اللہ اپنے بندوں کا بینا ہے۔

انسانی فطرت کے لئے حقیقی الخیر دراصل وہی "رضوان من اللہ" یا "اللہ کی رضامندی" ہے، یعنی لامحدود قدرت وطاقت والے کا انسانی فطرت کے لامحدود احساسات اور خواہشوں کے ساتھ کامل موافقت وتطابق تام، اسی کا نام "رضوان من اللہ" یا خدا کا راضی ہوجانا ہے، اسی کی تعبیر دوسرے الفاظ میں یوں بھی کی گئی ہے۔

لکم فیھا ما تشتھی انفسکم و لکم فیھا ما تدعون۔

(الخیر والی اس زندگی میں) تمہارے لئے وہ سب کچھ ہے جو تم چاہوگے اور وہ سب کچھ جو تم مانگوگے، (کہ لامحدود قوتوں اور قدرتوں والا، لامحدود طلب رکھنے والے سے راضی ہوچکا ہے، پس اب یہ جو چاہے گا، وہ اسی کو پورا کرے گا)

الجنات، ازواج مطہرات، یا اسی قسم کی اور چیزیں دراصل اسی اجمال کی بعض تفصیلی وتمثیلی شکلیں ہیں، بلکہ حب الشہوات والی آیت کے بعد الخیر کی جن جن شکلوں کا یہاں تذکرہ کیا گیا ہے، بہ ظاہر اس کا مطلب یہی ہے کہ موجودہ زندگی میں انسانی فطرت کے اندر لامحدود تمناؤں کی جو بھٹی جوڑی گئی ہے، اور محدود شکلوں میں بعض آرزوئیں یہاں آدمی کی جو پوری ہوجاتی ہیں، تو غرض اس سے یہی ہے کہ آئندہ کی لامحدود طلب کا جذبہ آدمی میں پیدا ہو، پیاس بھی ہے اور پیاسے کو پانی کے چند گھونٹ پلا بھی دیئے گئے ہیں، پینے کی اس لذت سے مانوس ہولے، بلکہ پیاس کے بھڑک اٹھنے کے بعد اس وقت تک جب تک اس پیاس کی کامل تسکین کا سامان نہ ہوجائے۔ ظاہر ہے کہ پیاسے کو نہ قرار مل سکتا ہے اور نہ اسے ملنا چاہیئے۔ پس آرزوؤں اور تمناؤں کے گلا گھونٹنے کی راہ جیسا نہ جوگیانہ تدبیریں فطرت کے قانون سے جیسا کہ گذر چکا کھلا ہوا مقابلہ ہے۔ صحیح راہ یہی ہے کہ بجائے دبانے اور بجھانے کے ان آرزوؤں کو صحیح رُخ پر لگانے کی کوشش کی جائے، جس کی عملی صورت یہی ہے، اور یہی ہو بھی سکتی ہے کہ اپنی نہ ختم ہونے والی لامحدود تمناؤں اور آرزوں کے متعلق ایک طرف تو یہ قطعی فیصلہ کرلینا چاہیئے کہ متاع الدنیا کے محدود سرمایہ سے ان کی تسکین ناممکن ہے، اور دوسری طرف نکل جانا چاہیئے۔ آدمی کو اس قوت وقدرت کے لازوال سرچشمہ کی تلاش میں جس کی لامحدودیت کی شہادت کائناتی حقائق کا ذرہ ذرہ اپنے لامحدود کمالات کے مظاہرہ سے ادا کررہا ہے۔

دلِ من مسافر من کہ خداش یار بادا،

قرآن ہی میں ایک موقعہ پر الآخرۃ کی زندگی کا ذکر کرتے ہوئے پہلے تو یہ فرمایا گیا کہ

لایبغون عنہا حولا۔ یعنی (الآخرۃ کی بہشتی اور فردوسی زندگی)
سے لوگ منتقل ہونا نہ چاہیں گے۔

اسی کے بعد مشہور آیت ہے

قل لوکان البحر مداداً — بتا دو کہ اگر سمندر بھی روشنائی بن جائے
لکلمات ربی لنفد البحر — میرے رب کے کلمات (کے لکھنے کے لئے)
قبل ان تنفد کلمات ربی ولو — تو سمندر (کا پانی) ختم ہو جائے گا، قبل اس
جئنا بمثلہ مددا — کے کہ میرے رب کے کلمات ختم ہوں، اگرچہ
ہم اس سمندر کے مانند دوسرے سمندر کو بھی لائیں۔

پڑھنے والے پڑھتے ہیں، لیکن مقدم الذکر اور موخر الذکر دونوں آیتوں میں ربط کیا ہے، شاید اس کی طرف کسی نے توجہ نہیں کی، حالانکہ یہاں بھی اسی مسئلہ کا ذکر کیا گیا ہے جسے میں بیان کر رہا ہوں، مطلب یہ ہے کہ فردوسی زندگی سے لوگ منتقل اسی لئے ہونا نہیں چاہیں گے کہ اُس زندگی میں لامحدود کمالات رکھنے والی ذات اپنے ان ہی لامحدود کمالات کو لامحدود کلمات[۱] کے ذریعہ سے ظاہر کرتی رہے گی، انسانی احساسات اپنے ارد گرد، پس و پیش، اندر و باہر ہر لمحہ، ہر لحظہ ایسے نت نئے تجلیات کو مسلسل بغیر کسی انقطاع کے پاتے چلے جائیں گے، جن کی نہ کوئی حد ہوگی نہ انتہا، اور یوں لامحدود مطالبات والی فطرت کو لامحدود مطلوبات سے متمتع اور لذت گیر ہونے کا موقعہ ابدالآباد تک ملتا جائے گا، اس وقت تک جس کی کوئی انتہا نہیں اور جس کا کوئی اختتامی نقطہ نہیں ہے اور یوں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے انسان کی جدت پسند فطرت نو بہ نو شکلوں میں اپنے اس جذبے کی تسکین کا سامان حاصل کرتی چلی جائے گی، گویا ؎

ہر لحظہ جمال خود نوعِ دگر آرائی — شورِ دگر انگیزی، شوقِ دگر افزائی

کا ایک نہ ختم ہونے والا تماشا ہوگا، عجیب تماشا!! اور یہ سب دراصل "رضوان من اللّٰہ" کے حصول میں کامیابی ہی کی تفصیلات ہوں گی جو "المفلحون" (کامیاب ہونے والوں) کے سامنے لامحدود شکلوں میں پیش ہوتے رہیں گے، بس یہ ہے ھلوعیت یا اس جذبہ کی شدت کے امالہ کی صحیح تدبیر جو الخیر کے حُب و طلب کے متعلق آدم زادوں کی فطرت میں قصداً و ارادۃً ان ہی اغراض کی تکمیل کے لئے ودیعت کی گئی ہے، یہی اس کی صحیح قیمت، اور یہی اس جذبہ کا صحیح استعمال ہے۔ واللّٰہ یھدی من یشاء الیٰ صراط مستقیم۔

معاشی مشکلات کے بنیادی اسباب کی آخری چیز رزقی مدارج و مراتب کا وہ اختلاف رہ جاتا ہے، جو افرادِ انسانی کے کمالاتی و صفاتی تفاوت کا قدرتی نتیجہ ہے، جیسا کہ میں نے پہلے بھی اشارہ کیا ہے کہ

---

[۱] کلمات کلمہ کی جمع ہے یہ قرآن کی اصطلاح ہے تخلیقی کاروبار جس ذریعہ سے انجام پا رہا ہے، اُسی کا نام کلمہ یعنی بات بھی ہے، اور اسی کلمہ یا بات کو قرآن نے کہیں "کُن" کے لفظ سے بھی یاد کیا ہے ۱۲

کوفت اور دُکھ کے اس احساس کا بجائے مادی حالات وواقعات کے زیادہ تر اس کا تعلق انسان کے نفسیاتی کیفیات سے ہے، مثلاً ہم اسے یوں بھی سمجھ سکتے ہیں کہ لاکھوں اور کروڑوں کی تعداد، آدمیوں کی جو آج پائی جا رہی ہے، اگر صورتِ حال یہ نہ ہوتی، بلکہ کسی فردِ واحد میں نوعِ انسانی کا ظہور منحصر ومحدود ہو کر رہ جاتا، یعنی دُنیا میں تنہا ایک ہی آدمی اگر پیدا ہوتا، اور اسی حال میں یہاں رکھا جاتا جس حال کو ہم غربت وفلاکت کی انتہائی شکل اس وقت قرار دے رہے ہیں، مثلاً غریزی حرارت جن بدنی اجزا کو فنا کرتی رہتی ہے، صرف ان ہی تحلیل یافتہ اجزاء کا بدل جس قسم کی خوراک اور خوراک کی جس مقدار سے مہیا ہو سکتا ہو، اس سے زیادہ کھانے کے لئے اسے کچھ نہ ملتا۔ اسی طرح موسمی حالات گرمی وسردی سے مقابلہ کرنے کے لئے اس کے پاس بس اتنا ہی سامان ہوتا جس سے صرف جان کا جسم سے تعلق باقی رہ سکتا ہو، ظاہر ہے کہ معاشی ذرائع کا یہ وہ پیمانہ ہے جس سے ہر وہ شخص مستفید ومتمتع ہو رہا ہے جسے اس دنیا میں جینے کا موقع مل رہا ہے، بلکہ جینے کا موقع ملتا ہی اس وجہ سے ہے کہ ان چیزوں سے وہ مستفید ومتمتع ہو رہا ہے۔ خود سوچئے کہ غربت کے ان حالات کے ساتھ اگر آدمی دوسروں کے ساتھ نہیں بلکہ اکیلا تنِ تنہا اس میں پڑا آتا تو آج مدارج کے اختلاف کی وجہ سے پست زندگی والوں میں کوفت کی کیفیت بلند معیار والوں کی زندگیوں کو دیکھ کر جو پیدا ہو رہی ہے۔ کیا پیدا ہو سکتی تھی؟ کھلی ہوئی بات ہے کہ یہ سارا کوفت اور ذہنی دُکھ محض اس پیمائش کا نتیجہ ہے جو ہم ایک کی دوسرے کے مقابلے میں کرنا چاہتے ہیں، پیمائش کے اسی عمل کے بعد ہم میں کوئی چھوٹا اور کوئی بڑا ہو جاتا ہے، اور اسی کے بعد چھوٹوں میں بڑوں کو دیکھ کر وہ کیفیت پیدا ہوتی ہے جو اس حال میں قطعاً پیدا نہ ہوتی اور نہ ہو سکتی تھی، جب پیمائش کا میدان ہی ہمارے سامنے نہ ہوتا۔

مطلب یہی ہوا کہ کوفت وقلق کی یہ کیفیت صرف اضافی انتسابات کا ایک ذہنی اثر وثمرہ ہے۔ فی نفسہ واقعات سے اس کا بہت کم تعلق ہے۔

آخر یوں بھی تو غور کیجئے کہ طبعی عمر (مثلاً ساٹھ ستر سال) کی عمر تک پہنچنے کا موقعہ ہم میں جب امیروں ہی کو نہیں، غریبوں کو بھی مل رہا ہے، اسی طرح طبعی عمر سے پہلے مر جانے کا حادثہ اگر غریبوں کے ساتھ پیش آتا ہے تو امیروں میں بھی اس کی نظیروں کی کمی نہیں ہے، عمر کی جس جس منزل میں ناگہانی اموات سے غریبوں کو کبھی کبھی دوچار ہونا پڑتا ہے، یقیناً ان ہی منزلوں پر امیروں کی لاشیں بھی آپ کو بکثرت نظر آ سکتی ہیں، ایک دن بلکہ ایک گھنٹہ کی زندگی سے سو سو سال تک زندہ رہنے کے نظائر وامثال دونوں طبقوں میں برابر اور مسلسل ہر قوم ہر ملک ہر آبادی میں ڈھونڈھنے والوں کو ملتے چلے جا سکتے ہیں۔ جس کا مطلب یہی ہوا کہ شکل وصورت، رنگ وبو، ذائقہ ومزہ وغیرہ کے اعتبار سے باہر کا حال کچھ ہی کیوں نہ ہو، مگر آنکھ ہو یا کان، جگر ہو یا پھیپڑا، لغرض رئیسہ اعضا ہوں، یا مرؤسہ حرارت غریزی فنا ہونے والے اجزاء کا بدل جب غریبوں کے لئے بھی یہاں مہیا ہو رہا ہے اور امیروں کے لئے بھی۔ توالد وتناسل کا کام جیسے امیروں میں جاری ہے، غریبوں میں بھی یہ قصہ رکا ہوا نہیں ہے۔ حتیٰ کہ چوبیس گھنٹوں میں مسرت وخوشی کے جتنے اوقات امیروں کو ملتے ہیں، جھوٹ بات ہوگی، اگر سمجھا جائے کہ غریبوں کی خوشی ومسرت کے اوقات ان سے کم ہوتے ہیں، غم والم، فکر وتردد کی

جتنی گھڑیاں غریبوں کی ہوتی ہیں، یہ واقعات کا انکار ہوگا، اگر کہنے والا یہ دعویٰ کر بیٹھے کہ امیروں کے چوبیس گھنٹوں میں غم کی گھڑیوں کا اوسط ان سے کم ہے۔ پس واقعاتی نقطۂ نظر سے جس پہلو سے بھی دیکھا جائے آخری نتائج کے لحاظ سے رزقی مدارج و مراتب کے ان اختلافات کا درحقیقت زندگی کے ٹھوس حالات وکیفیات سے چنداں تعلق نہیں ہے، بلکہ زیادہ تر اضافی انتسابات یا پیمائشی تصورات سے آدمی خود بخود اس کوفت کو خریدتا ہے، ناپنے کے عارضہ کو ترک کر کے تجربہ کیا جا سکتا ہے کہ اس کے بعد بھی اس وہمی دکھ کا کانٹا آدمی کے دل میں کیا باقی رہتا ہے؟ میں پوچھتا ہوں کہ یہی آدمی دوسروں کے جامہ وار اور حسرد کی شیروانیاں دیکھ کر اپنی کھادی کی قمیص پر جب ٹسوے بہانے لگتا ہے، تو طاؤس کے قدرتی خلعتِ رنگا رنگ اور بوقلموں کو دیکھ کر وہ کیوں نہیں جلتا، موٹروں پر پھرنے والوں کی سواریاں جس طرح پیادہ یا جوتیاں گھسیٹ گھسیٹ کر چلنے والوں کو حسد کے شعلوں میں جھلساتی رہتی ہیں، یہی جلنے والے، کڑھنے والے آخر چوکڑیاں بھرنے والے ہرنوں اور چھلانگ مار کر جست کرنے والے شیروں کو دیکھ دیکھ کر کیوں نہیں جلتے کیوں نہیں کڑھتے۔ ان ہی کے سامنے تو گدھوں اور چیلوں کو فضائے آسمانی میں تیرتے ہوئے دیکھا جاتا ہے خاک اور دھول سے قطعاً بے تعلق ہو کر صاف ستھری سطح ہوا میں ان پرندوں کی سیر کا یہ تماشا ان کے سینوں کا بوجھ کیوں نہیں بنتا، یہ نظارے اپنی چھاتیوں کے پیٹنے پر انھیں کیوں مضطر و مجبور نہیں کرتے، حالاں کہ یہ کمالات حیوانی طبقات کے ایسے کمالات ہیں جہاں تک ہزارہا ہزار سال کی کدوکوشش کے باوجود بھی جیسا کہ گذر چکا انسانوں میں امیروں کا طبقہ بھی نہیں پہنچ سکا ہے تا بغربا چہ رسد۔

زندگی کی کسی ایسی کمالی سہولت سے محرومی جو کسی دوسرے کو میسر ہو، اگر محرومی کا صرف یہی واقعہ مدارج و مراتب کے اختلاف سے پیدا ہونے والی کوفت کا سبب ہوتا تو مذکورہ بالا تمام صورتوں میں یہی بات پائی جا رہی ہے، لیکن اس واقعہ کے باوجود (محض اس لئے کہ) جن دوسروں کو یہ کمالات میسر ہیں۔ وہ ہمارے ابنائے جنس سے تعلق نہیں رکھتے، یعنی وہ آدمی نہیں طاؤس ہیں، درندے ہیں، چرندے ہیں، پرندے ہیں، ظاہر ہے کہ یہ فرق قطعاً ایک غیر منطقی فرق ہے، دوسرا کوئی ہو۔ وہ بہرحال دوسرا ہی ہے، خواہ اس کی شکل آدمیوں کی سی نہ ہو، پس غیر انسانی شکل و صورت رکھنے والے دوسروں کے متعلق کمالاتی و صفاتی تفاوت کے اس اختلاف کو ہم جب جنسی خوشی کے ساتھ برداشت کر رہے ہیں، اور برداشت کے لفظ کا اطلاق تو اس وقت صحیح ہو سکتا تھا کہ ان دوسروں کے کمالات کے مقابلہ میں اپنی بے کمالی یا ان کمالات سے محرومی کا ہمیں احساس بھی ہوتا، سو احساس کیا معنیٰ، یہ واقعہ ہے کہ ہم انسانوں میں کسی کے اندر اپنی اس محرومی کا خطرہ بھی تو پیدا نہیں ہوتا، ایک طے شدہ فیصلہ کی شکل میں ہم بھی گذر رہے ہیں، وہ بھی گذر رہے ہیں، اپنے حالات میں ہم بھی مگن ہیں، اور جہاں تک میں سمجھتا ہوں وہ دوسرے بھی ہم سے اور ہمارے صفات و کمالات سے بے تعلق ہو کر اپنے اپنے حال میں سب مست ہیں۔

بہرحال دوسروں کو ملا اور ہم محروم ہیں، مطلقاً اس کا گلہ تو کسی میں نہیں پایا جاتا، اور جو چیز پائی جا رہی ہے۔ وہ ایک حد تک اس کے برعکس ہے۔ یعنی جن دوسروں کے متعلق اپنے ہونے کا خیال آدمی

قائم کرلیتا ہے، جس حد تک "اپنائیت" کا یہ تعلق قریب تر ہوتا جاتا ہے، کمی و بیشی، ترجیح و تفضیل کی شکایت و حکایت اسی نسبت سے بڑھتی چلی جاتی ہے۔ ان ہی کے کمالات و صفات کو دیکھ دیکھ کر آدمی زیادہ کڑھتا اور جلتا ہے، جنھیں وہ اپنی ذات سے زیادہ قریب پاتا ہے جس کی طرف میں نے پہلے بھی اشارہ کیا ہے!

یہ ساری علامتیں کس بات کی ہیں؟ اسی حقیقت کی کہ مدارج و مراتب کے اختلاف کی جانب جن بے چینیوں دکھوں اور تکلیفوں کو منسوب کرکر کے دنیا میں آج ہنگامے برپا کئے جا رہے ہیں، شعر جنی من گھڑت، یک طرفہ داستانیں بنا بنا کر عصبی امراض کے بیماروں کو ہول دل میں لوگ مبتلا کر رہے ہیں۔ یک چشمی شعراء میدانوں میں اتر پڑے ہیں، ان کی شاعری مبالغہ اور اغراق، غلو و افراط کے انتہائی نمونوں کو پیش کر کر کے ان مسکینوں کو جو صرف دوسروں کی اُگلی ہوئی باتوں کی جگالی کرسکتے ہیں، یعنی بد ماغ خود دماغ خویش جو کچھ سوچ نہیں سکتے، ان ہی بیچاروں کو آلۂ کار کی حیثیت سے استعمال کر رہے ہیں، اور اس قسم کے سارے عصری مہیجات جن سے کام لینے والے اس زمانہ میں کام لے رہے ہیں، بجائے واقعات کے حقیقت بین نگاہوں میں ان کا زیادہ تر تعلق ذہنی احساسات اور وہمی تاثرات سے ہے، کیسی عجیب بات ہے کہ دوسروں کے ساتھ قدرت کے ترجیحی سلوک اور برتاؤ کا مشاہدہ تو ہمارے جذبات میں کسی قسم کی کوئی جنبش نہیں پیدا کرتا، یعنی وہی قدرتی کمالات جو پرندوں کو درندوں کو دو ندوں کو عطا ہوئے ہیں اور نوعِ انسانی کے افراد ان سے محروم ہیں، جہاں تک مشاہدہ کا تعلق ہے ان ترجیحی کمالات کی فہرست مختصر نہیں ہے، مگر احتجاج و اعتراض تو کجا، سچ پوچھئے تو کسی کی ان پر نظر بھی نہیں پڑتی، اس کا خطرہ بھی نہیں گذرتا کہ جن کمالات و صفات سے ہمیں محروم رکھا گیا ہے، دوسروں کو ان ہی سے کیوں سرفراز کیا گیا ہے۔ لیکن بجائے ان کے اگر خود ہمارے ابناء جنس کے ساتھ قدرت اسی قسم کا کوئی ترجیحی سلوک کرتی ہے تو ہم اپنے بال نوچنے لگتے ہیں، جھنجھلا اٹھتے ہیں، اور اب تو اس سے بھی آگے بڑھ کر ہمیں دوسروں کو نوچنے کھسوٹنے پر بھی اکسانے والے اکسا رہے ہیں۔ لوٹ کھسوٹ کی ان حرکتوں ہی کو جائز قانونی افعال کی حیثیت جا رہا ہے کہ دے دیا گئے بلکہ بعض ممالک میں دیا جا چکا ہے، حالانکہ بجائے اپنوں کے دوسروں کے ساتھ قدرت کا یہ معاملہ ہمارے غیظ و غضب کے جذبات کا نشانہ بننے کا زیادہ مستحق اور زیادہ صلاحیت رکھتا تھا، آخر اپنوں کے کمالات و فضائل کو تو ایک حد تک ہم اپنی طرف منسوب کرکے گونہ تسلی بھی حاصل کرسکتے ہیں، ہمیں اگر کوئی چیز میسر نہ آسکی تو یہی کیا کم ہے کہ ہمارے بھائی کو اس سے استفادہ کا موقعہ عطا کیا گیا ہے، ہم اگر پیدل چلنے پر مجبور ہیں تو ہماری تسکین کے لئے یہی انتساب کافی ہوسکتا تھا کہ ہماری انسانی برادری کے کسی فرد کو موٹر اور ہوائی جہاز پر سیر کرنے کی صورت فراہم ہوگئی ہے، چیلوں اور کرگسوں کی فضائی سیر کے مقابلہ میں اسی سیر کا کسی انسان کو میسر آجانا چاہیئے تھا کہ ہماری بشاشت اور مسرت کا باعث ہوتا۔ واقعہ کا تقاضا اگر کچھ ہوسکتا تھا تو یہی ہوسکتا تھا۔

لیکن اس عقلی فیصلہ کے خلاف نتائج و آثار کا ظہور جب اس کے برخلاف معکوس شکلوں میں ہو رہا ہے تو ایسی صورت میں اس کے سوا اور کیا سمجھا جاسکتا ہے کہ باہم افرادِ انسانی میں ترجیحی سلوک و مدارج

مراتب کے اختلاف کو دیکھ دیکھ کر غم و غصے کی جو لہریں دلوں میں پیدا ہو رہی ہیں، یہ عقل کا نہیں، وہم کا، اور صحیح منطقی فکر کا نہیں بلکہ مغالطوں اور صرف مغالطوں کی کرشمہ پردازیوں کا نتیجہ ہے، میں تو سمجھتا ہوں کہ آیتِ قرآنی

ولا تتمنوا ما فضل اللہ بہ	اور نہ آرزو کیا کرو ان چیزوں کی جن کی وجہ سے
بعضکم علیٰ بعض۔	برتری بخشی ہے خدا نے بعض کو تم میں بعض پر۔

میں جہاں اس حقیقت کا اظہار کیا گیا ہے کہ بعض کی بعض پر برتری خود خدا کی پیدا کی ہوئی ہیں، وہیں برتری اور ترجیحی سلوک کے ان قصوں میں آرزو آفرینیوں سے حق تعالیٰ نے منع فرما کر یہی چاہا ہے کہ پیمائشی مغالطوں سے پیدا ہونے والے خواہ مخواہ کی اس غیر ضروری کوفت سے مسلمانوں کو نجات عطا فرمائی جائے۔ حاصل یہی ہے کہ اپنی اپنی واقعی ضرورتوں اور حاجتوں کی حد تک سوچنا اور اسی کے مطابق جد و جہد کرنا یہ اور بات ہے، اور فیتے لگا لگا کر اپنے آپ کو دوسروں سے ناپ ناپ کر بیٹھے بٹھائے لوگ جو غم نداری بز بخر کے عارضہ میں خود اپنے ہی ہاتھوں مبتلا ہو جاتے ہیں، یہ قطعاً دوسری چیز ہے، سعی و عمل کے تو ہم مکلف ہیں، اسلام میں اس کی جو اہمیت ہے آغاز بحث میں اس کی تفصیل گذر چکی۔ لیکن ناپا ناپی کے ان قصوں میں مبتلا ہو کر لوگ جو ہانپ رہے ہیں، کانپ رہے ہیں، اور اسی کا نام انھوں نے دنیاوی فکر اور معاشی تردد رکھ چھوڑا ہے، کسب معاش کی ٹھوس، مادی ضرورتوں سے اس کا کوئی تعلق نہیں، یہ ایک خود ساختہ غم، خود پرداختہ الم ہے۔ جس میں اپنی سبک مغزی کی وجہ سے وہی مبتلا ہو جاتے ہیں، جن میں زندگی کے واقعی اور غیر واقعی حقیقتوں میں تمیز کا سلیقہ نہیں ہوتا،

خلاصہ یہ ہے کہ مدارج و مراتب کے اختلاف کے جس قصہ کو آج اتنی بلند آہنگیوں سے جو اچھالا گیا ہے، اتنا شور برپا کیا گیا ہے کہ زمین کانپنے لگی ہے، آسمان تھرا رہا ہے، اور اسی کو معاشی گتھیوں میں سب سے زیادہ "اُلجھی ہوئی گتھی" قرار دے کر اس کے سلجھانے میں ایڑی سے چوٹی تک کا زور لگایا جا رہا ہے، اور ایک سلجھی ہوئی صاف بات کو خواہ مخواہ الجھا کر خود بھی لوگ الجھ رہے ہیں، دوسروں کو بھی الجھا رہے ہیں۔ ایک خود آفریدہ پھندے کے کھولنے کے لئے بلا وجہ پھندوں پر پھندوں کا اضافہ کرتے چلے جا رہے ہیں۔ ایک سیدھی بات کو بیسیوں الٹی تدبیروں سے الٹ رہے ہیں سینکڑوں بلکہ سچ یہ ہے کہ لاکھوں لاکھ سال کے تجربات نے نسل انسانی کو زندگی کے جن ٹھوس نتیجوں تک پہنچایا تھا، اسی لاحاصل سعی کے درپے ہو کر یک گردش قلم سب کو غلط اور مہمل ٹھہرا دیا گیا، جو آسمان تھا اسے زمین اور جو زمین تھی اسے آسمان بنا دیا گیا، ایک فرضی زخم کو اچھا کرنے کے لئے نت نئے آپریشنوں سے معاشرہ کے جسد کو چھلنی کر دیا گیا۔ آپ دیکھ رہے ہیں، منطقی تجزیہ و تحلیل کی معمولی کارروائی کے بعد ان ساری مغزی شورشوں کی تہہ میں چند دور از کار اوہام بے معنی، اور بے بنیاد وساوس کے سوا کیا اور بھی کچھ نکلا؟

زیادہ سے زیادہ کہنے والے اس سلسلہ میں اگر کچھ کہہ سکتے ہیں تو یہی کہہ سکتے ہیں کہ مدارج و

مراتب کے ان اختلافات سے جس اندرونی کوفت کو آدمی محسوس کرتا ہے، مان لیا جائے کہ واقعاتی نقطۂ نظر سے اس کی تہہ میں کچھ نہ ہو، لیکن اتنا تو بہر حال تسلیم ہی کرنا پڑے گا کہ اپنے ابنائے جنس کی بلندیوں اور برتریوں کو دیکھ دیکھ کر پستیوں میں زندگی گذارنے والوں کے دلوں میں بجا ہو، یا بے جا، بلا وجہ ہو، یا با وجہ، لیکن کوفت اور خلش پیدا ضرور ہوتی ہے، کیوں پیدا ہوتی ہے؟ اسے جانے دیجئے، لیکن جب پیدا ہوتی ہے، ہوتی رہتی ہے تو ایسی صورت میں یہی سمجھا جائے گا کہ بنانے والے نے انسان کی فطرت کو بنایا ہی ہے اس نہج اور اقتدار پر، کہ غیروں کی نہیں بلکہ اپنوں کی اپنے ابنائے جنس کی برتریاں اس سے دیکھی نہیں جاتیں۔ "اپنائیت" کا یہ رشتہ جتنا زیادہ قریب ہوتا ہے، کوفت کے اس احساس کی شدت بھی اسی نسبت سے تیز سے تیز تر ہوتی چلی جاتی ہے جس لئے ہوتی ہے، وہ واقعہ نہ ہو، لیکن بجائے خود یہ کوفت انسانی فطرت کا تو ایک واقعہ ناقابل انکار واقعہ ہے منطق لاکھ ثابت کرتی رہے کہ تڑپنے والوں کی یہ تڑپ بے معنی ہے۔ غیروں کی نہیں بھائی بندوں کی خوش حالیوں کو دیکھ دیکھ کر بجائے مسرور ہونے کے بدحال ہونا بدعقلی کی بات ہی سفیہانہ فعل ہے (فرمائیگی)، اور انتہائی کمینہ حرکت ہے، یہ حسد ہے، حسد کا وہ پتھر ہے جو بجائے محسود کے پلٹ کر حاسد ہی کے سر کو لہولہان اور اسی کی کھوپڑی کو چکنا چور کرتا ہے، اپنی سلگائی ہوئی آگ میں حاسد کو خود ہی جھلسنا اور جلنا پڑتا ہے۔

مگر سب کچھ سن لینے، سب کچھ سمجھ لینے کے بعد بھی دیکھا یہی جاتا ہے کہ پستی و بلندی فراز و نشیب کے اس تماشے سے آدمی کی فطرت عموماً وہی اثر لیتی ہے جسے عقلاً و خلقاً نہ لینا چاہئے تھا، فطری جذبے کا زور عقلی پند ناموں کے اوراق کو اڑا اڑا کر تتر بتر کر کے رکھ دیتا ہے سب کچھ سمجھ لینے کے بعد بھی پانے والے اپنے اندر جب پاتے ہیں تو کوفت کی اسی کیفیت کو پاتے ہیں، جسے چاہئے تھا کہ وہی پاتے جنھوں نے نہیں سمجھا ہے۔

یقیناً یہ سوال ہے، ایسا سوال ہے جو توجہ کا مستحق ہے۔ اس سے بے اعتنائی درحقیقت انسانی فطرت کے ایک واقعہ سے بے اعتنائی ہوگی۔ کم از کم قرآن کا جو طرز عمل اس باب میں ہے اس سے تو یہی سمجھ میں آتا ہے، بلاشبہ اس نے ان ترجیحی سلوکوں کے متعلق "فتنہ بازی" کی بدعات سے جیسا کہ ابھی گذر ا روکا ہے، لیکن دوسروں کی بلندیوں کو دیکھ کر پستی میں رہنے والوں کے اندر ان بلندیوں کی آرزو کا پیدا ہونا، اس آرزو کی نہ پوری ہونے کی صورت میں آدمی کا جھنجلانا اور کڑکڑانا، قلق اور بے چینی میں مبتلا ہونا۔ چوں کہ یہ بھی انسانی جبلت کا اقتضا ہے، ایسا اقتضا جسے جبلت سے نکالا نہیں جا سکتا، ابھی پیغمبر کے حوالے سے بتایا گیا تھا کہ پہاڑوں کو اپنی جگہ سے ہٹایا جا سکتا ہے لیکن جبلت میں جو کچھ ہے اسے کوئی نہیں نکال سکتا۔ اور یہی راز ہے کہ بجائے ازالہ کی فضول کوشش کے امالہ کی اسی پرانی ترکیب سے اسلام نے اس مسئلہ میں بھی کام لیا ہے! اور اسی کا ذکر اس مقام پر میرا اصل مقصود ہے۔

مختلف طریقوں سے یہ سمجھاتا چلا آرہا ہوں کہ انسانی معاشرہ میں مدارج و مراتب کا اختلاف درحقیقت افراد کے صفاتی و کمالاتی تفاوت کا ایک ناگزیر نتیجہ ہے، اب یہاں یہ بتانا چاہتا ہوں، اور قرآن ہی سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے۔ ضمناً پہلے بھی اس کی طرف اشارہ کر چکا ہوں کہ مدارج و مراتب کے اس اختلاف کا ایک سلسلہ تو وہ ہے، جس کا تعلق زندگی کے غیر معاشی شعبوں سے ہے۔ مثلاً ہم میں کسی کا حسین ہونا، کسی کا زشت رو، کریہ المنظر ہونا، کسی کی طبیعت کا لگاؤ شعر شاعری سے ہے، اور دوسرا ریاضی و حساب کی باریکیوں سے دلچسپی رکھتا ہے، کوئی ہم میں صنعت و حرفت کا دلدادہ ہے اسی میں اس کا جی لگتا ہے، اور کسی کو مابعد الطبیعاتی مسائل و کلیات کے سلجھانے میں مزہ ملتا ہے، ترجیح و تفضیل یا قرآنی الفاظ میں فضلنا بعضهم علیٰ بعض کے اس سلسلہ کے تفصیلات لامحدود ہیں۔

اسی کے مقابلہ میں ترجیح و تفضیل، برتری و کمتری، بلندی و پستی کا دوسرا مستقل سلسلہ وہ ہے جس کا تعلق زندگی کے خاص معاشی حالات سے ہے، قرآنی اصطلاح میں یوں کہیئے کہ الرزق کے لحاظ سے انسانوں کے بعض افراد کو بعض پر جو برتری و فضیلت بخشی گئی ہے۔ نتیجۃً جس کی وجہ سے ہم میں بعض فراخی و فراغت کی حالت میں نظر آتے ہیں، قرآن میں جس کی تعبیر بسط سے کی گئی ہے۔ اور بعض لوگ ضیق معاش اور تنگی کی حالت میں گرفتار رہیں، قرآن نے رزق کی اسی حالت اور کیفیت کا نام قدر رکھا ہے۔

بسط و قدر کی قرآنی اصطلاح کی تشریح

بات یہ ہے کہ الرزق یا روزی بعضوں کو تو بقدر ضرورت ملتی ہے، بالفاظ دیگر جن کا دخل بہ مقدار خرچ اور آمدنی بالکل ٹھیک ضرورت کے مطابق تلی تلی حالت میں اس طور پر ہوتی ہے کہ ضرورت میں خرچ ہونے کے بعد بچ کر کوئی پس انداز سرمایہ انھیں ہاتھ نہیں آتا۔ لغت میں قدر کا یہی مفہوم ہے۔ یعنی واقع میں جو چیز جیسی ہو، ٹھیک اسی کے مطابق اندازہ قائم کرنا یہی قدر کے لغوی معنی ہیں، اور اسی لغوی معنی کو پیش نظر رکھ کر ایسی آمدنی جو بالکل خرچ کے برابر برابر، ایک دم بالکلیہ اس کے مطابق ہو، اسی کا نام رزق مقدور ہے۔ یعنی ضرورت کے مطابق تلی تلی روزی، اور اسی رزق مقدور کے مقابلہ میں بعضوں کی آمدنی کا پیمانہ ایسا ہوتا ہے کہ ضروریات میں خرچ کرنے کے بعد بھی ان کے پاس بچ رہتا ہے۔ رزق کے اسی پیمانے کا نام بسطی پیمانہ ہے۔ اور جو رزق اس پیمانہ پر ملتا ہے، اس کا نام رزق مبسوط ہے۔ کیونکہ بسط کے معنی پھیلاؤ کے ہیں۔ گویا آمدنی کی یہ ایک ایسی شکل ہے جس کا دامن خرچ کے حدود سے وسیع اور آگے نکل کر پھیلا ہوا ہے۔

بہر حال مدارج و مراتب کے اعتبار سے ترجیح و تفضیل کی یہ دو مستقل صورتیں ہیں۔ واقعہ تو یہ ہے کم و بیش ہر دو حالات میں یہ دیکھا جاتا ہے کہ جنھیں برتری عطا کی جاتی ہے، ان کو دیکھ دیکھ کر نہ پانے والوں اور محروم رہ جانے والوں میں ترجیح و تفضیل کی ان دونوں صورتوں میں کسی نہ کسی حد تک اپنی محرومی کا احساس عموماً پیدا ہوتا ہے، اور یہی احساس سوز اور کوفت کی شکل بھی بسا اوقات اختیار کر لیتا ہے۔ لیکن جہاں تک تجربہ اور مشاہدہ کا تعلق ہے۔ خاص معاشی شعبہ میں بعضوں کی بعضوں پر برتری، یعنی الرزق کے لحاظ سے کسی کا بسط کی حالت میں ہونا اور کسی کا قدر کی حالت میں ہونا قدر والوں کیلئے زیادہ جانگزا

اور سوہانِ روح کا زیادہ سبب بن جاتا ہے۔

یہی وجہ معلوم ہوتی ہے کہ گو ضرورت تو امالہ کی ترکیب کی ترجیح و برتری کی دونوں صورتوں میں ہے، لیکن جہاں تک میرا خیال ہے قرآن نے اس مسئلہ میں جتنی توجہ معاشی شعبہ کی طرف امالہ کی تدبیروں میں کی ہے، اتنی توجہ غیر معاشی سلسلہ کی طرف نہیں کی گئی ہے، اور ہے بھی یہی بات کہ اس شعبہ میں مدارج و مراتب کے اختلاف اور اس کے نتائج کے آثار کو جتنی اہمیت ہر زمانہ میں حاصل رہی ہے۔ اتنی اہمیت اسی اختلاف کے دوسرے ابواب کو شاید کبھی نہیں دی گئی، اس زمانے میں بجائے امالہ کے تفاوت واختلاف کے اس قصہ کے ازالہ یا بالکلیہ ختم کر دینے پر جو زور دیا جا رہا ہے، زیادہ تر اس کا تعلق بھی اسی تفاوت واختلاف سے ہے جو رزق اور معائش کے لحاظ سے انسانی معاشرہ کے افراد میں پایا جاتا ہے۔ اور اب میں چاہتا ہوں کہ امالہ کی ان ہی تدبیروں کو جو معاشی شعبہ کے اختلافِ مراتب کے سلسلہ میں قرآن میں پائی جاتی ہیں، ذرا تفصیل کے ساتھ بیان کر دوں۔

مطلب یہ ہے کہ معاشی لحاظ سے جو قدر وتنگی کی حالت میں گرفتار ہیں، سفلی رزق ومعاش رکھنے والوں کے لحاظ سے ان کے اندر شکوہ وشکایت غم وغصہ کے جو جذبات متلاطم ہوتے رہتے ہیں اگرچہ بظاہر ان کا تعلق ان ہی لوگوں سے معلوم ہوتا ہے، جو باوجود ان ہی جیسے انسان ہونے، ان ہی کے ہم نسل، ہم قوم بلکہ بسا اوقات ہم خاندان ہم چشم ہونے کے ایسی آمدنیوں سے متمتع ہوتے رہتے ہیں کہ خرچ کرنے کے بعد بھی ان کے پاس بچ رہتا ہے۔ لیکن اسی کے مقابلہ میں غریب قدری رزق پانے والا بیچارہ گا تو کیا، بسا اوقات اپنی آمدنی کے منہ کو گذرنے والے سال یا مہینہ یا ہفتہ یا دن کے مصارف سے ملانے میں دشواری اور سخت دشواری محسوس کرتا ہے، اور یہی حال اسے اندرونی سوزشوں، اور فکری لکد کوبوں میں مبتلا رکھتا ہے، جن کا نام دنیا میں معاشی پریشانیاں ورزقی حیرانیاں ہیں، ایسی صورت میں غور کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ قدری رزق والوں کے جذبات غیظ وغضب گلہ حکایت شکوہ وشکایت کا ایک رُخ اگرچہ سفلی رزق والوں ہی کی طرف ہوتا ہے، لیکن شعوری یا غیر شعوری دانستہ یا نادانستہ طور پر سب میں نہ سہی۔ لیکن اکثریت میں ایک رخ ان ہی جذبات کا محسوس یا نا محسوس شکلوں میں خود اس ذات کی طرف بھی کسی نہ کسی شکل میں ضرور رہتا ہے، جس کے متعلق آدمی یہ سمجھتا ہے کہ اسی نے تقسیم رزق کے اس اختلاف کو قائم کر کے ہمیں ان حالات میں مبتلا کر دیا ہے، خواہ ادب یا اس خوف سے کہ قدری پیمانے پر بھی جو رزق مل رہا ہے، کہیں وہ بھی بند نہ ہو جائے زبانوں پر حرفِ شکایت نہ آتا ہو، بلکہ شکوہ وشکایت کی جگہ شکر وحمد ہی میں لوگوں کو کیوں مشغول نہ پایا جاتا ہو، بلکہ سچ یہ ہے کہ ذاتِ حق جیسی بڑی ہستی جس کے متعلق قرآن نے

افی اللہ شک فاطر السموٰت والارض۔	کیا اللہ میں شک ہے آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے والے میں؟

کا استعجابی واستبعادی سوال شکوں سے اسی بداہت اور کامل وضوح ہی کی بنیاد پر کیا گیا ہے۔ در اصل

شک کے یہ معنی اگر غور کریں گے تو وہ پائیں گے کہ خدا سے "روٹھ" کی جو کیفیت کسی وجہ سے ان میں پیدا ہوتی ہے۔ درحقیقت "روٹھ" کی اسی کیفیت کی غلط تعبیر وہ شک سے کرتے ہیں، اور زیادہ تر بندوں میں اپنے خدا سے روٹھ کا یہ احساس جہاں تک میں نے دیکھا ہے ان ہی معاشی ترجیح و تفضیل کے قصوں ہی سے اس کے دامن کو بندھا پایا ہے۔ اندر ہی اندر لوگوں میں یہ یا اسی قسم کے وسوسوں کا بھبھار اٹھتا رہتا ہے کہ آخر ہم بھی جب خدا ہی کے بندے ہیں تو ہمیں محروم رکھ کر یا ہمیں قدر کی حالت میں رکھ کر دوسروں کو بجائے قدر کے قانون بسط کے تحت کیوں دیا جا رہا ہے، خصوصاً شکایت کا احساس اس وقت ذرا زیادہ تیز ہو جاتا ہے، جب بسطیوں کے مقابلہ میں قدریوں کو اپنے اندر کسی کمال کے پائے جانے کا احساس غلط یا صحیح کسی طور پر پیدا ہو گیا ہو، کچھ بے دینی اور الحاد کے ان ہی دنوں میں نہیں جن سے دنیا آج گذر رہی ہے، بلکہ اس زمانے میں بھی جس کا نام مذہبیت اور دینیت کا زمانہ ہے، کہنے والے یہ کہتے چلے آئے ہیں، بچپن میں ہم جب مختصر المعانی پڑھتے تھے تو عربی کے یہ دو شعر جو سینکڑوں سال پرانے کسی عربی شاعر کے ہیں، پڑھایا گیا تھا۔

کم عامل عالم اعیت مذاہبہ وجاہل غافل فی الارض مرزوقا
ھذا الذی ترک الاوھام حائرۃ وصیر العالم النحریر زندیقا

جن کا مطلب وہی ہے کہ "کتنے علم و دانش عمل و کردار والوں کو زندگی کی راہوں نے تھکا تھکا مارا ہے اور کتنے نادان ان پڑھ جاہل بے عمل غافلوں کو دیکھا جاتا ہے۔ جنہیں زمین پر روزی پہنچائی جا رہی ہے یہی واقعہ ہے جس نے انسانی سمجھ کو حیرت میں ڈال رکھا ہے، اور بڑے بڑے جلیل فاضلوں کو اسی نے زندیق اور بے دین بنا کر چھوڑ دیا" شاید اسی کا ترجمہ حافظؒ نے اپنے ان مشہور شعروں میں کیا ہے؂

ابلہاں را ہمہ شربت ز گلاب و قند است قوت دانا ہمہ از خون جگر می بینم
اسپ تازی شدہ مجروح بزیر پالاں طوقِ زریں ہمہ در گردنِ خر می بینم

ظاہر ہے کہ شاعر کا بہرحال یہ شعر ہی ہے جس کا بالکلیہ واقعہ کے مطابق ہونا ضروری نہیں، شاعری شاعری ہی کب باقی رہتی ہے۔ جب وہی کہا جائے جو ہے، آخر شاعر کا یہ دعویٰ کہ زمین پر صرف جاہلوں اور غافلوں ہی کو روزی پہنچائی جا رہی ہے۔ اس کا تو یہی مطلب ہوا کہ زندگی گذارنے والوں میں کوئی ایسا طبقہ بھی ہے جسے رزق سے بالکلیہ محروم رکھا جاتا ہے۔ بھلا رزق سے محرومی کے بعد کوئی جی ہی کب سکتا ہے بس واقعہ تو یہی ہے کہ جو بھی یہاں جی رہے ہیں یا جن کو خدا کی اس زمین پر جتنے دن تک بھی جینے کا موقعہ عطا کیا جاتا ہے، اس وقت تک کے لئے الرزق کے جس مقدار کی حقیقی و واقعی ضرورت ہے وہ تو سب ہی کو پہنچ رہی ہے۔ اگر وہ نہ پہنچتی تو شکوہ کرنے کے لئے شاکیوں کا یہ گروہ جیتا ہی کیسے؟ جیسا کہ میں نے پہلے بھی کہا تھا کہ رئیسہ اعضا ہوں یا دوسرے ہر ایک کے تحلیل یافتہ اجزا کا بدل سب ہی کے لئے مہیا ہو رہا ہے۔ یا فاقات کی تلافی کا عمل سب ہی میں جاری ہے۔ آنکھوں میں نور، دلوں میں شعور، بازوؤں میں زور، تو سب ہی کے بھرا جا رہا ہے، فرق جو کچھ ہے وہ صرف باہر ہی رہ ہے۔ یعنی جن چیزوں سے توانائیوں کے یہ ذخیرے

مختلف افراد میں تقسیم ہو رہے ہیں، رنگ و بو، شکل و صورت، ذائقہ اور مزے کے لحاظ سے اختلاف اگر کچھ پایا جاتا ہے تو ان ہی بیرونی صفات میں پایا جاتا ہے۔ اس کا انکار نہیں کیا جا سکتا کہ توانائیوں کے یہی ذخیرے کسی کے لئے پلاؤ قورمے سے مثلاً مہیا ہو رہے ہیں اور کسی میں نانِ جویں اور نمک ہی سے سہی۔ لیکن "باہر" کی منزلوں کو طے کرنے کے بعد جب وہ "اندر" پہنچ جاتے ہیں تو پھر ان میں مشکل ہی سے امتیاز باقی رہتا ہے، امجد نے سچ کہا ہے ع پیٹ میں لقمۂ تر نانِ جویں یکساں ہے۔ سب ہی دیکھتے ہیں، سب ہی سنتے ہیں، سب ہی چلتے ہیں، پھرتے ہیں، الغرض جن توانائیوں کا ظہور ایک سے ہوتا ہے۔ ان ہی کا ظہور دوسرے سے بھی ہو رہا ہے، بلکہ قوت و طاقت کے مظاہر کی کثرت کن میں زیادہ پائی جاتی ہے، اگر یہ بحث چھیڑ دی جائے۔ تو شاید کچھ بات اس سے بھی آگے بڑھ سکتی ہے۔ لیکن اسی نقطہ پر بحث اگر ختم بھی کر دی جائے، جب بھی ہر حال میں شاعر کو جھٹلا کر قرآنی آیت

وما من دابۃ الا علی اللہ رزقہا۔ — اور نہیں ہے کوئی چلنے والا، مگر اس کی روزی کی ذمہ داری خدا پر ہے۔

کے مشاہدہ ہی کی تصدیق ہر اس شخص کو کرنی پڑتی ہے جو بجائے "شعر" کے واقعات کو واقعات ہی کے رنگ میں دیکھ رہا ہو۔ خلاصہ یہ ہے کہ اس حد تک تو شاعر کا بیان اگرچہ شعر ہے، اس نے مبالغہ اور غلو کا رنگ جس واقعہ میں بھرا ہے، دراصل یہ ترجیحی اور تفضیلی سلوک ہی کا واقعہ ہے جو مختلف افرادِ انسانی میں پایا جا رہا ہے۔ بستیوں کو دیکھ کر قدریوں کو گویا ایسا محسوس ہوتا ہے کہ قدرت کے وہ مرزوق ہی نہیں ہیں، باوجود پانے اور بہت کچھ پانے کے مقابلہ کے بعد گویا باور کرنے لگتے ہیں کہ انھوں نے کچھ نہیں پایا ہے۔ اور یہی چیز خدا اور خالق کے متعلق ان کے دلوں میں اعتراض و احتجاج کی اس کیفیت کو پیدا کرتی ہے جس کا نام میں نے "روٹھ" رکھا ہے۔ کمزور اعصاب والے اپنی اسی روٹھ کو غیظ و غضب کی شدت میں جھلا کر کبھی کبھی "شک" بھی کہہ دیتے ہیں، یا ممکن ہے کہ شک کی صورت میں اس کیفیت کو بدلتے ہوں، لیکن لوگ سمجھیں یا نہ سمجھیں عام حالات میں اس کی ابتدا ر ہوتی ہے روٹھ ہی کی اس کیفیت سے اور جیسا کہ میں نے عرض کیا وہ شک نہیں بلکہ اپنے پیدا کرنے والے سے ایک قسم کا مخفی احتجاج اور غم و غصہ کی ایک مستور شکل ہوتی ہے۔ ہمیں بھی وہی سب کچھ کیوں نہیں دیا گیا جو دوسروں کو دیا گیا، اگر وہ بھی آپ کے بندے ہیں تو ہم کیا کسی دوسرے کی مخلوق ہیں۔ مبہم غیر مبہم، واضح غیر واضح شکلوں میں اسی قسم کی بھنبھناہٹ، کڑکڑاہٹ لوگوں میں پائی جاتی ہے۔ اس وارستہ مزاج شاعر نے جو یہ کہا تھا ؎

زندگی اپنی کہ جس شکل سے گذری غالب — ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

تو اس کی تہہ میں آپ ہی بتائیے کہ شکایت کے اس باطنی احساس کے سوا اور بھی کچھ ہے؟

خلاصہ یہ ہے کہ الرزق یہ معاشی لحاظ سے مدارج و مراتب کے اختلاف کی بنیاد پر قانون قدرت کے تحت روزی پانے والوں میں غم و غصہ کی کیفیت ایک، تو ان لوگوں کے لحاظ سے پیدا ہوتی رہتی ہے جن کے

متعلق سمجھا جاتا ہے کہ بسطی پیمانہ پر رزق پا رہے ہیں۔ ان ہی کو سامنے رکھ رکھ کر قدریوں کا یہ طبقہ اپنے آپ کو اپنی زندگی کے مختلف شعبوں کو مثلاً مکان، سواری، لباس، خوراک وغیرہ کو ناپتا رہتا ہے۔

لیکن جیسا کہ میں نے عرض کیا اسی کے ساتھ دوسری طرف اسی احساس کا ایک رخ دانستہ یا نادانستہ گفتہ یا ناگفتہ شکلوں میں خود پیدا کرنے والے خالق کی طرف بھی ہوتا ہے، سمجھا جاتا ہے کہ ارزاق اور معاش میں یہ ترجیحی عمل اور فضلنا بعضھم علیٰ بعض فی الرزق کا یہ تماشا بہرحال تقسیم رزق کے خدائی قانون ہی کا نتیجہ ہے۔ کم از کم جن قوموں میں کھل کر ابھی خدا کے انکار کی جرأت نہیں پیدا ہوئی ہے، ان کے اس احساس کا ایک رخ بہرحال خدا کی طرف بھی ضرور ہوتا ہے۔ اب خواہ ان تأثرات کا حقیقی مادی واقعات سے تعلق ہو یا نہ ہو، لیکن اس کا انکار نہیں کیا جا سکتا کہ بالآخر ان احساسات کی انتہا انسان کی اسی جبلت، اور ان کی آخری تان، ان ہی اقتضاآت پر ٹوٹتی ہے۔ یعنی پیدا کرنے والے نے جن پر انسان کو پیدا کیا ہے۔

اور جہاں تک میرا خیال ہے، یہی وجہ ہے اس بات کی کہ قرآن میں اس سلسلہ کے تأثرات واحساسات کے ان دونوں رخوں کے ازالہ کی الگ الگ تدبیریں پائی جاتی ہیں، اور اب آپ کے سامنے ازالہ کی ان ہی قرآنی تدبیروں کو دو الگ عنوانوں کے نیچے درج کرتا ہوں۔

پہلی صورت یعنی خود اپنے ابنائے جنس کے لحاظ سے غم وغصہ کی یہ کیفیت جو دلوں میں پائی جاتی ہے، اس کے رخ کو پلٹنے کے لئے میرے خیال کے مطابق فطرتِ انسانی کے ایک دوسرے جبلی اور فطری جذبہ ہی کو ابھار کر قرآن نے ازالہ کی صورت پیدا کرنا چاہی ہے، مطلب یہ ہے کہ بجائے اختلاف وتفاوت، نشیب وفراز کے معاشی حیثیت سے تمام افرادِ انسانی کو ہم سطح اور برابر برابر کر دیا جائے اس مطالبہ کے معنی کیا ہوں گے؟ یہی نا کہ جس طرح خدا کی اسی زمین پر جی اور جان رکھنے والی ہستیوں کی حیوانی جماعتیں اپنی خود اکتفائی زندگیوں کی بدولت ایک دوسرے سے الگ تھلگ اس طریقہ سے جو زندگی بسر ہو رہی ہے کہ اس کو نہ اس کی ضرورت ہے نہ اس کی اس کو، الف بے سے بے نیاز ہے۔ اور یہی الف ہے گویا چاہا جاتا ہے کہ بنی نوعِ انسانی کے افراد کو بھی اسی قانون کے تحت زندگی بسر کرنے کا موقع دیا جائے

آخر حیوانی طبقات کو خود اکتفائیت کی اس بے نیازانہ زندگی سے متمتع ہونے کا موقعہ جو یہاں مل گیا ہے تو رزقی اور معاشی مساوات کے قانون کے سوا اس کی وجہ، بتایا جائے کہ اور کیا ہے؟ یہی بات کہ اپنی اپنی ضرورت اور حاجت کے مطابق دانہ گھاس آب وخورد دوسرے کی امداد کے بغیر چونکہ ان میں ہر ایک کو میسر آ رہا ہے، اور اس طور پر میسر آ رہا ہے کہ ہر جنس اور ہر صنف کے ایک فرد کو جو کچھ ملتا ہے، وہی دوسرے کو مل رہا ہے، اس لئے ان میں ہر ایک تشفی یافتہ زندگی گذار رہا ہے۔ اور اسی لئے کسی کو کسی کی حاجت نہیں ہے۔ اب سوچنا چاہئے کہ بنی نوعِ انسانی کے افراد کو بھی معاشی اعتبار سے ہم سطحیت ومساوات کے اسی قانون کے تحت اگر رکھا جاتا تو اس کا نتیجہ بھی اس کے سوا اور کیا ہوتا کہ جیسے بکروں، بیلوں، گھوڑوں، گدھوں، وغیرہ وغیرہ حیوانی انواع اور نسلوں کے افراد قطعی ایک دوسرے سے بے تعلق ہو کر

جی رہتے ہیں، یہی حال انسانی افراد کا بھی ہو جاتا۔

یہی مقام ہے اس فطرت کے متعلق غور و خوض کا جس کا سب سے بڑا امتیاز یہی بتایا جاتا ہے کہ وہ مدنی الطبع ہے یعنی باہمی میل جول، اتحاد و اتفاق، ہمدردی و غمخواری، مواساۃ و موانست، جس کی زندگی کا سب سے قیمتی ترین سرمایہ ہے۔ اسی سرمایہ کی حفاظت و نگرانی کے لئے کانفرنسوں کے پنڈالوں، مجالس کے اسٹیجوں، مساجد کے ممبروں سے مواعظ و نصائح کا ایک طوفان جاری ہے۔ "اتفاق" "اتفاق" "ہمدردی" "ہمدردی" "یک جہتی" "یک دلی" کی آوازوں سے دنیا گونج رہی ہے۔ اب یہی سوچنے کی بات ہے کہ ایسی صورت میں کیا زندگی کا وہ منحوس نقشہ جس میں بجائے جوڑنے کے آدمی کو آدمی سے توڑا جائے افتراق و انشقاق، بے تعلقی و جدائی، علیحدگی و بے نیازی کا یہ وحشت ناک منظر کیا انسانی فطرت کے لئے قابلِ برداشت ہو گا؟

رزقی و معاشی حیثیت سے مراتب و مدارج کا جو اختلافِ نسلِ انسانی کے افراد میں پایا جاتا ہے قرآن میں اسی کا تذکرہ کرتے ہوئے یہ جو فرمایا گیا ہے

نحن قسمنا معیشتهم فی الحیوٰۃ الدنیا ورفعنا بعضهم فوق بعض درجات لیتخذ بعضهم بعضا سخریا۔	ہم ہی نے بانٹ دی ہے حیوٰۃ دنیہ (پست زندگی) میں ان کی معیشت کو ان کے درمیان، اور اونچا کر دیا ہے ہم نے بعض کو بعض سے مدارج و مراتب کے لحاظ سے (یہ اس لئے کیا گیا ہے) تاکہ انسانوں میں بعض بعض سے کام لیں۔

اس کا مطلب آج ہی نہیں، صدیوں پہلے مشہور مفسر قرآن القاضی بیضاوی نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

ای یستعمل بعضهم بعضا فی حوائجهم فیحصل بینهم تآلف وتضام وینتظم بذلک نظام العالم (ص ۱۸۱ ج ۲)	یعنی انسانوں میں بعض بعض سے اپنی حاجتوں میں کام لیں، اور اسی ذریعہ سے باہم انس و تآلف پیدا ہوتی ہے۔ اور بعض بعض کے ساتھ مل گئے ہیں۔ عالم کے نظام کا انتظام اسی پر قائم ہے۔

حاصل اس کا کیا ہوا؟ یہی کہ نوعِ انسانی جن کے افراد فطرۃً و طبعاً ایک دوسرے کے ساتھ مل جل کر رہنا چاہتے ہیں، ان ہی کو بجائے توڑنے اور ایک کو دوسرے سے جدا کرنے کے قصداً و ارادۃً خود پیدا کرنے والے نے مدارج و مراتب کا یہ اختلاف پیدا کر کے یعنی معاشی لحاظ سے بعضوں کو بعض پر برتری عطا کر کے وحدت و وفاق کا ایسا نظام قائم فرمایا ہے کہ ساری انسانی برادری گویا زنجیر کی کڑیوں کی شکل میں ایک دوسرے کے ساتھ گتھی ہوئی زندگی بسر کر رہی ہے۔ کیسی عجیب بات ہے، مراتب و مدارج کا وہی معاشی نشیب و فراز ان کی وہی اونچ نیچ بلندی و پستی جسے گرید کر آج بھڑکایا جا رہا ہے اور اسی اختلاف کو دکھا دکھا کر فساد و جدال، فتنہ و فساد کی جہنم انسانی بستیوں میں بھڑکانے والے بھڑکا رہے ہیں۔

آپ نے دیکھا اللہ کی ایک ہلکی سی تدبیر سے اسی اختلاف کو قرآن نے اتحاد و اتفاق کا کتنا مستحکم و استوار ذریعہ اچانک بنا دیا۔ دوسرے جس سے جدائی اور فصل کی فصل کاٹنا چاہتے ہیں۔ بلکہ کاٹ رہے ہیں، اسلام نے اسی کو میل ملاپ اور وصل کے سدا بہار پھول پیدا کرنے کی تدبیر سے بدل دیا، ایسی تدبیر کہ صرف ذہنی تصورات کے رخ کی ہلکی سی تصحیح اس کے لئے کافی و وافی ہے، غلط نقطہ نظر قائم کرکے جس واقعہ کو لوگوں نے اپنے اور اپنے بعد ساری انسانیت کے دکھ کا ذریعہ بنا لیا تھا اب اسی میں راحت و آسائش کی ضمانت بلا شبہ نظر آرہی ہے۔

اب کوئی نہ سمجھنا چاہے تو اور بات ہے، ورنہ حق یہ ہے کہ احتیاجی تعلقات (جو قانون تفضیل بعض علیٰ بعض) کا قدرتی نتیجہ ہے۔ ان ہی تعلقات کی بنیاد پر کسی آبادی کے افراد میں اس قسم کی وابستگیوں اور پیوستگیوں کا جو تماشا نظر آتا ہے کہ دھوبی کمہار کا برتنوں میں محتاج ہے، دیکھا اپنے کپڑوں کے دھلانے میں دھوبی کا، حجام زرگر کا، زرگر حجام کا، عالم طبیب کا، طبیب عالم کا، کیمیا والے طبعیات والوں کے، طبعیات والے کیمیا والوں کے، اور اس طویل زنجیر نے کی تفصیل کا بجائے کتابوں کے ہر ملک اور ہر ملک کی ہر آبادی کے اوراق پر چلتی پھرتی تصویروں کی شکل میں ہر جگہ آپ بآسانی مطالعہ اور مشاہدہ کرسکتے ہیں، ظاہر ہے کہ سارا تماشا، اسی تقسیم معیشت اور رفعنا بعضہم علیٰ بعض کے اسی شجرۂ طیبہ یا مقدس درخت ہی کا تو ثمرہ ہے، جس کی مختلف شاخوں پر ہر آبادی کے مختلف افراد بیٹھے ہوتے ہیں، یا انسانیت کی زنجیر کے حلقوں کی شکل ہر ایک اختیار کئے ہوئے ہے۔

الحاصل سب کو سب کچھ دے دیا جاتا، بجائے اس کے قدرت نے یہ طریقہ بنی نوع انسانی کے ساتھ جو اختیار کیا ہے کہ کچھ نہ کچھ سب کو دے کر ہر ایک کو دوسرے کا دست نگر بنا دیا ہے، اگرچہ قدر و قیمت کے اعتبار سے باہمی احتیاج کی یہ کیفیتیں بیسیوں شکلوں میں منقسم ہیں، لیکن افراد کی باہمی پیوستگی کا یہ نظام ہے تو یہی تفضیل بعض علیٰ بعض کے قانون کا نتیجہ، یعنی بعض کو بعض پر صفات و کمالات، عواطف و رجحانات کے حساب سے جو برتری عطا کی گئی ہے۔ اسی نے ہماری آبادی کو گویا اینٹوں کی اس دیوار کی شکل میں ڈھال دیا ہے۔ جس کی ہر اینٹ دوسری اینٹ پر قائم اور اسی سے سہارا لئے ہوئے ہے، انسانیت کا یہ مایۂ ناز افتخار کہ ؎

چو عضوے بدرد آورد روزگار — دگر عضوہا را نماند قرار

اگر سوچا جائے تو اس میں فطری انجذاب کے ساتھ ساتھ احتیاجی تعلقات کے ان مادی اسباب کا ہاتھ بھی یقیناً نظر آئے گا، اور اسی کا اثر ہے کہ باہم اگر ہم ایک دوسرے کے ساتھ کبھی الجھ بھی جاتے ہیں۔ تو بالآخر عموماً طبیعت غالب آکر اس غیر طبعی کیفیت کا ازالہ کرکے تعلقات کو پھر سنبھال دیتی ہے، بلکہ میں تو یہاں تک کہنے کے لئے آمادہ ہوں کہ دنیا کے مختلف خطوں اور علاقوں میں مختلف پیداواروں کی پیدا کرنے کی صلاحیت جو قدرت نے پیدا کی ہے، نظری وسعت و کشادگی سے اگر کچھ کام لیا جائے تو بنیاد اس قرآنی آیت

وفی الارض قطع متجاورات	اور زمین میں باہم ملے جلے قطعات
وجنات من اعناب وزرع	ہیں، اور باغ ہیں انگوروں کے
ونخیل صنوان وغیر صنوان	اور کھیت ہیں، درخت ہیں،
یسقی بماء واحد ونفضل	چند تنے والے اور ایک تنے والے
بعضها علیٰ بعض فی الاکل۔	سینچے جاتے ہیں ایک ہی پانی سے
(الرعد)	اور برتری بخشتے ہیں بعض کو

بعض پر پھلوں میں۔

سے بھی ذہنوں کو چاہا جائے تو اسی واقعہ کی طرف منتقل کیا جا سکتا ہے۔ یعنی سب کچھ ہر ملک اور ہر ملک کے ہر علاقہ اور قطعہ میں جو نہیں پیدا ہوتا، بلکہ ضرورت کی مختلف چیزوں کو قدرت نے مختلف ممالک اور ان ممالک کے مختلف قطعات کے ساتھ جو مختص کر دیا ہے، کسی کو معدنیات، کسی کو زرعیات، کسی کو مصنوعات، اسی طرح مختلف حاجتوں کا مختلف اقالیم اور کشوروں کے ساتھ خصوصی تعلق جو نظر آتا ہے میرے خیال میں تو یہ بھی وہی "تفضیل بعض علیٰ بعض" ہی کی یہ ایک وسیع شکل ہے اور کہا جا سکتا ہے کہ اس ذریعہ سے کسی آبادی ہی کے افراد کو نہیں، بلکہ مختلف بلاد و امصار میں بکھری ہوئی انسانی برادری کو بھی باہم مربوط رکھنے کا کام قدرت لینا چاہتی ہے، اور لینا چاہتی ہے کیا معنیٰ؟ تاریخ کے نامعلوم زمانے سے دور دراز ممالک کے رہنے والوں میں مختلف قسم کے تعلقات جو نظر آتے ہیں۔ مواصلات کی جو آسانیاں آج مہیا ہیں جس زمانے میں ان کا پتہ بھی نہ تھا، ہم دیکھتے ہیں کہ ایک ملک کے تاجر دوسرے ملکوں میں ہندوالے سندھ میں، سندھ والے ایران میں، ایران والے عرب کے سواحل پر، عرب کے باشندے بحر روم کے کناروں پر فنیقیہ والے وینس اور یورپ کے دوسرے شہروں میں جو گھومتے پھرتے تھے۔ بتایا جائے کہ بجز اسی احتیاجی رشتہ کے اور کونسی چیز تھی جس نے کرۂ زمین کے بعد المشرقین پر رہنے والوں کو یوں جوڑ رکھا تھا یقیناً یہی قدرتی رشتہ تھا جس میں مشرق بعید کے بعید ترنقاط مثلاً جاپان و چین کے باشندے اور مغربی آبادیوں کی آخری حدود تک کے رہنے والے اور جو ان کے درمیانی علاقوں میں آباد تھے، سب کے سب تسبیح کے دانوں کی طرح پروئے ہوئے اور پھولوں کے ہار کے مانند ایک دوسرے کے ساتھ گتھے ہوئے تھے۔ ہر علاقہ کا آدمی دوسرے علاقہ میں گھومتا رہتا تھا، قافلوں کا ایک سلسلہ تھا، جو رواں تھا، دواں تھا، ہر ملک کے باشندے دوسرے ملک کی پیداواروں کے لئے چشم براہ رہتے تھے۔ ہندوستان کے رہنے والے استنبول کے قالین، کاشان کے مخمل، چین کے ظروف کو فخریہ استعمال کرتے تھے۔ عرب کے رہنے والے سیف ہندیہ تیغ ہندی کے بھروسہ پر اپنی زندگی کے دن کاٹتے تھے، اور میں کہاں تک تفصیل کروں کہ کہاں کہاں کے باشندوں کو کن کن [illegible] کے جہازوں کا ترقی کی راہوں سے، اور کن کن [illegible] [illegible] مدتوں سے اتصال رہتا تھا جزیروں اور [illegible] کو دیکھا جاتا تھا کہ اپنے اپنے جزیروں کی پیداواروں کو لے [illegible] [illegible] کی [illegible] کی ضرورت کی چیزوں کو بدلتے [illegible] ملتے ہیں۔

حتیٰ کہ ہمارے ملک ہندوستان میں مصری اور چینی کے غالباً قدیم زمانے کی تاریخی یادگاریں ہیں۔
شکر کی خاص قسم کا نام مصری اسی لئے رکھ دیا گیا تھا کہ مصر سے وہ ہندوستان آتی تھی۔ اور چینی بھی چینی
اسی لئے کہتے تھے کہ چین سے وہ درآمد ہوتی تھی، انتہا یہ ہے کہ علاج و معالجے جیسی اہم ضرورت میں بھی ایک
ملک بغیر کسی دغدغے کے دوسرے ملکوں پر بھروسہ کرتا تھا۔ قدیم یونانی طب کے نسخوں میں روم کی مصطگی
آرمینیہ کی گِل (مٹی)، کشمیر کا بنفشہ، ختن (چینی ترکستان) کی بادیان، اور کیا کیا بتاؤں کن کن ملکوں کی پیدا
شدہ دوائیں کہاں کہاں استعمال ہوتی تھیں۔ بلکہ آثار قدیمہ والے دور دراز ممالک کے سکوں کو مختلف
علاقوں میں پا کر آج جو متحیر ہو رہے ہیں۔ حد یہ ہے کہ بغداد کا سکہ سائبیریا میں بلکہ ہندوستان کے ڈھلے
ہوئے پیسے اور روپے میکسیکو (امریکہ) تک میں جو نکل رہے ہیں اگر ان قصوں کو بھی

نحن قسمنا بينهم معيشتهم في	ہم ہی نے بانٹ دی ہے الحیوۃ الدنیا
الحيوة الدنيا ورفعنا بعضهم	(پست زندگی) میں ان کی معیشت کو
فوق بعض درجات ليتخذ	ان کے درمیان، اور اونچا کر دیا ہے ہم
بعضهم سخريا۔	نے بعض کو بعض سے مدارج و مراتب کے

لحاظ سے، (یہ اس لئے کیا گیا ہے) تاکہ انسانوں میں بعض بعض سے کام لیں۔

کے قرآنی اشارے کی وسیع پیمانے پر تفسیر ہی سمجھا جائے تو اس کے انکار کی کیا کوئی وجہ ہو سکتی ہے۔ مگر خدا
ہی جانتا ہے کہ کس جرم کی پاداش میں اچانک یورپ کی سرزمین سے وطنیت کے بھوت نے سر نکالا۔ وہی بھوت
انسانیت پر سوار ہو گیا۔ جھوٹی غیرت، جاہلی حمیت کے غلط جذبات کو بھڑکا بھڑکا کر ان ہی کو جو ملے جلے
تاریخ کے نامعلوم قرون سے ملے ہوئے تھے۔ خود اکتفائیت کے مغالطی ہتھوڑوں سے اچانک توڑ پھوڑ کر
جدا کر دیا گیا۔ دوسروں سے بے نیاز ہو کر اپنی اپنی ضرورتوں کو ہر ملک خود مہیا کرے، اسی افتراقی و
انشقاقی نظریہ کا غوغا بلند کیا گیا، اپنی اپنی منڈیوں میں اپنے اپنے راگ الاپنے کے لئے ڈیڑھ ڈیڑھ اینٹوں
کی مسجدوں کی تعمیر کا اشتغال ہر جگہ درست ہونے لگا۔ ابتدا میں یورپ اور ایشیا جیسے وسیع علاقوں ہی کی حد تک خود
اکتفائیت کی یہ تحریک محدود تھی۔ لیکن جس سیاسی تصور پر اس تحریک کی بنیاد قائم کی گئی ہے۔ اس کا لازمی نتیجہ
یہ تھا کہ بات ان وسیع علاقوں ہی تک محدود نہ رہے، کھلی ہوئی بات ہے کہ ہر ہر اقلیم مختلف ملکوں میں اور ہر
ملک مختلف صوبوں میں ہر صوبہ مختلف اضلاع میں، ہر ضلع مختلف تعلقوں میں، ہر تعلقہ مختلف دیہاتوں
کی شکل میں مختلف سہولتوں کی وجہ سے بٹا ہوا تھا اور ہے۔ "ہر جگہ کے رہنے والے بجائے دوسروں کے اپنی
ضرورت خود پوری کریں" خود اکتفائیت کے قانون کی جب یہی تعبیر تھی اور اس کے سوا ہو ہی کیا سکتی ہے
تو ملکوں سے آگے بڑھ کر صوبوں میں، و صوبوں سے بھی متجاوز ہو کر اضلاع کے رہنے والوں تک پر خود
اکتفائیت کے ہتھوڑے اگر پڑنے لگے ہیں، تو جو بویا گیا تھا، یہ تو اسی کی اُگی ہوئی فصل ہے، جسے بہرحال
بنی آدم کو کاٹنا ہی پڑے گی، بلکہ کیا تعجب ہے کہ ضلعی حدود کو توڑ کر تعلقوں بلکہ گاؤں تک میں یہ عارضہ پھیل جائے۔
آبادیوں کی بیگانگیاں جس رفتار سے آگے بڑھتی چلی جا رہی ہیں۔ بظاہر اس کا انجام تو یہی معلوم ہوتا ہے۔

لیکن خیر دوسرے ملکوں کا رنگ تو ابھی ہلکا ہے عصمت کے دائرے سے بیچارگی، بی بی کو باہر نکلنے کا موقعہ ہی نہیں دے رہی ہے۔ چاہنے والے اگر چاہتے بھی ہیں، تو جو نہیں چاہتے ہیں وہ ان کی چاہ کو کب پوری ہونے دیتے ہیں۔ لیکن وطنیت اور وطنیت کے ساتھ ساتھ خود اکتفائیت کے معلم اول غریب یورپ ہی کو اپنے ہاتھوں کی اس بھڑکائی جہنم میں خود کودنا پڑا ہے، بے گانگی نے عداوت کی آگ سلگائی، اب اسی آگ میں ہر تھوڑے تھوڑے وقفہ سے خود یورپ کو بھی بھننا پڑتا ہے۔ اور یورپ کے ساتھ ان مسکینوں کو بھی بالآخر اس جلن میں حصّہ لینا ہی پڑا جنھیں مختلف ترکیبوں سے یورپ والوں نے اپنا طفیلی بنا لیا ہے۔

اب سوچنے والوں کی آنکھیں کھلی ہیں، چاہا جا رہا ہے کہ اس ٹوٹی ہوئی دُنیا کو اور ٹوٹی ہوئی تو غلط تعبیر ہے، وہ تو جٹی ہوئی تھی، بلکہ صحیح یہ ہے کہ خود اپنے ہاتھوں کی توڑی ہوئی اس دُنیا کو پھر جوڑ جائے، تب عصبۃ الاقوام (لیگ آف نیشنس) یا تخفیف اسلحہ اور از یں قبیل بیسیوں ناموں سے بیسیوں تجویزیں بچاری جا رہی ہیں، تا کہ جو الگ کئے گئے ہیں، باہم انھیں پھر ملا دیا جائے۔ حالاں کہ دور کی ان کوڑیوں کے لانے میں وقت ضائع کرنے سے کتنا آسان تھا اب بھی ہے ہمیشہ رہے گا کہ خود اکتفائیت کے اس حیوانی خبط کو دماغوں سے نکال کر پھر بنی آدم کے گھرانوں کو لیتخذ بعضہم بعضاً سخریا کے اسی قدرتی قانون کے ماتحت چھوڑ دیا جائے، آزاد چھوڑ دیا جائے، تا کہ تاریخ کے نامعلوم زمانہ سے جس حال پر ان کے احتیاجی و معاشی تعلقات قائم تھے، اسی حال پر پھر وہ واپس ہو جائیں۔

الغرض سب کو سب کچھ پیدا کرنے کی تلقین کی جگہ ہر ملک کو ان ہی چیزوں کے پیدا کرنے کا مشورہ دیتے ہوئے جنھیں اپنے اپنے ماحول اور موسمی و مقامی خصوصیات کے لحاظ سے بآسانی بہتر شکلوں میں وہاں کے باشندے پیدا کر سکتے ہیں، اگر ایک ملک کی آبادیوں کو دوسرے ممالک کی آبادیوں سے پیوستہ و وابستہ کر دیا جائے تو یوں بھی یہ بات خود اکتفائیت کے حیوانی اصول کے مقابلہ میں زیادہ مفید ہو سکتی ہے، کیوں کہ گر پڑ کر بقول شخصے

"نکلتا جیا برے احوال"

کی شکل میں مثلاً صنعتی ممالک کو جبراً و قہراً کسی نہ کسی طرح مصنوعی ذرائع سے کام لے کر غیر فطری طور پر اگرچہ زرعی ملک میں بدل دیا جا سکتا ہے، یوں ہی زرعی علاقوں میں بھی صنعتی کاروبار پھیلایا جا سکتا ہے لیکن سچ یہ ہے کہ واقع میں جو زرعی علاقے ہیں، زرعی پیداواریں جتنی عمدہ شکلوں میں وہاں مہیا ہو سکتی ہیں، بالجبر زرعی بنائے ہوئے خطوں کی پیداواریں ان کا مقابلہ نہیں کر سکتیں۔ یہی حال مصنوعات اور ضروریات حیات کی دوسری چیزوں کا ہے۔ میں پوچھتا ہوں کہ ہندوستان میں اگر چاہا جائے تو انگور یا انار نہیں پیدا ہو سکتے، یقیناً ہو سکتے ہیں اور جب کوشش کی گئی تو سب نے دیکھا کہ یہ دونوں پیدا ہوئے، لیکن کابل یا کشمیر کے انگوروں یا اناروں کا مقابلہ کیا وہ کر سکتے ہیں، جب ہندوستان کے آموں کو بیچ کر ہم کابل کے انگور کھا سکتے ہیں؛ قند بعد کے [illegible] کو لذت پہنچ سکتے ہیں، اسی طرح ہم اپنے ملک کی قدرتی

پیداواروں کا دوسرے ممالک کی قدرتی پیداواروں سے جب بآسانی تبادلہ کر سکتے ہیں، تو خواہ مخواہ ایک ذہنی خیال کہ یہ ہندوستان ہی کا پیدا کیا ہوا انگور چوں کہ ہے، اس لئے بدمزہ ہی کیوں نہ ہو کابل و کشمیر کے انگوروں پر ہمیں اسے ترجیح دینا چاہئے، وسواس اور وہمی احساس کے سوا یہ چیزیں اور کیا ہیں۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ موجودہ اقوام کی ان معاشی وابستگیوں سے چاہنے والے اگر چاہیں تو لیگ آف نیشنس (جنیوا والی، یا جس قدر ایک والی) وغیرہ کے مقاصد کو ایک حد تک اس ذریعہ سے بھی حاصل کر سکتے ہیں۔ یہی پٹیرٹی جنگ جو ابھی گزری ہے خود اسی کے تجربات بتا رہے ہیں کہ زندگی کی معمولی معمولی سہولتوں مثلاً مٹی کے تیل جیسی چیزوں تک نے جنگ سے لوگوں کو بے زار بنا رکھا ہے، اُف! کونین کی کمیابیوں نے ملیریا کے مریضوں کو جتنا پریشان کیا ہے، کیا ان لوگوں میں اس کی ہمت ہو سکتی ہے کہ جس ملک سے کونین برآمد ہوتی تھی اس سے جنگ کا ارادہ کریں، آپ اقوام کی مجلسوں میں اسی جنگ کو روکنے کے لئے قوموں کو اس پر مجبور کرنا عقل کا اقتضا سمجھتے ہیں کہ باوجود استطاعت کے آئندہ وہ اپنی بحری فوجوں کی تعداد معینہ مقدار سے نہ بڑھائیں یا سرے سے حربی آلات و اسلحہ کے کارخانے ہی بند کر دیئے جائیں۔ کیا جنگ کے ان ہی خطرات کے انسداد کی ایک صورت یہ بھی نہیں ہو سکتی ہے کہ زندگی کی ضرورتوں میں ایک ملک کو دوسرے ملک کا کچھ اس طرح محتاج بنا دیا جائے کہ ایک کا کام دوسرے کے بغیر چل ہی نہ سکے، یعنی وہی قدرت کا جو قانون ہے، اسی پر دُنیا کو واپس ہو جانے کی اجازت دیدی جائے۔ تو بالکلیہ نہیں، ایک بڑا سبب قوموں کی پنجہ آزمائیوں کے رکنے کا کیا یہ اندیشہ نہیں ہو سکتا ہے کہ لڑائی کی صورت میں ان چیزوں سے محروم ہونا پڑے گا۔ جن کی برآمد کا دارومدار اسی قوم پر ہے جس سے ہم لڑنا چاہتے ہیں۔ کچھ نہیں تو انسدادِ جنگ کے اسباب میں ایک مؤثر سبب کی حیثیت سے یقیناً یہ ایک بڑی بات ہو سکتی ہے، بشرطیکہ قومیت کا آسیب قوموں کے سروں پر جو کھیل رہا ہے، اس بھوت کے اتارنے میں پہلے کامیابی حاصل ہو جائے۔

اور یوں بھی تجربہ کی ایک بات یہ بھی ہے کہ تاریخ کے نامعلوم زمانے سے جس ملک میں جن پیداواروں کی تیاری کا دستور اس ملک کی خصوصیات کی بنیاد پر چلا آ رہا تھا، اس کا انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس ملک کے باشندوں کو عموماً ایک فطری مناسبت ان ہی چیزوں سے ہو جاتی تھی۔ مہارت و کاریگری میں دوسرے ممالک ان کا مقابلہ مشکل ہی سے کر سکتے تھے۔ یہ تجربہ بھی اسی کی تائید کرتا ہے کہ ہر ملک میں ہر قسم کی چیزوں کی پیدا کرنے کی کوشش پر خود اکتفائیت کے نظریہ کے زیر اثر اصرار، یوں بھی چنداں مفید نہیں، اسی طرح مفید نہیں جیسے اس زمانے میں دُنیا کے اس قدیم اصول کو جو توڑا گیا ہے۔ یعنی عموماً قاعدہ تھا کہ حصول معاش کا جس خاندان میں جو ذریعہ پشتینی طور پر چلا آ رہا تھا، لوگ ادھر ادھر دیکھے بغیر اسی پیشہ کو اختیار کرتے ہوئے نسلاً بعد نسلٍ چلے جاتے تھے، جس کا اس فائدہ کے سوا کہ نسبتاً معاشی افکار میں لوگ اس لئے کم مبتلا ہوتے تھے کہ اپنی معاش کا ذریعہ ان کے نزدیک متعین ہوتا تھا۔ ایک دھوبی کا لڑکا پیدا ہونے کے بعد مطمئن رہتا تھا، سمجھتا تھا کہ روزی کمانے کے لئے مجھے وہی کرنا ہے جو میرا باپ کر رہا ہے، دھوبیوں کی اولاد اگر بڑھ رہی تھی، تو فرق بس یہ ہے کہ کھانے والوں کی نسلوں میں بھی اسی نسبت سے

اضافہ ہو رہا تھا، یہی وجہ تھی کہ کبھی کسی زمانہ میں میں نہیں جانتا کہ کسی پیشہ ور کو اس کی شکایت پیدا ہوئی ہو، کہ باپ کے جس پیشے کو اس نے اختیار کیا تھا اس کی مانگ نہیں ہو رہی ہے۔ الا ما شاء اللہ، گفتگو کا تعلق عام حالات ہی سے ہے۔

بہر حال اس فائدے کے سوا بڑا فائدہ اس کا یہی تھا کہ بچپن سے ہر پیشہ ور کا پیشہ چوں کہ طے شدہ ہوتا تھا، اس لئے ہر بیٹا اسی وقت سے جب سے ہوش سنبھالتا تھا، باپ سے اپنے پیشہ کے گروں کو سیکھتا رہتا تھا، مسلسل عملی مشق وقت آنے تک اس فن میں اس کو ماہر بنا دیتی تھی۔ اور یوں بھی موروثی مؤثرات کا انکار نہیں کیا جا سکتا، ہندوستان ہی میں دیکھئے، تعلیم و تعلم کا جدید مغربی اصول ڈیڑھ صدی سے اس ملک میں رواج ہے، ہر ہر صوبہ میں بیسیوں کالج بلکہ یونیورسٹیاں، سینکڑوں بلکہ ہزاروں مدارس قائم ہیں، لیکن اس ملک کے جن خاندانوں کا موروثی پیشہ تعلیم اور تعلم اور دماغی کاروبار تھا، مثلاً برہمن یا کائستھ، جدید تعلیم کے سلسلہ میں کیا ان کا کوئی مدمقابل ہے؟ بنگال کے بنگالی، کہا جاتا ہے کہ تعلیم جدید میں بہت آگے نکل گئے ہیں، لیکن اس پر کوئی غور نہیں کرتا کہ آگے نکلنے والوں میں اکثریت کبیرہ کن لوگوں کی ہے؟ پوچھ لیجئے، دیکھ لیجئے، وہی چٹرجی، بنرجی، مکرجی وغیرہ برہمن یا مترا، گھوش وغیرہ کائستھ خاندان کے افراد آگے بڑھے ہوئے ہیں، یعنی وہی لوگ جن کے آبا و اجداد ہزارہا سال سے تعلیم میں آگے بڑھے ہوئے تھے، یہی حال مدراس، مرہٹہ، وغیرہ کے ان علاقوں کا ہے، جہاں سمجھا جاتا ہے کہ جدید تعلیم نے اچھے اور ممتاز افراد پیدا کئے ہیں، بہر حال جو حال افراد کا ہے، وہی اقوام کا ہے۔ جن پیداواروں کا جس جس ملک سے قدرتی تعلق مدت دراز سے رہا ہے، میرا تو یہی خیال ہے کہ ان ہی ملکوں سے ان پیداواروں کے متعلق اچھی قسموں کی توقع کی جا سکتی ہے۔ بشرطیکہ ان کی کارکردگی کی صلاحیتوں کو بجائے ابھارنے اور ترقی دینے کے مردہ کرنے کی کوشش خاص اغراض کے تحت نہ کی جائے اور ممالک کے متعلق تو میں نہیں کہہ سکتا اپنے ملک ہندوستان میں تو دیکھ رہا ہوں کہ موروثی پیشوں سے لوگوں کو ہٹا ہٹا کر جب سے دوسرے شعبوں کی طرف دعوت دینے میں ہمت افزائیوں سے کام لیا جا رہا ہے۔ ممکن ہے کہ ابتداءً میں کچھ لوگوں کو نفع محسوس ہوا ہو، لیکن تعلیم یافتہ طبقہ میں "شکم" کا سوال تمام سوالوں سے زیادہ اہم جو اس وقت بنا ہوا ہے، مرنے سے پہلے لوگوں کو موت کا مزہ چکھنا پڑ رہا ہے تو اس میں بڑا دخل ان ہی غلط ہمت افزائیوں کو ہے، پہلے اپنے باپ کے موروثی پیشے اور اس پیشے کی آمدنی پر لوگ قانع تھے، ہزارہا ہزار سال سے ایک خاص قسم کی مطمئن زندگی عموماً سب کو میسر تھی، لیکن آج ان ہی غریبوں کو گم کردہ نشیمن پرندوں کی شکل میں دیکھا جا رہا ہے کہ ادھر سے ادھر مارے پھرتے ہیں، معاش کا جو آبائی ذریعہ تھا وہ بھی کھو بیٹھے اور دوسرا نیا ذریعہ رزق کا مل نہیں رہا ہے، اور ملے بھی تو زندگی کا جو "آبائی معیار" تھا وہ نظر سے پوشیدہ ہو گیا، اب کوئی "معیار" ان کے سامنے ایسا نہیں ہے جس پر پہنچ کر اطمینان کا سانس وہ لے سکتے ہوں۔

"ایں ہم رفت، آں ہم رفت"

خیر یہ میں کدھر نکل گیا، دماغ میں بات تھی، موقعہ اظہار کا آگیا، جی نہ چاہا کہ کترا کر نکل جاؤں۔
اب پھر اصل مسئلہ کی طرف متوجہ ہوتا ہوں، میں یہ کہہ رہا تھا کہ معاشی مراتب و مدارج کے اختلافات اور ان ہی اختلافات سے پیدا ہونے والی پستی و بلندی کو اہمیت دے دے کر اس زمانے میں ہر ملک و قوم کے حق میں اس مسئلہ کو ایک مستقل "شعلۂ جوالہ" کی شکل جو عطا کی گئی ہے۔ ایسا "شعلۂ جوالہ" کہ تقریباً ہر ملک کے باشندے کانپ رہے ہیں، ڈر رہے ہیں کہ دیکھئے اس شعلہ میں ہمیں کب جھونکا جاتا ہے۔ خانہ جنگی اور طبقاتی معرکہ آرائیوں کا ذریعہ اسی مسئلہ کو بنانے والے اس ملک میں کب بناتے ہیں۔

اب کسی کو مجھ سے اتفاق ہو، یا نہ ہو لیکن میرا خیال تو یہی ہے کہ قرآن نے فکری تصحیح سے کام لے کر اسی مسئلہ کو جس سے بد اندیشوں نے چاہا ہے کہ انسانی برادری کو ہر ملک اور قوم میں ٹکرا دیں، بجائے ٹکرانے کے اسی کو بچھڑے ہوؤں کے ملانے کا ذریعہ اتنی آسانی سے بنا دیا ہے کہ نقطۂ نظر کو قرآنی مشورہ کے مطابق بدلنے کے ساتھ ہی وہ کانٹا ہی درمیان سے نکل جاتا ہے، جسے چھپا چھپا کر میٹھے بٹھائے آدم کی اولاد کو لوگوں نے بے چینی اور بلاوجہ کی کلفت و قلق میں مبتلا کر رکھا ہے، اونچ نیچ کے قصہ کو دیکھ دیکھ کر سماج کے بعض افراد کے قلوب میں دوسرے افراد سے جو کڑاہیاں پیدا کرائی جا رہی ہیں میرا خیال کرتا ہوں کہ قرآن نے جو نقطۂ نظر پیش کیا ہے۔ توڑنے کی جگہ جوڑنے کا ذریعہ اسی قصہ کو اس نے املاک کے جس طریقہ سے بنا دیا ہے۔ انصاف سے غور کرنے والوں کے لئے اس میں ان شاء اللہ تسلی و سکینت کا بڑا سرمایہ ہاتھ آسکتا ہے۔

لیکن سچی بات یہ ہے کہ املاک کی اس تدبیر سے اس چبھن اور خلش کو تو ہم مٹا سکتے ہیں جو باہم افرادِ انسانی میں معاشی مدارج و مراتب کے اختلاف سے پیدا ہوتی ہے، لیکن باہمی احتیاجات کی یہ تلخ اونچ نیچ زنجیرہ جس میں تقسیم معیشت اور تفضیل بعض علی بعض کے قانون کے تحت آدم کی اولاد جکڑی ہوئی ہے، کھلی ہوئی بات ہے کہ معیشت کے اس نظام میں رزقی اعتبارات سے کسی کا بلند مقام پر قابض ہو جانا اور کسی کا پست جگہ پر رہ جانا ناگزیر ہے، آخر جب سب کچھ سب کو نہیں دیا گیا ہے۔ بلکہ صلاحیتوں اور سلیقوں کے مختلف ملکات اور کمالات و صفات کے مختلف حصوں کے مختلف افراد حصہ دار ہیں، اور ہر کمال ہر صفت اپنے نتائج کی قدر و قیمت کی وجہ سے برابر نہیں ہے۔ خصوصاً معاشی برتری جن کمالات و صفات کے بل بوتے پر لوگوں کو حاصل ہو جاتی ہے، چوں کہ ان کی تعداد ہر آبادی میں تھوڑی ہوتی ہے، اس لئے بآسانی ان کا بدل ضرورت مندوں کو میسر نہیں آتا، بخلاف ان لوگوں کے جو ان معاشی برتری رکھنے والے افراد کے محتاج ہوتے ہیں کہ کثرتِ تعداد کی وجہ سے ان کا بدل ہر جگہ بآسانی مل جاتا ہے، یہی سبب ہے کہ کسی امیر یا تاجر کا ملازم تو ڈرتا رہتا ہے کہ اگر میں ان کے پاس سے چلا جاؤں گا، تو وہی کام جو میں انجام دیتا ہوں اسی کام کے کرنے والے بیسیوں ان کو مل سکتے ہیں۔ لیکن نوکری چھوڑ کر یہ اگر علیحدہ ہو گیا تو میرے کام سے استفادہ کر کے اجرت دینے والے دنیا میں چونکہ کم ہیں، اس لئے ایسا آدمی جس کی مجھے ضرورت ہو اس کا تلاش کرنا میرے لئے آسان نہ ہوگا، یہ ایک واقعہ ہے جس کا تعلق روز مرہ کے مشاہدہ سے ہے۔

قانونِ بسط کے تحت رزق حاصل کرنے کا ذریعہ قدرت جن کے لئے فراہم کرتی ہے۔ درحقیقت ان کی برتری کا راز یہی واقعہ ہے، یعنی ہونے کو تو وہ بھی دوسروں کے محتاج ہوتے ہیں، لیکن جن کے یہ محتاج ہوتے ہیں، ان بیچاروں کا بدل تو انھیں بآسانی مل سکتا ہے اور مل جاتا ہے، بخلاف ان کے جو ان کے محتاج ہوتے ہیں کہ ان کو عموماً ایسے افراد کے پانے میں دشواری پیش آتی ہے جو ان کا در ان کے کام کا محتاج ہو۔

یہی وہ نقطۂ بحث ہے، جہاں پر اس معاشی زنجیر کے ان حلقوں کو جو اپنے آپ کو رزقی حیثیت سے پستی میں پاتے ہیں۔ یعنی وہی لوگ جو بجائے بسط کے قانون قدر کے تحت روزی پاتے ہیں۔ ان کے دلوں میں بسطی رزق والوں سے اگر شکایت نہ بھی پیدا ہو۔ لیکن خود پیدا کرنے والے کی طرف سے ان کے قلوب میں اگر یہ سوال اٹھے کہ بجائے دوسروں کے زنجیر کے اس حلقے میں مجھے ایسی جگہ کیوں دی گئی جہاں پر رہنے والوں کو قدری معیشت گذارنی پڑتی ہے۔ آخر قانونِ قدر کے نشانہ ہم ہی کیوں بنے۔ بسطیوں کا جو پیدا کرنے والا ہے، خالق میرا بھی تو وہی ہے، پھر ان کو اتنا دیا گیا، دیا جا رہا ہے کہ خرچ کرنے، خوب اچھی طرح دل کھول کر بھی خرچ کرنے کے بعد پس انداز کرنے کا ان کو موقعہ مل جاتا ہے، اور ہمارا حال یہ ہے کہ آج کھانے کو اگر مل گیا تو

چہ خورد بامداد فرزندم

کی فکر اسی وقت اندر اندر ہماری جان کھائے جاتی ہے، سر چھپاتے ہیں تو پاؤں کھلتا ہے اور پاؤں پر کپڑا ڈالتے ہیں تو سر ننگا رہ جاتا ہے۔

قدری پیمانے پر رزق پانے والوں کے دلوں کا یہی احساس (شعوری یا غیر شعوری طور پر) اس مسئلہ کا وہ رُخ ہے جس کا تعلق بجائے مخلوقات یا اپنے ابنائے جنس کے خالق تعالیٰ کی ذات کی طرف ہے۔ اس سوال کا یہ جواب کہ بنی نوع انسانی کے بکھرے ہوئے افراد کی تنظیم اور باہم ان میں پیوستگی و وابستگی کے تعلقات کو پیدا کرنے کے لئے کسی کا اوپر اور کسی کا نیچے ہونا ضروری تھا۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہئے کہ سب ہی اگر انجن ہی بن جائیں گے تو ڈبہ اور بوگی آخر گاڑی کا کون حصہ بنے گا۔ اور گاڑی میں جب ڈبے یا بوگی ہی نہ ہوں گے تو نرے تنہا صرف انجن سے کیا کام چلے گا۔ خواہ ساری گاڑی کی روحِ رواں انجن ہی کیوں نہ ہو۔ اسی طرح جسدِ انسانی میں ہر ہر عضو کو دل و دماغ ہی کا مقام اگر عطا کیا جائے گا۔ تو پھر ہاتھوں، ٹانگوں، انگلیوں کے وظائف کون ادا کرے گا۔ واقعات کی حد تک بلاشبہ یہ ایک معقول جواب ہے، یوں بھی اگر سوچا جائے کہ جمادات کی طرف سے اگر یہ مطالبہ پیش ہو کہ نباتات کی صفات سے ان کو کیوں محروم رکھا گیا، یا نباتات کی جانب سے احتجاج کی یہ آواز بلند ہو کہ حیوانی کمالات سے محروم کر کے سلسلہ وجود میں ان کا درجہ پست کیوں کر دیا گیا، اسی طرح حیوانات اگر چلانے لگیں کہ آدم کی اولاد جن صوری و معنوی قوتوں سے سرفراز ہے، وہی قوتیں جن کی بدولت ساری کائنات پر انسان کی حکومت قائم ہے سب پر وہ [illegible] ثابت کرتا ہے، ان سے وہ کیوں محروم ہیں

الغرض متفاوت صفات وکمالات رکھنے والی اس دنیا کے ہر طبقہ کی طرف سے پستی وبلندی، فراز ونشیب کے اسی سوال کو اگر اٹھایا جائے تو بتایا جائے کہ مذکورہ بالا جواب کے سوا کہنے والے اور کیا کہہ سکتے ہیں۔ خدا کی مخلوق ہونے میں جمادات، نباتات، حیوانات وانسان، جب سب برابر ہیں تو کسی کو کم کسی کو زیادہ جو دیا گیا ہے، اس کی توجیہ میں اس کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ اس مطالبہ کے معنی تو یہی ہوئے کہ گوناگوں بوقلموں، موجودات سے بھری ہوئی یہ دنیا گویا صرف ایک ہی ہستی کی شکل میں بدل دی جائے یعنی وہی بات کہ سب کو انجن ہی انجن بنا دیا جائے جس کا دوسرا مطلب یہی ہوگا کہ ریل گاڑی اور اس کے منافع وفوائد کے سارے قصہ ہی کو ختم کر دیا جائے۔ مگر بایں ہمہ انصاف کی بات یہی ہے کہ انسان کی اجتماعی عقل اس جواب سے اطمینان حاصل کرنے کے باوجود جب انفرادی طور پر قدری زندگی کی کشمکشوں میں مبتلا ہوتی ہے۔ تو اس وقت تفاوت صفات کا یہ فلسفہ اور اس فلسفہ کے مصالح دماغوں سے عموماً غائب ہو جاتے ہیں۔ سب جانتے ہیں، روزمرہ کے ان تجربات کو سب مانتے ہیں کہ "انسانی معاشرہ" کا سارا دارومدار صفات وکمالات اور ان سے پیدا ہونے والے مدارج ومراتب کے اسی اختلاف وتفاوت ہی پر قائم ہے۔ اس کو ختم کر دینے کے یہ معنی ہیں کہ احتیاجی تعلقات کا وہ رشتہ جو اس وقت ہم میں ایک کو دوسرے سے جوڑے ہوئے ہے، اسی وقت ختم ہو جائے گا، اسی طرح ختم ہو جائے گا جیسے خود اتفاقی زندگی رکھنے والے حیوانات میں ان روابط کے فقدان کی وجہ اختلاف وتفاوت کا یہی فقدان بنا ہوا ہے، اسی کا نتیجہ ہے کہ بیلوں کی قطار سے کوئی بیل، یا گھوڑوں کے اصطبل سے کوئی گھوڑا، بکریوں کے مندول سے کوئی بکری اگر غائب ہو جاتی ہے۔ تو ان میں کسی کو کانوں کان خبر تک نہیں اس قصہ کا احساس بھی نہیں ہوتا۔ لیکن بڑی تو بڑی "انسانی آبادی" کا کوئی معمولی رکن۔ مثلاً کوئی حجام، کوئی دھوبی ایسی کچھ دن کے لئے اگر کہیں چلا جاتا ہے تو لوگوں میں کھلبلی مچ جاتی ہے، حد تو یہ ہے کہ حلال خوروں یا بھنگیوں تک کی اسٹرائک بڑے بڑے شہروں میں قیامت برپا کر دیتی ہے۔

سوال یہی ہے کہ ان بین مشاہدات، کھلے کھلے تجربات کے باوجود قدری پیمانہ پر رزق پانے والوں میں شکایت کا یہ احساس آخر کیوں پایا جاتا ہے؟

عام طور پر "تقدیر" کے مسئلہ کو بھی لیا جاتا ہے کہ اس شکایت کے ازالہ کا ذریعہ بنایا جائے پڑھنے والے ان ہی مواقع پر پڑھ دیتے ہیں۔

کوئی [illegible] ہے، کوئی بینوا فقیر ہے   جسے چاہا جیسا بنا دیا تری شان جل جلالہ

آخر معاشی نشیب وفراز یا بسط وقدر کا یہ قصہ، ان صفات وکمالات، فطری ملکات وجبلات ہی کے ساتھ جب وابستہ ہے، جن کے نتائج قدر وقیمت کے اعتبار سے قدرتاً مختلف ہیں تو کھلی ہوئی بات ہے کہ انسانی فطرت کا جو پیدا کرنے والا ہے وہی فطرت کے ان جبلی لوازم وآثار کا بھی خالق ہے اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

کل شیء من القدر حتی العجز والکیس   ہر چیز تقدیر سے ہے حتی کہ زندگی کے

کاروبار میں) بےچارگی و درماندگی اور دانائی و ہوشیاری (یہ بھی مقدر ہی سے ہے)

اور اسی بنیاد پر جیساکہ عرض کرچکا ہوں

واللہ یبسط الرزق لمن یشاء و یقدر۔ — اور اللہ جس کی روزی میں چاہتا ہے بسط پیدا کر دیتا ہے۔ اور جس کی روزی میں چاہتا ہے قدر پیدا کر دیتا ہے۔

کے الفاظ میں الرزق کے بسط و قدر کو حق تعالیٰ نے براہ راست اپنی مشیت ہی کی طرف منسوب فرمایا ہے اور جہاں تک میں جانتا ہوں امارت و غربت، یا بسط و قدر کے متعلق یہ آخری جواب ہے، جو عام مذاہب کی طرف سے دے کر بولنے والوں کی زبان بند کر دی جاتی ہے۔ لیکن قرآن بھی اسی جواب کو آخری جواب ٹھہراتے ہوئے خاموش ہو جانے پر لوگوں کو اگر مجبور کرتا تو اپنے دلائل اور اپنی حجتوں کے متعلق "حجۃ بالغہ" یعنی ایسی دلیل ہونے کا دعویٰ ہی وہ کیوں کرتا جو شکوک و شبہات کی انتہائی جڑوں تک پہنچ کر ان کی باریک سے باریک رگوں اور ریشوں کو گہرائیوں سے نوچ نوچ کر اکھاڑ پھینکتی ہے؛

آئیے اور اس مسئلہ میں بھی قرآن کی "حجۃ بالغہ" کا تماشا کیجئے، کوئی طول طویل بات نہیں ہے، بلکہ وہی امالہ کی پرانی ترکیب سے کام لیتے ہوئے قرآن نے لوگوں کو جیساکہ میں سمجھتا ہوں ادھر متوجہ کیا ہے کہ الرزق کی تقسیم بسط اور قدر کے ان دو مختلف پیمانوں پر قدرت جو کر رہی ہے، اس کے متعلق یہ سوال کہ ایسا کیوں کر رہی ہے؟ ظاہر ہے کہ اس سوال کے جواب دینے کا واقعی استحقاق اسی کو حاصل ہے اور اس کے سوا اور کس کو ہو سکتا ہے جو قصداً و ارادۃً ان دو مختلف پیمانوں پر الرزق کو اپنے پیدا کئے ہوئے بندوں میں بانٹ رہا ہے لیکن قبل اس کے کہ خود بانٹنے والے اور تقسیم کرنے والے سے پوچھا جاتا، قرآن نے لوگوں کی اس حماقت پر مطلع کیا ہے کہ انھوں نے پیش قدمی کر کے بغیر کسی حق کے اپنی طرف سے اس سوال کے خود تراشیدہ بے بنیاد قطعاً بے بنیاد غلط جوابات گھڑ لئے اور انہی غلط جوابوں کو صحیح علم باور کر کے ادھر قدریوں نے بیٹھے بٹھائے اپنے آپ کو ایک نا شدہ اندرونی کوفت میں مبتلا کر رکھا ہے۔ اور دوسری طرف اسی غلط علم اور غلط احساس کا نتیجہ بسطیوں پر یہ مرتب ہوا ہے کہ اپنے متعلق وہ الگ ایک بے جا خوش اعتقادی کے شکار بنے ہوئے ہیں۔ حاصل اس کا یہی ہے کہ غلط علم سے لوگوں نے اس مسئلہ میں بھی جو غلط اقتصادی نظریہ قائم کر لیا ہے۔ اسی غلط علم کی تصحیح کرکے نقطۂ نظر کا امالہ قرآن نے ایک ایسے اعجازی رنگ میں کر دیا ہے کہ جن شکووں اور شکایتوں یا کڑکڑاہٹوں اور بھنبھناہٹوں سے آج آسمانوں کو سر پر اٹھایا گیا ہے، میں نہیں جانتا کہ اس امالے کے بعد ان کے خطرے کی بھی قلوب میں گنجائش باقی رہ سکتی ہے، اگرچہ ایک سے زائد مقامات پر قرآن میں یہ مسئلہ پایا جاتا ہے، لیکن مجھے اس کا اعتراف کرنا چاہئے کہ جس توجہ کی یہ قرآنی آیتیں مستحق تھیں، اتنی توجہ ان کی طرف نہیں کی گئی۔ بہ حال توجہ کی گئی ہو یا نہ کی گئی ہو، قرآن میں تو موجود ہیں، اور ان ہی کو اب میں پیش کرتا ہوں، سب سے پہلی آیت اس سلسلہ کی وہی ہے جو سورۃ الفجر میں بایں الفاظ پائی جاتی ہے۔

واما الانسان اذا ما ابتلاہ	کہ آدمی سو جب جانچتا ہے اس کا مالک
ربہ فاکرمہ ونعمہ فیقول ربی	اس کو، تب عزت عطا کرتا ہے اسے اور
اکرمن واما الانسان اذا	نعمت سے سرفراز کرتا ہے اس کو تو
ما ابتلاہ ربہ فقدر علیہ	کہنے لگتا ہے وہی آدمی کہ میرے مالک نے
رزقہ فیقول ربی اھانن کلا	میری عزت بڑھائی۔ اور آدمی ہی کو

جب اس کا مالک جانچتا ہے تب تنگی کر دیتا ہے روزی کو اس کے، تو کہنے لگتا ہے کہ میرے مالک نے مجھے ذلیل وخوار کر دیا۔" ہرگز نہیں۔"

میں دوسروں کو کیا کہوں، خود اپنا حال بھی مدت تک اس آیت کے متعلق عجیب تھا۔ یعنی ابتدائے زندگی میں اس کا جو ترجمہ سمجھ میں آیا تھا، اس کی بنیاد پر یہ خیال گذرتا تھا کہ اللہ میاں نے جس بندے کو نعمتوں سے سرفراز فرمایا ہے۔ وہ اگر یہ کہتا ہے کہ خدا نے مجھے نعمت سے سرفراز فرمایا تو غلط کیا کہتا ہے، آخر وہ یہ نہ کہے تو کیا کہے۔ پھر اسی کو کلا کے توبیخی لفظ سے ڈانٹنے کے کیا معنی!؟ اسی طرح دوسرے جزء کے متعلق بھی یہی وسوسہ ہوتا تھا کہ ضیق معاش میں مبتلا ہو کر جو بیچارہ اپنے ہم جنسوں میں ہلکا اور سبک ہو رہا ہے، اہانت وذلت کی اس کیفیت کا اگر اظہار کرتا ہے تو ایک واقعہ کا اظہار کرتا ہے، اگرچہ اس پچھلی بات کے متعلق یہ بھی خیال گذرتا تھا کہ اس میں مالک کی شکایت کا پہلو چونکہ پیدا ہوتا ہے، ہو سکتا ہے کہ اسی کے متعلق تنبیہ کی گئی ہو، حافظ کا شعر یاد آجاتا تھا ؎

گناہ گرچہ نبود اختیار ما حافظ تو در طریق ادب کوش گو گناہ من ست

لیکن خیر "طریق ادب" کے ذیل میں ربی اھانن (میرے مالک نے مجھے ذلیل کیا) کی شکایت کو تو داخل کیا جا سکتا ہے۔ مگر پہلے جزء میں تو اس کی بھی گنجائش نہ تھی بلکہ

اما بنعمۃ ربک فحدث	تو اپنے رب کی نعمت کا چرچا کر۔

یا اسی کے مفاد کو دہرانے والی یہ حدیث

فلیر اثر نعمتہ علیہ	پس چاہئے کہ دکھائے اللہ کی نعمت کے اثر کو اپنے اوپر۔

وغیرہ میں تو اسی کا مطالبہ کیا گیا ہے کہ نعمت سے جو سرفراز ہو، چاہئے کہ وہ اس کا اعلان کرے۔ پھر جن پر اکرام کیا گیا اور جو نعمتوں سے نوازے گئے ہیں، وہی بیچارے ربی اکرمن (میرے مالک نے میرا اکرام واعزاز کیا) کے الفاظ کے ساتھ تحدث بالنعمۃ کے حکم کی تعمیل اگر کرتے ہیں، تو غلطی کیا کرتے ہیں۔ زجر وتوبیخ کا مستحق ان کو اس مقام پر کیوں ٹھیرایا گیا۔ یہ واقعہ ہے کہ سالہاسال تک اسی الجھن میں الجھتا رہا، کتابوں میں بھی دیکھتا تھا، لیکن ژولیدگی کا ازالہ نہیں ہوتا تھا۔

مدت کے بعد جو بات تھی جب وہ واضح ہوئی، تو صرف یہی نہیں کہ اس مقام کے متعلق جو شکوک تھے اُن ہی کا ازالہ ہو گیا، بلکہ اس سوال کا یعنی الرزق کو بانٹنے والے نے بسط وقدر کے دو مختلف

پیمانوں پر کیوں تقسیم کیا ہے۔ صحیح علم کی روشنی میں اس کا جو واقعی جواب تھا، وہ بھی مل گیا، اور یہ معلوم ہوا کہ ان دو مختلف پیمانوں پر رزق پانے والوں میں سے ہر ایک اپنی اپنی رزق کی نوعیت کے متعلق بغیر کسی اخلاقی حق کے بے بنیاد غلط احساسات جو اپنے اندر پیدا کر لیتے ہیں، الرزق کے خود بانٹنے والے نے صحیح علم عطا کر کے ان غلط احساسات کو چاہا ہے کہ مٹا دیا جائے اور یہی بھی یہی بات، جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا کہ الرزق کی تقسیم میں یہ طریقہ کار بانٹنے والے نے کیوں اختیار کیا۔ اس کے صحیح جواب کا واقعی علم ظاہر ہے کہ رزق کے بانٹنے والے اور دینے والے ہی کو ہو سکتا ہے۔ دینے والا ہی بتا سکتا ہے کہ وہ کیوں دے رہا ہے، لینے والے کیا بتا سکتے ہیں، اور کیسے بتا سکتے ہیں کہ دینے والے نے اُس پیمانے پر نہیں اس پیمانے پر، اُس شکل میں نہیں، اس شکل میں انھیں کیوں دیا یا کیوں دے رہا ہے۔ علمی دیانت و امانت کا اقتضاء زیادہ سے زیادہ اگر کچھ ہو سکتا ہے تو یہی ہو سکتا ہے کہ اس کیوں کے جواب میں جہل کا اعتراف کر لیا جائے۔ جس چیز کے جاننے کا ہمارے پاس کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ کہہ دیں کہ ہم اس کے متعلق کچھ نہیں جانتے ہیں، اور جب تک دینے والا خود نہ بتا دے، ہم کچھ جان بھی نہیں سکتے۔ قطعاً نہیں جان سکتے، حقائق و واقعات کے صحیح علم اور صادق تحقیق کی یہی اور صرف یہی ایک ہی متعین راہ ہے۔ اس سے ہٹ کر کہنے والے جو کچھ بھی کہیں گے، یا جو کچھ انھوں نے کہا ہے، اس کی وقعت خود آفریدہ اوہام اور خود تراشیدہ وسوسوں سے زیادہ، قطعاً زیادہ نہیں ہے۔ اب علم و تحقیق کے اس صحیح معیار کو سامنے رکھتے ہوئے اس پر غور کیجیے کہ اسی طرح کے پیمانے پر جن لوگوں کو یہاں روزی مل رہی ہے، مذکورہ بالا علمی و تحقیقی معیار کی بنیاد پر کیا ان کے لئے یہ جائز ہوگا کہ روزی دینے والے سے علم پائے بغیر وہ خود بخود یہ نقارہ پیٹنے لگیں کہ دوسروں کے مقابلے میں میرا انتخاب عزت و نعمت کے لئے کیا گیا ہے، اور دینے والے کا یہ مقصود ہے کہ اپنے ابنائے جنس میں مجھے معزز و مفتخر کیا جائے، کیا جاننے سے پہلے کسی چیز کے جاننے کا یہ بے بنیاد دعویٰ نہیں ہے؟ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ علمی امانت کے مقررہ حدود سے ہٹ کر عقلی ٹٹول سے کام لیتے ہوئے آدمی اگر کچھ خیال کر سکتا ہے تو یہی خیال کر سکتا ہے کہ دینے والے پر نہ تو میرا قرض باقی تھا، اس پر میں نے یا میرے باپ دادوں نے کسی قسم کا کوئی احسان بھی نہیں کیا تھا، میرا کوئی خاص رشتہ ناطہ بھی اس کے ساتھ نہیں ہے، ایسا رشتہ یا تعلق جو صرف میری ذات ہی کے ساتھ مخصوص ہو بلکہ تعلق اس کے ساتھ اگر ہے بھی تو وہی تعلق جو اس کی ہر مخلوق اس کے ساتھ رکھتی ہے۔ الغرض نہ میں خدا کا بیٹا ہوں، نہ بھتیجا، نہ میرا وہ مقروض ہے اور نہ ممنون کرم؛ ایسی صورت میں عقل اگر کچھ سوچ سکتی ہے تو یہی سوچ سکتی ہے کہ بلاوجہ مجھے امتیاز بخشنے اور میرے ساتھ ترجیحی سلوک روا رکھنے کا کوئی سبب جب نہیں ہے تو یہ خیال کہ دوسروں کے مقابلے میں میرا انتخاب کر کے خصوصیت کے ساتھ میری عزت افزائی کی گئی ہے، یعنی قرآن کے الفاظ میں

ربی اکرمن — میرے مالک نے مجھے عزت بخشی۔

[illegible]

دعویٰ ہے، خلاصہ یہ ہے کہ بسط کے پیمانے پر ان کو کیوں روزی مل رہی ہے؟ اولاً تو اس کیوں کے جواب میں صحیح منطق کی رو سے جہل کا اعتراف، یہی ان کا صحیح علمی مقام تھا، ثانیاً بجائے دینے والے کے ان پانے والوں کے لئے اگر کچھ نہ کچھ جواب تراش ہی لینا ضروری تھا، تو جیسا کہ میں نے عرض کیا، اس کا اقتضاء بھی یہ قطعاً نہ تھا کہ جواب میں وہ ربی اکرمن (میرے مالک نے مجھے عزت بخشی) کا ڈھنڈورا پیٹنے لگیں، لیکن کیا کیجئے کہ جاہل انسان کو بسا اوقات اپنے جہل پر علم کا دھوکہ لگتا ہے۔ اس کے بعد دلوں میں ایسے خیالات، زبانوں پر ایسے مقالات جاری ہو جاتے ہیں، جن کے متعلق ادنیٰ تامل سے بھی اگر کام لیا جائے تو واضح ہو جاتا ہے کہ جس کے سوچنے کا انھیں کوئی حق نہ تھا، وہی وہ سوچ رہے ہیں اور بولنے کی جو بات نہ تھی وہی وہ بول رہے ہیں، یعنی جھوٹ سوچ رہے ہیں جھوٹ بول رہے ہیں!

اور جو حال اس سلسلہ میں بسطیوں کا ہے، دیکھا جاتا ہے کہ قدری پیمانے پر رزق پانے والے بھی اسی غلطی کے شکار ہیں۔ وہی علمی بددیانتی کہ جس کے جاننے کا کوئی صحیح علمی ذریعہ ان کے پاس نہ تھا اسی کے جاننے اور جان کر غلط قطعاً غلط احساسات کا اسی بے بنیاد وہم کو سبب بنائے بیٹھے ہوئے ہیں آخر ٹھیک خرچ کے مطابق نپی تلی شکل میں جنھیں دینے والا رزق عطا کر رہا ہے، یعنی قدری پیمانے پر جو رزق پا رہے ہیں، ان کی طرف سے یہ اعلان کہ پیدا کرنے والے نے قدری رزق دے کر چاہا ہے کہ اپنے ہم جنسوں میں ہمیں رسوا اور ذلیل ہو کر جینا پڑے یعنی قرآنی تعبیر میں

ربی اھانن — میرے مالک نے مجھے رسوا اور ذلیل کر دیا

کے احساسات سے جو خود اپنے آپ کو بھی جلاتے رہتے ہیں اور اپنے ساتھ دوسروں کو ان مغالطی وسوسوں میں مبتلا کرنے کے جرم کے مجرم ہو رہے ہیں کہ مذہب نے جس ذات کی رحمتوں اور رافتوں کا اتنی بلند آہنگیوں سے چرچا پھیلایا ہے۔ ذرہ ذرہ میں مطالبہ کیا جاتا ہے کہ اس کی مہربانیوں، کرم فرمائیوں کا معائنہ کیا جائے رحم سے بھری ہوئی اس ذات نے بغیر کسی سابق قصور کے ان بیچاروں کو رسوائی کی، اس جہنم اور ذلت کی اس دوزخ میں کیوں جھونک دیا ہے، آخر یہ فیصلہ کہ ذلیل و خواری کرنے کے لئے قدریوں کے ساتھ قدرت یہ برتاؤ کرتی ہے، اس کی بنیاد کیا ہے؟ تحقیق و علم نے قدری پیمانے پر رزق پانے والوں کو ایسے کون سے مقدمات دیئے ہیں، جن کی روشنی میں ان کے دعوے نے ربی اھانن (میرے مالک نے مجھے رسوا کر دیا) کے اس نتیجہ کو پیدا کیا ہے؟ دینے والے سے پوچھے بغیر خود پانے والوں کو اس فیصلے کا حق، کیا دنیا کی کوئی منطق دے سکتی ہے؟ سوچا جائے تو یہاں بھی منطق سے کام لینے والوں نے الٹی منطق ہی سے کام لیا ہے، حالانکہ درحقیقت نہ سیدھی منطق ہی کا حق ان کو پہنچتا تھا، نہ الٹی منطق کا، بلکہ وہی بات یعنی اعتراف جہل، ان کا نتیجہ علم اگر کچھ ہو سکتا تھا تو یہی ہو سکتا تھا۔ مگر جب منطق ہی کے دامن کو انھوں نے پکڑا تھا، عقل ہی سے فیصلہ مانگنے پر یہ مضطر و مجبور تھے، تو اسی سے ان کو پوچھنا تھا کہ میں نہ تھا، پیدا کرنے والے نے مجھے پیدا کیا، ان کمالات و صفات کے ساتھ پیدا کیا، جن کا نام انسانی کمالات ہے۔ مجھے بینائی بخشی گئی، شنوائی بخشی گئی، فہم و فراست فکر و نظر کی قوتیں مجھ میں بھری گئیں، ایسی قوتیں جن کی [illegible] بجائے خود [illegible]

نعمتیں ہیں۔ ان نعمتوں کی کوئی قیمت دینے والے کو میں نے ادا نہیں کی تھی، بغیر کسی معاوضہ اور مزدوری کے مجھے ان نعمتوں سے میں نوازا گیا، پھر کیا یہ عقل کا مشورہ ہوسکتا ہے کہ وہی جس نے میرے ساتھ یہ سب کچھ کیا، بلاوجہ کسی قصور و جرم کے بغیر میری رسوائی اور خواری کے درپے ہوجائے۔ ذلت کا طوق پہنا کر میرے بھائیوں کے درمیان برسر بازار وہی میری رسوائیوں کے تماشے سے لذت گیر ہونے لگے۔

خلاصہ یہ ہے کہ وہی قصہ یعنی بتانے کا جو واقعی حقدار تھا، اس سے پوچھے بغیر یہ جو سمجھ اہانن، ربی اہانن یعنی (ہائے ہائے قدر رزق دے کر میرے مالک نے مجھے رسوا کردیا) کے ساتھ قدری پیمانے پر رزق پانے والوں کا گروہ کوچہ و بازار میں جو چلاتا چیختا پھرتا ہے اور احساس اہانت کی دہکتی انگیٹھی کو اپنے سینوں میں لئے ادھر ادھر جو مارا مارا پھرتا ہے۔ کسی حیثیت سے بھی ان کا یہ فیصلہ اور اس فیصلہ کا اثر احساس اہانت کیا علم کے صحیح معیار پر، یہ مسکین بدنام عقل ہی کی راہ نمائی میں ایک لمحہ کے لئے بھی قابل التفات یا مستحق توجہ ہوسکتا ہے؟

بہرحال تقسیم رزق کے ان دو مختلف پیمانوں کے متعلق بلاوجہ نہ جاننے والوں نے اپنے جس وہم کو علم باور کرلیا تھا، یہ ثابت ہوجانے کے بعد کہ ان کا یہ علم غلط تھا، ظاہر ہے کہ اس مسئلہ کے متعلق جو علم ہے اس کے صرف ایک سلبی اور منفی پہلو ہی کا یہ علم ہوسکتا ہے۔ یعنی ہم نے جو کچھ سمجھا تھا وہ صحیح نہیں ہے مگر یہ سوال کہ پھر صحیح واقعہ کیا ہے، انسان ہونے یا خدا کی مخلوق ہونے میں باوجودیکہ سب برابر ہیں ایسی صورت میں ترجیحی وجوہ کے بغیر بعضوں کے لئے بسط کے پیمانے پر اور بعضوں کو قدر کے پیمانہ پر آخر روزی کیوں بانٹی جا رہی ہے؟ مانا کہ جاہل انسان نے جو وجہ تراش لی تھی وہ غلط تھی، لیکن صرف اس کے غلط ہونے کی واقفیت یہ تو نہیں بتاتی کہ قدرت کے اس طرز عمل کی صحیح اور واقعی وجہ کیا ہے؟ یعنی سلبی پہلو سے واقف ہونے سے ظاہر ہے کہ مسئلہ کا جو ایجابی پہلو ہے، پھر بھی آدمی کے لئے وہ مجہول ہی رہ جاتا ہے۔

کیا قرآن میں اس کا جواب نہیں دیا گیا ہے؟ کیسی عجیب بات ہے۔ قرآن کے گنے چنے وہی الفاظ جو سورۃ الفجر سے میں نے نقل کئے ہیں، ان ہی میں سلب کے ساتھ ایجاب کا بھی صحیح علم عطا کیا گیا تھا، لیکن عموماً خدا کے کلام کو بھی پڑھنے والے جب اسی طریقے سے پڑھتے ہیں، جیسے انسانی کلام پڑھا جاتا ہے، تو یہ دیکھا گیا ہے کہ قرآن جو کچھ دینا چاہتا ہے، جیسا کہ چاہئے، اس کے پانے سے لوگ محروم رہ جاتے ہیں۔ زیادہ مطلب و معنی کے لئے عام طور پر چاہا جاتا ہے کہ الفاظ بھی اسی کی نسبت سے زیادہ ہوں لیکن قرآن کے تجربہ کار ہی جانتے ہیں کہ اس کا رویہ اس باب میں بالکل مختلف ہے۔ اپنے ایک ایک لفظ میں عموماً معانی کے سمندروں کو وہ بند کرتا ہے۔ اور اگر ایسا نہ کیا جاتا، بلکہ معانی کے مطابق قرآن میں الفاظ بھی صرف نہ پیدا کر دیا جاتا، تو جس آسانی کے ساتھ جمع ہونے کی وجہ سے آج اس کی حفاظت ہو رہی ہے، یقین تو نہیں ہوتا کہ ہر زمانے میں وہ اسی طرح ممکن ہوتا۔ جیسے آج ہو رہا ہے۔ لیجئے اسی مسئلہ میں دیکھئے کچھ بھی زیادہ [illegible] آیتوں میں فقط دو دفعہ دہرایا گیا ہے

غور کرنے والے اگر اس میں غور کریں گے تو مسئلہ کے ایچ پیچ کے متعلق وہ جو کچھ بھی جاننا اور دریافت کرنا چاہتے ہیں یقین کیجئے کہ سب کچھ اسی ایک لفظ میں ان کو مل جاتا ہے "ابتلاہ" کے اس لفظ کے جو معنی ہیں، اسے سمجھ لیجئے، پھر جن مطالب پر وہ مشتمل ہے، خود بخود سمجھنے والوں کی سمجھ میں آنے لگیں گے۔

ابتلاہ کے آخر میں "ہ" کا جو حرف ہے، یہ تو ضمیر ہے اور انسان اس کا مرجع ہے، رہ جاتا ہے اب صرف "ابتلا" یہ ماضی کا صیغہ ہے، مصدر اس کی ابتلاء ہے جو اردو میں بھی عموماً مستعمل ہے، امتحان یا آزمانا، جانچنا اس کا ترجمہ کیا جاتا ہے۔ تو اب "ابتلاہ" کا ترجمہ ہوا، آدمی کے رب نے آدمی کا امتحان لیا، یا آزمایا، جانچا، یہ تو اس لفظ کے لغوی معنی ہوئے۔ با مطلب موضوع لینے کی چیز یہ ہے کہ امتحان یا آزمانے، جانچنے کے الفاظ انسان کی طرف جب منسوب ہوتے ہیں، تو ظاہر ہے کہ اس کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ جس کا امتحان لیا جاتا ہے، اس کے جن حالات سے امتحان لینے والا ناواقف ہوتا ہے چاہتا ہے کہ امتحان کے ذریعے سے ان ہی حالات کو جانے، مثلاً اس کے معلومات کیسے ہیں، فلاں علم میں اس کی استعداد کیسی ہے، یا اسی قسم کے نامعلوم امور سے واقفیت امتحان لینے والے کی غرض ہوتی ہے۔ پھر خدا کی طرف بھی امتحان کے لفظ کو جب منسوب کیا جاتا ہے تو کیا ذہن ہٹ کر اس کا بھی کیا یہی مطلب ہوتا ہے یا ہو سکتا ہے یعنی خدا بندوں کے جن حالات سے ناواقف ہے، امتحان میں ڈال کر چاہتا ہے کہ ان ہی حالات کو وہ جانے، خدا کو سرے سے نہ ماننا یہ دوسری بات ہے، لیکن خدا کو خدا مان کر ایک لمحہ کے لئے بھی کسی کو اس مطلب کے انتساب کی جرأت ہو سکتی ہے؟ پس سوال یہی ہے کہ کسی کا امتحان جب خدا لینا چاہتا ہے یا کسی کو آزمانا یا جانچنا چاہتا ہے تو پھر اس کا مطلب کیا ہوتا ہے؟ عام مذاہب و ادیان میں عموماً، خصوصاً قرآن میں بکثرت ابتلا، یا اسی کے ہم معنی الفاظ کا انتساب حق تعالیٰ کی طرف کیا گیا ہے؟ دریافت طلب یہی بات ہے کہ اس وقت اس کا مقصد کیا ہوتا ہے؟ جب یہ مسلم ہے کہ خدا کی باتوں کو مخلوقات اور مخلوقات کے صفات و افعال کے مماثل قرار دینا مذہباً جائز نہیں ہے، کم از کم قرآن نے لیس کمثلہ شیء (کوئی چیز خدا کے مانند نہیں ہے) کا اعلان کر کے مسلمانوں کو اس سے منع کر دیا ہے کہ ذات میں ہو یا صفات میں، یا افعال میں، غرض کسی اعتبار سے کسی چیز کو خدا کے مماثل نہ سمجھنا چاہیے، یہی وجہ ہے کہ سماعت بصارت علم و حیات وغیرہ جیسے صفات قرآن میں جو خدا کی طرف منسوب کئے گئے ہیں، سب جانتے ہیں کہ حق تعالیٰ کی نسبت سے ان کا وہ مطلب قطعاً نہیں ہے جو انسان کی طرف ان ہی صفات کے منسوب کرنے کی صورت میں ہوا کرتا ہے۔ مثلاً بصارت یعنی دیکھنے ہی کی ایک صفت ہے، آدمی کی طرف جب بصارت و بینائی کے الفاظ کو ہم منسوب کرتے ہیں، تو اس وقت بینائی کی اس صفت سے مراد ایسی صفت ہے جو عمل کرنے میں رنگ اور روشنی کی محتاج ہوتی ہے اور بعد مفرط نہ ہو قرب مفرط نہ ہو، ان شروط کے ساتھ اس لئے اس کا یہ ظہور مشروط و وابستہ ہوتا ہے، لیکن ظاہر ہے کہ بجنسہٖ اسی بصارت کے لفظ کو خدا کی طرف جب منسوب کیا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ خدا دیکھتا ہے، تو ہم میں ہر ایک جانتا ہے کہ خدا کی یہ صفت نہ رنگ کی محتاج ہے نہ روشنی کی، نہ دوسرے شروط کی، بلکہ وہ دیکھتا ہے۔ ہر حال میں دیکھتا ہے، پھر دیکھنے کے

اس لفظ کا جو حال ہے، اگر جانچنے آزمانے امتحان لینے کے الفاظ کا بھی یہی حال ہو، یعنی انسان کی طرف منسوب ہونے کی صورت میں اور معنی ہو، اور خُدا کی طرف منسوب ہونے کی صورت میں دوسرے معنی ہوں، تو آپ ہی بتائیے کہ اور ہوتا کیا، یہ کتنی بڑی غلط بدگمانی ہے جو بعضوں سے میں نے سنی کہ ایسے مواقع پر اعتراض پڑنے کے بعد اعتراض سے گریز کے لئے خُدا کی طرف امتحان وابتلاء کے منسوب ہونے والے الفاظ کے معنیٰ کو مولوی بدل دیتے ہیں، حالانکہ آپ نے دیکھا کچھ اسی ابتلاء وامتحان کے لفظ کی خصوصیت نہیں ہے۔ بلکہ یہ ایک عام کُلّی قانون ہے۔ جو ذات وصفات وافعال وغیرہ وغیرہ سب ہی پر حاوی ہے۔ خُدا اپنی تمام شانوں میں جیسے نرالا بے مثل بے نظیر ہے، اسی طرح ابتلاء وامتحان کا جو فعل خُدا کی طرف منسوب کیا جاتا ہے، وہ اس امتحان سے جو ایک مخلوق دوسری مخلوق کی لیتی ہے، قطعاً مختلف ہے اور اس کو مختلف ہونا ہی چاہیئے رہا یہ سوال کہ خُدا کی طرف منسوب ہونے کی صورت میں ابتلاء وامتحان یا آزمانے جانچنے کے ان الفاظ کا کیا مطلب ہوتا ہے، یہ بھی ایسی بات نہیں ہے جو لوگوں کو معلوم نہ ہو، آخر کون نہیں جانتا کہ قرآن میں ایک جگہ نہیں، متعدد مقامات میں بار بار مختلف الفاظ میں یہ اعلان کیا گیا ہے کہ انسانی زندگی کی کوئی خاص حالت وکیفیت ہی نہیں، بلکہ جس زندگی کو آدمی اس وقت زمین پر گذار رہا ہے، ہم اس کی یہ پوری زندگی ہی ابتلاء وامتحان ہی کی زندگی ہے، ایسی آیتیں مثلاً

خلق الموت والحیاۃ لیبلوکم	پیدا کیا خُدا نے موت اور حیات کو تاکہ جانچے
ایکم احسن عملا۔	تمہیں (یعنی یہ جانچے) کہ تم میں عمل میں
سب سے اچھا کون ہے۔	

یا

انا خلقنا الانسان من نطفۃ	ہم نے پیدا کیا آدمی کو ایک ملے جلے نطفہ سے تاکہ
امشاج نبتلیہ فجعلناہ سمیعا بصیرا	جانچیں ہم اس کو، پس بنایا ہم نے اسی

انسان کو شنوا اور بینا۔

ظاہر ہے کہ قرآن میں اس قسم کی آیتوں کی کیا کمی ہے؟ حاصل جن کا یہی ہے کہ زندگی کا کوئی خاص پہلو، کوئی خاص رُخ ہی نہیں، بلکہ پوری زندگی ہی آدمی کی امتحان وابتلاء کی زندگی ہے، اور یہ کیا ہے، تمام آفاقی کائنات کے مقابلہ میں بشری فطرت میں خواہ وہ کسی رنگ میں ہو، دو راہوں میں سے کسی ایک راہ یا دو پہلوؤں میں سے کسی ایک پہلو کے انتخاب واختیار کرنے کی جو خصوصیت رکھی گئی ہے، درحقیقت فطرت کے اسی اقتضاء کے صحیح استعمال کے مطالبہ کی دوسری تعبیر یہ ہے کہ آدمی کی پوری زندگی ہی ابتلاء وامتحان کی زندگی ہے، خُلاصہ یہی ہوا کہ خدا کی طرف ابتلاء وامتحان کے الفاظ جو منسوب کئے جاتے ہیں تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ جن باتوں کو خُدا نہیں جانتا، امتحان لے کر ان ہی کو جاننا چاہتا ہے، بلکہ انسانی فطرت میں اقتدار واختیار، انتخاب وترجیح کی جو قوت رکھی گئی ہے، اسی قوت کے صحیح استعمال کے مطالبہ کا نام ابتلاء وامتحان ہے۔

اب آئیے، بسط وقدر کے دو مختلف پیمانوں پر رزق کی تقسیم کے متعلق خرافی اوہام، ہو غلط فہمیاں کی

تردید کے بعد قرآن میں جو ایجابی علم "ابتلاء" کے لفظ سے دیا گیا ہے۔ اس کا مطلب متعین کیجئے۔ جو باتیں اب تک آپ کو ابتلاء متعلق ان کے متعلق معلوم ہو چکی ہیں، ان ہی کو پیش نظر رکھ کر سوچئے کہ اس کا مطلب کیا ہوا؟ الغرض بات کیا تھی، ورغلط معلومات سے انسان کی فکری معکوسیت کن کن غلط نتیجوں کو پیدا کر رہی تھی، بسطی پیمانے پر رزق پانے والے اپنے بافیدہ خیالات میں مگن ہو کر اکڑ رہے تھے، اترا رہے تھے کہ ان کا اکرام کیا گیا، اپنے ہم چشموں، ہم جنسوں میں ان کا سر اونچا کیا گیا ہے۔ گویا وہ قدرت کے چہیتیں اور پیارے بن رہے ہیں، یوں ہی ضرورت کے مطابق قدر کے پیمانے پر جن کی روزیاں مہیا ہو رہی ہیں، خود اپنے ذہن کے بھپھولوں سے گرم گرم ہو ہو کر کڑھ رہے تھے، گڑگڑا رہے تھے کہ ہمیں پیدا کر کے رسوا کیا گیا، یہی ایک رونا تھا، جس کے ساتھ وہ رو رہے تھے، غم کے آنسوؤں سے اپنے چہروں کو دھو رہے تھے، مگر یہ تو خود تراشیدہ خیالات، غلط معلومات سے نکالے ہوئے غلط نتائج تھے، ظاہر ہے کہ ابتلاء کا خدائی اعلان اب جس حقیقت کو واشگاف کر رہا ہے، یعنی ناواقفوں، جاہلوں کو واقف بنایا جا رہا ہے کہ تقسیم رزق کی دونوں شکلوں اور دونوں پیمانوں میں بانٹنے والے اور تقسیم کرنے والے کی غرض یہ ہے کہ جس کسی کو جس پیمانے پر بھی بسط کے پیمانے پر ہو یا قدر کے پیمانے پر جو کچھ بھی جس شکل میں دیا جا رہا ہے، ہر ایک سے دینے والے کا یہ مطالبہ ہے کہ جو کچھ انھیں دیا جا رہا ہے اس کے استعمال کے صحیح اور غلط طریقوں میں سے جو صحیح طریقہ ہے اسی کو اختیار کریں، جس کے دوسرے معنی یہی ہوئے کہ معیشت کے ان دونوں حالوں (بسط و قدر) دونوں میں بظاہر یہ جو معلوم ہوتا تھا کہ دیا گیا ہے، واقعہ کے صحیح علم کی روشنی میں اب سوجھ رہا ہے کہ درحقیقت ہر ایک سے اپنی اپنی حیثیت کے مطابق سچ پوچھو تو مانگا گیا ہے۔ اسی لئے تو یہی جاتا ہے کہ رزق میں جو یہاں بڑھائے گئے ہیں نہ جاننے کی وجہ سے اپنے اپنے دلوں میں خواہ وہ کسی قسم کے خیالات پکا رہے ہوں، لیکن جو واقعہ ہے اس کے جان لینے کے بعد ہی کہنا پڑتا ہے کہ دراصل ان کی ذمہ داریاں بڑھائی گئی ہیں۔ اور الرزق جن کا گھٹایا گیا ہے، ناواقفیت کی وجہ سے اپنے متعلق خواہ جس قسم کا بھی غلط خیال وہ قائم کر لیں۔ لیکن سچی بات حقیقت کے مطابق یہی ہے کہ دراصل ان کی ذمہ داریاں گھٹائی گئی ہیں، جاننے والے سے جو واقعہ ہے اس کا صحیح علم پانے کے بعد سمجھنے والوں نے یہی سمجھا ہے۔ بلکہ اس کے سوا وہ کچھ سمجھ ہی نہیں سکتے یہاں تو خیر اجمال سے بھی کام لیا گیا ہے۔ سورۃ "الانعام" کو ختم کرتے ہوئے اسی اجمال کی تفصیل خود قرآن نے ان الفاظ میں کی ہے،

وھو الذی جعلکم خلائف الارض ورفع بعضکم فوق بعض درجات لیبلوکم فیما اتاکم ان ربک سریع العقاب وانہ لغفور رحیم۔

وہ خدا ہی ہے جس نے زمین میں تم کو اپنا جانشین خلیفہ بنایا اور تم میں بعض کو بعض سے درجوں میں اونچا کر دیا، اس لئے کیا گیا ہے، کہ جانچے خدا تمہیں ان چیزوں کے متعلق جو تمہیں اس نے دی ہیں یعنی

تمہارا مالک زود انتقام بھی ہے اور قطعاً بلا شبہ وہی بہت بڑا بخشنے والا اور بہت زیادہ رحم کرنے والا ہے

جس کا حاصل یہی ہے کہ زمین اور زمین کی پیداواروں پر قابو عطا کرکے مدارج و مراتب کا جو اختلاف نسلِ انسانی کے افراد میں پیدا کر دیا گیا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ دینے والے نے جس کسی کو جو کچھ دیا ہے، اسی لئے دیا ہے تاکہ وہ جانچے اور آزمائے، گویا الفجر میں جو بات مجمل تھی وہی یہاں مفصل ہے، اسی طرح "الاولاد" کے ساتھ "الاموال" کو فتنہ کا نام قرآن میں جو دیا گیا ہے تو اسی حقیقت اور اسی واقعہ سے ان الفاظ کے ذریعہ قرآن پردہ اٹھانا چاہتا ہے، معاشی زندگی کے ان درجاتی اختلافات کے متعلق جہل نے جو تاریکیاں پھیلائی ہیں، قرآن کا قاعدہ ہے کہ علم کی روشنی دے کر پہلے ان تاریکیوں کا ازالہ کر لیتا ہے، اور اس کے بعد اسی علم کے مطابق عمل کا نظام پیش کرکے مطالبہ کیا جاتا ہے کہ ہر ایک اپنے علم کو صحیح علم کے مطابق بنانے کی کوشش کرے اور طبعی طریقہ عملی زندگی کی تصحیح کا یہی اور صرف یہی ہے، علم کی تصحیح سے پہلے عمل کے اصلاح و درستگی کا جو لوگ ارادہ کرتے ہیں، یقین مانیے کہ چلنے کی حد تک تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھی چل رہے ہیں، لیکن چلنے والے ہی جانتے ہیں کہ قدم قدم پر جہل کی آہنی بیڑیاں کس طرح ان کے لئے روک بنتی چلی جا رہی ہیں، اسی مسئلہ میں خیال کیجئے، تقسیم رزق کے ان دو پیمانوں سے پیدا ہونے والے مشکلات سے آپ چاہتے ہیں کہ لوگوں کو نجات بخشی جائے، لیکن تقسیم رزق کے اس دورنگے نظام کا جن واقعات سے تعلق ہے، ان واقعات کے متعلق علم اور تحقیق کے صحیح ذرائع سے صادق معلومات جو در حقیقت واقعات کے مطابق ہوں۔ ان معلومات کے حاصل کئے بغیر "مشکلات، معاشی مشکلات" "مدارج و مراتب کے اختلاف تفاوت سے پیدا ہونے والے مشکلات" ان ہی الفاظ، صرف الفاظ کو اگر آپ رٹتے رہیں گے تو دوسروں کو جانے دیجئے، اپنے ہی سینے پر ہاتھ رکھ کر سوچئے، تشفی و اطمینان کی خنکیوں کا کوئی اثر آپ اپنے اندر محسوس فرما رہے ہیں، ہر عملی اقدام جو صحیح علم کی روشنی میں نہ ہو، اسی کا نام تو غیر حکیمانہ اقدام اور ان سائنٹفک طرزِ عمل ہے! اسی مسئلہ میں کیا ہوا یا کیا ہو رہا ہے؟ مسئلہ چھیڑ دیا گیا، سوال اٹھا دیا گیا، لیکن اللہ کے بندوں میں کوئی نہیں جو یہ پوچھے کہ جھگڑنے والو! باہم ایک دوسرے پر بپھرنے والو! اس عملی پیچیدگی سے پہلے طے کرنے کی باتیں تو یہ ہیں کہ رزق کی تقسیم کا تعلق کس ذات کے ساتھ ہے؟ وہ خدا کی ذات ہے یا خدا کے سوا کوئی اور ہے؟ اور خود اس سوال سے پہلے تنقیح طلب سوال یہی ہے کہ جھگڑنے والے سرے سے خدا کو مانتے بھی ہیں یا نہیں، اگر مانتے ہیں تو سب مانتے ہیں، یا کوئی پارٹی بحث کرنے والوں کی صرف خدا کو مانتی ہے یا کوئی نہیں مانتی، کھلی ہوئی بات ہے کہ جو حق تعالیٰ کو مانتے ہیں اور مومن ہیں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا کا سچا رسول جو یقین کر چکے ہیں، اس یقین میں ادنیٰ ترین شک بھی ان کی فطرت کے لئے ناقابلِ برداشت بن چکا ہے، ان کا اور ان لوگوں کا طریقۂ بحث و تحقیق ایک کیسے ہو سکتا ہے جو سرے سے العیاذ باللہ حق تعالیٰ کے وجود ہی کو جھٹلا رہے ہیں، یا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صادق دعوے کے انکار پر ان کو اصرار ہے۔ فکر و نظر کی راہ دونوں کی ایک کیسے ہو سکتی ہے؟ اور یہ سارے مسائل کیا ہیں۔ علم ہی سے تو ان کا تعلق ہے، واقعہ کیا ہے؟ خدا ہے یا نہیں ہے، خدا کے رسول

خدا کے رسول واقع میں تھے بھی یا (استغفر اللہ استغفر اللہ) اس میں ابھی کچھ دبدھا اور تردد ہے، ٹھیک ٹھیک واقعات کے مطابق ان سوالوں کے جوابات کا صحیح صحیح علم طے شدہ فیصلوں کی صورت میں جب تک بحث و تحقیق کرنے والے حاصل نہ کرلیں گے، کیا فکر و نظر کی کوئی منطق اس مسئلہ پر ان کو گفتگو کرنے کی اجازت دے سکتی ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ خواہ مخواہ اثبات ہی میں جواب کا علم حاصل کیا جائے۔ بندگانِ خدا حاصل اگر کرسکتے ہو تو نفی و انکار ہی کے متعلق آخری فیصلہ، ایسا فیصلہ حاصل کرو جس میں شبہ اور شک کی پھر گنجائش، کسی قسم کی گنجائش باقی نہ رہے۔ مگر نفی ہو یا اثبات دونوں سے قطع نظر کرکے صحیح نتیجہ تک پہنچنے کی کوشش کے کیا معنی؟ آخر اس قسم کے مباحث میں آج یہ جو کہا جاتا ہے کہ یہاں خدا کو یا مذہب کو درمیان میں لانے کی کیا ضرورت ہے؟ دوسرے الفاظ میں اس کا مطلب کیا یہی نہیں ہوا کہ صحیح نتیجہ تک پہنچنے کے لئے صحیح علوم کو درمیان میں لانے کی کیا حاجت ہے، خدا کا نام یا مذہب کا نام ایسے مواقع پر اگر لیا جاتا ہے تو غرض اس سے یہی تو ہوتی ہے کہ خدا نے جو علم اس مسئلہ میں دیا ہے، یا مذہب میں جو معلومات اس کے متعلق پائے جاتے ہیں پیش کرنے والے ان ہی کو تو خدا کے یا مذہب کے نام سے پیش کرتے ہیں، ہم تو جہاں تک جانتے ہیں، یہی جانتے ہیں! ایسا مذہب جس کے ماننے والے اسے سچا مذہب بھی مانتے ہوں، جو معلومات اس میں ملتے ہوں انھیں خداداد علوم بھی یقین کرتے ہوں لیکن مذہب کے ان معلومات اور خدا کے عطا کردہ ان علوم کا زندگی کے جن مسائل سے تعلق ہو، ان ہی کے متعلق جب ٹھیک واقعات کے مطابق فکر و تحقیق، بحث و تمحیص کا قصہ چھڑے، تو ان معلومات اور ان علوم سے خطرہ ہو کر ان کی راہ نمائی میں ہم غلط نتائج تک پہنچ جائیں گے، دیوانہ ہی ہوگا جو ایسے علوم اور معلومات کو اپنا مذہب یقین کرلے، اور ایسی باتوں کو سمجھے کہ یہ خدا کی باتیں ہیں، اس عقلی انتشار ذہنی پراگندگی کی کوئی انتہا بھی ہے۔ میں تو نہیں سمجھتا کہ ثبات عقل و ہوش اس قسم کے تناقضات ایک دوسرے کی تغلیط کرنے والی باہم دو متضاد چیزوں کو اپنے دماغ اور دل میں کوئی کیسے جگہ دے سکتا ہے۔ لعنت ہے ایسے مذہب پر اور اس کے معلومات پر جو عمل کے وقت بجائے صحیح راہ نمائی کے غلط اندازی اور بجائے راستی کی جنت کے جھوٹ کی جہنم میں آدمی کو ڈھکیل دے۔

بہر حال ہم مسلمانوں کے نزدیک مذہب معلومات کے اس مجموعہ کا نام ہے جن کا تعلق علم محیط کے لازوال سرچشمہ سے ہے۔ علم کا وہی ابدی سرچشمہ جس سے نہ غائب پوشیدہ ہے اور نہ حاضر، مستقبل میں بھی جو کچھ پیش آنے والا ہے، پیش آنے سے پہلے وہ جانا ہوا ہے، ظاہر میں جو کچھ ہے اس پر بھی اور باطن کی گہرائیوں میں جو کچھ پوشیدہ ہے اس پر بھی علم کی یہ لازوال قوت حاوی ہے اور اس طور پر حاوی ہے جس سے کسی شیٔ اور کسی مسئلہ کا کوئی پہلو پوشیدہ نہیں ہے، جس کے جھٹلانے کی قوت ہمارے قلوب سے سلب ہوچکی ہے، یعنی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی کا یقین ہمیں دلایا ہے۔ اسی یقین کے ساتھ ہم جینا بھی چاہتے ہیں، اور اسی طرح ہم میں ہر ایک مسلمان قطعی فیصلہ کی صورت میں یہ طے کئے ہوئے ہے کہ اسی پر وہ مرے گا بھی، مذہب کا یہی مطلب ہمیں سمجھایا گیا ہے، اس کے سوا

جماعت میں بعضوں کے متعلق خیال کرتے ہیں کہ وہ بسط کی حالت میں ہیں۔ اسی طرح دوسروں کو ان کے مقابلے میں سمجھتے ہیں کہ وہ قدر کی زندگی رکھتے ہیں۔ لیکن دوسری طرف یہ بھی واقعہ ہے کہ ایسا آدمی جو کسی آبادی میں بسطی معاش والا سمجھا جاتا ہے، بسا اوقات وہی اس بستی کے باہر رہنے والوں کے مقابلے میں قدری قرار پاتا ہے۔ وجہ اس کی وہی ہے کہ رزق کی یہ دونوں حالتیں (بسط و قدر) درحقیقت معاشی حالت کی اضافی و نسبی شکلیں ہیں۔ یہی نہیں کہ ایک آدمی کسی آبادی میں تو بسطی سمجھا جاتا ہو، اور آبادی کے باہر دوسروں کے اعتبار سے خود وہی اپنے آپ کو قدر کی حالت میں پاتا ہو، بلکہ ایک ہی آدمی مختلف اوقات میں اپنے آپ کو کبھی بسط کبھی قدر کی حالت میں پاتا ہے، بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر یہ کہا جا سکتا ہے کہ ایک ہی شخص ایک ہی وقت میں معاشی زندگی ہی کے بعض شعبوں میں یہ بالکل ممکن ہے کہ اپنے آپ کو بسط کی حالت میں پائے اور دوسرے شعبہ میں وہی قدر کی کیفیت محسوس کرے۔ رزق کی ان دونوں کیفیتوں کی اضافی ہونے ہی کا یہ نتیجہ ہے کہ صحیح طور پر افراد کی تعیین دشوار ہے۔ عمل کی صحیح راہ ایسی صورت میں یہ ہے کہ آدمی بسط کی حالت میں جب اپنے آپ کو پائے سمجھے کہ بسطی ہدایات کے عمل کا وقت ہے، اور جب قدر کی حالت میں اپنے آپ کو دیکھے تو اس وقت ان ہدایتوں کی راہ نمائی حاصل کرے جن کا تعلق قدریوں سے ہے۔

رہ جاتا یہ سوال کہ جب سب خدا ہی کے بندے اور اسی کے آفریدہ ہیں، تو تقسیم رزق کے سلسلہ میں کسی کو بسط کے پیمانے پر رکھ کر امیر، اور دوسروں کو قدر کے پیمانے پر رکھ کر غریب کیوں بنا دیا گیا ہے، امیروں کے ساتھ قدرت کا یہ کیسا انوکھا رشتہ ہے جو عزت و نعمت سے وہ نوازے جا رہے ہیں اور غریبوں نے خدا کا کیا بگاڑا تھا کہ افلاس و غربت کا طوق پہنا کر ان کو رسوا اور ذلیل کیا جا رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس سوال کی بنیاد تو اس پر قائم تھی یعنی واقعہ اگر یہ ہوتا کہ دینے والے کی طرف سے سمجھا جاتا کہ لوگوں کو دیا جاتا ہے، صرف دیا جاتا ہے، دے دیا جاتا ہے۔

لیکن جب صورت حال یہ نہیں ہے بلکہ درحقیقت یہاں، جتنا کم دیا گیا ہے اور جسے جتنا زیادہ دیا گیا ہے، اسی قدر اس سے زیادہ مانگا گیا ہے۔ خود دینے والا جب یہی اعلان کر رہا ہے اور اپنے دینے کی غرض یہی بتا رہا ہے تو جو دینے والے نہیں ہیں ان کے وسوسوں کی کیا وقعت باقی رہ جاتی ہے۔

کیسی عجیب بات ہے جو نہیں جانتے تھے اور جاننے کا حق نہیں رکھتے تھے، لے جانے ہوئے وہ جو کچھ کہہ رہے تھے، قطعاً وہ بات الٹ گئی۔ اب تو اسی کو زیادہ دینا پڑے گا جسے زیادہ دیا گیا ہے، اور وہی پکڑا جاتا ہے، جسے زیادہ دیا گیا ہے اس سے زیادہ مانگا جائے گا۔ اور شاید یہ حکمت ہی کا یہ تقاضا ہے کہ اکثریت و عمومیت کو زیادہ تر قدری پیمانے پر رزق غالباً اسی لئے بانٹا جاتا ہے، خدا ان کی ذمہ داریوں کو کم اور ان کے بوجھ کو ہلکا رکھنا چاہتا ہے، آخر ایسی ذمہ داریاں اور ایسا بوجھ جن سے نہ ہر شخص بآسانی عہدہ برآ ہو سکتا ہے اور نہ ہر ایک میں اس بوجھ کے لادنے کی صلاحیت ہی ہوتی ہے۔ اگر اکثریت کو اس سے مستثنیٰ رکھا گیا ہے تو خدا کی مہربانی کے سوا اسے اور کیا سمجھا جائے، بلکہ سچ تو یہ ہے کہ ہر آبادی میں معدودے چند افراد کو بسط کے پیمانے پر رزق دے کر بسطی ذمہ داریاں عائد بھی کی جاتی ہیں تو اس طور

کہ خود اپنی خواہش اور رضامندی سے وہ ان ذمہ داریوں کو لینے کے لئے اپنے آپ کو پیش کرتے ہیں۔ آخر بسطی پیمانے پر رزق پانے والوں میں ایسا کون ہے جو خود تو قدری رزق کا طالب تھا۔ لیکن قدرت نے اس پر بسطی رزق کا بوجھ لاد دیا ہو، عام طور پر دیکھا تو یہی جاتا ہے کہ بسطی رزق کے حاصل کرنے میں ہر ایک کوشش کی انتہائی شکلوں کو ختم کر دیتا ہے، بلکہ حاصل کر لینے کے بعد بھی اس کی بقا بلکہ ارتقاء کی ممکنہ صورتوں کے مہیا کرنے میں قطعاً کسی قسم کی کوتاہی کو کسی حال میں روا نہیں رکھتا۔ ان میں شاذ ہی کوئی ایسا ہوگا جو اپنے رزق کے اس بسطی پیمانے کو قدری پیمانے سے بدلنے پر دل سے راضی ہو سکتا ہو، پس یہ بھی جو کچھ ہوتا ہے۔ خود لادیتے والے کی خواہش اور مرضی سے ہوتا ہے اور یہ بات کہ ان ہی سے زیادہ مانگا جاتا ہے جنھیں زیادہ دیا جاتا ہے، یہ بھی ایک ایسا فطری مطالبہ ہے کہ مذہب تو خیر مذہب ہی ہے بغیر کسی استثناء کے دنیا کے تمام ملل و ادیان میں بسطیوں کی ذمہ داریوں کی فہرست طویل ہوتی ہے۔ ہم تو دیکھتے ہیں کہ غیر مذہبی دائروں میں بھی مطالبوں کا سارا نزلہ اسی طبقہ پر نازل ہوتا ہے، جو نسبتاً بسطی پیمانے پر رزق پاتے ہیں، مذاہب میں خیر و خیرات، صدقات و زکوٰۃ، صلہ رحمی و مواسات وغیرہ وغیرہ مختلف ناموں سے ان پر اگر ذمہ داریاں عائد کی گئی ہیں تو ٹیکس، ریوینیو، سس، باج، خراج اور کیا کیا بتایا جائے کن کن ناموں سے حکومتیں بھی اگر مانگتی ہیں تو ان ہی سے مانگتی ہیں۔ اسی طرح چندہ، فنڈ، بھری، امداد، اعانت وغیرہ اسمار مختلفہ سے قومی کارکنوں کا حملہ اگر ہوتا ہے تو ان ہی پر ہوتا ہے اور یہ بھی یہی بات کہ اپنی ذاتی ضروریات میں خرچ کرنے کے بعد جس کے پاس کچھ پس ماندہ رہ جاتا ہو، ظاہر ہے کہ مانگا اگر جائے گا تو اسی سے مانگا جائے گا، اور یہ بات جیسا کہ گذر چکی ان ہی لوگوں کو میسر آسکتی ہے، جنھیں قانون بسط پر روزی مل رہی ہے، باقی جن لوگوں کی آمدنی خرچ کے ساتھ نپ تل کر ملتی ہو، یعنی قدر کے پیمانے پر رزق جو پا رہے ہیں، ان سے مانگنے والے آخر کیا مانگیں گے، ان کے پاس باسی ہی کب بچتا ہے، جس کے لئے کھانے والوں کو ڈھونڈھنے کی ضرورت محسوس ہو، اور سچ تو یہ ہے کہ فطری نقطہ سے ہٹے ہوئے ایسے انحراف یافتہ قلوب جن کا ذکر قرآن میں بایں الفاظ فرمایا گیا ہے کہ

واذا قیل لھم انفقوا مما	اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ خدا نے
رزقکم اللہ قال الذین	تمہیں جو روزی عطا کی ہے اس سے خرچ
کفروا للذین امنوا انطعم	کرو، تو انکار کرنے والے ماننے والوں
من لو یشاء اللہ اطعمہ	سے کہتے ہیں، کیا ہم انھیں کھلائیں جنھیں
ان انتم الا فی ضلل مبین۔	خدا چاہتا تو کھلا سکتا تھا۔ نہیں ہو تم لوگ

(یعنی جو لوگ غریبوں کی امداد کا مطالبہ ہمدردی سے کرتے ہیں) لیکن کھلی گمراہی میں۔

فطرت کے ان بیماروں سے اگر قطع نظر کر لیا جائے، تو عام حالات میں خود بسطیوں کا طبقہ خود بھی اپنی ان ذمہ داریوں کو محسوس کرتا ہے جن کا بسط کی حالت میں مطالبہ کیا جاتا ہے۔ اور اسی لئے الرزق کے بسطی پیمانے کے متعلق قرآن نے ابتلائی و امتحانی ہونے کا جو دعویٰ کیا ہے، میرے نزدیک تو یہ ایک ایسا دعویٰ ہے

جس کی تصدیق ہر اس شخص کی فطرت کرتی ہے جو خدانخواستہ کسی شدید غیر فطری عارضہ کا شکار نہ ہو گیا ہو۔ لیکن بسطی پیمانے کے ساتھ ساتھ الرزق کے قدری پیمانے کو بھی ابتلائی و امتحانی قرار دیتے ہوئے قرآن میں جو یہ ارشاد ہے کہ

واما اذا ما ابتلاہ فقدر علیہ رزقہ۔	لیکن انسان ہی کو خدا جب جانچتا ہے اور (اس جانچنے کے سلسلے میں) بنی تُلی کر دیتا ہے اس کی روزی کو۔

یعنی قدری پیمانے پر بھی رزق جنھیں دیا جاتا ہے۔ ان کا بھی ابتلا ہی مقصود ہے، دوسرے الفاظ میں اس کا یہی مطلب ہوا کہ ان کو بھی جو کچھ دیا جاتا ہے۔ لینے ہی کیلئے دیا جاتا ہے۔ بظاہر یہ کچھ عجیب سی بات معلوم ہوتی ہے عام احساس اس سلسلہ میں یہی دیکھا جاتا ہے کہ قدر کے پیمانے پر جو لوگ روزی پاتے ہیں، سمجھا جاتا ہے کہ روزی کے حساب سے ان کا قدر اور تنگی کی حالت میں ہونا، یہی کافی ہے، اب مزید ذمہ داری ان پر کیا عائد ہو گی؟

لیکن دوسرے مذاہب و ادیان کے متعلق تو میں نہیں کہتا، قرآن میں ایک طرف ذمہ داریوں کا ایک سلسلہ اگر ایسا پایا جاتا ہے جن کا تعلق بسطیوں سے ہے تو دوسری طرف ذمہ داریوں ہی کی ایک فہرست ایسی بھی ہے، جن کے متعلق لوگوں کا خیال خواہ کچھ ہی ہو، لیکن میرے نزدیک براہِ راست ان کا رُخ ان ہی لوگوں کی طرف ہے جو قدری پیمانے پر یہاں رزق پا رہے ہیں، اور اسی بنیاد پر میں یہ خیال کرتا ہوں کہ اپنی متعلقہ ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کا جیسے مکلف بسطیوں کا طبقہ ہے، بجنسہ اسی طرح قدریوں کے گروہ کو بھی قرآن نے ذمہ دار بنایا ہے۔ اور اب میں چاہتا ہوں کہ دونوں طبقات کی قرآنی ذمہ داریوں کو الگ الگ درج کر دوں۔

بسطی رزق کی ذمہ داریاں جیسا کہ ابھی یہ بات گذری کہ بسطی پیمانے پر رزق پانے والوں کی ذمہ داریاں تو اتنی بدیہی ہیں کہ نہ صرف دوسرے بلکہ خود بھی اپنے آپ کو یہ طبقہ ذمہ دار محسوس کرتا ہے۔ اسلام کے مطالبات بھی ان سے وہی ہیں، جن کا عام نام خیر و خیرات، انفاق فی سبیل اللہ ہے، اسی عام مطالبہ کی ایک منظم قانونی شکل الزکوٰۃ ہے جس کی تفصیل قانونی ابواب کے ذیل میں کی جائے گی۔ قرآن میں اسی مطالبہ کا ذکر اجمالاً و تفصیلاً کیا گیا ہے۔ خود اسی موقعہ پر یعنی سورۃ الفجر کی اسی آیت میں جس میں بسطی رزق کے متعلق اکرامی نظریہ کی تردید کلا (ہرگز نہیں) کے لفظ سے فرمانے کے بعد یہ جو ارشاد ہوا ہے

بل لا تکرمون الیتیم ولا تحاضون علی طعام المسکین۔	بلکہ تم یتیموں کا اکرام نہیں کرتے اور مسکین کے کھانے پر لوگوں کو آمادہ نہیں کرتے۔

اس میں بھی بسطیوں ہی کی ذمہ داریوں کا اظہار اجمالی الفاظ میں کیا گیا ہے۔ یہ دکھانے کے لئے کہ قرآن اپنے مطالبات کو عائد کرتے ہوئے کتنی نازک منطقیانہ تعبیر میں ان کو پیش کرتا ہے۔ بطور نمونے کے ان الفاظ کی کچھ تشریح اگر کر دی جائے تو غالباً نامناسب نہ ہو گا مطلب یہ ہے کہ نعمت و عزت پانے کے بعد یا نوالوں میں

جو یہ خیال پیدا ہوجاتا ہے کہ میرا اکرام کیا گیا ہے، اور مجھے عزت بخشی گئی ہے، قرآن نے کلّا کے لفظ سے تو چاہا ہے کہ لوگ اس خیال کو اپنے اندر سے نکال دیں لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ نعمت و عزت پانے والا تو خیر اپنے اندر سے اس خیال کو نکال بھی دے سکتا ہے، لیکن اس کا کیا علاج ہے کہ نعمت و دولت عزت و ثروت سے جو یہاں سرفراز ہوتے ہیں انہیں بہرحال دوسرے لوگ معزز اور بڑا آدمی ہی خیال کرتے ہیں، کسی کے پاس کچھ نہ ہو، علم نہ ہو، فضل نہ ہو، فضائل و کمالات کے جتنے سلسلے ہیں سب ہی سے خالی ہو، لیکن اگر کسی جاگیر پر وہ قابض ہے، کسی فرم کا وہ مالک ہے، تو لوگ باوجود کچھ نہ ہونے کے محض اسی دولت و ثروت کی وجہ سے اسے اپنوں میں بڑا آدمی ہی خیال کرتے ہیں، عموماً آبادیوں کے بڑے آدمی کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ کسی نہ کسی درجہ میں الرزق اسے بسطی پیمانہ پر میسر آ رہا ہے۔ پھر قرآن کلّا (ہرگز نہیں) کے لفظ سے تردید جو کر رہا ہے۔ غور کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ نعمت و عزت کو صرف اپنے اعزاز اور اپنے بڑے پن کا ذریعہ بنا لینا، قرآن نے دراصل لوگوں کو اس سے روکا ہے، روک کر پھر اسی عزت و شرف سے جو نعمت و دولت ثروت رکھنے والوں کو حاصل ہوجاتی ہے، اس کے استعمال کے صحیح ذریعہ کی طرف ان آیتوں میں رہنمائی فرمائی گئی ہے، مقصد یہ ہے کہ جو عزت دولتمندوں کو حاصل ہوتی ہے، چاہا یہ جاتا ہے کہ اس عزت اور بڑائی کو ان لوگوں کی عزت اور بڑائی کا ذریعہ بنایا جائے، جنھیں دنیا بلاوجہ اپنی آنکھوں سے گرا دیتی ہے اور اس سلسلہ میں سب سے زیادہ قابل رحم حالت ان بچوں کی ہوتی ہے جو اپنے باپ کے سایہ سے محروم ہوجاتے ہیں، دیکھا جاتا ہے کہ تقریبوں میں، شادیوں میں، تہواروں اور عیدوں کے مواقع پر، باپ رکھنے والے بچے اچھے اچھے کپڑوں میں اپنے اپنے باپوں کے ساتھ خوش خوش چہکتے کودتے ناز نخرے کرتے آ رہے ہیں، دل میں جس چیز کے خریدنے کی خواہش پیدا ہوتی ہے، ابا جی کہہ کر باپ کی فطری محبت کو ابھار ابھار کر کام نکال رہے ہیں، لیکن ان ہی مجلسوں میں وہ بچے بھی ہوتے ہیں جن کے باپ مر چکے ہیں وہ اپنے دل کی آرزو کس سے کہیں، ابا جی فلاں چیز بک رہی ہے، لے دیجئے، کس سے کہیں۔ ان کے ناز اٹھانے والا اس پورے مجمع میں کوئی نہیں ہوتا، جو ان کی طاقت تھی وہ سپرد خاک ہوچکی، دل بیٹھ جانے والی کیفیت ہوتی ہے، جب مجمع میں کوئی بچہ اس شان کے ساتھ شریک ہوتا ہے، یہی وقت ہے ان لوگوں کی آزمائش کا جنھیں بڑائی بخشی گئی ہے۔ اور عزت عطا کی گئی ہے کہ اپنی بڑائی اور اپنی عزت سے کام لیتے ہوئے سوسائٹی کے اس معصوم کس مپرس ہستی کو بڑائی عطا کریں، ایک ایسا تعلق اس کے ساتھ پیدا کریں کہ ان کی بڑائی کی وجہ سے ان بچوں کی بھی عام نگاہوں میں بڑائی پیدا ہوجائے، گویا ان کی عزت کی وجہ سے لوگ ان بچوں کی بھی عزت کرنے لگیں، اکرام یتیم کا یہی مطلب ہے۔

اور یہ حال تو ان بچوں کا ہے جن میں انسانی کمالات و قوتوں کی بھی نشوونما نہیں ہوئی ہے۔ لیکن ان ہی کے ساتھ ہر مجمع، ہر آبادی میں انسانوں ہی کا ایک طبقہ وہ بھی پایا جاتا ہے جن کی قوتیں ارتقائی مدارج کو طے کرنے کے بعد کسی وجہ سے ساکن و معطل ہوگئیں، اور اسی وجہ سے بسا اوقات معمولی کھانے کی ضرورت بھی وہ اپنے دست و بازو سے پوری نہیں کرسکتے، ان ہی کو قرآن کی اصطلاح میں

المسکین کہا گیا ہے، ان لوگوں کو جنھیں نسبتی پیمانہ پر روزی ملتی ہے۔ یعنی ضروریاتِ زندگی میں خرچ کرنے کے بعد جن کے پاس پس ماندہ ہو جاتا ہے۔ ان ہی لوگوں کو آمادہ کیا گیا ہے کہ یہ پس ماندہ دولت اس لئے تمہیں نہیں دی گئی ہے کہ صرف اپنے ہم جنسوں، ہم چشموں میں اپنی بڑائی کا آلہ اس کو بناؤ، بلکہ تمہارے ابنائے جنس میں کسب و سعی کی قوتیں جن کی ٹھنڈی پڑ گئی ہیں، صرف یہی نہیں کہ ان کو کھلاؤ، بلکہ مذکورہ بالا آیت میں تحاضون کا لفظ فرمایا گیا ہے جس کا مصدر محاضہ ہے۔ محاضہ کے معنیٰ ہیں باہم مل کر لوگوں کو آمادہ کرنا، تو اب مطلب یہ ہوا کہ اربابِ ثروت کو ایسا طریقۂ کار اختیار کرنا چاہئے جس کی وجہ سے نہ صرف خود بلکہ دوسرے دولتمندوں میں بھی مسکینوں کی امداد و اعانت کا جذبہ پیدا ہو، گویا ایک ایسا ماحول پیدا کر دیا جائے کہ لوگ امداد مساکین میں ایک دوسرے پر سبقت چاہنے لگیں۔ اور یہ تعلیم اس عام قاعدے پر مبنی ہے کہ عموماً ہر سوسائٹی اور ہر سماج زیادہ تر اپنے طریقۂ کار میں دولت مندوں ہی کو نمونہ بناتی ہے، جس ملک کے دولت مند اپنی دولت کو کھیلوں، تماشوں، عیاشیوں، فضول خرچیوں میں صرف کرتے ہیں۔ دیکھا دیکھی دوسرے بھی ان ہی بیہودہ مشاغل میں مبتلا ہو جاتے ہیں، اور جہاں دولت مندوں میں نیکیوں، غربا پروریوں، مساکین نوازیوں کی رسم جاری ہو جاتی ہے، تو دوسرے بھی ان کو دیکھ کر خیر کے ان ہی ابواب میں اپنی پس ماندہ دولت کو صرف کرتے ہیں۔

الحاصل قرآن کے اشارے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ دولت و نعمت، عزت و آبرو جنھیں دی جاتی ہے، اسی لئے دی جاتی ہے۔ اور یہی اس بڑائی اور اکرام کا صحیح استعمال ہے جو نعمت و عزت کی وجہ سے آدمی کو حاصل ہوتا ہے، قرآنی آیت

احسن کما احسن اللہ الیک — نیکی کر جیسے خدا نے تیرے ساتھ نیکی کی۔

میں بھی اس حُسنِ سلوک کا جو قدرت کسی کے ساتھ کرتی ہے۔ یہی صحیح استعمال بتایا گیا ہے اور میرا تو خیال ہے کہ "الشکر" کے لفظ سے مذہب میں جس چیز کا مطالبہ کیا گیا ہے، اس کا ایک بڑا اور اہم پہلو خداداد نعمتوں کا یہی استعمال ہے، بلکہ اس عام قاعدے کی بنیاد پر جس پر عموماً اسلامی تعلیمات مبنی ہیں، یعنی عمل کی تصحیح کا طریقہ اسلام میں یہ اختیار کیا ہے کہ پہلے لوگوں کے علم کی تصحیح کر دی جائے، علم جب درست ہو جاتا ہے تو قدرتی طور پر عملی اصلاح پر آدمی خود بخود آمادہ ہو جاتا ہے۔ بلکہ صحیح علم سے خود بخود صحیح عمل پیدا ہونے لگتا ہے۔ آپ قرآن میں عملوا الصالحات سے پہلے عموماً امنوا کا لفظ جو پاتے ہیں تو اس کا منشا بھی یہی ہے۔ ایمان دراصل علمی تصحیح ہی کا دوسرا اصطلاحی نام ہے۔ جسے پیغمبر کے توسط سے اہل ایمان حاصل کرتے ہیں۔

بہرحال میں سمجھتا ہوں کہ اس قسم کی قرآنی آیتیں مثلاً سورۂ کہف میں باغ اور کاشت رکھنے والے آدمی کو لیکن جس پیمانہ پر جسے رزق دی گئی تھی۔ اسی کے متعلق کہنے والوں کی

زبان سے یہ فقرہ جو کہلوایا گیا ہے

ولولا اذ دخلت جنتک قلت	اور کیوں نہ ہوا ایسا کہ جب تو اپنے باغ
ماشاء اللہ لا قوۃ الا باللہ	میں داخل ہوا تو کہا ہوتا کہ جو کچھ ہے سب

اللہ کا چاہا ہے۔ نہیں ہے قوت لیکن اللہ ہی سے۔

جس کا حاصل یہی ہے کہ نعمتوں کو پانے کے بعد آدمی کو چاہیئے کہ واقعہ کے مطابق ان کے متعلق جو صحیح دانش اور علم ہو، اس کو اپنے سامنے سے اوجھل ہونے نہ دے، مثلاً باغ والے کے سامنے اس کا باغ تھا حکم دیا گیا کہ اس باغ میں جب جایا کرو تو دو باتیں سوچا کرو، ایک تو یہ کہ جو کچھ ہے سب اللہ کا چاہا ہوا ہے، اور دوسری بات یہ کہ قوت اور طاقت جو کچھ بھی جس کسی میں ہے، اس کا سرچشمہ حق تعالیٰ کی ذات مبارک ہے، ظاہر ہے کہ پہلی بات کا مطلب یہی ہو سکتا ہے کہ جن شکلوں میں نعمتوں کا ظہور ہوا ہو ان کو دیکھ کر چاہیئے کہ اس واقعہ کے احساس کو ہم اپنے اندر پیدا کرتے رہیں کہ ان کی آفرینش اور پیدائش سے ہمارا کوئی تعلق نہیں ہے، بلکہ یہ سب کچھ قدرت کی کارفرمائیوں کا نتیجہ و اثر ہے، باغ ہی کو دیکھئے۔ باغ کی زمین، باغ کے درخت، درختوں کی شاخیں، پتے، پھول، پھل اسی طرح وہ سارے اسباب جنھیں باغ کی نشوونما بارآوری میں دخل ہے، ان میں کوئی چیز بھی ایسی ہے جسے آدمی پیدا کرتا ہے۔ باغ تو خیر باغ ہی ہے۔ ایسی چیزیں جنھیں ہم انسانی مصنوعات خیال کرتے ہیں، بلکہ جن مصنوعات کے متعلق عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ فلاں کی ایجاد ہے۔ مثلاً ریل گاڑی اور اس کے انجن کو لیجئے، خود انجن کے اجزاء لوہا تانبا پیتل، انجن کے فلزاتی و غیر فلزی عناصر اور اس کے سوا جو چیزیں اس کے بنانے میں استعمال ہوتی ہیں کیا ان میں سے کسی ایک چیز کے پیدا کرنے والے ہم ہیں۔ اسی طرح انجن جن چیزوں سے چلتا ہے، بتائیے کہ آگ ہو یا پانی، کیا آدمی ان کا پیدا کرنے والا ہے، پانی کو آگ پر چڑھانے سے اسٹیم پیدا ہوتی ہے۔ کیا پانی اور آگ میں یہ خاصیت آدمی کی رکھی ہوئی ہے۔ کھلی ہوئی بات ہے یہ بھی قدرت ہی کا ایک بنایا ہوا قانون ہے، اسٹیم میں حرکت پیدا کرنے کی قوت ہے، کیا اس قوت کو آدمی نے پیدا کیا ہے؟ سوچتے چلے جائیے۔ اگر آپ حقیقت پر نظر جمائے ہوئے سوچیں گے۔ تو ہر سوال کے جواب میں آپ کو وہی "ماشاء اللہ" کہنا پڑے گا، یعنی سب اللہ کا چاہا ہوا ہے، اسی کی قدرت کی یہ کرشمہ پردازیاں ہیں،[۱] یہ تو پہلے فقرے ماشاء اللہ کا مطلب ہوا، رہی دوسری بات یعنی

---

[۱] یوں بھی اگر سوچا جائے کہ جن ایجادات و انکشافات کو ہم اپنی اپنی دماغی قابلیتوں فکر و غور کی محنتوں کی طرف منسوب کرتے ہیں کیا واقعی وہ ہمارے فکری نتائج ہوتے ہیں، میں آپ کے سامنے دو چیزیں پیش کرتا ہوں، ایک واقعہ تو یہ ہے کہ جدید مصنوعات و ایجادات یا انکشافات جن لوگوں کی طرف منسوب ہیں، زیادہ تر میرا خیال ہے کہ اگر سو فی صد نہیں تو ۹۰ فی صدی یہ واقعہ ہے کہ جنھیں بانی [illegible] یا تو سرے سے موقعہ ہی نہیں ملا یا بہت تھوڑی بہت ابتدائی [illegible] [illegible] یا تو عام [illegible] [illegible] قدرتی طاقتوں کے مقابلہ میں ان کی تعلیم صفر کے [illegible] (بقیہ برصفحہ [illegible])

"قوۃ الا باللہ" یہ اس وسوسہ کے ازالہ کی طرف اشارہ ہے جو عموماً ایسے موقعہ پر دل میں پیدا ہوتا ہے یا ہوسکتا ہے، خیال یہ گذرتا ہے کہ ہیں تو یہ سب کچھ قدرتی پیداوار، اور قدرتی قوانین ہی کے نتائج، لیکن انسان جب تک ان قوانین کا علم نہ حاصل کرے اور علم حاصل کرنے کے بعد اپنی محنت و توجہ کو ان پر صرف نہ کرے، عقل کی ترکیبوں اور ذہن کی تجویزوں کو ان میں نہ لگائے۔ انجن کا وجود نہیں ہوسکتا، اور انجن ہی کیا، باغ میں جب تک باغبانی کے قواعد و قوانین کی پابندی نہ کی جائے گی اس وقت تک جیسا کہ چاہیئے اس کے پھلنے پھولنے کی کیا صورت ہوسکتی ہے اور اتنا حصہ ان چیزوں میں یقیناً آدمی کا ہے، اسی وجہ سے ان چیزوں کو انسانی مصنوعات و ایجادات میں لوگ شمار کرتے ہیں۔ ورنہ اتنا احمق کون ہوگا جو سمجھتا ہوگا انجن کے لوہے یا اس میں جو آگ جلتی ہے، جو پانی خرچ ہوتا ہے، ان چیزوں کا ایجاد کرنے والا اور پیدا کرنے والا آدمی ہے۔

دراصل اسی کے متعلق اس دوسرے فقرے میں چاہا گیا ہے کہ ٹھیک ٹھیک حقیقت اور واقعہ کے بالکل مطابق اپنے علم کو کرلیا جائے، یعنی یہ سوچنا چاہیئے کہ بلا شبہ ان امور کے ظہور میں انسانی ترکیبوں اور تدبیروں کو دخل ہے، لیکن ہمیں اپنے آپ سے یہ پوچھنا چاہیئے کہ ان ترکیبوں اور تدبیروں کا تعلق انسان کی جن علمی و عملی قوتوں سے ہے، خود ان قوتوں کا پیدا کرنے والا کون ہے، کھلی ہوئی بات ہے کہ ہم جب خود اپنے پیدا کرنے والے نہیں ہیں تو ان قوتوں کے پیدا کرنے والے ہم کیسے ہوسکتے ہیں جو ہمارے اندر پائی جاتی ہیں، بلکہ جو ہمارا پیدا کرنے والا ہے۔ ظاہر ہے کہ اسی کے ارادہ و مشیت سے ہماری ان قوتوں کا بھی تعلق ہے "لا قوۃ الا باللہ" دراصل اسی واقعہ کی یافت کا نام ہے۔؎

(بقیہ صفحہ گذشتہ)

حیثیت رکھتی ہے، ہماری بیسویں صدی کے موجد اعظم ایڈیسن ہی کو لیجئے۔ اس بڑے موجد کی سوانح عمری سے کون واقف نہیں، سوال یہی ہے کہ اگر آدمی کی فکری و عقلی قوتوں کے نتائج یہ ایجادات ہیں تو چاہیئے کہ عقلی قوتوں کی تربیت کا جن لوگوں کو اعلیٰ تعلیم گاہوں میں موقعہ ملا رہتا ہے، ان کا دماغ ایجاد کرنے میں سبقت کرتا، لیکن جب واقعہ یہ نہیں ہے تو غور کرنے کی بات ہے کہ ان انکشافات و ایجادات کو ہم کس چیز کا نتیجہ قرار دیں، دوسری بات اسی کے ساتھ جسے میں پیش کرنا چاہتا ہوں، وہ یہ ہے، شاید دوسرے بھی جانتے ہوں کہ ان ایجادات و انکشافات کے متعلق ایک عجیب انکشاف یہ بھی ہے کہ عموماً کسی ایک ایجاد کا خیال کسی ملک میں کسی شخص کے دماغ میں جب آیا تو ٹھیک ان ہی دنوں میں یہ دیکھا گیا ہے کہ بالکل دور دراز ملک کے رہنے والوں میں سے بھی کسی کے دماغ میں بھی ٹھیک ان ہی دنوں میں اس ایجاد کا خیال آیا، مصر کے مشہور سائنٹفک مجلہ "الہلال" کی اشاعت ۱۹۲۲ء نومبر میں ایک مقالہ اسی "توارد" کے متعلق شائع ہوا ہے۔ مستقل ومتتبع سے مقالہ نگار نے عہد حاضر کی (۱۴۳) ایجادوں کے متعلق ثابت کیا ہے کہ ایک ہی زمانے میں دو مختلف ملکوں کے باشندوں کو ان کا توارد ہوتا رہا ہے۔ مثلاً امریکہ میں ایک بات کسی کی سمجھ میں آئی، ٹھیک اسی ہفتہ میں دیکھا گیا کہ انگلستان کا ایک آدمی بھی اپنے دماغ میں اسی خیال کو پا رہا ہے، آخر بتایا جائے کہ اس توارد کی کیا توجیہ ہوسکتی ہے ۱۲

خلاصہ یہ ہے کہ شکر کے سلسلے میں بھی حقائق و واقعات کے مطابق اپنے علم کی تصحیح کرائی جاتی ہے
اور اس سلسلہ میں واقعہ جب یہ ٹھیرا کہ نعمتوں کی شکل میں جو کچھ ہم سے باہر ہے وہ تو "ماشاء اللہ" کا وجود
کچھ ہمارے اندر ہے وہ "لاقوۃ الا باللہ" کا مظاہرہ ہے، اور نعمت ہی کیا، یوں بھی ہر شخص کے لحاظ سے
یہ سارا عالم بجز "ماشاء اللہ" کے یعنی جو کچھ ہے سب اللہ کا چاہا ہوا ہے، اس کے سوا اور کیا ہے، یہ تو باہر کا
حال ہے، اسی طرح ہر شخص کے اندر جس قسم کی قوتیں، طاقتیں، کمالات و صفات پائے جاتے ہیں، ظاہر
ہے کہ یہ سب کچھ "لاقوۃ الا باللہ" ہی کی تو نمائش ہے۔ گویا ان ہی دو فقروں میں سارا عالم آفاقی ہو یا انفسی
یعنی آدمی کے باہر ہو، یا اندر، دونوں کا صحیح علم سمٹ کر آگیا ہے، سوچنے والے جتنا زیادہ سوچتے چلے
جائیں گے، اسی حد تک اس علم کی واقعیت ان پر واضح ہوتی چلی جائے گی، اور جو اپنے علم کو اس حقیقت
سے واقعات کے مطابق کر لے گا، ظاہر ہے کہ اب اس کے بعد جس صحیح راہ عمل کا مطالبہ شکر کے نام سے
رزق پانے والوں سے کیا گیا ہے، وہ خود بخود ان کے علم کا ایک منطقی نتیجہ کی حیثیت اختیار کرلے گا،
یعنی یہ معلوم ہو جانے کے بعد کہ نعمتیں اور جن قوتوں سے ان نعمتوں کو آدمی حاصل کرتا ہے، دونوں
میری نہیں، بلکہ براہِ راست حق تعالیٰ ہی کی ہیں، تو خدا کی چیزوں کے ساتھ خدا کی مرضی کے مطابق طریقہ
عمل اختیار کرنے میں اسے کیا دشواری پیش آئے گی، ہاں جنھوں نے اپنے علم کو واقعات کے مطابق
کرنے کی کوشش نہ کی ہو، یا علم تو ان کا درست ہو چکا ہو، مگر یقین کی کیفیت جیسی کہ چاہیئے اسے حاصل
نہ ہوئی ہو، وقت اگر کچھ ہوتی ہے یا ہو سکتی ہے تو ان ہی کو ہو گی یا ہو سکتی ہے۔ بلکہ اسی علم کو مستحکم اور قلوب میں پوری قوت
کے ساتھ جاگزیں کرنے کے لئے ہم دیکھتے ہیں کہ علاوہ باطنی احساس کے اسلام میں حکم دیا گیا ہے کہ زبان سے، ظاہری صورت سے
بھی "شکر" ادا کرنا چاہیئے، کیونکہ عموماً آدمی کا باطن ظاہر سے متاثر ہوتا ہے، حدیثوں میں ہے، بخاری کی روایت ہے
"جب کوئی پانی پیتا ہے، کھانا کھاتا ہے تو خدا پسند کرتا ہے کہ کھانے والے اور پینے والے اس کی تعریف کریں۔ (وغیرہ وغیرہ)"
نیز کھانے، پینے، پہنے، الغرض نعمتوں کے حصول کے وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو
دعائی نمونوں کو مسلمانوں کے لئے چھوڑا ہے، سب کا مطلب وہی ہے کہ جس طرح ممکن ہو مسلمان
اپنے اندر نعمتوں کے متعلق جو صحیح علم ہے، اس کے احساس کو زندہ اور بیدار رکھنے کی مسلسل کوشش کرتے
رہیں کہ عمل کو آسان کرنے کی یہی تجربی و نفسیاتی راہ ہے، نہ صرف زبان بلکہ روایتوں میں جو یہ آتا ہے
کہ تمام نعمتوں میں جو سب سے بڑی نعمت خدا کے کسی بندے کے لئے ہو سکتی ہے یعنی مغفرت، جب
قرآن میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی بشارت حق تعالیٰ کی طرف سے سنائی گئی تو نماز ہی کے
متعلق حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اشتغال روز بروز بڑھ گیا۔ پوچھنے والوں نے جب پوچھا تو فرمایا

افلا اکون عبداً شکوراً — کیا میں اللہ کا شکر گزار بندہ نہ بنوں۔

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ زبان ہی نہیں بلکہ دوسرے اعضاء و جوارح سے بھی "شکر" کی مشق کر کے اپنے
باطنی احساس کو ابھارتے رہنا چاہیئے۔
بہرحال مقصد اصلی سب کا آخر میں وہی عمل کی تصحیح ہے جس کے لئے علم کی تصحیح کرائی جاتی ہے

اور علمی احساس کو مسلسل زندہ و بیدار رکھنے کے لئے مذہب نے عدود دل کے چاہا ہے کہ لوگ زبان سے بھی اعضا سے بھی۔ الغرض ہر اس ذریعہ سے جس سے اس احساس کی بیداری میں مدد مل سکے لینا چاہیئے، تا آنکہ کسبی رزق کی صورت میں ضروریات میں صرف ہونے کے بعد آدمی کا جو حصہ لوگوں کے پاس بس ماندہ رہ جاتا ہے، اس کے صحیح استعمال میں آسانی ہو، یہی رزق مبسوط کی ذمہ داری ہے، اور اس کا وہ ابتدائی امتحان ہے جس سے ہستیوں کو عہدہ بر آ ہونے کی کوشش کرنی چاہیئے، اجمالاً اس سارے کاروبار کا نام خواہ عملی شکل میں ہو یا علمی، پھر زبان سے ہو، یا جوارح سے اس کا تعلق ہو، سب کا نام "شکر" ہے۔ قرآن میں ہستیوں سے بار بار مختلف الفاظ میں اس کا مطالبہ کیا گیا ہے، اسی سے اس کی اہمیت ظاہر ہے کہ پیغمبر حضرت سلیمان علیہ السلام جنہیں حق تعالیٰ نے کسبی زندگی عطا فرمائی تھی، بارگاہِ الٰہی میں التجا فرماتے کہ

رب اوزعنی ان اشکر نعمتک — میرے پروردگار! میرے دل میں یہ بات
التی انعمت علی۔ — ڈال کہ جس نعمت سے آپ نے مجھے
سرفراز فرمایا ہے، اس کا شکر ادا کروں۔

قرآن میں اس کا بھی اعلان کر دیا گیا ہے، خصوصیت کے ساتھ تاذن کا لفظ اعلان کرتے ہوئے استعمال کیا گیا ہے جس کے معنی ہیں کہ منادی کر دی گئی ہے، یعنی اسی شکر کے متعلق فرمایا گیا ہے،

واذ تاذن ربکم لان شکرتم — اور جب منادی کی تمہارے مالک نے
لازیدنکم۔ — کہ اگر تم شکر کرو گے تو میں قطعاً تمہیں
بڑھاتا ہی چلا جاؤں گا۔

اور کھلی ہوئی بات ہے کہ دینے والے کی مرضی کے مطابق جو طرز عمل اس کی دی ہوئی چیز کے متعلق آدمی اختیار کرتا ہے۔ اسی پر بھروسہ کیا جاتا ہے، جتنا زیادہ اس عمل میں وہ امانت داری کا اظہار کرے گا، اسی قدر زیادہ اس کے سپرد بھی کیا جائے گا۔ لیکن بجائے اس کے اگر دینے والے کی مرضی کے خلاف خیانت سے کام لے گا تو قرآن میں اسی مطالبۂ شکر کے بعد یہ دھمکی دی گئی ہے۔

ولئن کفرتم ان عذابی — اور اگر تم ناشکری کرو گے (تو یاد رکھو) کہ
لشدید۔ — میرا عذاب بہت سخت ہے۔

جس کا تفصیلی قصہ ان شاء اللہ عنقریب سنایا جائے گا:

بہرحال کسبی رزق کی حقیقی ذمہ داری درحقیقت یہی فریضہ شکر ہے۔ اس کے سوا اور جو کچھ بھی ہے وہ اسی فریضۂ شکر کی ادائیگی کی مختلف شکلیں ہیں۔ اس بحث کو اسی نقطہ پر ختم کر کے اب ان ذمہ داریوں کی تھوڑی بہت تفصیل کرنا چاہتا ہوں جن کا تعلق قدری رزق سے ہے۔

قدری رزق کی ذمہ داریاں :- جیسا کہ میں نے پہلے بھی اشارہ کیا ہے، اور پھر کہتا ہوں کہ "قدری رزق" کے متعلق عام خیال لوگوں کا کچھ ایسا ہے کہ رزق کی تنگی یا معاشی ضیق، بالفاظِ دیگر جس کی تعبیر غربت و

فلاکت سے کی جاتی ہے۔ سمجھا جاتا ہے کہ رزق کا یہ حال بجائے خود ایک ابتلا اور ایسا ابتلا ہے جس میں
مبتلا ہونے والے کے لئے یہی ابتلا کافی ووافی ہے، ایسی حالت میں ان پر مزید ذمہ داریوں کے اضافہ کی
گنجائش ہی کیا ہے؟ مشہور ہے کہ

خداوند روزی بحق مشتغل

یعنی روزی میں جو کشائش و وسعت رکھتے ہیں، ان کو تو خدا اور خدا کے احکام کی تعمیل کا موقعہ حاصل
ہے، اسی لئے مذہب نے ان پر اگر ذمہ داریاں عائد کی ہیں تو وہ اس کے مستحق ہیں، لیکن غریب قدری
رزق رکھنے والا جس کا عمومی حال یہ ہو کہ سر چھپاتا ہے تو پاؤں کھلتے ہیں، ایک جگہ کو سیتا ہے تو دوسری
جگہ ادھڑ جاتی ہے، جس کی معاشی زندگی اس ادھیڑبن کی شکار ہو، ظاہر ہے کہ ایسے

پراگندہ روزی، پراگندہ دل

آدمی سے مزید اور کس بات کی توقع کی جا سکتی ہے؟

بظاہر یہ ایک لگتی ہوئی بات بھی معلوم ہوتی ہے، بقول ایک دل جلے انگریز کے، اسی غربت
فلاکت کا ذکر کرتے ہوئے جھنجھلا کر اس نے لکھا تھا

> غربت کی کشمکش کرنے سے قلب کی صفائی ہوتی ہے، یہ بعض لوگ کہتے ہیں
> حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کے لوگوں کو اس کش مکش سے سابقہ نہیں پڑا ہے
> ورنہ تمام کش مکشوں میں جن میں کسی انسان کو پھنسایا جا سکتا ہے۔ یہ
> (غربت و افلاس) سب سے زیادہ پست اور ذلیل کرنیوالی کشمکش ہے۔
> (داستانِ دہقان ص ۲۲۷ مصنفہ ڈارلنگ)

سعدی نے بھی مختلف پیرایوں میں اسی خیال کو ادا کیا ہے، ان کا زبان زد شعر
اسی سلسلے کا یہ بھی ہے سہ

شبِ چو عقدِ نماز می بندم   چہ خورد بامداد فرزندم

اور گو محدثین کے اصول پر ان مشہور اقوال کا آثارِ نبوت سے ہونا مشتبہ ہے۔ لیکن بہر حال مسلمانوں
میں مشہور ہے اور اسلامی بزرگوں نے اپنی کتابوں، اپنی گفتگوؤں میں انھیں عموماً استعمال کیا ہے۔ مثلاً

کاد الفقر ان یکون کفرا   قریب ہے کہ ناداری اور محتاجی کفر بن جائے

یا

الفقر سواد الوجہ فی الدارین   محتاجی اور ناداری دونوں جہان کی
روسیاہی ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف جو دعائیں اسنادِ صحیحہ کے ساتھ منسوب ہیں، ان دعاؤں میں
سے ایک دعا میں یہ الفاظ بھی پائے جاتے ہیں یعنی اللھم انی اعوذ بک من فتنۃ الفقر (اے اللہ میں فقر و
محتاجی کے فتنے سے تیری پناہ چاہتا ہوں) بعض دعاؤں میں یہ بھی ہے کہ آپ فرماتے۔

اقض عنی الدین واغننی من الفقر۔ مجھ سے میرے قرض کے بار کو اتر دیئے اور محتاجی سے مجھے بے نیاز کیجئے۔

سچ پوچھیئے تو "قدری رزق" کے ان ہی حالات کی طرف مذکورہ بالا اقوال اور حدیثوں میں اشارہ کیا گیا ہے جن کے متعلق اس انگریز نے غیظ و غضب کا اظہار کیا ہے، اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ قدری رزق کے بعض مدارج ایسے ہولناک جاں گسل روح فرسا ہوتے ہیں کہ اس وقت کسی قسم کی کوئی نصیحت لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتی۔

قدری رزق کے دراصل یہی ہوش رُبا حالات ہیں جن کی ذمہ داریاں بجائے قدریوں کے اسلام نے ان لوگوں پر عائد کی ہیں، جو مبطہ کے پیمانے پر قدرت کی طرف سے روزی پا رہے ہیں، ہر ملک اور ہر آبادی کے ان طبقات کو جو بسطی معاش سے سرفراز ہیں، ذمہ دار بنایا گیا ہے کہ ان سے لیا جائے گا اور ان لوگوں میں تقسیم کیا جائے گا، جو ان ہی کے ساتھ ان ہی آبادیوں میں قدری زندگی گذار رہے ہیں اسلام کو اپنے اصول پر اتنا اصرار ہے کہ قدریوں کے اسی حق کو بسطیوں سے حاصل کرنے کے لئے اس نے اپنے ہاتھ میں تلوار تک اٹھائی، الزکوٰۃ کے نام سے بسطی آمدنی رکھنے والوں پر باضابطہ قانون کی شکل میں ایک ایسا فرض (زکوٰۃ) عائد کیا گیا ہے جسے سب جانتے ہیں کہ اسلام کے چار اہم ارکان میں وہ ایک بڑا اہم رکن ہے۔ اسی قسم کا اہم رکن کہ عہدِ صدیقی میں باضابطہ اعلانِ جنگ ان لوگوں کو دے دیا گیا تھا جو قدریوں کے اس حق سے گریز کرنا چاہتے تھے، رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے خلیفۂ اکبر نے حکم دیا تھا کہ ایک ڈوری بھی اس حق کی اگر دبالی جائے گی، تو ان پر قتال اور ان سے جہاد کیا جائے گا۔

اور صرف الزکوٰۃ ہی نہیں، ہر آبادی کے ارباب بسط پر صدقۃ الفطر کے نام سے جو صدقہ واجب کیا گیا ہے اور اس طور پر واجب کیا گیا ہے کہ صرف اپنی ذات ہی کی طرف سے نہیں، بلکہ ان میں سے ہر ایک کی طرف سے یہ صدقہ نکالا جائے جن کا آدمی کفیل ہوتا ہے، ہر سال تقریباً کروڑہا کروڑ روپے کی شکل میں دُنیا کے مسلمان اس صدقہ کو ادا کرتے ہیں، اور گو مقصود بالذات قربانی سے صدقہ نہیں ہے، لیکن قرآن میں

واطعموا البائس والفقیر اور کھلاؤ (قربانی سے) مصیبت زدہ محتاج کو۔

کا جو حکم قربانی ہی کے متعلق پایا جاتا ہے، ظاہر ہے کہ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ایک بڑا مقصد قربانی کا یہ بھی ہے کہ قدری رزق رکھنے والوں کو بسطیوں سے امداد دلائی جائے۔

خُلاصہ یہ ہے کہ الزکوٰۃ کی مستقل مد کے سوا قدریوں کی امداد کی اور بھی اسلام نے مختلف صورتیں پیدا کی ہیں، خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ روایت حدیث کی کتابوں میں منقول ہے۔

ان فی المال حقا سوی الزکوٰۃ مال میں زکوٰۃ کے سوا بھی حق ہے۔ پھر آنحضرت

ثم تلا لن تنالوا البر حتی تنفقوا صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کی وہ آیۃ تلاوت کی

مما تحبون۔ — جس کا ترجمہ ہے ''نیکی کو ہرگز نہ پا سکو گے جب تک وہ نہ خرچ کرو جسے تم چاہتے ہو۔''

اور اسی سے سمجھا جاتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ قول یعنی

اذا ادیت زکوٰتک فقد قضیت ماعلیک۔ — تم نے جب زکوٰۃ ادا کردی، تو تم پر جو حق تھا، اسے پورا کر دیا۔

یہ مد حکومت کے اس مطالبہ سے تعلق رکھتا ہے جسے امیروں سے غریبوں کے لئے وصول کرنا اسلام نے واجب ٹھہرایا ہے یعنی زکوٰۃ ادا کرنے کے بعد حکومت اب امیروں سے مطالبہ نہیں کر سکتی، خود قرآنی آیت

ان تبدوا الصدقات فنعما هی وان تخفوها وتوتوها الفقراء فهو خير لكم ويكفر عنكم سيئاتكم۔ — اگر صدقات کھلے بندوں ادا کرو تو یہ بھی اچھا ہے، اور اگر اسے چھپاؤ اور دو فقراء کو، تو یہ بہتر ہے تمہارے لئے، دور کرے گی یہ پوشیدہ خیرات تمہاری برائیوں کو۔

سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ صدقات کی دو قسمیں ہیں، ایک تو وہ جسے علانیہ کھلے بندوں دیا جائے، اور یہ بات اسی صدقہ میں پائی جا سکتی ہے، جسے حکومت وصول کرتی ہے، اور دوسری قسم ''الصدقات'' کی وہ ہے جسے چاہیے کہ آدمی چھپا کر ادا کرے، قرآن میں وعدہ کیا گیا ہے کہ ان باتوں کا ازالہ اس خفیہ صدقہ سے ہوتا ہے جو آدمی کو بری معلوم ہوتی ہوں کہ ''السیئات'' بری باتوں ہی کو کہتے ہیں، اُن حدیثوں سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے جن میں خبر دی گئی ہے کہ بلاؤں کو صدقہ کے ذریعہ سے ٹالا جا سکتا ہے یا صدقہ خدا کے غصے کو بجھا دیتا ہے، غالباً یہ خاصیت خفیہ صدقات ہی کی بیان کی گئی ہے۔ تجربہ بھی اسی کا شاہد ہے۔ صدقات کی اسی قسم کے متعلق غالباً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم ہے کہ مخفی طریقہ سے لوگوں کو دیا کرو کہ داہنے ہاتھ کی خبر بائیں کو نہ ہو، صرف یہی نہیں بلکہ آئندہ قانونی ابواب میں آپ پائیں گے کہ عام خیر و خیرات صدقات کے سوا اسلام نے قرض کو بھی نیکی کی ایک بڑی اہم مد قرار دی ہے اتنی اہم کہ قرض پانے والوں کی طرف سے قرآن میں ایک سے زیادہ مقام پر خدا نے خود قرض کا مطالبہ فرمایا ہے

من ذا الذی یقرض اللہ قرضاً حسناً فیضاعفہ لہ۔ — کون ہے جو اللہ کو اچھا قرض دیتا ہے، تو بڑھائے گا اللہ اس کو۔

قرآن میں تو صرف قرض ہی کی حد تک یہ فرمایا گیا ہے، لیکن مشہور حدیث جس میں بیماروں اور عدم حاجتمندوں کا ذکر کرتے ہوئے یہ مشہور روایت ہے کہ قیامت کے دن حق تعالیٰ اپنے بندوں سے فرمائیں گے۔

یا ابن آدم استطعمتک فلم تطعمنی قال یا رب کیف اطعمک — اے آدم کے بچے، میں نے تجھ سے کھانا مانگا تو نے مجھے کھانا نہ دیا، بندہ کہے گا ...

علمت انه استطعمک عبدی فلان فلم تطعمه اما علمت ان لو اطعمته لوجدت ذلک عندی۔

سارے جہان کے پالنہار ہیں، تب خُداوند تعالیٰ فرمائیں گے، تجھے کیا اس کی خبر نہ تھی کہ میرے فلاں بندے نے تجھ سے کھانا طلب کیا تو تو نے اسے نہ کھلایا کیا تو نہیں جانتا تھا کہ اگر اس شخص کو تو کھلاتا تو پاتا تو اس کھانے کو میرے پاس۔

اسی طرح پیاسوں کا تذکرہ کرتے ہوئے حق تعالیٰ نے اپنے آپ کو ان حاجت مندوں کی جگہ قائم فرما کر پلانے کا مطالبہ کیا ہے سمجھا جا سکتا ہے کہ ان ذمہ داریوں کو جو فقیروں کی طرف سے بسطیوں پر عائد ہوتی ہیں، کتنی اہمیت عطا فرما دی ہے۔ غالب مرحوم نے شاید اسی حدیث کے مطلب کو اپنے اس شعر میں ادا کیا ہے۔

بدل کر فقیروں کا ہم بھیس غالبؔ — تماشائے اہلِ کرم دیکھتے ہیں

اور قدری رزق کی پیچیدگیوں کے حل کی صرف یہی صورتیں اسلام نے اختیار نہیں کی ہیں، بلکہ میں تو سمجھتا ہوں کہ باوجود مقدرت و اقتدار کے پیغمبر اور پیغمبر کے جانشینوں (صلوات اللہ علیہم وسلامہ) نے زندگی کے جس نمونے کو دُنیا کے سامنے پیش کیا ہے، کھانے، پینے، پہننے، رہنے سہنے کا جو معیار قصداً اختیار فرمایا گیا تھا، اس کی ایک مصلحت اگر یہ سمجھی جائے کہ غریبوں یعنی قدری معیشت رکھنے والوں کی دل دہی اور تسکین خاطر بھی اس طرز عمل سے مقصود تھی۔ تو ایسا سمجھنے کے کافی وجوہ موجود ہیں، آخر خود ہی غور کرنا چاہئے کہ جس کا دعویٰ ہو کہ اوتیت مفاتیح خزائن الارض (بخاری) (مجھے زمین کے خزانوں کی کنجیاں عطا کی گئی ہیں) ورنہ یوں بھی خُدا کی طرف سے ہر قسم کی روحانی اور مادی قوتوں سے جو ہستی سرفراز تھی۔ کیا اسی کے متعلق مجبوری اور معذوری کا ہلکا سا وسوسہ بھی ہو سکتا ہے[۱۵] ؟ جن مسلمانوں کو خبر دی گئی ہے کہ زمین کو سونا بنانے کا اختیار بھی آپ کو سپرد کیا گیا تھا اُحد پہاڑ نے چاہا تھا کہ اپنی تمام چٹانوں کے ساتھ زرِ خالص کی شکل آپ کے لئے اختیار کرلے؛ اور جو مسلمان نہیں ہیں، کم از کم اتنا تو سب ہی کو ماننا ہی چاہئے کہ جس پیوند دوز کمبل اور کھجوروں کی شاخوں سے چھائے ہوئے مکان میں پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) کی وفات جس وقت ہوئی تھی، اس وقت اگر وہ چاہتے تو دس لاکھ مربع میل کے بادشاہ کی حیثیت کا لباس اور مکان بھی رکھ سکتے تھے۔ مگر آخر وقت تک نہ خود اس اقتدار سے فائدہ اٹھایا، اور نہ اپنے خاندان والوں کو اس سے استفادہ کا موقع عطا فرمایا، ان کی چہیتی صاحبزادی بھی

---

[۱۵] ابیکی نے قاضی عیاضؒ کے حوالے سے اندلس کا یہ واقعہ نقل کیا ہے کہ طیطلہ کا رہنے والا ایک شخص صالح نامی تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق اس نے دعویٰ کیا کہ ان زھدہ لم یکن قصداً ولو قدر علی الطیبات لاکلہا (یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اندازِ زندگی قصد و اختیار کا نتیجہ نہ تھی، آپ میں اگر اچھے کھانوں کے کھانے کی مقدرت ہوتی تو ضرور کھاتے) گویا فقر کو وہ مجبوری و معذوری کا نتیجہ قرار دیتا تھا، لکھا ہے کہ اس زمانے کے علماء اندلس نے اس کے قتل کا فتویٰ دیا اور وہ سولی پر چڑھایا گیا (دیکھو کتاب نظام الحکومۃ النبویہ للکتانی ص ۸۹ ج ۲)

چکی ہی پیستی رہیں اور مشکیں بھرتی رہیں، سوال یہی ہے کہ ایسا کیوں کیا گیا تھا؟ موطا امام مالک کی روایت

ان لمصائبی لتعزوا المسلمین فی مصائبھم۔ — میری مصیبتیں تمام مسلمانوں کی مصیبتوں کے وقت تسلی کرتی رہیں گی۔

میں اگر غور کیا جائے تو اس سوال کا جواب مستور ہے، خدا ہی جانتا ہے کہ پیغمبر اور پیغمبر کے گھرانے والوں کی زندگی کا یہ معیار قدری معیشت رکھنے والوں میں سے کتنے خستہ دلوں کے لئے مرہم کا کام کرتا رہا ہے، اور قیامت تک کرتا رہے گا، بلکہ اسی کو نمونہ بنا کر اگر امرا اپنی زندگی کے معیار کی نگرانی کرتے ہیں۔ ایسے تکلفات سے حتی الوسع پرہیز کریں جن کے میسر نہ آنے کی وجہ سے خواہ مخواہ غریبوں کو بے جا حرص کے انگاروں پر لوٹنا پڑتا ہے تو یقیناً غریبوں کی دل دہی کا یہ بھی ایک بڑا ذریعہ ہو سکتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد آپ کے خلفاء نے (باوجود سب کچھ رکھنے کے) جس قسم کی زندگی گذاری اس سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں میں جسے جتنی زیادہ بلندی عطا کی جائے بستی میں رہنے والوں کو خود سے چاہیئے کہ حتی الوسع وہ اپنی زندگی کے معیار کو زیادہ بلند ہونے نہ دے، حضرت عمرؓ کا مشہور واقعہ ہے کہ عتبہ بن فرقد جو کسی صوبہ کے عامل تھے، خدمتِ والا میں حاضر ہوئے، حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس وقت کھانا کھا رہے تھے، ان کو اندر ہی بلا لیا حضرت عمرؓ کی موٹی جھوٹی غذا کو دیکھ کر عتبہ نے کہا۔

ھل لک من طعام یقال لہ الحواری۔ — آپ کیا ایسی خوراک استعمال نہیں کرتے جس کا نام میدہ ہے۔

جواب میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پہلے تو عتبہ کو خطاب کر کے پوچھا۔

یا ابن فرقد ھل تری احدا من العرب اقدر منی۔ — ابن فرقد! سرزمین عرب میں مجھ سے بڑی مقدرت والا اس وقت کوئی ہے؟

عتبہ نے جواب میں وہی کہا جو کہا جا سکتا تھا یعنی آپ سے زیادہ مقدرت رکھنے والا کون ہے؟ تب حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس سوال و جواب کے بعد پوچھا،

ویلک یسع ذلک المسلمین قال لا۔ — ابن فرقد! کیا سارے مسلمانوں کو میدہ کا یہ آٹا میسر آ سکتا ہے۔ اس نے کہا نہیں۔

اس طرزِ زندگی کا جو اصل مقصد تھا اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا۔

بئس الوالی انا کلت طیبھا واطعمت الناس کرادبیتھا۔ (ص ۱۸۵ محب طبری) — میں بہت ہی برا حاکم ہوں گا کہ اچھی تو خود کھاؤں، اور لوگوں کو بری خراب خستہ چیزیں کھلاؤں۔

عام رمادہ میں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے دنیا کے امیروں کے لئے جو نمونے چھوڑے ہیں، آج ان نمونوں سے سلجھانے والے چاہیں تو دنیا کی بہت سی الجھی ہوئی معاشی گتھیاں سلجھ سکتی ہیں

تفصیل کے لئے تو ان کی سوانح عمری ہی پڑھنی چاہئے کیسی عجیب بات ہے، خلافِ عادت آپ کو محض غربیوں کے خیال سے ایسی غذا اختیار کرنی پڑی جو ٹھیک طرح سے ہضم نہیں ہوتی تھی، کھانے کے بعد پیٹ بولتا تھا آپ پیٹ پر ہاتھ رکھتے اور فرماتے

ان شئت قرقر وان شئت	تیرا جی چاہے تو گڑگڑ، اور تیرا جی چاہے
لاتقرقر مالک عندی ادم حتی	تو نہ گڑگڑا، مگر تیرے لئے میرے پاس سالن
یفتح اللہ للمسلمین۔	اس وقت تک نہیں ہے جب تک کہ قحط
(محب طبری ص ۵۲ ج ۲)	کی موجودہ مصیبت مسلمانوں کے سر سے

ٹل نہ جائے۔

آپ ہی کے زمانے کا واقعہ ہے حمص کے والی نے ایک علیہ (اٹاری) بنوائی تھی جس پر خود رہتے تھے حضرت عمرؓ کو خبر ہوئی۔ بارگاہِ خلافت میں طلب ہوئے، حضرت عمرؓ سامنے بلا کر ڈانٹ کر پوچھ رہے تھے۔

بنیت العلیة واشرفت بھا	تم نے اٹاری (بالاخانہ) بنوایا ہے،
علی المسلمین والارملة	اور عام مسلمانوں، بیواؤں، یتیم پر
والیتیم۔	اسی کے ذریعے سے شرافت و بلندی
(محب طبری ص ۵۵ ج ۲)	حاصل کی ہے۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو پیوند دوز کپڑوں میں دیکھ کر اس زمانے میں جب مسلمانوں کے آپ امیر اور خلیفہ تھے، دیکھنے والے نے دیکھ کر کہا۔

لم ترقع قمیصک	اپنے کرتے میں آپ پیوند کیوں لگاتے ہیں۔

جواب میں اسی نکتہ کی طرف اشارہ فرماتے ہوئے فرمایا۔

لانہ یخشع القلب ویقتدی بہ	اس سے دل میں نرمی پیدا ہوتی ہے۔ اور
المومنین (طبری ص ۲۲۰ ج ۲)	مسلمان اس کو نمونہ بنا سکتے ہیں۔

بلا شبہ فقر کی یہی وہ روح پرور، حوصلہ افزا شکل ہے، جس پر اس کے اختیار کرنے والے جتنا چاہیں فخر کر سکتے ہیں، اور ارادی مسکنت کی یہی شان رفیع ہے، جس کے لئے خلقِ خدا کے سچے ہمدردوں نے دعائیں مانگی ہیں[1] اور سچ تو یہ ہے کہ بسط پر مقتدر ہونے کے باوجود قدریوں کی تسلی کے لئے قدری زندگی کے معیار کو اختیار کرنے والوں ہی کو ان ذمہ داریوں کی تکمیل کا بآسانی موقعہ مل سکتا ہے۔ جو قدری معیشت رکھنے والوں کی

---

[1] اور یہی حل ہے اس شبہ کا جو اس موقعہ پر عموماً دلوں میں پیدا ہوتا ہے، یعنی ابھی کچھ دیر پیشتر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ان دعاؤں کا ذکر گذرا جن میں فقر سے بے نیازی کی خواہش آپ نے کی یا وہ دعا جس میں محتاجی وفقر کے فتنہ سے آپ نے پناہ مانگی ہے سوال ہوتا ہے کہ باوجود اس کے پیغمبرؐ نے اپنی زندگی فقر کی کیوں رکھی، بلکہ بعض دعاؤں میں آپ نے خدا سے درخواست کی کہ مجھے مسکین زندہ رکھئے الخ حل یہی ہے کہ اضطراری فقر و محتاجی جو باعثِ فتنہ بن جاتی ہے اس سے تو پناہ مانگی گئی ہے اور جس فقر کو آپ نے اختیار فرمایا یا جس کی دعا کرتے تھے وہ یہی اختیاری فقر و مسکنت ہے ۱۲

چکی ہی پیستی رہیں اور مشکیں بھرتی رہیں، سوال یہی ہے کہ ایسا کیوں کیا گیا تھا؟ موطا امام مالک کی روایت

ان المصائبی لتعز والمسلمین فی مصائبھم۔ — میری مصیبتیں تمام مسلمانوں کی مصیبتوں کے وقت تسلی کرتی رہیں گی۔

میں اگر غور کیا جائے تو اس سوال کا جواب مستور ہے، خدا ہی جانتا ہے کہ پیغمبر اور پیغمبر کے گھرانے والوں کی زندگی کا یہ معیار قدری معیشت رکھنے والوں میں سے کتنے خستہ دلوں کے لئے مرہم کا کام کرتا رہا ہے، اور قیامت تک کرتا رہے گا، بلکہ اسی کو نمونہ بنا کر اگر امراء اپنی زندگی کے معیار کی نگرانی کرتے رہیں۔ ایسے تکلفات سے حتی الوسع پرہیز کریں جن کے میسر نہ آنے کی وجہ سے خواہ مخواہ غریبوں کو بے جا حسرتوں کے انگاروں پر لوٹنا پڑتا ہے تو یقیناً غریبوں کی دل دہی کا یہ بھی ایک بڑا ذریعہ ہوسکتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد آپ کے خلفاء نے (باوجود سب کچھ رکھنے کے) جس قسم کی زندگی گذاری، اس سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں میں جسے جتنی زیادہ بلندی عطا کی جائے بستی میں رہنے والوں کی خاطر سے چاہیئے کہ حتی الوسع وہ اپنی زندگی کے معیار کو زیادہ بلند ہونے نہ دے، حضرت عمرؓ کا مشہور واقعہ ہے کہ عتبہ بن فرقد جو کسی صوبہ کے عامل تھے، خدمت والا میں حاضر ہوئے، حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس وقت کھانا کھا رہے تھے، ان کو اندر ہی بلا لیا حضرت عمرؓ کی موٹی جھوٹی غذا کو دیکھ کر عتبہ نے کہا۔

ھل لک من طعام یقال لہ الحواری۔ — آپ کیا ایسی خوراک استعمال نہیں کرتے جس کا نام میدہ ہے۔

جواب میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پہلے تو عتبہ کو خطاب کرکے پوچھا۔

یا ابن فرقد ھل تری احدا من العرب اقدر منی۔ — ابن فرقد! سرزمین عرب میں مجھ سے بھی بڑی مقدرت والا اس وقت کوئی ہے؟

عتبہ نے جواب میں وہی کہا جو کہا جا سکتا تھا، یعنی آپ سے زیادہ مقدرت رکھنے والا کون ہے؟ تب حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس سوال و جواب کے بعد پوچھا،

ویلک یسع ذلک المسلمین قال لا۔ — ابن فرقد! کیا سارے مسلمانوں کو میدہ کا یہ آٹا میسر آسکتا ہے۔ اس نے کہا نہیں۔

اس طرز زندگی کا جو اصل مقصد تھا اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا۔

بئس الوالی انا اکلت طیبھا واطعمت الناس کرادیتھا۔ (ص ۵۰۹ مجب طبری) — میں بہت ہی برا حاکم ہوں گا کہ اچھی تو خود کھاؤں اور لوگوں کو بری خراب خستہ چیزیں کھلاؤں۔

عام رمادہ میں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے دنیا کے امیروں کے لئے جو نمونے چھوڑے ہیں، آج ان نمونوں سے سلجھانے والے چاہیں تو دنیا کی بہت سی الجھی ہوئی معاشی گتھیاں سلجھ سکتی ہیں

تفصیل کے لئے تو ان کی سوانح عمری ہی پڑھنی چاہیئے، کیسی عجیب بات ہے، خلافِ عادت آپ کو محض غریبوں کے خیال سے ایسی غذا اختیار کرنی پڑی جو ٹھیک طرح سے ہضم نہیں ہوتی تھی، کھانے کے بعد پیٹ بولتا تھا آپ پیٹ پر ہاتھ رکھتے اور فرماتے

ان شئت قرقر وان شئت	تیرا جی چاہے تو گڑگڑا، اور تیرا جی چاہے
لا تقرقر مالک عندی ادم حتی	تو نہ گڑگڑا، مگر تیرے لئے میرے پاس سالن
یفتح اللہ للمسلمین۔	اس وقت تک نہیں ہے جب تک کہ قحط
(محب طبری ص ۵۳ ج ۲)	کی موجودہ مصیبت مسلمانوں کے سر سے

ٹل نہ جائے۔

آپ ہی کے زمانے کا واقعہ ہے حمص کے والی نے ایک علیہ (اٹاری) بنوائی تھی جس پر خود رہتے تھے حضرت عمرؓ کو خبر ہوئی۔ بارگاہِ خلافت میں طلب ہوئے، حضرت عمرؓ سامنے بلاکر ڈانٹ کر پوچھ رہے تھے۔

بنیت العلیة واشرفت بہا	تم نے اٹاری (بالاخانہ) بنوایا ہے،
علی المسلمین والارملة	اور عام مسلمانوں، بیواؤں، یتیم پر
والیتیم۔	اسی کے ذریعے سے شرافت و بلندی
(محب طبری ص ۵۵ ج ۲)	حاصل کی ہے۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو پیوند دوز کپڑوں میں دیکھ کر اس زمانے میں جب مسلمانوں کے آپ امیر اور خلیفہ تھے، دیکھنے والے نے دیکھ کر کہا۔

لم ترقع قمیصک	اپنے کرتے میں آپ پیوند کیوں لگاتے ہیں۔

جواب میں اسی نکتہ کی طرف اشارہ فرماتے ہوئے فرمایا۔

لانہ یخشع القلب ویقتدی بہ	اس سے دل میں نرمی پیدا ہوتی ہے۔ اور
المومنین (طبری ص ۲۲۰ ج ۲)	مسلمان اس کو نمونہ بنا سکتے ہیں۔

بلا شبہ فقر کی یہی وہ روح پرور، حوصلہ افزا شکل ہے، جس پر اس کے اختیار کرنے والے جتنا چاہیں فخر کر سکتے ہیں، اور ارادی مسکنت کی یہی شان رفیع ہے، جس کے لئے خلقِ خدا کے سچے ہمدردوں نے دعائیں مانگی ہیں[1] اور سچ تو یہ ہے کہ بسطِ رزق پر مقتدر ہونے کے باوجود قدریوں کی تسلی کے لئے قدری زندگی کے معیار کو اختیار کرنے والوں ہی کو ان ذمہ داریوں کی تکمیل کا بآسانی موقع مل سکتا ہے۔ جو قدری معیشت رکھنے والوں کی

---

[1] اور یہی حل ہے اس شبہ کا جو اس موقع پر عموماً دلوں میں پیدا ہوتا ہے، یعنی ابھی کچھ دیر پیشتر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ان دعاؤں کا ذکر گذرا جن میں فقر سے بے نیازی کی خواہش آپ نے کی، یا دوسری دعا جس میں محتاجی و فقر کے فتنہ سے آپ نے پناہ مانگی ہے۔ سوال ہوتا ہے کہ باوجود اسکے پیغمبر نے اپنی زندگی فقر کی کیوں رکھی، بلکہ بعض دعاؤں میں آپ نے خدا سے درخواست کی کہ مجھے مسکین زندہ رکھئے الخ حل یہی ہے کہ اضطراری فقر و محتاجی جو باعثِ فتنہ بن جاتی ہے، اس سے تو پناہ مانگی گئی ہے، اور جس فقر کو آپ نے اختیار فرمایا یا جس کی دعا کرتے تھے وہ یہی اختیاری فقر و مسکنت ہے ۱۲

طرف سے مذہب نے ان پر عائد کیا ہے۔

بہر حال قدری معیشت کی دشواریوں کو سہولتوں سے بدلنے کے لئے یہ تو اسلامی ہدایتوں کا وہ سلسلہ تھا، جن کا خطاب بجائے قدریوں کے بسطیوں سے ہے۔ واقعہ تو یہ ہے کہ جن جاں فرسا پیچیدگیوں اور کشمکشوں میں قدری زندگی آدمی کو مبتلا کر دیتی ہے، ان کے حل کے لئے اسلامی دستور کے یہی قوانین کافی ہو سکتے ہیں، بشرطیکہ عمل کرنے والے جیسا کہ چاہیئے ان پر عمل بھی کریں، اور قدرت نے جو ذمہ داریاں ان کے سپرد کی ہیں ان سے عہدہ برآ ہونے کو بسطی پیمانے پر روزی پانے والے طبقات اپنا فرض خیال کریں، قدریوں کے جو حقوق بسطیوں کی آمدنیوں میں اسلام نے قائم کئے ہیں، حکومتیں ان حقوق کو حاصل کر کے حقداروں تک پہنچانے کا باضابطہ نظم اگر قائم کر دیں، اور یہی براہِ راست جو مطالبات اس سلسلہ میں بسطیوں سے کئے گئے ہیں، ان مطالبات کی تکمیل ہوتی رہے جنھیں معاشی بلندی عطا کی گئی ہے، پستی میں رہنے والوں کے خیال سے وہ بھی اپنی زندگی کے معیار کو حتی الوسع پست ہی رکھنے کی کوشش کرتے رہیں، میں تو یہ خیال کرتا ہوں کہ قدری معیشت کی جن تلخیوں کا دنیا کو شکوہ ہے۔ بہت کچھ اس کے ازالے کی صورت یوں ہی نکل آسکتی ہے۔

لیکن اسلام کامل دین ہی کیوں ہوتا، اگر اسی نقطہ پر اپنی تعلیم کو ختم کر دیتا، آپ دیکھئے ایک طرف بسطیوں کو خطاب کر کے قدری زندگی کی الجھنوں کے سلجھانے کی جو تدبیریں اس نے اختیار کی ہیں، وہی کیا کم تھیں، لیکن دوسری طرف براہِ راست قدری معیشت رکھنے والوں کو بھی جو ہدایتیں دی گئی ہیں، کاش! ان ہدایتوں کو سمجھنے اور ان پر عمل پیرا ہونے کی کوشش کی جاتی تو غریبوں کے طبقات کو اس کا تجربہ ہو سکتا تھا کہ اپنی جن معاشی بے چینیوں اور قلبی کلفتوں میں وہ بسطیوں کے بظاہر دستِ نگر نظر آتے ہیں، بجائے دوسروں کے بہت کچھ ان کے ازالہ کا سامان وہ خود بھی کر سکتے ہیں اور اب میں ان ہی چیزوں کا تذکرہ کرنا چاہتا ہوں۔

قانون مدّو عدّ۔ یہ میری ایک اصطلاح ہے، اور قرآن سے ماخوذ ہے۔ مد کے قانون سے میرا اشارہ قرآن کی مندرجہ ذیل آیات کی طرف ہے، ارشاد فرمایا گیا ہے۔

ولا تمدن عینیک الی ما	اور نہ اٹھاؤ اپنی دو آنکھوں کو ان کی
متعنا بہ ازواجا منھم	طرف جنھیں جوڑے جوڑے کی شکل میں
زھرة الحیوة الدنیا	ہم نے نعمتیں بخشی ہیں۔ یہ پست زندگی کی
لنفتنھم فیہ (طٰہٰ)	تازگی ہے (اس لئے ان کو دی گئی ہیں)

تاکہ ہم امتحان لیں ان کا اس میں۔

بعض الفاظ کی کمی و بیشی سے اس حکم کا اعادہ دوسری جگہ ان الفاظ میں کیا گیا ہے۔

ولا تمدن عینیک الی ما	اور نہ اٹھانا اپنی دونوں آنکھوں کو
متعنا بہ ازواجا منھم	ان چیزوں کی طرف جن سے جوڑے جوڑے کی

ولا تحزن علیھم (کہف) شکل ہیں ہم نے لوگوں کو سرفراز کیا ہے
اور نہ اس پر غم کھانا!

ان دونوں آیات میں مدّ عین سے منع کیا گیا ہے، مدّ کے معنی کھینچنے اور بلند کرنے کے ہیں اور عین کے معنی آنکھ۔ مطلب یہ ہے کہ آنکھوں کو ان کی طرف اٹھانے سے منع کیا گیا ہے، جنھیں گویا بسطی پیمانے پر روزی عطا کی گئی ہے۔ اردو میں مدّ نظر کا لفظ بھی قریب قریب اسی مفہوم کو ادا کرتا ہے جو مدّ عین کا مفہوم ہے، خیر یہ تو الفاظ کا سرسری حاصل ہوا، بسطی طبقات کی تعبیر جن الفاظ سے یہاں کی گئی ہے، غور کرنے کی یہی چیز ہے، پہلے اسے سمجھ لینا چاہیئے۔

(۱) پہلی بات اس سلسلے کی "ازواجاً" کا لفظ ہے، بسطی طبقات کی ایک خاص خصوصیت کی طرف اس میں جہاں تک میں سمجھتا ہوں اشارہ کیا گیا ہے، مشاہدہ سے اس کی توثیق ہوتی ہے، یعنی دیکھا جاتا ہے کہ ضرورت سے زیادہ آمدنیوں پر جن لوگوں کو یہاں اقتدار بخشا جاتا ہے عموماً ان کے قلوب میں ایک عجیب جذبہ اس بات کا پیدا ہوجاتا ہے کہ ضرورت کی ایک ہی چیز مثلاً سواری، لباس، پوشاک، مکان وغیرہ وغیرہ ہر ایک میں ان کی تشفی کسی ایک شکل سے نہیں ہوتی، باوجودیکہ ان کے پاس مثلاً موٹر موجود ہوتی ہے۔ لیکن ایک موٹر سے ان کا جی نہیں بھرتا، دل دوسری موٹر کے لئے بے چین رہتا ہے۔ پھر شکل و صورت، رنگ روپ کا معمولی فرق بھی کسی دوسری موٹر کی ضرورت کو ثابت کرنے کے لئے کافی ہوتا ہے یہی حال زندگی کی دوسری ضرورتوں میں ان کا ہوتا ہے، اسی کا نتیجہ یہ ہے کہ ان امیروں کے کمروں میں جب آپ داخل ہوں گے تو عموماً ایک طرف قطار در قطار مختلف شکلوں، صورتوں کے جوتے نظر آئیں گے دوسری طرف کسی کونے میں دیکھئے تو صرف چھڑیوں کا ایک بوجھا ٹھیک اس شکل میں جیسے ترکش میں تیر ہوتے ہیں۔ ان کی چھڑی دانیوں میں رکھا نظر آئے گا، اور یہ تو ان کا حال ہے جن کا شمار نسبتہً متوسط طبقات بلکہ کہیئے تو عوام کی زبان میں کہہ سکتے ہیں کہ چھٹ بھیئوں میں جو گنے جاتے ہیں، ازواجی مذاق میں ان کی یہ کیفیت ہے، باقی ان میں جو بڑے ہیں، ان کو تو دیکھا جاتا ہے کہ ایک بلڈنگ کے بعد دوسری بلڈنگ، اور ایک محل کے بعد دوسرے محل کا شوق کسی طرح ختم ہونے ہی کو نہیں آتا، ہر چیز میں زوج اور جوڑے کے ذوق نے اس حد تک ان لوگوں کو پہنچا دیا ہے کہ کسی عمارت کے ایک پہلو میں اتفاق سے اگر کوئی مسجد آگئی ہے تو صرف "ازواجیت" اور جوڑا بنانے کے ذوق کی تکمیل کے لئے سنا ہی نہیں گیا ہے بلکہ دیکھا گیا ہے کہ مسجد کے مدمقابل دوسری سمت میں ٹھیک مسجد ہی کی شکل وصورت رکھنے والی عمارت بنوائی گئی، چونکہ قبلہ ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں اس دوسری مجازی مسجد کا کعبہ کی سمت واقع نہیں ہوسکتا تھا۔ اس لئے واقع میں تو وہ مسجد نہ ہوسکی، لیکن دیکھنے والوں کو اگر مغالطہ ہوجائے اور شکل وشبا ہت سے دھوکہ کھا کر اس میں نماز پڑھنے لگیں تو کچھ تعجب نہیں؛

(۲) دوسری چیز "زہرۃ الحیوۃ الدنیا" کے الفاظ ہیں "الحیوۃ الدنیا" تو ظاہر ہے کہ انسان کی موجودہ پست زندگی کی تعبیر ہے، رہا زہرۃ سو لغت میں اس کے معنی تازگی اور شادابی کے ہیں، مطلب یہ ہوا کہ

ایک تو انسان کی موجودہ زندگی کے واقعی ضروریات ہیں، یعنی ایسی ضرورتیں جن کے بغیر اپنی زندگی کو آدمی گذار نہیں سکتا، معاشی اصلاح میں جنھیں NECESSARY کہتے ہیں، اور دوسری چیزیں وہ ہیں جن کا اصطلاحی نام LUXURY ہے، سچ پوچھیے تو زہرۃ الحیوٰۃ الدنیا" زندگی کے ثانی الذکر لوازم کی قرآنی تعبیر ہے، دوسرے مقام پر اسی کو کبھی "زینۃ الحیوٰۃ الدنیا" بھی کہا گیا ہے، یعنی زندگی کے آرائش وزیبائش سے ان کا تعلق ہے۔
ان امور کو ذہن نشین کر لینے کے بعد اب مذکورہ بالا آیات کے مفہوم کو سمجھنا چاہیئے۔

ظاہر ہے کہ بسطی طبقات کی طرف نگاہ اٹھانے سے جب ان آیتوں میں منع کیا گیا ہے تو یہی قرینہ ہے اس بات کا کہ براہ راست ان آیتوں کے خطاب کا تعلق ان ہی لوگوں سے ہو سکتا ہے جو معاشی لحاظ سے بسطی نہیں بلکہ قدری زندگی رکھتے ہوں، لیکن جیسا کہ میں نے پہلے بھی عرض کیا ہے کہ بسط و قدر انسان کے معاشی مدارج کی اضافی شکلیں ہیں، اس لئے اُن کے استعمال میں بھی چاہیئے کہ کسی خاص طبقہ کو متعین کر کے محدود نہ کر دیا جائے۔ بلکہ وہی بات کہ اپنے آپ سے بالاتر طبقات کے حساب سے جو لوگ یہ پاتے ہوں کہ معاشی لحاظ سے وہ قدر اور تنگی کی حالت میں گرفتار ہیں، وہی ان آیتوں کا اپنے آپ کو مخاطب قرار دے کر ان ہدایتوں پر عمل کرنے کی کوشش کریں جن کی طرف حق تعالیٰ نے راہنمائی فرمائی ہے۔

مقصود تو ان آیتوں سے یہی ہے کہ ہر شخص کو معاشی جدوجہد میں اپنی حقیقی ضرورتوں پر نظر رکھنی چاہیئے۔ دوسروں کے ساتھ ناپ ناپ کر اپنے اندر کمتری اور کم مائگی کا خواہ مخواہ احساس پیدا کر کر کے اپنے ہاتھوں خود اپنے آپ کو ذہنی کلفتوں میں لوگ مبتلا نہ کریں، گویا دوسرے الفاظ میں وہی بات جس کی طرف قرآن ہی کی آیت

ولا تتمنوا ما فضل اللہ بہ	اور نہ آرزو کیا کرو اس چیز کی جس کی وجہ سے
بعضکم علیٰ بعض۔	خدا نے بعض کو بعض پر برتری عطا کی ہے۔

میں توجہ دلائی گئی ہے، میں نے بھی کہیں لکھا ہے کہ زندگی کی حقیقی ضرورتوں کی پوری ہونے کے باوجود جو دوسروں کے ساتھ اپنی زندگی کے معیار کو ناپ ناپ کر کڑھتے اور جلتے رہتے ہیں، وہ دنیا میں اگر تنہا پیدا ہوتے، اور ان کے ساتھ ان کا ہم جنس کوئی دوسرا نہ ہوتا، تو کھلی ہوئی بات ہے کہ دوسروں سے ناپنے کا موقعہ ہی ان کو نہ ملتا، پھر اس وقت جیسے اپنی زندگی سے آدمی مسرور ہوتا، کیوں نہیں آج بھی دوسروں سے قطع نظر کر کے اپنی زندگی ہم گذاریں، تجربہ بتا دے گا کہ جن کلفتوں اور الجھنوں کو آدمی قدری معیشت کی طرف منسوب کرتا ہے، ان کا اکثر و بیشتر حصہ اس عمل کے بعد ثابت ہو گا کہ قطعاً وہمی اور خود تراشیدہ تھا۔ لیکن قرآن نے اسی پر بس نہیں کیا ہے، بلکہ مذکورہ بالا آیات کے جن الفاظ کی طرف میں نے توجہ دلائی ہے ان پر غور کیجئے نظر آئے گا کہ ان الفاظ کا اضافہ بلا وجہ نہیں کیا گیا ہے۔ آخر سوچئے کہ بسطیوں کے جن حالات کو دیکھ دیکھ کر قدریوں کا گروہ محزون و مغموم رہتا ہے۔ تجربہ کے بعد ان کی حقیقت کیا وہی نہیں ہے کہ زیادہ تر ان میں وہی ازواجی مذاق یعنی ہر چیز کو جوڑے کی شکل میں رکھنے، اور ہر شئی کے مقابل کے مہیا کرنے کے شوق سے ان کا تعلق ہے، کھلی ہوئی بات ہے کہ ایک قسم کی

ابلہی کے سوا اسے اور کیا سمجھا جا سکتا ہے، تاجروں اور کاریگروں، کارخانہ داروں سے پوچھیے، وہی بیرانہ چونچلوں کے اس راز سے خوب واقف ہیں، اسی لئے ایک ہی چیز کو مختلف شکلوں اور قالبوں میں ڈھال ڈھال کر وہ ان کے سامنے پیش کرتے رہتے ہیں، اور ان بیچاروں کی، وف ذہنیت سے جو ازدواجیت کے ذوق کی عموماً مریض ہوتی ہے فائدہ اٹھاتے ہیں، بسطیوں کو جو کچھ دیا گیا ہے جو اس کی اس واقعی حقیقت پر متنبہ ہو جائے گا جس کی طرف قرآن نے "ازواجاً" کے لفظ سے اشارہ کیا ہے، ظاہر ہے کہ حقیقت کے سمجھ لینے کے بعد اسی ابلہی کی ہوس اپنے اندر کیوں پیدا کرے گا، اور میں تو سمجھتا ہوں کہ مشہور حدیث

من حسن اسلام المرء ترک مالا یعنیہ۔	آدمی کے اسلام کی خوبی کی یہ دلیل ہے کہ لاحاصل اور بے نتیجہ باتوں کو ترک کر دے۔

کا ایک مصداق آدمی کا یہ طرز عمل بھی ہے، بلکہ حدیثوں میں جو آیا ہے۔

یکفیک من الدنیا ما سد جوعتک ووارٰی عورتک وان کان شیئ یظلک فذاک وان کان لک دابۃ فبخ۔ (کنز العمال)	دُنیا سے تیرے لئے یہ کافی ہے جس سے تیری بھوک کا ازالہ ہو جائے اور جس سے تیری ستر پوشی ہو جائے۔ اور ان ہی کے ساتھ اگر کوئی ایسی چیز بھی تجھے مل گئی جس کے سائے میں تو رہے (یعنی کسی قسم کا گھر) تو پھر یہ تو ہے ہی، اسی کے ساتھ اگر کوئی سواری بھی تجھے مل جائے تو پھر کیا کہنے۔

اس میں بھی اسی حقیقت کی یافت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

اب اس کے بعد "زہرۃ الحیوٰۃ الدنیا" کے الفاظ پر غور کیجیے، میں نے عرض کیا تھا کہ اسی کی دوسری تعبیر قرآن ہی میں "زینۃ الحیوٰۃ الدنیا" سے بھی کی گئی ہے، یعنی جن سرمایوں کو بسطیوں کا سرمایہ سمجھا جاتا ہے قرآن نے اشارہ کیا ہے کہ اس کا تعلق بھی زندگی کی ضرورت سے نہیں، بلکہ زینت سے ہے، جن لوگوں کو حیاتِ دُنیا کی زینت دی گئی ہے، اس زینت کے استعمال سے تو ان کو منع نہیں کیا گیا ہے، بلکہ منع کرنے والوں کو ڈانٹا گیا ہے، جس کا ذکر اپنے مقام پر آ چکا ہے، لیکن سوال ان لوگوں کے متعلق ہے جو حیات دنیا کی اس زینت یا زہرہ سے محروم ہیں، کیا ان کی محرومی اس قابل ہے کہ اس پر حزن کیا جائے، اور اس حُزن وملال کو مٹانے کے لئے زینت ہی کو اپنی زندگیوں کا مقصود بنا لیا جائے؟ قرآن میں سخت تہدیدی لہجہ میں یہ فرماتے ہوئے

ترید زینۃ الحیوٰۃ الدنیا	کیا اس پست زندگی کی زینت کو تم اپنا مقصود بناتے ہو۔

حیات دنیا کی زینت کو مقصود بنانے سے روکا گیا ہے۔ کیوں روکا گیا ہے؟ کیا خُدا کا اس میں فائدہ ہے، آخر حیاتِ دُنیا کی زینت سے جو سرفراز کئے گئے ہیں، انھیں اس کے استعمال سے جب منع نہیں کیا گیا ہے تو زینت کا استعمال ظاہر ہے کہ حق تعالیٰ کی ناراضی کا سبب کیسے ہو سکتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ یہاں خطاب

ان لوگوں سے ہے جن کی معاشی زندگی زینت کے اسباب سے خالی ہے، ان کو ہدایت کی گئی ہے کہ خواہ مخواہ بلا وجہ زینت کو اپنا مطلوب بنا کر وقت کو رائگاں نہ کریں۔ جب ضرورت پوری ہو رہی ہے تو غیر ضروری چیزوں کی طلب میں اپنے آپ کو دکھ میں آدمی کیوں مبتلا کرے۔ بلکہ مدّ عین والی آیتوں میں سے ایک آیت جو سورۂ طٰہٰ میں پائی جاتی ہے اس کے آخر میں جو یہ الفاظ ہیں

ورزق ربک خیر و ابقی — تیرے مالک کی روزی تیرے لئے خیر بھی اور زیادہ باقی رہنے والی بھی۔

اگر غور کیا جائے تو حیاتِ دُنیا کی زینت کو مطلوب بنانے سے روکنے کے دوسرے وجوہ بھی اسی سے سمجھ میں آسکتے ہیں، مطلب یہ ہے کہ زینت سے ہٹ کر اگر آدمی ان ہی ضروریات پر قناعت کرے جن کی بدولت اس کی زندگی گذرتی رہتی ہے، قرآن نے جس کا نام "رزق رب" رکھا ہے تو زینت کی لوکو دل سے نکالنے کے ساتھ ہی رب کی یہی روزی آدمی کے لئے خیر کا رنگ اختیار کر لیتی ہے، خیر کے معنی وہی ہیں کہ وہی اس کی فطرت کے لئے بہتر اور خوش گوار بن جاتی ہے اور یہ حاصل تو خیر کے لفظ کا ہوا، رہا دوسرا لفظ ابقیٰ کا جو اس کے بعد ہے۔ اس کو یوں سمجھئے کہ آدمی جب تک جیتا ہے، اس وقت تک ضروریاتِ حیات بہر حال اس کے لئے مہیا ہوتے ہی رہتے ہیں، بلکہ وہ جیتا ہی اس وقت تک ہے جب تک قدرت ان ضرورتوں کو اس کے لئے مہیا کرتی رہتی ہے جن پر اس کی زندگی مبنی ہے، اس لئے جب تک زندگی ہے اس وقت تک ان ضرورتوں کی فراہمی بھی ضروری ہے۔ اور جب تک یہ ضرورتیں فراہم ہوتی رہتی ہیں، اسی وقت تک زندگی ہے، خلاصہ یہ ہے کہ زندگی اور زندگی کی ان ضرورتوں کو ایک دوسرے سے کوئی علیحدہ نہیں کر سکتا بخلاف ان چیزوں کے جن کا تعلق حیاتِ دنیا کی زینتوں سے ہے، کہ زندگی کے ساتھ ان کی بقا کی ذمہ کوئی نہیں لے سکتا، آئے دن لوگوں کو یہ ملتی بھی رہتی ہے اور چھنتی بھی رہتی ہے، کتنے زینت والے ہیں جو چھنتے رہتے ہیں، اور حیاتِ دنیا کی ان زینتوں کے بغیر جیتے رہتے ہیں جن سے کسی زمانہ میں وہ مالا مال تھے زینۃ الحیٰوۃ الدنیا کو مطلوب و مقصود بنانے سے منع کرنے کا یہ دوسرا فائدہ ہے جس کی طرف "ابقیٰ" کے لفظ سے میرے خیال میں قرآن میں ایما کیا گیا ہے، اور غالباً یہی مطلب اس حدیث کا بھی ہے۔

ما قل و کفی خیر مما کثر و الھی — ایسی چیز جو کم ہو، لیکن کافی ہو، وہ بہتر ہے اس چیز سے جو ہو تو بہت، لیکن آدمی کو غفلت میں مبتلا کردے (یعنی زندگی کے حقیقی نصب العین سے غافل بنا دے!)

(منیانی المختار)

اور یہ مطلب تو "مُدّ" کا ہوا، باقی اسی قانون کا دوسرا جزء جسے "غَلّ" کے لفظ سے ادا کیا گیا ہے۔ یہ اصطلاح بھی قرآن ہی کے الفاظ سے ماخوذ ہے

مقصد یہ ہے کہ قدری معیشت رکھنے والوں کو ایک توسلبی حکم یہ دیا گیا ہے کہ طرح طرح کی نعمتوں اور حیاتِ دنیا کی تروتازگی زیب و زینت سے جو لوگ سرفراز ہیں، ان کی طرف مدّ عین نہ کرنا چاہئے یعنی ان کی طرف ٹکٹکی باندھنے یا گھورنے سے منع کیا گیا ہے۔ اب اسی کے ساتھ قرآن ہی کے دوسرے

ایجابی حکم کو ملا لیا جائے، یعنی اس قسم کی آیتوں کو جن میں سے ایک مشہور آیت یہ ہے،

وان تعدوا نعمة الله لاتحصوها	اور اگر اللہ کی نعمت کو تم گنو، تو نہ گِن پاؤ گے اس کو۔

مذکورہ بالا آیت میں نعمتوں کے عدل (شمار) کرنے کی طرف توجہ دلائی گئی ہے، اسی لئے جو قانون اس سے پیدا ہوتا ہے اس کا نام مال کی مناسبت سے عدل رکھ دیا گیا ہے۔ مَدّ کا قانون تو سلبی حکم پر مشتمل ہے یعنی مدّ عینین سے روکا گیا ہے، اور عدّ و لا قانون ایجابی و اثباتی ہے۔ یعنی جن نعمتوں میں آدمی زندگی کے ہر لمحہ میں ڈوبا ہوا ہے، ان ہی کے گننے کا مطالبہ کیا گیا ہے میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ قانون مدّ کی تعمیل کرتے ہوئے نایافتہ نعمتوں سے نگاہوں کو ہٹا کر یافتہ نعمتوں کو اگر آدمی شمار کرنے لگے، تو بستیوں کی طرف آنکھ اٹھانے، ان کے معاشی حال سے اپنے معاشی حال کو ناپنے کی وجہ سے قلوب میں شکوے شکایت کے جو جذبات پیدا ہوتے ہیں، صرف ان کا ہی ازالہ نہیں ہو جائے گا بلکہ یافتہ نعمتوں کے شمار کرنے یعنی قانونِ عد پر عمل کرنے کا یہ لازمی نتیجہ ہوگا کہ جذباتِ شکر کی مسرتوں سے دل بھر جائیں گے، بخاری و مسلم وغیرہ میں جو یہ حدیث پائی جاتی ہے، یعنی

قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم اذا نظر احدکم الی من فضل فی المال ..... فلینظر الی ما ھو اسفل منہ۔	تم میں سے جس کی نظر ایسے آدمی پر پڑے جسے مال و دولت میں اس پر برتری عطا کی گئی ہو، تو چاہیئے کہ دیکھے اس وقت ان لوگوں کو جو (مال و دولت کے حساب سے) اس سے نیچے ہیں۔

میں تو سمجھتا ہوں کہ قانونِ عد ہی کی تعمیل کی یہ ایک عملی شکل ہے، مطلب وہی ہے کہ بستیوں کی دولت و ثروت، بجت و شوکت کو دیکھ دیکھ کر اپنی قدری معیشت سے جو لوگ غیر مطمئن ہو جاتے ہیں، اور نایافتہ کی حسرتیں ان کو بے چین کرتی رہتی ہیں، ان کو چاہیئے کہ ان نعمتوں کو شمار کریں جو انھیں حاصل ہیں اور ان حاصل شدہ نعمتوں کے شمار کرنے کا طریقہ یہ بتایا گیا ہے کہ ایسے آدمی کو چاہیئے ان لوگوں کو دیکھے جو نعمتوں کے حساب سے اس سے بھی فروتر درجہ میں ہیں، سعدی نے جس کی مثال دی ہے کہ بغیر جوتے کے ایک دن راہ چلنے کا مجھے اتفاق ہوا، اپنے افلاس کا دل میں شکوہ پیدا ہوا تھا کہ سامنے ایک آدمی پر نظر پڑی جس کے پاؤں کٹے ہوئے تھے، اس حال کو دیکھ کر

سپاس نعمتِ حق بجا آوردم و بہ بے کفشی صبر کردم۔	اللہ کی نعمت کا شکر بجا لایا، اور جوتے کے نہ ہونے پر دل کو صبر ہو گیا۔

اور کوئی شبہ نہیں کہ قدری معیشت کی طرف جن جن تکلیفوں کو منسوب کیا جاتا ہے، ان کا ایک بڑا حصہ اس ترکیب پر عمل پیرا ہونے کے بعد صرف زائل ہی نہیں بلکہ زحمتیں راحتوں سے بدل جاتی ہیں، مذکورہ بالا حدیث کے راویوں میں، عوف بن عبد اللہ بن عتبہ بھی ہیں، صاحبِ جمع الفوائد نے ان کا یہ

ذاتی تجربہ نقل کیا ہے، یعنی اس حدیث کو بیان کرنے کے بعد انھوں نے کہا۔

کنت اصحب الاغنیا فما	میں بڑے امیروں کی صحبت میں زندگی گذارا
کان اکثر هما منی کنت اری	کرتا تھا، اس زمانہ میں مجھ سے زیادہ غم
دابة خیرا من دابتی وثوبًا	الم والا آدمی کوئی نہ ہو گا، میں دیکھتا کہ
خیرًا من ثوبی فلما سمعت	دوسروں کی سواری میری سواری سے اچھی
هذا الحدیث صحبت الفقرآء	ہے، اور دوسروں کے کپڑے میرے کپڑوں
واسترحت۔	سے اچھے ہیں، لیکن جب سے نور بار حدیث
(مجمع الفوائد ص ۱۵۲ ج ۱)	میں نے سنی، میں نے فقیروں کی صحبت

اختیار کی، بس اس دن سے چین میں ہوں۔

قدری معیشت اور قانون صبر

اور اب سمجھا جا سکتا ہے کہ اس صبر کا کیا مطلب ہے؟ جس کا مطالبہ اگرچہ ان تمام کشکشوں، پریشانیوں، بےچینیوں میں کیا گیا ہے، جو موجودہ زندگی کے کسی شعبہ میں پیش آتی ہیں یا آسکتی ہیں۔ لیکن ان ہی پریشانیوں میں قدری معیشت کی پریشانیاں بھی ہیں جن کے متعلق قرآن میں اسی صبر کے قانون سے استعانت اور امداد حاصل کرنے کا حکم دیا گیا ہے، صبر سے جن جن مقامات میں کام لینا چاہئیے ان میں "اموال کے نقص" کا بھی قرآن نے تذکرہ کیا ہے، اور جو لوگ قدری معیشت کی پریشانیوں میں صبر سے کام لیتے ہیں

الصابرین فی الباساء	وہی جو جنگی مصائب اور معاشی تکلیفوں
والضرآء۔	کے وقت صبر کرنے والے ہیں۔

کے ذیل میں شمار کر کے ان کی تعریف کی گئی ہے۔

میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ "مدّو عدّ کے قانون" کو سمجھ لینے کے بعد قدری معیشت رکھنے والوں کے لئے "صبر" کے مطالبہ کی تکمیل میں غور کرنا چاہئیے کیا اب بھی دشواری پیش آسکتی ہے؟ آخر "صبر" کا کیا مطلب ہے، شیخ محی الدین بن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے صبر کی تشریح ان الفاظ میں کی ہے، یعنی

حبس النفس عن الشکوی (ج ۲ ص ۲۱۶) اپنے جی کو شکوہ، گلہ سے روکے رکھنا۔

ظاہر ہے کہ "مدّو عدّ کے قانون" کا علم جن الفاظ میں قرآن نے عطا کیا ہے، جس کی تشریح گذر چکی، اس علم کی روشنی میں "صبر" کے مقام تک آدمی قدرتی طور پر پہنچ جاتا ہے، میں بتا چکا ہوں کہ ان قوانین سے علم کی تصحیح کے بعد شکوہ شکایت کا ازالہ خود بخود ہو جاتا ہے، بلکہ بجائے اس کے دل کو شکر یوں کے جذبات سے معمور بنایا جا سکتا ہے۔ "صبر" غریب کا جن لوگوں نے "از روئے تلخ" نام رکھ چھوڑا ہے، حتیٰ کہ بعضوں نے تو صبر کے اس لفظ تک کو عربی زبان کے لفظ "صبر" سے ماخوذ قرار دیا ہے، جو ایلوا جیسی تلخ چیز کا نام ہے۔ پھر اس تلخی کو مٹانے کے لئے مختلف قسم کی تدبیروں سے دنیا کے اکثر ادبیات میں کام لیا گیا ہے۔ لیکن تعلیم و تربیت کا اسلام نے جو طبعی طریقہ اختیار کیا ہے، یعنی عمل کی تصحیح کے لئے علم کی تصحیح پر ہی

اسی طریقۂ کار کو اختیار کرنے کے بعد آپ نے دیکھا کہ "صبر" کا عمل اس علم کا ایک لازمی منطقی نتیجہ بن جاتا ہے، جو مذکورہ بالا آیتوں سے ہمیں بخش گیا ہے، یعنی بسطی معیشت والوں کی دولت و ثروت کو دیکھ دیکھ کر قدری معیشت والوں کو جو کوفت اور دکھ ہوتا رہتا ہے، دکھ کا یہ کانٹا نکل جاتا ہے۔ ایک سکون میسر آتا ہے، ایسا سکون، جو لوگوں کے سامنے اپنے افلاس اپنی تنگ دستی کے اظہار سے آدمی کو بے نیاز بنا دیتا ہے، یہی لے دے کر صبر کا مطلب ہے۔ ورنہ جو چیزیں آدمی کو میسر نہیں ہیں، ان کے لئے جد و جہد کرنا خواہ جزئی اسباب کی راہ سے سعی و کوشش کی جائے یا کائناتی پیداوار جس کے قبضۂ قدرت میں ہے۔ دوسرا نام جس کا سبب الاسباب ہے اس کے آگے عرض و معروض کر کے ان چیزوں کے حصول کی تدبیر اختیار کی جائے، یعنی دعاء کی جائے، صبر کے منافی نہ دہ تر نہ ہے، سعی و عمل کے متعلق مجھے جو کچھ کہنا تھا پہلے کہہ چکا ہوں، رہی دوسری تدبیر یعنی مسبب الاسباب ہی سے براہ راست ان کو مانگنا اور طلب کرنا سو اس کا حکم تو قرآن ہی میں ہے، اسی آیت کے بعد جس میں مدعیّن سے منع کیا گیا ہے، یہ ارشاد ہے

واصطبر لعبادته نحن نرزقک	اور اپنے مالک کی عبادت پر ڈٹا رہ، ہم
والعاقبة للتقویٰ۔	تجھے روزی پہنچائیں گے، اور اچھا انجام
	تو پرہیزگاری کا ہے۔

جس کا مطلب میری سمجھ میں تو یہی آتا ہے کہ ارباب ثروت و دولت کی طرف ٹکٹکی باندھنے سے تو کوئی فائدہ نہیں بلکہ ان کو دیکھ دیکھ کر اپنے آپ کو ان سے ناپ ناپ کر لوگ اپنے ہاتھوں خود کو ذہنی لکد کوب اور دماغی کوفت میں مبتلا کر لیتے ہیں، بلکہ بجائے اس کے قرآن حکم دیتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت پر ڈٹے رہو، عبادت کی تشریح کرتے ہوئے خود پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہے الدعاء مخ العبادة (عبادت کا مغز دعا ہے) بلکہ بعض روایتوں میں تو ہے کہ الدعاء هو العبادة (دعا ہی عبادت ہے) بس عبادت پر ڈٹے رہنے کا مطلب یہی ہوا کہ دعا پر ڈٹے رہو، آگے وعدہ کیا گیا ہے کہ

نحن نرزقک	ہم تمہیں روزی پہنچاتے رہیں گے۔

گویا دعا کے راز سے واقف ہونے کے بعد جو اس پر ڈٹ ہوا ہے، وہ روزی کے اس سرچشمہ پر جا کر کھڑا ہو گیا ہے کہ جس کسی کو جو کچھ مل رہا ہے وہیں سے مل رہا ہے، بس صبر کی تلقین سے مقصود یہی ہے کہ غیروں کے سامنے ذلیل ہونے سے اللہ کے بندوں کو بچایا جائے، ورنہ حق تعالیٰ سے مانگنا اس کے آگے اپنی ضرورتوں کے لئے گڑگڑانا، یہ تو بندوں کی زندگی کے نصب العین کی تکمیل ہے، اسی لئے شیخ اکبر نے لکھا ہے کہ

الصبر عندنا حبس	صبر کی حقیقت ہمارے یہاں یہ ہے کہ اپنے
النفس عن الشکوی لا الی اللہ	جی کو آدمی شکوہ شکایت سے روکے رکھے
(فتوحات ص ۲۱۶ ج ۲)	لیکن خدا کے آگے نہیں۔

یعنی خدا کے سامنے اپنی ضرورتوں کا پیش کرنا یہ صبر کے منافی نہیں ہے۔ ترمذی کی جو یہ حدیث ہے کہ

قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم من نزلت بہ فاقۃ فانزلھا بالناس لم تسد فاقتہ ونزلت بہ فاقۃ فانزلھا باللہ فیوشک اللہ برزق عاجل او عاجل۔

جس شخص پر فاقہ کی مصیبت نازل ہوا گر اپنی اس حاجت کو لوگوں پر دہ پیش کرے گا، تو اس کی حاجت پوری نہ ہوگی۔ مگر وہ جس پر فاقہ کی مصیبت نازل ہوئی اور اپنی اس حاجت کو اس نے خدا کے سامنے پیش کیا۔ تو قریب ہے کہ دیر یا سویر اس کے پاس روزی پہنچ کر رہے گی۔

الحاصل ”الرزق“ کا جو حقیقی مالک و مختار ہے، اس کے آگے اپنی ضرورت کو پیش کرنا، پیش کرتے رہنا اور اس ضرورت کی تکمیل کو حق تعالیٰ کے سپرد کر دینا اسی کا اصطلاحی نام ”توکل“ ہے۔ قرآن میں

رب المشرق والمغرب لا الہ الا ھو۔

پالنے والا مشرق کا اور مغرب کا نہیں ہے الٰہ کوئی اس کے سوا۔

کا علم عطا فرمانے کے بعد

فاتخذہ وکیلا

پس بنالے تو اسی کو اپنا وکیل۔

کے فرمان میں اسی ”توکل“ کا مرادو حکم دیا گیا ہے، حقیقت تو یہ ہے کہ قدری معیشت کی کشمکشوں میں صبر کی راہ کھولکر اور صبر کے دامن کو ”دعا و توکل“ سے جوڑ کر زندگی کے ایک ایسے طریقہ کی تعلیم مسلمانوں کو دی گئی ہے کہ معیشت کی قدریت اور تنگی خواہ کسی حال میں پہنچ گئی ہو، لیکن عمل کرنے والے ان قاعدوں پر عمل کرکے چاہیں تو ہمیشہ اپنے آپ کو خوش رکھ سکتے ہیں، بلکہ میں تو خیال کرتا ہوں کہ سورۂ کہف کی آیت

واصبر نفسک مع الذین یدعون ربھم بالغداۃ والعشی یریدون وجھہ ولا تعد عیناک عنھم ترید زینۃ الحیوۃ الدنیا ولا تطع من اغفلنا قلبہ عن ذکرنا واتبع ھواہ وکان امرہ فرطا۔

اور روکے رکھیو اپنے آپ کو ان لوگوں کے ساتھ جو پکارتے ہیں اپنے مالک کو صبح وشام، مقصود بنایا ہے ان لوگوں نے اللہ کے وجہ کو، اور نہ ہٹیو اپنی دونوں آنکھوں کو ان سے، کیا مقصود بنانا چاہتے ہو تم پست زندگی کے بناؤ سنگار کو اور نہ اطاعت کرنا ان لوگوں کی جن کے دل کو ہم نے اپنی یاد سے غافل بنا دیا ہے اور پیچھے لگ گیا ہے وہ اپنی ہوا (من مانے خیالات) کا اور ہے بات اسکی حد سے بڑھی ہوئی

اس میں بھی صبر کی تلخیوں کے مٹانے کی ایک تدبیر بتائی گئی ہے، مطلب یہ ہے کہ کسی عمل کے اختیار کرنے میں آدمی کو اگر دشواری محسوس ہو تو عام قاعدہ ہے کہ نمونوں اور مثالوں سے پست ہمتوں میں بلندی پیدا

ہو جاتی ہے، اگر غور کیا جائے تو نظر آئے گا کہ مسلمانوں کو مذکورہ بالا آیت میں جس کی ہدایت کی گئی ہے، حاصل بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ وجہ اللہ کو اپنے وجود کا نصب العین بنا کر جینا، یعنی یہ سمجھ کر کہ حق تعالیٰ اور اس کی مرضیات کے مطابق زندگی بسر کرنا، یہی مسلمان کی ہستی کا مقصد ہے، ظاہر ہے کہ اسلام کا آخری خلاصہ یہی ہے، پس حکم دیا گیا ہے کہ جن لوگوں نے وجہ اللہ کو اپنا مقصود اور اپنے وجود کا نصب العین ٹھیرالیا ہے، ان کے ساتھ اپنے آپ کو جوڑے رکھو، زندہ ہوں تو اُن ہی کے صحبت میں رہو، نشست و برخاست ان ہی کے ساتھ رکھو، اسی طرح جو اس دنیا کی زندگی ختم کر کے دوسرے عالم میں جا چکے ہیں، ان کے حالات وسوانح کا پڑھنا، میں تو سمجھتا ہوں کہ یہ بھی ان ہی لوگوں کی صحبت میں اپنے آپ کو روکے رکھنے کا ایک طریقہ ہے، دوسرے الفاظ میں یوں سمجھیئے کہ تنہا صبر کے مقام پر اگر کسی کا پاؤں زجمتا ہو تو ایسے مسلمانوں کو چاہیئے کہ اسلامی نصب العین رکھنے والے بزرگوں کے نمونوں سے فائدہ اٹھائیں جو زندہ ہیں ان کو دیکھیں، جو مر چکے ہیں، ان کے حالات کتابوں میں پڑھیں اور اپنے نصب العین میں کامیاب ہونے کے لئے جو طریقۂ عمل ان کا تھا، یعنی وجہ اللہ کو اپنا مقصود بنانے والے جیسا کہ چاہیئے زیادہ وقت اللہ ہی کے ذکر و فکر میں گذارتے ہیں، اسی طرح ان نمونوں سے فائدہ اٹھانے والوں کو بھی چاہیئے کہ ذکر و فکر میں ان ہی کا طریقہ اختیار کریں، آخر میں یہ فرما کر کہ

ولا تعد عیناک عنھم — اور نہ ہٹائیو اپنی دونوں آنکھوں کو ان سے

سے گویا اس پر تنبیہ کی گئی ہے کہ جیسے حیاتِ دنیا کی زینت والوں کی طرف ٹکٹکی باندھنے اور نظر اٹھانے سے منع کیا گیا ہے۔ اسی کے بالمقابل چاہیئے کہ ان نمونوں پر نگاہ جمائے رکھو، ان کو دیکھ دیکھ کر تسلی حاصل ہوتی رہے گی۔ آگے پھر اسی مضمون کو دہرایا گیا ہے جس کا "عین" کے قانون میں ذکر گذر چکا ہے، یعنی جن لوگوں نے اپنے وجود کا نصب العین یہ قرار دے رکھا ہے کہ اس پست زندگی کی زیب و زینت اور آرائشوں، آسائشوں کے حاصل کرنے میں اپنی آخری سانس پوری کریں گے قرآن ہی میں ایسوں کے متعلق اس قانون کا بھی اعلان کیا گیا ہے کہ

من کان یرید الحیوۃ الدنیا	اور جو مقصود بنا لیتا ہے اسی پست
وزینتھا نوف الیھم اعمالھم	زندگی اور اس کے زینت (بہت ٹھاٹ)
فیھا وھم فیھا لا یبخسون۔	کو، پورا کرتے ہیں ان اعمال کو اس میں
	اور نہیں کمی کی جاتی ہے دیتے ہیں۔

جس کا مطلب یہی ہوا کہ حیات دُنیا اور اس کی زینت کے حاصل کرنے کو جو لوگ اپنے جینے کا واحد نصب العین ٹھیرا لیتے ہیں، اور اسی راہ میں سعی و عمل کی ساری توانائیوں کو خرچ کرتے رہتے ہیں ان کو اپنے عمل کے نتیجوں سے محروم نہیں کیا جاتا، بلکہ جدوجہد سعی و عمل کے مطابق نتائج سے قدرت ان کو سرفراز کرتی ہے، قرآن میں جو کچھ کہا گیا ہے، آج اس کی تفسیر ان ممالک کے باشندوں کے طرز عمل سے

ہو رہی ہے جنہوں نے اسی حیاتِ دنیا کی زینت بناؤ سنگار کو اپنا مقصود بنا رکھا ہے، اور اپنے اپنے عمل کے مطابق اس کے نتائج بھی ان کے سامنے آ رہے ہیں[۱]۔ اور ان کی یہی کامیابیاں بالآخر اس مقام تک پہنچا دیتی ہیں، جس کا آیت کے آخر میں ذکر کیا گیا ہے، یعنی مسلمانوں کو ان کی پیروی سے منع کرتے ہوئے ان کے خصوصی صفات یہ بیان کئے گئے ہیں کہ ان کے قلوب پر قدرت غفلت کا پردہ ڈال دیتی ہے۔ اپنے رب کو وہ بھول جاتے ہیں، اپنے جینے کا مطلب ان کے نزدیک صرف یہ ہو کر رہ جاتا ہے کہ جو خواہش دل میں پیدا ہو، اس کے پیچھے روانہ ہو جائیں، اور جس طرح بن پڑے اس خواہش کو پورا کریں۔ اسی لئے قدرت کے جو مقررہ حدود ہیں، ان ہی حدود پر ٹھہر نہیں سکتے، ان کی زندگی صرف زیادتیوں سے معمور ہو جاتی ہے اور اس کی تصدیق بھی ان ہی ممالک کے باشندوں کی زندگیوں سے ہو رہی ہے جو زینۃ الحیٰوۃ الدنیا کو اپنی زندگی کا نصب العین بنا کر اپنی سعی و عمل کے نتائج سے بہرہ ور ہو رہے ہیں

---

[۱] جو اپنے وجود کا مقصد حیاتِ دنیا کو بنائے ہوئے ہیں، ان ہی کے متعلق قرآن میں دوسری جگہ ایک آیت ہے جس میں یہ ہے من کان یرید العاجلۃ عجلنا لہ فیھا ما نشاء لمن نرید (جو مقصود بنا تا ہے عاجلہ یعنی جلد ملنے والی چیز یعنی دنیا، کو تو جلد عطا کر دیتے ہیں اس میں جتنا ہم چاہتے ہیں جس کے لئے) جس کا مطلب بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ عاجلہ یعنی جلد ہی پیش آنے والی زندگی جو اسی حیاتِ دنیا کی دوسری قرآنی تعبیر ہے، جو اسی کو اپنا مقصود بنا لیتے ہیں، ان کو اسی دنیا میں دیا جاتا ہے لیکن سب کو دیدیا جاتا، بجائے اس کے فرمایا گیا ہے، جتنا ہم جسے چاہتے ہیں۔ اسی دنیا میں دیتے ہیں جس سے معلوم ہو کہ دنیا خواہوں میں ہر ایک کی آرزو کا پورا ہونا ضروری نہیں ہے اور یہ بھی مشاہدہ کی بات ہے لیکن سوال یہ ہوتا ہے کہ سورۂ ہود کی جس آیت کو اصل عبارت میں میں نے نقل کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں کو پورا پورا دے دیا جاتا ہے مطلب یہ ہے کہ بظاہر دونوں میں کچھ تضاد سا معلوم ہوتا ہے۔ لیکن اگر اس پر غور کیا جائے کہ سورۂ ہود والی آیت میں سعی و عمل کے نتائج کے متعلق قانون بتایا ہے یعنی محنت و کوشش کسی کی رائگاں نہیں جاتی نوف الیھم اعمالھم فیھا (پورا کرتے ہیں ان کے عمل ان کے نتائج اس پر تنبیہ کی گئی ہے کہ عمل پر ——— نتائج مرتب ہوتے ہیں، بخلاف اس آیت کے جس کا ذکر بنی اسرائیل کی سورۃ میں ہے یعنی حاشیہ میں جو نقل کی گئی ہے، اس میں صرف ان لوگوں کا حال ہے جو آرزو کرتے ہیں، اور دنیا خواہوں میں بے شبہ ایک بڑی جماعت ایسوں کی بھی ہے جس نے دنیا ہی کو اپنا نصب العین بنا لیا ہے۔ لیکن محنت و جفاکشی ان سے نہیں ہو سکتی۔ ان ہی کے متعلق فرمایا گیا ہے کہ ان میں سے جتنا چاہتے ہیں ہم دیتے ہیں۔ الغرض سورۂ ہود میں عمل کے نتائج سے لوگوں کو محروم نہیں کیا جاتا، دنیا میں بھی یہی قانون ہے اور آخرت کا بھی یہی ہے۔ اسی بنی اسرائیل والی آیت کے بعد ہے من اراد الاخرۃ وسعیٰ لھا سعیھا وھو مؤمن فاولئک کان سعیھم مشکورا۔ (یعنی جو آخرت کی زندگی کو اپنا مقصود بنا لیتا ہے۔ اور اسی نصب العین کے مطابق سعی و عمل میں سرگرمی دکھاتا ہے۔ تو ان کی کوشش بھی مشکور ہوتی ہے یا بالفاظِ دیگر نتائج سے ان کے عمل کو محروم نہیں کیا جاتا۔ البتہ آخرت کے نتائج عمل و سعی پر اسی وقت مرتب ہوتے ہیں جب عمل کرنے والا مومن ہو ایمان کے بغیر آخرت کے مساعی بارآور نہیں ہوتے ۱۲

اسی لئے فرمایا گیا ہے کہ گو دنیا میں تو ان کے اعمال کے نتائج بغیر کسی کمی کے ان کے سامنے آجاتے ہیں، لیکن آخرت کی ابدی زندگی میں ان ہی کے متعلق یہ بھی اعلان کیا گیا ہے

اولئک لیس لھم فی الاخرۃ	یہی وہ لوگ ہیں کہ نہیں ہے آخرت میں
الا النار وحبط ما صنعوا	ان کے لئے مگر صرف آگ اور نہیں نہیں
فیھا وبطل ما کانوا یعملون۔	ہو کر رہ گیا جو کچھ کیا دھرا تھا انھوں نے

دنیا میں۔ اور بے نتیجہ ہو کر رہ گیا جو کچھ انھوں نے کیا تھا۔

مسلمانوں کو ان کی اطاعت اور پیروی سے منع کیا گیا ہے، اسی لئے منع کیا گیا ہے کہ ان کی راہوں کو اگر تم بھی اختیار کرو گے تو وجہ اللہ والا اسلامی نصب العین تمہاری نگاہوں کے سامنے سے مٹ جائیگا اور اس کی توثیق بھی مشاہدہ و تجربہ سے ہو رہی ہے۔ مسلمانوں میں جنھوں نے ان قوموں کی راہ اختیار کی، خواہ وہ ہند میں ہوں یا ترک ہیں، مصر میں ہوں یا مراکش میں، جس نسبت سے ان کی طرف بڑھ رہے ہیں، وجہ اللہ کے نصب العین سے دور ہوتے چلے جا رہے ہیں، اور کھلی ہوئی بات ہے کہ اس نصب العین سے محروم ہو جانے کے بعد آدمی اور کچھ باقی رہتا ہو یا نہ رہتا ہو لیکن ظاہر ہے کہ مسلمان تو قطعًا باقی نہیں رہ سکتا بہرحال صبر کی دارو ئے تلخ کو خوشگوار بنانے کے لئے یہ تو وہ تدبیریں تھیں جو اسلامی وثائق میں پائی جاتی ہیں، لیکن قرآن نے ان ہی تدبیروں پر معاملہ کو ختم نہیں کر دیا ہے، بلکہ زینۃ الحیٰوۃ الدنیا کے نصب العین والوں کے سامنے ان کی سعی و عمل کے نتائج جیسے آتے ہیں، اسی طرح قرآن نے صبر کو بھی ایک مستقل عمل قرار دے کر اس پر مرتب ہونے والے نتائج کی بھی تفصیل کی ہے، پہلا نتیجہ تو اس عمل کا یہی ہے جسے ایک سے زائد مقام پر

ان اللہ مع الصابرین	قطعًا اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہیں۔

کے الفاظ میں ادا کیا ہے، قدرتی معیشت کے سلسلے میں جس صبر کی تلقین قدریوں کو کی گئی ہے، وہ چاہیں تو اسے یوں سمجھ سکتے ہیں کہ جن نایافتہ نعمتوں کی محرومی انھیں محزون رکھتی ہے، اگر بجائے اس حزن کے صبر کے عمل سے اس موقعہ پر امداد حاصل کریں گے۔ تو پائیں گے کہ ان نایافتہ نعمتوں کی جگہ خود حضرت حق سبحانہ وتعالیٰ کی معیت و رفاقت کی دولت انھیں ملی ہوئی ہے جو بجائے خود ایک ایسی دولت ہے جس کا معاوضہ دنیا کی کسی چیز سے نہیں ہو سکتا اور خدا ہی جس کے ساتھ ہو جائے سوچا جا سکتا ہے کہ اس نے کیا کچھ نہیں پایا۔ میں تو خیال کرتا ہوں کہ صبر کرنے والوں کے متعلق قرآن میں جو یہ فرمایا گیا ہے کہ انھیں یہ بشارت سنا دی جائے کہ

اولئک علیھم صلوات من ربھم	یہی وہ لوگ ہیں جن پر ان کے رب کی
ورحمۃ واولئک ھم	طرف سے صلوات نازل ہوتے ہیں، اور
المھتدون۔	رحمت اور یہی ہیں وہ لوگ جنھوں نے
	راہ پائی۔

تو یہ سب کچھ حق تعالیٰ کی اس معیت ہی کے نتائج ہیں جو صبر کی بدولت آدمی کو میسر آتی ہے، آخر خدا ہی جس کے ساتھ ہو گیا ہو، اگر خدا کی طرف سے اس پر صلوات کا نزول ہو، خدائی نعمتوں سے وہ مالا مال ہو جائے اور سیدھی راہ زندگی کی اس کے سامنے آجائے، تو آپ ہی بتائیے کہ اس کے سوا اور کسی دوسری بات کا امکان ہی کیا ہے۔ پھر زینۃ الحیوٰۃ الدنیا کو نصب العین بنانے والوں کے سامنے جیسے ان کے اعمال کے نتائج آتے ہیں، اسی طرح صبر کے اس عجیب و غریب عمل کے متعلق قرآن میں اگر یہ اطلاع دی گئی ہے کہ

انما یوفی الصابرون اجرھم بغیر حساب۔

اس کے سوا کوئی دوسری بات نہیں ہے کہ صبر کرنے والوں کو ان کا اجر بغیر کسی حساب کے دیا جاتا ہے۔

تو لوگوں کو اس پر حیرت کیوں ہوتی ہے جس عمل کی بدولت لامحدود طاقتوں والے خدا کی معیت میسر آتی ہے، صلوات اور خدا کی رحمتوں سے جو عمل آدمی کو ڈھانک دیتا ہو، جس کی روشنی میں سیدھی راہ پر عمل کرنے والے پڑجاتے ہوں، یقیناً ان کا غیر محدود اجر ہی تو ہے جو ان شکلوں میں ان کے سامنے آتا چلا جاتا ہے۔

بہرحال موجودہ زندگی کے مصائب کا مقابلہ صبر سے کرنا، اور صبر کو خوش گوار بنانے کے لئے مذکورہ بالا قرآنی تدبیروں سے فائدہ اٹھانا، جن نتائج کا وعدہ اس عمل پر کیا گیا ہے اس سے قلب کو قوی رکھنا، اسلامی دماغوں کے لئے ایسا معلوم ہوتا ہے کسی زمانے میں ایک فطری احساس کی شکل اختیار کئے ہوئے تھا، گویا مسلمانوں کے دماغ کی منطق ٹھیک قرآنی منطق بن گئی تھی۔ یہی مضمون جسے طول طویل الفاظ میں مجھے بیان کرنے کی ضرورت ہوئی، اور پھر بھی مطمئن نہیں ہوں کہ جو کچھ میں کہنا چاہتا تھا وہ کہہ بھی سکا یا نہیں، لیکن دیکھئے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اس مشہور قول پر غور کیجئے فرمایا کرتے تھے

ما ابتلیت ببلاء الا کان علی فیہا اربع نعم، اذ لم تکن فی دینی، واذ لم تکن اعظم منہا واذ لم احرم الرضی واذ ارجو الثواب فیہا۔

(ازالۃ الخفاء وغیرہ)

نہ مبتلا ہوا میں کسی مصیبت میں کہ میں اپنے لئے اس میں ان چار نعمتوں کو نہ پاتا ہوں، یعنی یہ مصیبت میرے دین میں نہیں ہے اتو کیا پروا) جب اس سے بڑی مصیبت ہو سکتی تھی وہ نہ تھی، اور جب حق کی رضامندی سے اس مصیبت کی وجہ سے میں محروم نہ ہوا، اور جب ثواب کی امید اس مصیبت پر لگاتا ہوں،

ہر مصیبت میں معاً چار نعمتوں کا احساس فرماتے ہیں کہ میرے دل میں بیدار ہو جاتا ہے، اور وہ نعمتیں کیا ہیں، وہی بات کہ اسلامی نصب العین جس کی تعبیر آپ نے دین سے کی یعنی وہ محفوظ رہ گیا، دوسری بات وہی ہے جس کا ذکر نعمتوں کے شمار یعنی قانون عدد کے ذکر میں گذر چکا، اور تیسری بات حدود اللہ سے متجاوز

ہونے کے جرم میں بجائے اس معصیت کے مبتلا نہ ہوا، جو تھی بات ان ہی نتائج کی طرف اشارہ ہے جن کا عمل صبر پر قرآناً مرتب ہونا ضروری ہے، ایک ایک مصیبت سے چار چار نعمتوں کو کھینچ کھینچ کر نزول مصیبت کے ساتھ ہی نکال لینا، اس حیرت انگیز اثر کی دلیل ہے، جو قرآن نے اپنے ماننے والوں میں پیدا کیا تھا، لیکن اب تو قرآن کے پڑھنے والے ہی کتنے ہیں، اور جو ہیں بھی وہ قرآن سے اپنی موجودہ زندگی کی دشواریوں کے حل کا کام ہی کب لینا چاہتے ہیں، خود میرا یہ طرز عمل کہ قرآن سے ان چیزوں کو نکال نکال کر مسلمانوں کے آگے اس لئے پیش کر رہا ہوں کہ ان سے فائدہ اٹھائیں، جہاں تک سمجھ رہا ہوں عام مذاق کے لحاظ سے یہی نہیں کہ اس سے کوئی دلچسپی نہیں لی جائے گی، بلکہ اکثروں پر میری یہ باتیں شاید گراں گذر رہی ہیں، لیکن میں کیا کروں، مجھے کچھ سمجھایا گیا ہے، چاہتا ہوں کہ دوسرے بھی کاش! اس کے سمجھنے میں میرا ساتھ دیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ قدرتی معیشت کے مشکلات کے حل کی جو ذمہ داریاں لسبطی معیشت رکھنے والوں پر عائد کی گئی ہیں۔ اپنی ان ذمہ داریوں کو اگر وہ نہ بھی محسوس کریں، حکومتوں پر جو فرائض قدریوں کے ان حقوق کی بجاآوری کے سلسلے میں اسلام کی طرف سے متوجہ ہوتے ہیں: ان حقوق کے حاصل کرنے میں حکومتیں لاپروائی سے بھی کام لیں، پھر بھی یہ واقعہ ہے کہ دوسروں پر اگر اختیار نہیں ہے تو اپنے آپ پر تو قدرتی معیشت رکھنے والوں کو اختیار ہے، میں تو خیال کرتا ہوں کہ جن تدبیروں پر عمل کرنے کا مطالبہ براہ راست خود قدریوں سے کیا گیا ہے، دوسروں سے قطع نظر کر کے صرف ان ہی مطالبات کی تکمیل پر اپنے آپ کو اگر یہ آمادہ کرلیں تو تجربہ ان کو بتائے گا کہ اپنی دشواریوں کے حل کا اقتدار بجائے دوسروں کے زیادہ تر خود ان کے اپنے ہاتھوں میں ہے، وہ چاہیں تو قدرتی معیشت کی اکثر و بیشتر کلفتوں کا ازالہ اسلام کی ان ہی تدبیروں کی امداد سے بسہولت تمام کر سکتے ہیں؛

بلکہ سچ تو یہ ہے کہ خود اپنی متعلقہ ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونا جو اپنے لئے ضروری نہیں سمجھتا، ایسوں کو تو صحیح معنوں میں دوسروں کو ان کی ذمہ داریوں کی طرف توجہ دلانے کی ہمت بھی نہیں کرنی چاہیئے، اپنی ذات کے متعلق جن سہولتوں کو ہم خود مہیا کر سکتے ہیں، جب ان ہی کے مہیا کرنے کی توفیق ہمیں نہیں ہوتی، تو ہماری جو سہولتیں دوسروں کے ہاتھ میں ہیں، ان کے مطالبہ کا آخر ہمیں حق ہی کیا پہنچتا ہے۔

ایک ضروری تنبیہ خدا ہی جانتا ہے کہ کیا اسباب پیش آئے، لیکن دیکھا یہی جاتا ہے کہ فقراء کے جو حقوق امراء کے اموال میں ہیں، بلکہ قدرتی معیشت رکھنے والوں کے ساتھ مختلف شکلوں میں عام حسن سلوک کے جو احکام اسلام نے لسبطی طبقات کو دیئے ہیں۔ ان کا شمار تو فرائض و واجبات میں کیا جاتا ہے، اسی لئے فرائض و واجبات میں ان کو شمار کیا جاتا ہے کہ ان مطالبات کو جن الفاظ میں ادا کیا گیا ہے ان کا اقتضاء یہی ہے، مگر سوچنے کی بات یہ ہے کہ قدرتی معیشت کے متعلق عملی تدبیروں کا مطالبہ خود قدریوں سے بھی تو الفاظ کے ان ہی قالبوں میں کیا گیا ہے جن کا اثر وہی وجوب و فرضیت ہے،

لیکن عام طور پر ان مطالبات کو اہمیت کیوں نہیں دی گئی؟ زیادہ سے زیادہ کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ قرآن کے ان احکام کو کچھ نیک مشوروں کی حیثیت سے لوگ استعمال کرتے ہیں۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ قدری معیشت کے مصائب کا احساس لوگوں کو جب ہوتا ہے تو ان کا دھیان بھی ان قرآنی احکام کی طرف نہیں جاتا، جن پر عمل پیرا ہونا ایسی حالت میں ان پر فرض کیا گیا ہے۔ آخر زہرۃ الحیوٰۃ الدنیا والوں کی گوناگوں نعمتوں کی طرف آنکھ اٹھانے سے قرآن نے جن الفاظ میں منع کیا ہے، کیا وہ معمولی الفاظ ہیں۔ "لا تمدن" ہی کے لفظ پر غور کیجئے، صرف یہی نہیں کہ بصیغۂ نہی اس فعل سے روکا گیا ہے جس کی خلاف ورزی قطعاً حرام ہو جاتی ہے، بلکہ آخر میں مشدد نون کے اضافہ نے اس حکم میں جتنی قوت بھر دی ہے، اس سے معمولی عربی صرف کا جاننے والا بھی واقف ہے، لیکن اپنے دلوں پر ہاتھ رکھ کر ہمیں سوچنا چاہیئے کہ ایسے سخت تاکیدی فرمانِ الٰہی کے متعلق ہمارے احساسات کیا ہیں اور وقت پر اس حکم کی تعمیل کی توفیق کتنوں کو ہوتی ہے اور جو حال مدّعین کے اس قانون کا ہے، یہی حال نعمتوں کے عدوالے قانون کا بھی ہے۔ یہی حال ان دفعات کا بھی ہے جن میں صبر اور صبر کے متعلقہ احکام نافذ کئے گئے ہیں۔

اس سے بھی عجیب تر بات یہ ہے کہ قدری معیشت کی ان ذمہ داریوں کے متعلق جو الفاظ مسلمانوں میں آج مروج ہیں معنوی حیثیت سے خواہ ان کا مآل وہی کیوں نہ ہو جو قرآنی الفاظ کا مآل ہو، لیکن نہ معلوم کیوں قرآنی محاوروں کو ترک کر کے دوسرے الفاظ کو ان کا قائم مقام بنا کر پھیلا دیا گیا ہے مثلاً ایسے مواقع میں لوگوں کو قناعت کی تعلیم دی جاتی ہے، لالچ اور حرص سے روکا جاتا ہے۔ مجھے اس سے انکار نہیں ہے کہ ان الفاظ کا مقصد بھی اگر چہ قریب قریب وہی ہے جو قرآنی الفاظ کا مفاد ہے، لیکن قرآنی تعبیروں کو چھوڑ دینے کا ایک نتیجہ یہ بھی ہے کہ ان غیر قرآنی اصطلاحات کو قرآن میں نہ پا کر شعوری یا غیر شعوری طور پر کچھ اس قسم کا احساس قائم ہو گیا ہے کہ یہ قرآنی مطالبات ہی نہیں ہیں، بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر بدگمانوں کا ایک گروہ ہم میں ایسا بھی پیدا ہو گیا ہے جو سمجھتا ہے کہ شاید غیر قوموں سے مسلمانوں میں قناعت و کم طلبی وغیرہ کے جذبات منتقل ہوئے ہیں، ظاہر ہے کہ ان مغالطوں میں جو خود مبتلا ہو گئے ہیں یا دوسروں کو مبتلا کرنا چاہتے ہیں۔ اس میں زیادہ تائید ان لوگوں کو قرآنی تعبیرات کے ترک ہی سے حاصل ہو رہی ہے، بلکہ سچ تو یہ ہے کہ غیر قرآنی الفاظ کی اشاعت ہی کا ایک نتیجہ یہ بھی ہوا ہے کہ اس سلسلے کے قرآنی بیانات کے متعلق صحیح طور پر یہی طے نہیں ہوا ہے کہ ان کا تعلق معیشت کے کس خاص کیفیت سے ہے؟ یعنی جن قرآنی آیات کا تعلق قدری معیشت اور اس کی دشواریوں کے حل سے ہے، ان کے متعلق عام مسلمانوں میں جہاں تک میں جانتا ہوں اس قسم کا کوئی خیال نہیں ہے، عموماً یہی سمجھا جاتا ہے کہ ان کا خطاب ہر شخص سے ہے، خواہ وہ قدری معیشت رکھتا ہو، یا بسطی، یہی وجہ ہے کہ جن خاص مواقع پر ان قرآنی احکام اور مشوروں کو استعمال کرنا چاہیئے، عام طور پر ان موقعوں پر لوگ ان کے استعمال کرنے کے عادی نہیں ہیں، اس لئے مسلمانوں کو ان آیتوں سے جو منافع پہنچنے چاہئیں جیسا کہ چاہیئے

نہیں پہنچ رہے ہیں۔ ضرورت جب پیش آتی ہے تو لوگوں کے سامنے عموماً ان اشعار اور مقولوں کو پیش کر دیا جاتا ہے جن میں غیر قرآنی الفاظ استعمال کئے گئے ہیں، ظاہر ہے کہ اگر براہ راست قرآنی آیتوں کے استعمال کا رواج مسلمانوں میں باقی رہتا، تو یقیناً اس کے آثار و نتائج موجودہ حال سے مختلف ہوتے۔

بہر حال جو کچھ ہونا تھا وہ ہو چکا، آپ کے سامنے معیشت کی دونوں قسموں اور ہر قسم کے متعلق اسلام نے مسلمانوں پر جو فرائض عائد کئے ہیں براہِ راست قرآنی الفاظ ہی میں پیش کر دیئے گئے ہیں، حدیثوں کا استعمال بھی صرف تشریح و تفصیل کی حیثیت سے کیا گیا ہے، اس بحث کو اسی نقطہ پر ختم کر کے

قل الحق من ربکم فمن شاء فلیومن ومن شاء فلیکفر۔[۱] — سچی بات بول دے جو تیرے رب سے تجھ تک پہنچی ہے، پھر جس کا جی چاہے مانے اور جس کا جی چاہے انکار کر دے۔

کی اس آیتِ کریمہ کو تلاوت کر کے چپ ہو جاتا ہوں۔

یہاں تک تو ان ذمہ داریوں کا ذکر تھا جو رزق کی کسبی و قدری حالتوں میں قرآن نے عائد کی ہیں، اب وقت آگیا ہے کہ ان ذمہ داریوں کی خلاف ورزی کے جن نتائج پر قرآن نے تنبیہ کی ہے اس کی تفصیل پیش کر دی جائے، جیسا کہ میں نے عرض کیا تھا کہ بحث کا حقیقی حاصل مضمون کا یہی حصہ ہے اسی میں اس شبہ کا جواب آپ کو مل سکتا ہے جس کا ذکر ابتدائے مضمون میں کیا گیا تھا، یعنی معاشی زندگی میں خدا کو الٰہ المعاش بنانے سے جو گریز کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ کم از کم موجودہ زندگی میں اس کے نتائج سے انھیں دوچار ہونا نہیں پڑتا ہے۔ یورپ و امریکہ کے باشندوں کی باغیانہ زندگی ثبوت میں پیش کی جاتی ہے۔ اسی خیال کی تردید واقعات کی روشنی میں اب آپ کے سامنے ہو گی آپ دیکھیں گے کہ اس سلسلہ میں قرآن کی ساری معاشی دھمکیاں صرف دھمکیاں نہیں ہیں، بلکہ زندگی کے وہ حقیقی و مشاہداتی حقائق ہیں، وباللہ التوفیق۔

اجمالاً پہلے بھی اس کا ذکر آچکا ہے، درحقیقت اسی کی تفصیل اب مقصود ہے، قرآن میں "معیشت" کا ذکر کر کے ایک خاص قانون کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا گیا ہے۔ یعنی

ومن اعرض عن ذکری فان لہ معیشۃ ضنکا۔ — اور جو کترایا میری یاد سے تو یقیناً اس کے لئے ہے ایسی معیشت جو ضیق اور تنگی سے بھری ہے۔

ضیق اور تنگی، یہی "ضنک" کے لغوی معنی ہیں، حاصل اس کا یہی ہوا کہ حق تعالیٰ اور اس کی عائد کردہ

---

[۱] یہ بات خاص طور پر سوچنے کی ہے کہ مندرجہ بالا آیت قرآن میں اسی موقع پر آئی ہے، جہاں قدری معیشت کی الجھنوں کا عملی علاج یہ بتایا گیا ہے کہ وجہ اللہ کو نصب العین بنا کر جینے والوں کی صحبت پر صبر کرو، اور ان ہی پر اپنی نگاہوں کو جائے رکھو ۱۲

ذمہ داریوں کو جو یاد نہیں کرنا چاہتا، قرآن میں یہ اعلان کیا گیا ہے کہ اس کی معیشت میں قدرت تنگی اور ضیق پیدا کر دیتی ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ قانون زندگی کے ہر حال اور ہر پہلو کو حاوی ہے، اسی لئے سمجھنا چاہئے کہ رزق کے حساب سے خواہ آدمی بسط کی حالت میں ہو، یا قدر کے، جو اپنی متعلقہ ذمہ داریوں سے اعراض و گریز کرے گا، اس کی معیشت تنگی اور ضیق کی شکار ہو جائے گی، اگرچہ یہ بالکل ایک تجربی چیز ہے، اسی لئے علماء نے اس کی تفصیل کی طرف کم توجہ کی، یعنی یہ بات کہ ایسی حالت میں ضیق اور تنگی کی کیفیت معیشت میں کیوں پیدا ہو جاتی ہے اسے چھوڑ دیا گیا ہے کہ تجربہ ہی اس کا بہترین جواب ہو سکتا ہے۔

لیکن جہاں تک میں سمجھتا ہوں، قرآن ہی کی متفرق آیتوں کے مضمون پر اگر غور کیا جائے تو علاوہ تجربہ کے یوں بھی اس کے اسباب اور ان اسباب سے پیدا ہونے والے آثار کو بیان کیا جا سکتا ہے، جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں، اس باب میں اپنے خیالات عرض کرتا ہوں۔

بسطی معیشت کی ذمہ داریوں کی خلاف ورزی کے نتائج

کھلی ہوئی بات ہے کہ معیشت میں بسط کی خواہش اسی لئے کی جاتی ہے کہ بسطی معیشت سے زندگی میں سہولت و آسانی پیدا ہوتی ہے۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہئے کہ مال و دولت کی غرض یہی سمجھی جاتی ہے کہ خواہشوں کی تکمیل اور ضرورتوں کی فراہمی میں ان سے امداد ملتی ہے، لیکن بسطی معیشت کا یہ مقصد کیا ہر حال میں پورا ہوتا ہے قرآن ہی کی آیت ہے۔

وامامن اعطیٰ و اتقیٰ و صدق بالحسنیٰ فسنیسرہ للیسریٰ

تو جس نے دیا اور ڈرا اور تصدیق کی اس نے الحسنیٰ کی یعنی اچھی باتوں کی تو قریب ہے کہ ہم آسان کریں اس پر سہولت کی زندگی کو۔

جس کا مطلب بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ "الیسریٰ" یعنی آسانیوں اور سہولتوں والی زندگی کی راہ ان ہی لوگوں کے لئے آسان کی جاتی ہے، جو دیتے ہیں، دینے کا مقصد یہی ہے کہ جو ذمہ داریاں ان کے مال پر عائد کی گئی ہیں، ان ذمہ داریوں کو پوری کرتے ہیں، آگے و اتقیٰ و صدق بالحسنیٰ (یعنی ڈرا اور اچھی باتوں کی تصدیق کی) یہ ان اسباب کی تشریح ہے جو ذمہ داریوں کے ادا کرنے پر آدمی کو آمادہ کرتے ہیں، یعنی خدا سے جو ڈرتا ہے اور اچھی باتیں جنھیں خدا پسند کرتا ہے، انھیں وہ مانتا ہے، ظاہر ہے خدا کی ذمہ داریوں کا خیال ایسے آدمی کو نہ ہوگا تو کیسے ہوگا؟"

بہرحال قرآن سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ الیسریٰ (آسان زندگی) کے حاصل کرنے کی راہ یہ ہے کہ خدا کے خوف سے خدا کی مرضی کے مطابق حق داروں تک ان کے حقوق پہنچائے جائیں، رہی یہ بات کہ ایسا ہوتا ہے بھی یا نہیں، یعنی ایسوں پر ان کی زندگی آسان ہوتی ہے یا نہیں، سو جیسا کہ میں نے عرض کیا یہ بالکل ایک تجربہ کی بات ہے اور جہاں تک میرے غور و فکر کا تعلق ہے اس باب میں اس سے زیادہ شاید دوسرا کچھ بھی نہیں کہہ سکتا۔ بخلاف ان لوگوں کے جو اس راہ سے ہٹ کر زندگی بسر کرتے ہیں یعنی وہی بات کہ اس معاملہ میں خدا اور اس کی عائد کردہ ذمہ داریوں کو یاد کرنا نہیں چاہتے جن کے

ذکر سے اعراض کرتے ہوئے، مثلاً اس اصول کو اختیار کرتے ہیں، جس کا ذکر امی الیسریٰ والی آیت کے بعد ان الفاظ میں کیا گیا ہے،

وَاَمَّا مَنْ بَخِلَ وَاسْتَغْنٰی وَ كَذَّبَ بِالْحُسْنٰی ۔	اور جو بخیل بنا اور بے نیاز بنا اور اچھی باتوں کو جس نے جھٹلایا،

یعنی جو لوگ بجائے اعطاء (داد و دہش) کے بخل کا رویہ اختیار کرتے ہیں، کیوں اختیار کرتے ہیں؟ اسی کی طرف جہاں تک میں سمجھتا ہوں آگے کے الفاظ میں اشارہ کیا گیا ہے، یعنی مال و دولت روپیہ پیسے میں ان کو یہ خاصیت محسوس ہوتی ہے کہ دوسروں سے آدمی کو یہ بے نیاز کر دیتے ہیں اور بظاہر روپے میں کچھ یہ خصوصیت نظر بھی آتی ہے، ایک غریب آدمی آج کی ضرورتوں کی پوری ہو جانے کے بعد پریشان رہتا ہے کہ کل کیا ہوگا۔ اپنی ضرورتوں کے لئے کس کس کے پاس جانا پڑے گا۔ کس کس سے کہنا ہوگا، لیکن اسی کے مقابلہ میں جس کا سرمایہ فرض کیجئے کہ کسی بنک میں جمع ہے۔ وہ ہر حال میں بے غم رہتا ہے۔ ہر ضرورت جو پیش آسکتی ہے، اس کے متعلق مطمئن رہتا ہے کہ قاضی الحاجات ہمارے پاس موجود ہے جس کھانے کی خواہش دل میں پیدا ہوگی اسے کھا سکتا ہوں، جس لباس کے پہننے کو جی چاہے گا، بنوا سکتا ہوں، جہاں جانے کی ضرورت ہوگی، جا سکتا ہوں، حتیٰ کہ جس ڈاکٹر کو چاہوں گا بیمار پڑنے کی صورت میں بلا سکتا ہوں، جس دوا کی طبیب ضرورت ظاہر کرے گا منگوا سکتا ہوں، روپے کے متعلق "استغنا" یا "غنا بخشی" کا یہی نظریہ ہے جو ارباب بخل پر مسلط ہوتا ہے اور جیسا کہ میں نے کہا بظاہر یہ ایک عقل کی بات بھی معلوم ہوتی ہے، روپے کے متعلق یہی احساس ایسوں کو اپنے سوا ہر دوسرے سے بے نیاز بناتا چلا جاتا ہے، نہ صرف انسانوں سے ہی، بلکہ بتدریج ایک کیفیت قلب میں ان کے پیدا ہوتی ہے۔ ایسی کیفیت جس کا انھیں ممکن ہے شعور بھی نہ ہو، لیکن یہ واقعہ ہے کہ روپے کی استغنائیت ان کو خدا سے بھی بالآخر بے تعلق بنا کر رہتی ہے اور ہے بھی یہی بات کہ خدا کی ضرورت تو اسی بیچارے کو ہوتی ہے جو اپنے آپ کو بے سہارا پاتا ہو، اور سرمایہ دار خواہ واقعہ میں کتنا ہی بے سہارا ہو، لیکن روپے کا ایک نشہ ہوتا ہے۔ جو بے سہارا ہونے کے احساس کو اس کے اندر پیدا ہونے نہیں دیتا، اور یہ تو خیر اس کے نفس کی ایک باطنی کیفیت ہوتی ہے، لیکن دوسرا جملہ وکذب بالحسنیٰ (جھٹلاتا ہے وہ اچھی باتوں کو) یہی چیز اس باطنی کیفیت کے راز کو فاش کرتی رہتی ہے، یہ روزمرہ کا مشاہدہ ہے کہ الحسنیٰ (یعنی ہر ایسی بات جو اچھی سمجھی جاتی ہے) قدرتاً بخل زدہ انسان انھیں جھٹلاتا ہے، اس کے دل سے انسانیت کی ہمدردی نکل جاتی ہے، صلۂ رحمی، غربا پروری، حسن سلوک الغرض تمام اخلاقی خوبیاں، کردار کی بلندیاں، اس کی نگاہوں میں حماقت اور نادانی بن جاتی ہیں، آخر ان باتوں کی پرواہ کیوں کرے؟ آدمی ان چیزوں کی پابندی یا خدا کے ڈر سے کرتا ہے یا مخلوق خدا کے خیال سے، لیکن جس پر اپنے سوا ہر دوسرے سے بے نیازی واستغنا کا احساس مسلط ہو، وہ کسی کا خیال ہی کیوں کرنے لگا، اپنی تمام بے مروتیوں، بداخلاقیوں کے متعلق دل میں وہ ایک ہی جواب کہتا ہے کہ

کوئی میرا کیا کرلے گا؟ اس "تکذیب بالحسنیٰ" کے ردِ عمل میں اگرچہ اسے ہر قسم کی رسوائیوں سے دو چار ہونا پڑتا ہے، عمومیت اس سے بے نیاز رہتی ہے، محفلوں میں مجلسوں میں لوگ اس کی دنائتوں، خباثتوں کا تذکرہ کرتے ہیں، بلکہ سچ تو یہ ہے کہ بنی آدم کے عام قلوب میں اس قسم کے لوگوں کے متعلق جو ایک قسم کی عداوت پائی جاتی ہے اور خلق اللہ کی ساری لعنتوں اور ملامتوں کی تہہ میں عداوت کا یہی مخفی جذبہ پوشیدہ ہوتا ہے، تو کون کہہ سکتا ہے کہ اسی عداوت کا یہ پرتو نہیں ہوتا جس کے متعلق بعض حدیثوں میں آیا ہے کہ "بخیل خدا کا دشمن ہے" مگر باوجود ان تمام باتوں کے اس کے قلب کا استغنائ اس کے آگے کوئی میرا کیا کرلے گا، اسی جواب کو دہراتا رہتا ہے، اور ہے بھی یہی بات کہ بیچارے عوام اس کا کیا کرسکتے ہیں؟ لیکن کیسی عجیب بات ہے جو اس کے بعد اسی آیت کے آخر میں ہے، یعنی حق تعالیٰ فرماتے ہیں

فسنیسرہ للعسریٰ۔ پس قریب ہے کہ ہم آسان بنادیں گے

اس کے لئے "العسریٰ" کو یعنی دشواریوں اور سختیوں سے بھری ہوئی زندگی کو۔

معلوم نہیں قرآن کے ان الفاظ کا مطلب دوسرے کیا سمجھتے ہیں، لیکن مجھ پر تو یہی کھولا گیا ہے، یعنی عوام ظاہر ہے کہ ایسوں کا کچھ بگاڑ نہیں سکتے، لیکن جس نے اسے یہ دولت دی ہے، کیا اس کے پنجۂ اقتدار سے بھی وہ نکل جاتا ہے، میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ خدا چاہے تو اس دولت کو اس سے چھین لے یا دولت ہی کیا، وہ تو قادر ہے کہ زندگی اور زندگی کے جن احساسات پر یہ بولیاں وہ بولتا رہتا ہے اسی زندگی سے جب چاہے اسے محروم کردے، یہ تو خیر عام بات ہے، اور رات دن یہ ہوتا ہی رہتا ہے مذکورہ بالا قرآنی الفاظ میں جس واقعہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ وہ اس سے الگ بات ہے۔ یعنی سب کچھ کو اس کے قبضۂ اقتدار میں دیتے ہوئے، اقدرت کی یہ عجیب مخفی تدبیر ہے کہ جس دولت و ثروت روپے پیسے کو آدمی زندگی کی سہولتوں کے لئے حاصل کرتا ہے، اور غالباً بخل زدہ آدمی بھی مال اندوزی کی راہ میں ابتداءً جب قدم رکھتا ہے تو اسی عام خیال کے زیر اثر ہی رکھتا ہے۔ لیکن قدرت کی قہاریت کا یہ کیسا عجیب نظارہ ہے کہ جب روپے پیسے پر اسے اقتدار حاصل ہوجاتا ہے، تو بجائے "الیسریٰ" (آسان زندگی) کے العسریٰ (سخت دشواریوں سے بھری زندگی) اس پر آسان کردی جاتی ہے، وہ سب کچھ کھا سکتا ہے۔ لیکن کچھ کھا نہیں سکتا۔ سب کچھ پہن سکتا ہے، لیکن کچھ پہن نہیں سکتا، الغرض اپنے اپنے دائرے کے اعتبار سے آرام و عیش کی جن جن صورتوں کو وہ مہیا کرسکتا ہے، دیکھا جاتا ہے کہ ہر ایک سے وہ محروم کردیا گیا ہے، اتنا محروم کہ غربت، انتہائی غربت کی زندگی رکھنے والوں کو بھی جو سہولتیں میسر آتی ہیں عموماً بخل کے ان روگیوں کو وہ بھی نصیب نہیں ہوتیں، سچ پوچھئے تو ایسوں کو دیکھ کر بے ساختہ

ایں طرفہ تماشا بیں لب تشنہ بآب اندر

کا مصرعہ زبان پر جاری ہوجاتا ہے، گویا بہتی ہوئی خنک ریز موجوں کے نیچے حالانکہ اسے بٹھایا جاتا ہے، موجوں پر موجیں گذرتی رہتی ہیں، اسی پر سے گذرتی رہتی ہیں، لیکن اس کور بخت کور نصیب کی

تشنہ لبی اور محرومی اپنے حال پر باقی رہتی ہے، بہرحال حق تعالیٰ کی ذمہ داریوں سے انحراف واعراض کرکے بُخل کی راہ جو اختیار کرتے ہیں، ان کے متعلق قرآنی آیت

فسنیسرہ للعسریٰ۔ | پس قریب ہے کہ ہم آسان بنا دیں گے

اس کے لئے العسریٰ کو (یعنی دشواریوں اور سختیوں سے بھری ہوئی زندگی کو)

کا مشاہدہ ایک ایسا تفسیری مشاہدہ ہے جس کی زندہ مثالیں دُنیا کی آبادیوں میں جہاں ڈھونڈیے آپ کو مل سکتی ہیں، ہر قسم کی سہولتوں پر قابو یافتہ ہونے کے باوجود آپ دیکھیں گے کہ زندگی کی دشوار ترین شکلوں کو اپنے آپ پر اس قسم کا آدمی کتنا آسان بنائے ہوئے ہیں، اور جیسے ان مثالوں کی کمی نہیں ہے، قرآنی الفاظ

کذب بالحسنیٰ۔ | جھٹلاتا ہے وہ "الحسنیٰ" کو (یعنی جو باتیں اچھی سمجھی جاتی ہیں)

کے لئے بھی بجائے کتابوں کے کسی بُخل زدہ فطرت کی زندگی کا مطالعہ ہی کافی ہو سکتا ہے، اس سلسلہ میں جن واقعات کا تجربہ آئے دن ہوتا رہتا ہے۔ میرے نزدیک تو قرآن فہمی کے لئے وہی بس کرتے ہیں، کسی کو زیادہ شوق ہو تو جاحظ کی مشہور "کتاب البخلا" کے مطالعہ سے اپنے شوق کو وہ پورا کر سکتے ہیں۔

لیکن جیسا کہ میں نے عرض کیا "الحسنیٰ" کی تکذیب کے متعلق تو کوئی میرا کیا کرے گا؟ یہ جواب بھی وہ رکھتا ہے۔ اس تکذیب کے ردِ عمل کا ظہور جن شکلوں میں ہوتا ہے، ان کے متعلق بھی یہ سمجھ کر کہ حاسدوں کو بکنے دو، وہ میرا بگاڑ ہی کیا سکتے ہیں، شائد اپنے دل کو مطمئن کر لیتا ہو، اگرچہ سچ تو یہ ہے کہ معیشت کی تنگی وضیق کے لئے اس کی یہی رسوائیاں کافی ہو سکتی ہیں، اور میں نہیں جانتا کہ انسانی احساسات رکھتے ہوئے یہ کیسے باور کیا جا سکتا ہے کہ خلق اللہ کی لعنتوں اور ملامتوں کی چوٹ اس کے دل پر نہیں پڑتی مال کا ایک بڑا مصرف جیسا کہ حضرت حسین علیہ السلام سے مروی ہے، عزت اور آبرو ہی کا بچانا ہے لیکن قدرت کا یہ بھی انتقام ہی ہے کہ اسی مال سے رسوائیوں اور بے عزتیوں کے خریدنے پر وہ مجبور کیا جاتا ہے، تاہم جو اذیت اپنی بے عزتی بے آبروئی سے آدمی کی ہوتی ہے۔ چوں کہ قلب کی یہ ایک مخفی کیفیت ہے جس پر گذرتی ہے وہی اس کا صحیح اندازہ کر سکتا ہے، دوسروں کے مشاہدہ کی یہ چیز نہیں؛

مگر دوسری سزا یعنی "العسریٰ" کی "تیسیر" یعنی دشوار اور کٹھن زندگی جو اس پر آسان کر دی جاتی ہے اور سزا کے اس سلسلہ میں بآب اندررہ کر جس "تشنہ لبی" کا تماشا یہ طبقہ دکھاتا چلا آ رہا ہے، یہ تو کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے، سہولتوں اور آسانیوں کے لئے جو چیز حاصل کی جاتی ہے، مغالطوں میں مبتلا ہو کر اسی کو اپنی دشواریوں اور سختیوں کا وہ ذریعہ بنا لیتا ہے اور یہ ہے،

من اعرض عن ذکری فان لہ | جو کترایا میری یاد سے تو قطعاً ہے اس کے
معیشۃ ضنکا۔ | لئے زندگی ضیق اور تنگی سے بھری ہوئی۔

کی مشاہداتی بیّن اور کھلی ہوئی تفسیر، مرنے سے پہلے جسے ان لوگوں کو دیکھنی پڑتی ہے جو خُدا اور اس کی

ذمہ داریوں کے یاد کرنے سے گریز کرتے ہیں۔

باقی مغالطوں میں مبتلا ہونے کا جو ذکر میں نے کیا، اس سے میرا مطلب یہ ہے کہ یہ سارے پاپڑ جو اس مسکین کو بیلنے پڑتے ہیں، جیسا کہ قرآن ہی میں اشارہ کیا گیا ہے، اس کی بنیاد وہی "استغنی" کا راز ہے، یعنی دوسروں سے بے نیاز بنانے کی جو صلاحیت دولت میں نظر آتی ہے۔ یہی بات کراتی ہے، ان لوگوں سے جو کچھ کراتی ہے، لیکن کیا واقعہ بھی یہی ہے، اب میں لوگوں سے کیا کہوں، صبح و شام ہر شہر ہر بستی و آبادی میں

ما اغنیٰ عنہ مالہ وما کسب — نہ کام آیا اسے مال ہی اس کا اور نہ وہ جو کچھ کمایا اس نے۔

کی قرآنی آیت کا تجربہ لوگوں کو کرایا جا رہا ہو، صرف اسی وقت نہیں، جیسے کہ قرآن ہی میں اسی سورۂ "واللیل" کے اندر ارشاد فرمایا گیا ہے۔

ما یغنی عنہ مالہ اذا تردیٰ — نہیں کام آتا ہے مال اس کا جب برباد ہوتا ہے وہ۔

خواہ یہ تباہی اور بربادی مال کی بربادی کی شکل میں ظاہر ہو یا خود صاحب مال کی کہ یہ تو خیر ایک کھلی ہوئی بات ہے، بکثرت قرآن ہی میں آپ کو اس مضمون کی آیتیں ملتی چلی جائیں گی۔

افلم یسیروا فی الارض فینظروا کیف کان عاقبۃ الذین من قبلھم کانوا اکثر منھم واشد قوۃ واثارا فی الارض فما اغنی عنھم ما کانوا یکسبون۔ — کیا وہ چلتے پھرتے نہیں زمین میں، پھر دیکھتے وہ کہ کیا حال ہوا ان کا جو ان سے پہلے تھے، ان سے قوت میں بھی، اور زمین پر آثار (عمارتیں اور دوسرے آثار کہ چھوڑنے میں) یہ گذرے ہوئے لوگ زیادہ بھی تھے اور شدید بھی تھے۔ پر نہ کام دے سکا ان کو وہ سب کچھ جو کمایا تھا انھوں نے۔

دولت و امارت، سلطنت و حکومت، شوکت و قوت کی غنا بخشیوں کے مغالطہ کا ازالہ ہر تھوڑے تھوڑے دن پر قدرت صحیفۂ عالم پر کرتی رہتی ہے، آج ہی دُنیا میں عددی کثرتوں اور حربی و جنگی قوتوں، حیرت انگیز اختراعی و ابتداعی ایجادوں سے استغنا حاصل کرنے والی قوموں پر جو گذر رہی ہے، وہ سب کے سامنے ہے، انھوں نے زمین کو الٹا پلٹا، اور کیا کیا چیزیں نہیں نکالیں، شورہ نکالا، گندھک نکالا، زغال کے معدنوں کا پتہ چلایا، پٹرول کے خزانوں کا سراغ لگایا اور زمین کی ان ہی ودیعتوں سے کیا کیا کام نہیں نکالے، لیکن

فما اغنی عنھم ما کانوا یکسبون۔ — نہ کام دے سکا ان کو وہ سب کچھ جو کمایا تھا انھوں نے۔

کا ترجمہ ان میں کتنے کر چکے اور جو باقی ہیں انھیں آج نہیں تو کل بہر حال اس کا ترجمہ کرنا ہی پڑے گا، یہاں بھی کرنا پڑے گا، اور وہاں بھی جہاں کہنے والوں سے کہلایا جائے گا۔

ما اغنی عنہ مالیہ ھلک — نہ کام آیا (آج) مجھے میرا مال تباہ ہوگیا
عنی سلطانیہ۔ — میرا سارا غلبہ (اقتدار)

لیکن یہ تو بڑے پیمانوں کی باتیں ہیں، زیادہ تر ان آیتوں کا تعلق اقوام وامم سے ہے، میں تو اشخاص وافراد تک کے متعلق دیکھ رہا ہوں کہ صاحب مال زندہ بھی ہیں، مال ان ہی کا ہے، دوسروں کی نگاہوں میں وہ خوش حال بھی ہیں، سب کچھ ہے لیکن باوجود اس کے

ما اغنی عنہ مالہ وما کسب — نہ کام دے سکا اس کو مال اس کا اور جو کچھ کمایا تھا وہ۔

کی تفسیر بھی کر رہے ہیں، اس راہ کے خوردکوں، اور مردکوں کو تو چھوڑیئے، میں آپ کے سامنے بیسویں صدی کے سب سے بڑے انفرادی دولت مند کو پیش کرتا ہوں جو کسی خاص صوبہ یا ملک نہیں، بلکہ ہفت اقلیم کے امیروں میں کبھی سب سے بڑا امیر گنا گیا، اسی کی شہادت اسی کی زبانی سن لیجئے

"میرے پاس اتنی دولت ہے کہ میں اس کا حساب بھی نہیں کر سکتا، کہا جاتا ہے کہ میری جائداد ۵ کروڑ پونڈ (۷۵ کروڑ روپے) سے زائد کی ہے۔"

دیکھا آپ نے! پچھتر کروڑ روپے سے زائد کی دولت موجود ہے، اس پر اقتدار کلی حاصل ہے، ابھی وہ مرا بھی نہیں ہے، زندہ ہے، لیکن غم بخشیوں کی ضمانت العیاذ باللہ جس قاضی الحاجات کے اندر پوشیدہ سمجھی جاتی ہے، اسی کے متعلق اعلان کرتا ہے،

"میں ساری جائداد کو دے ڈالنے کو بخوشی تیار ہوں، اگر ایک وقت بھی پیٹ بھر کھانا کھا سکوں۔"

مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی اپنے اخبار سچ مورخہ ۱۷ جنوری ۱۹۲۷ء میں ملک البترول (یعنی گھاس لیٹ کے بادشاہ) مسٹر راک فیلر آنجہانی کی اس ذاتی شہادت کو نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں؛

"اُس کی (راک فیلر جو زندہ تھا) عمر ۸۵ سال کی ہو چکی ہے، ابتدا ہی سے سوء ہضمی کی اس کو بیماری ہے، حال یہ ہے کہ بجز دودھ اور بسکٹوں کے ایک قلیل مقدار کے وہ دن بھر کچھ کھا نہیں سکتا۔"

مولانا عبدالماجد نے کسی انگریزی دستیقہ سے یہ خبر نقل کی ہے، اور سچ تو یہ ہے کہ بیچارا راک فیلر اس میدان کا تنہا آدمی نہیں ہے، جو اس خبر کی تحقیق و تلاش میں خواہ مخواہ وقت ضائع کیا جائے دولت کے اعتبار سے آپ کو راک فیلر جیسے سرمایہ دار ممکن ہے کہ دنیا میں نہ ملیں لیکن ابتدا سے سوء ہضمی کی شکایت پیٹ بھر کھانا کھانے کی "نہ پوری ہونے والی تمناؤں" میں تو اس راہ کے اتنی پچاسی (؟) صدی راہ رو آپ کو ہر گلی کوچے میں مل سکتے ہیں، جناب راک فیلر آنجہانی کے دوسرے

ہم چشم ہم قدم جو ابھی اس جہانی ہیں، میری مراد ہنری فورڈ صاحب شاہ موٹر ان سے ہے۔ اسی اخبار "سچ" میں ان کے متعلق بھی یہ خبر شائع ہوئی تھی۔

"وہ (ہنری فورڈ) ایک نحیف الجثہ لاغر اندام دائم المرض بزرگ ہیں، جن بیچارے نے اپنی زندگی کی خاطر سالہا سال سے اپنے اوپر ہر قسم کی لذیذ اور پُر تکلف غذاؤں کو حرام کر رکھا ہے، ڈاکٹروں کی ایک جماعت ہر وقت ان کی نگرانی کرتی رہتی ہے کہ کسی وقت کھانے میں بدپرہیزی نہ کر بیٹھیں۔"

اور یہ واقعہ تو چند ہی دن ہوئے دُنیا کے اخباروں میں چھپا تھا کہ یہی ہنری فورڈ صاحب جنھیں عربی اخباروں اور رسالوں میں "اغنی اغنیاء العالم" یعنی "سارے عالم کے امیروں کا سب سے بڑا امیر" کے خطاب سے ہمیشہ یاد کرتے ہیں۔ ان کے اکلوتے نورِ نظر پر بیماری کا حملہ ہوا سب کچھ کیا گیا جو ہنری فورڈ جیسے باپ سے اپنے اکلوتے بیٹے کے لئے ممکن ہو سکتا تھا۔ لیکن دولت کے متعلق "غنا بخشی" کا انسانی نظریہ غلط ثابت ہوا، اور خُدا کی بات

وَمَا یُغْنِی عَنْهُ مَالُهُ إِذَا تَرَدّٰی۔ اور نہیں کام دیتا ہے مال اُس کا جب گرتا ہے وہ۔

پوری ہوئی۔ لیکن قدرت کی مجازاتی کارفرمائیاں کیا اسی حد پر ختم ہو جاتی ہیں؟ بالفاظِ دیگر اعراضی زندگی کو "معیشتِ ضنک" یعنی تلخیوں اور تنگیوں سے ایسوں کی معیشت جو بھری جاتی ہے۔ اس کے تلخ بنانے کی کیا صرف ایک یہی صورت ہے؟ قرآن کی ایک پوری سورۃ جس کا سورۂ ھمزہ نام ہے۔ عم یتساءلون ہی کے پارے کی مشہور سورۃ ہے۔ اس میں بھی صرف ایک اس معاشی مسئلہ کے ایک خاص پہلو کو بیان کیا گیا ہے۔ بہرحال پہلے پوری سورۃ کو ترجمہ کے ساتھ لکھ دیتا ہوں۔

وَیْلٌ لِّکُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةِ ۙ الَّذِیْ جَمَعَ	تُف ہے ہر چشمک مارنے والے عیب چینی
مَالًا وَّعَدَّدَهٗ یَحْسَبُ اَنَّ	کرنے والے کے لئے جو جمع کرتا ہے مال کو
مَالَهٗۤ اَخْلَدَهٗ کَلَّا لَیُنْۢبَذَنَّ	اور گنتا رہتا ہے اس کو خیال کرتا ہے کہ
فِی الْحُطَمَةِ وَمَاۤ اَدْرٰىكَ	دوام بخشتا ہے مال اس کا، ہرگز نہیں،
مَا الْحُطَمَةُ نَارُ اللّٰهِ الْمُوْقَدَةُ	وہ جھونک دیا جاتا ہے الحطمہ میں اور کس نے
الَّتِیْ تَطَّلِعُ عَلَى الْاَفْـِٕدَةِ اِنَّهَا	تجھے بتایا کہ الحطمہ کیا چیز ہے، آگ ہے اللہ کی
عَلَیْهِمْ مُّؤْصَدَةٌ فِیْ عَمَدٍ مُّمَدَّدَةٍ	سلگائی ہوئی، چڑھ جاتی ہے دلوں پر

اس آگ کے پٹ بند ہیں لمبے لمبے کھمبوں میں۔

میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ جیسے والیل میں مال اور سرمایہ کے متعلق "نظریۂ غنا بخشی" اور جن آثار و نتائج تک یہ نظریہ آدمی کو پہنچاتا ہے، بیان کیا گیا تھا، اسی طرح مذکورہ بالا سورۃ یعنی سورۂ ہمزہ میں

اسی مال اور سرمایہ کی بابت ایک دوسرا عام خیال جو پایا جاتا ہے، اسی کی تعبیر

يحسب ان ماله اخلده　　　خیال کرتا ہے کہ دوام بخشتا ہے اس کو مال اس کا۔

کے الفاظ میں کی گئی ہے۔ یعنی یہ جو سمجھا جاتا ہے کہ زندگی کی راحتوں اور سہولتوں کو دیرپا بنانے کی یا قرآنی اصطلاح کی رو سے "خلود بخشی" کی کیفیت مال میں پائی جاتی ہے اور اسی بنیاد پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ مال اور سرمایہ کا ذخیرہ جتنا زیادہ بڑھایا جائے گا، راحتوں اور سہولتوں کی دیرپائی اور خلود کی ضمانت بھی اسی نسبت سے بڑھتی جاتی ہے۔ مثلاً دو سو روپے ماہوار کے خرچ سے زندگی کا جو معیار قائم ہوتا ہے، اس معیار کو وہی برقرار رکھ سکتا ہے جو اس آمدنی کو قائم رکھے، اور اس معیار کو جو بلند کرنا چاہتا ہے، چاہیئے کہ اپنی آمدنی کو بھی بڑھائے۔

مال کے متعلق "خلود بخشی" کا یہی نظریہ ہے جو صرف "جمع" مال کے سمیٹنے ہی پر نہیں۔ بلکہ ان گوناگوں پیچیدہ تدبیروں اور ترکیبوں پر آدمی کو آمادہ کرتا ہے، قرآن میں جس کی طرف "عدّده" کے لفظ سے اشارہ کیا گیا ہے۔ بظاہر یہ ایک لفظ معلوم ہوتا ہے، لیکن جہاں تک میرا خیال ہے، یہی ایک لفظ ان تمام حسابی چکروں کو حاوی ہے، جن کی عامیانہ تعبیر "ننانوے کے پھیر" سے کی جاتی ہے؛ بلکہ اگر وسعتِ نظری سے کام لیا جائے تو اکاؤنٹ اور فینانس وغیرہ کے پُرشوکت الفاظ سے موجودہ زمانے میں مالی کاروبار کے جن شعبوں کو موسوم کیا جاتا ہے ان پر بھی "عدّدہ" کے قرآنی لفظ کو ہم منطبق کر سکتے ہیں۔

آگے قرآن میں "کلّا" کا لفظ ہے، جو ایک تردیدی کلمہ ہے، جس کا اردو ترجمہ "ہرگز نہیں" کیا گیا ہے۔ اس کا صاف مطلب یہی ہے کہ "جمع وعدّ" کی یہ ہنگامہ آرائیاں، خلود اور دیرپائی کے جس مقصد کے لئے لوگ برپا کئے ہوئے ہیں، اور خیال کرتے ہیں کہ سرمایہ کے متعلق "جمع و عدّ" کی یہ یہ تدبیریں خلودی نصب العین کے حاصل کرنے میں انھیں کامیاب بنائیں گی، قطعاً غلط ہے، اس کے بعد جو یہ الفاظ ہیں

لينبذن في الحطمة وما ادرىك ما الحطمة نار الله الموقدة التي تطلع على الافئدة انها عليهم موصدة في عمد ممددة۔

قطعاً جھونک دیا جاتا ہے وہ "الحطمہ" میں اور کس نے بتایا تجھے کہ الحطمہ کیا چیز ہے، آگ ہے اللہ کی سلگائی ہوئی جو چڑھ جاتی ہے دلوں پر، اس آگ کے پٹ بند ہیں ان لوگوں پر لمبے لمبے کھمبوں میں۔

لفظی ترجمہ تو قرآنی الفاظ کے سامنے لکھ دیا گیا ہے۔ لیکن مطلب اس کا کیا ہے؟ موجودہ زندگی کے بعد جو دوسری زندگی آنے والی ہے۔ کیا ان کیفیات و حالات سے اس زندگی میں ان لوگوں کو دوچار ہونا پڑے گا یا آئندہ زندگی کے سوا موجودہ زندگی میں بھی ہم ان کیفیتوں کو ان لوگوں کے اندر پا سکتے ہیں

جن کی طرف "جمع وعدد" کے ان آثار اور نتائج کو منسوب کیا گیا ہے، سورۃ کے ابتدائی الفاظ

ویل لکل ھمزۃ لمزۃ۔ — تف ہے ہر چشمک زنی کرنے والے عیب چینی کرنے والے کے لئے۔

کو پہلے سمجھ لینا چاہئیے، ممکن ہے کہ اسی سے اس سوال کا جواب بھی نکل آئے۔

ہمزہ کا مادہ ہمز ہے اور لمزہ کا مادہ لمز ہے۔ ہمز کے معنی کچوکے لگانے کے ہیں۔ مہمیز کا لفظ اردو میں بھی اسی ہمز سے بنا ہے۔ سوار اپنے جوتوں میں نوک دار کیل جیسی چیز اس لئے لگاتے ہیں کہ گھوڑے کو ایڑ لگانے کی ضرورت جب ہوتی ہے تو کچوکے لگانے کا کام اسی کیل سے لیتے ہیں، قریب قریب لمز کا مفہوم بھی یہی ہے، منجملہ اور معانی کے منتہی الارب میں زدن و سوختن یعنی مارنا اور جلانا بھی لمز کا ترجمہ کیا گیا ہے، یہ تو ان الفاظ کے ابتدائی معانی تھے، بعد کو یہ محاورہ ہو گیا کہ جن کے اقوال و افعال سے دل مجروح و زخمی ہوتے ہوں، اور اپنی گفتار و رفتار سے لوگوں کو جو جلاتے ہوں، ان ہی کو ہمزہ لمزہ کے نام سے موسوم کرنے لگے، اسی لئے عام مفسرین نے چشمک زنی کرنے والے، فقرے کسنے والوں کے ساتھ تمسخر اور استہزاء کرنے والے نقل بنانے والے غیبت کرنے والے وغیرہ الفاظ میں ہمزہ لمزہ کی تشریح کی ہے، اب غور کرنے کی بات یہی ہے کہ مال کے متعلق "جمع وعدد" کے گورکھ دھندوں میں جو لوگ شب و روز منہمک و مشغول رہتے ہیں، ان کا ہمز و لمز کے ان صفات سے کیا تعلق ہے؟

بات یہ ہے کہ "خلود بخشی" اور "دیر پائی" کی ضمانت مال اور سرمایہ میں محسوس کر کے "جمع وعدد" کی اس مہم میں جیسا کہ عرض کر چکا ہوں، کرنے والوں کو یوں تو بہت کچھ کرنا پڑتا ہے، لیکن حاصل سب کا یہی ہوتا ہے، کہ جو آچکا ہے، اس سرمایہ کے ایک ایک پیسہ کی نگرانی کی جائے، اور جو ابھی نہیں آیا ہے اس کے آنے کے ممکنہ ذرائع کو کسی طرح ضائع ہونے نہ دیا جائے۔ اب اسی کے ساتھ اکبر مرحوم کی اس حقیقت طرازی کو بھی سامنے رکھ لیجئے جو انھوں نے فرمایا ہے۔

یہ بات ہے صاف مجھ سے سُن لے — کتاب میں اس کو کیا پڑھے گا
حدود فطرت کے ہیں مقرر — جو یہ گھٹے گا تو وہ بڑھے گا

اور یہی بات اس سرمایہ پر بھی صادق آتی ہے جو زندگی گذارنے کے لئے دنیا میں آدمی کو دیا گیا ہے مطلب یہ ہے کہ بہرحال جو لوگ "جمع وعدد" کا عمل شروع کرتے ہیں تو لازماً ان کے سامنے دو ہی صورتیں پیش آتی ہیں، اگر اپنے سرمایہ کے بڑھانے میں کامیاب ہوئے تو قدرتاً دوسروں کا سرمایہ گھٹ جائے گا۔ اور اگر ناکام ہوئے تو اس کا مطلب یہی ہوگا دوسروں کا سرمایہ بڑھ گیا اور ان کا گھٹ گیا، جہاں تک میں خیال کرتا ہوں "جمع وعدد" کی مہم کا یہی وہ نقطہ ہے جو مقابلہ کے اس میدان میں آدمی کو بہرحال گھسیٹ کر لے ہی آتا ہے جس کی طرف قرآن ہی دوسری جگہ

الھٰکم التکاثر حتیٰ زرتم — غفلت میں ڈال دیا تم کو تکاثر نے (یعنی
المقابر۔ — دولت کے بڑھانے میں باہمی مقابلے نے)
حتیٰ کہ زیارت کی تم نے قبروں کی۔

کے الفاظ میں اشارہ کیا گیا ہے "التکاثر" کا مادہ کثرت ہے، یہی کثرت جب "تکاثر" کی شکل اختیار کر لیتی ہے تو کثرت طلبی میں مقابلہ اور COMPETITION کا مفہوم اس سے سمجھا جاتا ہے، یہ التکاثر کا خبط ایک ایسا خبط ہے کہ وہی آدمی جو صرف زندگی کی حقیقی ضرورتوں کی تکمیل کے ارادے سے معاشی جدوجہد کی راہوں میں ابتداءً قدم رکھتا ہے، اگر کہیں ننانوے کے پھیر میں پڑ کر "التکاثر" کے میدان مقابلہ میں کود جاتا ہے تو آئے دن یہ دیکھا جاتا ہے کہ ضرورت کا سوال ایسوں کے سامنے سے ہٹ گیا اور صرف "مقابلہ" کا بھوت سر پہ سوار ہو گیا، جیسے جیسے آگے بڑھنے کے مواقع مقابلہ کے اس میدان میں لوگوں کو ملتے چلے جاتے ہیں۔ اس مقابلہ کا دائرہ بھی بدلتا جاتا ہے، ابتداء میں کسی گاؤں کے باشندوں سے مقابلہ تھا، تو گاؤں سے آگے بڑھ کر اب کسی تعلقہ کے سرمایہ داروں کو اپنا ہم چشم بنایا جاتا ہے، یونہی تعلقہ سے آگے بڑھ کر ضلع، ضلع کے دائرے کو چھوڑ کر صوبہ، صوبہ سے نکل کر ملک، اور ملک کے دائرے کو بھی توڑ کر ساری دنیا میں چاہتا ہے کہ اسی کا گھوڑا اس راہ میں سب سے آگے نکل جائے، بلکہ ممکن ہے کہ بعضوں میں انسانیت کی ساری تاریخ میں بھی اپنے آپ کو نمایاں کرنے کا جذبہ "التکاثر" کی راہ میں مسلط ہو جائے الھاکم (غفلت میں ڈال دیا تم کو) کے الفاظ سے قرآن نے اس دماغی خبط کی طرف اشارہ کیا ہے، جس میں "التکاثر" کے بیمار مبتلا ہو جاتے ہیں، حالانکہ مسلسل مقابلہ کے اسی میدان میں آئے دن ان کو یہ دکھایا جاتا ہے کہ ان ہی کے ساتھ چلنے والوں میں کتنے ہیں جو گرتے جاتے ہیں، ٹپکتے جاتے ہیں، قبروں میں دھنستے چلے جاتے ہیں۔ لیکن "التکاثر" کے خبطیوں کے کان پر جوں بھی نہیں رینگتی، اور یہی مطلب ہے قرآن کے الفاظ

حتیٰ زرتم المقابر۔ حتیٰ کہ زیارت کر چکے تم قبروں کی۔

کا یعنی ایک دو قبروں ہی نہیں بلکہ "المقابر" جو "قبر" کی جمع ہی نہیں بلکہ منتہی الجموع یعنی جمع کی انتہائی شکل کا صیغہ ہے، ان "المقابر" کی زیارت بھی مقابلہ کے ان دیوانوں میں چونکہ پیدا نہیں کرتی، اور کبھی دوسروں کی قبروں کو دیکھ کر اپنے قبری انجام کا خیال ان کے سامنے آتا بھی ہے تو فوراً اپنی تسلی اور اس دماغی خبط کی تصحیح کے لئے اپنے سامنے اپنی آئندہ نسلوں کو یہ لے آتے ہیں، گویا توجیہ یہ کر لی جاتی ہے کہ مقابلہ کے میدان کے ان نتائج سے اگر مجھے تمتع اور استفادہ کا موقعہ قبر نہ دے سکے گی تو کیا ہوگا، میری آئندہ نسلیں تو اس سے مستفید ہوتی رہیں گی۔ یوں "المقابر" کی زیارت جس تنبیہ کو ان میں بیدار کر سکتی تھی، توجیہ کی اسی لوری کو سنا کر اسے بھی یہ سلا دیتے ہیں، اور ہر طرف سے بے خوف ہو کر "التکاثر" کے اس میدان میں اپنا نصب العین اسی مقصد کو بنا لیتے ہیں۔ قرآن میں دوسری جگہ جیسا کہ میں خیال کرتا ہوں ان الفاظ میں اسے بیان کیا گیا ہے، یعنی

وتاکلون التراث اکلا لما اور التراث کو تم کھا رہے ہو سمیٹ کر کھانے کی شکل میں۔

آیت کریمہ میں "التراث" کا لفظ "وراث" کی بدلی ہوئی شکل ہے، عربی زبان میں اس وزن اور اس

شکل کے الفاظ اشتراک کی کیفیت کو ظاہر کرتے ہیں، گویا پہلی نسلوں کے ساتھ پچھلی نسلیں جس سرمایہ میں شریک ہوں، ان ہی کو "التراث" کہتے ہیں۔ دوسرا جزا اسی آیت میں "اکل لم" کا ہے، اکل کے معنیٰ تو کھانے کے ہیں، رہا لم کا لفظ، تو عربی زبان میں "رجل ملم" اس شخص کو کہتے ہیں جو قوم کے بکھرے ہوئے افراد کو سمیٹ کر کسی نقطہ پر جمع کرنے والا ہو، منتہی الارب میں ہے "رجل لم" (جمع کنندہ قوم یا عشیرہ پراگندہ را) لغت کی اسی کتاب میں مذکورہ بالا آیت کا ترجمہ اسی بنیاد پر یہ کیا گیا ہے:

تاکلون التراث اکلا لما ای | تم کھاتے ہو التراث کو اکل لم کی شکل میں
نصیبکم ونصیب صاحبکم | یعنی اپنا حصہ بھی اور اپنے ساتھی کا حصہ

بھی کھا جاتے ہو۔

حاصل اس کا یہی ہوا کہ سرمایہ اور دولت سے استفادہ کی یہ شکل کہ پہلی نسلوں سے پچھلی نسلوں تک وہ بایں شکل منتقل ہوتی چلی جائے کہ دوسروں تک قطعاً اس سرمایہ کا کوئی حصہ نہ پہنچ سکے، بلکہ جو کچھ ہو دانہ دانہ، رتی رتی، سب ایک ہی خاندان خاص نسل اور خاص طبقہ ہی تک پوری طاقت کے ساتھ اس طور پر اس کو محدود رکھنے کی کوشش کی جائے کہ کسی غیر کے منہ میں اس کی کوئی کھیل بھی اڑ کر نہ پہنچ سکے گویا وہی بات جس کے انسداد کے لئے صلحی فتوحات کے مقبوضات اور آمدنیوں کے متعلق قرآن میں

لکیلا یکون دولۃ بین الاغنیاء | تاکہ نہ بن جائے ایسی دولت جو تمہارے
منکم۔ | سرمایہ داروں ہی کے درمیان گھومتی رہتی

کا قانون نافذ کیا گیا ہے، ٹھیک اسی کے توڑ پر یہ "اکل لم" سرمایہ داروں کا ایک خاص شیوہ ہے مسٹر ڈارلنگ نے امریکہ و یورپ کے موجودہ نظام سرمایہ داری کی تعریف کرتے ہوئے یہ الفاظ جو لکھے ہیں:

"یہ قبضہ میں رکھنے والوں اور تعاقب کرنے والوں کی محض اجتماعی صورتیں ہیں" (داستانِ دہقان ص ۳۳۸)

میں تو سمجھتا ہوں کہ قرآنی الفاظ "اکل لم" ہی کی گویا تفسیر ہے۔ اور اسی کے بعد وہ حالت اس راہ کے چلنے والوں کی ہو جاتی ہے جس کی طرف بخاری کی مشہور حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بایں الفاظ یعنی

کالذی یاکل ولا یشبع | اس شخص کی حالت جو کھاتا جاتا ہے

اور سیر نہیں ہوتا۔

میں ایما فرمایا ہے، بلکہ قرآن کا وہ تمثیلی بیان گویا ان ہی لوگوں کی ایک زندہ تصویر ہے۔ یعنی اس مثالی شخص کا ذکر کرتے ہوئے جو زمین کی مٹی پکڑ کر بیٹھ گیا تھا، یا قرآنی الفاظ میں

اخلد الی الارض واتبع ھواہ | ہمیشہ کے لئے گڑ گیا زمین میں اور پیچھے

چل پڑا اپنی خواہش کے۔

کی کیفیت جس پر مسلط ہو گئی تھی، اسی کے متعلق ارشاد ہے۔

فمثلہ کمثل الکلب ان تحمل علیہ یلھث او تترکہ یلھث۔ تو اس کی مثال اس کتے جیسی ہے کہ اگر اسے دھتکار و جب بھی ہانپنے لگے گا نہ دھتکار و جب بھی ہانپنے لگے گا۔

سرمایہ کے متعلق یہ خیال کہ زندگی کی ضروریات و حاجات کی تکمیل کا وہ ذریعہ ہے، یہ چیز تو اس کے سامنے سے ہٹ جاتی ہے۔ بلکہ بجائے اس کے "سرمایہ" اور "مال" بذاتِ خود اس کا مقصود و مطلوب بن جاتا ہے اسی لئے ہر حال میں "جمع و عد" کا یہ مریض ہانپتا ہی رہتا ہے، ملے جب بھی، نہ ملے جب بھی کتوں کی طرح زبان نکالے اپنے اوپر حرص کی ایک ایسی کیفیت طاری کئے رہتا ہے کہ گویا اسے اب تک کچھ ملا ہی نہیں ہے، "جمع کرتا جائے، گنتا چلا جائے" اس کا کام اب فقط یہی رہ جاتا ہے، قرآن ہی میں

وتحبون المال حبا جما اور چاہتے ہو مال کو "حب جم" کے ساتھ۔

جو فرمایا گیا ہے، اگرچہ میں اپنے خاص نقطۂ نظر کی بنیاد پر جس کا ذکر آئندہ آئے گا، بجائے مبسوط الرزق طبقات کے یہ زیادہ بہتر سمجھتا ہوں کہ اس آیت کا تعلق قدری رزق پانے والوں کے اس گروہ سے سمجھا جائے، جو رزق کے اس قدری پیمانے کو اپنی اہانت و ذلت کا سبب ٹھیرا لیتے ہیں، لیکن اس میں بھی کوئی حرج نہیں، اگر اس کو عام رکھا جائے۔ کیونکہ سرمایہ داروں کا یہ گروہ بھی یقیناً مال سے اسی قسم کا عشق مفرط پیدا کر لیتا ہے، یعنی ہر چیز سے ٹوٹ کر صرف مال ہی کی محبت میں غرق ہو جاتا ہے شب و روز وہ "جمع و عد" ہی کے ادھیڑ بن میں مبتلا رہتا ہے، اپنی ساری عقلی اور ذہنی قوتوں کی جولانیوں کی آماجگاہ "جمع و عد" کے مقابلہ کے اسی میدان کو قرار دے لیتا ہے، اسی میں رات دن وہ "التکاثر" والے مقابلہ میں مشغول و منہمک رہتا ہے، اور یہی چیز اس میں اس خیال کو پیدا کر دیتی ہے، کہ جو کچھ بھی اس کے پاس جمع ہو گیا ہے یہ اس کی عددی کرتبوں اور معاشی مہارتوں کا نتیجہ ہے، قرآن کے سب سے بڑے تاریخی سرمایہ دار (قارون) کے حوالہ سے یہ فقرہ جو منقول ہے، یعنی وہ کہتا تھا کہ

انما اوتیتہ علیٰ علم عندی اس کے سوا اور کوئی بات نہیں کہ مجھے یہ دولت جو دی گئی ہے، یہ میرے اس علم کا نتیجہ ہے جو میرے پاس ہے۔

وہ اسی خیال کی ترجمانی ہے، جس کا پیدا ہونا اس قسم کے لوگوں میں ان کے اعمال و افعال کا لازمی نتیجہ ہے، بلکہ اسی بنیاد پر ان کی زبانوں پر اس قسم کے فقرے جو جاری ہوتے ہیں

لن تبید ھذہ ابدا قطعاً اب (میرا قائم کیا ہوا یہ نظام کبھی) برباد نہیں ہو سکتا۔

یا اسی کے قریب قریب متعدد مقامات پر قرآن ہی میں ان کی طرف جو الفاظ منسوب کئے گئے ہیں تو وہ اسی زعم باطل کا نتیجہ ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ان کے قبضہ اقتدار میں جو کچھ بھی آیا ہے، یہ ان کی حسابی اور عددی چالاکیوں اور فینانشل جابکدستیوں کا ثمرہ ہے۔

اور یہی مقام ہے جس پر پہنچنے والوں کا ہمزہ و لمزہ کے ان امراض میں مبتلا ہو جانا ناگزیر ہو جاتا ہے

جن کا قرآن کی مذکورہ بالا سورہ ہمزہ میں ذکر کیا گیا ہے: تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ ایسا آدمی جو رزق کی تنگی کی حالت میں ہو یا فراخی میں، دونوں کو حق تعالیٰ ہی کی طرف سے سمجھتا ہے اور یقین رکھتا ہے کہ دونوں رزق کے قدرتی پیمانے ہیں، ظاہر ہے کہ کسی حال میں ہو، ایسے آدمی کی نگاہ رزق کے معاملہ میں قدرت اور اس کی مشیت ہی پر جمی رہتی ہے، لیکن جو

اوتیتہ علیٰ علم عندی (دیا گیا ہے مجھے یہ سب اس علم کی بنا پر جو میرے پاس ہے۔)

کے مغالطہ میں الجھ گیا یا الجھا دیا گیا ہو، وہ ان لوگوں کو بھی جو مقابلہ کے میدان میں اس سے پیچھے رہ گئے ہوں اور ان کو بھی جو آگے بڑھ گئے ہوں، دونوں ہی کے دونوں جانبوں کا ذمہ دار خود ان ہی کو قرار دیگا اور دے گا کیا معنی تجربہ شاہد ہے کہ قرار دیتا ہے، ایسی صورت میں یہ دیکھا گیا ہے، اور دیکھا جاتا ہے کہ "جمع و عد" کے مقابلہ میں پیچھے رہ جانے والوں پر تو وہ حماقت و سفاہت، ناعاقبت اندیشی اور اسی قسم کے بیسیوں عیوب کے ساتھ حملہ کرتا ہے، اور یہ حملہ شدت کی صورت عموماً اس لئے بھی اختیار کر لیتا ہے کہ "جمع و عد" کی مہم میں عموماً ناکام زیادہ تر وہی بیچارے رہ جاتے ہیں جو اپنی آمدنی کو زندگی کی سہولتوں اور راحتوں میں خرچ کرتے ہیں، خواہ خود اپنی ذات سے اس کا تعلق ہو یا اپنے بال بچوں اعزہ و اقربا اور دوسرے مستحقین پر انھوں نے خرچ کیا ہو، اب کھلی ہوئی بات ہے کہ خرچ کرنے والوں کو جو راحت و آرام رہنے سہنے، کھانے پینے پہننے اوڑھنے وغیرہ میں نصیب ہو سکتا ہے، یہ بات اس کم بخت کم نصیب کو کیسے میسر آسکتی ہے جس نے پیٹ پر پتھر باندھ لیا ہو اور "جمع و عد" کی اس مہم میں جو ہر وقت اسی فکر میں غلطاں پیچاں ہو کہ جو آچکا ہے وہ جانے نہ پائے اور جو آسکتا ہے اس کے آنے کا کوئی موقعہ ہاتھ سے چھوٹنے نہ پائے۔ ظاہر ہے کہ دولت اور سرمایہ میں جو اس سے فروتر ہیں ان کی رفاہیت اور خوش باشی کو دیکھ دیکھ کر اگر اس میں رشک و حسد کی آگ جل اٹھے تو تعجب نہ ہونا چاہئے، جس کے پاس سب کچھ ہے وہ تو اپنی اور چیتھڑوں پر مارا مارا یا جوتیاں ہی چٹخاتا بازاروں میں گھومتا پھرے، اور جس کے پاس کچھ نہیں ہے وہ موٹروں اور جوڑیوں پر اڑا پھرے۔ اس حال کو دیکھ کر بے چین ہو جانا ایک قدرتی بات ہوتی ہے، اسی باطنی سوزش پر پانی ڈالنے کے لئے وہ ان خرچ کرنے والوں پر تمسخر کلمات کے ساتھ برسنے لگتا ہے۔ خصوصاً اگر اس خرچ کرنے والے غیر سرمایہ دار انسان کو کسی وقت سرمایہ دار صاحب سے کچھ لینے کی ضرورت پیش آجائے، خواہ وہ قرض ہی کی صورت میں کیوں نہ ہو، لیکن مطالبہ کی تکمیل کا معاملہ تو بعد کا ہے، سب سے پہلے اس بیچارہ کو ان شعلوں میں دیر تک جھلسنا پڑتا ہے، جن کی صورت تو بظاہر نصیحت اور خیر خواہی کی ہوتی ہے، لیکن درحقیقت حقیقی محرک اس کی تہہ میں دبی آگ ہوتی ہے، جو ان سرمایہ داروں کے دلوں میں چھپی ہوتی ہے۔ چونکہ ان ظالموں کو اس قسم کے بے سرمایہ لوگوں سے خوف بھی نہیں ہوتا، اسی لئے جلی کٹی جو بھی سنانی ہوتی ہے، عموماً ان کے منہ پر سنائی جاتی ہے، قرآن ہی میں یہ جو

ان ہی سرمایہ داروں کے متعلق یہ الفاظ جو پائے جاتے ہیں

الذین یبخلون و یامرون الناس	وہی جو بخل اختیار کرتے ہیں، اور حکم دیتے
بالبخل و یکتمون ما اتاھم اللہ	ہیں لوگوں کو بخل کے اختیار کرنے کا اور
من فضلہ۔	چھپاتے ہیں اس چیز کو جو اپنے فضل سے

اللہ تعالیٰ نے انھیں عطا کیا ہے۔

تو ایک پہلو اس کا یہ بھی سمجھ میں آتا ہے کہ اسی قسم کے مواقع پر پہلے تو خرچ کرنے والوں کو یہ کفایت شعاری عاقبت بینی وغیرہ کے الفاظ میں بخل کی تعلیم دیتے ہیں، اور اسی کے ساتھ جب سب کچھ سنا لینے کے بعد مطلب پر آتے ہیں تو بسا اوقات دیکھا گیا ہے کہ وہ کتمانِ فضل سے کام لیتے ہیں یعنی کہہ دیتے ہیں کہ میرے پاس تو خود کچھ نہیں ہے، خیر یہ صورت تو ان کے ساتھ پیش آتی ہے، جو میدان مقابلہ میں پیچھے رہ جاتے ہیں، باقی آگے نکلنے والوں کے منہ پر تو ممکن ہے کچھ کہنے کی ہمت نہیں پڑے لیکن پسِ پشت یہ شکست خوردہ میدانِ مقابلہ میں ہارنے والا سرمایہ دار ہر گفتنی و ناگفتنی کو اس کی طرف منسوب کرتا ہے، اور ان ہی باتوں کو اس کی کامیابی اور اپنی ناکامی کی وجہ قرار دیتا ہے، اس نے بے ایمانی کی، دھوکہ دیا، فریب سے کام لیا، یہ کیا، وہ کیا، حالانکہ یہ بھی جو کچھ ہوتا ہے، اسی حسد کی کی آگ کے ظہور کی ایک شکل ہوتی ہے جس میں "جمع وعدّ" کا یہ ماہر سرمایہ دار جلتا بھنتا رہتا ہے۔

بعض علماء نے ہمزہ لمزہ کے ان دو لفظوں کی تفسیر کرتے ہوئے یہ جو لکھا ہے،

العیب فی الوجہ لمزا و فی	سامنے منہ پر کسی کو برا بھلا کہنا یہ تو لمز
الغیب ھمز و قیل عکس ذلک	ہے، اور پیٹھ پیچھے کہنا ہمز ہے بعض ان
و یدخل فیہ الاستہزاء۔	دونوں الفاظ کی تشریح بالعکس اس کے
والاستھزاء والمحاکاۃ۔	کرتے ہیں۔ بہرحال مسخراپن کسی کے ساتھ

کرنا، کسی کا ٹھٹھا اڑانا، کسی کی نقل بنانی ہمز و لمز کے نیچے یہ ساری باتیں داخل ہیں۔

تو اس خیال سے اتفاق کرتے ہوئے میں اس پر اتنا اور اضافہ کرنا چاہتا ہوں کہ ہمزہ اور لمزہ کے ان دو قرآنی الفاظ میں سے ایک کا تعلق اگر ان لوگوں سے رکھا جائے جو "جمع وعدّ" کی مہم میں پیچھے رہ جاتے ہیں اور دوسرے کے متعلق یہ قرار دیا جائے کہ اس کا تعلق ان لوگوں سے ہے جو اس مہم میں آگے بڑھ جاتے ہیں، تو اس مشہور علمی قاعدے کی بنیاد پر یعنی تجدید سے تاسیس بہتر ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ دو لفظوں کا ایک ہی مصداق قرار دینا، اس سے زیادہ بہتر یہ ہے کہ دو کو دو مختلف معانی پر محمول کیا جائے، اگر ایسا کیا جائے تو یہ زیادہ مناسب ہے۔

اب خیال کیجئے، اس شخص کے نفسی کیفیات، اور باطنی واردات کا جو مال میں خلود بخشی کی کرامتوں کو پوشیدہ قرار دے کر "جمع وعدّ" کے گھن چکر میں مبتلا ہو گیا ہو، اور اسی اندرونی گردش نے بالآخر اس کو ہمزہ و لمز کے مقام تک پہنچا دیا ہو، وہ ان سے بھی بگڑا ہوا ہے، جو اس سے پیچھے رہ گئے ہیں،

اوران سے بھی روٹھا ہوا ہے جو آگے نکلے ہوئے ہیں، اسی کے ساتھ ہر آئے ہوئے پیسے کے متعلق جو طے کئے ہوئے ہو کر اسے نکلنے نہ دیا جائے گا، اور ہر وہ پیسہ جو ابھی نہیں آیا ہے۔ لیکن اس کے آنے کا کچھ بھی امکان ہے، اس کے متعلق بھی یہ فیصلہ کر چکا ہو کر بہر حال اس کو آنا ہی چاہیئے، خود ہی سوچنا چاہیئے کہ باہر سے ایسا آدمی خواہ کچھ ہی نظر آتا ہو، لیکن اندر جھانک کر دیکھئے، بجز آگ ہی آگ کے اس میں اور بھی کچھ ہو سکتا ہے، خصوصاً زندگی کی ناگزیر ضروریات میں آئے ہوئے پیسوں میں سے کچھ پیسوں کا خرچ ہوتا رہنا چونکہ بہر حال یقینی ہے، اسی طرح جن آمدنیوں کے حصول کا امکان پیدا ہو جائے۔ ظاہر ہے کہ ہر وقت اور ہر حال میں ان کا حاصل ہونا کب ضروری ہے۔ پھر کون اندازہ کر سکتا ہے اس چوٹ کا جو نکل نکل کر ہر پیسہ اس کے دل پر لگاتا رہتا ہے، اسی طرح جس کے آنے کا امکان تھا۔ جب اس آمدنی سے اسے محروم ہونا پڑتا ہے، اس کے قلق اور بے چینی کی صحیح رُوداد وہی دے سکتا ہے، جس پر گذرتی ہے، بلکہ سچ تو یہ ہے کہ پیسوں کے لئے خرچ ہونے ہی کی صورت میں نہیں بلکہ خرچ ہو جانے، یا جمع شدہ سرمایہ کے ضائع ہو جانے کے خطرات بھی جن بھیانک صورتوں میں انھیں ڈراتے اور دھمکاتے رہتے ہیں۔ اور مختلف اندیشے اور احتمالات جن جن شکلوں میں انھیں کپکپاتے رہتے ہیں، بجائے خود یہ ایک مستقل بلائے جان کی صورت میں اس کے اندر تہلکہ مچاتے رہتے ہیں جس سے نجات کی کوئی صورت اس کے پاس نہیں ہوتی، آخر اس راہ کے بعض تجربہ کاروں سے کتابوں میں اس قسم کے اعترافات جو ملتے ہیں، مثلاً امریکہ کے مشہور کروڑپتی کارنیگی کا یہ زبان زد عام فقرہ نقل کیا جاتا ہے کہ وہ کہا کرتا تھا،

"لاکھ پتی (ملینیر) کبھی مسکرا نہیں سکتا (منقول از ہلال مصری سئی ۱۹۲۵ء)

یا اسی قارون آباد کے دوسرے شاہ دولت راک فیلر آنجہانی کے متعلق یہ لطیفہ جو نقل کیا جاتا ہے کہ کسی مجلس میں "کامیابی" کے عنوان پر بحث ہو رہی تھی، راک فیلر نے اٹھ کر اس وقت تقریر کی۔

> کیا ان کی مراد کامیابی سے مال و دولت کمانا ہے، کیا اسی کا نام کامیابی ہے؟ میں کہتا ہوں۔ اور مجھے کہنے کا حق ہے کہ سب سے بڑا مفلس وہی ہے جس کے پاس مال کے سوا اور کچھ نہ ہو۔ میں کہتا ہوں کہ اگر مجھے ابتدا ہی میں اس کا اختیار دیا جاتا کہ کس قسم کی زندگی چاہتا ہوں، تو میں اپنے لئے یہ اختیار کرتا کہ میرے پاس کچھ نہ ہو، یا ہو تو بہت تھوڑا، بقدر ضرورت ہو، لیکن اسی کے ساتھ مجھے بتا دیا جائے کہ میرے جینے کا مقصد کیا ہے؟ (الہلال مصری جون ۱۹۲۴ء)

ان اعترافات کی تہہ میں بجز ان نفسیاتی کیفیات و حالات کے اور کونسی چیز چھپی ہوئی ہے، اور آپ پڑھیئے اس کے بعد سورہ ہمزہ کے ترجمہ کا یہ ٹکڑا۔

> "وہ جو مال جمع کرتا اور گنتا ہے، اسے خیال کرتا ہے کہ مال اسے خلود اور دیرپائی عطا کرتا ہے، ہرگز نہیں، قطعاً وہ جھونکا دیا جاتا ہے الحطمہ یعنی

چورچور کردینے والی میں) اور یہ الحطمہ کیا چیز ہے؟ آگ ہے اللہ کی سلگائی
ہوئی، چڑھ جاتی ہے دلوں پر اور اس آگ (کے پٹ) بند کر دیئے جاتے ہیں
(اس پر) جو لمبے لمبے ستونوں پر کھڑی ہے۔"

یہ صحیح ہے کہ حقیقی رنگ میں یہ کیفیت تو ان کے سامنے اسی وقت پیش آئے گی، جب ہر حقیقت اپنی اصلی رنگ میں نمایاں ہوگی، لیکن جو "کل" ہونے والا ہے، دیکھنے والے چاہیں تو آج بھی اس آتشیں مکان کا تماشا کر سکتے ہیں، جس کی دیواریں بھی آگ ہی کی ہیں، اور جس کی چھت بھی آگ ہی کی ہے ایسی چھت جو لمبے لمبے ستونوں پر قائم ہے، اور اسی آتشیں مکان میں اسے جھونک کر پٹ بند کر دیا گیا ہے، نکلنے کی راہیں چاروں طرف سے مسدود ہیں، آخر قرآن ہی میں تو

وان جھنم لمحیطۃ بالکافرین — اور قطعی جہنم گھیرے ہوئے کافروں کو۔

فرمایا گیا ہے، کم از کم

احاط بھم سرادقھا — اس جہنم کے سراپردوں نے ان کا احاطہ کر لیا ہے۔

اس کا تو انکار نہیں کیا جا سکتا، بلکہ سچ تو یہ ہے کہ جو چیز آج اندر ہے، وہی تو کل باہر نکل آئے گی اجساد کا تروح اور ارواح کا تجسد ارباب حقائق کا مسلمہ ہے، اسی لئے میں سمجھتا ہوں کہ جمع وعد کے مجرموں کے متعلق سورۂ ہمزہ کی جس سزا کو صرف ادھار ہی ادھار سمجھا جا رہا ہے، اگر غور کیا جائے تو اسی سورہ کے الفاظ میں "نقد" کی جھلک بھی ان لوگوں کو نظر آسکتی ہے، جو مال و سرمایہ کے ساتھ انسانی نفسیات کے تعلقات کا مطالعہ ان قرآنی آیات کی روشنی میں کریں گے، یقیناً سوچنے والوں کو اس "آتشیں گرداب" کی کچھ موجیں آج بھی محسوس ہو سکتی ہیں جس میں پھنس کر "جمع وعد" کے ان مجرموں کو ہر حال میں چکراتے ہی رہنا پڑتا ہے، یہی جذبہ قدرت کی سلگائی ہوئی آگ کی شکل اختیار کر کے ان کی چھاتیوں پر چڑھ کر مونگ دلتی رہتی ہے، باہر سے دیکھنے والوں کو یہ بیچارے نظر آتے ہیں کہ ان کے اوپر بھی روپیہ ہے اور نیچے بھی روپیہ ہے، وہ روپیوں ہی میں جاگتے اور اسی میں سوتے ہیں، لیکن جس کی نظر اندر کا کچھ بھی اندازہ کر سکتی ہے، میں نہیں سمجھتا کہ قرآنی اشارات کی تصدیق میں وہ شک کر سکتا ہے، بلکہ ہمز و لمز کے جو شعلے ان کی زبانوں سے نکلتے رہتے ہیں، سچ پوچھئے تو جو کچھ ان کے اندر ہوتا ہے، وہی ان شکلوں میں ان کی زبانوں کی راہ سے باہر نکلتا رہتا ہے۔ گویا باطن کی شہادت ظاہر کی یہ حالت ہوتی ہے۔ بلکہ سورۂ ہمزہ کی یہی آیت یعنی

یحسب ان مالہ اخلدہ — خیال کرتا ہے کہ اس کا مال اسے دوام بخشتا ہے۔

نے میرے ذہن کو ایک عجیب مسئلہ کی طرف منتقل کر دیا ہے۔ میں نہیں کہتا کہ قرآنی الفاظ کی یہ تفسیر ہے، بلکہ میرا صرف یہ ایک ذہنی انتقال ہے، غور کرنے کے لئے دوسروں کے سامنے بھی پیش کر دیتا ہوں۔

مطلب یہ ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کے قصے میں جس "الشجرہ" کا ذکر ہے، اگرچہ کتابوں میں اس کے متعلق بیسیوں اقوال پائے جاتے ہیں، اور ان ہی اقوال میں سے عوام میں ایک قول یعنی یہ بات کہ وہ گیہوں کا درخت تھا، جس کے قریب جانے سے حضرت آدم علیہ السلام کو منع کیا گیا تھا، زیادہ مشہور ہو گیا ہے، اگرچہ جاننے والے جانتے ہیں کہ کسی صحیح روایت سے نہ یہ ثابت ہے اور نہ دوسرے اقوال کی تائید کسی صحیح حدیث سے ہوتی ہے، اسی لئے علامہ شہاب محمود آلوسی نے اپنی تفسیر روح المعانی میں لکھ دیا ہے کہ

الاولی عدم القطع بھا — زیادہ بہتر ہے کہ کسی قول کے متعلق قطعی فیصلہ نہ کیا جائے۔

اسی لئے میرا عقیدہ بھی اگرچہ یہی ہے کہ جس چیز کو خدا نے مبہم چھوڑ دیا، ہم خواہ مخواہ اس کی تعیین میں کیوں سر کھپائیں، خصوصاً جب اس کا کوئی نفع بھی نہ ہو آخر اگر یہ متعین بھی ہو جائے کہ وہ گیہوں یا انگور، یا عقل یا حیات ہی کا درخت تھا تو اس سے کوئی خاص علمی یا عملی نتیجہ کیا حاصل ہوتا، لیکن اگر حضرت آدمؑ کے اس قصہ کو صرف قصہ کی حیثیت سے نہ پڑھا جائے، بلکہ اولاد آدم کی موجودہ زندگی میں اس قصہ کے اجزاء سے نفع اٹھانے کا ارادہ کیا جائے، تو اس وقت دوسرے اجزاء سے قطع نظر کرتے ہوئے میں "الشجرہ" کے متعلق یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ قرآن ہی میں جب یہ موجود ہے کہ بہکاتے ہوئے "الشیطان" نے حضرت آدم کو کہا کہ

ھل ادلک علی شجرۃ الخلد — کیا راہ نمائی کردوں تمہاری ہمیشگی کے درخت کی طرف۔

اور دوسری جگہ اسی کی شرح کرتے ہوئے شیطان ہی کی زبان سے یہ ادا کرایا گیا ہے کہ اس نے آدمؑ و حواؑ کو یہ سمجھایا تھا کہ خدا نے اس "الشجرہ" سے تم دونوں کو اس لئے روکا ہے کہ اس "الشجرہ" کے استعمال کے بعد تم دونوں کو "خلود" حاصل ہو جائے گا، یعنی تکونا من الخالدین (ہو جاؤ گے تم دونوں ہمیشہ رہنے والوں میں) کا جو حاصل ہے۔

اب ایک طرف اس مسئلے کو سامنے رکھ لیجئے، اور دوسری طرف سورۂ ہمزہ کے اس مضمون پر غور کیجئے کہ آدمی مال اور سرمایہ ہی کے متعلق خیال کرتا ہے کہ اس میں "خلود بخشی" کی کیفیت پائی جاتی ہے، اس کے بعد اگر یہ سمجھا جائے کہ حضرت آدم علیہ السلام جس عالم میں اس وقت تھے، اس وقت ان کے سامنے خواہ کسی صورت میں وہ چیز پیش ہوئی ہو، لیکن آدم کی اولاد کے سامنے وہی آج مال اور سرمایہ کی شکل میں جلوہ گر ہوئی ہے، تو جہاں تک قرآن کا اقتضاء ہے، یہ خیال چنداں بعید نہیں قرار دیا جا سکتا، آخر ان امور پر غور کیجئے۔

(۱) حضرت آدم اور ان کی بیوی حوا علیہما السلام کو حکم دیا گیا تھا کہ

کلا منھا رغدا حیث شئتما — دونوں کھاؤ اس باغ میں جی بھر کر

ولا تقربا ھٰذہ الشجرۃ فتکونا من الظالمین۔ | جہاں سے جی چاہے۔ اور نہ قریب پھٹکنا اس درخت کے، کیونکہ تب ہو جاؤ گے

تم اپنی حد سے نکلنے والے، یعنی ظالموں میں ہو جاؤ گے۔

آج بھی دیکھا جاتا ہے کہ اولادِ آدم کے سوا زندگی کی تمام ضرورتوں کی محتاج ہستیاں لاکھوں اور کروڑوں کی تعداد میں اس طور پر زندگی گذار رہی ہیں کہ صبح سے شام تک خوب کھاتی پیتی چرتی چگتی رہتی ہیں۔ لیکن ان میں کوئی بھی اپنی ضرورتوں کے متعلق خلود اور دیرپائی کی ضمانت میں سرگرداں نہیں ہے۔ ان سب میں صرف ایک آدم زاد ہے جو آج کی ضرورتوں کی تکمیل کے بعد "کل" کے متعلق ہمیشہ غیر مطمئن رہتا ہے عدمِ اطمینان کی اسی کیفیت کے ازالہ کے لئے وہ اس چیز کی تلاش میں سرگرداں ہے جس کے متعلق "خلود بخشی" کا خیال اس میں پیدا ہو گیا ہے۔ یعنی مال اور سرمایہ گویا آج جو مل رہا ہے، کل وہی ملتا رہے سمجھا جاتا ہے کہ اس کی ضمانت مال اور سرمایہ ہی میں مستور ہے، جیسا کہ بہ تفصیل اس پر بحث ہو چکی۔

(۲) حضرت آدم علیہ السلام کے قصہ میں ہے کہ "شجرۃ الخلد" کے چکھنے کے ساتھ ہی ان کے سوآۃ (چھپانے کی چیزیں) کھل گئیں، آدم کی اولاد میں بھی یہی دیکھا جاتا ہے، بلکہ قرآن ہی کے حوالہ سے گذر چکا کہ مال کی محبت میں جب بخل کی راہ آدمی اختیار کرتا ہے تو "الحسنیٰ" یعنی اچھی باتوں کی تکذیب شروع کر دیتا ہے، گویا یوں مال اور سرمایہ کی محبت اس کے عیوب کو کھول دیتی ہے۔

(۳) اسی "الشجرۃ" کے چکھنے کا نتیجہ حضرت آدم علیہ السلام کے ساتھ اس صورت میں ظاہر ہوا کہ ان کو ہبوطا اور اتر جانے کا حکم دیا گیا۔ حق تعالیٰ کی درگاہ میں قرب کا جو مقام ان کو حاصل تھا اسی سے وہ اتار دیئے گئے، آدم کی اولاد میں بھی یہی دیکھا جاتا ہے کہ مال اور سرمایہ پر اقتدار حاصل کرنے کے بعد اس کے سارے احتیاجی تعلقات اسی مال کے ساتھ قائم ہو جاتے ہیں۔ بندے اور خدا کے درمیان جو احتیاجی تعلق رہنا چاہیئے، وہ تعلق باقی نہیں رہتا۔ قرآن میں بھی جیسا کہ گذر چکا من بخل واستغنیٰ کے الفاظ میں اس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

(۴) مال میں جیسے غنا بخشی کی کیفیت بظاہر لوگوں کو محسوس ہوتی ہے، گویا عدمِ احتیاج کا جو ایک پہلو فرشتوں میں پایا جاتا ہے، اسی ملکوتی پہلو کی تکمیل کی ایک شکل مال میں پائی جاتی ہے جضرت آدم کو بھی شیطان نے منجملہ اور باتوں کے یہ بھی کہا تھا کہ اس "الشجرۃ" کے استعمال سے چوں کہ ملک (فرشتہ) بن سکتے ہو، اس لئے خدا نے تم کو اس سے روکا ہے۔

(۵) شیطان نے اس "شجرۃ الخلد" کی ایک صفت ملک لا یبلیٰ بھی بیان کی تھی، یعنی یہ ایک ایسی چیز ہے جو پرانی اور کہنہ نہیں ہوتی، معاشیات کے ماہرین اپنی کتابوں میں لکھتے ہیں کہ فرسودگی اور کہنگی دنیا کی دوسری چیزوں پر جلد طاری ہو جاتی ہے، لیکن سونا اور چاندی میں یہ بات نہیں پائی جاتی، بلکہ سچ تو یہ ہے کہ روپیہ ہی ایک ایسی چیز ہے کہ کسی کو قرض میں اگر آج دیا جائے اور سو سال بعد واپس لیا جائے۔ تو نہ دینے والا یہ کہہ سکتا ہے کہ سو سال کی اس مدت میں تمہارے روپے پرانے

اور فرسودہ ہو گئے، اور نہ لینے والا واپس لیتے ہوئے یہ خیال کر سکتا ہے، بلکہ جس تر و تازہ حال میں روپیہ دیا جاتا ہے، خواہ کتنی ہی مدت بعد واپس ہو، اسی حال میں واپس بھی لیا جاتا ہے، ایسی مملوکہ شئے جو پرانی نہ ہو، میں تو خیال کرتا ہوں کہ دنیا میں روپے کے سوا شاید ہی کوئی دوسری چیز ہو۔

(۶) ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ اسی "شجرۃ الخلد" کی سزا میں ہبوط اور نزول کے ساتھ ساتھ یہ بھی کہا گیا کہ "تمہارے بعض بعض کے دشمن رہیں گے۔" یعنی لبعضکم لبعض عدو۔ آدم کی اولاد میں بھی آج جتنے جھگڑے رگڑے، جنگ و جدال چھوٹے پیمانوں پر ہوں یا بڑے پیمانوں پر، آخری چیز ان تمام لڑائیوں اور جھگڑوں کی تہ میں عموماً یہی مال و دولت ہی ہوتی ہے۔

میرے ذہنی انتقال کے اسباب یہی تھے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ وہ کس حد تک صحیح ہے، صرف دماغ میں ایک بات آئی تھی، مدتوں سے کھٹک رہی تھی، اس کا اظہار کر دیا گیا۔ والعلم عند اللہ تعالیٰ وھو اعلم بمرادہ۔

بہرحال ان قرآنی بیانات کا تعلق تو ان سے تھا، جو مال کے ساتھ بخل اور جمع وعد کا تعلق رکھتے ہیں، باقی ان ہی سرمایہ داروں میں بعضوں کو جو دیکھا جاتا ہے کہ "العسریٰ" کی زندگی بسر کرتے کرتے اچانک کبھی کبھی کچھ دن کے لئے ایک ہی دن دو دن کے لئے سہی کچھ ایسی صورت اختیار کر لیتے ہیں کہ بظاہر محسوس ہوتا ہے کہ اب ان پر گویا "الیسریٰ" کی زندگی آسان کی گئی ہے، مثلاً کسی تقریب کے موقعہ پر وہی شخص جس نے ساری عمر ایسی گذاری جس کا گذارنا شاید کسی ادنیٰ درجہ کے غریب قدری معیشت رکھنے والے کے لئے بھی دشوار ہو، لیکن یہی غریبوں سے بھی غریب تر زندگی رکھنے والا چند دنوں کے لئے امیر بننے کا مظاہرہ کرتا ہے، یا وہی جو "جمع وعد" کے جالوں اور چالوں سے کام لے کر تمام عمر غریبوں کی غربت میں اضافہ کرنے کا ذریعہ اپنے سرمائے کو بنائے رکھتا ہے۔ ایک ایک روپے کو غریبوں کی جیبوں میں پہنچا کر سیکڑوں اور ہزاروں روپے وصول کرتا رہتا ہے، اس طور پر وصول کرتا رہتا ہے کہ وصولی کی اس مہم میں کسی غریب کی غربت کسی لاچار کی لاچاری پر لمحہ بھر کے لئے بھی اس کا دل ترس نہیں کھاتا، لیکن ناگاہ دیکھا جاتا ہے کہ شہر کے کسی موڑ اور چوراہے پر یا کسی پڑاؤ یا اسٹیشن کے سامنے "دھرم" کے نام سے کسی بلند و بالا اونچی عمارت کی تعمیر میں وہی اس لئے مصروف ہے کہ تھکے ماندوں کو آرام ملے گا، مسافر اس میں ٹھیرائے جائیں گے، یا از قبیل چیرٹی CHARITY اور خیرات خانے کے نام سے کسی بڑی رقم کا اعلان اس احساس کے ادعا کے ساتھ کرتا ہے کہ اس کا دل آدم کی بے سرمایہ اولاد کے لئے روتا رہتا ہے۔ مفلوک الحالوں کے لئے اس کا کلیجہ پھٹا جاتا ہے۔ انسانی ہمدردی کے ان ہی شریفانہ جذبات سے بے کل ہو ہو کر کبھی ہسپتال کھولتا ہے، کبھی محتاجوں کے لئے مشہور کرتا ہے کہ اس نے سدابرت جاری کیا ہے، غریبوں میں غلہ تقسیم کرتا ہے، حالاں کہ یہ واقعات نے دن دنیا میں پیش آتے ہیں، لیکن سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ دنوں میں یہ سوال کیوں پیدا نہیں ہوتا کہ

نظریہ ابتلائیت کے انکار کے بعد کرنے والے یہ سب کچھ جو کرتے ہیں تو کیوں کرتے ہیں؟ کیا وہ خُدا کو خوش کرنا چاہتے ہیں، خُدا اور خُدا کی ذمہ داریاں ہی اگر انھیں یاد رہتیں تو "سرمایہ" کے جمع کرتے ہیں وہ خُدا کی مرضیات سے بے پروائی ہی کیوں برتتے، یہ نہیں تو کیا واقعۃً غریبوں کی غربت پر واقعی کیا ان کا دل دکھتا ہے؟ انسانی برادری کے متعلق ان کے دل میں کیا رحم کا کوئی جذبہ حقیقۃً متلاطم ہوا ہے؟ جن کی مالی فربہی سراسر غریبوں کے خون ہی کے چوسنے سے پیدا ہوئی ہے، کیا سمجھ میں آنے کی بات ہے کہ ان کا دل غریبوں کی غربت پر تڑپ سکتا ہے، افلاس پھیلا پھیلا کر ملک کے عام باشندوں سے امراض کے مقابلہ و مقاومت کی قوت جن کے کرتوتوں کی بدولت سلب ہوئی ہو، کیا ان ہی بے زردوں کو ان بیچاروں کی بیماریوں سے بھی کوئی ہمدردی ہو سکتی ہے؟ لیکن باوجود ان تمام باتوں کے جب وہ خرچ کرتے ہیں، تو یقیناً سوال ہوتا ہے کہ کیوں کرتے ہیں؟ آئیے سنیئے، قرآن کی آیتیں سنیئے، آپ خود نہیں سوچتے تو قرآن جو کچھ کہتا ہے خُدارا اسے تو سوچا کیجئے، ارشاد ہے،

كَالَّذِي يُنفِقُ مَالَهُ رِئَاءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ۔

(احسان کرنے کے بعد احسان جتلانے والوں کی مثال) اس شخص کے جیسی ہے جو خرچ کرتا ہے اپنے مال کو لوگوں کو دکھانے کے لئے، اور نہ مانتا ہے وہ اللہ کو اور نہ پچھلے دن کو (یعنی قیامت کے دن جو بدلہ کا دن ہے اس کے یقین سے بھی وہ محروم ہوتا ہے)

جس سے معلوم ہوا کہ خرچ کرنے والے صرف اسی لئے خرچ نہیں کرتے کہ خُدا ان کے اس خرچ سے خوش ہوگا یا خُدا کی مخلوق کو اس سے فائدہ پہنچے گا، بلکہ خرچ کی ایک صورت وہ بھی ہوتی ہے، جس میں نہ مقصود ہوتا ہے نہ وہ بلکہ رِئاءَ الناس (لوگوں کو دکھانا) ہی ان کے مصارف کا نصب العین ہوتا ہے اور ہے بھی یہی بات کہ دیکھنے اور دکھانے کا تعلق خُدا سے جو توڑ چکا ہے اب وہ دکھائے بھی تو آخر کسے دکھائے؛ جن کو غریب بنا کر وہ اپنی امیری پیدا کرتا ہے، ان ہی غریبوں کی آنکھ میں اپنے دھرم سالوں، اپنے ہسپتالوں سے، سچ پوچھئے تو سرمایہ داروں کا یہ طبقہ خاک جھونکنا چاہتا ہے۔ "تکذیب بالحسنیٰ" سے پیدا ہونے والی لعنتوں کو اس تدبیر سے چاہتا ہے کہ لوگوں کی ستائشوں اور مدح سرائیوں سے بدل دے اور اسی لئے سیکڑوں چوہوں کی نگلنے والی یہ بلی دراصل "حج" کے لئے کمر کستی ہے، بلکہ سب نہیں تو ایک بڑا گروہ ان میں ایسے بدباطنوں، سیاہ سینوں کا بھی ہوتا ہے جو "ریاء الناس" کی اس کمان سے بھی غریبوں کے قلوب کو تیز و تند کے تیروں اور برچھیوں سے گھائل کرنا چاہتا ہے۔ تاکہ دوسروں کی تسلی ہو، جیسے اس خیال سے باوجود قدرت و اختیار کے اللہ کے خاص بندے جیسا کہ عرض کر چکا ہوں غربت کی زندگی گذارتے ہیں، ٹھیک اسی کے مقابلہ میں دوسروں کو تلملانے اور جلانے کے لئے اپنے مالی زور اور سرمایہ کی قوت کا یہ مظاہرہ کرتے ہیں اور جن کی نیت یہ نہ بھی ہوتی ہو، لیکن "نظریۂ ابتلائیت" سے ہٹ کر خرچ کرنے والوں کے سامنے یہ بات تو ضرور ہوتی ہے کہ دوسروں پر ان کی دولتمندی کا

رعب قائم ہو، ان کی بڑائیوں کا دنیا میں چرچا ہو، وہ کتنا بڑا آدمی ہے، محفلوں اور مجلسوں میں اس کا تذکرہ کیا جائے۔

بہرحال اب یہ ہو، یا وہ ہو، دیکھنے کی بات یہ ہے کہ عمر بھر کی عزت کی زندگی کے بعد چند دنوں کی امیری کے اس مظاہرے سے جو اغراض ان کے پیش نظر ہوتے ہیں، ان میں کہاں تک کامیاب ہونے کا موقع ان کو دیا جاتا ہے، قرآن نے ایک مثالی بیان سے بایں الفاظ اس کو واضح کیا ہے

فمثله کمثل صفوان علیه تراب	تو اس کی (یعنی ریاکار ان کے لئے خرچ
فاصابه وابل فترکه صلدا	کرنے والوں کی) مثال ایسی ہے جیسے کوئی
لا یقدرون علی شیٔ مما کسبوا	چٹان ہو، اس پر گرد جمی ہے، تو برسی اس پر
واللّٰه لا یهدی القوم الکافرین	بارش، بس چھوڑ دیا اس کو (یعنی گرد

بجھی ہوئی چٹان) کو سپاٹ، نہیں ہاتھ لگتی ان کو اپنی کمائی، اور اللہ نہیں راہ نمائی فرماتا ہے ناشکروں کی۔

ایک مطلب تو اس کا وہی ہو سکتا ہے، جس کا ذکر قرآن ہی کی دوسری آیتوں میں آیا ہے کہ مرنے کے ساتھ ہی ان کا سارا کیا کرایا برباد ہو جاتا ہے، اس طور پر برباد ہو جاتا ہے کہ ان مصارف کا کوئی ثمرہ ان کے ساتھ نہیں جاتا، آخر خدا کو دکھانے کے لئے جو خرچ نہیں کرتا، تو اس وقت جب خدا ہی سے بدلہ پانے کی گھڑی سامنے آرہے گی، اسے کیا مل سکتا ہے، جن لوگوں کو دکھانے کے لئے خرچ کرتا ہے، ظاہر ہے کہ قیامت کے دن وہ تو بدلہ دے نہیں سکتے، اور جو بدلہ اس وقت تقسیم کرے گا اسے دکھایا نہیں گیا تھا، قرآن کی اس قسم کی آیتیں مثلاً

مثل ما ینفقون فی هذه	مثال اس کی جو خرچ کرتے ہیں اس پست
الحیوة الدنیا کمثل ریح فیها	زندگی میں اس ہوا کے مانند ہے جس میں
صر اصابت حرث قوم ظلموا	پالا (مارنے والی ٹھنڈک تھی) پہنچی یہی
انفسهم فاهلکته وما	پالا مارنے والی ہوا ان لوگوں کی کھیتی پر
ظلمهم اللّٰه ولکن کانوا	جنھوں نے اپنے آپ پر ظلم کیا تھا۔ پس
انفسهم یظلمون۔	برباد کر دیا اسی ہوا نے اس کھیتی کو،

اور نہ ظلم کیا خدا نے ان پر، لیکن اپنے آپ پر وہ خود ظلم کرتے رہتے ہیں۔

یا

فسینفقونها ثم تکون علیهم	پس وہ خرچ کرتے ہیں، پھر بن جاتا ہے یہی
حسرة۔	خرچ ان کے قلوب کی حسرت۔

ظاہر ہے کہ غیر ابتلائی انفاق کے یہ وہ نتائج ہیں جو مرنے کے بعد دوسری زندگی میں ان کے سامنے پیش آئیں گے۔

لیکن صفوآن یعنی چٹان والی مثال جو دی گئی ہے جس پر گرد جمی ہوئی ہو، پانی کی ایک بوچھار آتی ہے اور دھو دھاکر پھر اسے صاف ستھرا سپاٹ بنا دیتی ہے، اس مثال پر اگر غور کیا جائے تو ریاء الناس والے مصارف یعنی بجائے خدا کے لوگوں کے دکھانے کے لئے خرچ کرنے والے جو خرچ کرتے ہیں، اور جس جس قسم کے اغراض شعوری یا غیر شعوری طور پر ان کے سامنے ہوتے ہیں۔ ان سارے اغراض پر موجودہ زندگی ہی کے حساب سے یہ مثال صادق آتی ہے، آخر میں پوچھتا ہوں کہ پبلک کی آنکھوں میں دھرم سالوں اور ہسپتالوں کی خاک جھونکنے والے سود خواروں کو باوجود یہ سب کچھ کرنے کے دنیا نے کیا کبھی اچھے الفاظ کے ساتھ یاد کیا ہے؟ ممکن ہے کہ وقتی طور پر سپاس اور شکر کے الفاظ پیش کرنے والوں کی طرف سے پیش ہو جاتے ہوں، لیکن تشکر و امتنان کی یہ گرد لوگوں کے قلوب پر کتنی دیر تک جمی رہتی ہے، جوں ہی کہ ان دھرم سالے بنانے والوں ہسپتال کھولنے والوں کے متعلق یہ خبر شہر میں پھیلتی ہے کہ ہزار روپے دیکر آج فلاں بیچارے کی لاکھ روپے کی کوٹھی نیلام کرا دی گئی، اس کا یہ سارا کیا کرایا یک دھل کر نہیں رہ جاتا؟ میں پوچھتا ہوں کہ وہ حکومتیں بھی تو جگہ جگہ ہسپتال قائم کرتی پھرتی ہیں، سڑکیں بناتی ہیں، پُل بھی تعمیر کرتی ہیں، جن کے ظالمانہ مطالبوں، بھاری بھاری محصولوں کے ذکر سے دنیا چیخ اٹھی ہے، عدالت و انصاف تعلیم اور ذرائع تعلیم کے ان سوداگروں کے متعلق آخر دلوں میں کیوں رواداری نہیں پیدا ہوتی؟ جم جم کر آخر وہ گرد کیوں دھل دھل جاتی ہے، جیسے بنی آدم کے قلوب پر مختلف ترکیبوں اور تدبیروں سے اس قسم کی چالاک حکومتیں بچھاتی رہتی ہیں، کیا یہ دلیل نہیں ہے اس بات کی کہ "ریاء الناس" کے مصارف کا اثر قائم بھی ہوتا ہے تو بہت جلد زائل ہو جاتا ہے، دلوں کی گہرائیوں میں جو خیالات ان کے متعلق جاگزیں رہتے ہیں، دب جانے کے بعد وہی ابھر کر ان پر مسلط ہو جاتے ہیں، اسی طرح ریاء الناس کے جس خرچ میں آنکھوں کا دکھانا اور دلوں کا ڈکٹ نا مقصود ہو، یا دکھانا نہ سہی، اپنے مالی جلال اور سرمایہ کی قوت کا رعب جمانا مقصود ہو، خود ہی خیال کیجئے کہ دکھانے یا جمانے کے ان دونوں عمل کے اثر کی عمر بھی کتنی ہو سکتی ہے۔ اپنے بچوں کے عقیقوں میں، ختنوں میں، شادیوں میں، محلے ٹولے، بھائی برادری والوں کو دکھانے کے لئے مشرق میں جو مصارف کئے جاتے ہیں، اور غریب مشرق کی آتشبازیوں، پٹاخوں، ڈھول باجوں، رقص و سرود کی محفلوں پر ہنسنے والے، یورپ و امریکہ کے باشندوں کے متعلق ان ہی ممالک کے خبار وں کی زبانی جو یہ خبریں سنی جاتی ہیں کہ معمولی روزمرہ دوست احباب کی دعوتوں میں اڑانے والوں نے بر ازیل اور ریو ڈی جنیرو سے منگائے ہوئے رنگ رنگ کے پتنگوں کو کھانا کھلانے کے بعد یہ کہتے ہوئے اڑایا کہ صرف اسی دعوت کے لئے ہزارہا روپے خرچ کر کے یہ پتنگے زندہ حالت میں ان ملکوں سے منگوائے گئے تھے، (دیکھو الہلال مصری مئی ۱۹۲۵ء) یا پھول کے گلدستوں کی جگہ ہر ہر مہمان کے ہاتھ موتیوں سے بھرا ہوا ایک ایک صدف صادق رخصت کے وقت دیا گیا، یا سگریٹ پینے کے لئے مہمانوں کے سامنے جو کاغذ تقسیم کیا گیا۔ وہ سو سو روپیہ نوٹ والا کاغذ تھا۔ یہ اور اسی قسم کے ریاء الناسی مصارف کے آثار و نتائج آپ ہی بتائیے کہ

کمثل صفوان علیه تراب — مانند اس چٹان کے جس پر گرد جمی ہو پس
فاصابه وابل فترکه صلداً — پہنچی اس پر بارش، پھر چھوڑ دیا اس کو
سپاٹ (بناکر)

کے سوا کچھ اور بھی ہوتا ہے،

آپ نے اپنی نورچشمی سلمہا کی تقریب کی یاد کو حافظوں میں منقوش کرنے کے لئے مانا کہ لاکھوں لاکھ اڑادیئے، لیکن آپ کی نورچشمی بہرحال آپ ہی کی نورچشمی ہیں، دوسروں کو آخر کب تک مجبور کریں گے کہ وہ آپ کو، آپ کی نورچشمی سلمہا کو ان کی شادی کو خواہ مخواہ یاد ہی رکھتے چلے جائیں، کب تک؟ دن دُودن، زیادہ سے زیادہ ہفتہ دُوہفتے، بھلا اس کی فرصت موجودہ کش مکش کی زندگی میں کسے ہے کہ تمام مشاغل سے دست بردار ہو کر وہ صرف اسی سبق کو گھونٹتا اور رٹتا چلا جائے کہ فلاں صاحب نے اپنے صاحبزادے کی ختنہ میں اتنا روپیہ صرف کیا، اور صاحبزادی کی شادی میں اتنا لٹایا، کن کن جتنوں اور کیسے کیسے کٹھن راستوں سے لوگ روپے حاصل کرتے ہیں اور "العسریٰ" کی کیسی کیسی عسرتوں، بنیق حالیوں میں باوجود قدرت وقوت کے اپنی اور اپنے بال بچوں کی زندگی گذارتے اور گذرواتے ہیں: اور یہ سب کچھ اس لئے کرتے ہیں تاکہ لڑکی کی شادی کے دن اپنی امیری کے مظاہرہ کا موقعہ ان کو میسر آجائے، ان کو موقعہ دیا جاتا ہے اور ساری جمع کی کرائی دولت ایک دُودن کے اندر ارمانوں اور حوصلوں کے قدموں پر نثار کردی جاتی ہے، پھر اس گرد کے سوا ان کو اور کیا ملتا ہے جو کچھ دن کے لئے پبلک اور عام مخلوق کے دماغوں اور دلوں پر جمتی ہے، جنھیں نہ آپ سے تعلق ہے نہ آپ کے بچوں سے نہ آپ کے مصارف سے گویا ایک چٹان ہے جس پر آپ کا کوئی اندرونی اثر نہیں ہے، اسی چٹان پر گرد جمتی ہے اور ڈھل جاتی ہے، ہلکی سی بوچھار اس کے دھو دینے کیلئے کافی ہوتی ہے، بہرحال جس طرح دیکھئے،

فسینفقونها ثم تکون علیهم حسرة۔ — پس خرچ کریں گے (اس جمع کی ہوئی دولت کو) اور وہی دولت بن جائے گی ان کے لئے (بالآخر) حسرت وافسوس۔

کے سوا آخری انجام "ریاء الناس" کے ان مصارف کا کیا کبھی کچھ اور بھی ہوا ہے؟

بس واقعہ وہی ہے کہ جو خدا کے لئے خدا کی مخلوق پر خرچ نہیں کرتا۔ ان ناشکروں کے مصارف کو یونہی برباد ولاحاصل بنا کر رکھ دیا جاتا ہے، بڑے بڑے سوچنے والوں کو اسی بات کے سوچنے پر مجبور کردیا جاتا ہے کہ خرچ کرنے کے بعد وہ سوچتے ہیں تو حسرت وندامت کی آگ ہی پر انھیں لوٹنا پڑتا ہے، پرانی قوموں کے متعلق قرآن میں ذکر کیا گیا تھا کہ پیغمبر ان سے پوچھتے تھے،

اتبنون بکل ریع اٰیة تعبثون۔ — کیا بناتے ہو! ہر ٹیلے پر نشان، کھیل کرتے ہو (یعنی جن عمارتوں کا کوئی حاصل نہیں وہ بناتے ہو)

لیکن ان کے متعلق تو سمجھا جا سکتا تھا کہ عقلی ارتقاء کے میدان میں ان کی دماغی سطح حیوانیت کے قریب تھی، اس لئے اس قسم کی حماقتوں کا ارتکاب کرتے تھے، لیکن ارتقاء کی آخری منزلوں پر پہنچنے کے مدعی دماغوں کو بھی جب دیکھا جا رہا ہے کہ سڑک کے ہر ہر موڑ پر اسٹیچو کھڑا کر رہے ہیں، پارکوں اور سبزہ زاروں کے بیچ میں پتھر کی مورتیاں بٹھا رہے ہیں، ان پر بھی اور ان میناروں، نادردں پر بھی جن کے اندر نہ گرمی ہی سے کسی کو پناہ مل سکتی ہے اور نہ سردی ہی میں وہ کسی کو امن دے سکتے ہیں لاکھوں لاکھ روپے ہر سال خرچ ہو رہے ہیں، ان ہی لوگوں سے چھین چھین کر خرچ ہو رہے ہیں جنھیں سر چھپانے کے لئے گھاس کا چھپر بھی بہ مشکل میسر آتا ہے، فٹ پاتھوں پر بھی لیٹنے کے لئے جن کے پاس بستر نہیں ہیں، اخباروں کے سوا اوڑھنے کے لئے بھی جو بیچارے اپنے پاس کوئی سامان نہیں رکھتے۔ ”الناس“ کے دکھانے کے لئے آپ ہر سال غریبوں کی کمائی ہوئی آمدنیوں کو اس طرح جو پھونک رہے ہیں، اپنے روشن دماغ اور ترقی یافتہ عقل سے کبھی آپ نے پوچھا بھی کہ آخر یہ کیا ہو رہا ہے، کیوں ہو رہا ہے؟ جو مر چکے ہیں کیا پتھروں میں ان کی شباہتوں کے قائم کر دینے سے جو مر چکے ہیں کیا واقعی وہ جی اٹھتے ہیں، جھگا دڑوں کے سوا جن گنبدوں اور میناروں میں اور کوئی بس نہ سکتا ہو، ان کروڑہا کروڑ روپیوں سے تعمیر ہونے والے میناروں اور گنبدوں میں واقعی یہ خاصیت ہے کہ جو واقعہ گذر چکا ہے، اسے نہ گذرنے دے مرنے والا جو مر چکا ہے اسے نہ مرنے دے؟

واللہ لا یھدی القوم الکافرین — اور اللہ تعالیٰ راہ نہیں دکھاتا ناشکروں کو۔

کے سوا آپ خوب غور کیجئے، اچھی طرح سوچئے، اس کا کوئی اور جواب آپ کو کسی حیثیت سے کبھی بھی مل سکتا ہے ڈوب مرنے کی بات ہے کہ جیتی جاگتی صورتوں کو تو بھوکوں مارا جائے، اور مردہ تصویروں اسٹیچوں کے متعلق دعویٰ کیا جائے کہ ان سے فنونِ لطیفہ میں زندگی پیدا ہوتی ہے، آرٹ زندہ ہوتا ہے، حسن کاری کی روح تازہ ہوتی ہے،

اف لکم ولما تعبدون — تف ہے تم پر اور ان چیزوں پر جنھیں تم پوجتے ہو،

رہا ان ہی خرچ کرنے والوں میں ایک طبقہ جو ان لوگوں کا ہے جن کے ”سرمایہ“ میں ابتدائی ذمہ داریوں کے متعلق تو ایک حبہ بھی نہیں ہوتا، لیکن خود اسی ”سرمایہ“ کو ممکنہ خطرات سے محفوظ رکھنے کے لئے دل کھول کر خرچ کرتے ہیں، قرآن میں ایک عجیب اشارہ ان لوگوں کے متعلق بھی پایا جاتا ہے، سورۃ البلد[۱] میں جن کی طرف

اھلکت مالا لبدا ۔ — کھپایا ہے میں نے مال ڈھیروں۔

کے دعویٰ کو منسوب کیا گیا ہے، وہیں ایک فقرہ بالکل اسی کے متصل یہ بھی ہے، یعنی

ایحسب ان لن یقدر علیہ احد — کیا وہ خیال کرتا ہے کہ بس نہ چلے گا اس پر کسی کا۔

---

[۱] اس سورۃ بلد کی ابتدائی آیتیں لا اقسم بھذا البلد وانت حل بھذا البلد ووالد وما ولد لقد خلقنا الانسان فی کبد،

دوسروں سے مجھے بحث نہیں، لیکن میرے خیال میں اس آیت کے متعلق جو بات آتی ہے اسے عرض کرتا ہوں، مطلب یہ ہے کہ مال اور سرمایہ میں خلود بخشی کی قوت پاکر "جمع و عد" کی تدبیر میں پر عمل کرنے والوں کو متنبہ کیا گیا تھا کہ صرف یہی نہیں کہ ان کا یہ خیال غلط ہے، بلکہ ننانوے کے اس پھیر میں الجھ جانے والوں کو اسی وقت بھرکس نکال دینے والی "الحطمہ" اور ایک ایسی نفسیاتی کیفیت میں جھونک دیا جاتا ہے جو اپنی اندرونی لتد کوب سے انہیں چورچور کرتی رہتی ہے اور وہ بےچارے باطن کے ان ہی آتشیں کیفیات میں الٹتے پلٹتے رہتے ہیں، اسی طرح خرچ کرنے کے متعلق یہ خیال کہ وہ خطرات سے محفوظ کرکے آدمی کو اطمینانی زندگی بسر کرنے کا موقعہ عطا کرتا ہے، میں سمجھتا ہوں کہ مذکورہ بالا سوال یعنی "وہ کیا خیال کرتا ہے کہ بس نہ چلے گا اس پر کسی کا" اس میں بھی گویا چونکایا گیا ہے کہ خطرات سے محفوظ ہو جانے کے مقصد میں وہ کامیاب ہوا ہے یا ناکام ہوا ہے۔ اس کے پتہ چلانے کا طریقہ یہ ہے کہ اس سوال کو اپنے دل میں اٹھائے اور سوچے کہ دولت کی خواہ جتنی بڑی سے بڑی مقدار اس مقصد کے لئے خرچ کی جائے، پھر بھی آدمی کیا اپنے آپ کو اور اپنے سرمایہ کو خطرات سے محفوظ پاتا ہے؟ یعنی بس نہ چلے گا اب اس پر کسی کا، اسی سوال کو اٹھا کر دیکھیے اس کے دل کا اس کے دماغ کا احساس کیا ہے؟ بلاشبہ عجیب سوال ہے، وہی نہیں جو بےچارے انسداد خطرات کی راہ میں دس بیس ماہوار خرچ کرتے ہیں، بلکہ اسی مقصد کو پیش نظر رکھ کر کروڑہا کروڑ حتیٰ کہ آج تو اربہا ارب کے خرچ کرنے والوں کو بھی دیکھا جاتا ہے کہ خرچ کرنے کی حد تک تو وہ خرچ کرتے رہتے ہیں، خوب خرچ کرتے رہتے ہیں، لاکھوں لاکھ تعداد والی فوجیں رکھتے ہیں، اعلیٰ سے اعلیٰ ہتھیار اور اسلحہ تیار کرتے ہیں، نظم و ضبط قائم کرنے کے لئے اپنے سرمایہ کا تقریباً اکثر و بیشتر حصہ اسی راہ میں بہاتے رہتے ہیں، عوام کی ہمدردیوں کو حاصل کرنے کے لئے ان کے پیٹ کو نہ سہی، پاؤں ہی کو آرام پہنچانے کے لئے ریلیں بناتے ہیں، سڑکیں تعمیر کرتے ہیں عوام کا کام نکلتا ہو یا نہ نکلتا ہو، لیکن کہتے یہی ہیں کہ ان ہی کو روشن دماغ بنانے کے لئے تعلیم گاہیں کھولتے ہیں، یونیورسٹیاں قائم کرتے ہیں، لیکن باوجود سب کچھ کرنے کے دوسرے ہی نہیں وہ خود بھی جانتے ہیں کہ قرآنی سوال۔

ایحسب ان لن یقدر علیہ احد — کیا خیال کرتا ہے وہ کہ اب بس نہ چلے گا اس پر کسی کا۔

کے جواب میں "نہیں" کے سوا ان اربوں اور کھربوں کے خرچ کرنے والوں کی طرف سے بھی کم از کم اس وقت تک تو کوئی دوسرا جواب نہیں ملا ہے، ایک خطرہ مٹتا ہے، تو دس خطرات دانت نکالے پورب سے پچھم سے دکھن سے اتر سے جھانکنے لگتے ہیں، ہر تھوڑے سے تھوڑے عرصہ کے بعد "سرمایہ" کی بڑی سے بڑی مقدار ان ہی سر نکلنے والے خطرات کی راہوں میں آگ اور دھواں بن بن کر قرآنی آیت

حبطت ما صنعوا فیہا و باطل ما کانوا یعملون — تہس نہس ہو کر رہ گیا جو کچھ کیا دھرا تھا انہوں نے اور بے نتیجہ ہو کر رہ گیا جو کچھ وہ کرتے تھے۔

کا تماشا عبرت پذیر نگاہوں کے سامنے پیش کرتی رہتی ہے۔ خرچ کر کر کے چھوٹے دائروں کے خطرات سے اس قسم کے خرچ کرنے والے پاتے ہیں کہ وہ محفوظ ہو گئے کہ اچانک اس سے بڑے خطرے کو دیکھتے ہیں کہ سر پہ کھڑا دھمک رہا ہے، آدمی کیا کرے کتنا خرچ کرے، تاریخ جن جن خرچ کرنے والوں کے قصے سناتی ہے، سنائی جاتی ہے، بتائی جاتی ہے کہ خرچ کے ہر پیمانے پر خطروں کا لوگوں کو شکار ہونا پڑا کتنے دن کی بات ہے، ابھی ابھی گذری ہے۔ آدھی دنیا اور اس کی بیداواروں کا شخصی مالک زار جس کے ذاتی مصارف کی فہرست تیار کرنے والوں نے یہ تیار کی ہے کہ۔

> جو ٹوپی پہنتا تھا وہ مستم ایک جگ مگ جگ مگ کرنے والا گویا ایک شعلہ تھا ایک نہیں، ڈوبڑے بڑے موتیوں کے ہار اس پر لپٹے ہوئے تھے، سامنے سب سے اوپر ایک لعل تھا، جس پر الماس کی ایک صلیب چڑھائی گئی تھی ہاتھ میں ملکہ کیتھرائن کا وہ عصا تھا جو صرف زر خالص سے ڈھالا گیا تھا، جس کے اوپر رنگ رنگ کے انمول جواہر جڑے ہوئے تھے، عصا کے سر پر ایک لٹو تھا الماس کا، اور اس کے سوا بھی وقتاً فوقتاً استعمال کیے لئے اس کے خزانے میں جو جواہرات رہتے تھے، جن میں الماس، زمرد، یاقوت وغیرہ سب ہی طرح کی چیزیں تھیں۔ جن کی مجموعی قیمت کا اندازہ اسٹی ملین پونڈ (ایک ارب بیس کروڑ روپے) سے کی جاتی تھی، اور جن میں بعض جواہر کی تاریخ ہزار ہزار سال سے بھی متجاوز تھی۔" الہلال دسمبر ۱۹۲۲ء۔

لیکن وہ بھی جب واقعہ نے ثابت کر دیا کہ لن یقدر علیہ احد (نہیں قابو چل سکتا ہے کسی کا اس) کے مقام تک نہ پہنچ سکا، اور یہ ہزار بے کسی و بے بسی وہ بھی اس کے بچے بھی۔ اس کی محبوبہ بیوی بھی اسی کے سامنے تڑپا تڑپا کر ذبح کئے گئے، تو جن مسکینوں نے خود اپنا اور اپنے عزیزوں، اپنے رشتہ داروں اور دوسرے حق داروں کا پیٹ کاٹ کاٹ کر ہزار یا لاکھ وغیرہ اعداد کی صورت میں کچھ سرمایہ جمع کر لیا ہے، کس بنیاد پر ان غریبوں سے اس کی توقع کی جا سکتی ہے کہ ہر ایک کے قابو سے باہر ہو جانے کا دعویٰ کر کے خطرات سے اپنے آپ کو محفوظ محسوس کر سکیں؟

خلاصہ یہی ہے کہ اپنی بسطی معیشت میں اللہ اور اس کی عائد کردہ ذمہ داریوں سے انحراف و اعراض کرنے والوں کو نہ تو سرمایہ کے جمع ہی کرنے میں چین کی صورت میسر آتی ہے اور نہ خرچ ہی کرنے میں "سکون" کا کوئی حصہ انھیں نصیب ہوتا ہے، دیکھا ہی جا رہا ہے، اور قرآن میں جو کچھ سنایا گیا ہے اس کا حاصل بھی یہی ہے کہ اضطراب اور بے چینی، تڑپ اور قلق، خلش اور تپش، سوز اور جلن، درد اور کرب گھٹن اور کڑھن کی سانس ان کے اندر بھی جاتی ہے اور وہی باہر بھی آتی ہے، ان ہی بدبو آتشین گرم گرم سانسوں کے ساتھ یہ جیتے بھی ہیں، اور جس دن مرتے ہیں تو آخری سانس بھی ان کی باطن کی ان ہی متعفن گندی کیفیتوں میں ٹوٹتی ہے، مرنے سے پہلے ہی قدرت کا انتقام ان کے معاشی جرائم کی

سزا ان دردناک خمیازوں کا رنگ اختیار کر لیتی ہے۔ اور اب میں تلاوت کرنا چاہتا ہوں قرآن کی اس عجیب و غریب آیت کو جس میں عالم کے ایک مشہور تاریخی سرمایہ دار کو خطاب کر کر کے کہنے والے یہ عجیب بات

ولا تنس نصیبک من الدنیا — اور نہ بھول تیرا حصہ جو دنیا میں ہے،

کہتے تھے، قارون جس کے خزانے نہیں، بلکہ قرآن ہی میں ہے کہ اس کے خزانے کی کنجیاں قوت اور زور والوں کا جتھا بہ مشقت لاد کر لے چلتا تھا، اسی قارون کو یہ مشورہ دیا جاتا تھا، جس کا حاصل یہی معلوم ہوتا ہے کہ دین تو خیر دین ہی ہے، دنیا میں جو تیرا نصیبہ اور حصہ ہے، اسے تو نہ بھول، اس سے تو لاپروائی نہ برت، جو از سرتا پا روپیہ ہی روپیہ تھا، روپیہ ہی میں ڈوبا ہوا تھا۔ روپیہ ہی میں سوتا اور اسی میں جاگتا تھا، دین میں نہیں بلکہ دنیا میں بھی اس کا جو حصہ تھا، سے بھول گیا تھا۔ کم از کم اس آیت پر جب کبھی میرا گذر ہوا، حیرت ہوتی تھی کہ آخر یہ کیا ہے؟ جس کے اندر دنیا اور دنیا کی دولت کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ اسی کے متعلق یہ کیسے باور کیا جائے کہ اسی کے حافظہ سے دنیا اور دنیا میں اس کا جو حصہ تھا وہی پھسل کر باہر نکل پڑا تھا، لیکن قرآن ہی کی روشنی میں جو کچھ اس سلسلہ میں آپ کے سامنے پیش کیا گیا ہے کیا اس کو پڑھنے کے بعد بھی اب کسی کو اس حقیقت کے متعلق خواہ وہ جتنی بھی حیرتوں اور اعجوبوں سے بھری حقیقت ہو اس کی واقعیت میں شک کی گنجائش باقی رہ سکتی ہے، جس کے پاس سب کچھ ہے۔ اسی کے پاس کچھ نہیں ہے، سب کچھ دے دیا گیا اور کچھ نہیں دیا گیا، یہی تو قدرت کا مخفی داؤ اور مکر اللہ کے طلسمی مظاہر ہیں کہ ہوتا کچھ ہے اور سمجھا جاتا کچھ ہے، دراصل اس ساری طول و طویل بحث کا مقصد سچ پوچھیے تو اسی قارونی تماشے کی نمائش تھی،

وفی ذلک ذکری لمن کان له قلب او القی السمع وهو شهید۔ — اور اس میں چونکہ ہے ان کے لئے جن کے پاس دل ہے یا جھکائی جس نے اپنی شنوائی۔ اس حال میں کہ وہ حاضر ہے،

حقیقت تو یہ ہے کہ دنیا میں جس جرم کی پکڑ اتنی سخت ہو، اگر آخرت میں قدرت کی یہی مخفی گرفت مجرموں کے سر پر اژدہوں اور سانپوں کی شکل میں آئے، اپنے مال ہی کی مختلف بھیسوں سے اسے کچلا جائے اور روندا جائے، جیسا کہ صحیح حدیثوں میں آیا ہے، تو اس پر تعجب نہ کرنا چاہیئے، بلکہ حدیثوں میں جو کچھ آیا ہے۔ میرے نزدیک تو وہ بھی قرآنی آیت

ولا یحسبن الذین یبخلون بما اتاهم الله من فضله هو خیرا لهم بل هو شر لهم سیطوقون — اور ہرگز ہرگز نہ خیال کریں وہ لوگ جو بخالت کرتے ہیں ان چیزوں میں جو دے رکھی ہے اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنے فضل سے کہ یہ بات (یعنی بخالت) بہتر ہے ان کے لئے بلکہ بری ہے یہ ان کے لئے

بما بخلوا به یوم القیمة (آلِ عمران)	قریب ہے طوق ڈالا جائے ان کو ان چیزوں کا جس کے ساتھ وہ بخالت کرتے تھے قیامت کے دن۔

کے آخری جز "سیطوقون ما بخلوا به یوم القیمة" (یعنی جس چیز کے ساتھ انھوں نے بخل کیا تھا، اسی کا طوق ان کے گلوں میں ڈالا جائے)[1] کے تفصیلات اور اخروی تشکلات ہیں۔ میرے سامنے چوں کہ اس وقت اخروی انتقام اور ان کی تفصیلات نہیں ہیں، اس لئے مناسب ہوگا کہ ان حدیثوں کا مطالعہ کتابوں میں کرلیا جائے۔ جن کے ترجمے بھی اردو زبان میں ہوچکے ہیں۔ اس وقت تو میں صرف یہ دکھانا چاہتا ہوں کہ دنیا ہی میں جس جرم کے نتائج ان بھیانک شکلوں میں سامنے آتے ہوں، اندازہ کرنے والوں کو اندازہ کرنا چاہئیے کہ آخرت میں ان کا حال کیا ہوگا، اللہ کے پیغمبروں، بنی آدم کے خیر خواہوں، بلکہ درحقیقت خود ارحم الراحمین نے کتنا بڑا کرم اور احسان کیا ہے کہ واقع ہونے سے پہلے لوگوں کو نتائج وعواقب سے آگاہ کر دیا گیا ہے تاکہ چونکنے والے چونک جائیں، ایسا نہ ہو کہ ان کو بھی وہی کہنا پڑے جو بالآخر کہنے والوں کو بہرحال وہی کہنا پڑتا ہے، جیسا کہ قرآن ہی میں ہے،

حتیٰ اذا جاء احدھم الموت	تا آں کہ جب آگئی ان پر موت تو
قال رب لولا اخرتنی الی اجل	کہا کہ میرے پروردگار! کیوں نہ مہلت
قریب فاصدق واکن	دی آپ نے کسی قریب زمانے تک
من الصالحین۔	تو پھر میں صدقہ کرتا اور ہوجاتا میں سلجھنے والوں میں۔

مدت ہوئی خبار "پیج" میں چھپا تھا۔ امالیہ کے مشہور کروڑپتی گوستپ لوگی نی کے متعلق کہ دولت کے متعلق "جمع" کی تدبیروں پر عمل کرنے کے بعد کروڑوں روپے کا جب وہ مالک ہوگیا، اور کومونامی جھیل کے کنارے ایک رشک ارم کوٹھی بنا کر چاہا تھا کہ اب اطمینان کی سانس اپنی اس فردوسی کوٹھی میں لے۔ لیکن اچانک

---

[1] صحیح بخاری و مسلم نیز صحاح ستہ کی صحیح حدیثوں میں آیا ہے کہ جنت و دوزخ میں جانے سے پہلے میدان حشر کے اس اجتماع عظیم میں اپنے سرمایہ کے متعلق اجتماعی ذمہ داریوں کے ادا کرنے سے گریز کرنے والے اپنے آپ کو پائیں گے کہ "مار شجاع اقرع زبیتان یطوقہ یوم القیمة یاخذ بلھزمتیہ یعنی شدقیہ ثم یقول انا مالک انا کنزک" ان کا مال ایک ایسے سانپ کی شکل میں ہوگا جس کا سر بالکل چکنا ہوگا اور جس کے چہرہ پر دو سیاہ سیاہ نشان ہونگے، لپیٹ پڑیگا ان ہی بخیلوں کی گردنوں سے اور ان کے دونوں جبڑوں کو پکڑے گا کہے گا میں ہوں ترا مال میں ہوں ترا خزانہ (خزانہ) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بیان فرما کر اس آیۃ کو تلاوت فرماتے جس کا میں نے ذکر کیا۔ انھی حدیثوں میں ہے کہ اونٹوں اور دوسرے مویشیوں کی زکوٰۃ ادا نہ کرنے والوں پر قیامت کے دن ان ہی جانوروں سے انھیں روندا جائیگا۔ یہ بھی ہے کہ سونے اور چاندی کی تختیاں آگ میں تپائی جائیں گی اور ان ہی لوگوں کے پہلو اور پیشانیاں، ان کی پیٹھیں ان ہی تپائی ہوئی تختیوں سے داغی جائیں گی یہ مدت ان لوگوں کو اتنی دراز محسوس ہوگی کہ موجودہ دنیا کے وقت کا جو پیمانہ ہے اس کے حساب سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پچاس ہزار سال اس کی مدت بیان کی ہے۔ اعاذنا اللہ والمسلمین منہ ۱۲

دیکھنے والوں نے دیکھا کہ اسی کوٹھی کی ایک چھت میں پھانسی پڑی ہوئی، اس کی لاش لٹکی ہوئی ہے! اور لاش کے نیچے اسی کے ہاتھ کا لکھا ہوا یہ رقعہ پڑا ہوا ہے، جس کا لفظی ترجمہ یہ ہے۔

"مجھے اپنی طویل زندگی میں تجربہ ہوگیا کہ راحت کی تلاش اگر ہے تو روپے کے ڈھیروں میں وہ نہیں ملتی، میں اپنی زندگی کا خاتمہ کر رہا ہوں، اس لئے کہ تنہائی اور افسردگی سے میں عاجز آگیا ہوں۔ جس وقت نیویارک میں میں معمولی مزدور تھا، اس وقت مجھے مسرت حاصل تھی۔ لیکن آج کروڑوں کا مالک ہوں، مگر میری افسردگی کی انتہا نہیں، اور ایسی زندگی پر میں موت کو ترجیح دیتا ہوں۔"

اور یہ کوئی نادر واقعہ نہیں ہے "کارنیگی" امریکہ کے ارب پتی کا یہ قول گذر چکا کہ

"لاکھ پتی آدمی مسکرا نہیں سکتا"

راک فیلر کے بیان کا بھی کہیں ذکر آیا تھا کہ "سب سے بڑا مفلس وہی ہے جسے روپے کے سوا اور کچھ نہ دیا جائے۔" اسی اخبار سچ ہی میں یہ خبر بھی شائع ہوئی تھی، جیمس وہائٹ نامی انگلستان کے نامور رئیس تھے، مولٰنا عبدالماجد صاحب دریا آبادی (مدیر سچ) نے ان کا تعارف کراتے ہوئے لکھا تھا کہ ملک (انگلستان) کے نامور امراء میں ان کا شمار تھا، بڑے ذہین اور طباع مشہور تھے۔ ان کی سوجھ بوجھ کا لوگ لوہا مانتے تھے، حالت یہ تھی کہ آج ایک تھیٹر کھول کر لاکھوں لاکھ کا ڈھیر لگا دیا۔ کل روئی کے کارخانے جاری کرکے روپے کا انبار لگا دیا، پرسوں گھوڑدوڑ کی بازیوں میں بازی لگا کر لاکھوں لاکھ جیت لیا۔ ایک روز ربر کے ٹائر کی فیکٹری کے مالک ہوگئے، دولت و ثروت فہم و فراست کے ساتھ سوسائٹی میں گھلنے ملنے کا بھی بڑا شوق رکھتے تھے، شاہی خانوادے تک رسائی تھی۔ الغرض جمع ہی نہیں بلکہ عدو املاک یعنی اس راہ کے ہر سلسلے کے ماہر و شاطر تھے، لیکن ہوا کیا؟ مولٰنا ہی رقم فرماتے ہیں،

ایک دن جب انگلستان میں ٹھیک سورج گرہن کا میلہ لوگ منا رہے تھے۔ دیکھا گیا کہ بند کمرے میں سانس سے خالی ان کی لاش پڑی ہوئی ہے۔ سرہانے ایک تحریر بھی تھی جس میں لکھا تھا۔

(ترجمہ یہ ہے)

"موت کے دروازے پر قدم رکھتے وقت اپنے آخری مضمون میں اس شخص کے نقطۂ نظر سے موجودہ تمدنی زندگی پر تبصرہ کروں گا جو سفر آخرت پہ رواں ہو رہا ہے، میں نے بادشاہوں تک کی میزبانی کی ہے۔ بڑے بڑے امراء اور والیانِ ریاست سے میری بے تکلفی کا یارانہ رہا ہے، سیاسیات کے حلقہ میں بھی رہا ہوں۔ ایک تھیٹر کا مالک بھی رہا ہوں، ایک ایک دن میں ساڑھے سات سات لاکھ پونڈ (گویا ایک کروڑ بیس لاکھ) کی

دولت کمائی ہے، اخبارات کا حصہ دار رہا ہوں، گھوڑدوڑ کی بازی میں ایک
ایک لاکھ پونڈ جیتتا رہا ہوں، مانچسٹر تک اپنی اسپیشل ٹرین پر گیا ہوں ۔
اس لئے موجودہ تمدنی زندگی پر رائے دینے کا حق رکھتا ہوں؛
آج میں اپنی زندگی کے آخری دن جب کہ ماضی کے سارے
نقشے جلدی جلدی میرے پیشِ نظر ہو رہے ہیں، مجھے نظر آ رہا ہے :
موجودہ تمدن بجز حرص و خواہش نفسانی حبّ جاہ کے
اکھاڑے کے اور کچھ نہیں ہے، جذباتِ عالیہ اور قناعت اب خواب و
خیال میں ہیں، اور ان کی بجائے ایک نفرت انگیز ہنگامہ برپا ہے :
ایک طرف شہوتِ جاہ، شہوتِ زر، شہوتِ زن کا زور ہے، دوسری
طرف بوشویک دنیا تخلیق جدید کے خبط میں مبتلا ہے، ہر شخص پر دھن
سوار ہے کہ محنت کم کرے اور روپیہ زیادہ لے اور گلچھرے خوب
اڑانے کو ملیں؛ زرپرستی کی اس شدت کو دیکھ کر روح لرزاٹھتی ہے
دل دھڑک رہا ہے، میں خدا کے آگے جھکتا ہوں، میں اسی سے لو لگاتا
ہوں، میں قماربازی کی معصیت میں مبتلا رہا ہوں، اس کی سزا مجھے
ملنی چاہیئے۔" (سچ ۳۔ جولائی ۱۹۲۶ء بحوالہ سنڈے اکسپرس)

میں سمجھتا ہوں کہ جو کچھ آپ کے سامنے اب تک پیش کیا جا چکا ہے یہ آیت قرآنی

ومن اعرض عن ذکری فان له	اور جو کترایا میری یاد سے تو اس کے لئے
معیشة ضنکا۔	ہے ضیق اور تنگی سے بھری ہوئی معیشت

کی مشاہداتی اور تجربی تفسیر کے لئے کافی ہے، سچ تو یہ ہے کہ ذکر اللہ سے انحرافی زندگی جس نقد انتقام کے تجربات کو آئے دن پیش کرتی رہتی ہے، جس پر گذرتی ہے وہی نہیں، بلکہ دوسروں کو بھی اندرونی کشمکش کے ان نتائج و آثار کے مشاہدہ کرنے کا بسا اوقات موقعہ ملتا رہتا ہے جن میں بظاہر سکھ اور درحقیقت سراسر دکھ بھری زندگی رکھنے والے لوگ مبتلا رہتے ہیں، وہی جنھیں اونچے اونچے بنگلوں، طرح طرح کے گملوں، پرشوکت سواریوں کے درمیان خدم و حشم کے جھرمٹوں میں بھی

زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے

یا ؎

غضب کی الجھنیں ہیں زندگی بس بسر میں باز آیا باطمینان دم لینے کی بھی فرصت نہیں ملتی

اور اسی قسم کے اشعار پر سر دھنتے پایا گیا ہے، جن کی نگاہوں میں غالب شاعروں میں صرف اس لئے بڑا شاعر ہے کہ ؎

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

یا

غمِ ہستی کا اسدؔ کس سے ہو جز مرگ علاج — شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

جیسے اشعار میں وہی بات کہہ دی ہے جو ان کے دل میں تھی، اکبرؔ مرحوم کے ایسے اشعار مثلاً

غریب اکبرؔ کے گرد کیوں ہیں، جناب واعظ کوئی کہہ دے
اسے ڈراتے ہو موت سے کیا، وہ زندگی ہی سے ڈر چکا ہے

یا

اپنی مرضی کے مطابق دہر کو کیونکر کروں — مجھ کو بے حد غصہ آتا ہے مگر کس پر کروں

سن کر ہمیشہ تڑپتے اور پھڑکتے ہی دیکھا گیا ہے، جس کی وجہ اس کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے کہ جو کچھ ان کے اندر ہو تا ہے۔ اسی کی غمازی یہ اشعار کر رہے ہیں۔ آج بھی کسی کو شوق ہو "نظریۂ ابتلائیت" سے لاپروا ہو کر بسطی معیشت رکھنے والوں کا تجربہ ان اشعار کو سنا کر وہ کر سکتا ہے۔ کسی مجلس میں جہاں اس طبقہ کے لوگ جمع ہوں، آپ مذکورہ بالا اشعار یا اسی مفہوم کو دوسرے شاعروں نے بکثرت اپنے شعروں میں ادا کیا ہے۔ انہیں سنائیے اور پھر دیکھئے تماشا۔ دیکھئے کہ اپنے دل کے حالات کا آئینہ ان حرکات و سکنات کو کس طرح بنا رہے ہیں جو ان اشعار کے سننے کے بعد ان پر طاری ہوتے ہیں۔

البتہ یہاں ایک سوال ہوتا ہے اور بجا سوال ہے کہ قدرت کے ان نقد خمیازوں کو بھگتنے اور بھگتتے رہنے کے باوجود پھر یہ کیا ہے کہ ان میں کوئی بھی بسطی معیشت سے بھی دستبردار ہونے کو تیار نہیں ہے، اور نہ انحرافی طریقۂ عمل کو ترک کر کے بازگشت پر کوئی آمادہ نظر آتا ہے اگر واقعی ان ہی کلفتوں اور سوزشوں میں ان کی زندگیاں جلتی اور بھنتی رہتی ہیں۔ تو ایسی کونسی چیز ہے جو انھیں اندر ہی اندر پکڑے رہتی ہے، سب کچھ کہتے ہیں، سب کچھ سنتے ہیں، عقل رکھتے ہیں، ہوش رکھتے ہیں، حواس رکھتے ہیں، جب چاہیں پلٹ سکتے ہیں، پھر سکتے ہیں، پھر وہ کیوں نہیں پلٹتے، کیوں نہیں پھرتے؟

اب میں اس کا جواب کیا دوں، حالانکہ پڑھا جاتا تو قرآن ہی میں اس کا جواب بھی مل سکتا تھا، لیکن مصیبت یہ ہے خصوصاً اس زمانے کی سب سے بڑی مصیبت یہ ہے کہ جن ان دیکھے اسباب و علل کو بتانے کے لئے پیغمبر آئے تھے، ان ہی ان دیکھی باتوں کو دلیل بنا کر پیغمبروں کی پیغمبری اور انبیاء کی نبوتوں میں شک اندازی کی جا رہی ہے، طبیب کے پاس مریض اسی لئے تو جاتا ہے کہ مرض کے جن اسباب کا پتہ اسے نہیں چل رہا ہے، طبیب سے ان کا علم حاصل کرے! اور اسی کے مطابق طریقۂ علاج اختیار کرے۔ لیکن مرض کے جن مخفی اسباب کی طبیب نشاندہی کر رہا ہو، مریض اگر ان ہی مخفی اسباب کو دلیل بنا کر طبیب کی طبابت ہی کا انکار کرنے لگے کہنے لگے کہ اپنے مرض کے جن اسباب کو میں جانتا ہوں چونکہ ان اسباب کی تم نشاندہی نہیں

کررہے ہو، یعنی جو کچھ میں جانتا ہوں وہی چونکہ تم نہیں بتا رہے ہو، اسی لئے تمہارے طبیب ہی ہونے پر مجھے بھروسہ نہیں، بتائیے کہ اس قسم کے مالی خولیا رکھنے والے مریضوں کا علاج دنیا کا کوئی طبیب کرسکتا ہے؟

حواس اور عقل کی راہوں سے جن چیزوں تک آدمی کی رسائی ممکن نہ تھی، ان ہی چیزوں کے بتانے اور ان ہی کا علم دینے کے لئے تو خدا نے نبوت اور وحی کی نئی راہ کھولی تھی، لیکن کہنے والوں کو اگر اس پر اصرار ہو کہ ہم وہی اور صرف وہی مانیں گے جسے ہم پہلے سے جانتے ہیں، تو آپ ہی بتائیے کہ ایسے ذہنی اختلاط کے مریضوں کے لئے پیغمبروں کی پیغمبری اور نبیوں کی نبوت ہی کی کیا ضرورت باقی رہ جاتی ہے؟

یہی سوال ہے، کتنا اچھا، کتنا معقول سوال ہے، دکھ اور دکھ کے ... سے انسان فطرتاً بھاگتا ہے، انحرافی زندگی اگر دکھ ہے تو چاہئے تھا کہ آدمی اس سے بھاگتا، لیکن بھاگنے کا کیا، دیکھا تو یہ جاتا ہے کہ بڑھنے والوں کا غلو دن بہ دن اس میں بڑھتا ہی چلا جاتا ہے، ننّو کے حلقوں میں جکڑنے والے کوشاں رہتے ہیں کہ ہزار حلقوں والی زنجیریں ان پر چڑھا دی جائیں یوں ہی ہزار والے لاکھ کی اور لاکھ والے جہاں تک جاسکتے ہیں، جانے میں قطعاً کمی نہیں کرتے یہ بھی کہتے ہیں کہ لکھ پتی کبھی مسکرا نہیں سکتا، لیکن جو لکھ پتی ہیں وہ کروڑ پتی بننے کے لئے اور کروڑ پتی ارب پتی بننے کے لئے بے چین نظر آتے ہیں، پھر یہ قصہ کیا ہے؟

اب آپ مانئے یا نہ مانئے۔ لیکن قرآن ہی میں اسی ذکر اللہ سے انحراف کی پاداش میں اس دوسری مخفی سزا کا جو ذکر کیا گیا ہے، یعنی ارشاد ہے۔

ومن یعش عن ذکر الرحمٰن	اور جو آنکھیں چراتا ہے رحمٰن کی یاد سے
نقیض لہ شیطٰنا فھو لہ قرین	تو پیچھے لگا دیتے ہیں ہم اس کے ایک
(زخرف ع ۴)	شیطان کو، پھر وہ اس کا ساتھی بن جاتا ہے

اور یہ ہے درحقیقت "ضنکِ معیشت" اور تلخ زندگی کے پھل کا وہ مخفی غیر مرئی درخت جس کے پھل کا مزہ تو ان میں سے ہر ایک کو چکھنا ہی پڑتا ہے جن کی زندگی، ذکر اللہ سے کٹ کر گزرتی ہے، اب آپ ہی بتائیے کہ درخت ہی جب تک اکھاڑا نہ جائے گا، پھل کے پھینے کو کون روک سکتا ہے، کیسے روک سکتا ہے، اور انسانی فطرت کے جگر میں جڑ قائم کرنے والا یہی وہ درخت ہے جس کے اکھاڑنے اور نکالنے کی کوئی شکل اس کے سوا نہیں ہے کہ جس چیز کی حرارت سے وہ مرجھاتا ہے، مرجھا کر گرتا ہے، گرنے کے بعد خود بخود اس کی جڑ نکل جاتی ہے، اسی حرارت کے مہیا کرنے کا سامان کیا جائے۔

جو نہیں جانتے کہ خود میں کیا ہوں، وہی پوچھتے ہیں کہ یہ "الشیطان" آخر کیا بلا ہے، خدا جانے دینے والے اس کا کیا جواب دیتے ہیں، لیکن میں تو سمجھتا ہوں کہ وہ بیچارا کچھ نہیں ہے، صرف قدرت کا ایک انتقامی تازیانہ ہے، پیدا کرنے والے نے انسان کو جس نصب العین کی تکمیل کے لئے زمین کے

اس کرہ پر بسایا ہے۔ جو جس حد تک اس قدرتی نصب العین سے ہٹتا ہے۔ نہ رکنے والے کوڑے کی شکل میں وہی ان پر برستا ہے، برستا چلا جاتا ہے، ٹھیک جیسے بل سے نکلنے والے چوہے کو بلی دبوچ لیتی ہے، اپنے نصب العین سے ہٹنے والوں کو الشیطان بھی اسی طرح دبوچ لیتا ہے، اس کو اسی لئے بنایا گیا ہے، یہی اس کا کام ہے، ایک جگہ نہیں قرآن میں مختلف مقامات میں

ان عبادی لیس علیهم سلطان	میرے بندوں پر تجھے قابو حاصل نہیں۔
کے اعلان کے ساتھ اس کو حکم دیا گیا ہے۔	
واجلب علیهم بخیلک ورجلک	اور چڑھا ان پر (آدمی کی) اولاد
وشارکهم فی الاموال	اپنے سوار اور پیادوں کے ساتھ،
والاولاد وعدهم وما	ساجھی بن جا ان کے مالوں اور اولاد
یعدهم الشیطان	میں، اور وعدے دے ان کو وعدے
الا غرورا۔	ان کو، اور نہیں وعدے کرتا ہے ان سے
شیطان مگر صرف فریب۔	

"الاولاد" کے ساتھ "الاموال" میں جن لوگوں کے وہ ساجھی اور شریک بن جاتا ہے، یقین مانئیے کہ ان ہی مسکینوں کو "دخل" کی شکل میں ہو، یا "خرچ" کی راہوں میں، ہر حال میں ان ہی مغشی احساسات میں مبتلا کرتے ہوئے وہ گھسیٹے لئے چلا جاتا ہے، جن کی تفصیل قرآن کے حوالہ سے گزر چکی، انحرافی زندگی گذارنے والوں کو اس حال میں جو دیکھا جاتا ہے کہ چیختے بھی جاتے ہیں، چلاتے بھی جاتے ہیں۔ جلتے بھی جاتے ہیں اور گھٹتے بھی جاتے ہیں، لیکن اسی کے ساتھ بڑھتے بھی جاتے ہیں چڑھتے بھی جاتے ہیں۔ تو درحقیقت وہ خود نہیں بڑھتے، خود نہیں چڑھتے، قرآن کی روشنی میں دیکھئے اس شیطان کو جو انھیں دبوچے ہوئے بڑھاتا اور چڑھاتا جاتا ہے۔ اسی موقعہ پر شیطان کی زبانی قرآن میں یہ الفاظ نقل کئے گئے ہیں کہ اس نے آدم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا لاحتنکن ذریته (میں ڈھاٹی لگاؤں گا اس کی اولاد کو) گدھوں اور گھوڑوں کے منہ پر بجائے لگام کے لوگ رسی باندھ کر کبھی کھینچتے ہیں۔ اسی کو اردو میں ڈھاٹی اور عربی میں احتناک کہتے ہیں، بہار میں تھوتھری لگانا کہتے ہیں۔ یعنی جیسے گدھوں اور گھوڑوں کو تھوتھری لگا کر لوگ لے چلتے ہیں جو گدھوں اور گھوڑوں کی تذلیل کی شکل ہے۔ شیطان نے بھی دعویٰ کیا کہ انھیں گھسیٹوں گا اور ذلت کے ساتھ گھسیٹوں گا! گھسٹنے والوں کا یہ تماشا کتنا دردناک ہے، گویا وہی مثل ان پر صادق آتی ہے کہ کمبل کو یہ نہیں چھوڑتے، ... بلکہ کمبل ہی انھیں نہیں چھوڑنا چاہتا۔ جب تک کہ وہی بڑھ کر اس پر نہ ہو کہ

جائے جس کے سوا دنیا کے کسی جھاڑ او پھونک کو وہ نہیں سنتا[1]، صحیح حدیثوں میں آیا ہے،

اذا ذکر اللہ خنس — جب آدمی اللہ کو یاد کرتا ہے تب ہی وہ پیچھے سرک جاتا ہے۔

ورنہ جب تک یہ نہیں ہے، اس کا کام ہی یہ ہے کہ جن چیزوں میں درحقیقت غنا بخشی کی قوت نہیں ہے باور کرائے کہ وہی آدمی کو غنی بناتی ہے، خلود بخشی کی خاصیت سے جو واقع میں محروم ہے، دھوکہ دیتا رہتا ہے کہ وہی خلود بخش ہے، جن اعمال و افعال کا بالآخر کوئی نتیجہ نہیں، باور کراتا رہتا ہے کہ وہی نتیجہ خیز ہیں، جس راہ پر چلنے والوں کو کچھ نہیں ملتا، سکھاتا رہتا ہے کہ سب کچھ اسی راہ میں ملتا ہے، الغرض جو ہے، شیطانی تسئیط کے بعد نظر آتا ہے کہ وہی نہیں ہے، اور جو نہیں ہے، عجیب بات ہے کہ آدمی دیکھتا ہے اور یقین کرتا ہے کہ وہی ہے، یہی ترجمہ ہے، آیت کریمہ قرآنیہ

وما یعدھم الشیطٰن الا غرورا — اور نہیں وعدہ کرتا ہے ان سے شیطان لیکن صرف فریب اور دھوکہ۔

کا، اور اب سمجھ میں آتا ہے اس کا مطلب کہ وہی قرآن وہی اسلام جس کی تعلیم ہو کہ زمین اور زمین میں جو کچھ ہے، بلکہ آسمان و زمین اور اس کے درمیان جو کچھ ہے، خدا نے سب کو انسان ہی کے لئے بنایا ہے، اسی قرآن میں

وما الحیوۃ الدنیا الا متاع الغرور — اور نہیں ہے یہ پست زندگی، لیکن صرف سرمایۂ فریب۔

اور ان جیسی آیتوں کو بھی جو پایا جاتا ہے تو ان کا کیا مطلب ہے؟ حالانکہ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان آیتوں میں اسی نظریہ کو دہرایا گیا ہے، جس کے ماننے والوں نے دنیا اور دنیا کی چیزوں کو مایا اور مایا کا جنجال قرار دیا ہے، بہتوں کو دونوں نظریوں میں تناقض نظر آتا ہے، بلکہ دیکھا جاتا ہے کہ اسلام کی تشریح و تفصیل کرنے والوں میں دو مستقل گروہ پیدا ہو گئے ہیں جو اسلام کو دنیا کا بھی ایک معاشی نظام قرار دینا چاہتے ہیں، وہ تو اس قسم کی آیتوں، حدیثوں کے ذکر سے پرہیز کرتے ہیں

---

[1] مسلمانوں میں بعض چیزیں کچھ ایسے طریقے سے مشہور ہیں کہ ان کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ علاج اور علاج کے طریقوں کا تو سب ذکر کرتے ہیں، لیکن یہ بات کہ یہ علاج ہے کس مرض کا، اس سے بہت کم لوگ واقف ہیں، یہی ذکر اللہ کا مسئلہ ہے۔ اسلامی تصوف کا سارا دار و مدار اسی کثرتِ ذکر پر ہے، صوفی کہتے ہی اسی کو ہیں جو کسی حال میں ذکر اللہ سے غافل نہ ہو، اور اسی دوام ذکر کی کیفیت کو حاصل کرنے کے ارباب تصوف نے بے شمار طریقے ایجاد کئے ہیں، لیکن یہ سوال کہ ہر وقت ہر حال میں خدا کے ذکر کی آدمی کو ضرورت ہی کیا ہے؟ اس کی طرف کم توجہ کی جاتی ہے۔ حالانکہ دوسرے فوائد کے سوا ذکر اللہ کا سب سے بڑا فائدہ اسی تسئیط شیطان کے مرض کا ازالہ ہے، اس کا واحد علاج ہی یہ ہے ۱۲

اور جن پر دینی جذبہ کا غلبہ ہے وہ ان ہی آیتوں کو پیش کر کر کے ان کے خیال کی تردید کرتے ہیں، حالانکہ نہ وہ غلط ہے اور نہ یہ غلط ہے، لینے والوں میں دنیا اور دنیا کی پیداواروں کو جو ابتلائی ذمہ داریوں کے ساتھ لیتے ہیں، اور ٹھیک وہی مثال جو پیغمبر سے بخاری وغیرہ حدیث کی کتابوں میں مروی ہے اسی کو اپنی بسطی زندگی میں دستور العمل بناتے ہیں، ان کی یہی دنیا آخرت کی تعمیر کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ اس حدیث کے ایک جز کا پہلے بھی ذکر آیا ہے، یہاں پوری حدیث نقل کی جاتی ہے، ابو سعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں،

جلس النبی صلی اللہ علیہ وسلم علی المنبر وجلسنا حوله فقال ان مما اخاف علیکم بعدی ما یفتح اللہ علیکم من زھرة الدنیا وزینتها فقال رجل او یاتی الخیر بالشر یا رسول اللہ فسکت عنه فقالوا ما شانک تکلم رسول اللہ ولا یکلمک وارئینا انه ینزل علیه فافاق یمسح الرحضاء قال این السائل انفاً ان الخیر لا یاتی الا بالخیر وان ھذا المال خضرة حلوة وان مما ینبت الربیع ما تقبل حبطا او یلم الا اکلة الخضر فانھا اکلت حتیٰ اذا امتدت خاصرتاھا استقبلت عین الشمس فثلطت وبالت ثم ارتعت وان ھذا المال حلوة من اخذه بحقه ووضعه فی حقه فنعم المعونة ھو ونعم صاحب المال ھو لمن اعطی منه المسکین

تشریف لائے نبی صلی اللہ علیہ وسلم ممبر پر اور ہم بھی آپ کے ارد گرد بیٹھ گئے تب اللہ کے پیغمبر نے کہنا شروع کیا، بے شبہ جس چیز سے ڈر رہا ہوں اپنے بعد وہ وہی چیزیں ہیں جنھیں فتح کرے گا اللہ تعالیٰ تم لوگوں کے لئے دنیا کی تروتازگی سے اور اس کی زینت بناؤ سنگار سے (یعنی آئندہ اسلامی فتوحات کی طرف اشارہ فرمایا جا رہا تھا) تب کہا ایک آدمی نے اے اللہ کے رسول کیا خیر اور بھلائی کے بعد شر اور برائی آئے گی؟ (یعنی بھلائی سے کیا برائی کا نتیجہ پیدا ہوگا؟) تب چپ ہو گئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو لوگوں نے کہنا شروع کیا، رسول اللہ تو ایک بات فرما رہے تھے تجھ سے تو نہیں بول رہے تھے (جو تو نے خواہ مخواہ سوال کیا) اسی حال میں دیکھا گیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی نازل ہونے لگی (یعنی نزول وحی کے وقت جو ایک خاص حال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر طاری ہوتا تھا وہی کیفیت شروع ہوئی) پھر اس حال سے افاقہ ہوا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پسینہ پونچھ رہے تھے اور فرمایا کہ

والیتیم وابن السبیل اوکما قال صلی اللہ علیہ وسلم وان من یاخذ بغیر حقہ کالذی یاکل ولایشبع ویکون علیہم شہیداً یوم القیمۃ۔
(رواہ البخاری ومسلم والنسائی)

ابھی جس نے سوال کیا تھا وہ کہاں ہے؟ پھر فرمایا کہ اچھی چیز نہیں پیدا کرتی لیکن اچھے ہی نتائج کو (اگر جب اس کا استعمال صحیح طور پر کیا جائے) پھر فرمایا کہ دیکھو! یہ مال اور سرمایہ ہریالی میٹھی چیز ہے لیکن برساتی پرنالوں کے کنارے جو ہریالی اُگتی ہے (حالانکہ اچھی چیز ہے لیکن اس کو جب کوئی جانور زیادہ مقدار میں کھا جاتا ہے تو) وہی مار ڈالتی ہے یا قریب موت کے پہنچا دیتی ہے۔ مگر ایسی مویشیاں جو صرف ہری ہری دوب کو چرتی ہیں کہ وہ انھیں کھاتی ہیں، پھر جب ان کے دونوں پہلو برابر ہو جاتے ہیں، تو آفتاب کے سامنے دھوپ میں جاکر بیٹھتی ہیں، پھر گوبر کرتی ہیں، اور پیشاب کرتی ہیں، پھر جاکر چرتی ہیں، (اس مثال کو بیان کرکے فرمایا) یہی حال مال کا ہے، بڑا میٹھا ہے جب لینے والا اس کو حق کے ساتھ لے، اور حق ہی میں اسے خرچ کرے، تو پھر یہ بہترین امداد ہے، اور ایسا سرمایہ دار بہت اچھا آدمی ہے، یہ اپنے مال سے مسکین یتیم مسافر کو دیتا ہے بہر حال یہی الفاظ یا جیسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ اور فرمایا کہ جو اس مال کو اس کے حق کی راہ سے نہیں لیتا، اس کی مثال ایسی ہے کہ کھائے جاتا ہے لیکن پیٹ اس کا نہیں بھرتا اور قیامت کے دن یہی مال اس کے خلاف گواہ بن جائے گا۔

آپ نے دیکھا اسلام کے نقطۂ نظر کو، وہی مال اور وہی سرمایہ جس سے عموماً مذہبی مزاج والوں نے ہمیشہ نفرت ہی کا اظہار کیا ہے۔ لوتھر کا دین حالانکہ سمجھا جاتا ہے کہ روشن خیالی کا دین تھا۔ لیکن چونکہ بہر حال وہ دین ہی تھا، اس لئے مُخَیِّثہ گدھوں کے خطاب سے زیادہ لوتھر کو بھی ہمت نہ ہوئی کہ کسی اور نام سے ان دولتمندوں کو موسوم کرے جن کے متعلق انجیل میں خبر دی گئی تھی کہ سوئی کے ناکے سے اونٹ کا گذرنا اس سے زیادہ آسان ہے کہ آسمانی بادشاہت میں دولتمندوں کو گھسنے کی اجازت دی جائے۔ لیکن اسلام اسی دولت اسی سرمایہ اور مال کو خیر کہتا ہے اور یہ کہ بجائے خود وہ قطعاً شر نہیں ہے، البتہ شریروں کا غلط استعمال اس کو "شر" بنا دیتا ہے، یہی حاصل ہے مذکورہ بالا احادیث کا بلکہ سچ پوچھئے تو جو کہتے ہیں کہ سب کچھ یہیں ہے، یہاں کے سوا کہیں بھی کچھ نہیں ہے، قرآن میں

لم یرد الا الحیوۃ الدنیا

نہ مقصود بنایا اس نے لیکن صرف اسی پست زندگی کو۔

یا

ضل سعیھم فی الحیوۃ الدنیا

یا کھوئی ان کی سرگرمیاں اسی پست زندگی میں

وغیرہ الفاظ میں جس مسلک کی تعبیر کی گئی ہے، یعنی وہی مسلک جو آج مغربی اقوام و ملل اور ان کے طفیلیوں کی اکثریت پر مسلط ہے، یعنی پیٹ اور روٹی والا خالص مادی نظریہ اور جنھیں اسی کے بالمقابل جو یہ کہتے ہیں کہ "کچھ بھی یہاں نہیں ہے" یا جو کچھ بھی ہے بھوگنے کے لئے نہیں بلکہ بھاگنے اور صرف بھاگنے کے لئے ہے، جس کا ذکر جیسا کہ گذر چکا، قرآن میں

رھبانیۃ ابتدعوھا — رہبانیت کا مسلک جسے تم نے ایجاد

کیا — کتبنا ھا علیھم۔ — واجب نہیں ٹھیرایا تھا۔

کے الفاظ میں کیا گیا ہے۔ الغرض مادیت اور روحانیت ان دونوں افراطی و تفریطی متناقض نظریات کے درمیان حسب دستور بجائے ازالہ کے اپنی پرانی تدبیر امالہ سے کام لے کر اسلام نے انسانی فطرت کو اس کی وہ کھوئی ہوئی چیز عطا کر دی، جسے پیغمبروں کی تعلیم سے ہٹنے کے بعد وہ ہمیشہ کھو بیٹھتی ہے۔ الخیر لا یاتی الا بالخیر (اچھی چیز نہیں پیدا کرتی، لیکن اچھے ہی نتائج کو) یہی وہ پیغمبرانہ فقرہ ہے جس میں وہ سارا مضمون سمٹ کر آ گیا ہے جسے اب تک تسلی زندگی اور اس کی ذمہ داریوں کی تفصیل میں آپ کے سامنے پیش کیا گیا ہے، دولت اور سرمایہ سے جب غلط نتائج کا تجربہ لوگوں کو ہوتے رہے اور تاریخ کا کونسا دور ہے جس میں سرمایہ اور مال کے ان تلخ نتائج کی تلخیاں لوگوں کو نہ چکھنی پڑی ہیں، آج بھی یہی ہوا ہے، ہو رہا ہے، اور کل بھی یہی ہوا تھا، ہوتا چلا آیا ہے، چیخنے والے جب چیخنے لگے، اور ہر تھوڑے تھوڑے وقفہ سے دنیا کو اس راہ میں چیخنا ہی پڑا ہے تو عطائیوں نے نمدے کو دیکھ کر مریض کے واویلا کو نمدے ہی کی طرف منسوب کر دیا۔ سرمایہ اور مال دولت اور ثروت کے نام سے تبرّہ بازیاں شروع ہو گئیں، اسی پر لعنتوں کے تیر، نفرتوں کی گولیوں کی بارش شروع ہو گئی، ان ہی لعنتوں اور نفرتوں نے کبھی رہبانیت و کلبیت کی شکل اختیار کی، کبھی ملک میں مزدکیت کا چولا پہن کر اسی نے سر اٹھایا، اور آج وہی اشتراکیت واشتمالیت اور ازیں قبیل مختلف "یتوں" کے بھیس میں سرمایہ داروں کو دھمکا رہی ہیں، مالداروں کو ڈرا رہی ہیں۔

لیکن انسانیت کی تشخیص و علاج کے لئے جن طبیبوں کو قدرت پیدا کرتی ہے، ان قدرتی اطبار نے سرمایہ کو نہیں بلکہ ان کو ٹوکا جو سرمایہ کو غلط طریقہ سے استعمال کر رہے تھے، ان کو سلجھایا جنھوں نے خود الجھ کر دولت سے کام لینے کے فطری طریقوں کو الجھا دیا تھا،

"قسم ہے رات کی جب وہ چھا جائے اور قسم ہے دن کی جب وہ روشن ہو
اور قسم ہے اس کی جس نے نر و مادہ (مرد و عورت) پیدا کئے"

قرآن مجید میں ان ہی عجیب و غریب قسموں اور تاریخی انقلابات کے عمیق اشاروں مرد ول اور عورتوں اور باہم ان کے تعلقات سے پیدا ہونے والے نتیجوں کے کنائی ذکر کے بعد

ان سعیکم لشتی۔ — قطعاً تمہاری کوششیں (عملی سرگرمیاں) طرح طرح کی ہیں۔

فرما کر

فاما من اعطیٰ واتقیٰ — بس جس نے دیا اور ڈرا اور الحسنیٰ

وصدق بالحسنیٰ فسنیسرہٗ — (اچھی باتوں) کی تصدیق کی تو ہم قریب

للیسریٰ۔ — ہے کہ آسان کریں گے اس پر آسان

زندگی کو۔

میں جہاں تک میں سمجھتا ہوں وہ سب کچھ کہہ دیا گیا ہے جو اس سلسلہ میں اب تک کہا گیا ہے یا کہا جا رہا ہے یا کہا جا سکتا ہے۔ "الیسریٰ" (آسان زندگی) کی ضمانت لی گئی ہے۔ ان لوگوں کے لئے جو عطائی مشوروں سے ہٹ کر قدرتی طبیبوں کے اس علاج کو اختیار کرنا چاہتے ہیں، چوں کہ ان قرآنی آیات کے متعلق جو کچھ کہنا تھا پہلے کہا جا چکا ہے، پڑھنے والوں کو چاہئے کہ پھر اسی کو پڑھیں، غور سے پڑھیں، علاج کا یہی لازوال فطری طریقہ ہے۔ فطرت کی راہوں سے ہٹ کر جو بھی چلنا چاہے گا، دکھ کے ساتھ اسے واپس ہی ہونا پڑے گا، آج نہیں تو کل اسے پچھتانا ہی پڑے گا۔ ایک کانٹا اگر نکلے گا تو دس کانٹے چبھیں گے، اگر ایک گرہ کھلے گی تو کھل کر دہی بیسیوں گرہوں کی شکل اختیار کرے گی، عارف رومی نے اپنے مثیلی بیان میں اسی مضمون کو کتنے اچھے پیرایہ میں ادا فرمایا ہے، مثنوی میں ہے:

کس بزیر دم خر خارے نہد — خر نداند دفع او بر می جہد

ایک آدمی کسی گدھے کی دم کے نیچے کانٹا چبھو دیتا ہے — گدھا کانٹے نکالنے کی تدبیر سے چونکہ ناواقف ہے اس لئے کودتا پھاندتا ہے۔

می جہد آں خار محکم تر زند — عاقلے باید کہ آں خارش کند

کودتا پھاندتا ہے اور کانٹا اور زیادہ مضبوطی سے چبھتا چلا جاتا، — یہاں ضرورت کسی عقلمند کی ہے جو اس کانٹے کو اسکے اندر سے نکال دے

خر ز بہر دفع خار از سوز و درد — جفتہ می انداخت صد جا زخم کرد

گدھا کانٹے کو نکالنے کے لئے مارے جلن اور درد کے — ٹانگوں پر رگڑ لگا کر سینکڑوں جگہ زخم پیدا کر لیتا ہے

اور آج دنیا اسی حال میں مبتلا ہے۔ انسانیت کے جسم میں جو کانٹا چبھ گیا ہے، اس کانٹے کے نکالنے کا صحیح طریقہ جن بزرگوں کو معلوم ہے، اللہ کے ان پیغمبروں سے تو بغاوت اختیار کی گئی ہے، اور کوشش کی جا رہی ہے کہ ان سے بے تعلق رہ کر اس کانٹے کے نکالنے میں کامیابی حاصل کی جائے گی، لیکن مسکین گدھے کو کون سمجھائے کہ خار برآری کی اس کوشش میں بجائے نکلنے کے کانٹا اور اندر دھنستا چلا جائے گا۔ بہرحال رگڑ جو اس کانٹے کو نکالنے کے لئے گدھا لگائے گا بیسیوں نئے زخم اپنے اندر پیدا کر لے گا، بقول اکبر مرحوم

جتنا پھڑکو جال کے اندر — جال گھسے گا کھال کے اندر

اور یہ تو سطحی معیشت کی ذمہ داریوں سے انحراف کے وہ نتائج جن کا ظہور علاوہ اخروی زندگی کے

اسی معیشت اور زندگی میں از روئے قرآن وحدیث اسی دنیا میں ہوتا ہے۔

قدری معیشت اور اس کی ذمہ داریوں سے انحراف کے نتائج اب میں چاہتا ہوں کہ قدری معیشت کی ذمہ داریوں سے گریز کرنے والوں کے ان نتائج کی تفصیل کروں جن کا ذکر اسلامی وثائق ونصوص میں کیا گیا ہے، تو بات یہ ہے کہ

من اعرض عن ذکری — جو کترایا میری یاددہانی سے تو اس کے لئے
فان له معیشة ضنکا۔ — معیشت ہے تنگی اور تنگیوں سے بھری ہوئی

کی قرآنی آیت میں جس جرم کی پاداش میں زندگی کو تلخ وپراگندہ بنا دینے کی دھمکی دی گئی ہے، ظاہر ہے کہ جس طرح اس کا تعلق ان لوگوں سے ہے جو بسطی پیمانے پر رزق پاتے ہیں، اسی طرح اس کے دائرے میں وہ بھی شریک ہیں جنھیں قدری پیمانے پر روزی مل رہی ہے کیونکہ مَن کا لفظ عام ہے اور ہر اس شخص کو حاوی ہے جو ذکر اللہ سے ہٹ کر اور کٹ کر جینا چاہتا ہے۔ الغرض معیشت خواہ بسطی ہو یا قدری جب معلوم ہوچکا کہ "الرزق" کا ہر حال خاص قسم کی خدائی ذمہ داریوں کا طالب ہے، تو جو ان ذمہ داریوں کو پوری کرے گا، ان کے نتائج بھی ان کے سامنے آئیں گے اور جو ان سے لاپرائی اختیار کرے گا، قدرت کے انتقامی خمیازوں سے اپنے آپ کو وہ بچا نہیں سکتا، اسی طرح

من یعش عن ذکر الرحمٰن — اور جو آنکھیں چراتا ہے الرحمٰن کی یاد
نقیض له شیطانا فهو له قرین۔ — سے پیچھے لگا دیتے ہیں ہم اس کے
شیطان کو، پس وہ ہوجاتا ہے اس کا ساتھی۔

کا قانون جیسے بسطیوں کے لئے ہے اور ذکر الرحمٰن سے اعراض کی سزا شیطانی تسلیط کی شکل میں جیسے انھیں بھگتنی پڑتی ہے۔ اسی طرح اس جرم کا ارتکاب اگر قدری معیشت والوں کی طرف سے ہوگا تو اس قدرتی تازیانے کی مار سے وہ اپنے آپ کو کیسے محفوظ رکھ سکتے ہیں، بلکہ

الشیطان یعدکم الفقر — الشیطان دھمکاتا ہے تمہیں افلاس سے
ویامرکم بالفحشاء۔ — اور حکم دیتا ہے بےحیائی کی باتوں کا۔

کی آیت جب میری تلاوت میں گذرتی ہے، تو ذہن میں یہی بات آتی ہے کہ جن بیچاروں کی آمدنی ٹھیک خرچ کے مطابق بالکل اس کے برابر برابر ہوتی ہے، یعنی خرچ کرنے کے بعد جن کے پاس کچھ پس ماند نہیں رہ سکتا، ایسوں کے لئے معیشت کے اسی رنگ کو پیش کر کر کے ہر گذرنے والے دن کو دماغ سے نکال کر الشیطان آنے والے دن کی ضرورتوں کے اندیشوں کو پیدا کر کے ان کے کلیجوں کو مستقل اور "فردا کی فکر" میں ڈال کر "امروز" کی لذتوں کو بھی ان غریبوں کے لئے تلخ بناتا چلا جاتا ہے اور یہی مطلب ہے الشیطان یعدکم الفقر کا (یعنی شیطان تمہیں محتاجی اور ناداری کی دھمکی دیتا ہے) ہے، لیکن بسطی معیشت رکھنے والوں میں اس خیال سے ڈرانے کی گنجائش چونکہ نہیں پاتا، اس لئے عموماً

"الفحشاء" اور بے حیائیوں پر الشیطان ان لوگوں کو اکساتا رہتا ہے جو بسیطی معیشت رکھتے ہیں، دیکھتا ہے کہ فقر کی دھمکی تو ان پر کارگر نہ ہوگی، تو آوارگی اور بدچلنی کی راہوں پر ان کو ڈالتا ہے، عام طور پر نوابوں، جاگیرداروں، سرمایہ داروں کا جو حال ہے کہ اپنی بسیطی معیشت کی ابتلائی ذمہ داریوں سے جب وہ بے پروا ہو جاتے ہیں، تو ان کی آمدنیوں کا بڑا مصرف بھی "الفحشاء" رہ جاتا ہے۔

بہرحال یہ تو اجمال ہے، قرآن میں اسی اجمال کے جو تفصیلات پائے جاتے ہیں، اب میں ان ہی کو پیش کرنا چاہتا ہوں، لیکن ان تفصیلات کے ذکر سے پہلے میں پھر اسی مسئلہ پر تنبیہ ضروری خیال کرتا ہوں جن کا تذکرہ پہلے بھی آچکا ہے۔

عرض کر چکا ہوں کہ قدری معیشت والوں کو جن معاشی پریشانیوں میں عام طور پر مبتلا پایا جاتا ہے، ان کا ایک حصہ تو وہ ہے، جن کی ذمہ داری بالکلیہ ان لوگوں پر عائد ہوتی ہے جو بسیطی معیشت رکھتے ہیں۔ لیکن اکل لَم کے عارضہ میں مبتلا ہو جانے کی وجہ سے قدریوں کے ان جائز حقوق کو نہیں ادا کرتے، نہیں ادا کرنا چاہتے، جو دینے والے کی طرف سے ان کے سرمایہ میں مقرر کیا گیا ہے۔

اور اکلِ لَم کا استسقائی روگ ہے بھی ایسا ناپاک روگ کہ جن پر اس کا دورہ پڑ جاتا ہے، وہ صرف یہی نہیں کہ جو آچکا ہے اسی کو پوری طاقت سے اس طور پر پکڑے رہتے ہیں کہ ایک کھیل بھی چاہتے ہیں کہ دوسروں کے منہ میں اڑ کر نہ جانے پائے، بلکہ دوسروں کے منہ کے لقموں کو بھی چھین چھین کر چاہتے ہیں کہ نگلتے چلے جائیں، خود ان ہی کے ملک ان ہی کی قوم ان ہی لوگوں پر جن میں وہ رہتے سہتے ہیں کچھ بھی گذر جائے۔ لیکن اکل لَم کے ان روگیوں کے کان پر جوں بھی نہیں رینگتی، خصوصاً جن ممالک میں آئینی پشت پناہیاں بھی اکل لَم کے ان آسیب زدوں کو میسر آجاتی ہیں تو پھر ان کے بے پناہ مظالم کا کیا ٹھکانہ ہے، آج جن کے تماشے ان ممالک میں نظر آرہے ہیں، جہاں دولت کا طوفان برپا ہے، فی کس "اوسط آمدنی" کی طلسمی تعبیروں کا جو کھیل جہاں ملک کے سادہ لوح عام باشندوں کو خوش کرنے کے لئے کھیلا جا رہا ہے۔ سنایا جاتا ہے اور یہ تھوڑے تھوڑے وقفے سے مختلف پیرایوں میں اعلان کرایا جاتا ہے کہ مثلاً ہمارے ملک کی اوسط آمدنی فی کس

"گیارہ سو اسی روپے ہیں"

اوسط نکالنے کے وقت تو اس آمدنی کو فی کس پر بٹھایا جاتا ہے، لیکن بجائے اوسط کے واقعی جو اوسط نہیں بلکہ دولت ہے، ثروت ہے، اس کی تقسیم کا وقت جب آتا ہے تو اسی گیارہ سو اسی روپیہ فی کس آمدنی رکھنے والے ملک کے عام باشندوں کے متعلق یہ خبریں بھی معلوم ہوتی رہتی ہیں کہ

"ملک میں بے روزگاروں کی تعداد ایک کروڑ بیس لاکھ ہے۔"

یہ قارون کی زمین امریکہ کا حال ہے (دیکھو رسالہ جامعہ دہلی اپریل ۱۹۳۳ء)

اور خیر امریکہ تو ایک براعظم ہے، لیکن اسی کے مقابلہ میں دنیا کے آخری کنارے کا وہ جزیرہ بلکہ جزیرچہ جس کے متعلق کہنے والے کہتے ہیں کہ صوبہ بنگال کے کسی بڑے ضلع کے رقبہ سے اس کا رقبہ زیادہ نہیں ہے، لیکن صنعت و حرفت، تجارت، سیاست و حکومت، بنکنگ اور اسی قسم کے جائز و ناجائز ذرائع سے کام لے لے کر دنیا کے اکثر حصوں کی پیداواروں کے سیلاب کا دہانہ اس وقت تقریباً اسی ملک کی طرف پھیر دیا گیا ہے، یا بقول اسی ملک کے کسی باشندے کے دنیا کی دولت کا اسپنج اس ملک والوں کو مل گیا ہے، بجائے پانی کے اسی اسپنج میں سارے جہان کے کمانے والوں کی کمائیوں کو جذب کر کر کے لوگ لے جاتے ہیں اور اسی ملک کے دریائے ٹیمز کے کنارے اسے نچوڑ دیتے ہیں، نچوڑنے کا یہ سلسلہ دس بیس سال سے نہیں بلکہ صدیوں سے جاری ہے اسی لئے فی کس کا اوسط یہاں بھی امریکہ کے برابر نہیں تو اس سے کم بھی نہیں ہے۔

میرا اشارہ جزیرہ برطانیہ اور اس کے باشندوں کی طرف ہے۔ فی کس اوسط کا حساب اور واقع میں فی کس اس مجموعی سرمایہ سے لوگوں کو کتنا مل رہا ہے جو ہر سال اس میں داخل ہوتا ہے اس سے درحقیقت واقف[۱] تو وہی حضرات ہو سکتے ہیں جن کا مشغلہ ہی اعداد و شمار کا ہی قصہ ہے، تاہم مجھ جیسے دور افتادوں کی نظر بھی اس فن کے ماہرین ہی کے بعض بیانات پر کبھی کبھی پڑ جاتی ہے، ان ہی میں سے ایک رپورٹ یہ ہے، یعنی جزیرہ برطانیہ کی آبادی جس زمانے میں بتائی جاتی تھی کہ چار کروڑ تیس لاکھ اور فی کس کے حساب سے اوسط نکالنے والے ساٹھ ساٹھ ستر ستر روپیہ فی کس کا اوسط نکالتے تھے، لیکن واقع میں دولت کی تقسیم اس ملک میں جس طریقہ سے ہوئی ہے، اس کا اندازہ اسی سے ہو سکتا ہے کہ ۱۹۲۹ء کی مردم شماری میں چار کروڑ تیس لاکھ کے باشندوں کے اس ملک میں ان لوگوں کی تعداد جو اپنی آمدنی کے اعتبار سے ملینیر (لکھ پتی) کہلاتے تھے، کروڑ لاکھ بلکہ ہزار بھی نہیں صرف پانسو تینتالیس تھی (المقتطف مصر نومبر ۱۹۳۵ء)"

---

[۱] دولت کی تقسیم 'کل لم' کے اس استبقائی دور میں اعتدال کے نقطہ سے بتدریج مخفی طور پر اندر ہی اندر ہٹتے ہوئے کہاں تک پہنچ جاتی ہے، عوام تو عوام خواص کو بھی اس کا صحیح اندازہ اس وقت تک نہیں ہوتا جب تک خونی نتائج بھیانک شکلوں میں سامنے نہیں آجاتے۔ ڈاکٹر ایف، ڈبلیو، ٹاسگ پی۔ ایچ، ڈی، ڈی لٹ وغیرہ جن کی کتاب اصول معاشیات کا ترجمہ دارالترجمہ سے شائع ہو چکا ہے، وہی لکھتے ہیں کہ یہ عدم مساوات کس حد تک ہے اور اسکے اسباب کیا ہیں، اس موضوع کے متعلق ہمارے معلومات ابھی حال تک نہایت حیرت افزا طور پر محدود تھیں ص ۲۵۲ اصول معاشیات ج ۲ جب ایسے ماہروں کے لئے اس سلسلے کی معلومات حیرت افزا طور پر محدود ہوں تو ہم جیسے ایک عامی آدمی پر اس فی کس اوسط آمدنی کے مغالطہ کا راز کیا واضح ہو سکتا ہے، ڈاکٹر ٹاسگ نے ڈرتے ڈرتے انتہائی احتیاط جس میں مصلحت بھی شریک معلوم ہوتی ہے اپنی یہ رپورٹ دی ہے کہ برطانیہ کی فی کس اوسط آمدنی کی تقسیم جس شکل میں ہو رہی ہے اس کا راز یہ ہے کہ چار کروڑ تیس لاکھ کی آبادی میں برطانوی قوم کی مجموعی آمدنی کا نصف تقریباً بیس لاکھ آدمیوں کے درمیان منحصر ہے اور باقی نصف تین کروڑ اسی لاکھ کے حصہ میں پڑتا ہے دیکھو اصول معاشیات ص ۲۵۶ ج ۲، اور اس بیس لاکھ میں بھی نصف آمدنی جس نہج پر تقسیم ہوتی ہے اس کا اندازہ ملیونیروں کی تعداد سے کیا جا سکتا ہے۔

سمجھا آپ نے کیا مطلب؟ انگلستان میں ہر سال آمدنی کی ان اَن گنت راہوں سے انسانوں کا کمایا ہوا روپیہ جو داخل ہوتا ہے، اس روپے میں سے تقریباً چودہ آنے "اکل لم" کے زور سے کل ان ہی پانچ ساڑھے پانچ سو آباد کاروں کی جیب میں گھوم گھوم کر رہ جاتے ہیں، ان کی جیبوں سے چرنے اور چگنے کے لئے یہ ملک سے باہر نکلتے ہیں اور اپنے بچوں، بچوں کے بچوں، پوتوں، پروتوں کے ساتھ پھر ان ہی کی جیبوں میں جا کر دفن ہو جاتے ہیں۔ یہی چکر ہے، صدہا سال سے اس ملک میں جس کے اندر وہاں کی دولت گھوم رہی ہے، باقی ملک کی عام آبادی پر دیہی فی کس والا اوسط جس طریقہ سے تقسیم ہوتا ہے، اس کا اندازہ بھی آپ کو اسی ملک کی معاشی رونداووں سے ہو سکتا ہے۔ جنگِ عظیم اول سے پہلے جب ہر طرف امن و امان ہی کا دور دورہ تھا، آمدنی ہی آمدنی تھی۔ آگ اور سمندر نے اس ملک کے رہنے والوں اور ان کی کمائیوں کو نگلنے کے لئے اپنا منہ نہیں کھولا تھا، اس وقت کا حال چھپوانے والوں نے اخبار میں یہ چھپوایا تھا،

> آج ہمارے ملک انگلستان کی یہ حالت ہے کہ ہر تیس آدمیوں میں ایک آدمی ایسا ضرور ہے جو اپنی قوتِ بازو سے اپنی گذر بسر نہیں کر سکتا ۔"

ایک کماتا ہے، دس کھاتے ہیں، بدبخت ہندوستان اس عارضہ میں بدنام تھا، لیکن بدنام کرنے والوں کی نیک نامیاں کیا اس سے کم ہیں۔ اور یہ حال تو جنگِ عظیم اول سے پہلے تھا، جنگ کے بعد ۱۹۲۶ء میں گننے والوں نے اپنی گنتیوں کو ان الفاظ میں مشتہر کیا تھا،

> آخری مردم شماری کے عداد کے لحاظ سے ہمارے ملک انگلستان میں ایک کروڑ (یعنی تقریباً چوتھائی آبادی) ایسی ہے جو ناداری میں بسر کر رہی ہے، اور دوسرے ایک کروڑ کی تعداد ایسی ہے جو نیم فاقہ کشی کی حالت میں اپنی زندگی کے دن کاٹ رہی ہے جو آرام و آسائش کے نام سے بھی واقف نہیں اور جس کی سسکتی ہوئی زندگی جو ہر لمحہ گویا ختم ہی ہونے کو آمادہ ہے۔"

جہاں کے عوام پر خود عوام کی حکومت ہے، جمہوریت کا سبق جو ملک سارے جہاں کو پڑھاتا پھرتا اور دنیا بھر میں اس کے برکات بانٹتا پھرتا ہے، اس کی نصف آبادی "سسکتی ہوئی زندگی جو ہر لمحہ گویا ختم ہی ہونے کو آمادہ ہے" گذار رہی تھی، اس کے نتیجہ کا آخری فقرہ یہ تھا

> یعنی ہر چار آدمیوں میں ایک آدمی ایسی حالت میں گذار رہا ہے جس میں کوئی کاشتکار اپنے مویشی کو بھی رکھنا گوارا نہ کرے۔

۷۔ مئی ۱۹۲۶ء اخبار ریچ میں انگلستان ہی کے مختلف اخباروں سے یہ معلومات فراہم کر کے اس وقت شائع کئے گئے تھے، جب تک باہر کے دشمنوں نے اس جزیرے کے باشندوں پر زبم برسائے تھے، نہ ان کے گھروں کو کھنڈر بنا کر خندقوں میں شب باشی پر مجبور کیا تھا، اف اس وقت بھی ہر چار آدمی میں خود ان ہی کا بیان ہے،

"ہم میں ایک آدمی کا حال ایسا ہے کہ گویا کوئی دھوبی اپنے گدھے کو، کوئی تیلی اپنے کولھو کے بیل کو بھی رکھنا پسند نہیں کر سکتا۔"

چار کروڑ انسانوں میں پانچ ساڑھے پانچ سو انسانوں کا لاکھ پتی ہونا اور اس کے بعد اسی چار کروڑ کی بقیہ آبادی میں ہر چار میں سے ایک کو مویشیوں، گائے بیلوں، بھیڑوں اور بکریوں سے بھی بدتر زندگی گذارنے پر کس نے مجبور کیا تھا؟ باہر کے بمب افگنوں، اور آتش باروں نے؟ یا اندر کے پانچ سو، ساڑھے پانچ سو لکھ پتیوں کے اکل لم نے؟ کتنا دلچسپ ہے فی کس کے اوسط کا یہ افسانہ جسے سُنا سُنا کر غریب ہندوستان ہمیشہ اپنے لیڈروں کی زبانوں سے دھتکارا گیا، اور ڈرایا گیا ہے،

یاد پڑتا ہے ان ہی دنوں میں عوام کے مطالبوں سے مجبور ہو کر انگلستان کی حکومت نے بھی اپنے بیت المال میں ایک حد تک "الفقراء والمساکین" کے حقوق کا جب اعتراف کیا۔ غریبوں کو کچھ امداد شاہی کہئے، یا سرمایہ داری کے خزانے سے ملنے لگی تو لقمہ دوختہ ہونٹوں کو دیکھ کر کسی مراسلہ نگار نے لکھا۔

"اب ملک میں افلاس کی وہ حالت نہیں ہے۔"

ڈیلی ہیرالڈ نے جو ان ہی لقمہ دوختوں کا اخبار ہے، اس اعلان کی اشاعت پر بپھر کر لکھا تھا،

"ہم دریافت کرتے ہیں کہ مراسلہ نگار کو کتنے گھروں کے اندر جانے کا اتفاق ہوا ہے، اسے کچھ بھی اندازہ ہے کہ اب بھی (تقسیم خیرات کے بعد بھی) کتنے گھرانے ایسے ہیں جن کا گذر زیادہ تر محض روٹی اور چار پر ہے، بجائے مکھن کے جو چربی پر بسر کرتے ہیں، جنھیں گوشت اور سبزی (بجز آلو) کے کبھی دیکھنی بھی نصیب نہیں ہوتی۔"

ڈیلی ہیرالڈ کا یہ بیان اس وقت کا نہیں ہے جب انگلستان میں راتب بندی کا نفاذ ہو چکا تھا جنگ عظیم ثانی سے پہلے کا یہ قصہ ہارنے والے جرمنی کا نہیں، جیتنے والے، بلکہ مقبوضات بڑھانیوالے انگلستان کا ہے، سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ تین پیسے یا کچھ کم اسی قسم کے چند پیسوں کی اوسط آمدنی رکھنے والے ہندوستان کو کس بُنیاد پر شرماتے، اور آن دلاتے تھے، جھونپڑوں والا ہندوستان سن لے کیسل اور پیلس والے انگلستان کا حال ایک

"شہر گلاسگو میں چودہ ہزار مکانات ایسے ہیں جو صرف ایک کوٹھری پر شامل ہیں، اور ہر کوٹھری میں چار چار پانچ پانچ چھ چھ آدمی رہتے ہیں، تیس ہزار مکانات دو دو کوٹھریوں پر شامل ہیں، اور ان میں سات سے بارہ تک گذر کرتے ہیں۔"

یہ بیان دیا تھا، جناب مسٹر لائڈ جارج صاحب سابق وزیر اعظم دولتِ انگلشیہ آکسفورڈ میں پہنچ کر، اس لئے یہ اعداد و شمار فراہم کئے تھے کہ ووٹوں کی تعداد میں اضافہ ان ہی اعداد کے پیش کرنے ہی سے ہو سکتا تھا اور گلاسگو تو بہر حال گلاسگو ہے، بلاد الدنیا کی ملکہ، لندن ہی کا حال جب

یہ تھا، مسٹر لائڈ جارج ہی کا بیان۔

اُس شہر لندن کی کل آبادی کا ⅓ ڈربوں جیسے مکانوں میں بسر کرتی ہے۔"

پھر لندن اور لندن والے جن ملکوں اور جن شہروں پر حکومت کرتے ہیں، اگر وہاں کے باشندوں کو رہنے کے لئے مرغی کے یہ ڈربے بھی نصیب نہ ہوں تو لوگوں کو اس پر حیرت کیوں ہے؟

ان ہی دنوں میں جب یہ خبریں ایک کالم میں شائع ہوتی تھیں تو دوسرے کالموں میں اس قسم کی خبروں کی بھی کبھی کمی محسوس نہیں کی گئی ہے۔ اور آج بھی یہ دونوں سلسلے ایک ساتھ ایک ہی رفتار سے جاری وساری ہیں، مثلاً انگلستان ہی کے متعلق

"چار ارب چوہتر کروڑ روپے کی صرف شراب لنڈھائی گئی" (سچ ۵۔ فروری ۲۶ء)

اور امریکہ کے متعلق

عورتوں نے اپنے چہروں (صرف چہروں) کی آرائش کے لئے غازہ پوڈر وغیرہ پر چونتیس کروڑ روپیوں سے زائد خرچ کئے (ویسٹ منسٹر گزٹ ۱۶۔ مارچ ۲۷ء)

اور یہ ہیں

تاکلون التراث اکلا لما کھا رہے ہو (موروثی سرمایہ کو)

اکلِ لَم کے ساتھ۔

کی وہ زندہ تفسیریں جن کی بدولت چار کروڑ کی آبادی میں سے ڈیڑھ کروڑ انسانوں کو تو سسکتے، ایڑیاں رگڑتے ہوئے مویشیوں کے مانند مرغیوں کے ڈربوں میں پایا گیا، لیکن اسی ملک میں لنڈھانے والے چوہتر کروڑ ہی نہیں بلکہ چوہتر کروڑ چار ارب کی سالانہ شرابیں بھی لنڈھا رہے تھے۔ اللہ اللہ رے "اکلِ لم" کا زور کہ رخساروں پر چونتیس چونتیس کروڑ کی دولت مل مل کر ہر سال رکھ دی جائے، لیکن لاکھوں اور کروڑوں باشندوں کے بھوکے پیٹ اور ننگے اجسام کے لئے ان کے پاس کچھ نہ ہو، اور اس پر بھی دنیا کے کان کو اس قسم کے دعووں مسلسل دعووں سے بہرا بنایا جا رہا ہو کہ اشخاص سے چھین کر ملک کے عام باشندوں تک دولت اور حکومت کے پہنچانے میں ہم ہی نے پیش قدمی کی ہے۔ ورنہ اس سے پہلے جہاں بھی گذرے جو بھی گذرے، چور تھے، بٹ مار تھے، اپنے اور اپنے بال بچوں کے سوا ان کے خزانوں میں ملک کے عام باشندوں کے لئے کچھ نہ تھا، دنیا ہی انصاف کر سکتی ہے کہ جس ملک میں ایک طرف تو یہ حال ہے کہ پینے والوں نے سال بھر میں چار چار ارب اور چوہتر چوہتر کروڑ روپے کی شراب لنڈھا ڈالی ہو، لیکن اسی ملک میں شراب ہی کے متعلق ندیدوں کے ایسے طبقات بھی پائے جاتے ہیں، وہی ۱۹۲۶ء جس میں شراب کی بجٹ کے یہ اعداد ہیں، اسی سنہ چھبیس میں ڈیلی میل اخبار نے یہ خبر بھی شائع کی تھی،

گلاسگو میں وھسکی کے تین مٹکے اتفاقی شراب کی لاری سے لڑھک کر زمین پر گر پڑے

سڑک پر شراب بہنے لگی، ہزاروں کے اوپر عوام کا ہجوم تھا جو صراحیاں اور بوتلیں لئے ٹوٹ پڑا، اور بعض ترسی ہوئی روحوں نے تو کمال ہی کر دیا کہ سڑک پر اوندھے لیٹ کر نالی میں بہتی ہوئی شراب کو پینا شروع کیا اور بعضوں نے اس میں کپڑے ڈبو ڈبو کر پھر انھیں بوتلوں میں نچوڑ لیا (ماخوذ از سچ ۳۔ مئی ۱۹۲۷ء)

اگرچہ یہ ایک جزئی واقعہ ہے، لیکن اسی سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ سرمایہ داری کا جو ظالمانہ نظام آج یورپ وامریکہ میں قائم ہے، اسی نظام کے تحت زندگی بسر کرنے والے ممالک میں بسطی معیشت رکھنے والوں نے قدری رزق والوں کو محرومی ومفلسی کے کس آخری نقطہ تک پہنچا دیا ہے، گندی نالیوں میں بہنے والی شراب جس کے پینے پر شاید کتا بھی بآسانی تیار نہیں ہو سکتا، لیکن آپ دیکھ رہے ہیں کہ یورپ کے غریب افراد کتنی مسرت کے ساتھ اس نعمتِ غیر مترقبہ کو اوندھے ہو ہو کر نالیوں میں منہ ڈالے اسی کو پی رہے تھے:

اسی لئے قدری معیشت کی وہ دردناک حالت جو بسطی معیشت والوں کے "اکل لمّا" یا انتہائی خود خواری وخود نوشی کے جذبات کے تسلط کا نتیجہ ہے، اس کی اصلاح وتصحیح کے قصہ کو تو اسی قدرت کے حوالہ کرنا چاہئے جس نے ان ظالمانہ چیرہ دستیوں کے جنگلوں سے نجات دے دے کر تاریخ کے موجودہ دور تک نسلِ انسانی کو پہنچایا ہے۔ قرآن کا وہی خدا جس نے اپنے متعلق

ان ربک لبالمرصاد — اور تیرا رب گھات میں ہے۔

کا اعلان کیا ہے، اور بتایا ہے کہ قدرت کی مخفی نگرانی اندازہ کرتی رہتی ہے، تا اینکہ

فاکثروا فیھا الفساد — جب بگاڑ اور فساد کو بڑھا دیتے ہیں

(سدھار اور اصلاح پر)

کے درجہ تک ظلم وتعدی کا پارہ پڑھ کر جب پہنچ جاتا ہے تو معاً اسی کے ساتھ

فصب علیھم ربک سوط عذاب — بس برسا دیتا ہے ان پر تیرا رب عذاب کا کوڑا۔

کا تجربہ کرۂ زمین کے باشندوں کو ہمیشہ کرنا پڑا ہے اور آج بھی "معاشی توازن" کے جس قصہ کو ناہمواری کے جن حدود تک پہنچا دیا گیا ہے، مرصاد (گھات) والے رب کے سوط عذاب (تازیۂ عذاب) کا لوگوں کو انتظار کرنا چاہئے، اور میں تو سمجھتا ہوں کہ شاید قدرت کی اس مخفی بے آواز لاٹھی کی مار کے آثار کا ظہور شروع ہو چکا ہے، آخر قرآن ہی میں یہ بوفرما یا گیا ہے، یعنی

وذرنی والمکذبین اولی النعمۃ — چھوڑ دو مجھے اور ان جھٹلانے والوں کو
ومھلھم قلیلا ان لدینا — جو نعمت والے ہیں اور مہلت دو ان کو
انکالا وجحیما وطعاما — تھوڑی، ہمارے پاس بیڑیاں ہیں ...

ذا غصة و عذابا الیما — اور آگ کا ڈھیر اور کھانا ایسا جو گلے میں اٹک جائے اور دکھ بھرا عذاب۔

نعمت کہئے یا "سرمایہ" اسی کو پانے کے بعد اپنی متعلقہ ذمہ داریوں کو جنھوں نے جھٹلایا تھا، کچھ دن کی ڈھیل کے بعد ان ہی کے حلقوم میں آج "اشتراکیت" و "اشتمالیت" اور اسی قسم کے مختلف لقمے جو اٹکے نظر آرہے ہیں، ایسے لقمے جنھیں نگلنے والے نہ نگل سکتے ہیں نہ اگلنے والے اگل سکتے ہیں، سرمایہ، محنت، مزدوری اور اسی قسم کے دوسرے معاشی مسائل کچھ ایسی بھیانک شکلوں میں جو دانت دکھا رہے ہیں کہ موجودہ عہد کا ہر صاحب نعمت اپنی اپنی نعمتوں یا اپنے اپنے سرمایہ کے حساب سے بدخوابیوں میں مبتلا ہے، کیا ان کو دیکھ کر بھی اس کا انکار کیا جا سکتا ہے کہ مرصاد والے رب کا "سوطِ عذاب" اور "غیبی کوڑا" غیب سے سر نکال کر شہادت میں رہنے والوں کی پیٹھوں پر نہیں برسنے لگا ہے؟

اشتراکیت معاشی نظام نہیں بلکہ قدرت کا انتقام ہے

بہرحال قدرتی معیشت کا یہ پہلو زبردستوں کی زبردستیوں کا چونکہ نتیجہ ہوتا ہے، اس لئے ان زبردستوں کا مقابلہ تو وہی کر سکتا ہے جس کا ہاتھ سب سے اونچا ہے اور آج ہی نہیں بلکہ ہمیشہ سے زیردستوں کو زبردستوں پر چڑھاتا رہا ہے۔ بڑے بڑے گھڑوں کو کنکریوں سے دیکھا گیا ہے کہ اس نے پھوڑ دیا، اور میں تو سمجھتا ہوں کہ توڑ پھوڑ کے اس سلسلہ کا آغاز ہو چکا ہے، پھر جب آغاز ہو چکا ہے تو کسی نتیجہ تک بہرحال اس آغاز کا انجام پہنچ کر ہی رہے گا۔ غلطی میں مبتلا ہونے والوں کو غلطی جو کچھ بھی لگ رہی ہے وہ صرف یہ ہے کہ "انتقام" کو وہ واقعی انسان کا کوئی "معاشی نظام" سمجھ رہے ہیں، لیکن واقعات خود اس کی شہادت پیش کر رہے ہیں کہ انتقام صرف انتقام تھا۔ وہ دنیا کا کوئی واقعی نظام نہ تھا، اور نہ ہو سکتا ہے۔ انتقام کے دن جب پورے ہو جائیں گے، تب بنی آدم کی معیشت کا جو فطری نظام ہے وہ خود بخود قائم ہو جائے گا یہی ہوتا رہا ہے اور دنیا کی عمر کی مدت اگر ابھی کچھ باقی ہے تو اللہ کی اسی سنت کا ظہور یقیناً ہو کر رہے گا۔ ولن تجد لسنة اللہ تبدیلا۔

پس قدرتی معیشت کے اس پہلو کو چھوڑ کر میں اسی معیشت کی طرف اس شکل سے بحث کرنا چاہتا ہوں جو بنی آدم کے صفات و کمالات کے قدرتی تفاوت کا لازمی نتیجہ ہے۔ اور قرآن میں جیسا کہ بار بار گذر چکا

اللہ یبسط الرزق لمن یشاء — اللہ ہی کشادہ کرتا ہے جس کی چاہتا ہے

ویقدر۔ — روزی کو اور وہی تنگ کر دیتا ہے

جس کی روزی کو چاہتا ہے۔

کے الفاظ میں یہ طے کر دیا گیا ہے کہ انسانی اعمال کی مصنوعی کوششوں کا نہیں بلکہ معاشی مدارج و مراتب کا یہ اختلاف حق تعالیٰ کی قدرت قاہرہ اور ارادہ باہرہ کا پیدا کیا ہوا قصداً و ارادۃً پیدا کیا ہوا ہے

جس کے مٹانے کی کوشش میں کامیابی اسی وقت صرف اسی وقت ہو سکتی ہے جب انسانوں کے پیدا کرنے کا اختیار خود ہم انسانوں ہی کو مل جائے اور اس کے بعد آئندہ جتنے بچے بھی پیدا کئے جائیں وہ اپنے تمام اندرونی و بیرونی صفات کے لحاظ سے برابر کر کے پیدا کئے جائیں، لیکن جب تک مختلف صلاحیتوں اور مناسبتوں کو لے لے کر لوگوں کے پیدا ہونے کا یہ سلسلہ جاری ہے، معاشی طبقات کے تفاوت کے اس سلسلہ کو بھی کوئی روک نہیں سکتا۔[لہ] بہرحال معیشت کی اس قدرتی کیفیت میں زندگی گذارنے کے قرآن میں جو چند گر جو بتائے گئے تھے ان کا ذکر تو گذر چکا، اب دیکھئے کہ ان "قرآنی ہدایات" کو ٹھکرانے والوں کو جو ٹھوکریں کھانی پڑتی ہیں، وہ کیا ہیں، ٹھیک بسطی معیشت کی ذمہ داریوں سے لاپروائی برتنے والوں کے متعلق قرآن میں جو یہ بیان کیا گیا ہے کہ اس کے پیچھے شیطان لگا دیا جاتا ہے اور وہی شیطان آدمی کے صحیح احساسات کو زیر و زبر کر کے بالآخر "معیشت ضنک" اور تلخ زندگی کا انھیں شکار بنا دیتا ہے، یقین کیجئے کہ یہی حال ان لوگوں پر بھی طاری ہوتا ہے اور اسی کو طاری ہونا چاہئیے جو قدری معیشت میں مبتلا ہونے کے بعد ان ہدایتوں سے استفادہ نہیں کرتے جس کی طرف رزق کے اس خاص حال میں راہ نمائی کی گئی ہے۔ وجہ اس کی وہی ہے کہ

من اعرض عن ذکری	جو کترایا میری یاد سے تو قطعاً اس کے لئے ہی
فان لہ معیشۃ ضنکا	معیشت (زندگی) خنگی و تنگی سے بھری ہوئی

لہ بلکہ بغیر کسی جد و جہد کے جیسے معاشی مراتب و مدارج کے اختلافات کا قصہ حیوانات وغیرہ میں ختم شدہ ہے بنی نوع انسانی میں یہ جھگڑا بغیر کسی کوشش تقریر و تحریر، تحریک و انقلاب کے ختم ہو جائے گا، اب میں لوگوں کو کیا کہوں، اخباروں میں روز پڑھتے ہیں، اس قسم کی خبریں روز پڑھتے ہیں، مثلاً ایک دفعہ ڈاکٹر رائے نے کلکتہ میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ

"علی پور (کلکتہ کی عدالتوں کا محلہ) کی بار میں اس وقت نو سو پچاس وکیل وکالت کر رہے ہیں، جن میں صرف دس فیصدی ایسے ہیں جن کی آمدنی اوسط درجہ کی ہے اور بار میں وکلا کی آمدنی کا اوسط پندرہ بیس روپیہ ماہوار سے زیادہ نہیں، اور نہ معلوم کتنے وکلا وکالت کی ڈگریاں رکھنے والے ایسے ہیں جو ایک ایک دانہ کو ترستے ہیں"۔ (سچ ۳۔ مارچ ۱۹۳۷ء)

یہ اس زمانہ کی رپورٹ بنگال ہی کی ہے جب اسی علی پور اسی کلکتہ اسی بنگال میں سی۔ آر۔ داس جیسے وکلا کی اوسط آمدنی اسی وکالت کی راہ سے جیسا کہ عام طور پر مشہور ہے، تقریباً پچاس پچاس ہزار روپے تک پہنچ جاتی تھی۔
وکالت ظاہر ہے کہ ایک آزاد پیشہ ہے، اس میں محروم رکھنے اور پیچھے ڈھکیلنے کا الزام افسرانِ بالا دست پر بھی تو نہیں لگایا جا سکتا، بلکہ کھلا ہوا قسمت آزمائی کا میدان ہے، ہر ایک ان میں گریجویٹ ہی ہوتے ہیں، وکالت اور قانون کی سند رکھتے ہیں، ان قدرتی صلاحیتوں کی کمی بیشی کے سوا آمدنی کے اس عظیم تفاوت کی توجیہ اور کیا ہو سکتی ہے جو باہم فطری طور پر افرادِ انسانی میں پائی جاتی ہیں اور بالآخر ان صلاحیتوں ہی کے تفاوت کا نتیجہ معاشی فرق مراتب کے نتائج کی شکل میں رونما ہوتا ہے ۱۲

اور

من یعش عن ذکر الرحمٰن نقیض له شیطانا فھو له قرین۔ — اور جو آنکھیں چُراتا ہے الرحمٰن کی یاد سے پیچھے لگا دیتے ہیں ہم اس کے شیطان کو پس ہو جاتا ہے وہ اس کا ساتھی۔

جیسا کہ بتا چکا ہوں، دونوں میں مَن (جو) کا لفظ عام ہے، جیسے مبسطی معیشت والوں کو حاوی ہے اسی طرح ان لوگوں پر بھی یہی قاعدے منطبق ہوں گے جو اپنی قدری معیشت میں خدائی ذمہ داریوں سے منہ موڑ کر زندگی گذارتے ہیں، باقی احساسات کے بگاڑنے کا یہ سلسلہ شیطان کس طرح شروع کرتا ہے، جہاں تک قرآن ہی سے معلوم ہوتا ہے ابتدا اس کی اس کیفیت سے ہوتی ہے جسے سورۃ الفجر ہی کی اس آیت میں بیان کیا گیا ہے، یعنی

واما الانسان اذا ما ابتلاہ ربہ فقدر علیہ رزقہ فیقول ربی اھانن۔ — اور الانسان سو جب جانچتا ہے اس کو اس کا مالک پس نپی تلی کر دیتا ہے اس پر اس کی روزی کو تو کہتا ہے وہ کہ میرے مالک نے مجھے رسوا اور ذلیل کر دیا۔

جس کا مطلب یہی ہوا کہ اپنی قدری زندگی کے متعلق بجائے یہ خیال کرنے کے کہ یہ بھی ابتلائی اور امتحانی زندگی ہی کی ایک شکل ہے، اور جو ذمہ داریاں ایسی حالت میں آدمی کے سپرد کی گئی ہیں، ان کی تکمیل کی کوشش کرے، وہ یہ غلط خیال اپنے اندر قائم کر لیتا ہے کہ میرے پیدا کرنے والے نے قدری معیشت کی اس حالت میں مجھے مبتلا کر کے ذلیل اور رسوا کر دیا۔ اپنی قدری زندگی کے متعلق اہانت کا یہی خیال یقین کیجئے کہ شیطان کا وہ پہلا عمل ہے جسے مسلط ہونے کے بعد اپنے معمولوں پر وہ شروع کر دیتا ہے۔

جہاں تک واقعات کا تعلق ہے عام حالات میں اگر غور کیا جائے تو غربت کی زندگی یعنی قرآن کی اصطلاح میں جس کا قدری معیشت نام ہے، یہ خیال کرنا کہ میری رسوائی اور ذلت کی وجہ یہی ہوئی ہے، واقعہ سے بہت کم تعلق رکھتا ہے، آخر ہم میں ہر ایک کو سوچنا چاہیئے کہ اس کے سامنے ہر وقت ہر گلی کوچہ میں لاکھوں لاکھ تعداد میں غریب مرد عورت جو گذرتے رہتے ہیں، کیا محض اس لئے کہ وہ بیچارے غریب ہیں، یعنی ان کی آمدنی ان کی حاجت وضرورت کے مطابق ہے، صرف اس لئے کون کس کو ذلت کی نگاہ سے دیکھتا ہے، یہاں حال تو یہ ہے کہ ہر شخص اپنے حالات ہی میں مستغرق رہتا ہے، دوسروں کے سوچنے کا موقع ہی کسی کو کب ملتا ہے، اور اگر کسی کے حال کی طرف کسی وجہ سے توجہ بھی ہوتی ہے تو جہاں تک میں جانتا ہوں کسی کی قدری معیشت کا حال سن کر لوگ عموماً رحم ہی کھاتے ہیں، ان کے ذلیل وخوار ہونے کا خیال بھی کسی کو نہیں گذرتا۔ آخر غربت وفلاکت کی وجہ سے آدمی کا دوسروں کی نگاہوں میں رسوا اور ذلیل ہونا اگر ضروری ہوتا، تو آج دنیا کے بڑے بڑے

مذہبی پیشواؤں، یا علمی حلقوں کی سربرآوردہ ہستیاں جن میں عموماً قدری معیشت رکھنے والوں ہی کی اکثریت ہے، ان کی عظمت واحترام سے لوگوں کے قلوب کیوں معمور ہوتے۔

اور بعض دماغوں میں غریبوں کے متعلق اگر اس قسم کا کوئی گندہ خیال پیدا بھی ہوتا ہو، تو خود غریبوں پر اس کا کیا اثر پڑتا ہے، کسی پاکباز، عفت مآب خاتون کو کوئی بدنظر خبیث، خباثت اور اگر بری نگاہوں سے دیکھتا ہے تو یہ گندگی دیکھنے والے کی ہے یا اس عفیفہ خاتون کی جس بری نگاہ سے دیکھا گیا، سعدی کا مشہور فقرہ

"الحمد للہ کہ مصیبتے گرفتارم نہ بہ معصیتے"

اس میں بھی اسی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ افلاس و غربت اگر کوئی مصیبت بھی ہے، تو وہ صرف مصیبت ہے۔ کوئی معصیت یا کردار کی خرابی تو نہیں ہے، جس کی وجہ سے آدمی ذلیل خیال کیا جائے واقعہ تو یہی ہے کہ غریب آدمی کو ذلیل خیال کرنے والا دراصل خود ذلیل ہوتا ہے جس کا اندازہ اس سے بھی ہو سکتا ہے کہ غریبوں کو ذلیل خیال کرنے والے علانیہ اپنے اس خیال کا اظہار نہیں کر سکتے، اسی لئے نہیں کر سکتے اور نہیں کرتے کہ وہ بھی یقین رکھتے ہیں کہ میرے اس خیال کو جو بھی سنے گا، بجائے غریبوں کے مجھ کو وہ ذلیل خیال کرے گا۔

پس حقیقت تو جو کچھ ہے وہ یہی ہے۔ لیکن قدری معیشت کی ذمہ داریوں سے جو منحرف ہو کر زندگی گذارتے ہیں، دیکھا یہی جاتا ہے کہ خواہ انھیں کوئی ذلیل خیال کرے یا نہ کرے لیکن وہ چوبیس گھنٹے اسی احساس اور خیال میں گھٹتے رہتے ہیں کہ میں اولادِ آدم کا ایک ذلیل ترین فرد ہوں، وہ بے چارا تو یہ خیال کرتا ہے کہ میرا یہ احساس خود میری طبیعت کا احساس ہے اور ایک واقعہ کا احساس ہے، لیکن اب اس مسکین کو یہ کون بتائے کہ اس پر شیطان مسلط ہو گیا ہے، اور جو واقعہ نہیں ہے بلاوجہ واقعہ کا رنگ دے کر اس کے سامنے وہ پیش کر رہا ہے اور شیطان کا سب سے بڑا کرتب یہی تسویل و تزویر ہے۔ اور بات اسی نقطہ پر کب ختم ہوتی ہے، عزت و ذلت بلندی و پستی کا سارا معیار جس کے سامنے صرف روپیہ رہ گیا ہو، ایسا آدمی اگر ہر حیثیت سے ہو کر صرف عزت و جلال کے اسی معیار و حید کے عشق میں ڈوب جائے تو جس غلط خیال کا وہ شکار ہو گیا ہے اس کا تو یہ ایک لازمی نتیجہ ہے۔ بہر حال سببی و قدری معیشت دونوں کو ابتلائی حالات قرار دیتے ہوئے سورۂ فجر کی آیتوں کے بعد آخر میں دو فقرے جو پائے جاتے ہیں جن کا پہلے بھی ذکر آ چکا ہے، یعنی

وتاکلون التراث اکلا لما و — اور کھاتے ہو میراث کو الجھا کے سمیٹ کر اور

تحبون المال حبا جما — چاہتے ہو مال کو جی بھر کے ساتھ۔

میں نے پہلے بھی اشارہ کیا تھا کہ جیسے پہلے فقرے یعنی تاکلون التراث اکلا لما کا تعلق سببیوں سے ہے، اسی طرح اگر دوسرا فقرہ یعنی وتحبون المال حبا جما (اور چاہتے ہو مال کو جی بھر کے ساتھ) کے متعلق اگر یہ سمجھا جائے کہ اس کا تعلق قدریوں سے ہے تو جہاں تک مشاہدہ کا تعلق ہے اس کے انکار کی کوئی وجہ نہیں ہو سکتی۔

میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ نظریۂ ابتلائیت کے انکار کے بعد جیسے بسطیوں کا گروہ پالنے کے بعد
چاہتا ہے کہ مال و دولت کے جس حصہ پر اس کا اقتدار قائم ہوگیا ہے، وہ اس کے اور اس کی نسلی دائرہ
سے باہر نکلنے نہ پائے، قرآن نے جس کی تعبیر "تاکلون التراث اکلا لما" سے کی ہے، اسی طرح جو لوگ بسط
کی اس نعمت سے محروم ہوتے ہیں، یعنی قدری رزق پاتے ہیں۔ ضروریاتِ حیات میں صرف ہوجانے
کے بعد جو سرمایہ کے کسی جز کو پس انداز نہیں کر سکتے۔ ان کا مال و دولت سے وہی تعلق پیدا ہوجاتا
ہے، جو دردِ فراق، غمِ ہجر میں مبتلا ہونے والے عاشق مہجور و مسکین کو اپنے بچھڑے ہوئے معشوق سے
ہوتا ہے، ایامِ ہجر میں عشق کا جذبہ جیسے عاشق مہجور کو ہر چیز سے توڑ کر صرف

بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کئے ہوئے

کے مشغلہ میں غرق کر دیتا ہے۔ چونکہ "حب جم" کے معنی یہی ہیں، یعنی ہر چیز سے الگ ہو کر کسی شے کے ساتھ
لو لگانا یہی اس کے لغوی معنی ہیں، عربی محاورہ ہے کہ ہر طرف سے سمٹ کر جب پانی کسی گڑھے میں
جمع ہوجاتا ہے، جم الکب کہ تالاب وغیرہ کے کسی ایسے حصہ میں جو سب سے زیادہ گہرا ہو اور اسی
میں تالاب کا سارا پانی آخر میں جمع ہوجاتا ہو تو اس کو جمۃ الماء اسی وجہ سے کہتے ہیں۔ پس قرآن کی
بیان کردہ کیفیت کہ "چاہتے ہو تم مال کو حب جم کی چاہ کے ساتھ" جہاں تک میں سمجھتا ہوں یہ وہی کیفیت
ہے جس میں عموماً قدری معیشت رکھنے والے اس وقت مبتلا ہوجاتے ہیں جب بڑے امتحان و ابتلاء کے
وہ یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ ساری شرافتوں اور بلندیوں کا دارومدار روپے ہی پر ہے، وہی باعزت ہے جو
روپیہ والا ہے، اور بے عزت وہی ہے جو روپے سے خالی ہو، مشہور فارسی شعر

خوک باش و خرس باش و یا سگِ مردار باش — ہر چہ باشی باش، لیکن اندکے زردار باش

کی ذہنیت جب کسی فرد یا قوم اور ملک پر مسلط ہو جاتی ہے تو "اندکے زردار باش" کے مشورے کی تعمیل کا
موقعہ جن لوگوں کو نہیں ملتا، قدرتی طور پر ہر چیز سے الگ ہو کر اسی "زردار باشی" کو وہ اپنے وجود کا
آخری نصب العین بنا لیتے ہیں۔ ٹھیک آج موجودہ مغربی تمدن نے جس حال کو دنیا میں پیدا کیا ہے
ایسا حال کہ شاید تاریخ میں اس کی نظیر مشکل ہی سے مل سکتی ہے۔ کیونکہ "عشقِ مال و سرمایہ" اگرچہ کوئی
نیا حادثہ نہیں ہے، قدری معیشت کو جس زمانہ میں بھی محسوس کرنے والوں نے اپنی اہانت کا ذریعہ
محسوس کیا ہے۔ قدرتاً اس شوق کی آگ ان کو اپنے قلوب میں سلگانی اور بھڑکانی ہی پڑی ہے لیکن
جہاں تک میں جانتا ہوں دل کے اس کیفیت کے اظہار کی عموماً لوگوں کو جرأت نہیں ہوتی تھی، یا
ہوتی بھی تھی تو کچھ دبے دبے لفظوں میں ہوتی تھی۔ آدمی صرف مال اندوزی یا زر آفرینی کا آلہ ہے
اس کے سوا وہ اور کچھ نہیں ہے، یا دوسرے لفظوں میں اسی کی تعبیر آج کرنے والے ان الفاظ میں جو
کر رہے ہیں کہ آدمی صرف پیٹ ہے یا فقط وہ روٹی ہے۔ پیٹ ہی کے لئے وہ جیتا ہے اور پیٹ ہی
کے لئے مرتا ہے، روٹی ہی کے لئے قدرت نے انسانی نسل کو پیدا کیا ہے۔ اسی کا حاصل کرنا اور اسی کو
حاصل کرتے ہوئے اپنی آخری سانس پوری کرنی، یہی فقط یہی اس کے وجود کا سب سے بڑا نصب العین ہے

جن بلند آہنگیوں کے ساتھ بغیر کسی شرم و حیا کے آج یہ سب کچھ بہ بانگِ دہل نہ سہی بہ بانگِ ریڈیو یا میکروفون جو کیا جا رہا ہے، تقریروں میں، تحریروں میں چیخنے والے صرف ان ہی آوازوں کے ساتھ جو چیخ رہے ہیں، گلے پھاڑ پھاڑ کر جو چلا رہے ہیں، انسانیت کی تاریخ کا کوئی مؤرخ کسی قوم کسی ملک کے کسی دور کا مؤرخ کیا بتا سکتا ہے کہ زمین کے کرہ پر بنی آدم کے گھرانوں میں اتنی ڈھٹائیوں اور انتہائی بے حیائیوں کے ساتھ کانوں کو کبھی پہلے بھی سنانے والوں نے یہ سنایا تھا، یا زبانوں پر اس قسم کے الفاظ آئے تھے شاید یہ قرآنی الفاظ

تحبون المال حبًّا جمًّا۔ اور چاہتے ہو مال کو تم حب جم کے ساتھ

کی علانیہ تفسیر ہے، اسی لئے ان حالات میں جو کیفیت دلوں میں پیدا ہوتی تھی زبانوں سے بھی اس کا اقرار کرا دیا گیا، اور اس طور پر اقرار کرایا گیا کہ آج ان الفاظ کے انکار کرنے والوں کو ہی مطعون ٹھیرایا جا رہا ہے، وہی دردرائے اور دھتکارے جا رہے ہیں، جو انسان جیسی بلند ہستی کو اتنا پست قرار دینے سے ہچکچا رہے ہیں۔

بہرحال انسانیت کی بلندی و پستی کا یہ قصہ بجائے خود ایک الگ قصہ ہے، جو خوک (سور) خرس (ریچھ) یا سگ مردار بنا کر نہیں پیدا کیا گیا ہے۔ اسی کو انھی چرندوں یا درندوں کے مقام تک اتارنے کی کوشش کس حد تک کامیاب ہو سکتی ہے۔ اس وقت میرے سامنے یہ بحث نہیں ہے میرے پیش نظر اس وقت جو کچھ بھی ہے، وہ صرف یہی ہے کہ قرآن کے نظریۂ ابتلاء کا انکار کیجئے، یا خدا کی ذمہ داریوں سے انکار کیجئے، اس انکار کے بعد انسانی احساسات میں قدری معیشت کے متعلق جو تبدیلیاں پیدا ہوتی ہیں، قرآن کی روشنی میں اسے ان لوگوں کے آگے رکھ دوں جو قرآن کو سمجھنا اور سمجھ کر اسی کی روشنی میں چلنا چاہتے ہیں، آپ نے دیکھ لیا کہ پہلی افتاد انسانی فہم پر اس سلسلہ میں جو پڑتی ہے وہ یہ ہے کہ قدری معیشت کو لوگ اپنی اہانت و ذلت کا ذریعہ یقین کرنے لگتے ہیں، اس کے بعد قدرتاً خواری و ذلت کی اس حالت سے نکلنے کے لئے مال اور سرمایہ کے اس "حب شدید" یا "عشقِ مفرط" کی آگ اپنے اندر بھڑکا لیتے ہیں، جس کی تعبیر قرآن نے "حب جم" سے کی ہے گویا بسطی معیشت والے جیسے نظریۂ ابتلائیت کے انکار کے بعد سرمایہ کے متعلق "اکل لم" میں مبتلا ہو جاتے ہیں، اسی طرح قرآنی اشارے سے معلوم ہوتا ہے کہ قدری معیشت والوں کو مال کے حب جم کا شکار ہونا پڑتا ہے۔ یہی قرآن سے بھی سمجھا جاتا ہے اور واقعات بھی اسی کی توثیق و تائید کر رہے ہیں، لیکن بات کیا اسی منزل تک پہنچ کر ختم ہو جاتی ہے؟ اگر ختم بھی ہو جاتی تو جنھیں اپنی انسانیت اور اس کی قدرتی بلندیوں پر ناز ہے ان کا ایک معمولی ذہنی انقلاب کے ہاتھوں اتنے نیچے گر جانا یا گرانے والے کا ان کو اتنا نیچے گرا دینا درحقیقت کچھ کم سزا نہ تھی، لیکن کہنے والے کہہ سکتے تھے بلکہ کہہ رہے ہیں کہ اپنی بلندی و برتری کا یہ خیال انسانوں کا خود ساختہ ایک وہمی خیال ہے، زمین پر چرنے والے سوروں، جنگلوں میں گھوم گھوم کر شکار کرنے والے ریچھوں، کتوں اور

کوچوں میں دربدر مارے پھرنے والے کتوں سے آخر آدم کے بچوں کو بلند و بالا کیوں خیال کیا جائے، کیوں سمجھا جائے کہ کھانا، پینا، مرجانا اس حیوانی نصب العین سے زیادہ انسانی وجود اپنے ساتھ کوئی اور اونچا نصب العین بھی رکھتا ہے، جیساکہ قاعدہ ہے کہ قرآنی حجۃ ہمیشہ "بالغہ" یعنی آخری دروازے تک پہنچانے والی حجت ہوتی ہے۔ اس مسئلہ میں بھی کم از کم میرے نزدیک یہی طرز عمل اس نے اختیار کیا ہے،

مطلب یہ ہے کہ "مال کے حب جم" اور سرمایہ کا "عشق مفرط" جب ان طبقات پر مسلط ہوجاتا ہے جنھیں قدری پیمانے پر یہاں روزی مل رہی ہے، تو پھر

اے عشق مجھے لے چل اے عشق کہیں لے چل

کے دوروں سے ان بیماروں کو کون بچا سکتا ہے جو اپنے آخری محبوب کے وصال کی تمنا وں میں تڑپتے اور ایڑیاں رگڑتے رہتے ہیں، قدری معیشت کی دشواریوں کو آسان بنانے کے وہ سارے ذرائع جن کی مذاہب نے تعلیم دی ہے، عشق کی اس آگ میں جل بھن کر بھسم ہوجاتے ہیں، اور وہی پرانا معاشی پھوڑا

ان نفعل فی اموالنا ما نشا، — اپنے اموال اور سرمایوں کو جو چاہیں کریں

کا دماغوں میں نمودار ہوتا ہے، صلوات کہئے یا مذہب و دین ایمان و دھرم کا "معاشی جدوجہد" کی راہوں سے رشتہ توڑ دیا جاتا ہے۔ تذکار قناعت عدد الالتکم، صبر و توکل، دعا، التکرا الی الادنی، ترک مالایعنی، الغرض وہ ساری ذمہ داریاں جو قدری معیشت میں الرحمٰن کی طرف سے عائد کی گئی ہیں، وہ بھلا دی جاتی ہیں۔ اپنے عشقی مطالبات کی تکمیل میں بے روک ٹوک لوگ مشغول ہوجاتے ہیں، بے آئینی کی اس زندگی میں زمین پر جس قسم کا فساد بھی پھوٹ پڑے اس کا کون اندازہ کرسکتا ہے، معاشی مسائل کے متعلق حضرت شعیب علیہ السلام کی تمثیلی قوم جس نے اپنے اندر مال کے اسی حب جم کو پیدا کیا تھا، اسی قوم کو خطاب کر کر کے اللہ کے منادی حضرت شعیب علیہ السلام کے جو اس قسم کے الفاظ قرآن میں محفوظ کئے گئے ہیں،

ولا تقعدوا بکل صراط توعدون — اور بیٹھتے ہو تم ہر راہ پر دھمکاتے ہو لوگوں کو۔

یا فرماتے

ولا تفسدوا فی الارض بعد اصلاحها۔ — اور نہ بگاڑ پیدا کرو زمین میں اس کی سدھار کے بعد۔

"شعیبی مواعظ" کے ان فقرات کی تفسیر اگر کوئی پڑھنا چاہے، تو ان ممالک میں جاکر پڑھ سکتا ہے جو کہنے کی حد تک تو سب سے بڑے آئینی ممالک ہیں، بلکہ آج تو دنیا کی "آئین گری اور آئین سازی" کا کام وہی کر رہے ہیں، اور انسانی اخلاق کی تفسیخ کا وہ بے خطا نسخہ جس کے متعلق یاد پڑتا ہے کہ

جاہل ہندوستان کا تذکرہ کرتے ہوئے سرونٹ آف جیردل نے لکھا تھا،

"میکالے جیسے مدبر نے یہ اعلان کیا کہ تعلیم جہل کی بدامنی اور قانون شکنی کا بہترین اور یقینی علاج ہے۔ اس لئے انگریزی گورنمنٹ کے لئے لازمی ہوئی کہ وہ ہندوستان کے ذہنی غلامی کی کوشش کرے۔"

بدامنی اور قانون شکنی کا یہی بہترین اور یقینی علاج تعلیم سے بھی جن ممالک کے لوگ چور بیٹھے ہوئے ہیں، لیکن اور تو اور آئینیت اور تعلیمیت کے سب سے بڑے مرکز امریکہ میں قدری معیشت رکھنے والے جو کچھ کر رہے ہیں، بر سر راہ بیٹھ کر "مال کے جب جرم کے تقاضوں کی تکمیل میں جن جن ہتھکنڈوں سے وہ کام لے رہے ہیں، کس دن کے اخبارات میں اس کی خبریں نہیں چھپتی ہیں۔ آج تو ان ممالک میں جو کچھ ہو رہا ہے اور آئندہ جو کچھ ہونے والا ہے، اسے تو جانے دیجئے۔ جب امن کے دن تھے، عافیت کا دور دورہ تھا، اخبار پانیر نے صرف امریکہ کے متعلق لکھا تھا کہ،

"امریکہ میں سالانہ اوسطاً ایک لاکھ ڈاکے پڑتے رہتے ہیں، پانچ لاکھ کے قریب چوریوں کی تعداد ہے۔" (پانیر الہ آباد ۱۱-جنوری سنہ ۳۰ء)

یہ سنہ ۳۰ء کی رپورٹ ہے، اس کے بعد

"سنہ ۱۹۳۱ء میں دیکرشم کمیشن نے جو رپورٹ امریکہ کے متعلق حکومت کے آگے پیش کی تھی، اس سے معلوم ہوا کہ چوریوں نقب زنیوں جعل سازیوں غبن وغیرہ جرائم کی تحقیقات کے سلسلہ میں حکومت پورے تین ارب روپے خرچ کرتی ہے۔" (سچ ۲-اکتوبر سنہ ۱۹۳۱ء)

اور یہ تو خیر ایک ملک کا حال ہے، اسی اخبار سچ میں ملک نہیں، صرف ایک شہر موسوم بہ لندن کے متعلق یہ روئداد شائع ہوئی تھی،

"کھلے بندوں اس شہر لندن میں جو ڈاکے پڑے سنہ ۲۹ء میں ان کی تعداد ساٹھ اور سنہ ۳۰ء میں ستر تھی، اور سنہ ۲۹ء میں نقب زنی کے ذریعے سے دو ہزار بیس اور سنہ ۳۰ء میں اسی طریقہ کو کام میں لا کر دو ہزار آٹھ سو پینسٹھ آدمیوں نے چوری کی، راہ گیروں کو ڈرا دھمکا کر جن لوگوں نے شہر لندن میں روپے وصول کئے سنہ ۲۹ء میں ان کی تعداد (۲۰) اور سنہ ۳۰ء میں (۴۳) تھی" (سچ ۸-ستمبر سنہ ۱۹۳۱ء)

اور یہ وہ واقعات ہیں جن کا سراغ پولیس نے لگا لیا، ورنہ پولیس کے دائرہ علم سے باہر جو حوادث اس سلسلہ میں پیش آئے ہوں گے، ان کو اسی پر قیاس کیجئے، اور سچ تو یہ ہے کہ تمدن اور تہذیب نے مردوں سے آگے بڑھ کر خود عورتوں تک کو اتنا جری بنا دیا ہو، جیسا کہ امریکہ کے ایک ادیب ایونگ گریفک نے لکھا تھا،

"سارے ملک میں اس سرے سے اس سرے تک تعلیم یافتہ حسین لڑکیوں نے قزاقی اور راہ زنی کا پیشہ شروع کر دیا ہے...... روز روشن میں یہ حسین ڈاکو ریوالور بندوق سے مسلح ہو کر موٹروں پر بیٹھ کر بینکوں کو لوٹنے لگی ہیں۔" (اخبار سچ ۳۰۔ جولائی ۱۹۳۷ء)

بہرحال قرآنی آیت

ولا تقعدوا بکل صراط توعدون — اور بیٹھے ہو ہر راہ پر دھمکاتے ہو۔

کی تفسیر جن نت نئی بلکہ بعض ناقابل تصور شکلوں میں آج دنیا کے ان ممالک میں ہو رہی ہے، جہاں کے قدری معیشت رکھنے والوں میں "مال کا حب جم" خود ان ہی کے راہ نماؤں، اور حرص وطمع، زرطلبی، کے اندیشوں نے پیدا کر دیا تھا، انھیں کون گن سکتا ہے، معصوم بچوں کو اڑا اڑا کر لے بھاگنا، اور ان کی ماؤں اور باپوں سے یہ دھمکی دے کر بڑی بڑی رقمیں طلب کرنی کہ اگر روپیہ نہ دیا جائے گا تو ان کا بچہ ذبح کر دیا جائے گا، پھر جن بدقسمت ماں باپوں نے ان کے حکم کی تعمیل نہیں کی بجائے زندہ بچے کے اپنی آنکھوں سے بچے کی سر کٹی لاش انھیں دیکھنی پڑی۔ ایک دن جہاں یہ واقعات شہروں اور قصبوں کے لئے اب نئے نہیں رہے ہیں، حیدرآباد کے پائگاہی امیر نواب ظہیر یار جنگ بہادر نے اپنے سفرنامہ امریکہ و یورپ میں لکھا ہے کہ چکاگو کے میئر بلدیہ نے خصوصیت کے ساتھ بلا کر ان پر یہ اصرار کیا کہ اپنی جان کی حفاظت کے لئے چاہیئے کہ کسی خفیہ آدمی کو مقرر کر لیں، ورنہ امریکہ کے ڈاکوؤں سے ممکن ہے کہ ان کو گزند پہنچ جائے۔ ان کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس ملک کے سیاحوں کے لئے ایسا کرنا اپنی جان کی حفاظت کے لئے ضروری ہے۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ آئین و قانون تعلیم رکھنے والے اس ملک کی کیا حالت ہو چکی ہے، سالانہ اربوں کی رقم خرچ کرنے کے باوجود اس ملک کی حکومت لوگوں کی جان و مال کی حفاظت سے معذور ہو چکی ہے۔ اور تعلیم جسے آئین شکنی کے انسداد کا یقینی نسخہ باور کرایا گیا تھا، جہاں تک واقعات اور خبروں سے معلوم ہوتا ہے، وہی تعلیم بدامنی اور قانون شکنی میں امداد پہنچا رہی ہے، ناولوں افسانوں کے ذریعہ لوگ نت نئے جرائم کی تدبیروں کے نقشے پیش کر رہے ہیں، سینماؤں، اور متحرک تصاویر کی راہ سے ان ہی جرائم کو کر کر کے دکھایا جاتا ہے، اور جو باتیں سوچی بھی نہیں جا سکتیں، بتایا جا رہا ہے کہ آدمی چاہے تو یہ بھی کر سکتا ہے، فریب دہی کے سائنٹیفک طریقوں کا رواج اس ملک میں بڑھ رہا ہے۔

واقعہ تو یہ ہے کہ جن ملکوں کے اہل قلم ارباب تصنیف و تالیف تک کے متعلق ایسی باتیں سنی جاتی ہوں، اگرچہ واقعہ تو جزئی ہے۔ لیکن جزئیات ہی سے کلیات کا علم حاصل ہوتا ہے، لندن کے اخبار نیوز آف ورلڈ میں یہ خبر شائع ہوئی تھی کہ چارلس کارڈن نامی ایک صاحب جن کا شمار انگلستان کے ممتاز مصنفین میں ہے، متعدد مقبول عام کتابوں کے مؤلف ہیں، اپنی کتابوں سے ہزارہا روپے دو تین سال کے عرصہ میں انھوں نے اکٹھا کر لیا تھا، ان ہی مصنف صاحب کے متعلق

یہ واقعہ چھپا تھا کہ ایک دن جب سڑک پر سناٹا تھا، انگلستان کا یہ مصنف تعلیم یافتہ گھر سے باہر نکلا قسمت کی ماری ایک میم صاحبہ سڑک سے گذر رہی تھیں، گلے میں ان کے ایک ہار پڑا ہوا تھا، جس کی قیمت پندرہ سولہ ہزار روپے سے کم نہ تھی، اس قیمتی ہار والی میم صاحبہ کو تنہا پا کر جناب مصنف صاحب نے ہار پر ایک جھپٹا مارا، غریب عورت کیا کر سکتی تھی، وہ دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی، اور ہار کو گلے سے اتار، مصنف صاحب یہ جا وہ جا گلیوں میں غائب ہو گئے، لیکن میم نے بھی پیچھا نہ چھوڑا "چور چور، اچکا اچکا" کہتے ہوئے وہ بھی ان کے پیچھے دوڑنے لگی، سامنے راہ گیر ہو آ رہے تھے، انھوں نے اس تعلیم یافتہ مصنف چور کو پکڑ لیا۔ اتنے میں پولیس آ گئی، چور گرفتار ہو گیا۔ اچک کر لے بھاگنے کے جرم میں ڈیڑھ سال کی سزا اس چور مصنف کو بھگتنی پڑی (ماخوذ از سچ بحوالہ نیوز آف ورلڈ ۱۳۔ دسمبر ۱۹۳۱ء) بدقسمتی سے یہ چور مصنف صاحب پکڑے گئے، اس لئے بات کھل گئی۔ ورنہ خدا ہی جانتا ہے کہ "مال کے حب جم" کے عاشقوں سے بھرے ہوئے اس ملک میں آئین شکنی کا بے خطا اور یقینی علاج کن کن نتائج کو پیدا کر رہا ہے۔

اور یہ حال تو ان کا ہے جن میں جرائم کی ان راہوں پر بیٹھنے اور قسمت آزمائی کی ہمت پائی جاتی ہے، لیکن قدری معیشت رکھنے والوں میں ناکام عاشقوں کا وہ گروہ جو کرنا تو سب کچھ چاہتا ہے، لیکن کچھ کر نہیں سکتا، اس کے درد کا افسانہ کون سن سکتا ہے، کہتے ہیں، اور کہتے کیا ہیں خود قرآن میں ہے کہ اپنی جاہلیت کے دور میں عرب کی سرزمین کا یہ عام رواج تھا کہ محض معاشی دشواریوں سے غالب آنے، اور مال کے "حب جم" کے جذبہ کی تسکین کے لئے وہاں کے باشندے اپنے جگر کے ٹکڑوں کو بھی ذبح کرنے سے نہیں ہچکچا تے تھے[۱]، قرآن کو اسی رواج بد کے انسداد کے لئے ایک سے زائد مقام پر

ولا تقتلوا اولادکم خشیة املاق۔ — اور نہ گردن مارو اپنی اولاد کی افلاس کے اندیشے سے۔

کا حکم نافذ کرنا پڑا، اور جہاں تک عرب کی تاریخ کا تعلق ہے، قرآنی حکم کے بعد یہ سنگدلی اور قساوت قلبی کے

---

[۱] عام طور پر مشہور ہو گیا ہے کہ جاہلیت میں عرب والے صرف اپنی لڑکیوں کو زندہ درگور اس لئے کر دیتے تھے کہ اپنی لڑکی کو کسی اجنبی مرد کی جورو بننے پر ان کی غیرت اور جاہلی حمیت آمادہ نہ تھی۔ ہو سکتا ہے کہ لڑکیوں کے ساتھ یہ ظلم اسی وجہ سے روا رکھا گیا ہو۔ گو اس کا کوئی تاریخی ثبوت اب تک مجھے نہیں ملا ہے، لیکن لڑکیوں کے سوا لڑکوں یا عام اولاد لڑکے ہوں یا لڑکیاں ان کے قتل کے جاہلی دستور کا ذکر تو خود قرآن میں ایک سے زائد جگہ پر کیا گیا ہے، جہاں اس کا ذکر ہے وہیں قتل اولاد کی اس منحوس رسم کی وجہ وہی اور صرف وہی بیان کی گئی ہے جسے آج برتھ کنٹرول کے جواز بلکہ وجوب کے سلسلہ میں عموماً پیش کیا جاتا ہے یعنی معاشی دشواریوں کے حل کا ایک ذریعہ قتل اولاد عرب کے جاہل اسی طریقہ سے قرار دیئے ہوئے تھے جیسے آج ضبط تولید کے رسم کو بھی دشواریوں کی اسی قسم کے حل کا ذریعہ ٹھیرایا جا رہا ہے۔ پڑھیئے قرآن میں پڑھیئے قتل اولاد کی ممانعت کا جہاں بھی ذکر ہے، وہاں اسی کے ساتھ من خشیة املاق (افلاس کے اندیشہ) کا بھی تذکرہ کیا گیا ہے ۱۲

اس جانگداز فعل کو اس ملک میں اب تک تو دہرایا نہیں گیا ہے، لیکن یہ تو جاہل عرب اپنی جاہلیت کے دور میں کرتا تھا، آج تعلیم یافتہ یورپ و امریکہ میں پیدا ہونے کے بعد نہ سہی، پیدا ہونے سے پیشتر ہی بچوں کے گلے ماؤں کے پیٹ ہی میں برتھ کنٹرول وغیرہ کی مختلف تدبیروں سے جو گھونٹے جا رہے ہیں: کیا اس کی وجہ اس کے سوا اور بھی کچھ ہے کہ دوسروں سے چھیننے کی ہمت جو اپنے اندر نہیں رکھتے "مالی سب جنم" کے ان عاشقوں نے اپنے قدرتی سرمایہ کو بچانے کی یہ تدبیر پیدا کی۔ تب کہ قدرتی معیشت کی پریشانیوں میں جن سے اضافہ کا اندیشہ ہے اپنے ان بچوں کو پیدا ہونے سے پہلے ہی زندگی کے حقوق سے محروم کر دیا جائے۔

اور قصہ کیا یہیں ختم ہو جاتا ہے، آج نہیں[سلہ] کہ آج تو "دشمن کشی" کے مشاغل میں یہ ممالک مشغول ہیں، لیکن ان ہی دنوں میں جب تک "دشمن کشی" کا یہ قصہ نہیں چھڑا تھا، کون نہیں جانتا کہ "قدرتی معیشت" ہی کے متعلق ان ممالک کے باشندوں کے غلط احساسات نے ان کے لئے "اولاد کشی" ہی نہیں کہ "اولاد" پھر بھی غیر ہی ہوتی ہے، بلکہ "خود کشی" کے فعل کو بھی ان کا ایک محبوب فعل بنا دیا تھا، ان ہی دنوں کے اخباروں کی یہ خبریں کس سے پوشیدہ ہیں کہ بعض علاقوں میں "خود کشی" کو آسان بنانے کے لئے باضابطہ انجمنیں اور کلب قائم تھے، رسالے نکلتے تھے جن میں لوگوں کو یہ بتایا جاتا تھا کہ بسہولت تمام اپنی زندگی کے قصہ کو وہ کس طرح ختم کر سکتے ہیں، پولینڈ، آسٹریا وغیرہ کا نام اس سلسلہ میں سب سے آگے تھا۔

۱۹۲۷ء ۲۔ مارچ کی اشاعت میں سنڈے اکسپریس اخبار میں بریگیڈ ہیری گارڈن کا ایک بیان "خود کشی کے واردات" کے متعلق شائع ہوا تھا، جس میں انھوں نے اعلان کیا تھا کہ

"ان کی رائے میں خود کشی کا سب سے بڑا سبب خانگی اور مالی دشواریاں ہیں (سچ ۱۱۔ اپریل ۲۷ء)

چونکہ ہیری گارڈن کے مطالعہ کا خاص مضمون خود کشی کے واردات ہی تھے، اس لئے ان کے بیان کو بہت اہمیت دی جاتی تھی، اسی بیان میں انھوں نے یہ بھی ظاہر کیا تھا کہ

"ہر ہفتہ اوسطاً آٹھ آدمی زبانی یا تحریراً مجھے اپنے ارادۂ خود کشی سے مطلع کرتے رہتے ہیں۔ دوسرے جو خود کشی پر آمادہ رہتے ہیں مگر زبان سے اقرار نہیں کرتے ان کی تعداد انگلستان میں ہر سال پانچ ہزار تک پہنچتی ہے۔" (اخبار مذکور)

دیکھا آپ نے نظریۂ ابلائیت کا انکار قدرتی معیشت میں بھی بالآخر لوگوں کو کس چیز پر راضی ہونے کے لئے مجبور کرتا ہے انھوں نے اپنی قدرتی زندگی کا رشتہ جب خدا سے توڑا، تو اس رشتے کے توڑنے کے جو لازمی نتائج ہیں ان سے اپنے آپ کو وہ کیسے بچا سکتے تھے، یہی لوگ ہیں جن کے متعلق قرآن میں پوچھا گیا ہے۔

سلہ اس کا خیال کتاب پڑھنے والوں کو رکھنا چاہئے کہ کتاب جس وقت لکھی جا رہی تھی اس وقت یورپ اپنی دوسری جنگ اعظم میں مبتلا تھا ۱۲

ومن یظن ان لن ینصرہ اللہ فی الدنیا والاٰخرۃ فلیمدد بسبب الی السماء ثم لیقطع فلینظر ھل یذھبن کیدہ ما یغیظ۔

اور جو خیال کرتا ہے کہ نہیں مدد کرے گا اللہ اس کی دنیا میں اور آخرت میں تو تانے وہ ڈوری کسی بلندی میں پھر پھانسی لگا کر اس کو کاٹ دے اور دیکھے کہ یا اس چال سے کیا اپنے دل کے غم وغصہ کا ازالہ وہ کر پایا،

اس موقعہ پر ایک اور شخصی واقعہ کا ذکر شائد اس قرآنی اشارے کے سمجھنے میں زیادہ مددگار ثابت ہو سکتا ہے۔ مولٰنا عبد الماجد دریا آبادی نے ایک "مغربی خاتون" جس کا نام مسز کینسن تھا اسی کے متعلق یہ لکھنے کے بعد کہ

"یہ ایک حسین عورت تھی ۲۹۔ سال کی جوان عمر، شوہر موجود تھا۔ اولاد بھی ہو چکی تھی، موجود تھی، شادی پر صرف پانچ سال گذرے تھے۔"

مولٰنا کے بیان سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ نوجوانی اور عنفوان شباب کے زمانہ میں "فلم اسٹار" بننے کا موقعہ بھی مل چکا تھا لیکن آخر چند سے ہٹ کر ایک کے ہو رہنے کا اس نے فیصلہ کیا تھا۔ اب اسباب کیا تھے لیکن جیسا کہ دستور ہے، رزق جس پیمانہ پر اس کے لئے مقدر ہوا تھا وہ قدر کا پیمانہ تھا، سینمائی زندگی کی رنگ رلیوں کے بعد قدری معیشت کا یہ حال اس کے لئے ناقابلِ برداشت بن گیا جس تمدن وتہذیب میں وہ پیدا ہوئی تھی، ظاہر ہے کہ خدا اور اس کی نصرتوں سے مایوس تمدن اور مایوس تہذیب تھی، ایسی حالت میں جو تحریری فیصلہ اس نے کیا اسی کو پیش کرنا میرا مقصود ہے۔ اس کی خود نوشتہ تحریر کا ترجمہ ہے۔

"میں مالی مشکلات سے جن کا کوئی حل نہیں مجبور ہو کر اپنی زندگی کا خاتمہ کر رہی ہوں، میری آمدنی اتنی رہی جس سے خود میری اور میری بچی کی گذر ہو سکے، شوہر سے میرا افتراق ہو چکا ہے۔ میری ایک اولاد کی وہ پرورش کر رہا ہے، میرے دوست واحباب ایسے موجود ہیں جو مجھے مالی امداد دے سکتے ہیں لیکن اس کے بعد ان کے دلوں میں میری محبت اور قدر باقی نہ رہے گی۔"

اس تحریری فیصلہ کے بعد الٰہی اعانتوں اور خدائی نصرتوں سے اس مایوس تمدن میں پیدا ہونے والی اس عورت نے کیسی عجیب بات ہے کہ جس کا قرآن میں اشارہ کیا گیا تھا یعنی فلیمدد بسبب الی السماء (چاہیئے کہ چھت میں رسی لٹکائے) ثم لیقطع (پھر اسے کاٹ دے) گویا اسی حکم کی تعمیل و تجربہ کی راہ بتاتے ہوئے اپنا اور اپنی بچی کا اس نے خاتمہ کر دیا، لیکن جیسا کہ قرآن میں پوچھا گیا ہے۔

فلینظر ھل یذھبن کیدہ ما یغیظ۔

پھر دیکھے کہ کیا اس چال نے بھی اس کے دل کے غم وغصہ کا ازالہ کیا؟

اس کے دل میں بھی اس کا خیال آیا، مردہ ضمیروں میں زندگی کے بعض جراثیم موجود ہوتے ہیں، خصوصاً موت کے وقت کسی نہ کسی حد تک ان زندہ جراثیم کی حرکت کا احساس ہوتا ہے، اسی احساس کو دبانے کے لئے اس عورت نے یہ بھی لکھا تھا،

"میں اپنی بچی کو بھی اپنے ساتھ ختم کئے دیتی ہوں، اس لئے بھی ختم کرتی ہوں کہ اگر وہ حسین نکلی اور میرے خیال میں وہ حسین نہیں ہے۔ تو کوئی اسے پوچھے گا بھی نہیں، میں ہی اس بچی کو وجود میں لائی تھی، اور میں ہی اس کو ختم بھی کر دیتی ہوں،

جو سوالات اس کے دل میں اٹھ رہے تھے، معاذیر کے ان ہی پردوں کو ان پر ڈال رہی تھی۔[1]
آخر میں اس نے یہ بھی لکھا تھا،

"مجھے یقین ہے کہ میں اپنی اور اپنی بچی کی جان لینے میں حق بجانب ہوں، اخبار میں چھپتا رہتا ہے کہ مردوں کے مقابلے میں عورتوں کی تعداد اتنی زیادہ ہے، خیر اس زیادتی سے بقدر دو عورتوں کے تو کمی ہو ہی جائے گی"

لیکن ظاہر ہے کہ دم نکلنے کے بعد اس کی یہ ساری چالیں اور اس کا کید قطعاً اس کے لئے نفع بخش نہ ہوا نہ ہو سکتا تھا، جیسا کہ موت سے پہلے کی زندگی جو الرحمن کے ذکر سے الگ ہو کر گذر رہی تھی۔ اس کے متعلق اس نے لکھا تھا کہ "میں نے زندگی کو اپنے حق میں ایک مصیبت پایا۔ میری زندگی کا کوئی حصہ چین سے نہ گذرا۔ میں نے مردوں کو درندہ پایا۔ کوئی مرد اپنی غرض کے بغیر مجھے پوچھتا بھی نہیں، اس لئے اس بچی کو میں اس مصیبت میں ڈالنا نہیں چاہتی!"

من اعرض عن ذکری	اور جو کترایا میری یاد سے اس کے لئے ہی
فان لہ معیشۃ ضنکا.	معیشت تنگ اور تنگیوں سے بھری ہوئی۔

کی یہ کتنی کھلی تفسیر اور اس کی تصدیق کی کتنی واضح شہادت ہے۔

حقیقت تو یہی ہے کہ بجائے ابتلا و امتحان کے موجودہ زندگی اور اسی کی راحتوں اور نعمتوں کو اول و آخر مان کر خدائی ذمہ داریوں سے بے پروا ہو کر جو جیتے ہیں، اگرچہ بظاہر وہ بھی جیتے ہیں، لیکن سچ پوچھئے تو وہ ہر وقت موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا رہتے ہیں، آپ دیکھ رہے ہیں ایک جوان اور حسین عورت کہ جوانی اور بہار کے دن جس نے ہر قسم کے قیود سے آزاد ہو کر گذارے، سینما کے افق پر ستارہ بن بن کر چمکتی رہی، لیکن وہی اقرار کرتی ہے کہ

میں نے زندگی کو اپنے حق میں مصیبت پایا، میری زندگی کا کوئی حصہ چین سے نہیں گذرا۔

---

[1] اشارہ قرآن کی مشہور آیت ... بل الانسان علی نفسہ بصیرۃ ولو القیٰ معاذیرہ (بلکہ آدمی اپنے آپ کو دیکھنے والا ہے خواہ اپنے عذروں کے پردے ہی کیوں نہ ڈال رکھے) کی طرف ہے ۱۲

کوئی حصہ" کا لفظ قابلِ غور ہے جس کا کھلا ہوا مطلب یہی ہے کہ سبطی اور قدری معیشت کے دونوں حالات میں معیشت خشک اور تلخ زندگی ہی وہ گذارتی رہی، یہی اس کا اعتراف ہے اور اس کی زندگی کے دونوں کے تجربہ کا یہ آخری نتیجہ ہے۔ آخر دلوں کو دنیاوی دولت و ثروت کے ساتھ جب اس طرح جوڑ دیا جائے کہ وہی سب کچھ بن کر رہ جائے، نہ ہونے کی صورت میں ہونے کے ولولے اور جذبات اور ہونے کی صورت میں زوالِ نعمت کے اندیشے اور خطرات اس قسم کے نفوس کے لئے جس طرح سوہانِ روح بنے رہتے ہیں، ان کا اندازہ بہ نسبت دوسروں کے خود ان ہی کو زیادہ ہو سکتا ہے اخبار سچ ہی میں ایک دفعہ دنیا کے سب سے بڑے ہنسوڑ، خود ہنسنے اور دوسروں کو ہنسانے والے نقال چارلی چاپلن کے متعلق یہ خبر امریکن و یوروپین اخبارات کے حوالے سے چھپی تھی۔ مولینا عبدالماجد صاحب نے لکھا تھا۔

پچھلے دنوں انگلستان و امریکہ کے جتنے اخبار موصول ہوئے۔ سب میں غم کا یہ افسانہ موجود تھا، یعنی چارلی چاپلن کی لیڈی صاحبہ مسز چاپلن نے اپنے شوہر نامدار پر دعویٰ دائر کر دیا جو ہر طرح کے گفتہ و ناگفتہ الزامات پر شامل ہے، اور جس کی بنا پر یہ چارلی چاپلن کی برسوں کی کمائی، لکھوکھا روپیہ کی جائداد خطرے میں ہے۔"

مولینا نے اس کے بعد جو بات لکھی تھی وہی مستحق ہے کہ ذرا دیدۂ عبرت و بصیرت سے اسے پڑھا جائے، لکھا تھا،

ان راویوں کے بیان کے بموجب اب چارلی کے جسم پر پر تکلف لباس کی جگہ چیتھڑے لگے ہوئے ہیں، چہرے پر ہوائیاں چھوٹ رہی ہیں، صورت پر وحشت برسنے لگی ہے، پیرانہ سالی کے آثار اس پر طاری ہو گئے، صورت اتنی بدل گئی کہ پہچاننا دشوار ہے۔

آخر میں نیوز آف ورلڈ لندن کے حوالے سے مولینا نے نقل کیا تھا،

"کل جو دنیا کا زندہ ترین دل تھا، وہ آج دنیا کا مردہ ترین شخص ہے (سچ ۱۴ مارچ ۱۹۲۷ء)

اللہ اللہ جو اپنے چہرے اور اس کی کیفیات کو دل کے حالات سے جدا رکھنے کی عمر بھر مشق کرتا رہا۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ "مال کے حب جم" اور سرمایہ کے "عشق مفرط" نے اس کو کتنا متاثر کیا تھا کہ مصنوعی حالات کے طاری کرنے کی بھی ساری مہارت غائب ہو گئی اور جو آگ اس کے دل میں بھری ہوئی تھی اسی کے شعلوں نے چہرے کی ساری مصنوعی بشاشتوں کو جلا کر خاک سیاہ بنا دیا، اور یہ قدری معیشت میں مبتلا ہو جانے کے خطرے، صرف خطرے کے احساس کا اثر تھا، پھر اسی سے اندازہ کیجئے ان مسکینوں کی نفسیاتی کیفیتوں کا جو واقعی ان ممالک میں قدری زندگی گذار رہے ہیں اور گذارنے پر مجبور ہیں، نظریۂ ابتلائیت کا انکار کرا کے انکے مفکرین اور رہنماؤں نے جن ذہنی اور فکری انگاروں، دہکتے ہوئے انگاروں پر لوٹنے کے لئے ان کو چھوڑ دیا ہے، معاذ اللہ اس کی سوزش و تپش کا کوئی ٹھکانہ ہو سکتا ہے

باہر کی دوزخ کا انکار یقین کیجئے کہ ایسوں کے لئے خود ان کے اندر دوزخ بن کر بھڑک اٹھتا ہے، بنانے
والے نے آدمی کی فطرت یوں ہی بنائی ہے، ان ہی خصوصیتوں کے ساتھ بنائی ہے۔ قدری معیشت کا
وہ حال جس میں انسان کا خدا اور خدا کی مشیت خدائی رحمت و نصرت سے رشتہ توڑ دیا گیا ہو،
قدری زندگی کو بزور بسیطی زندگی سے بدل دینے کا سارا اقتدار و اختیار جہاں خود انسان ہی کے سپرد
کر دیا گیا ہو، وہی جس کی تعبیر اس زمانے میں یہ کی جاتی ہے کہ اپنی تقدیر کا معمار ہر شخص بذات خود
ہے، ناکاموں کو تو اس وقت جانے دیجئے، میں ذکر ان لوگوں کا کر رہا ہوں جو یہ سب کچھ سیکھ کر
سکھا کر پھر بھی اپنی تقدیر کی تعمیر میں ناکام رہتے ہیں، اور حالات ان کو ناکام رہنے پر مجبور کرتے ہیں
وہی جن کے قلبی انگاروں اور باطنی جہنم کو ٹھنڈی کرنے کے لئے آج اشتراکیت کا جھنڈا اڑایا گیا ہے
سرمایہ داری اور سرمایہ بے زاری کی اس کش مکش کا انجام کیا ہوگا؟ ابھی تو وہ سامنے نہیں ہے،
لیکن سوال ان سے ہے جو اس وقت جل رہے ہیں، اور ان سے پہلے [illegible] جن بیچاروں نے
اپنی قدری زندگیوں کو دوزخ بنا بنا کر گذاری ہے، ان کے ساتھ یقیناً یہی کیا گیا کہ دماغ سے دوزخ کا
خیال نکال کر ان کے دلوں میں دوزخ بھر دی گئی۔ اس وقت تک بھری ہوئی [illegible] ہے۔

حالانکہ میں سچ کہتا ہوں، پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ یہی قدری معیشت [illegible] انسانیت کے لئے
آج جہنم بنی ہوئی ہے۔ ابتدائی نظریہ کی راہ نمائی میں اسی زندگی کے [illegible] اور آج
بھی خدا کے فضل سے ایک بڑی تعداد [illegible] اسی زندگی کو گذار رہی ہے بخوشی و سکون گذار
رہی ہے، اگر اپنی زندگی کو وہ جنت کی زندگی نہیں بنا سکے ہیں تو اتنی بات یقینی ہے کہ اس جہنم میں بھی
انھیں جلنا نہیں پڑا [illegible] جہنم کے [illegible] کرنے والوں کو آج [illegible] اور [illegible]
پیتے دیکھا جا رہا ہے۔ [illegible] تو جس جنت کو آج خیال صرف خیال ٹھہرایا جا رہا ہے، میں تو دیکھ
رہا ہوں کہ اس جنت کے خیال نے بھی ان بہتوں کی زندگیوں کو جنت بنا دیا ہے، انسانی آبادیوں
میں آج بھی اگر ڈھونڈھا جائے تو گو ان کی تعداد گھٹ چکی ہے اور گھٹتی ہی چلی جا رہی ہے لیکن پھر
بھی آپ کو ایسے افراد ان ہی انسانوں میں مل جائیں گے جن کی زندگی کو جنت [illegible] خیال نے صرف
خیال نے جنت بنا رکھا ہے، [illegible] سروں کو اختیار ہے خواہ وہ کچھ ہی سمجھیں، لیکن میں تو یہی سمجھتا ہوں
اور ان لوگوں کو جب کبھی دیکھتا ہے تو ہمیشہ یہی اثر دل میں پیدا ہوا ہے کہ جس کا خیال بھی جنتی زندگی
بنانے کی ضمانت اپنے اندر رکھتا ہے، اس جنت کی واقعی حقیقت اپنے اندر مسرت و نشاط کے
کن سمندروں کو سمیٹے گی۔

لوگوں نے سمجھا نہیں ورنہ دین [illegible] مذہب کا وہ حصہ جس کے نتائج کا براہ راست تعلق
الآخرۃ سے سمجھا جاتا ہے، اور کوئی شبہ نہیں کہ مذہب اور مذہبی کاروبار کے نتائج کا [illegible]
بھی آخرت ہی کے ساتھ، لیکن اصلاً نہ سہی ذیلی طور پر اس کا انکار نہیں کیا جا سکتا کہ شعوری یا غیر شعوری
طور پر دنیا کی زندگی میں بھی دین یقیناً انقلاب پیدا کرتا ہے۔ یہ دیکھا جا رہا ہے۔ [illegible]

تجربہ شاہد ہے کہ دین کی دوزخ کا خوف جس حد تک جس کی زندگی پر مسلط ہوتا چلا گیا ہے، اسی حد تک دنیا کی دوزخوں کا دکھ بھی اس کے لئے سکھ کی شکل اختیار کرتا چلا گیا ہے، پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی دعاؤں کا یہ فقرہ

من الیقین ما تھون بہ علینا مصائب الدنیا۔ — اے پروردگار اضافہ فرمائیے میرے یقین کی قوت میں جس کے ذریعہ سے دنیا کی مصیبتیں ہلکی پڑتی چلی جاتی ہیں۔

میں تو سمجھتا ہوں کہ اس کا یہی مطلب ہے اور بجنسہ یہی حال دین کی جنت کا بھی ہے کہ جس کا جتنا زیادہ اعتماد دین کی اس جنت پر بڑھتا چلا گیا ہے، دنیا ہی میں اس پر جنت کے دروازے کھلتے چلے گئے ہیں۔

اب لوگوں کو کیا کہئے وہ آدم کی اولاد سے نیکی اور نیک کرداری کا مطالبہ کرتے ہیں کہ ان میں ہر ایک کو جو امانت بھی سپرد کی جائے بغیر کسی خیانت کے امانت کے فرائض کو وہ انجام دیتا چلے۔ ان غریبوں پر پیشانیاں چڑھائی جاتی ہیں جو حکومت کے محکموں میں رشوتیں لیتے ہیں، رعایا کو بھی لوٹتے ہیں اور جس حکومت کے ملازم ہوتے ہیں موقعہ ملنے پر اس کی آمدنیوں سے بھی نفع اٹھاتے ہیں ان مسکینوں کے خلاف ایک ہنگامہ برپا ہے جو تجارت میں دھوکے دیتے ہیں، صنعتی دستکاریوں میں فریب سے کام لیتے ہیں، ان کے لئے قانون پر قانون بنائے جا رہے ہیں، تعزیری دفعات ڈھالے جا رہے ہیں، جیلوں کی دھمکیاں دی جا رہی ہیں، سوسائٹی میں ان کو رسوا کیا جاتا ہے، لعنتوں اور ملامتوں سے ان کے قلوب کو لوگ چھلنی بنائے ہوئے ہیں، حالانکہ سوچنے کی بات یہ تھی کہ جہنم کا خوف جن کے دلوں سے نکال دیا گیا ہے اور نکال دینے کی مسلسل کوشش جاری ہے، کالجوں میں، اسکولوں میں، تصنیفوں میں، اخباروں میں، رسالوں میں، سینماؤں میں اور تماشا گاہوں میں، مجلسوں میں اور کلبوں میں اور کچھ ہوتا ہو یا نہ ہوتا ہو، لیکن یہ بات کہ مرنے کے بعد بھی سزا یا جزا سے آدمی کو دوچار ہونا پڑے گا، اس کا مضحکہ ہر جگہ اڑایا جاتا ہے، یہ مذہب کا ڈھکوسلہ صرف ڈھکوسلہ ہے، ہر ایک کی قدر مشترک کوشش اسی کے باور کرانے پر مرتکز ہو گئی ہے، پھر جو آنے والی زندگی کی سزاؤں سے نڈر بنائے گئے ہیں، جہاں ڈر نہ ہو، پولیس کا ڈر نہ ہو، عدالت کا ڈر نہ ہو وہاں ان افعال کے ارتکاب سے آپ ہی بتائیے کہ وہ کیوں ڈریں، جن سے ڈرنے کا آپ ان سے خواہ مخواہ مطالبہ کر رہے ہیں، رشوت کی اس آمدنی سے وہ کیوں دست بردار ہوں، جس کی اطلاع حکومت کے دسترس سے باہر ہے وہ دھوکے کیوں نہ دیں جب جانتے ہوں کہ جسے دھوکہ دیا جا رہا ہے وہ دھوکہ کھا سکتا ہے۔ آخر لوگوں کو آپ یہ بھی سکھا رہے ہیں۔ آپ کے اساتذہ سکھا رہے ہیں۔ آپ کے ارباب تصنیف و تالیف سکھا رہے ہیں، شعراء گا رہے ہیں، مقررین سنا رہے ہیں، حتیٰ کہ بازیگروں کو تک دکھایا جا رہا ہے کہ یاد کرا رہے ہیں کہ جو کچھ یہاں اور اس زندگی میں کھویا جاتا ہے، پھر وہ کہیں پایا نہیں جاتا، صرف اسی کو ملا، جسے یہاں اور اس زندگی میں ملا۔ اس کے بعد نہ زندگی ہی دہرکر

کسی کو ملتی ہے اور نہ وہ چیزیں ملتی ہیں جن کی زندگی کو ضرورت ہے، آپ یہ بھی منواتے جاتے ہیں، اب میں آپ کو اور آپ کی عقل کو کیا کہوں کہ اسی کے ساتھ یہ بھی بڑبڑاتے جاتے ہیں کہ اس روپے کو ہاتھ مت لگانا جس کے لینے کی قانون اجازت نہیں دیتا، کیا قانون کے روکے ہوئے روپے کو چھوڑ دینے سے قانون پھر اس رقم کو مجھ تک پہنچا سکتا ہے، آپ نے انسان کی فطرت کا مطالعہ اگر کیا ہے تو کیا کیا ہے جس پر بغیر کسی خطرے کے قبضہ کیا جا سکتا ہے، ان پیسوں کو کوئی کیوں چھوڑے، جب تک یہ نہ باور کرایا جائے کہ ان پیسوں کے چھوڑنے والوں کو روپیہ دیا جائے گا لیکن روپیہ تو روپیہ ان چھوڑے ہوئے پیسوں کے معاوضہ میں کوڑی دینے کے لئے بھی آپ تیار نہیں، پھر یہ کتنا غیر فطری مطالبہ ہے کہ ان پیسوں کو چھوڑ دیا جائے، انھیں حرام سمجھا جائے صرف رشوت، چوری، خیانت، بد دیانتی وغیرہ کے مذہبی الفاظ فقط الفاظ سے آپ کب تک فائدہ اٹھائیں گے، جب خود اپنے ہاتھوں اس دیوار کو ڈھا رہے ہیں جس پر ان الفاظ کے زور کی بنیاد قائم ہے، مولینا رومی نے سچ فرمایا ہے،

تا نہ بیند کودکے کو سیب ہست — او پیاز گندہ را ندہد ز دست

اور کودک یا بچوں کی فطرت کا جو حال ہے کہ سڑی پیاز کو ہاتھ سے اسی وقت چھوڑ سکتے ہیں جب اس کی جگہ سیب انھیں پکڑایا جائے، یہی فطرت جوانوں اور بوڑھوں میں بھی عمل کرتی رہتی ہے، تبدیلی جو کچھ بھی ہوتی ہے باہر میں ہوتی ہے۔ لیکن "اندر" ہر حال میں سب کا ایک ہی رہتا ہے، قرآن مجید کی آیت

اعلموا انما الحیوۃ الدنیا	جانو اس بات کو، کچھ نہیں ہے یہ پست
لعب ولھو وزینۃ وتفاخر	زندگی لیکن لعب (کھیل) اور لہو (غفلت)
بینکم وتکاثر فی الاموال	اور زینت (بناؤ سنگار) اور باہم آپس میں
والاولاد۔	تفاخر (ایک کا دوسرے کے مقابلہ میں

فخر کرنا) اور اموال (سرمایہ) اولاد کی کثرت میں مقابلہ۔

میں آدمی کی موجودہ پست دنیاوی زندگی کو بظاہر پانچ ادوار میں جو تقسیم کیا گیا ہے، مشاہدہ سے بھی جس کی تصدیق ہو رہی ہے یعنی پیدا ہونے کے بعد آدمی پر پہلا حال جو طاری ہوتا ہے اس کی تعبیر لعب سے کی گئی ہے، لعب کھیل کود کا نام ہے یا الفاظ دیگر ایسے اعمال و افعال جو اپنے اندر کسی نتیجہ کو نہیں رکھتے۔ عام خیال یہی ہے کہ بچپن میں بچے مثلاً مٹی خاک دھول کے گھروندے بنا بنا کر خوش ہوتے ہیں، حالانکہ نہ ان گھروں میں کوئی رہ سکتا ہے نہ ان سے اور کسی قسم کا فائدہ کوئی اٹھا سکتا ہے، اس قسم کا کام آدمی صرف ابتدائی زندگی ہی میں کرتا ہے، اس وقت تک کرتا رہتا ہے جب تک اس میں دنیا کے سمجھنے بوجھنے کی صلاحیت پیدا نہیں ہوتی۔ لیکن جب یہ دور گذر جاتا ہے تو اس کے بعد آدمی جو کچھ کرتا ہے، شائد اس کی نوعیت یہ نہیں ہوتی، ایام طفولیت کے کسی

دور کے گذرنے کے بعد جو کچھ عام حالات میں کرنے والے کرتے ہیں، پہلے ان کی فہرست مرتب کرنی چاہیئے۔ تب معلوم ہو سکتا ہے کہ اس عام خیال میں حقیقت کا حصہ کتنا شریک ہے۔ قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلے دور لعب والے کے گذرنے کے بعد یہ چار دور آدمی پر اور آتے ہیں۔

(۱) لہوی دور کے معنی غفلت کے ہیں، طفولیت کے ختم ہونے کے بعد جب شبابی محرکات کا انسانی دماغ پر استیلا ہوتا ہے، وہی جس کا نام جوانی دیوانی رکھا گیا ہے، یہ غفلت اور سرمستی کا دور ہوتا ہے، ہر چیز سے غافل ہو کر عام حالات میں دیکھا یہی جاتا ہے کہ لوگ ان ہی جذبات اور ولولوں میں ڈوب جاتے ہیں جن کا تقاضا جوانی کے ان دنوں میں زور پکڑتا ہے۔

(۲) پھر اسی کے ساتھ ساتھ اور اسی کے پیچھے پیچھے بننے اور سنورنے کا جذبہ آدمی پر مسلط ہوتا ہے صورت شکل کیسی ہی کچھ کیوں نہ ہو، لیکن جسے بھی دیکھئے نظر آتا ہے کہ اپنے بالوں کے ساتھ کھیل رہا ہے، سر، داڑھی، مونچھ کو اپنا تختۂ مشق بنائے ہوئے ہے، لباس میں، خیال میں، [illegible] الغرض اپنی اپنی بساط کے مطابق زیب و زینت میں عموماً لوگ مشغول ہو جاتے ہیں۔ اسی کا نام قرآن نے جیسا کہ میں سمجھتا ہوں "زینت" رکھا ہے، یہ فیشن اور بناؤ سنگار کا دور ہوتا ہے۔

(۳) یہ دور بھی بتدریج گذر جاتا ہے، گذرتا رہتا ہے کہ اپنے اپنے دائرے میں بعض بعض کو اپنا مقابل بنا کر اس کے بعد دیکھا جاتا ہے کہ لوگ ان مشغلوں میں مصروف ہیں جن کا قرآن نے تفاخر نام رکھا ہے۔ اپنے نسب پر اپنے کمالات و صفات پر، شکل پر صورت پر نظر آتا ہے کہ ہر ایک ناز کر رہا ہے اور کیسا ناز؟ کہ گویا اس کے مقابلہ میں دوسرا کچھ نہیں ہے۔

(۴) ان سب کے بعد آخری میدان جس میں بہر حال ہر ایک کو بالآخر قدم رکھنا ہی پڑتا ہے وہ وہی ہے جس کا نام لوگوں نے "عمل کا میدان" رکھا ہے۔ دراصل "عائلی زندگی" یا گھر گرہستی کی زندگی ہی کا نام عمل کا میدان رکھا گیا ہے، اور زندگی کا یہی دور سب سے زیادہ اہم سمجھا جاتا ہے، لیکن اس دور میں داخل ہو کر کرنے والے جو کچھ کرتے رہتے ہیں، اگر غور کیا جائے تو وہی بات حقیقت معلوم ہوگی جسے قرآن میں

تکاثر فی الاموال والاولاد   اموال اور اولاد کی کثرت میں باہم مقابلہ

کے الفاظ میں ادا کیا گیا ہے،

وہی بات یعنی ہر دائرے والے چند خاص افراد کو سامنے رکھ کر مقابلہ کا بازار گرم کرتے ہیں۔ عملی میدان کی اس زندگی میں پہلے تو دولت و ثروت کا مقابلہ لڑا جاتا ہے، تنخواہیں ناپی جاتی ہیں آمدنیوں کا موازنہ کر کر کے اندر ہی اندر ہر ایک دوسرے کے مقابلہ میں آگے بڑھ جانے کی فکر دل اور کوششوں میں منہمک رہتا ہے۔ "الاموال" کے بعد پھر "الاولاد" کا مقابلہ شروع ہو جاتا ہے، بیٹے گنے جاتے ہیں، بیٹیاں شمار ہوتی ہیں، اور موقعہ مل جاتا ہے تو مقابلہ کے اس میدان کو پوتوں اور پروتوں نبیروں اور نواسوں تک وسیع کر دیا جاتا ہے۔

الاموال والاولاد کے تکاثر کو یہی مشغلہ عموماً ہم سے اکثروں کی زندگی کا آخری مشغلہ ہوتا ہے۔ دم توڑ دینے والے اسی نقطہ پر پہنچ کر دم توڑ دیتے ہیں، مشرق ہو یا مغرب، قدیم دنیا ہو یا جدید ہر جگہ یہی تماشا ہے جو بنی آدم کے گھرانوں میں کھیلا اور دیکھا جا رہا ہے۔

سوال یہ ہے کہ زندگی کے ان پانچ ادوار میں سے طفولیت کے پہلے دور کے مشاغل کی نوعیت اگر لعب (کھیل کود) کی تھی، یعنی کرنے والے زندگی کے اس ابتدائی دور میں جو کچھ بھی کرتے رہتے ہیں، وہ لاحاصل اور بے نتیجہ ہوتے ہیں، اسی لئے نگاہوں میں ان اعمال و افعال کی کوئی قیمت نہیں ہوتی، تو چار دور جو اس کے بعد آتے ہیں، یعنی لہو یت، زینت، تفاخر، الاموال والاولاد میں تکاثر، ان ادوار میں جو مشاغل انجام دیئے جاتے ہیں، اگر ان کو بھی اسی نقطہ نظر سے جانچا جائے یعنی سوچا جائے کہ کوئی حاصل، کوئی نتیجہ ان کا بھی ہے یا نہیں، تو میں نہیں جانتا کہ فرق پیدا کرنے والے لعبی دور کے طفلانہ اعمال اور باقی چار کانہ ادوار کے اعمال و افعال میں کیا فرق پیدا کر سکتے ہیں؟ پھر سب کچھ کر کرا لنے کے بعد غور کرنے والوں کو ایسا کونسا نتیجہ اور حاصل ہاتھ آتا ہے جسے واقعی حاصل اور نتیجہ قرار دیا جا سکتا ہے، اسی کے بعد قرآن ہی میں جو مثال بیان کی گئی ہے، یعنی

كمثل غيث اعجب الكفار	مانند بارش کے کہ مسرور کرتی ہو کسانوں کو
نباته ثم يهيج فتراه مصفرا	اس کی روئیدگی، پھر لہرانے لگتی ہیں (اس کی)
ثم يكون حطاما۔	روئیدگیاں، پھر دیکھتے ہو کر پیلی پڑ گئیں

وہی، پھر ہو جاتی ہیں وہی چورا چورا (یعنی بیلوں سے روندکر ان کو بھوسہ وغیرہ بنا لیتے ہیں)

جس کا حاصل یہی ہے کہ بارش کا پانی آسمان سے زمین پر آتا ہے، روئیدگیوں کو یہی بارش اگاتی ہے۔ ہریالیاں اور کھیتیاں لہلہا اٹھتی ہیں، پھر وہ زرد پڑنے لگتی ہیں، بالآخر گھاس بھوسہ بن کر ختم ہو جاتی ہیں، جیسے یہ سارا تماشا بارش کا ہوتا ہے، یوں ہی زندگی کی نمائش انسانی اجساد میں سے کسی جسد میں ہوتی ہے، زندگی اسی جسد کو طفولیت شباب اور شیخوخت (پیرانہ سالی) کے ادوار سے گذارتے ہوئے اس نقطہ پر پہنچا دیتی ہے جس پر زندگی کی اس نمائش کا خاتمہ ہو جاتا ہے، سوال یہ ہے کہ بارش کے اس تماشے سے خود بارش کو جیسے کچھ ہاتھ نہیں آتا، انسانی جسد میں نمایاں ہو کر مختلف ادوار سے گذرنے والی زندگی ان تمام ادوار اور ان کی تمام نمائشوں سے خود اپنے لئے کس نتیجہ کو حاصل کرتی ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ بارش اور نباتی شکلوں میں بارش کی نمائشوں سے بارش کا پانی جیسے کسی نتیجہ کو حاصل نہیں کرتا، بجنسہ یہی حال اس زندگی اور الحیٰوۃ الدنیا کا ہے جس کا ظہور انسانی جسد میں ہوتا ہے اور ادوار پنجگانہ سے گذر کر موت پر جس کا خاتمہ ہوتا ہے، بجائے بارش کے بارش کی نباتی نمائشوں سے الکفار (کسان) لذت گیر ہوتے ہیں، کچھ یہی حال ہمارا بھی ہے کہ ہم میں ہر ایک کی زندگی اور زندگی کے ادوار دوسروں کے لئے ایک تماشے ہوئے ہیں، لیکن خود زندگی والے کو اپنی زندگی اور اس کے ان ادوار سے کوئی نتیجہ ہاتھ نہیں آتا، یوں ہی لوگ پیدا ہوتے جاتے ہیں اور

بچے بنتے ہیں، جوان ہوتے ہیں، بوڑھے بنتے ہیں اور مرجاتے ہیں، مرتے چلے جارہے ہیں اور کاش! بات اسی پر ختم ہو جاتی، یعنی الحیوٰۃ الدنیا اور اس کی مختلف نمائشیں بے نتیجہ اور لاحاصل ہو ہو کر یونہی ختم ہوتی چلی جاتیں جیسے بارش اور اس کی نمائشیں خود بارش کے لحاظ سے بے نتیجہ منتج ہوتی چلی جاتی ہیں، لیکن قرآن میں آگے جو یہ اطلاع دی گئی ہے کہ

وفی الاٰخرۃ عذاب شدید (اور اس پہلے تماشے حیوۃ دنیا کے بعد
ومغفرۃ من اللہ ورضوان پچھلی زندگی میں سخت مار ہے اور مغفرت
الحدید ۹ ع ۲) بھی اللہ کی طرف سے اور "رضوان" بھی ہے
(یعنی حق تعالیٰ کی رضامندی)

جس کا یہی مطلب ہوا کہ اپنی ان نمائشوں کو ختم کر کے انسانی زندگی ختم نہیں ہو جاتی، یعنی اس طور پر ختم نہیں ہو جاتی جیسے بارش کی نباتی نمائشیں ختم ہو جاتی ہیں، بلکہ بجائے ختم ہونے کے آدمی کی زندگی کو دو باتوں یعنی عذاب شدید (سخت مار) سے دو چار ہونا پڑتا ہے یا اس کے سامنے مغفرت کا وہ سرچشمہ آتا ہے جس میں غوطہ لگانے والے ہر قسم کی آلودگیوں سے پاک و صاف ہو کر اپنے تمام احساسات وجذبات کے مطابق دائرۂ وجود کی اس مرکزی طاقت کو پا لیتے ہیں جس کی کوئی حد اور انتہا نہیں ہے، قرآنی اصطلاح میں جس کا نام "رضوان" اور "رضوان اللہ" ہے۔

الحیوٰۃ الدنیا کی پست زندگی اپنے ادوار کے ساتھ جب ختم ہو جاتی ہے تو اس کے بعد کیا ہوتا ہے؟ نفیاً یا اثباتاً جو اس کا جواب نہیں دے سکتے، نہ ان کے حواس دے سکتے ہیں اور نہ ان کی عقل دے سکتی ہے، وہ اپنے اس جہل سے ظاہر ہے کہ اس علم کا مقابلہ نہیں کر سکتے جو پیغمبروں کو غیب وشہادت کے جاننے والے نے عطا کیا ہے۔ پس پیغامبروں کو واقعی خدا کے پیغامبر جو لوگ مان چکے ہیں، وہ یہ جاننے پر مجبور ہیں کہ اس پست زندگی کے بعد دوسری زندگی میں ان دو دفعات میں سے کسی ایک کے روبرو ان کو بہرحال ہونا پڑے گا، اور جب واقعہ یہی ہے تو پھر ان ہونے کے ابدی نہ ختم ہونے والے نتائج کے مقابلہ میں ہماری موجودہ "الحیوٰۃ الدنیا" اور یہ سارے بے حاصل ادوار اس کے سوا اور کیا رہ جاتے ہیں جو مذکورہ بالا آیات کے آخر میں فرمایا گیا ہے کہ

ما الحیوٰۃ الدنیا الا متاع اور نہیں ہے یہ پست زندگی لیکن صرف
الغرور۔ فریب کا ایک سرمایہ۔

آئندہ پیش آنے والے اتنے اہم الاہم نتائج سے غافل بنا کر جس بے نتیجہ زندگی نے اپنے ان لاحاصل ادوار میں آدمی کو الجھا لیا ہو، خود ہی سوچنا چاہیے کہ "سرمایۂ فریب" یا "متاع الغرور" کے سوا اس کا نام اور کیا رکھا جائے۔

خیر یہ تو ان آیات کا مطلب ہوا، میں یہ کہنا چاہتا تھا کہ لاحاصلی اور بے نتیجگی کی وجہ سے الحیوٰۃ الدنیا کا ابتدائی دور اگر لعب دورہے، طفولیت اور طفولیت کے سارے مشاغل اگر صرف

کھیل کود ہیں تو اس کے بعد آنے والے ادوار چار گانہ سوچنے والوں کی نگاہوں میں خواہ جتنی بھی اہمیت رکھتے ہوں، لیکن اپنی بے ثمری ولاحاصلی کی وجہ سے ان کو بھی لعب یا کھیل کود کے سوا اور کوئی دوسری بات آخر کیوں سمجھی جائے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ قرآن میں کبھی پوری "الحیوۃ الدنیا" ہی کو لہو و لعب کے نام سے موسوم کیا گیا ہے اور میں یہی کہنا چاہتا تھا کہ مشاغل اور کاروبار کے لحاظ سے زندگی کے مختلف ادوار میں جو کچھ بھی تبدیلیاں ہوتی ہیں وہ صرف باہر میں ہوتی ہیں، ورنہ "اندر" کا نقطۂ نظر ہر حال میں جوانی میں بھی بڑھاپے میں بھی لوگوں کا وہی رہتا ہے جو بچپن میں ہوتا ہے، یعنی نتیجہ سے بے پروا ہو کر صرف لذت و مسرت کے وقتی تقاضے کو سب ہی پورا کرتے رہتے ہیں، الا یہ کہ اپنی الدنیا کا رشتہ پیغمبروں کی راہ نمائی میں جن لوگوں نے الدین کے ساتھ جوڑ دیا ہے، جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں کہ دین سے رشتہ پیدا کر لینے کے بعد دنیا بھی بدل جاتی ہے، اس میں بھی انقلاب اور عظیم انقلاب پیدا ہو جاتا ہے، اسی لئے میں سمجھتا ہوں کہ سلجھانے والے دنیا کو بھی سلجھا نہیں سکتے، قطعاً سلجھا نہیں سکتے، جب تک وہ انسانیت کے دین کے سلجھانے میں کامیابی نہ حاصل کر لیں گے۔ دین کے بگاڑنے والوں کو آج نہیں محسوس ہوا ہے تو کل ماننا پڑے گا کہ انھوں نے انسان غریب انسان کے دین کو بگاڑ کر اس کی دنیا بھی بگاڑ دی، اور میں خیال کرتا ہوں کہ اس بگاڑ کے ظہور کا سلسلہ شروع بھی ہو چکا ہے اور جو شروع ہو چکا ہے وہ بہر حال ختم ہو کر بھی رہے گا۔ تجربات یہی ثابت کرتے چلے جائیں گے، مشاہدات یہی بتاتے چلے جائیں گے، ہم ہوں گے یا نہ ہوں گے، لیکن اس وقت جو بھی ہوں گے ان کی آنکھیں دیکھیں گی، یقیناً دیکھیں گی، وہ سب کچھ دیکھیں گی جو اس وقت کہا جا رہا ہے،

اللہ اللہ یہ سارے معاشی جھگڑے، معاشیاتی مقابلے جو افراد سے گذر کر اقوام تک کو میدان میں لے آئے ہیں، زمین انسانی رگوں کے خون سے لالہ زار بنی ہوئی ہے، آسمان آگ برسا رہا ہے، فتنہ اور فساد کے دھوئیں سے کائنات کی ساری فضا بھر گئی ہے، چیخنے والے چیخ رہے ہیں، چلانے والے چلا رہے ہیں، ازالہ کی ساری کوششیں جو ان جھگڑوں لاحاصل اور بے نتیجہ جھگڑوں کے ختم کرنے کی راہوں میں ممکن تھیں، تجربہ ہر راہ کی ناکامی کا اعلان کر چکا ہے، لیکن عقول ازالہ کی جن کوششوں میں تھک تھک در ماندہ ہو چکے ہیں، اگر سوچا جائے انصاف کے ساتھ ہر قسم کی تنگ نظریوں سے الگ ہو کر سوچا جائے تو الدنیا کا الدین سے رشتہ جوڑ کر بجائے ازالہ کے صرف امالہ کی یہ ہلکی سی تدبیر کہ مقابلہ کے سارے جذبات کا رُخ "الحیوۃ الدنیا" اور اس پست زندگی سے ہٹا کر "الحیوۃ الاخریٰ" کی بلند و دوامی زندگی کی طرف پھیر دیا جائے اور امالہ کی اسی تدبیر پر زور دیا جائے۔ اسی قدر زور دیا جائے جتنا کہ اب تک ازالہ کے لاحاصل سعی میں دیا جا چکا ہے۔ اور بجائے الدنیا کے الآخرۃ کو سامنے رکھ کر نسلِ انسانی کو دعوت دی جائے جیسا کہ قرآن نے اسی طریقۂ عمل کو اختیار کر کے

وفی ذلک فلیتنافس المتنافسون   پس چاہئے کہ مقابلہ کریں اسی میں مقابلہ کرنے والے

کی دعوت دی ہے تو میں نہیں سمجھتا کہ ازالہ کی کوششوں کی راہوں سے جن مقاصد کے حصول میں دنیا ناکام قطعاً ناکام ہو چکی ہے اور ہوتی رہے گی، ان ہی مقاصد میں امالہ کی اس معمولی تدبیر سے کامیاب نہ ہو سکے گی۔ یہ الگ بات ہے کہ لوگ امالہ ہی پر آمادہ نہ ہوں، یا زبان سے اقرار کر کے دل کے رخ کو ادھر نہ پھیریں جس کی طرف پھیرنے کا ان سے مطالبہ کیا گیا تھا لیکن منوا لینے کے بعد تو ان مقاصد میں کامیابی اصول امالہ کی تسلیم کا ایک ایسا لازمی اور منطقی نتیجہ ہے جس میں تخلف کا امکان ہی نہیں ہے، یہ کھلی ہوئی بات ہے کہ امالہ کے اس اصول پر اعتماد اسی حد تک بڑھتا جائے گا، جس حد تک مذہب پر انسانیت کے اعتماد کو آپ بڑھائیں گے، لیکن مذہبی اعتماد کے اضمحلال کا جب تک وہ حال ہے جس میں دنیا کو آج مبتلا کر دیا گیا ہے، ظاہر ہے کہ امالہ کی اس تدبیر کا ذکر مضحکہ کے سوا اور کیا ہے؟

اور یہ تھے اسلامی معاشیات کے وہ "اصولی کلیات" جن کا قرآن میں اب تک میری جستجو نے سراغ لگایا ہے، اس وقت تک تو جو باتیں سمجھ میں آئی ہیں وہ یہی ہیں، آئندہ اور چیزیں بھی جو ملتی چلی جائیں گی، انشاء اللہ ان کا اضافہ کیا جائے گا۔ بلکہ میں تو سمجھتا ہوں کہ ان ہی نمونوں کو دیکھ کر دوسرے ارباب فکر و نظر قرآن ہی سے دوسری چیزیں بھی نکال سکتے ہیں، جن پر میری نظر اب تک نہ پہنچ سکی ہے۔

البتہ آخر میں ایک چیز قرآن ہی کی ایسی ہے کہ اس کا تذکرہ اگر نہ کر دیا جائے گا تو قرآن پڑھنے والے ممکن ہے کہ بعض وسوسوں میں مبتلا رہیں:

میرا مطلب یہ ہے کہ معاشی مدارج کے جس اختلاف کی تعبیر قرآنی اصطلاح کی رو سے میں نے بسطی و قدری معیشت سے کی ہے، جیسا کہ بہ تفصیل بتا چکا ہوں کہ عام حالات میں معیشت کی یہ دونوں شکلیں ابتلائی رنگ ہی کی ہوتی ہیں، یعنی کسی کے ساتھ عمل کے نتیجہ کے طور پر رزق کی تقسیم ان دو پیمانوں پر نہیں ہوتی بلکہ الرزق کے یہ دونوں پیمانے امتحان اور ابتلا کی دو شکلیں ہیں، اور چونکہ دونوں امتحان ہیں یعنی ہر پیمانہ اپنے ساتھ کچھ ذمہ داریاں رکھتا ہے ان ہی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کی کوشش بھی ان میں ہر ایک کا نصب العین ہونا چاہیئے، پھر جیسے ہر امتحان کا قاعدہ ہے کہ اس میں شریک ہونے والوں میں بعض کامیاب ہوتے ہیں بعض ناکام، یہی حال ان لوگوں کا ہے جو معیشت کے ان دو مختلف پیمانوں پر روزی پا رہے ہیں، اسی سلسلہ میں جو کچھ مجھے کہنا تھا کہہ چکا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اس موجودہ پست زندگی (الحیوۃ الدنیا) میں جسے بھی جو کچھ دیا جاتا ہے کیا ہمیشہ ابتلائی حیثیت ہی سے دیا جاتا ہے؟ قرآن کے پڑھنے والے جانتے ہیں اور ان کو جاننا ہی چاہیئے کہ اجتماعی طور پر اقوام و امم کی خوش حالیوں اور بدحالیوں کو مکافات اور مجازات کا نتیجہ قرار دیا گیا ہے، قوموں کے عروج و زوال کی تاریخ کا جتنا حصہ قرآن میں محفوظ ہے۔ وہ یہی بتانے کے لئے محفوظ کیا گیا ہے کہ خدا اور اس کی مرضیات پر چلنے والوں سے خدا بھی راضی رہا اور خدا کے قوانین نے بھی ان سے

ہم نوائی کی، اور قدرت کے مقررہ قوانین پر چلنے سے جنھوں نے بغاوت کی یعنی شرعی قوانین سے تصادم
کی راہ جن قوموں نے اختیار کی، ان سے خدا اور خدا کے تکوینی قوانین متصادم ہونے لگے، اور اسی
تصادم کے بعد ان کے عروج کو زوال سے ترقی کو تنزل سے بدل دیا گیا، جیسا کہ میں نے عرض کیا
قرآن پڑھنے والوں کے لئے قرآن کا یہ دستور کوئی چھپی ڈھکی بات نہیں ہے، بلکہ چند کلیات
جن کے محور پر قرآنی تعلیمات گردش کرتی ہے ان میں سے قوموں کی حیات و ممات کا یہ ایک مسلمہ
اور بدیہی کلیہ ہے جس کے شواہد و نظائر کے بھی پیش کرنے کی حاجت نہیں، اس لئے میں سمجھتا ہوں
کہ نظریۂ ابتلائیت یعنی معیشت کے بسطی و قدری پیمانوں کو قرآن میں ابتلا و امتحان کی جو دو شکلیں
قرار دی گئی ہیں تو اس کا تعلق اقوام و امم کے اجتماعی حالات سے نہیں ہے بلکہ اشخاص کی شخصی
زندگیوں کا یہ قانون ہے، یہی وجہ ہے کہ اجتماعی طور پر عروج کی حالت میں کوئی قوم ہو یا زوال
کی، لیکن انفرادی حیثیت سے افراد میں روزی کی تقسیم کرنے کا یہ سلسلہ دونوں پیمانوں پر جاری رہتا
ہے، دوسرے لفظوں میں یوں کہئے کہ اجتماعی اور قومی نقطۂ نظر سے ان کا حال کچھ بھی ہو، مگر کسی نہ
کسی رنگ میں بعض افراد ان کے امیر بھی نظر آتے ہیں اور بعض غریب بھی۔ یعنی بعضوں کی آمدنی قدر حاجت
و ضرورت کے برابر اور اس کے ساتھ نپی تلی ہوتی ہے، اور بعضوں کو اس کا موقعہ مل جاتا ہے کہ ضرورت
و حاجت پر خرچ کرنے کے بعد وہ پس ماندہ بھی کر سکتے ہیں اور کرتے ہیں، الغرض قدر و بسط کے ان
دونوں پیمانوں پر افراد میں پھر بھی روزی تقسیم ہی ہوتی رہتی ہے، کم از کم انسانیت کی جو تاریخ
اس وقت تک کی موجود ہے اور قوموں کو اس زمانہ میں بھی جن حالات میں پایا جاتا ہے ان کے
افراد کی معیشت کی یہی کیفیت نظر آتی ہے، عروج یافتہ قوموں میں جیسے یہ نہیں دیکھا گیا کہ ان میں
ہر ایک شخص بسطی رزق والا بن جاتا ہے، یعنی سب امیر ہی نہیں ہو جاتے بلکہ باوجود قومی عروج
کے افراد کی بڑی اکثریت عین عروج و ارتقا کے ان ہی دنوں میں قدری پیمانے پر بھی روزی پاتی
ہے، اسی طرح زوال و انحطاط کے دنوں میں بھی، یہ دیکھا گیا ہے کہ بعض افراد اسی نکبت زدہ
قوم کے بسطی پیمانے پر رزق پا رہے ہیں؛

اور یہ پہلی بات تھی جو اس سلسلہ میں میں کہنا چاہتا تھا، یعنی اقوام و افراد میں جو فرق
قرآن میں کیا گیا ہے اس پر لوگوں کو متنبہ کر دوں؛

دوسری بات اسی سلسلہ کی یہ ہے کہ انفرادی معیشتوں کا ابتلا و امتحان پر مبنی ہونا،
اگرچہ معیشت کا عام قرآنی قانون یہی معلوم ہوتا ہے، بسط ہو یا قدر جس پیمانہ پر بھی یہاں افراد کو
جو کچھ مل رہا ہے، یہی سمجھنا چاہئے کہ ان میں سے ہر ہر پیمانے کی جو ذمہ داریاں ہیں، موجودہ زندگی
میں ان ذمہ داریوں کی تکمیل ہی آدمی کا سب سے بڑا فریضہ ہے، نتائج کے بھوگنے یا خمیازوں کے
بھگتنے کا وقت اس زندگی کے بعد آئندہ زندگی میں آئے گا، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ابتلا و
امتحان کے سوا معیشت کی ان دونوں شکلوں میں اور کچھ نہیں ہوتا، سمجھنے والوں نے اگر ایسا سمجھ لیا ہے تو

جو کچھ میں عرض کرتا چلا آیا ہوں، غالباً صحیح طور پر اس کے سمجھنے کی کوشش نہیں کی گئی ہے۔ میں نے بسطی اور قدری معیشت کے ان دونوں پیمانوں کی ذمہ داریوں کو بیان کرتے ہوئے ان نتائج پر بھی جو متنبہ کرتا چلا آیا ہوں جن سے موجودہ زندگی ہی میں آدمی کو قرآن کے بیان کے بموجب دوچار ہونا پڑتا ہے تو اس کا مقصد یہی تھا کہ موجودہ زندگی کے اعمال کی جزا اور سزا کا حقیقی مشہد اگرچہ مجازات ومکافات کی آئندہ زندگی ہی ہے، لیکن اسی کے ساتھ بعض اعمال وافعال ایسے بھی ہیں جن کی سزا وجزا کا ظہور موجودہ زندگی ہی میں شروع ہو جاتا ہے اور معاشی ذمہ داریوں کے متعلقہ اعمال وافعال بھی جیسا کہ قرآن کے حوالہ سے مسلسل دکھاتا چلا آیا ہوں مجھے اس قبیلہ کی چیزیں نظر آتی ہیں اسی بنیاد پر میں یہ خیال کرتا ہوں کہ الرزق یا معیشت کے یہ دونوں پیمانے ابتلائی بھی ہیں اور ابتلائی ہونے کے ساتھ ساتھ بسا اوقات مجازاتی ومکافاتی بھی ہوتے ہیں، اسی سلسلہ میں جو چیزیں لکھی جا چکی ہیں ان کو پھر پڑھیئے تو آپ کو یہی نظر آئے گا، مثلاً قرآن کی آیت

فاما من اعطی واتقیٰ	پس جس نے دیا اور ڈرا اور الحسنیٰ
وصدق بالحسنیٰ فسنیسرہ	(اچھی باتوں کی) تصدیق کی، تو ہم قریب
للیسریٰ۔	ہے کہ آسان بنائیں گے اس پر آسان زندگی کو

میں اعطار (داد و دہش) جو تقویٰ اور الحسنیٰ کی تصدیق پر مبنی ہو، فرمایا گیا ہے کہ اس پر عمل کرنے والوں کے لئے "الیسریٰ" کو آسان کر دیا جائے۔ "الیسریٰ" (آسان زندگی) ایک عام اور مطلق لفظ ہے جو ہر قسم کی زندگی کو عام ہے، اگر یہ سمجھا جائے اور یہی سمجھا یا بھی گیا ہے کہ موجودہ زندگی ایسوں پر آسان کر دی جاتی ہے تو اس کے انکار کی کوئی وجہ نہیں ہو سکتی۔ قرآنی آیات اور حدیثوں کے حوالہ سے یہ بات جو گذر چکی ہے کہ مثلاً صدقہ سے ردِّ بلا ہوتا ہے یا اسی قسم کی دوسری آسانیاں میسر آتی ہیں، ظاہر ہے کہ اس کا تعلق موجودہ زندگی ہی سے ہے، بخاری کے حوالے سے میں نے کئی جگہ بتایا تھا کہ چٹان کے ڈھنک جانے کی وجہ سے جو لوگ غار میں بند ہو گئے تھے، اپنے عمل کے بدلے انھوں نے اسی زندگی میں نفع اٹھایا تھا یا باغ کی آمدنی کو تین حصوں میں تقسیم کر کے آب پاشی کے جو فوائد حاصل کرتا تھا، ان ساری روائتوں کا حاصل اس کے سوا اور کیا ہے کہ خیر وخیرات وصدقات ومبرات وغیرہ کے نتائج سے موجودہ زندگی میں بھی کرنے والے کے لئے قدرت سہولت مہیا کرتی ہے، یعنی الیسریٰ کو آسان کرتی ہے۔ اسی کے بالمقابل قرآن سے سورۂ نون میں باغ والوں کا جو مشہور تمثیلی قصہ بیان کیا گیا ہے کہ مسکینوں اور غریبوں کو ان کے حقوق سے محروم کرنے کے لئے چاہا تھا کہ پھلوں کو صبح سویرے تڑکے توڑ کر نکل جائیں، لیکن قبل اس کے کہ وہ باغ پہنچیں قدرت کی طرف سے ان کا باغ اور اس کے پھل برباد ہو چکے تھے تو اس قصہ سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ جیسے نیکی کے بدلہ کا ظہور اسی زندگی سے شروع ہو جاتا ہے، اسی طرح معاشی سرمایہ کی بربادی پر بدی اور بدنیتی کا بھی اثر پڑتا ہے۔

اسی طرح قرآن کے احسن القصص (قصہ حضرت یوسف علیہ السلام) حضرت والا کی مختلف

آزمائشوں کے تذکرے کے بعد جہاں یہ بیان کیا گیا ہے کہ شاہ مصر نے خزائن الارض (زمین کی آمدنیوں) کو ان کے سپرد کر کے سرزمین مصر کی حکومت ان کے حوالے کر دی تھی تو یہ ارشاد فرمانے کے بعد یعنی

کذلک مکنا لیوسف فی الارض	یوں ہی قتدار بخشا ہم نے یوسف کو
یتبوء منہا حیث یشاء۔	زمین (مصر) پر، ٹھکانہ بناتے تھے وہ
(یوسف علیہ السلام) جہاں چاہتے تھے۔	

حق تعالیٰ نے عمومی رنگ میں جو یہ اعلان کیا ہے؛

نصیب برحمتنا من نشاء	پہنچاتے ہیں ہم اپنی رحمت جسے چاہتے
ولا نضیع اجر المحسنین۔	ہیں اور نہیں ضائع کرتے ہیں ہم مزدوری
ان لوگوں کی جو بھلائی کرنے والے ہیں۔	

ظاہر ہے کہ اس آیۃ کریمہ قدسیہ میں اسی دولت و ثروت اقتدار و اختیار کو جو زمین مصر میں حضرت یوسف علیہ السلام کو مل گیا تھا۔ "رحمتنا" (یعنی ہماری رحمت اور مہربانی) کے لفظ سے اس کی تعبیر کی گئی ہے، جس کے یہی معنی ہیں کہ حق تعالیٰ کی رحمتوں اور مہربانیوں کا ظہور کبھی دنیاوی دولت و ثروت کی شکل میں بھی ہوتا ہے اور آگے یہ فرما کر ہم محسنوں کی مزدوری کو ضائع نہیں کرتے۔ اس سے بھی اسی کی طرف اشارہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کو دنیاوی نعمت و عزت جو مصر میں ملی تھی، یہ ان کے احسانی اعمال و افعال کا بدلہ و اجر تھا، خود یوسف علیہ السلام کی زبان مبارک کا یہ فقرہ قرآن ہی میں جو محفوظ ہے یعنی مصر میں خدا نے ان پر جو نوازشیں فرمائیں اور ان کا بچھڑا ہوا خاندان وطن سے چل کر مصر میں ان کے پاس جب آ گیا تو آپ نے فرمایا؛

قد من اللہ علینا انہ	ہم پر بڑا اکرم کیا اللہ تعالیٰ نے جو ڈرتا
من یتق ویصبر فان اللہ	ہے اور صبر سے کام لیتا ہے تو قطعاً
لا یضیع اجر المحسنین۔	اللہ تعالیٰ بھلائی کرنے والوں کے
	اجر کو ضائع نہیں کرتے۔

تو اس کا بھی یہی مطلب ہے کہ وہ اپنے احسانی اعمال و افعال کا صلہ ان آسانیوں اور سہولتوں کو قرار دے رہے تھے جو اس وقت ان کو مصر میں میسر آئی تھیں۔

لیکن یہ عجیب بات ہے اور یہی بات میرے اس مضمون کی سب سے زیادہ قابل توجہ بلکہ غالباً دل ہلا دینے والی بات ہے کہ الحیوۃ الدنیا کی یہی سہولتیں، یہی آسانیاں جنھیں ہم بسطی معیشت بھی کہہ سکتے ہیں، زندگی کی یہی شکل اقوام کے لئے بھی اور کہہ سکتا ہوں کہ افراد کے لئے بھی قرآن ہی سے معلوم ہوتا ہے کہ کبھی کبھی عصیاں و تمرد کا قدرتی انتقام بھی اختیار کر لیتا ہے۔ باہر سے دیکھنے والوں کی نگاہوں میں وہی انتقام صلہ اور جزا معلوم ہوتا ہے۔ لیکن خود دینے والے کا

بیان ہے کہ درحقیقت وہ باطنی سزا کی خطرناک انتہائی خطرناک شکل ہوتی ہے۔ اقوام کے متعلق اسی عجیب و غریب قانون کا ذکر کرتے ہوئے یہ ارشاد فرمانے کے بعد کہ قوموں اور امتوں کو چونکانے کے لئے جب پیغمبر اور رسل بھیجے جاتے ہیں تو ابتداءً انکار و سرکشی اختیار کرنے والوں کو البأساء (جنگ وغیرہ کی سختیوں) اور الضراء (قحط و وبا وغیرہ کی مصیبتوں) میں مبتلا کر کے جھنجھوڑا جاتا ہے لیکن جن کے دل سخت، سینے سیاہ ہوتے ہیں، وہ قدرت کی ان تنبیہوں کو مختلف تاویلوں کی راہ سے یہ قرار دیتے ہیں کہ یہ تنبیہ نہیں ہے، بلکہ دنیا کے عام حوادث و واقعات ہیں، انسانی اخلاق و کردار سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہے، ایک سے زائد مقامات پر قرآن میں بیان کیا گیا ہے کہ اس قسم کی تاویلی ذہنیتیں رکھنے والی قوموں کے ساتھ قدرت کا عام دستور یہ ہے کہ کچھ دن کے لئے انھیں ڈھیل دی جاتی ہے، ڈھیل ہی نہیں بلکہ ان مواقع کی ایسی آیتیں مثلاً سورۃ الانعام میں ہے،

فلما نسوا ما ذکروا به فتحنا علیهم ابواب کل شئ۔ — جب وہ بھول گئے ان باتوں کو جن سے چونکائے گئے تھے تو کھول دیا ہم نے ان پر ہر چیز کے دروازے۔

یا سورۃ الاعراف میں ہے،

ثم بدلنا مکان السیئة الحسنة حتی عفوا۔ — پھر ہم نے برائی کی جگہ بھلائی کو بدل دیا تا اینکہ وہ لوگ خوب بڑھ گئے۔

وغیرہ سے تو معلوم ہوتا ہے کہ گذشتہ حالات سے بھی زیادہ آسانیوں کے دروازے ان پر کھولے جاتے ہیں اور "کل شئ" یعنی ہر قسم کی چیزوں کے اور زندگی کے تمام شعبوں کے ابواب و دروازے ان پر وا ہو جاتے ہیں، السیئہ (برائیوں) کو الحسنہ (بھلائیوں) سے بدل دیا جاتا ہے، گویا مٹی ان کے ہاتھوں میں پہنچ کر ایسی حالت میں سونا بنتی چلی جاتی ہے، وہ بڑھتے ہیں، بڑھائے جاتے ہیں، بڑھائے چلے جاتے ہیں، حتی عفوا کے یہی معنیٰ ہیں کہ اس زمانہ میں ترقی و عروج ارتقاء و اعتلاء کی انتہائی بلندیوں پر ان کو پہنچا دیا جاتا ہے۔ گو اس کے بعد یہ فرما کر جیسا کہ الانعام کی آیت کے آخر میں ہے،

حتی اذا فرحوا بما اوتوا اخذناهم بغتة فاذاهم مبلسون فقطع دابر القوم الذین ظلموا والحمد لله رب العلمین۔ — جب اترا گئے اس چیز سے جو دیا گیا ان کو تو پکڑ لیا ہم نے ان کو اچانک تب وہ ایسی حالت میں رہ جاتے ہیں مایوس ہو کر، پس کاٹ دی گئی جڑ ان لوگوں کی جنھوں نے اپنے حدود سے تجاوز کیا تھا اور ستائش رہ گئی صرف اللہ سارے جہان کے پالنے والے کی۔

یا الاعراف کی آیت کے آخر میں ہے،

حتیٰ عفوا وقالوا قد مس	جب وہ بڑھ گئے تو بولے کہ ہماری
آباءنا الضراء والسراء	گذشتہ نسلوں کو بھی دکھ اور سکھ
فاخذنٰھم بغتۃ وھم	نے چھوا تھا۔ پس پکڑ لیا ہم نے ان کو
لا یشعرون۔	اچانک اس طور پر کہ ان کو اس کا شعور
	بھی نہ ہوا۔

جس کا حاصل یہی ہے کہ ان ساری ترقیوں اور لغزشوں کے بعد قدرت کا مخفی ہاتھ اچانک ان کو پکڑ لیتا ہے اور اس طور پر پکڑ لیتا ہے کہ ان کا سارا کیا کرایا برباد ہو کر رہ جاتا ہے، ظاہر ہے کہ یہ تو ان کے آخری انجام کا مآل ہے، لیکن سرکشی و طاغی اقوام کے ساتھ قدرت کا یہ انتقامی برتاؤ جو بظاہر سرفرازیوں کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے، ان لوگوں کے لئے بڑا صبر آزما اور انتہائی خطرات کا سبب بن جاتا ہے، جنھیں انجام سے پہلے انتقام کے اس عجیب و غریب عبوری دور میں زندگی گذارنی پڑتی ہے اور جو حال اقوام کا ہے جیسا کہ میں نے عرض کیا، قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ افراد کے ساتھ بھی قدرت کبھی اسی قسم کا سلوک کرتی ہے، یعنی دیا تو جاتا ہے ان کو سزا اور انتقاماً ان کی غفلتوں مجرمانہ غفلتوں پر تاکہ غفلتوں کا اضافہ ہوتا چلا جائے، مقصود سبطی معیشت کی اس ٹوپی کے اڑھانے سے یہی اور صرف یہی ہوتا ہے کہ وہ اندھے بنائے جاتے ہیں اور دولت و ثروت کی ڈاٹیں ان کے کانوں میں اسی لئے ٹھونسی جاتی ہیں تاکہ پھر نیکی کی راہوں پر اب ان کی نظر نہ پڑے اور بھلائیوں کے سننے سے یہ بہرے بن جائیں، لیکن اپنی جگہ وہ اس خیال میں مگن رہتے ہیں کہ وہی قدرت کے پیارے اور ان لوگوں میں ہیں جنھیں پیدا ہی کیا گیا ہے خدائی نعمتوں سے استفادہ کے لئے، قرآن میں ایسی آیتیں مثلاً

فلا تعجبک اموالھم ولا اولادھم	پس حیرت میں نہ ڈالے تجھے ان کے اموال
انما یرید اللہ لیعذبھم	اور نہ ان کی اولاد اس کے سوا اور کوئی
بھا فی الحیوۃ الدنیا وتزھق	دوسری بات نہیں ہے کہ خدا چاہتا ہے
انفسھم وھم کافرون۔	کہ ان کو عذاب دے ان ہی چیزوں
	سے (یعنی اموال و اولاد کی کثرت سے) اس پست زندگی میں اور فرسودہ ہو کر نکلے
	ان کی جان اس حال میں وہ ناشکرے ہیں۔

"سبطی معیشت" کی اسی مغالطی قالب کے متعلق تنبیہ کی گئی ہے کہ ان کا حال کہیں لوگوں کے ایمان کو نہ لرزا دے، صاف لفظوں میں اعلان کیا گیا ہے کہ "الاموال" اور "الاولاد" کی یہ وہی قسم ہے جس سے قدرت ان لوگوں کی سزا کرتی ہے اور اس سے غرض ہی یہ ہوتی ہے کہ اسی ناشکری اور کفران کی حالت میں بدن سے ان کی جان فرسودہ ہو کر نکل جائے، اس طور پر نکل جائے کہ چونکنے اور سنبھلنے کا پھر ان کو موقعہ نہ ملے۔

قوموں کی حد تک تو شاید بسیطی معیشت کا یہ سزائی قالب ایسا نہیں ہے جسے پہچاننے والے باسانی پہچان نہیں سکتے، آخر دنیا کی ایسی قومیں جن کی زندگی کا ہر شعبہ خدا اور اس کے رسولوں کی تعلیم کی بغاوت صرف بغاوت پر مبنی ہو، لیکن اسی کے ساتھ ان کی ہر بغاوت ان کے سامنے ایسے دنوں کو لا رہی ہو، جن میں دیکھا جا رہا ہو کہ کسی نہ کسی خیر کا دروازہ ان پر کھولا گیا، اپنی ان ہی طغیانیوں میں وہ جس حد تک آگے بڑھتے چلے جاتے ہیں، اسی حد تک ابواب کل شئی (ہر چیز کے دروازوں) کے کھلنے کا سلسلہ بھی زور باندھتا چلا جا رہا ہو، ایسوں کے متعلق ان لوگوں کی منطق جو اللہ اور اس کے رسولوں کو مانتے ہیں، مذاہب و دیانات کے نظام کو انسانی دماغ کا خود تراشیدہ اور خود بافیدہ نظام نہیں سمجھتے، بلکہ نسل انسانی کے جینے اور مرنے کا قدرتی اور لاہوتی دستور ان کے نزدیک مذہب ہے، ان کی منطق اس کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے جس کی اطلاع قرآن میں دی گئی ہے۔ ایسی بات جس کے سوا کوئی دوسری بات سمجھی ہی نہیں جا سکتی، اگر قرآن وہی سمجھا جاتا ہے تو ظاہر ہے کہ قرآن کے کسی ایسے مسئلہ کے سمجھنے میں کسی کو کیا دشواری پیش آسکتی ہے، البتہ اگر دشواری کچھ ہے تو ان کے لئے ہے، یعنی مسکینوں، عقل کے مسکینوں کا جو طبقہ ایک طرف تو خدا کو بھی مانتا ہے، اس کے رسولوں کو بھی سراہتا ہے، لیکن اللہ کے باغیوں اور رسولوں کے دشمنوں پر ابواب کل شئی کے فتح کا جو انتقامی سلسلہ شروع ہوا، اور ان کی السیئۃ (بری حالت) جب الحسنۃ (بھلی حالتوں) سے بدل گئی تو اس انتقام کو وہ انعام اور اس سزا کو وہ باور کرنے لگے کہ یہ ان کے عمل کی جزا اور ان کے کرتوتوں کا یہ ثمرہ ہے اس قسم کے دماغوں کی ذہنی وسعتوں کے سمجھنے سے کم از کم میں تو قطعاً قاصر ہوں، یہ ہو سکتا تھا کہ ان باغیوں کے ساتھ یہ بھی مذہب سے بغاوت کا اعلان کر دیتے، جیسے وہ مرتد ہیں، ارتداد کے اس اصول کو یہ بھی تسلیم کر لیتے تو جو کچھ کہا جا رہا ہے اگر اس وقت کہتے تو خیر اس کی گنجائش تھی، لیکن جس تناقض اور تضاد کا شکار موجودہ حالات میں ان کا دماغ ہے۔ میں تو اس کی توجیہ سے قطعاً عاجز ہوں اور دنیا کے اس عجیب و غریب گروہ سے اگر قطع نظر کر لیا جائے تو جہاں تک میں جانتا ہوں عام حالات میں لوگ وہی مان بھی رہے ہیں جو قرآن ان سے منوانا چاہتا ہے یا سرے سے انھوں نے بھی مذہب اور مذہبی زندگی کی واقعیت اور نتیجہ خیزی کا اسی طرح انکار کر دیا ہے جیسے خود اس قسم کی سزا یافتہ قومیں اس کی منکر اور اس اصول سے باغی ہیں، اگرچہ تماشے کی ذہنیت ان کی ہے جو نہ مذہب ہی سے منحرف ہو کر زندگی گذارنا چاہتے ہیں اور نہ اسی فیصلہ سے وہ مطمئن ہونا چاہتے ہیں کہ باغی، مذہب سے باغی، اقوام کا یہ حال قدرت کا انتقام اور قدرتی عذاب ہی کی یہ ایک شکل ہے۔

بہرحال قوموں کی حد تک جیسا کہ میں نے عرض کیا کم از کم میرے نزدیک اس مسئلہ میں کوئی دشواری نہیں ہے، البتہ افراد کا مسئلہ ذرا مشکل ہے، لیکن اس میں بھی دشواری جو کچھ ہے وہ دوسروں کے اعتبار سے ہے، دوسروں کو دیکھنے والے جو کچھ دیکھتے ہیں دور سے دیکھتے ہیں، باہر سے دیکھتے ہیں لیکن خود اپنے حالات و خیالات، اعمال و افعال ظاہر ہے کہ دوسروں پر نہیں تو خود اپنے آپ پر تو

پوشیدہ نہیں رہ سکتے۔ "خودآگاہی" کے اسی نفسیاتی قانون کو قرآن نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

بل الانسان علیٰ نفسہ بصیرۃ	بلکہ آدمی اپنے نفس کے حالات سے
ولو القیٰ معاذیرہ۔	خود واقف ہے اگرچہ ان پر (نامعقول)
(القیامۃ)	عذروں کا (پردہ) ہی کیوں نہ ڈالے۔

پس ان لوگوں کو جو بسطی پیمانے پر رزق پا رہے ہیں یہ دیکھنا چاہیئے کہ خدا اور خدا کے مرضیات کے ساتھ ان کی زندگی کا کیا تعلق ہے۔ اگر ایسا حال ہے کہ جس حد تک خدا سے خدا کی مرضیات سے وہ ٹکراتے ہیں، اسی حد تک معیشت کے اس بسطی پیمانہ میں کشادگی پیدا ہوتی جاتی ہے، تمرد اور سرکشی کے میدانوں میں ان کا قدم جتنا آگے کی طرف بڑھتا جاتا ہے اسی حد تک دُنیا اور دُنیوی نعمتیں بھی ان کے قدم چومتی چلی جاتی ہیں تو ایسی حالت میں (العیاذ باللہ) انھیں یہ یقین کرنا چاہیئے کہ بسطی نعمت و معیشت کی یہ ٹوپی ان کے سر پر اسی لئے مڑھی گئی ہے تاکہ وہ اندھے ہی ہو کر جئیں اور اندھے ہی بنے ہوئے وہ مر جائیں۔ "الاموال" اور "الاولاد" کی یہ کثرت نشانی ہے اس بات کی کہ قدرت ان سے انتقام لینا چاہتی ہے اور ایسا انتقام کہ چونکنے کی ساری راہیں ان پر بند کر دی گئی ہیں، خدانخواستہ باوجود مسلم و مؤمن ہونے کے کوئی سزا کے اس حال میں اگر گرفتار ہو گیا ہو تو چاہیئے کہ آیت کریمہ قرآنیہ

ولا تعجبک اموالھم واولادھم	اور نہ حیرت میں ڈالیں تجھے ان کے اموال
انما یرید اللہ ان یعذبھم	اور اولاد، اس کے سوا اور کوئی بات نہیں
بھا فی الدنیا وتزھق انفسھم	ہے کہ اللہ چاہتا ہے کہ سزا دے ان کو
وھم کافرون۔	ان ہی (اموال و اولاد سے) اور فرسودہ
	ہو کر نکلے ان کی جان اس حال میں وہ ناشکرے تھے۔

کے ورد میں مشغول ہو، یہ اسی قسم کا مغالطہ ہے جس میں کہا جاتا ہے کہ ہندوستان میں ایک نووارد غریب کابلی مبتلا ہو گیا تھا، زبان کی ناواقفیت کی وجہ سے حلوائی کی دوکان سے مٹھائی اٹھا کر قیمت ادا کئے بغیر کھا گیا، پولیس نے گرفتار کر کے اس کی سزا یہ تجویز کی کہ سر منڈا کر گدھے پر سوار کر کے اسے شہر بدر کر دیا جائے، یہی کیا گیا، شہر کے لڑکے گدھے پر سوار اس کابلی کے پیچھے تالیاں پیٹتے جاتے تھے، اسی شکل میں وہ شہر سے باہر ہوا، کہتے ہیں کہ جب کابلی اپنے وطن پہنچا، پوچھنے والوں نے پوچھا، "آقا! در ہندوستان رفتہ بودی، چہ دیدی" جواب میں اس نے جو بات کہی اس سے حضرت تھانوی قدس اللہ سرہٗ نے قرآن کی مذکورہ بالا آیت کے سمجھانے میں ایک دفعہ امداد حاصل کی تھی۔ کابلی نے جواب میں اپنے ارباب وطن کے سامنے یہ رپورٹ پیش کی،

"ہندوستان خوب ملک است، حلوا خوردن مفت ست، موتراشیدن مفت ست، سواری خر مفت است، ڈف ڈف طفلان مفت ست۔ ہندوستان خوب ملک است۔"

حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا تھا کہ تحقیر و توہین، بے عزتی و رسوائی کے سارے اسباب و علامات کو جیسے اس جاہل کابلی کی ذہنیت نے اپنے اعزاز و اکرام کا ذریعہ باور کر لیا تھا، اسی طرح بسطی نعمت رکھنے والوں کا باغی گروہ بھی آج اپنی سزا کو جزا اور قدرت کے انتقام کو انعام سمجھ رہا ہے، لیکن حقیقت کی پیش گاہ میں پہنچ کر اس پر واضح ہو گا کہ ان میں ایک چیز بھی مفت نہ تھی، جیسے مغالطہ خوردہ کابلی کی طرح اس نے مفت سمجھ لیا تھا، ایسی سزا جو مسلسل دوسرے سزاؤں کی سزا یا فتوں کو مستحق بناتی چلی جاتی ہو، سزا کی عام قسموں میں بدترین سزا ہو سکتی ہے اعاذنا اللّٰہ والمسلمین عنھا۔

لیکن بسطی پیمانہ پر رزق پانے والوں کا حال اگر یہ نہیں ہے تو ظاہر ہے کہ وہ ابتلائی نعمت ہو گی یا ابتلائی ہونے کے ساتھ ساتھ وہ رحمت بھی ہو گی، خصوصاً بسطی معیشت کی ذمہ داریوں کی تکمیل کی راہ میں اگر اس کی وجہ سے رفتار میں اور زیادہ تیزی پیدا ہوتی چلی جائے، تو یقیناً نشانی ہے اس بات کی کہ اس کی یہ بسطی معیشت و امارت و ریاست و دولت سراسر رحمت ہے، وہی حال جس کی نشان دہی حضرت یوسف، حضرت داؤد، حضرت سلیمان علیہم السلام کی زندگیوں میں قرآن مجید نے کی ہے، وہی مصر جس کی حکومت دماغوں میں فرعونیت پیدا کرنے کی سبب بنی رہی، اور آج تک اس کا یہی حال ہے، لیکن جب یوسف علیہ السلام کو اسی فرعونی سرزمین پر اقتدار و اختیار عطا کیا گیا تو خدا کا یہ بندہ دینے والے کے قدموں پر سر جھکا کر آرزو کرتا ہے تو یہ کرتا ہے،

رب قد اتیتنی من الملک	میرے مالک! مجھے آپ نے ملک (حکومت)
وعلمتنی من تاویل الاحادیث	عطا کی اور باتوں کو ٹھیک ان کے ٹھکانے پر
فاطر السموات والارض	پہنچانے کا سلیقہ عطا کیا، آپ ہی ہیں آسمانو
انت ولی فی الدنیا والاخرۃ	کے پیدا کرنے والے اور زمین کے، آپ
توفنی مسلما والحقنی بالصالحین	ہی میری پشت پناہ اور والی ہیں دنیا میں

بھی اور آخرت میں بھی، اٹھائیے گا (دنیا سے) مجھے مسلمان! اور ملا دیجئے گا مجھے نیکوں سے۔

اور یہی چیزیں آپ کو داؤد و سلیمان علیہما السلام کے تذکروں میں نظر آئے گی جن کا ایک حصہ قرآن میں محفوظ ہو گیا ہے۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ مذہبی دعوت[1] کو بنی آدم کے لئے آخری ٹھوس دعوت بنانے کے لئے ابتدا ہی سے سیاسی قوت کا زور جب اس کی بنیادوں میں بھر گیا اور اس کی وجہ سے بہتوں کو بسطی معیشت گذارنے کا موقعہ تاریخ میں مسلسل ملتا رہا، تو صرف ابتدا ہی میں نہیں، بلکہ زمانے کے مختلف ادوار و قرون میں ایسی ہستیاں معرض شہود پر پیدا ہوتی رہیں، جن کی بسطی معیشت ان کے لئے رحمت بنی رہی، اس کے لئے تاریخ اسلام کی ورق گردانی کی ضرورت ہے، میرے لئے یہاں اس کی تفصیل کا

---

[1] مراد اسلام کی اس دعوت سے ہے جسے خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے دنیا کو سب سے آخر میں دی گئی ۱۲

موقعہ نہیں، بلکہ قرآن کی سورۂ کہف میں ذوالقرنین کے نام سے جس تمثیلی قصہ کا ذکر ہے، میرے نزدیک اس قصہ کے متعلق یہ سوال کہ ذوالقرنین کون تھے، کہاں تھے، کب تھے۔ بجائے ان غیر ضروری امور کی تحقیق کے اگر سوچا جاتا تو سمجھا جا سکتا تھا کہ ایک ایسی ہستی جسے زمین کے اتنے طول و عرض پر اقتدار بخشا گیا کہ گویا مغرب الشمس اور مطلع الشمس تک وہ پہنچ گئی تھی، اور اتنی بولیاں بولنے والوں پر اس کو حکومت بخشی گئی تھی جن کی بولی کو ان کی زبان سے کوئی مناسبت نہ تھی، وہ لوہے کی اینٹیں بنا بنا کر بجائے گارے کے رانگ کو پگھلا کر ان ہی اینٹوں کو ان سے جوڑ کر دیوار بناتے تھے، جس کے یہی معنی ہوئے کہ ایسے ایجادات و اختراعات پر بھی انھیں قدرت حاصل تھی جسے سائنس و کیمیا کے اس عہد میں بھی حقارت کی نگاہ سے نہیں دیکھا جا سکتا تھا، لیکن باوجود ان تمام باتوں کے اپنی اس سائنٹیفک دیوار کی تعمیر سے جب وہ فارغ ہوئے تو بجائے کسی کبر و ناز، تبختر و غرور کے جس میں عموماً ان حالتوں میں لوگ مبتلا ہو جاتے ہیں، اسی دیوار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اپنی بندگی اور دینے والے کی خدائی کا اعتراف انھوں نے ان الفاظ میں کیا

ھذا رحمة من ربی	یہ ہے میرے مالک کی مہربانی، پھر جب
فاذا جاء وعد ربی	آئے گا فرمان میرے مالک کا تو
جعله دكاء وكان وعدُ	ہو جائے گی یہ ٹکڑے ٹکڑے اور ہے
ربی حقا۔	وعدہ میرے مالک کا سچا۔

حالاں کہ اسی کے بالمقابل اسی سورۃ میں اس شخص کی دماغی کیفیت جسے دو باغ اور ان کے درمیان کھیت وغیرہ دی گئی تھیں اور درمیان میں بہنے والی نہروں سے جن کی سیرابی ہوتی تھی وہی اپنے باغ میں داخل ہونے کے بعد بڑبڑاتا تھا تو یہ بڑبڑاتا تھا،

ما اظن ان تبید ھذہٖ ابدا	میں نہیں خیال کرتا ہمارے یہ باغ کبھی
	بھی برباد ہو سکتے ہیں۔

بسطی معیشت اور اس کی مختلف شکلوں کو جیسے ان شکلوں کے خصوصیات و علامات سے پہچانا جا سکتا ہے قدری معیشت میں بھی اسی قاعدے سے ہم کام لے سکتے ہیں یعنی دوسروں کو اندازہ ہو سکے یا نہ ہو سکے لیکن جن پر گذرتی ہے وہ چاہیں تو سمجھ سکتے ہیں کہ ان کی معیشت کا قدری پیانہ خدانخواستہ دینے والے کے ساتھ کسی شوخی اور گستاخی کا نتیجہ تو نہیں ہے، وہی قرآن کی سورۂ نون میں اور سورۂ کہف کے قصہ یعنی باغ والوں کے باغ پر جو تباہی آئی تھی اور ان کی بسطی معیشت نے اچانک قدری رنگ جو اختیار کر لیا تھا، یعنی قدری معیشت کی وہ عتابی شکل تھی، سورۂ کہف میں بھی ہے کہ باغ کی تباہی و بربادی کے بعد وہی گستاخ امیر خود اپنے اندر یہ احساس رکھتا تھا اور اس احساس کا اظہار ان الفاظ میں کرتا تھا، قرآن ہی میں وہ منقول ہیں،

واحیط بثمرہٖ فاصبح یقلب کفیہ	اور احاطہ کر لیا گیا اس کے باغ کی پیداوار کا

علیٰ ما انفق فیہا وھی خاویۃ	(یعنی تباہ کر دی گئیں، تو وہ ملتا تھا اپنی
علیٰ عروشہا ویقول یا لیتنی	ہتھیلیوں کو ان مصارف کو یاد کرکے جو
لم اشرک بربی احدا۔ [ا]	باغ میں اس نے خرچ کئے تھے اور باغ

جو تھے وہ اپنی ٹٹھریوں اور چھتوں پر اوندھے پڑے تھے، کہتا تھا کہ اے کاش! ہم اپنے رب کے ساتھ کسی کو شریک اور ساجھی نہ بناتے۔

اسی طرح سورۂ نون میں جن باغ والوں کا ذکر ہے، باغ کی تباہی اور اس کے متعلق بھائیوں میں جو گفتگو ہوئی اس کو نقل کرنے کے بعد خود ان ہی کی زبانوں سے قرآن نے اعتراف جرم کے جو الفاظ نقل کئے ہیں وہ یہ ہیں کہ

فاقبل بعضہم علیٰ بعض	پھر ان میں بعض بعض کی طرف ملامت
یتلاومون قالوا یا ویلنا	کرتے ہوئے متوجہ ہوئے اور بولے کہ
انا کنا طاغین۔	افسوس ہے ہم پر ہم ہی لوگ سرکش تھے

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ جن پر گذرتی ہے وہ قدری معیشت کی اس انتقامی اور عتابی شکل کو خود پہچان لیتے ہیں اور ہوتا بھی ہے قدری معیشت کی اس شکل کا ظہور کچھ ایسے طریقہ سے کہ گرفت کے شعور کا دبانا مبتلا ہونے والوں کے لئے مشکل ہی ہوتا ہے، عہد بنی اسرائیل کے تین آدمیوں کا جو قصہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بخاری ومسلم کی جیسی صحیح حدیثوں کی کتابوں میں پایا جاتا ہے، جن میں

[ا] یہاں سوچنے کی بات یہ ہے کہ اس شخص کا جو قصہ قرآن میں اوپر بیان کیا گیا ہے، اس میں کوئی جزء ایسا نہیں ہے جس سے معلوم ہو کہ شرک کا ارتکاب اس عام معنی کے لحاظ سے کیا تھا جسے عموماً لوگ شرک سمجھتے ہیں یعنی خالق کے ساتھ کسی مخلوق کو اس نے اپنا معبود بنا لیا تھا اور خدا کے ساتھ خدا کی کسی مخلوق کو بھی وہ پوجتا تھا پھر سوال یہی ہے کہ "کاش! اپنے مالک کے ساتھ میں کسی کو شریک نہ بناتا" ان الفاظ سے وہ اپنے کس جرم کی طرف اشارہ کر رہا تھا، بات یہ ہے کہ شرک کی یہ تو بالکل چھچھوری اور بھدی شکل ہے جسے عام حالات میں لوگ شرک سمجھتے ہیں ممکن ہے کہ اس شرک میں وہ مبتلا نہ ہو، لیکن باغ میں داخل ہونے کے بعد اس کا یہ دعویٰ کہ اب یہ باغ اور اس کی کاشت کبھی تباہ نہیں ہو سکتے، دراصل یہ ان اسباب اور باغبانی وکشت کاری کے ان سامانوں کی طرف اشارہ تھا جن پر اعتماد کرکے مستقبل کے متعلق اتنا بڑا بول وہ بول رہا تھا، دراں حیزرائک وہ اپنی دانائی وفرزانگی، چستی وچالاکی، اپنی کارکردگی کی صلاحیتوں کا نتیجہ یقین کرتا تھا جس کے دوسرے معنی یہی ہوئے کہ خدا کے ساتھ بسطی معیشت کے ان مظاہر کی فراہمی میں وہ خود اپنے آپ کو بھی شریک کر رہا تھا اور اس کا یہی دعویٰ مشرکانہ دعویٰ تھا خود اس کو بھی اس کا احساس تھا، اسی مشرکانہ دعویٰ کے جرم میں وہ پکڑا گیا اور اس کی بسطی معیشت قدری معیشت سے بدل گئی ہے۔ افسوس! کہ موحد ہونے کے مدعی ہونے کے باوجود شرک کے اس خطرناک قرآنی جرم کی مسلمان بھی پروا نہیں کرتے ۱۲

ایک اندھا، ایک مبروص اور ایک گنجا تھا، تینوں کے امراض کا ازالہ بھی کیا گیا، اور غربت و افلاس کی جس قدری معیشت میں وہ گرفت رہتے تھے ان سے بھی نجات عطا کی گئی اور جس قسم کا مال جو چاہتا تھا ہر ایک کو دیا گیا، بیان کیا گیا ہے کہ پھر ان میں ہر ایک کے پاس اسی شکل میں جس شکل میں وہ پہلے تھے، فقیر کا بھیس بنا کر خدا کا فرشتہ آیا، یعنی اندھے کے پاس اندھا، مبروص کے پاس مبروص، گنجے کے پاس گنجے کی شکل بنا کر فرشتہ آیا اور ان میں ہر ایک سے اس نے دستگیری کی التجا کی، جس کے جواب میں دولت (یعنی مبروص اور گنجے نے) تو جواب میں وہی بات کہی جو عموماً مانگنے والوں کو نہ دینے والا طبقہ ایسے مواقع میں کہا کرتا ہے، یعنی دونے کہا

الحقوق کثیرۃ۔ مجھ پر بہتوں کے حقوق ہیں (تمہیں کہاں سے دوں)

روایت میں ہے کہ تب مانگنے والے نے مبروص سے کہا

کانی اعرفک الم تکن ابرص یقذرک الناس فقیرا فاعطاک اللہ۔ شاید میں تجھے پہچانتا ہوں کیا تو وہی کوڑھی آدمی نہ تھا کہ گھن آتی تھی لوگوں کو تجھ سے اور تھا تو ایک ننگا محتاج پھر دیا اللہ تعالیٰ نے تجھے۔

اور یہی بات اس نے گنجے کو بھی یاد دلائی، یہ سن کر دونوں نے جواب میں کہا تھا

انما ورثت ھذا المال کابرا عن کابر۔ نہیں! یہ دولت و ثروت تو مجھے اپنے بڑوں سے ملی اور بڑوں کو بڑوں سے (یعنی پشتینی دولت ہے)

حدیث میں ہے کہ تب فرشتے نے دونوں کو یہ بددعا دی کہ

ان کنت کاذبا فصیرک اللہ الی ما کنت۔ اگر تو جھوٹا ہے تو جیسا تھا ویسا ہی ہو جائیگا (روایت میں ہے کہ وہی ہو گیا)

اور یہی مجھے کہنا تھا کہ ایسے مواقع پر اگر ان دونوں کی بسطی معیشت قدری معیشت سے بدل گئی، تو یہ کھلی ہوئی دلیل ہو گی اس بات کی کہ اس کی قدری معیشت قدرت کے انتقام اور عتاب کی شکل تھی۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ معیشت کا بسطی رنگ دماغوں میں کبر و غرور کے بھبھارے پیدا کر کے اگر بسطیوں کو طغیانی اور سرکشی پر آمادہ کرے تو یہ چنداں تعجب خیز نہیں ہے، قوت کا احساس اور اقتدار و اختیار کے دائرہ کی وسعت قدرتاً دلوں میں فرح و استکبار کی کیفیت کو پیدا کرتی ہے اتراتے اور اکڑتے ہوئے اگر ان کو دیکھا جائے تو حالات کے لحاظ سے یہ بعید نہیں لیکن قدری پیمانے پر روزی پانے والوں کو بھی جب ان حالات میں مبتلا پایا جائے تو یقیناً بغاوت کی یہ کیفیت اس کی دلیل ہو گی کہ ایسوں کی قدری معیشت اسی قسم کی قدرتی سزا ہے جو سزا یافتوں کو

دوسری سزاؤں کی مستحق بناتی چلی جاتی ہے، وہی جو حال باطنی معیشت کی سزائی قالب کا تھا، سمجھنا چاہیے کہ قدری معیشت کی یہ حالت بھی سزا ہی کا ایک قالب ہے، ان لوگوں کا ذکر کرتے ہوئے قیامت کے دن جن سے حق تعالیٰ نہ خطاب فرمائیں گے اور نہ ان کا تزکیہ کیا جائے گا اور حق تعالیٰ کی نظر شفقت وکرم سے جو محروم رہیں گے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے صحیح مسلم میں یہ حدیث مروی ہے کہ وہ حسب ذیل لوگ ہوں گے،

شیخ زان وملک کذاب	بڈھا زانی، جھوٹا بادشاہ اور محتاج
وعائل مستکبر۔	اکڑفوں دکھانے والا۔

مطلب حدیث کا وہی ہے کہ گناہ یوں تو بجائے خود گناہ ہی ہے، لیکن ایسوں سے اسی گناہ کا صدور جن سے اس گناہ کی توقع نہ ہو، ان کے گناہ کی شدت کو بہت زیادہ بڑھا دیتا ہے، اس وقت مجھے دوسروں سے بحث نہیں، بلکہ بتانا یہ ہے کہ امیری ہی نہیں، بلکہ کبھی کبھی غریبی بھی سزا کی بدترین شکل ہوتی ہے اور یہ وہی غریبی ہے جس کی طرف پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے

عائل مستکبر۔	محتاج اکڑفوں دکھانے والا۔

کے الفاظ میں اشارہ فرمایا ہے، لیکن جن کی قدری معیشت ان حالات سے دوچار نہیں ہے، عام حالت میں سمجھنا چاہیے کہ یہ بھی وہ امتحان ہی کی ایک شکل اسی طریقہ سے ہے، جیسے عام حالات میں معیشت کا بسطی رنگ بھی عموماً ابتلا اور امتحان ہی کا ایک قدرتی اسلوب ہے، البتہ قدری معیشت کا ایک پاکیزہ ترین قدسی رنگ وہ ہے جس سے سرفرازی کا استحقاق ہر بوالہوس کی قسمت میں نہیں ہوتا اور جیسا کہ میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ معیشت کے اس قدری رنگ کو اختیار کرنے والے مختلف اغراض و وجوہ سے خود اختیار کرتے ہیں، سید الانبیاء والرسل علیہ الصلوٰۃ والتسلیمات کی طرف

الفقر فخری۔	فقر ہی میرے لئے باعثِ فخر ہے۔

کے جس فقرہ کو منسوب کیا جاتا ہے، محدثانہ تنقید کے معیار پر ممکن ہے بجنسہ ان الفاظ کے انتساب کی صحت میں شک کیا جائے، لیکن پیغمبر اور پیغمبر کے گھرانے کی زندگی بلکہ پیغمبر کے جانشینوں نے عموماً معیشت کے جس نقشہ کو دنیا میں پیش کیا، سب سے اس حقیقت کی تائید ہوتی ہے جو مذکورہ بالا فقرہ کا مفاد ہے، بلکہ صحاح کی ایسی حدیثیں مثلاً

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم	میرے سامنے مکہ کی سنگریزوں والی سرزمین
عرض علی ربی لیجعل لی بطحاء مکة	پیش کی گئی کہ اسے سونا بنا دیا جائے تو میں نے
ذھبا فقلت لا یا رب ولکن اشبع	عرض کیا نہیں میرے رب! میں ایک دن
یوما واجوع یوما فاذا جعت	سیر رہوں اور ایک دن بھوکا رہوں کہ یہ
تضرعت الیک وذکرتک واذا شبعت	چاہتا ہوں تاکہ جب بھوکا رہوں تو گڑگڑاؤں
حمدتک وشکرتک۔	آپ کے آگے اور یاد کروں آپ کو، اور جب
(رواہ الترمذی واحمد وابن ماجہ مشکوٰۃ)	سیر رہوں تو شکر کروں آپ کا۔

اور اس حدیث میں تو صرف سبطی معیشت سے ہی انکار فرمایا گیا ہے۔ اسی مشکوٰۃ میں ترمذی اور بیہقی وغیرہ کے حوالے سے یہ مشہور حدیث بھی مروی ہے، جس میں قدری معیشت کی اپنے لئے پیغمبر نے دعا فرمائی ہے، حدیث کے الفاظ یہ ہیں،

عن انس ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال اللھم احینی مسکینا و امتنی مسکینا و احشرنی فی زمرۃ المساکین

حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دعا کرتے تھے کہ اے اللہ مجھے مسکین ہی زندہ رکھیے اور مسکین ہی موت دیجئے اور قیامت کے دن اٹھائیے مسکینوں کے گروہ میں۔

نہ صرف اپنے لئے بلکہ پہلے بھی کہیں ذکر گذر چکا ہے کہ اپنے گھرانے اور آل کے لئے بھی آپ یہی دعا فرماتے تھے۔

اللھم اجعل رزق آل محمد قوتا

اے پروردگار محمد کے گھرانے والوں کو روزی صرف قوت (یعنی خوراک بھر دیجئے)

اور قدری معیشت کا یہ وہ قالب ہے جس کی روح تک نہ ہر شخص کی نظر پہنچ سکتی ہے اور نہ اس کی صحیح قدر و قیمت کا اندازہ کوتاہ بینوں کا وہ گروہ کر سکتا ہے جس کے تنگ سینوں، تنگ نگاہوں میں انسانی زندگی کی وہ وسعتیں سما سکتی ہیں جن کے اندر کائنات کا موجودہ محسوس نظام اور جو کچھ اس میں ہے چند حقیر تنکوں سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا، ہائے! ترمذی کی مشہور حدیث نبوی یعنی اللہ تعالیٰ نے (پیغمبر) سے فرمایا،

اغبط اولیائی عندی لمؤمن خفیف الحاذ ذو حظ من الصلوٰۃ احسن عبادۃ ربہ واطاعہ فی السر وکان غامضا فی الناس لا یشار الیہ بالاصابع وکان رزقہ کفافا فصبر علیٰ ذلک۔

قابلِ رشک دوست میرا وہ مومن بندہ ہے جو کم مایہ قلیل المعاش ہے لیکن نماز میں اسے حصہ ملا ہے، اپنے رب کی پوجا خوبصورتی سے کرتا ہے اور (اعلانیہ ہی نہیں) پوشیدہ حالات میں اسکی اطاعت کرتا ہے اور لوگوں میں گم شدہ سا رہا (یعنی اپنے آپ کو نمایاں نہ کیا) اس کی طرف انگلیاں نہیں اٹھائی جائیں، روزی اس کی بس ضرورت کے مطابق ہے اور اس پر صبر کئے رہا۔"

اس کے بعد اللہ کے وہی رسول جو تلاش کرنے والوں کو اپنا پتہ بتاتے ہوئے کبھی فرماتے

ابغونی فی ضعفاءکم (ابوداؤد)

ڈھونڈا کرو مجھے ضعیفوں اور کمزوروں یعنی غریبوں میں،

آخر میں اسی خفیف الحاذ (کم مایہ جزءِ معاش) والے مومن کی طرف اپنی مبارک انگلیوں سے اشارہ فرماتے ہوئے کہ بے چارہ کچھ دن دنیا میں جیا اور پھر آہ کہ

عجلت منيته قلت بواكيه	پھر جلدی آگئی موت اس کی، بہت کم
قل تراثه۔	تھیں اس پر رونے والیاں، ترکہ بھی
چھوڑا اس نے کم ہی۔	

قابلِ رشک زندگی کے اس بلند مینارے پر وہی قدم جما سکتا ہے جس پر آدم اولادِ آدم کی اولاد کی یہ حقیقت واضح ہو چکی ہو کہ

ظاہرش را پشۂ آرد بچرخ	باطنش باشد محیط ہفت چرخ

وہی یہ کہہ سکتا ہے اور اسی نے کہا بھی،

مالي وللدنيا ما انا والدنيا	میرا اور دنیا سے کیا تعلق، میرا حال اور
الا كراكب استظل تحت	دنیا کا حال تو ایسا ہے جیسے ایک سوار
شجرة ثم راح وتركها۔	ہو، چھاؤں میں کھڑا ہوا کسی درخت کے
(الترمذي في جامعه)	پھر درخت اور اس کی چھاؤں کو چھوڑ کر چل دیا۔

صدق مولنا العزيز

ان الدار الآخرة لهي الحيوان	اور پچھلا گھر ہی ہے زندگی کا گھر۔

العبد الاحقر الفانی
السید مناظر احسن گیلانی غفر اللہ لہٗ ولمن ربّاہ
گیلان (بہار) محراب الہدایت والارشاد عُرش جدید

تاریخ اختتام مسودہ ۲۳۔ جمادی الاولیٰ ۱۳۶۳ھ ۱۷۔ مئی ۱۹۴۴ء ۹۔ تیر ۱۳۵۳ف روز چہارشنبہ
تاریخ اختتام مبیضہ ۱۷۔ رمضان المبارک ۱۳۶۳ھ ۶۔ ستمبر ۱۹۴۴ء یکم آبان ۱۳۵۳ف روز چہارشنبہ

اسلامی معاشیات

کے

قانونی ابواب

اس وقت تک آپ کے سامنے اسلام کے معاشی
کلیات جو زیادہ تر قرآن مجید کی آیات ہی سے ماخوذ ہیں
پہلی جلد کی شکل میں پیش ہوئے ہیں۔ اب ان ہی کلیات کو
پیشِ نظر رکھتے ہوئے اسلام میں جو قوانین نافذ کئے ہیں
فقہاء اسلام نے قرآن اور سنت کی روشنی میں جن جزئیات کو
پیدا کیا ہے اُن کی تفصیل اس حصہ میں آپ کو ملے گی۔

مناظر احسن گیلانی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اسلامی معاشیات

حصہ دوم

قانونی ابواب

صحاح کی مشہور حدیث ہے کہ بندے قیامت کے دن اس وقت تک اپنی ٹانگوں پر کھڑے رہیں گے جب تک کہ چار باتوں کے جواب سے فارغ نہ ہولیں، ان ہی چار گانہ سوالات میں ایک بڑا اہم سوال یہ بھی ہوگا کہ

عن مالہ من این اکتسبہ وفیم انفقہ۔

آدمی سے پوچھا جائے گا اپنے مال سے یعنی اس مال کو کن ذرائع سے اس نے حاصل کیا اور کن راہوں پر خرچ کیا۔

سچ پوچھیے تو معاشیات کے قانونی یا فقہی مسائل کا تعلق ان ہی دو باتوں سے ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں خیال کیجیے کہ دولت کے دخل و خرچ کے متعلق اسلام نے مسلمانوں کو جو عملی ضابطہ دیا ہے، اب آپ کے سامنے اس کی تفصیل پیش ہوگی، دولتِ عباسیہ کے پہلے قاضی القضاۃ قاضی ابو یوسف نے بھی اپنی سیاسی و معاشی کتاب "کتاب الخراج" جو خلیفہ ہارون الرشید کی فرمائش سے لکھی گئی ہے۔ اس میں بھی قاضی صاحب نے تمہیدِ کلام میں اسی حدیث کو اسلامی معاشیات کی بنیاد قرار دیا ہے۔

اس "معاشی ضابطہ" کے اساسی قوانین کو پیشِ نظر رکھ کر فقہائے اسلام رحمہم اللہ اجمعین نے جزئیات کے متعلق، دفتر کے دفتر جو تیار کر دیئے ہیں، ظاہر ہے کہ اس مختصر سی کتاب میں ان سب کا احاطہ ناممکن ہے

تاہم میں کوشش کروں گا کہ ایک خاص ترتیب سے اس سلسلہ کے اہم مسائل کو اپنی اپنی جگہ پر درج کر دوں، ہو سکتا ہے کہ راہ بن جانے کے بعد آئندہ کام کرنے والے اس پر اور اضافہ کریں۔

معاشیات کے دو اسکول

پہلا اسکول واقعہ یہ ہے کہ مشاہدہ اور تجربے کے سوا خود قرآن سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ تاریخ کے نامعلوم زمانے سے بنی آدم میں ایک طبقہ ان لوگوں کا پایا گیا ہے جو مالیات یا تحصیل دولت و صرفِ دولت دونوں کو ہر قسم کی اخلاقی و مذہبی پابندیوں سے آزاد دیکھنا چاہتا ہے "کمانا چاہیے" خواہ کسی ذریعہ سے ہو "اُڑانا چاہیے" خواہ خرچ کی جو راہیں بھی ہوں۔

اس سلسلہ میں یہاں تک دیکھا گیا ہے اور اب بھی دیکھا جاتا ہے کہ جن کی زندگی بظاہر دینی اور شرعی ہوتی ہے، یعنی نماز، روزہ، درود وظائف، حج و قربانی ان تمام امور کے وہ پابند ہوتے ہیں، لیکن یہی لوگ جو اس قسم کی مذہبی پابندیوں کو اپنے لئے لازم سمجھتے ہیں، مالیات کے مسئلہ میں ہر قسم کی بے قیدیوں کا دیدہ دلیری سے ارتکاب کرتے ہیں، اس مکتبِ خیال یا مسلکِ عمل کا تذکرہ قرآن نے حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم کے ذکر میں کیا ہے، یعنی حضرت شعیب نے جب ان پر معاشی قوانین کی پابندیوں کو عائد کرنا چاہا تو ان کو جواب دیا گیا کہ

قالوا یا شعیب اصلوٰتک	انھوں نے کہا شعیب! کیا تمہاری نمازیں
تامرک ان نترک ما یعبد	یہ حکم کرتی ہیں کہ جن معبودوں کو ہمارے
اٰباءنا او ان نفعل فی اموالنا	باپ دادا پوجتے تھے انھیں ہم چھوڑ بیٹھیں
ما نشاء۔ (سورہ ہود ع ۹)	اور یہ کہ ہم اپنے اموال (دولت) کے متعلق

جو چاہیں کریں (اس میں وہ رکاوٹ پیدا کرتی ہیں)

صرف یہی نہیں بلکہ قوم شعیب کے معاشی ماہرین نے ان کے طرزِ عمل پر اظہارِ تعجب کیا اور ان کی عقل و فہم جس کا ایک مدت سے تجربہ تھا اس کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے ان روشن خیالوں نے طنز کے لہجہ میں کہا کہ

انک لانت الحلیم الرشید	تم تو بڑے بھاری بھرکم باوقار سوجھ بوجھ
(سورہ ہود)	کے آدمی ہو۔

بہرحال معاشیات کا یہ تو ایک آزاد مکتبِ خیال ہے تحصیل دولت کے ذرائع پر بظاہر ان کے نزدیک کسی قسم کی قید عائد کرنا سوجھ بوجھ عقل و دانائی کے خلاف ہے بلکہ جس کو جس وقت جس ذریعہ سے بھی حصول دولت کا موقع ملے بدعقلی ہوگی کہ اس سے فائدہ نہ اٹھایا جائے یا روپیہ رہتے ہوئے اپنی خواہش خواہ جس بات کی ہو آدمی پوری نہ کرے۔ قرآن نے جن الفاظ میں ان کے اس معاشی نظریہ کا ذکر کیا ہے۔ اس سے ضمناً یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مذہب جو عموماً لوگوں کے خیال میں پوجا پاٹ یا "صلوٰۃ" میں منحصر ہے۔ معاشی کاروبار میں اس کی دخل اندازیوں کو وہ ناپسند

کرتے تھے۔ اسی لئے انھوں نے کہا کہ تمہاری نمازیں کیا اس سے بھی روکتی ہیں کہ ہم اپنے اموال کے متعلق جو چاہیں کریں۔

دوسرا مکتبِ خیال اسی کے مقابلہ میں معاشیات ہی کا ایک دوسرا اسکول بھی ہے جو دوسرے پہلوؤں کی طرح انسانی زندگی کے معاشی پہلو کو بھی چند خاص حدود میں رکھنا چاہتا ہے، یعنی وہی بات جو حدیث میں آئی کہ من این اکتسبہ و فی ما انفقہ (کہاں سے کمایا اور کس راہ میں خرچ کیا) دونوں پر نگرانی قائم کرنا چاہتا ہے، تقریباً ہر زمانے میں اس طبقہ کی بھی کمی نہیں رہی ہے۔ عملی طور پر خواہ اس اصول کے ماننے والوں کی تعداد کتنی ہی تھوڑی ہو، لیکن نظری حیثیت سے اگر دیکھا جائے تو اکثریت کم از کم زبان سے اس نگرانی کی ہمیشہ حامی رہی ہے۔ اسی لئے چوری، ڈاکہ، رشوت، خیانت، دھوکا وغیرہ ذرائع کسب کو اچھی سوسائٹیوں میں ہمیشہ بری نظروں سے دیکھا گیا ہے، غالباً اسی بنا پر دُنیا کی ہر قوم اور ہر ملک میں حد بندی عائد کرنے والے معاشی قوانین پائے جاتے ہیں، اسلام کا تعلق بھی ثانی الذکر طبقہ سے ہے اور اس وقت میں انھیں پابندیوں کی کلی حیثیت سے تفصیل کرنا چاہتا ہوں جو ان دونوں امور یعنی من این اکتسبہ یا دوسرے لفظوں میں "دخل" اور "فیم انفقہ" یا "خرچ" پر اسلام نے عائد کئے ہیں، دونوں سوالوں پر دو مستقل عنوانوں کے نیچے بحث کی جائے گی۔

دخل

دخل یعنی مال و دولت کے کمانے اور ان سے استفادہ کے ذرائع پر اسلام نے جو قیود عائد کئے ہیں، اس کی تفصیل کے سمجھنے کے لئے چاہیئے کہ "اجمالاً" پہلے دنیا کی چیزوں کی اس تقسیم کو سمجھ لیا جائے جو معاشی حیثیت سے اسلام میں اختیار کی گئی ہے۔

اسلام میں اشیاء کی معاشی تقسیم واقعہ یہ ہے کہ فقہ کی کتابوں میں اگرچہ مالی مسائل کو مختلف ابواب کے ذیل میں منتشر کر کے بیان کیا گیا ہے، لیکن تمام ابواب کے مسائل کو پیش نظر رکھ کر منطقی طریقہ سے چاہیں تو ہم ان کو یوں تقسیم کر سکتے ہیں، یعنی ان چیزوں کا بنی آدم میں کوئی مالک ہے یا نہیں، اگر مالک نہیں ہے تو قبضہ کرنے کے بعد بھی آدمی ان کا مالک ہو سکتا ہے یا نہیں، اسی طرح جن چیزوں کا کوئی مالک ہے ان کی بھی دو صورتیں ہیں، مالک کی مرضی کے بغیر اسلام ان پر دوسروں کو قبضہ کرنے کی اجازت دیتا ہے یا نہیں، اگر دیتا ہے تو اس کی کتنی صورتیں ہیں، اور نہیں دیتا ہے تو پھر ان چیزوں کے مالک ہونے کے قانونی ذرائع کیا ہیں اور اسلام ان قانونی پابندیوں کو ان چیزوں کے مالک ہونے کے لئے کیوں ضروری قرار دیتا ہے۔ چونکہ ان تمام منطقی شقوں کے نیچے کچھ نہ کچھ چیزیں داخل ہیں اس لئے میں ہر ایک پر الگ الگ بحث کرتا ہوں۔

ایسی چیزیں جن کا اسلامی نقطہ نظر سے کوئی مالک نہیں ہے "ہدایہ میں ہے۔

الانتفاع بماء البحر — سمندر دریا کے پانی سے استفادہ کی

كالانتفاع بالشمس والقمر والهواء (كتاب الشرب ج ٤)

نوعیت وہی ہے جو آفتاب، ماہتاب اور ہوا سے استفادہ کا حکم ہے (یعنی ہر شخص کو ان سے استفادہ کا عام حق حاصل ہے)

جس سے معلوم ہوا کہ سمندر، دریا وغیرہ اور ان کا پانی اور آفتاب ماہتاب وغیرہ اور ان کی روشنی اسی طرح ہوا اور فضا کا کوئی مالک نہیں ہے۔ اسی طرح ہوا کے پرندے جنگل کے جانور، سمندر کے حیوانات ان سب کا کوئی مالک نہیں ہے اور یہی حال جنگل، پہاڑ وغیرہ کے درختوں اور دیگر نباتات کا ہے کہ نہ ان کا کوئی مالک ہے اور نہ ان کے پھلوں کا بلکہ ہر شخص کے لئے وہ شرعاً مباح اور جائز ہیں، قاضی ابو یوسف کتاب الخراج میں اخروٹ، بادام وغیرہ کے خودرو جنگلی درختوں اور شہد وغیرہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

اذا كان في المفاوز والجبال على الاشجار او في الكهوف فلا شئ فيه وهو بمنزلة الثمار تكون في الجبال والاودية.

جب یہ چیزیں صحرا اور پہاڑوں میں درختوں میں یا پہاڑ کے غار میں ہوں تو ان پر کچھ نہیں (یعنی حکومت ان پر کوئی محصول عائد نہیں کر سکتی) اور ان کا حال ان پھلوں کا ہے جو پہاڑوں اور وادیوں میں ہوں

باقی اراضی یعنی زمین کی بھی اسلام میں چند قسمیں ہیں، صاحب بدائع نے ان اقسام کو اس طرح بیان کیا ہے۔

والارض في الاصل نوعان مملوكة والارض مباحة غير مملوكة والمملوكة نوعان عامرة وخراب والمباحة ايضاً نوعان نوع هو من مرافق البلد محتطبا لهم ومرعى مواشيهم ونوع ليس من مرافقها وهو المسمى بالموات.

زمین کی دراصل دو قسمیں ہیں، زمین جو کسی کی ملک ہو، ایک قسم، دوسری قسم مباح یعنی کسی کی ملکیت میں نہ ہو، پھر جو زمین کسی کی ملک ہے اس کی بھی دو قسمیں ہیں آباد اور غیر آباد۔ اسی طرح غیر مملوکہ مباح زمین کی بھی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جس کا شمار بلدہ (آبادی) کی سہولت آفرینیوں سے ہو، مثلاً لکڑی حاصل کرنے کی جگہ ہے، مویشیوں کی چراگاہ ہو، اور دوسری وہ جس کا شمار مرافق سہولت آفریں خطہ سے نہ ہو اسی کا نام "الموات" ہے۔

جس سے معلوم ہوا کہ زمین کی بعض قسمیں غیر مملوک بھی ہوتی ہیں، اور ظاہر ہے کہ جب ان پر کسی کا قبضہ نہیں تو ان کے مملوک ہونے کے کیا معنیٰ ہو سکتے ہیں، سوال اس کے بعد ہوتا ہے کہ ان چیزوں کے تملیک کی کیا شکل ہے۔ عام طور سے ان چیزوں کے مالک ہونے کا طریقہ اسلام نے بھی وہی اختیار کیا ہے جو عموماً دنیا میں مروج ہے۔ ابوداؤد میں سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے۔

من سبق الی مالم یسبق الیہ مسلم فھو احق بہ۔	جس پر کسی مسلمان کا پہلے قبضہ نہ ہو جو پہلی دفعہ قبضہ کرے گا وہی اس کا زیادہ حقدار ہے

فقہار نے اس حدیث کی بنار پر یہ قانون پیدا کیا، جیسا کہ ہدایہ میں ہے۔

من سبقت یدیہ الیہ ملکہ۔	یعنی پہلی دفعہ جس کا قبضہ اس پر ہوگا وہی اس کا مالک ہو جائے۔

مثلاً کہتے ہیں کہ

من احتطب احتطب فی مفازۃ فھولہ ومن اصطاد صیدا فھولہ۔	جنگل میں جو لکڑی کاٹ لے اور شکار کو جو شکار کرے وہ اسی کا ہوگا۔

لیکن باوجود اس عام قانون کے چند چیزیں ایسی ہیں جن کو اسلام میں بعض خاص شرائط کے ساتھ اس قانون سے مستثنیٰ کیا گیا ہے، میرا مطلب یہ ہے کہ ایسی چیزیں جن پر کسی کا قبضہ ہی نہیں ہوسکتا، اور ان کو وہ اپنی حفاظت میں نہیں لے سکتا مثلاً آفتاب و مہتاب، ہوا وغیرہ ان کا تو ظاہر ہی ہے کہ آدمی مالک نہیں ہوسکتا، ہدایہ میں ہے کہ

الانتفاع بالشمس والقمر والھواء فلا یمنع من الانتفاع بہ علی ای وجہ شاء۔	آفتاب ماہتاب ہوا سے فائدہ اٹھانے سے کوئی روکا نہیں جاسکتا جس طرح چاہے ان سے استفادہ کرسکتا ہے۔

اسی بنا پر فقہار کا یہ مسئلہ ہے کہ دو منزلہ مکان کی نچلی منزل کا کوئی اگر مالک ہو اور اوپر والی منزل کا کوئی اور پھر اوپر والی منزل اگر گر جائے تو اس فضا یا ہوا کو جس میں یہ اوپر والی منزل تھی اس کو کوئی بیچ نہیں سکتا ابن ہمام نے اس کی وجہ فتح القدیر میں یہ لکھی ہے کہ مکان کو بلند کرنے کا جو حق اس کو حاصل تھا وہ

حق متعلق بالھواء ولیس الھواء مالا یباع (۳۰۲ مطبوعہ مصر ج ۵)	ایک ایسا حق ہے جو ہوا کے ساتھ قائم ہے اور ہوا کوئی مال نہیں ہے جسے بیچا جائے

اشتراکی سرمایہ پانی، آگ، گھاس لیکن علاوہ ان چیزوں کے اور بھی چند امور ہیں جن پر خواہ کسی کا قبضہ ہی کیوں نہ ہو جائے لیکن عام مفاد کے لئے اسلام نے یہ قرار دیا ہے کہ انفرادی طور پر قانوناً کوئی ان کا مالک نہیں ہوسکتا۔ بلکہ انھیں عام پبلک پراپرٹی قرار دینا چاہتا ہے۔ اس سلسلہ میں عموماً کتابوں میں اگرچہ تین ہی چیزوں کا تذکرہ کیا جاتا ہے یعنی مشہور حدیث ہے۔

الناس شرکاء فی الماء والکلاء والنار (اصحاح)	لوگ تین چیزوں میں ایک دوسرے کے ساجھی اور شریک ہیں یعنی الماء (پانی) الکلا (گھاس) النار (آگ) میں۔

اسی حدیث کی بنا پر پانی، گھاس، آگ میں "الناس" یعنی عام پبلک شریک سمجھی جاتی ہے۔

اشتراکی سرمایہ کے ملحقات

لیکن صرف ان ہی تین چیزوں تک اشتراک کے قانون کو محدود سمجھنا صحیح نہیں ہے بلکہ اس ذیل میں اور بھی ایسی چیزیں ہیں جن کو انفرادی ملکیت قرار دینے کی صورت میں اندیشہ ہے کہ

ملک احد بالاحتجار ملک	اگر احاطہ بندی کر کے کوئی اس کا مالک
منعه فضاق على الناس	ہو جائے گا تو لوگوں کو اس سے روکے گا
فان اخذ العوض عنه	اور عوام تنگی میں بتلا ہو جائیں گے
اغلاه فخرج عن الموضع	اور اگر اس کا معاوضہ لے گا تو اسے
الذی وضعه الله من	گراں کر دے گا جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ حق
تعميم ذوى الحوائج من	تعالیٰ نے جس غرض کے لئے اس چیز کو
غير كلفة، (المغنى)	جو مقام عطا کیا تھا وہاں سے وہ چیز
(ص ۱۵۰ ج ۲)	ہٹ جائے گی یعنی عام حاجتمندوں

کی ضرورت بغیر کسی کلفت و مشقت کے پوری ہو یہ بات جاتی رہے گی۔

اسی لئے علامہ ابن قدامہ نے اس سلسلہ میں حسب ذیل چیزوں کا اضافہ کیا ہے۔

المعادن الظاهرة وهى التى	ظاہری معادن ان کو کہتے ہیں جن تک
يوصل ما فيها من غير مؤنة	بغیر کسی محنت و مشقت کے رسائی حاصل
ينتابها الناس وينتفعون بها	ہو سکے لوگوں کی اس پر آمد و رفت جاری
كالملح والماء والكبريت	ہو اور لوگ اس سے نفع اٹھاتے
والقير والموميا والنفط	ہوں، مثلاً نمک، گندھک، تارکول (ڈامر)
والكحل والياقوت ومقاطع	مومیائی، نفت (مٹی کا تیل)، سرمہ، یاقوت
الطين واشباه ذلك.	یا مٹی نکالنے کی جگہ ہو۔

علامہ لکھتے ہیں کہ اسلامی نقطہ نظر سے یہ چیزیں۔

لا تملك بالاحياء ولا يجوز	نہ آباد کرنے اور حکومت سے جاگیر لینے
اقطاعها لاحد من الناس	کی وجہ سے ان امور کا کوئی مالک ہوتا ہے
ولا احتجازها دون	اور نہ یہ جائز ہے کہ عام مسلمانوں پر
المسلمين لان فيه ضرر	اس سے استفادہ کی راہ بند کی جائے
بالمسلمين وتضييقا عليهم	کیونکہ اس سے مسلمانوں کو نقصان

پہنچے گا اور ان پر تنگی ہوگی۔

فقہاء نے اس قانون کو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مشہور حدیث سے مستنبط کیا ہے جو ابو داؤد، ترمذی وغیرہ میں پائی جاتی ہے۔ واقعہ یہ ہوا کہ ابیض بن حمال نامی صحابی کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے

ان کی درخواست پر مآرب (یمن) کے ایک کھارے چشمہ کو بطور جاگیر کے عطا فرما دیا، لیکن سند لے کر جب وہ روانہ ہوئے تو لوگوں نے عرض کیا کہ حضور نے خیال نہیں فرمایا کہ اس شخص کو جاگیر میں کیا چیز عطا فرما دی گئی وہ تو ایک نہ ختم ہونے والا جاری چشمہ ہے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سن کر ارشاد فرمایا "فلا اذن" یعنی جب وہ ایسا چشمہ ہے تو پھر وہ جاگیر میں نہیں دیا جا سکتا، اسی لئے فقہار نے یہ طے کر دیا ہے کہ حکومت اس قسم کی چیزیں کسی کو جاگیر میں بھی دے جب بھی وہ کسی کی جاگیر نہیں بنے گی، اور وہ ہر حال میں پبلک جائداد ہی رہے گی۔

علاوہ ان معادن کے فقہار نے انھیں مصالح کی بنا پر لکھا ہے کہ

لیس للامام ان یقطع مالا غنی للمسلمین عنه یعنی اذا کانت اجمة او غیضة او بحریشربون منه او مملحة لاهل بلدة فلیس للامام ان یقطع ذلک لاحد.

(عنایہ برحاشیہ ہدایہ ص ۳۸۲ ج ۴)

ایسی چیزیں جن سے عموماً مسلمان بے نیاز نہیں ہو سکتا یعنی ان کی عام ضرورت کی چیزیں ہوں تو حکومت کو حق نہیں ہے کہ کسی خاص آدمی کی جاگیر میں ان کو دے دے، مثلاً اجمہ (آبی نیستان) ہو یا جنگل ہو، یا دریا ہو جس سے پانی پیتے ہوں یا نمک بنانے کی جگہ کسی خاص آبادی کی ہو، جائز نہ ہوگا کہ امام کسی کو یہ چیزیں جاگیر میں دے دے۔

اسی طرح آبادی کی چراگاہیں یا اردگرد کی جھاڑیوں جن سے لوگ ایندھن کا کام لیتے ہیں یا آبادی کے اطراف کی ایسی زمین جن پر کھلیان وغیرہ لگاتے ہیں اور ان کا کوئی مالک نہ ہو تو فقہار نے لکھا ہے

ما کان خارج البلد من مرافقها ومحتطبا لاهلها او مرعى لهم لا یکون مواتا حتى لا یملک الامام اقطاعها.

آبادی سے باہر جو سہولت کی چیز یا ہوں اور باشندوں کی لکڑی حاصل کرنے کی جگہ ہو، تو یہ ساری چیزیں زموات (یعنی ایسی زمین نہیں ہو سکتی ہیں جنھیں آباد کر کے کوئی ان کو ذاتی ملک بنا سکتا ہے، اور نہ امام (حکومت) کسی کو جاگیر میں یہ چیزیں دے سکتی ہے۔

زیلعی نے اس دفعہ کو نقل کرتے ہوئے یہ لکھا ہے۔

فناء العامر فینتفعون به لانهم محتاجون اليه لرعي مواشيهم وطرح حصائدهم

آبادی کے اطراف و کناف کی زمین کا بھی یہی حکم ہے کہ عام لوگ اس سے نفع اٹھاتے ہیں، لوگ اپنے مویشیوں کے چرنے کے لئے اور کھلیان لگانے کے لئے

فلم یکن انتفاعهم منقطعا عنه ظاهرا فلا یکون مواتا۔ (زیلعی بر ہدایہ ص ۳۰ ج ۴)	اس کے محتاج ہیں اور اس وجہ سے استفادہ کا تعلق ہے وہ اس قسم کی زمینوں سے منقطع نہیں ہو سکتا۔ اس لئے اس کا شمار الموات (آباد کر کے آدمی جس کا

مالک ہو سکتا ہو) اس میں شمار نہیں ہو سکتا۔

اسلام نے جب ان چیزوں میں انفرادی ملک کو ناجائز ٹھیرایا ہے تو ظاہر ہے کہ شاہراہ عام یا عام آب پاشی کے ذرائع جنھیں یوں بھی پبلک کی ملک خیال کیا جاتا ہے ان میں انفرادی ملک کو کس طرح جائز قرار دیا جا سکتا ہے، فقہ کی کتابوں میں اس کی صراحت کر دی گئی ہے کہ جس طرح مندرجہ بالا امور کو حکومت کسی کی انفرادی ملک نہیں قرار دے سکتی اسی طرح

لا اقطاعه کمشارع الماء وطرقات المسلمین۔ (ابن قدامہ ص ۱۵۸ ج ۶)	جائز نہ ہوگا کہ پانی کے خزانوں اور مسلمانوں کی عام شاہراہوں کو حکومت کسی کی جاگیر میں دے دے۔

نہ حکومت دے سکتی ہے اور نہ آبادی کے باشندے ان پر قبضہ کر کے اپنی ملک بنا سکتے ہیں، کفایہ شرح ہدایہ میں ہے

وکذا لا یجوز احیاء ما تعلق به حق العامة کما فی النهر والطریق۔ (ص ۲۸۲ ج ۴)	یوں ہی آباد کر کے قبضہ کرنے کی اجازت ان چیزوں کے متعلق بھی نہیں دی جا سکتی جن کے ساتھ عوام کا حق متعلق ہو، مثلاً نہر اور راستہ کا جو حکم ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ پانی، آگ، گھاس اور ایسے معادن جن کی پیداوار کے حاصل کرنے میں کسی محنت و مشقت، جد و جہد اور مصارف کی ضرورت نہیں ہوتی اور عام لوگوں کی ضرورت کی چیزیں ان سے برآمد ہوتی ہوں، آبادی کی چراگاہیں، جنگل جھاڑ جن کا کوئی مالک نہ ہو، آبادی کے اطراف کی وہ زمین جس میں آبادکار اپنے زرعی کاروبار کرتے ہوں مثلاً کھلیان وغیرہ لگاتے ہوں یا شوارع عام (عام راستے) یا آبپاشی کے عام خزانے وغیرہ ایسی چیزیں نہ حکومت کسی کو انفرادی طور پر ان کا مالک بنا سکتی ہے اور نہ قبضہ کر کے خود کوئی ان کو اپنی انفرادی ملک بنا سکتا ہے، اگر کوئی قبضہ بھی کر لے گا تو قانوناً غلط ہوگا اور ہمیشہ یہ پبلک جائداد ہی سمجھی جائے گی، گویا یوں سمجھنا چاہیئے کہ اسلام ان امور کے متعلق اپنا نقطۂ نظر اشتراکی رکھتا ہے۔ اجمالی طور پر تو ان امور کا یہی حال ہے، لیکن فقہاء نے ان کی مختلف قسموں پر غور کیا ہے اور بعض چیزوں کو اشتراک کے اس حکم سے مستثنیٰ بھی کیا ہے، مثلاً پانی کی انھوں نے چار قسمیں قرار دی ہیں، صاحب بدائع لکھتے ہیں

پانی کی مختلف قسمیں اور ان کے مختلف احکام صاحب بدائع لکھتے ہیں۔

المیاه اربعة انواع الاول	پانی کی چار قسمیں ہیں، پہلی قسم پانی کی

الماء الذی یکون فی الاوانی	وہ ہے جو برتنوں اور ظروف میں ہو،
والظروف والثانی الذی	دوسری قسم وہ ہے جو کنوؤں اور حوضوں
یکون فی الآبار والحیاض	اور چشموں میں ہو، تیسری قسم وہ ہے جو
والعیون الثالث ماء الانہار	ان چھوٹے دریاؤں اور ندیوں میں ہو
الصغار التی تکون لاقوام مخصوصین	جن کا تعلق خاص خاص قوموں سے ہو
والرابع ماء الانہار العظام	چوتھی قسم وہ ہے جو بڑے بڑے دریا
کجیحون سیحون ودجلہ	جیسے جیحون اور سیحون، دجلہ و فرات
والفرات۔	وغیرہ میں ہو۔

بڑے بڑے دریا کا پانی

پانی کے ان چار اقسام کے متعلق بالاتفاق سب کا یہ مذہب ہے کہ جو پانی بڑے بڑے دریا مثلاً جیحون وسیحون یا ہندوستان میں گنگ جمنا کرشنا کوداوری کا ہے یہ ملک کے تمام باشندوں کا پانی ہے۔ ہر شخص کو اس سے خود پینے کا جانوروں کو پلانے کا، اور کھیتوں باغوں کے سینچنے کا قانونی حق ہے۔ صاحب بدائع لکھتے ہیں

الانہار العظام کسیحون	بڑے بڑے دریا مثلاً سیحون اور جیحون
وجیحون ودجلۃ والفرات	دجلہ وفرات اور اسی قسم کے جو دریا ہیں
ونحوہا فلا ملک لاحد	یہ کسی کی ذاتی ملک نہیں بن سکتے، نہ ان کے
فیہا ولا فی رقبۃ	پانی کا کوئی ذاتی مالک ہو سکتا ہے اور
النہر ولا لاحد حق خاص	نہ اس رقبۂ زمین کا جس میں ان دریاؤں کا
فیہا ولا فی الشرب بل	پانی بہتا ہے اور نہ کسی خاص شخص کا ان
ہو حق عامۃ المسلمین	کے ساتھ کوئی ذاتی حق متعلق ہو سکتا ہے
فلکل احد ان ینتفع	نہ آبپاشی کا ذاتی حق ان دریاؤں کے
بہذہ الانہار بالشفۃ	متعلق کسی خاص شخص کو حاصل ہو سکتا ہے
والسقی۔	بلکہ یہ عام مسلمانوں کا حق ہے اسی لئے

ہر شخص کو حق حاصل ہے کہ ان دریاؤں سے وہ نوشیدنی اور سیرابی دونوں قسم کے منافع اٹھا سکتا ہے

بڑے دریاؤں سے نہروں کا نکالنا

صرف یہی نہیں بلکہ ان دریاؤں سے نہر کاٹ کر اگر کوئی اپنی زمین میں لائے اور کسی دوسرے کی زمین اس کے اس فعل سے برباد نہ ہوتی ہو یا باشندگان ملک کو اور کسی قسم کا نقصان نہ پہنچتا ہو تو کسی کو کوئی حق نہیں ہے کہ نہر کھودنے سے اس کو روکے حتیٰ کہ حکومت بھی یہ نہیں کر سکتی۔ بدائع میں ہے۔

لہ ان یشق الیہا نہرا	اس کا بھی ہر شخص کو حق حاصل ہے کہ اپنی
من ہذہ الانہار ولیس	زمین تک ان دریاؤں سے نہر کاٹ کرلے جائے

للامام ولا لاحد منعه عنه یضر بهم اولم یضر

اور نہ امام (حکومت) ہی کو اس کا حق ہے اور نہ کسی اور کو کہ اس فعل سے اس کو روکے بشرطیکہ اس نہر کی وجہ سے کسی کو ضرر نہ پہنچے۔

ان دریاؤں کے پانی کی قوت سے چکی وغیرہ چلانا یا موٹ جسر ان پر قائم کرنا

اسی طرح ہر باشندۂ ملک کو اس کا بھی حق ہے کہ اس قسم کے دریاؤں اور ندیوں پر۔

ان ینصب علیه رحی ودالیة وسانیة (ہدایہ)

کہ ان پر پن چکی اور رہٹ موٹ وغیرہ قائم کرے۔

البتہ حکومت اور پبلک دونوں کو اس کا حق ہے کہ اس کے ان افعال سے خود نہر یا دریا کو کوئی نقصان نہ پہنچے اس کی نگرانی کریں۔ بدائع ہی میں ہے۔

کل واحد بسبیل من الانتفاع لکن بشریطة عدم الضرر بالنهر کالانتفاع بطریق العامة وان اضر بالنهر فلکل واحد من المسلمین منعه۔

اگرچہ ہر شخص کو نفع گیری کا حق حاصل ہے بشرطیکہ اس کی نہر کی وجہ سے کسی کا کچھ نقصان نہ ہوتا ہو، یہی حکم کہ بھی ہے جو عام شاہراہوں کا ہے۔ لیکن اگر اس سے نہر کو نقصان پہنچا ہو تو ہر مسلمان کو حق ہے کہ اس فعل سے اس کو روک دے۔

دریاؤں کے سوا پانی کے اقسام

اسی طرح پانی کی دوسری اور تیسری قسم یعنی مخصوص افراد کی زمین میں جو نہریں بہتی ہیں یا مملوکہ زمینوں کے تالاب اور کنوؤں کا پانی اس کے متعلق حکم یہ ہے کہ

حق الشفة ثابت

نوشیدنی کا حق پبلک کے ہر فرد کو اس میں حاصل ہے

یعنی خود پینے یا اپنے جانوروں کو پانی پلانے کا حق تو اب بھی عام پبلک کو حاصل ہے۔ البتہ چونکہ مملوکہ زمینوں سے اس پانی کو تعلق ہے۔ اس لئے زمین کے مالکوں کی اجازت کے بغیر دوسروں کو اس پانی سے باغوں یا کھیتوں کے سینچنے کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔ ہدایہ میں ہے۔

فان اراد رجل ان یسقی بذلک ارضا احیاها کان لاهل النهر ان یمنعوه سنه اضربهم او لم یضر۔ (ہدایہ ص ۸۲ ج ۴)

اگر کوئی اپنی آباد کردہ زمین کو اس قسم کے پانی سے سینچنا چاہے تو نہر والوں کو حق ہے کہ اس کو روک دیں، خواہ نقصان ہو یا نہ ہو۔

نہروں کنوؤں تالابوں کے پانی کے فروخت کا حکم

مگر باایں ہمہ اس قسم کے پانی کے بیچنے یا اجارہ کی بھی اجازت نہیں ہے فقہاء اس باب میں ایک حدیث بھی نقل کرتے ہیں۔

نهی رسول الله صلی الله علیه وسلم عن بیع نقع البئر۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے کہ کنوؤں کے سوت کے پانی کو کوئی فروخت کرے۔

"نقع البیر" کا ترجمہ صاحبِ بدائع نے "فضل مائہا" یعنی کنووں کا زائد از ضرورت پانی کیا ہے بہرحال اس حدیث کی وجہ سے پینے پلانے سے تو کسی کو کوئی روک نہیں سکتا۔ لیکن اگر ہر شخص کو ایسی نہروں یا تالابوں یا باولیوں سے آبپاشی کی عام اجازت دیدی جائے گی تو جیسا کہ صاحب بدائع لکھتے ہیں

كل احد يتبادر الیہ فیسقی منہ زرعہ واشجارہ فیبطل حقہ اصلا۔

ہر شخص پیشقدمی کر کے اس پانی سے نفع اٹھانا چاہے گا اور اس سے اپنے کھیت اور باغ کو سیراب کرے گا بس نہر والوں کا حق مارا جائے گا۔

خلاصہ یہ ہے کہ اس قسم کے پانی میں اشتراکیت کا نظریہ صرف "حق الشفۃ" یعنی نوشیدنی تک محدود ہے، پھر فقہاء نے اس کی مختلف شکلوں کے احکام بھی لکھے ہیں۔ مثلاً اگر کنواں یا تالاب کا مالک پبلک کو اپنی زمین سے آنے سے روکے اور کہے کہ قانوناً پانی پر تمہارا حق ہے لیکن میری مملوکہ زمین کے احاطہ میں داخل ہونے کی تو اجازت نہیں، تو ایسی صورت میں دیکھا جائے گا اگر نوشیدنی کی ضرورت پبلک کسی اور ذریعہ سے پوری کر سکتی ہے تو جھگڑنے کی حاجت نہیں۔ لیکن اگر ایسی صورت نہ ہو تو پھر کنوئیں کے مالک کو مجبور کیا جائے گا کہ یا تو وہ لوگوں کو اپنے کنوئیں سے پانی لینے دے ورنہ کوئی نظم کرے کہ لوگوں تک ان کا قانونی حق پہنچ جائے یعنی ان کے اور ان کے جانوروں تک پانی پہنچ جائے۔ اس حق پر اتنا زور دیا گیا ہے کہ دونوں باتوں میں سے کسی پر راضی نہ ہو تو پبلک کو حق ہے کہ باضابطہ مسلح ہو کر اس سے جنگ کریں اور اپنا حق حاصل کریں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں اسی قسم کی ایک صورت پیش آئی تو آپ نے فرمایا۔

هلا وضعتم فيهم السلاح (بدائع)

تم نے لوگوں کے درمیان ہتھیار کیوں نہ ڈالا۔

پانی کی وہ قسم جو بک سکتی ہے

یعنی پانی کی چوتھی قسم یعنی جب برتنوں یا مشکوں میں پانی بھر لیا گیا ہو تو اس قسم کے پانی میں انفرادی ملکیت پیدا ہو جاتی ہے صاحبِ بدائع لکھتے کہ اب اس پانی کی حیثیت ایسی ہو گئی کہ

كما استولى على الحطب والحشيش والصيد۔

کوئی جنگل کی لکڑیوں اور گھاس و شکار پر قابو پالے (تو وہ اس کی ملک بن جاتا ہے)

کہ ان چیزوں سے استفادہ کا حق اگرچہ پبلک کے ہر فرد کو حاصل ہے لیکن جب ان پر کسی کا قبضہ ہو گیا تو قبضہ کرنے والے کی وہ ملک ہو جاتی ہیں اسی طرح برتن اور مشک کا پانی بھی مملوک ہو جاتا ہے

فيجوز بيعہ۔

اور ایسی صورت میں (مشک و برتن وغیرہ کے پانی کا فروخت کرنا بھی جائز ہے)

اس قسم کے پانی کی بیع و فروخت کا ثبوت اس سے بھی ملتا ہے کہ

السقاؤن يبيعون المباء

برتنوں میں جس پانی کو محفوظ کر لیا گیا ہو

المحوزۃ فی الظروف بہ	اس کو جبشیوں کی جماعت ہمیشہ بیچتی رہی
جرت العادۃ فی الامصار	ہے۔ تمام شہروں اور ملکوں میں اس کا
فی سائر الاعصار من غیر نکیر	عام رواج ہے اور کسی نے اس پر
(بدائع)	اعتراض نہیں کیا۔

اس لئے اس پانی کے متعلق حکم ہے کہ

فلم یحل لاحد ان یاخذ	جائز نہ ہوگا کہ پانی کے مالک کی اجازت کے
منہ فیشرب من غیر اذنہ	بغیر کوئی اس کو لے اور پئے۔

البتہ ایسی صورت میں کہ پیاس سے کسی کی جان پر بن آئے اور دوسرے کے برتن میں زائد از ضرورت پانی ہو تو غیر مسلح لڑائی کر کے پانی زبردستی چھین کر پی سکتا ہے۔

شدید ضرورت کی چیزوں میں اشتراکیت کا نقطۂ نظر اور یہ حکم کچھ پانی کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ ہلاکت کے اندیشے کی صورت میں زائد از ضرورت چیز دوسرے سے آدمی زبردستی چھین کر استعمال کر سکتا ہے خواہ کھانا ہو یا اسی قسم کی دوسری چیز۔ ہدایہ میں ہے کہ

وکذا الطعام عند اصابۃ المخمصۃ	یعنی یہی حکم کھانے کا بھی ہے شدت
(ص ۳۸۴ ج ۴)	بھوک میں۔

مملوکہ پانی میں بھی اشتراکیت کا اثر لیکن پانی برتن والا ہی کیوں نہ ہو۔ حدیث میں چونکہ (الماء) مطلق پانی میں عام لوگوں کو شریک قرار دیا گیا ہے اس لئے فقہاء اسلام نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ بلا ضرورت اگر کسی کی مشک یا برتن سے آدمی پانی چرائے تو چوری کی شرعی سزا قطع ید کا حکم اس پر نہ لگایا جائے گا خواہ اس پانی کی قیمت اسی قدر کیوں نہ ہو جس کے چرانے پر ہاتھ کاٹا جاتا ہے ہدایہ میں ہے

لو سرقہ انسان فی موضع	اگر کسی ایسے مقام میں جہاں پانی مشکل
یعز وجودہ وھو یساوی	سے میسر آتا ہو اور کوئی (برتن کے پانی
نصابا لم تقطع یدہ	چرالے تو چور کا ہاتھ نہ کاٹا جائے گا خواہ پانی
(کتاب الشرب جلد ۴ ص ۳۸۶)	کی قیمت اسی قدر کیوں نہ ہو جس پر ہاتھ کٹتا ہو۔

کیونکہ بہرحال ایک گونہ شرکت کا شبہ اس میں پیدا ہو گیا ہے اور شبہ سے اس قسم کی سزائیں ٹل جاتی ہیں۔

مچھلیوں کا حکم پانی ہی کے ذیل میں مچھلیوں کا مسئلہ بھی پیدا ہوتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ جس طرح ہوا کے پرندوں کا کوئی مالک نہیں ہے اور جو ان پر قبضہ کر لے گا وہی مالک ہو جاتا ہے۔ محض اس لئے کہ کسی تالاب یا باغ یا کھیت میں یہ پرندے چرتے چگتے ہیں یا رہتے ہیں کوئی ان کو فروخت نہیں کر سکتا حتیٰ کہ حکومت کو بھی اس کا اختیار نہیں ہے کہ اس قسم کی خشکی یا تری کے جانوروں کو کسی کی انفرادی ملکیت قرار دے۔ عنایہ شرح ہدایہ میں ہے

الامام لا یملک ان یخص	امام (حکومت) کو اس کا اختیار حاصل نہیں ہے

واحداً دون واحد بذالک حتیٰ لو امر واحداً ان یاخذ شیئاً صید البعینه من بر و بحر لا یملک المامور قبل الاخذ والاصطیاد۔

(ہدایہ ص ۳۸۰ ج ۴)

کہ کسی خاص شخص کو ان امور کی خصوصی ملکیت عطا کرے تا آنکہ اگر کسی کو امام حکم دے کہ فلاں خاص شکار کو پکڑے خواہ خشکی کا ہو یا دریا کا تو جسے حکم دیا گیا ہے وہ شکار پکڑنے سے پہلے اس کا مالک نہیں ہو سکتا۔

سوال ہوتا ہے کہ جب ہوا کے جانوروں کا یہ حکم ہے تو مچھلیاں جن کی حیثیت پانی میں وہی ہے جو ان وحشی پرندوں کی ہوا میں ہے ان کو بھی کوئی بیچ سکتا ہے یا نہیں —— قاضی ابو یوسف نے کتاب الخراج میں ایک خاص باب اس مسئلہ میں باندھا ہے۔ خود ان کا اور امام ابو حنیفہ وغیرہ کا خیال یہی ہے کہ ایسا کرنا جائز نہیں ہے لیکن اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ یہ غیر مملوک شئی کی بیع ہے۔ بلکہ ممانعت کا سبب یہ بتایا گیا ہے کہ خریدار کے متعلق دھوکہ کھا جانے کا اندیشہ ہے کہ پانی کے اندر کا حال کس کو کیا معلوم ہو سکتا ہے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے یہ فتویٰ قاضی صاحب نے نقل کیا ہے کہ

لا تبایعوا السمک فی الماء فانه غرر

مچھلی کو پانی کے اندر نہ بیچا کرو کہ اس میں دھوکہ ہے۔

اسی قسم کے الفاظ ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بھی منقول ہیں۔ لیکن اسی کے مقابلہ میں حضرت علی کرم اللہ وجہ سے اسی کتاب الخراج میں یہ بھی مروی ہے۔ رس نامی مقام میں جو یمن میں واقع ہے۔

انه وضع علی اجمة برس اربعة آلاف درهم وکتب لهم کتابا فی قطعة ادم۔

(کتاب الخراج ص ۹۵)

رس نامی مقام کے اجمہ (آبی نیستان) پر حضرت علی کرم اللہ وجہ نے چار ہزار درہم مشخص فرمایا اور چمڑے کے ایک ٹکڑے پر ان کو اس کا پٹہ لکھ کر دیا (اجمہ کے لفظ کی تحقیق آگے آرہی ہے)

صرف یہی نہیں کہ حکومت نے اس خزانۂ آب کو چار ہزار درہم میں بندوبست کیا بلکہ حضرت عمر بن عبد العزیز سے بھی اس کتاب میں یہ مروی ہے کہ عبد الحمید بن عبد الرحمٰن نے جو ان کے صوبہ دار تھے انھوں نے

یسئله عن بیع صید الآجام۔

آجام (آبی نیستانوں) کے شکار کے متعلق دریافت کیا کہ کیا ان کو فروخت کیا جائے۔

جواب میں عمر بن عبد العزیز نے فرمان بھیجا۔

ان لا باس به وسماه الحبس

(کتاب الخراج ص ۱۱۱)

اس کے فروخت کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے، اور اس کا نام انھوں نے "الحبس" رکھا۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تالاب کی مچھلیوں کے متعلق ابتدا سے کچھ اختلاف چلا آتا ہے۔ خود قاضی ابو یوسف نے

لکھا ہے کہ اگر کسی ایسے گڑھے میں مچھلی ہو جو بغیر شکار کی تدبیروں کے ہاتھ آجائے تو اس کے بیچنے میں حرج نہیں بلکہ آگے بڑھ کر ان کے الفاظ یہ بھی ہیں،

ومثله اذا كان يوخذ بغير صيد كمثل سمك في الجب۔	اور یہی حال ان مچھلیوں کا ہے جو بغیر شکاری تدبیروں کے پکڑی جاتی ہوں جیسا کہ ان مچھلیوں کا بیچنا جائز ہے جو کنوئیں میں ہوں۔
(کتاب الخراج ص ۱۱۱)	

ان تمام اقوال کے دیکھنے سے فیصلہ کی صورت یہی معلوم ہوتی ہے کہ سمندروں، دریاؤں، ندیوں وغیرہ کی مچھلیاں جو بند اور محدود پانی میں نہیں رہتی ہیں۔ ان کو نہ حکومت بیچ سکتی ہے اور نہ شکار کرنے سے پہلے کوئی اور بیچ سکتا ہے۔ بلکہ وہ عام پبلک کی چیز ہے۔ ملک کے ہر باشندے کو ان کے شکار اور ان سے استفادہ کا حق ہے۔ البتہ اگر محدود اور بند پانی مثلاً تالابوں وغیرہ میں ہوں تو حضرت علی کرم اللہ وجہہ اور عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے فتویٰ کے مطابق ان کے فروخت کرنے میں کوئی حرج نہیں خصوصاً ایسی مچھلیاں جنھیں اس زمانہ میں لوگ اپنے مخصوص تالابوں میں خرید کر پالتے ہیں یعنی ان کے بچے جنھیں زیرہ کہتے ہیں خرید کر تالابوں میں چھوڑ دیتے ہیں چونکہ قبضہ کرنے اور مملوک بنانے کے بعد ان کو تالابوں میں چھوڑا جاتا ہے بظاہر ان کے فروخت میں کوئی مضائقہ نہیں، لیکن آبادیوں کے اطراف و جوانب کے تالابوں یا جوہڑوں میں جو قدرتی خود زائیدہ مچھلیاں پائی جاتی ہیں، اگر زمیندار اور جاگیرداران کو گاؤں کے عام باشندوں کو شکار کر لینے کی بغیر کسی معاوضہ کے اجازت دے دیا کریں تو کم از کم حنفی مذہب کی رو سے اسلام نے عوام کا جو معاشی حق قائم کیا ہے اس سے محروم کرنے کے وہ مجرم نہ ہوں گے۔

مچھلیوں کے سوا دوسری آبی پیداواروں کا حکم مچھلیوں کے ساتھ سمندر، دریا، ندی وغیرہ کی دوسری پیداواروں کا بھی سوال اسلامی فقہ میں اٹھایا گیا ہے۔ ہمارے امام ابو حنیفہ کا تو کھلا ہوا فیصلہ ہے کہ خواہ جس قسم کی چیز بھی ہو، اس کی کتنی ہی قیمت ہو مثلاً عنبر ہو یا موتی ہو، یا اس کے سوا کوئی اور چیز ہو، سب کا حکم وہی ہے جو مچھلیوں کا ہے۔ یعنی ملک کے عام باشندوں کا وہ مشترک سرمایہ ہے جس کا جی چاہے انھیں نکال سکتا ہے اور فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ حکومت تک کو اس سے کسی قسم کا محصول لینے کا حق نہیں ہے۔ قاضی ابو یوسف نے اس کا بھی کتاب الخراج میں ایک مستقل باب باندھا ہے اور لکھا ہے کہ

قد كان ابو حنيفة وابن ابي ليلى يقولان ليس في شيئ من ذالك شيئ لانه بمنزلة السمك	ابو حنیفہ اور ابن ابی لیلیٰ دونوں کا خیال تھا کہ سمندری پیداواروں (مثلاً عنبر موتی وغیرہ) میں سے کسی پر کوئی محصول یا ان کی قیمت نہیں وصول کی جا سکتی۔ ان سب کا حکم وہی ہے جو مچھلیوں کا ہے

لیکن حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ایک فرمان کی بنا پر قاضی ابو یوسف نے خود یہ مسلک اختیار کیا ہے کہ دریا کی وہ چیزیں جو بطور زیور یا خوشبو کے استعمال ہوتی ہیں (مثلاً موتی مرجان عنبر وغیرہ) اس حکم سے مستثنیٰ ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ

فی ذلک خمس واربعة اخماسه لمن اخرجه۔	حکومت ان پیداواروں سے خمس (پانچواں حصہ) وصول کرے گی

اور باقی چار خمس (پنجے) اس شخص کے ہوں گے جس نے اسے نکالا۔

لیکن ان کے سوا اور تمام چیزوں کے متعلق ان کا بھی وہی خیال ہے جو امام کا ہے خود فرماتے ہیں۔

اما فی غیرها فلا شیٔ فیه۔	جو چیزیں بطور زیور (حلیہ) اور خوشبو کے استعمال ہوتی ہیں، ان کے سوا

سمندر کی اور چیزوں پر کچھ نہیں ہے۔

حضرت عمرؓ کے جس فرمان سے انھوں نے حلیہ اور عنبر کو مستثنیٰ کیا ہے وہ یہ ہے کہ یعلی ابن امیہ کو حضرت عمرؓ نے بحر (سمندر) کے علاقوں یا بحرین کا گورنر بنا کر بھیجا تھا یعلی نے بارگاہِ خلافت میں یہ لکھ کر پوچھا،

عنبرة وجدہ رجل یسئله عنها وعما فیها۔	عنبر (مچھلی جس سے عنبر نکلتا ہے) ایک شخص کو ملی ہے۔ وہ اس مچھلی اور

جو کچھ اس کے اندر سے برآمد ہوگا اس کے متعلق پوچھتا ہے۔

جواب میں یہ فرمان گیا کہ

فیما اخرج اللہ جل شانه من البحر الخمس۔ (کتاب الخراج)	سمندر سے اللہ تعالیٰ جن چیزوں کو برآمد کرتے ہیں، ان میں خمس (پانچواں حصہ) حکومت کا حق ہے۔

اس فرمان کے راوی ابن عباسؓ ہیں، خود بھی فرماتے ہیں۔

وذلک رائی۔	اور میری بھی یہی رائے ہے۔

بہر حال یہ سارے مباحث تو الماء (یعنی پانی) کے تھے جس میں آنحضرتؐ نے ملک کے عام باشندوں کو شریک قرار دیا ہے۔ گذشتہ بالا مسائل گویا اسی اشتراکی نظریہ کی تفصیل تھی۔

سیال معدنیات کے احکام پانی اور پانی کے خزانوں اور چشموں کے ذیل میں چونکہ بعض سیال "معادن" کو فقہاء اسلام نے اسی ذیل میں شمار کیا ہے۔ حتیٰ کہ قاضی ابو یوسف نے تو کتاب الخراج میں صاف طور پر لکھدیا ہے۔

لیس فی النفط والقیر والزیبق والمومیاان حق لشیٔ من ذلک عین فی الارض	جہاں تک میں جانتا ہوں مٹی کے تیل (نفط) اور قیر (تارکول)، مومیائی میں کچھ نہیں ہے، بشرطیکہ زمین سے ان کا

شیئ تعلمه کان فی ارض عشر (او فی ارض خراج (کتاب الخراج ص ۹۲)

کوئی چشمہ ابلتا ہو، خواہ یہ چشمے عشری زمین میں ہوں یا خراجی زمین میں۔

لیکن یہ ایک اجمالی بیان ہے ورنہ جیسے پانی کے مختلف اقسام کے مختلف احکام تھے ان معدنی چیزوں کا بھی یہی حال ہے، گنجائش کی حد تک ضروری مسائل درج کئے جاتے ہیں۔ اس مسئلہ کا پہلے بھی کچھ ذکر آچکا ہے، لیکن اس وقت ہم اس کو شرح الکبیر للمقنع الحنبلی سے نقل کرتے ہیں۔ اس میں ہے۔

لا تملک المعادن الظاهرة کالملح والقار والکحل والجص والنفط بالاحیاء ولیس للامام اقطاعه۔ (ج ۶)

ایسے معادن جنہیں معادن ظاہرہ کہتے ہیں مثلاً نمک اور قار (تارکول)، سرمہ، گچ، نفط (مٹی کا تیل) وغیرہ کے بعد معدنوں کا کوئی شخص ذاتی طور پر مالک نہیں ہو سکتا، نہ "احیاء" اور آباد کرکے ان کو اپنی ملک بنا سکتا ہے اور نہ حکومت کو حق ہے کہ کسی خاص شخص کی جاگیر میں ان چیزوں کو دے۔

یہ تو متن کی عبارت ہے۔ شرح اس کی یہ کی گئی ہے کہ

المعادن الظاهرة وهی التی یوصل الی ما فیها من غیر مؤنة ینتابها الناس وینتفعون بها کالملح والکبریت والقیر والمومیا والنفط والکحل والیاقوت ومقاطع الطین واشباه ذلک لا یملک بالاحیاء ولا یجوز لاحد من الناس ولا احتجازه دون المسلمین لان فیه ضرر المسلمین وتضییقا علیهم۔

(المغنی لابن قدامہ ص ۱۵۷)

ایسے معادن جو ظاہری معادن کہلاتے ہیں، جن کی تعریف یہ ہے کہ (۱) ان تک بغیر کسی محنت ومشقت کے رسائی ہو (۲) لوگوں کی اس پر آمد ورفت جاری ہو (۳) اور اس سے عام لوگ نفع اٹھاتے ہوں مثلاً نمک، گندھک، قیر (تارکول)، مومیائی، نفط (مٹی کا تیل)، سرمہ، یاقوت، مٹی نکالنے کی جگہ (الکو) اور اسی قسم کی چیزیں آباد کرکے بھی کوئی ان کا مالک نہیں ہو سکتا، اور نہ کسی کے لئے ایسا کرنا جائز ہے اور نہ یہ درست ہے کہ عام مسلمانوں کو ان سے استفادہ سے روکا جائے کیونکہ مسلمانوں کا نقصان ہے اور ان پر تنگی وضیق عائد کرنا ہے

نمک کا مسئلہ | گذشتہ بالا عبارتوں سے جہاں اور باتیں ثابت ہو رہی ہیں وہیں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ نمک کی کان بھی پبلک کا مشترک سرمایہ ہے نہ وہ انفرادی ملکیت بن سکتی ہے اور نہ حکومت اس پر کوئی محصول عائد کر سکتی ہے اور اس بنا پر بعض علماء نے ہندوستان میں پچھلے دنوں یہ عام فتویٰ دیدیا کہ اسلامی حیثیت سے نمک سازی پر محصول لگانا یا حکومت کو نمک بنانے سے لوگوں کو روکنا جائز نہیں ہے

مجھے سیاسی مصالح سے بحث نہیں لیکن علماء کے متعلق یہ ضرور خیال آتا ہے کہ مسئلہ کو ہمیشہ اس کی تنقیحات کے ساتھ پبلک میں پیش کرنا ان کی دیانت کا اقتضا ہونا چاہیئے۔ نمک کی ایسی کانیں جن میں مندرجہ بالا صفات پائی جاتی ہوں۔ یعنی (۱) لوگوں کی رسائی بلا خرچ نمک تک ہوتی ہو (۲) عام لوگوں کی آمد و رفت اس کان تک لگی ہوئی ہو اور لوگ اس سے نفع اٹھا رہے ہوں۔ بلا شبہ نمک کی ایسی کانوں کے متعلق اسلامی نقطۂ نظر وہی ہے۔ لیکن اگر بجائے اس کے صورت حال یہ ہو کہ

كان لقرب الساحل	سمندر کے کنارے کوئی ایسی جگہ ہو
موضع اذا حصل فيه	جب سمندر کا پانی اس میں آ کر جمع ہو جائے
الماء صار ملحا۔	تو نمک بن جاتا ہو۔

تو اس کے متعلق فقہاء کا عام فتویٰ یہ ہے کہ

ملك بالاحياء وللامام	تو اس کا آدمی مالک ہو جاتا ہے احیاء
اقطاعه۔	(آبادی) کے ذریعہ سے بھی اور امام

(حکومت) اس کو افراد کی جاگیریں دے سکتی ہے۔

اس قسم کی زمینوں کی "احیاء" یا زندہ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ

تهيئة لما يصلح له من	جس کام کی اس میں صلاحیت ہو اس کے
حفر ترابه وتمهيده وفتح	لئے اس کو تیار کرنا۔ یعنی اس کی مٹی
قناة اليه تصب الماء اليه	کھودنی، اس کو کشادہ کرنا سمندر سے

نالی نکال کر اس گڑھے تک لانا تاکہ سمندر کا پانی اس میں آ کر گرے۔

نمک بنانے کے لئے سمندر کی ساحلی زمینوں کو بندوبست کرنے کا حکومت کو اختیار کیوں ہے اور ان میں انفرادی ملکیت کیوں پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کی وجہ فقہاء نے یہ لکھی ہے کہ

لانه لا يضيق على المسلمين	کیونکہ سمندر کے کنارے اس قسم کے
باحداثه بل يحدث	کارخانے کے قائم کرنے سے مسلمانوں میں
نفعه بفعله فلم يمنع	کوئی تنگی پیدا نہیں ہوتی بلکہ اس زمین کا
منه كبقية الموات۔	نفع آباد کرنے والے کے عمل سے ظاہر
(المغنی ص ۵۸۰ ج ۲)	ہوتا ہے۔ پس اس کو اس فعل سے نہیں

روکا جائے گا جیسے موات کی دوسری زمینوں کے آباد کرنے سے وہ نہیں روکا جا سکتا۔

اور غالباً ہندوستان میں نمک سازی کا جو مسئلہ پیدا ہوا تھا وہ یہی صورت تھی۔

عام معدنیات کا حکم | اور صرف نمک ہی نہیں بلکہ اس کے سوا بھی جن معدنی امور کا ذکر کیا گیا ہے کہ اسلامی نقطۂ نظر سے ان میں انفرادی ملکیت پیدا نہیں ہو سکتی۔ اس حکم کو بھی ہر قسم کی کانوں کے لئے عام حکم نہ سمجھنا چاہیئے بلکہ یہ حکم ان ہی معدنی چیزوں تک محدود ہے جو خود بخود باہر آگئی ہوں

اور لوگ اس سے نفع اٹھاتے ہوں اور نہ ایسے معادن جن کو فقہی اصطلاح میں معادنِ باطنہ کہتے ہیں اور جن کی تعریف شرح کبیر میں یہ کی گئی ہے۔

هی التی لا یوصل الیها الا بالعمل والمؤنۃ۔ (ص ۱۵۰ ج ۶)	یہ ان کانوں کو کہتے ہیں جن کی پیداوار تک رسائی بغیر عمل اور مشقت و محنت کے نہیں ہو سکتی۔

پھر اس کی تشریح ان الفاظ میں کی گئی ہے۔

لم تکن ظاهرۃ فحفرها الانسان واظهرها۔	یعنی ابتداءً قدرتی طور پر وہ معدن ظاہر نہ تھا پھر کسی نے کھود کر اس کو نکالا اور نمایاں کیا۔

اس قسم کے معادن کی مثال میں حسبِ ذیل چیزوں کا ذکر کیا جاتا ہے۔

کمعادن الذهب والفضۃ والرصاص والبلور۔	جیسا کہ سونے، چاندی، سیسہ، بلور وغیرہ کی کانوں کا حال ہے۔

بہرحال ایسے معادن جن سے انتفاع بغیر عملی جد وجہد اور مصارف کے نہیں ہو سکتا، خواہ وہ کسی قسم کے ہوں۔ اگرچہ بعض فقہاء ان میں بھی انفرادی ملک کے قائل نہیں ہیں، ان کا مذہب ہے کہ حکومت کسی انفرادی شخصیت کے ساتھ ان کو بھی بندوبست نہیں کر سکتی۔ لیکن صاحب مغنی نے لکھا ہے کہ

والصحیح جواز ذلک	درست یہی ہے کہ ان کانوں کا بندوبست کرنا جائز ہے۔

یعنی "انفرادی ملکیت" بن سکتی ہے اور حکومت کو اس کا اختیار ہے کہ کسی واحد شخص کے ساتھ اس کو بندوبست کر دے۔ "جواز" کے ثبوت میں ابوداؤد کی یہ حدیث پیش کی جاتی ہے۔

ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم اقطع لبلال بن حارث معادن القبلیۃ جلسیها وغوریها۔	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بلال بن حارث کو قبیلہ کے معادن خواہ پست علاقوں میں ہوں یا بلند قطعات میں بطور جاگیر کے عطا فرمایا۔

اور اس سے ثابت ہوا کہ صرف جامد معادن ہی نہیں بلکہ سیال معادن مثلاً پارہ، پٹرول، تارکول وغیرہ ایسے معادن جن کے کھودنے اور نکالنے میں مصارف اور محنت پڑتی ہو وہ انفرادی ملکیت بن سکتے ہیں اور حکومت ان کو بندوبست کر سکتی ہے۔ لیکن حکومت کو ان معدنی پیداواروں پر کسی قسم کے محصول عائد کرنے کا بھی حق ہے؟ یا بغیر کسی ڈیوٹی کے ملک کے باشندے ان سے مستفید ہو سکتے ہیں۔ اس سوال کا تفصیلی جواب تو آئندہ حکومت کی آمدنی کی ذیل میں دیا جائے گا لیکن اسلامی معاشیات کی وسعت نظری کا سرسری اندازہ کرنے کے لئے غالباً اس مسئلہ کا ذکر بیجا نہ ہوگا جو فقہ کی عام کتابوں میں پایا جاتا ہے، ابن ہمام فتح القدیر میں لکھتے ہیں۔

اعلم ان ما يستخرج من المعدن ثلاثة انواع جامد يذوب وينطبع كالنقدين والحديد وجامد لا ينطبع كالجص والنورة والكحل والزرنيخ وسائر الاحجار كالياقوت والملح وما ليس بجامد كالماء والقير والنفط۔
(فتح القدیر ج ۱)

کانوں سے جو چیز نکلتی ہے وہ تین قسم کی ہوتی ہے ایسی جامد چیزیں جو پگھل سکتی ہوں اور چھاپ قبول کر سکتی ہوں مثلاً سونے، چاندی لوہے وغیرہ کا جو حال ہے، دوسری قسم وہ ہے جو جامد اور غیر سیال تو ہو، لیکن چھاپ قبول نہ کر سکتی ہو مثلاً گچ، چونا، سرمہ، ہڑتال، بلکہ ان تمام چیزوں کا حال ہے جن کا شمار پتھروں کے ذیل میں کیا جاتا ہے۔ مثلاً یاقوت، نمک، تیسری قسم ہے وہ ہے جو جامد نہ ہو بلکہ سیال ہو، مثلاً پانی، تارکول، مٹی کا تیل۔

ان تین قسموں کو بیان کرنے کے بعد آئندہ جو چیز انھوں نے لکھی ہے دنیا کی حکومتوں کی شاید اس سے آنکھیں کھل جائیں اور موجودہ حکومتوں کی رعایا میں کسی حکومت کے اس نقطۂ نظر کو سن کر معلوم نہیں کس قسم کے جذبات متلاطم ہونے لگیں۔ ابن ہمام نہایت سادگی کے ساتھ لکھتے ہیں کہ امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک

لا يجب الخمس الا في الاول۔

خمس (پیداوار کا پانچواں حصہ) صرف پہلی قسم سے حکومت وصول کر سکتی ہے۔

جس کا مطلب یہی ہوا کہ قسم اول کے سوا اور تمام معدنی پیداوار ہر قسم کے محصول سے آزاد ہیں اور یہ تو امام ابو حنیفہؒ کا خیال ہے۔ امام شافعیؒ نے تو اس سے بھی آگے قدم بڑھایا ہے۔

وعند الشافعي لا يجب الا في النقدين۔

بجز سونے چاندی کے اور کسی پر خمس واجب نہیں ہے۔

اگرچہ اس مسئلہ کے متعلق بعض تفصیلات ہیں جن پر بحث کا یہاں موقع نہیں بالفعل اتنا اجمالی بیان کافی ہو سکتا ہے۔ حدیث "الناس شرکاء" میں جن جن چیزوں کو پبلک کا مشترک سرمایہ قرار دیا گیا ہے اب تک اس کے پہلے جزء "الماء" اور اس کے متعلقات کی گویا یہ تفصیل تھی۔ باقی دو جزء اور رہ گئے یعنی "الکلاء" اور "النار" اب ان کے متعلق مسائل کی تشریح کی جاتی ہے۔

الکلاء (گھاس) کے مسائل کی تفصیل

حدیث میں چونکہ "الکلاء" کا لفظ آیا ہے اس لئے اس کی تحقیق ہونی چاہیئے کہ "الکلاء" کے لغوی معنی کیا ہیں۔ صاحب مغرب نے اپنی کتاب، فقہی لغات میں اس لفظ کو لیا ہے اور اس پر ایک طویل بحث کی ہے، امام محمدؒ کا قول تو یہ نقل کیا ہے کہ

الكلاء ما ليس له ساق وما قام على ساق ليس بكلاء۔

الکلاء ایسی نباتی چیز کا نام ہے جو تنہ پر قائم نہ ہو اور جو تنہ پر قائم ہو وہ کلاء نہیں ہے۔

ساق اور تنہ پر جو نباتات کھڑے ہوتے ہیں ان کی مثال میں "عوسج" اور "غرقد" وغیرہ جنگلی درختوں کو شریک کیا ہے۔ لیکن مطرزی صاحب مغرب نے خود اپنا فیصلہ یہ لکھا ہے۔

والظاهر انه يقع على ساق وغيره۔

بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ کلاء کا اطلاق تنے والے اور بے تنہ دونوں قسم کے نباتات پر ہوتا ہے۔

وجہ یہ بیان کی ہے کہ فقہاء "الکلاء" کی تعریف میں عموماً یہ کہتے ہیں کہ

لما ترعاه الدواب رطبا كان او يابسا۔

یعنی وہ جو پائے چرتے ہوں خواہ خشک حالت میں یا تر۔

مطلب یہ ہے کہ چونکہ جانور عموماً بے تنہ والی گھاسوں کو ہی چرتے ہیں اور بعض تنہ رکھنے والے جنگلی جھاڑ مثلاً ببول، عوسج، غرقد وغیرہ کی پتیاں بھی چرتے ہیں اس سے "الکلاء" کو بجائے گھاس کے ہر اس نبات کے لئے عام رکھنا چاہیے جسے جانور چرتے ہیں۔ اس سلسلہ میں انہوں نے ابوعبید کی کتاب الاموال سے بھی اپنی تائید میں بعض چیزیں نقل کی ہیں۔ خلاصہ اس کا یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے۔ چاہیئے کہ اپنے بھائی کو پانی اور شجر (درخت) میں گنجائش دے اور اس درخت سے مراد وہی چرے جانے والے درخت ہی ہوسکتے ہیں۔ البتہ "الکلاء" کے بجائے یہاں الشجر کا لفظ استعمال کیا گیا ہے تاکہ معلوم ہو کہ حکم گھاس اور ان درختوں کو بھی عام ہے جنہیں چوپائے اور مویشی چرتے ہیں۔ نیز ایک مشہور حدیث حمی (رکھت) کے باب میں ہے کہ امیہ بن حمال نے اراک (پیلو) کے متعلق دریافت کیا کہ اس کو حمی (رکھت) یعنی اپنے اونٹوں کے لئے اس کے جنگل کو کوئی مخصوص کرسکتا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ

مالم تنله اخفاف الابل

ہاں اگر اونٹوں کے قدم اگر وہاں نہ پہنچتے ہوں تو جائز ہے۔

ابوعبید نے اس کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ حکم پیلو کے ان درختوں سے متعلق ہوسکتا ہے جو کسی کی مملوکہ اراضی میں ہوں یعنی مملوکہ زمین کے پیلو کو بھی محض اپنے مویشیوں کے لئے کوئی مخصوص نہیں کرسکتا کیونکہ غیر مملوکہ زمین کے پیلو کو حمی (رکھت) بنانے کا تو کسی کو کیا اختیار رہے خواہ وہ دور کے ہوں یا قریب کے ہوں اونٹوں کی دسترس سے باہر ہوں یا نہ ہوں۔ پس مطلب یہی ہوسکتا ہے کہ مملوکہ زمین کے پیلو کو بھی رفاہیت عامہ کے خیال سے حمی نہ بنانا چاہیئے لہذا اس سے یہ ثابت ہوا کہ "الکلاء" کا لفظ تنہ دار اور غیر تنہ دار ہر قسم کی چری جانے والی روئیدگیوں کو عام ہے اور یہی واقعہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مقصود مویشیوں کی چرائی میں سہولت پیدا کرنی ہے۔ شریعت کا مقصد یہ ہے کہ اس قسم کی چیزوں کو حتی الوسع پبلک کا عام مشترک سرمایہ قرار دیا جائے۔ قاضی ابویوسف نے کتاب الخراج میں چراگاہوں کی چند مثالیں بیان کی ہیں۔

(۱) پہلی شکل تو یہ ہے کہ کسی گاؤں یا آبادی کی کوئی چراگاہ اور جنگلی جھاڑ اور گاؤں کا کوئی خاص باشندہ اس زمین کا مالک نہیں ہے بلکہ

قد عرف انہا لھم فھی لھم علیٰ حالھا۔	عموماً یہ مشہور و معروف ہو کہ فلاں چراگاہ (یا جنگلی جھاڑیاں) فلاں گاؤں والوں

کی ہیں پس وہ انہی لوگوں کی اپنے حال پر رہیں گی۔

اور گاؤں والوں کی اس زمین میں اجمالی ملک ثابت ہوگی اب دیکھا جائے گا کہ اس گاؤں کے باشندوں کی مویشیوں وغیرہ کے لئے کوئی دوسری چراگاہ یا کچھ، رمنہ وغیرہ ہے یا نہیں۔ اگر ہے تو ایسی صورت میں۔

لیس لھم ان یمنعوا الکلاء والماء ولا صحاب المواشی ان یرعوا تلک المروج ویستسقوا من تلک المیاہ۔	گاؤں والوں کو اس کا حق نہ ہوگا کہ عام مویشی والوں کو اس قسم کی چراگاہوں اور رمنوں میں چرائی سے روکیں اسی طرح مویشی والوں کو اس کا بھی حق ہے کہ

یہاں جو پانی ہو اس سے استفادہ کریں (خود پئیں جانوروں کو پلائیں)

لیکن اگر یہ شکل نہیں ہے بلکہ

لم یکن لاھل ھذہ القریۃ الذین لھم ھذہ المروج وفی ملکھم موضع مسرح ومرعی لدوابھم ومواشیھم غیر ھذہ المروج۔	اس گاؤں والوں کے لئے جن کی یہ چراگاہیں ہیں ان کے لئے بجز ان کے چرائی کی کوئی دوسری جگہ نہ ہو اور نہ کوئی دوسری چراگاہ ہو جس میں ان کے جانور اور مویشی چر سکتے ہوں۔

اور اس کے ساتھ صورت حال یہ ہو کہ

متی اذنوا للناس فی رعی تلک المروج والاحتطاب منہا اضر ذلک بھم ولمواشیھم ودوابھم۔	اگر عام لوگوں کو ان زمینوں اور چراگاہوں میں چرانے اور ہر شخص کو لکڑی کاٹنے کی اجازت دیدیں گے تو یہ بات ان کے لئے اور ان کے مویشیوں وچوپاؤں کیلئے نقصان رساں ہو

قاضی ابو یوسف کا ایسی حالت میں یہ فتویٰ ہے کہ

کان لھم ان یمنعوا کل من اراد ان یرعی فیہا او یحتطب منہا۔	اس قسم کے گاؤں کے باشندوں کو اس کا حق ہے کہ عوام کو اپنی چراگاہوں میں چرانے سے روکیں اور اس سے منع کریں

کہ کوئی اس کی جھاڑیوں سے لکڑی کاٹے۔

بہر حال حدیث نے ''الکلاء'' کو جب بہ ملک کا مشترک سرمایہ قرار دیا ہے تو ایسی صورت میں انفرادی ملکیت تو

اس پر طاری نہیں ہوسکتی لیکن "اشتراک" میں کچھ حد بندی اس وقت ہوسکتی ہے جب دوسرے گاؤں والوں کی شرکت سے خود اس گاؤں والوں کا نقصان ہو جن کی طرف یہ چراگاہ منسوب ہے اور یہ حال تو ان چراگاہوں کا ہے جن کی زمین کسی شخص کی واحد ملکیت میں نہیں ہے بلکہ یا تو ان کا کوئی مالک ہی نہیں ہے یا سارے گاؤں کی وہ ملکیت مشترکہ ہے۔ لیکن اگر کسی شخصی اور انفرادی ملکیت والی زمین میں الکلاء ہو تو باوجود زمین کے مالک ہونے کے "الکلاء" کا وہ قانوناً مالک نہیں ہے۔ بدائع میں ہے

اما الکلاء الذی ینبت فی ارض مملوکة فھو مباح غیر مملوکة۔

الکلاء (گھاس) جو کسی مملوکہ زمین میں ہو اس سے استفادہ کا حق ہر شخص کو حاصل ہے) یعنی مباح وجائز ہے اور اس الکلاء کا کوئی مالک نہیں ہے۔

اور اس کا بھی وہی حکم ہے جو پانی کا ہے کہ اگر اس الکلاء کے سوا لوگوں کو اپنے مویشیوں کے لئے چرائی نہ میسر آسکتی ہو تو پبلک کا حق ہے کہ اس کو مجبور کریں کہ ان کے مویشیوں کو اپنی زمین میں آنے دے یا گھاس کٹوا کر لوگوں کے حوالہ کرے اور دونوں شکلوں پر راضی نہ ہو تو بزور اپنے حق کو اس سے لوگ حاصل کریں۔

یہ حکم تو الکلاء کا اس وقت تک ہے جب تک زمین میں لگا ہوا ہے۔ لیکن زمین سے الگ کر لینے کے بعد جو اس پر قبضہ کرے گا وہ اس کا مالک ہو جاتا ہے۔ ٹھیک جو حال پانی کا تھا کہ برتن میں محفوظ کر لینے کے بعد انفرادی ملکیت اس میں پیدا ہو جاتی ہے۔ بدائع میں ہے۔

اذا قطعه صاحب الارض واخرج فی ملکه۔

جب اس کا مالک الکلاء کو کٹوالے اور نکال لے تو پھر اس کا وہ مالک ہو جاتا ہے

"صاحب الارض" (مالک زمین) کی قید اتفاقی ہے بلکہ جو بھی کاٹ کر اس پر قبضہ کرلے گا مالک ہو جائے گا۔ اور اب اس کو وہ اسی طرح بیچ سکتا ہے جیسے برتن اور مشک کے پانی کو فروخت کیا جا سکتا ہے۔ فقہ کا عام مسئلہ تو یہی ہے لیکن حنفی فقہاء نے بعد کو اس میں کچھ تفصیل بھی کی ہے یعنی دیکھنا چاہئے کہ "الکلاء" قدرتی طور پر پیدا ہوا ہے یا مالکِ زمین نے مصنوعی تدبیروں سے ان کو اگایا ہے دوسری صورت میں ان کا خیال ہے کہ

اذا سقاه وقام علیه ملکه
(بدائع)

اگر زمیندار (صاحب الارض) نے اس الکلاء کو سینچا ہے تو ایسی صورت میں اس کی ملکیت قائم ہو جائے گی۔

حدیث کے ظاہر معنی پر اصرار کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

الصحیح جواب ظاھر الروایة لان الاصل فیه ھو الاباحة۔

ظاہر روایت میں اس مسئلہ کا جو جواب دیا گیا ہے وہی درست ہے۔ کیونکہ "اصل" تو یہی ہے کہ "الکلاء" سے استفادہ کا عام حق دیا گیا ہے۔

اس سلسلہ میں فقہاء ایک اور مسئلہ کا ذکر کرتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ عربی میں ایک لفظ "مرج" کا ہے جس کی جمع "مروج" ہے۔ یہ اردو کے "رمنہ" یا "کنج" کے ہم معنی ہے، غالباً فارسی کا "مرغزار" "مرجزار" ہی کی کوئی صورت ہے لیکن ایک اور لفظ "اجمۃ" کا ہے جس کی جمع آجام ہے۔ علامہ مطرزی مغرب میں اس کی تفسیر یہ کرتے ہیں الاجمة الشجر الملتف یعنی (گھنے درختوں) کو کہتے ہیں۔ لیکن یہ لغوی معنی ہوئے۔ پھر فقہاء جس محاورہ میں اس کو استعمال کرتے ہیں اس کے متعلق کہتے ہیں۔

وقولهم بيع السمك في الآجام	مچھلیوں کا آجام میں بیچنا، جو فقہاء
يريدون البطيحة التي	لکھتے ہیں تو آجام سے سنگریزہ والی زمین مراد لیتے
منبت القصب والبراع	جو نرسل یا سرکنڈے کے اگنے کی جگہ ہے۔

بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ سنگریزوں والی ریتلی زمینوں کے گہرے حصوں میں برساتی پانی جو جمع ہو جاتا تھا اور اس کے اردگرد یا خود اس میں "نیستان" بن جاتا تھا اس کو آجام کہتے ہیں۔ چونکہ پانی بھی اس میں جمع ہو جاتا تھا اس لئے اس میں مچھلیاں بھی پیدا ہو جاتی تھیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ آجام دراصل آبی نیستان کو کہتے ہیں۔ فقہاء نے یہ سوال اٹھایا ہے کیا ان کا شمار بھی "مروج" اور جنگلوں کے ذیل ہوگا اور انفرادی ملکیت اس کی درست ہو سکتی ہے یا نہیں۔ قاضی ابو یوسف نے کتاب الخراج میں اس کا کلیہ یہ لکھا ہے کہ اس زمین کو دیکھنا چاہیئے جس میں اجمہ ہے۔ اگر زمین کسی کی انفرادی ملکیت میں نہیں ہے تو نیستان (اجمہ) ہی کیا تمام غیر مملوکہ زمینوں کا حکم یہ ہے کہ

فان لم تكن في ملك	اگر اس زمین میں کسی کی شخصی ملکیت نہیں ہے،
لاحد ملك فلا باس	تو پھر اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔ ہر قسم کے
ان يحتطب منه جميع	لوگ اس سے لکڑی کاٹ کاٹ کر لے جا سکتے ہیں
الناس كالثمار في الجبال	[illegible] اور وادیوں
والمروج والاودية	اور [illegible] درختوں [illegible]
والشجر ما لم يغرسه	پھلوں کا [illegible] ہر شخص
الناس ولا باس بان	ان کو کھا سکتا ہے، ہر شخص کو ان سے استفادہ کا
ياكل من ثمارها ويتزود	حق ہے اور اس میں بھی کوئی حرج نہیں ہے
ما لم يعلم ان ذلك في ملك	[illegible] درختوں کے پھلوں کو آدمی
انسان وكذلك اكل العسل	[illegible] استفادہ
يوجد في الجبال والغياض	[illegible] درخت
والخراب	کے متعلق معلوم نہ ہو کہ کسی خاص شخص کی

ملکیت [illegible] جو شہد پایا جاتا ہے اس کا بھی یہی حال ہے۔

لیکن [illegible]

اجازت کے بغیر جائز نہ ہوگا۔ خواہ زمین کے مالک نے اسے بویا ہو یا خودرو ہو۔ بدائع میں ہے۔

ليس لاحد ان يحتطب من اجمة رجل الا باذنه لان الحطب والقصب مملوكان لصاحب الاجمة ينبتان على ملكه وان لم يوجد منه الانبات اصلا۔

ایسا اجم (نیستان) جو کسی خاص شخص کی ملک میں ہو اس کے متعلق کسی کو اس کا حق نہیں ہے کہ مالک کی اجازت کے بغیر اس کی لکڑی کاٹے، کیونکہ لکڑی اور نے کے ڈنٹھل یہ دونوں اجم کے مالک کی ملک ہے وہ زمین سے پیدا ہی ہوتی ہیں مالک زمین کی ملک میں اگرچہ ان کے اگانے میں مالک زمین نے کوئی کام نہ کیا ہو یعنی خودرو ہوں، جب بھی اسی کی ملک قرار پائیں گے

بہر حال اس باب میں کلیہ وہی ہے جو صاحب بدائع نے لکھا ہے کہ

الاصل ان يكون من المملوك مملوكا الا ان الاباحة فى بعض الاشياء ثبت على مخالفة الاصل بالشرع والشرع ورد بها فى اشياء مخصوصة فيقتصر بها۔

اصل یہ ہے کہ مملوکہ چیز سے جو چیز پیدا ہوگی وہ بھی مملوک ہی ہوگی۔ لیکن اس اصل کے خلاف بعض چیزوں میں شریعت نے "اباحت" کا قانون نافذ کیا ہے۔ یعنی استفادہ کا حق ہر شخص کو دیدیا ہے لیکن اباحت کا یہ قانون چند مخصوص چیزوں کے ساتھ محدود ہے۔ اس لئے حکم بھی ان ہی تک محدود رہے گا۔

تیسرے اشتراکی سرمایہ آگ کے احکام

اب تیسرا جزء "النار" کا رہ گیا ہے۔ جسے حدیث میں عام پبلک کی مشترک چیز قرار دیا گیا ہے۔ فقہاء نے اس کی بھی کچھ تفصیل کی ہے۔ صاحب بدائع لکھتے ہیں

النار اسم للجوهر المضى دائم محركة علوا۔

آگ ایک تابناک روشن جوہر کا نام ہے جو ہمیشہ اوپر کی طرف متحرک رہتی ہے۔

اور اسی بناء پر فقہاء کا یہ فتویٰ نقل کیا ہے کہ

فليس لمن اوقدها ان يمنع غيره من الاصطلاء بها لان النبى صلى الله عليه وسلم اثبت الشركة فيها۔

پس جس نے آگ سلگائی ہو، اس کو اس کا حق نہیں ہے کہ دوسروں کو تاپنے سے روکے اس لئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آگ میں شرکت ثابت فرمائی ہے

اور اصطلاء یعنی تاپنے کا ذکر تو بطور مثال کے کیا گیا ہے، ورنہ مقصد یہ ہے کہ حرارت ہو یا روشنی یا اسی قسم کا کوئی کام استفادہ کی ان تمام صورتوں کا حق ہر شخص کو ہے اور آگ یا لیمپ روشن کرنے والے کو

اس کا حق نہیں ہے کہ وہ استفادہ کے اس حق پر کوئی معاوضہ لے۔ مگر اس کے بعد سوال آگ سے نہیں بلکہ اس لکڑی یا بتی یا اس چیز سے ہے جس میں آگ پیدا کی جاتی ہے کہ کیا اس کا شمار بھی مشترک سرمایہ میں ہو جائے گا۔ صاحب بدائع لکھتے ہیں۔

فاما الجمر فلیس بنار	لیکن انگارہ تو وہ آگ نہیں ہے بس جس کا
وھو مملوک لصاحبہ	وہ ہے وہ اس کا مالک ہے۔ اسی لئے دوسرے
فلہ حق المنع کسائر	کو روکنے کا حق اسے حاصل ہے جیسے دوسر
املاکہ۔	مملوکات میں یہی حق اس کو دیا گیا ہے۔

اگرچہ جزئیات کا اور طویل سلسلہ موجود ہے لیکن اس باب میں اسلام کے جو کلی نقاط نظر تھے ایک حد تک ان کی بحث ختم ہو گئی۔ اب اس سلسلہ کی صرف ایک چیز رہ جاتی ہے یعنی شوارع عام۔

عام شوارع اور راستوں کے احکام

جن کی حیثیت اسلام ہی میں نہیں بلکہ تقریباً دنیا کے تمام قوانین اور دستور میں آبادی کے عام باشندوں کے مشترک مفاد کی ہے اسلامی مقننین نے بھی اس کی اس حیثیت کو باقی رکھا ہے۔ بغیر کسی اختلاف کے فقہ کا یہ اتفاقی مسئلہ ہے کہ

ما کان من الشوارع	راستے، کوچے، شہر کے میدان جو کہ
والطرقات والرحاب	جو آبادیوں کے درمیان ہوتے ہیں
بین العمران فلیس لاحد	ان کے متعلق کسی کے لئے جائز نہیں ہے
احیاءہ۔	کہ ان کو آباد کرے۔

یعنی کسی شخص کے لئے یہ جائز نہیں ہے کہ بطور انفرادی ملکیت کے ان پر قبضہ کر کے ان کو اپنی ملکیت بنائے مثلاً ان پر مکان بنائے یا اس قسم کا کوئی تملیکی تصرف کرے۔ مندرجہ بالا عبارت کے الفاظ سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ حکم صرف سڑکوں اور کوچوں ہی تک محدود نہیں ہے بلکہ "الرحاب" یعنی شہروں کے بیچ بیچ میں جو میدان مختلف ضرورتوں کے لئے مثلاً کھیلنے کودنے کے لئے یا اس زمانے میں جو سیرگاہیں بنا دی جاتی ہیں یہ بھی پبلک کے مشترکہ مفاد میں داخل ہو جاتی ہیں اور ان پر بھی کسی شخص واحد کو مالکانہ تصرفات کا حق نہیں ہے۔ اس قانون کی تفصیل کرتے ہوئے فقہاء نے اس کی بھی تصریح کر دی ہے کہ یہ حکم صرف ان ہی سڑکوں یا گلیوں یا میدانوں تک محدود نہیں ہے جن پر تصرف کرنے سے عام مخلوق کو تکلیف ہوتی ہو بلکہ تکلیف ہو یا نہ ہو زمین کا ہر وہ حصہ جو عام گزرگاہ کی حیثیت کسی آبادی میں اختیار کر چکی ہے سب کے لئے یہ حکم عام ہے۔ ابن قدامہ کے الفاظ یہ ہیں۔

سواء کان واسعا او ضیقا	خواہ کشادہ ہوں یا تنگ اور خواہ ان میں
وسواء ضیق علی الناس	تصرف کرنے سے لوگوں پر تنگی پیدا ہوتی
اولم یضیق۔	ہو یا نہ ہوتی ہو۔

مسلمانوں میں شاہراہوں اور شہر کے ان مقامات میں عام باشندوں کے مفاد کو کس حد تک اہمیت حاصل تھی

اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس حکم کی توجیہ کرتے ہوئے صاحب مغنی لکھتے ہیں۔

لان ذلک مشترک فیہ	کیونکہ عام مسلمانوں میں یہ چیزیں مشترک
المسلمون ومتعلق بہ مصلحتھم	ہیں اور ان کی مصلحتیں ان سے متعلق ہیں، تو
فاشبہ مساجدھم	گویا مسلمانوں کی مسجدوں کی مانند ان کا حال ہے

عام راستوں کا اسلام میں احترام

مندرجہ بالا فقرہ میں فاشبہ مساجدھم کے الفاظ قابل غور ہیں، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ شہری حقوق کا مسلمانوں نے کتنا احترام کیا ہے اور یہی بات تو یہ ہے کہ جب خود سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے اماطۃ الاذی عن الطریق یعنی راستوں سے ان چیزوں کا ہٹانا جو راہ گیروں کے لئے باعث تکلیف ہوں۔ اس فعل کو من الایمان (یعنی ایمان کا جزء) قرار دیا ہے۔ اور اس بنا پر مشہور حدیث الطہور شطر الایمان (پاکیزگی اور صفائی ستھرائی ایمان کا ایک بڑا حصہ ہے) میں دوسری چیزوں کی تطہیر و ستھرائی کے ساتھ مکانوں اور سڑکوں کی صفائی کو بھی داخل سمجھنا چاہیئے۔ جب راستوں کی صفائی کی صحیح حدیثوں میں اتنی اہمیت ہے تو فقہاء نے شوارع و طرق کو مسلمانوں کے حقوق کے اعتبار سے اگر اشبہ بالمساجد قرار دیا ہے تو اس پر قطعاً تعجب نہ ہونا چاہیئے اور اس خیال کی بھی تغلیط ہوتی ہے کہ بلدیات اور میونسپلٹی وغیرہ کے اصول و قوانین جدید مغربی تمدن کے نتائج ہیں [1]۔ خیر یہ تو ایک ضمنی بات تھی میں گفتگو ان فقہی احکام کے متعلق کر رہا تھا جو شہروں اور آبادیوں کی عام گزرگاہوں وغیرہ کے متعلق ہیں کہ ان میں کسی قسم کی انفرادی ملکیت کی قطعاً گنجائش نہیں ہے۔ نہ خود ان کو اپنی ملک کوئی بنا سکتا ہے، اور نہ حکومت ایسا کر سکتی ہے۔ البتہ اس قسم کی سڑکوں اور گزرگاہوں پر بیٹھ کر عام طور سے جو لوگ خرید و فروخت کرتے ہیں، فقہاء نے اس کے متعلق لکھا ہے۔

ان کان مجالس یضیق علی	اگر گزرگاہوں کی ان نشست گاہوں کی
المارۃ لم یحل لہ الجلوس	وجہ سے آمد و رفت کرنیوالوں کو تنگی محسوس ہو
فیہ ولا یحل الامام تملکہ	تو پھر ان میں بیٹھ کر خرید و فروخت جائز نہ ہوگی
بعوض ولا غیرہ۔	اور نہ حکومت کے لئے جائز ہے کہ ایسے
(المغنی)	مقامات پر کسی کو قبضہ معاوضہ لے کر دے۔

لیکن سڑک اگر اتنی کشادہ ہے کہ راہ گیروں کو کوئی تنگی نہیں پیدا ہوتی تو ایسی صورت میں۔

یجوز الارتفاق بالقعود	ان گزرگاہوں میں جو کشادہ اور وسیع
فی الواسع من ذلک البیع	مقامات ہوں تو ان پر بیٹھ کر خرید و فروخت کی

---

[1] واقعہ یہ ہے کہ آج جن قوانین کا تعلق محکمہ صفائی یا آرائش وغیرہ سے ہے، اسلامی فقہاء نے ان کے مختلف پہلوؤں پر اپنی کتابوں میں بحث کی ہے، جاننا چاہیئے کہ فقہ کی کتابوں سے ان قوانین کا ایک اچھا خاصہ مجموعہ تیار کیا جا سکتا ہے ۱۲

والشراء على وجه لا يضيق
على احد ولا يضر المارة۔

آسانی حاصل کرنا اس وقت جائز ہے
جب آنے جانے والوں کی راہ میں
تنگی نہ پیدا ہوتی ہو، نہ کسی اور کو۔

اس قسم کا استفادہ سڑکوں سے شہر کے عام باشندے خود بھی کر سکتے ہیں اور حکومت کو بھی ایسی صورت میں (یعنی جن میں ضرر کا اندیشہ نہ ہو) اختیار ہے کہ سڑکوں بلکہ مسجدوں کے احاطہ وغیرہ میں جسے رحاب المساجد کہتے ہیں۔ اس قسم کے کاروبار کے لئے جگہ دے سکتی ہے۔

ابن قدامہ نے الطرق الواسعہ اور رحاب المساجد کا ذکر کر کے لکھا ہے کہ

للامام اقطاعها لمن
يجلس فيها۔

امام (حکومت) ان مقامات کو بیٹھنے والوں
کے لئے مخصوص کر سکتی ہے۔

لیکن اسی کے ساتھ اس کی بھی تصریح کر دی گئی ہے۔

ولا يملكها المقطع بذلك بل
يكون احق بالجلوس فيها
من غيره۔

لیکن حکومت جس کے نام سے اس کو مخصوص
کرے وہ اس کا مالک نہ ہوگا صرف دوسروں
کے اعتبار سے بیٹھنے کا وہ زیادہ حقدار ہوگا۔

اسی طرح اگر اس قسم کے مقامات پر حکومت کی اجازت کے بغیر کوئی خرید و فروخت کے لئے بیٹھ جائے تو

السابق احق به ما دام
فيه فان ترك متاعه
فيه لم يجز لغيره
ازالته لان يد الاول
عليه وان نقل متاعه
كان لغيره ان يقعد
فيه لان يده قد
زالت۔

جس نے آگے بڑھ کر اس پر قبضہ کر لیا ہو
تو وہی اس کا حقدار ہوگا۔ جب تک اس پر
قابض رہے گا، اگر اس قسم کے مقامات
میں اپنے سامان کو چھوڑ کر چلا جائے تو
کسی دوسرے کو اس کا حق نہ ہوگا کہ
اس کے سامان کو اس جگہ سے ہٹا لے
کیونکہ ابھی پہلے آدمی کا اس پر قبضہ باقی
ہے۔ اور اگر اپنے سامان کو وہاں سے
ہٹا لے تو پھر دوسرے کو حق ہے کہ اس مقام پر بیٹھ جائے کیونکہ پہلے آدمی کا قبضہ اس سے اٹھ گیا۔

بہرحال مشہور حدیث منی مناخ من سبق[1] کی بنا پر ایسی صورت میں جس نے پہلے قبضہ کر لیا اس کو ترجیح دی جائے گی۔ اس ضمن میں یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ اس قسم کے مقامات میں کوئی دوکان کے لئے کیا۔ مکان یا چبوترہ وغیرہ بنا سکتا ہے؟

ابن قدامہ لکھتے ہیں کہ

---

[1] منیٰ کے میدان میں جو جہاں اپنے اونٹ کو پہلے بٹھا دے گا وہی اس جگہ کا حقدار ہوگا ۱۲

ليس له البناء لا دكة	کسی کو ان مقامات میں کسی قسم کی تعمیر کا
ولا غيرها لانه يضيق	حق نہیں ہے حتیٰ کہ چبوترہ یا چبوترہ کے
على الناس ويعثر به	سوا بھی کوئی چیز نہیں بنا سکتا کیونکہ اس
المارة بالليل والضرر	قسم کی چیزوں سے عام لوگ تنگی میں مبتلا
بالليل والنهار ويبقى	ہو جائیں گے اور گزرنے والوں کے لئے
على الدوام فربما	خطرہ ہے کہ رات کے وقت اس سے ٹھوکر
ادعى ملكه بسبب ذلك	کھائیں او پھسل کر گریں۔ اسی طرح

شب و روز ضرر کا اس سے اندیشہ ہے اور چونکہ ایسی چیزیں دوامی ہوتی ہیں اسی لئے اس کا بھی خطرہ ہے کہ آگے چل کر اس کی ملکیت کا دعویٰ کر بیٹھے۔

لیکن اس کے ساتھ اس کی بھی اجازت دی گئی ہے کہ

له ان يظل على نفسه	ان مقامات پر بیٹھ کر خرید و فروخت
بما لا ضرر فيه من	کرنے والوں کو اس کی اجازت ہے کہ
بارية وتابوت وكساء	اپنے اوپر کوئی سایہ کی چیز کھڑی کریں
ونحوه لان الحاجة	جس میں کسی کو ضرر نہ پہنچے۔ مثلاً چٹائی یا
تدعوا اليه من غير	ٹاٹ یا کمل یا اسی قسم کی چیزوں سے سایہ
مضرة فيه۔	کریں، اور یہ اجازت اس لئے دی جاتی

ہے کہ اس کا وہ حاجتمند ہے اور دوسروں کا اس میں ضرر نہیں ہے۔

یہاں یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ جتنے احکام بیان کئے گئے ہیں۔ ان کا زیادہ تر تعلق شوارع عام یا عام گزرگاہوں وغیرہ سے ہے لیکن خاص راستے اور کوچے جنھیں صرف کسی خاص مکان یا چند مکان کے رہنے والے ہی اپنی آمد و رفت کے لئے استعمال کرتے ہوں۔ ان کے احکام عام راستوں سے مختلف ہیں جن کی تفصیل فقہ کی کتابوں میں موجود ہے۔

ایسی غیر مملوکہ چیزیں جن میں قبضہ کے بعد بھی انفرادی ملکیت پیدا نہیں ہوتی ان کی ممکنہ حد تک تفصیل کو اس نقطہ پر ختم کر کے اب ان غیر مملوکہ امور کے بھی کچھ احکام سننے چاہئیں جن میں قبضہ کے بعد انفرادی ملکیت پیدا ہو جاتی ہے۔

بنجر غیر آباد زمینوں کی ملکیت کے قوانین

اسلامی قانون میں ممالک محروسہ کی ایسی غیر آباد زمین اور علاقے جن کا کوئی مالک نہ ہو خواہ وہ کبھی آباد نہ ہوئی ہوں یا آباد ہونے کے بعد اس طرح ویران ہو گئی ہوں کہ ان کا کوئی مالک باقی نہ رہا ہو، ان کا اسلامی نام اموات، یا مردہ بنجر زمین ہے۔ بظاہر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اس قسم کی زمینوں کی مالک حکومت ہے اور اس لئے حکومت کی اجازت کے بغیر عام طور سے دنیا میں یہی دستور مروج ہے کہ حکومت یا بادشاہ وقت کی اجازت کے بغیر ایسی زمینوں

پہاڑوں، جنگلات وغیرہ پر کوئی تصرف نہیں کر سکتا اور نہ کوئی ان کو اپنی ملک بنا سکتا ہے۔ لیکن اسلام کا نقطۂ نظر اس باب میں بالکل مختلف ہے وہ اس قسم کی تمام زمینوں کو بھی ملک کے عام باشندوں کا مشترک سرمایہ قرار دیتا ہے اور بجز ان چند مستثنیٰ زمینوں اور معادن کے جن کا ذکر گزشتہ فصل میں بتفصیل ہو چکا ہے۔ رعیت کے ہر فرد کا یہ قانونی حق ہے کہ ان کو بغیر کسی معاوضہ (رائلٹی) ادا کئے قبضہ کر کے اپنی ملک بنالے۔ اس باب میں مسلمانوں کے پاس رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ مشہور فرمان ایک ابدی وثیقہ کی حیثیت رکھتا ہے جس کے راوی تقریباً تمام محدثین ہیں، مثلاً امام مالک، امام ترمذی، ابوداؤد وغیرہ سب کی کتابوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان موجود ہے کہ

من احیا ارضا میتة فھی لہ۔	کسی مردہ وغیر آباد زمین کو جو آباد کرے یہ زمین اسی کی ہوگی۔

اسی بناء پر علامہ مقدسی نے مغنی میں تمام ائمہ اسلام کا یہ اجتماع نقل کیا ہے کہ

عامة فقھاء الامصار علی ان الموات یملک بالاحیاء۔ (۱۴۷ ج ۲)	فقہاء امصار کا عامہ اس پر اتفاق ہے کہ احیاء (آباد کرنے) کی وجہ سے وہ آباد کرنے والے کی ملک بن جاتی ہے۔

خواہ یہ "ارض موات" ایسی زمین ہو جو کبھی کسی کی مملوک نہ ہوئی ہو اور اس کے آباد ہونے کی نوبت نہ آئی ہو جیسا کہ وہی لکھتے ہیں ایسی زمین کہ

مالم یجر علیہ ملک احد ولم یوجد فیہ اثر عمارة فھذا یملک بالاحیاء بغیر خلاف بین القائلین بالاحیاء۔	کسی کی ملک اس میں قائم نہ ہوئی ہو، اور اس میں کسی آبادی کی علامت نہ پائی جاتی ہو، تو بالاتفاق آباد کرنے کی وجہ سے آدمی اس کا مالک ہو جاتا ہے اس میں کسی کا اختلاف نہیں ہے، جو آباد کرنے کو ملک کا سبب کہتے ہیں

اسی طرح ایسی اراضی

مایوجد فیہ آثار ملک قدیم جاھلی کآثار الروم ومساکن ثمود ونحوھم فھذا یملک بالاحیاء۔	جس میں کسی قدیم جاہلی ملک کی علامتیں پائی جاتی ہوں، مثلاً روم کے آثار اور قوم ثمود کے مسکن کا حال ہے جو ایسے مقامات ہوں تو آباد کرنے سے ان کا بھی آدمی مالک ہو جاتا ہے۔

چونکہ اس قسم کی زمین اسلامی عہد سے قبل ہی سہی لیکن بنی آدم کی مملوکہ چیزوں میں ہو چکی تھی! اس لئے شبہ ہو سکتا تھا کہ دوسرے کی مملوکہ چیز پر قبضہ کرنے یا اس کو ملک بنانے کا کسی دوسرے کو کیا حق ہے۔ اس شبہ کے ازالہ کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دوسرے فرمان میں اس کی بھی تصریح فرمادی ہے کہ

عادی الارض للّٰہ ورسولہ ثم ھو بعد لکم۔

عادی اراضی (یعنی اقوام قدیمہ کے لئے یا ان کے آباد کئے ہوئے بنجر علاقے، یہ اللہ اور اس کے رسول کی ملک ہیں، پھر اس کے بعد اے مسلمانوں یہ تمہاری ملکیت ہے۔

یعنی اس قسم کی زمین کو جب اس کے مالک چھوڑ کر لاپتہ ہو چکے ہوں اور اسلامی حکومت کے زیر نگرانی آگئیں تو اب وہ اپنے پرانے مالکوں کی ملک سے نکل کر اللہ ورسول کی ملک میں داخل ہو گئیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حق تعالیٰ کی طرف سے پھر ان کو عام مسلمانوں کے حوالہ فرما دیا۔ البتہ ارض موات کی ایک قسم اور رہ جاتی ہے جو اسلامی عہد میں کسی خاص شخص کی ملکیت تھی لیکن ان کا مالک ان کو غیر آباد کر کے لاپتہ ہو گیا، ایسی زمینوں کے متعلق اگرچہ بعض ائمہ اسلام کی رائے مختلف ہے مگر امام ابو حنیفہ امام مالک وغیرہ کا ان اراضی کے متعلق بھی یہی فتویٰ ہے کہ

انھا تملک بالاحیاء وھو مذھب ابی حنیفہ ومالک (مغنی)

آباد کرنے سے وہ بھی مملوکہ بن جاتی ہیں، یہی ابو حنیفہ اور امام مالک کا مذہب ہے۔

بہرحال اس قسم کی تمام "اراضی" جن کا فقہ کی اصطلاح میں "موات" نام ہے۔ دراصل یہ ملک کے باشندوں کی مشترکہ جائیداد ہے اور ملک کا ہر باشندہ اس کو اپنی انفرادی ملکیت بنا سکتا ہے جس کی اسلامی قانون کی رو سے دو صورتیں ہیں۔

اقطاع یا جاگیروں کا حکم ایک کو اقطاع کہتے ہیں، یعنی خود حکومت اس علاقہ کو کسی شخص کے ساتھ بندوبست کر دے اور یہ امام کے صوابدید پر ہے کہ جس کو چاہے جتنی زمین کا اقطاع کر دے۔ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق روایت ہے کہ جیسا کہ قاضی ابو یوسف نے کتاب الخراج میں نقل کیا ہے کہ

اقطع رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم لبلال بن الحارث المزنی ما بین البحر والصخر۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بلال بن حارث مزنی کو دریا سے پہاڑ تک جاگیریں دیدیا تھا (یہ اصطلاح یعنی ساحل سمندر سے کسی خاص سنگ کوہ تک کی درمیانی ارضی کی ہندوستان میں جیسے از گنگ تا سنگ کا لفظ بعض علاقوں میں بولتے ہیں)

ابو عبید نے اپنی مشہور کتاب "کتاب الاموال" میں اس قسم کے قطائع (جاگیرات) جو بارگاہ رسالت اور سریر خلافت سے مختلف لوگوں کو عطا ہوتے رہے ہیں، ذکر کیا ہے۔ میں نے خاص کر بلال بن حارث کی جاگیر کا ذکر قصداً اس لئے کیا تاکہ معلوم ہو کہ بڑے سے بڑا علاقہ بھی حکومت اپنے صوابدید سے جاگیر میں عطا کر سکتی ہے۔ لیکن حکومت کے صرف اقطاع سے اس علاقہ کا وہ شخص مالک نہیں ہو جاتا ہے، جب تک کہ "احیاء" کر کے اس پر قبضہ نہ کرے، علامہ مقدسی لکھتے ہیں۔

فان اقطعہ الامام شیئا من

اگر "موات" زمین کو امام (یعنی حکومت)

الموات لم یملک بذلک	کسی کی جاگیر میں دے تو شخص اس سے
لکن یصیر احق بہ۔	وہ اس زمین کا مالک نہیں ہو جاتا البتہ بنسبت
(مغنی)	دوسروں کے وہ اس کا زیادہ حقدار ہوگا۔

اپنے اس دعویٰ کی انھوں نے دلیل بھی یہ پیش کی کہ "عقیق" میں جو جاگیر اصفی بلال کے نام رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اقطاع کی تھی چونکہ احیاء پر قادر نہ ہو سکے۔ حضرت عمرؓ نے ان سے واپس لے لی۔ علامہ مقدسی لکھتے ہیں۔

لوملکه لم یجز استرجاعه	اگر صرف اقطاع سے بلال مالک ہو جاتے
	توحضرت عمرؓ کو اس کی واپسی جائز نہ ہو سکتی تھی۔

اسلامی جاگیروں کا مطلب یہاں جاگیر کا یہ مطلب نہیں ہے جیسا کہ ہندوستان میں سمجھا جاتا ہے کہ وہ لاخراج کہ دی جاتی ہے بلکہ "موات" کی اراضی کے عطا کرنے کے بعد اس پر "عشر" یا "خراج" بھی لیا جا سکتا ہے اور اس معاملہ میں مختلف زمینوں کا حکم مختلف ہے جس کی تفصیل فقہ کی کتابوں میں موجود ہے خراج کے باب میں صرف امام (بادشاہِ وقت) کو اتنا اختیار دیا گیا ہے کہ ملک و رعایا کے مصالح کی بناء پر مثلاً وقت پر فوجی امداد جاگیر دار سے حاصل کی جائے گی یا ازیں قبیل کوئی اور مصلحت ہو توجیسا کہ قاضی ابو یوسف نے لکھا ہے۔

یکون الامام قدرای الصلاح	اگر امام اسی میں مصلحت دیکھے کہ زمین کا
فی تفویض خراج ارض	خراج جاگیردار کو عطا کر دیا جائے تو امام
صاحب الارض فیجوز له	ایسا کر سکتا ہے اور جاگیردار کو بھی اجازت
یسعه ان یقبله۔	ہے کہ وہ اس عطیہ کو قبول کرے۔

لیکن امام کے سوا حکومت کے کسی عہدے دار کو خواہ اس کا درجہ کتنا ہی بلند کیوں نہ ہو خراج کی معافی بلکہ تخفیف تک کا اختیار نہیں ہے۔

بہرحال یہ ایک ذیلی بات تھی۔ جاگیروں کے متعلق بعض غلط فہمیوں کا ازالہ مقصود تھا ورنہ اس کے تفصیلی مسائل تو بہت سے ہیں جن کے ذکر کا یہاں موقع نہیں۔ اصل بات یہ کہی جا رہی تھی کہ "اراضی موات" میں انفرادی ملکیت ایک تو اس احیاء (آباد کرنے) سے حاصل ہوتی ہے جو اقطاع کے ذریعہ سے کسی کو ملی ہو اور عام طور سے غیر آباد زمینوں کے بندوبست کرنے کا دنیا میں یہی طریقہ مروّج ہے۔ اگرچہ مختلف حکومتوں کا طرزِ عمل بندوبست کے شرائط اور نتائج میں مختلف ہے۔ لیکن اراضی موات کے مالک ہونے کا دوسرا طریقہ جو اسلام میں ہے دوسری حکومتوں کی رعایا کے لئے شاید وہ عجیب ہو۔

ملک کی غیر آباد زمینوں کے مالک ہونے کا دوسرا طریقہ میرا مطلب یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مذکورہ بالا فرمان یعنی،

من احیا ارض موات فھی لہ — موات اراضی کو جو آباد کرے گا، یہی کی وہ ہو جاتی ہے۔

کی بنا پر فقہاء امت کی اکثریت کا یہ فتویٰ ہے کہ اسلامی حکومت کی رعایا کے ہر فرد کو اس کا حق حاصل ہے کہ غیر آباد زمینوں اور علاقوں (اراضی موات) سے جتنا حصہ بغیر کسی معاوضہ اور رائلٹی کے چاہے۔ احیاء کر کے اسے اپنی ملک اور جاگیر بنالے۔ صرف امام ابوحنیفہ اس مسئلہ میں متفرد ہیں کہ حکومت سے بھی اجازت احیاء کے لئے ضروری قرار دیتے ہیں۔ لیکن عام فقہاء اسلام حکومت کی اجازت کو غیر ضروری سمجھتے ہیں حتیٰ کہ امام صاحب کے شاگرد رشید قاضی ابو یوسف نے ان سے اختلاف کرتے ہوئے مذکورہ بالا نبوی وثیقہ کی بنا پر لکھا ہے،

ان اذن رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم جائز الی یوم القیمۃ — رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اجازت قیام قیامت تک نافذ رہے گی۔

یعنی جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان فھی لہ (وہ آباد کرنے والے کی ملک ہے) موجود ہے تو اس میں اب کسی دوسرے شخص سے پوچھنے اور اجازت حاصل کرنے کی قطعاً ضرورت نہیں، البتہ حکومت کو صرف اس کی نگرانی کرنی چاہیئے کہ اس سے "مفاد عامہ" کو کوئی ضرر تو نہیں پہنچتا۔ قاضی ابو یوسف نے لکھا ہے کہ اس حدیث کی بعض روایتوں میں لیس لعرق ظالم حق کے الفاظ سے اسی "ضرر" کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جس کا مطلب ان کے نزدیک یہ ہے کہ کسی غیر آباد زمین میں (یعنی موات) میں اگر کوئی درخت نصب کرے جس سے دوسرے کو نقصان پہنچے تو پھر اس ظلم کا حق اس کو نہ دیا جائے گا۔

عام فقہاء اسلام سے امام صاحب کے اس اختلاف کے متعلق قاضی ابو یوسف سے پوچھا گیا تھا کہ اس صحیح وصریح "نبوی وثیقہ" کے ہوتے ہوئے حکومت کی اجازت کی قید امام صاحب نے کیوں بڑھائی۔ کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اجازت کافی نہیں ہے۔ اگرچہ اس کا جواب امام صاحب کی طرف سے نقل کیا جاتا ہے کہ آخر بیت المال کے متعلق بھی تو عام قانون یہی ہے کہ

ھو بیت مال المسلمین — یعنی اس کے مالک مسلمان ہیں۔

اور باوجود اس کے کہ امام بیت المال کا مالک نہیں ہے لیکن اس پر اتفاق ہے کہ

للامام تعیین مصارفہ وترتیبہ۔ (مقدسی) — امام کو بیت المال کے رقوم کے مصارف کی تعیین و ترتیب کا حق ہے۔

اسی طرح "زمین" کے متعلق بھی امام کو نظم و ترتیب میں بھی دخل دینا چاہیئے۔ ورنہ رعایا میں باہمی کشمکش کی توثیق کے بعد جھگڑے کا خطرہ نہ رہے گا۔ لیکن لوگوں نے امام صاحب کی اس توجیہ کو تسلیم نہیں کیا ہے۔ پوچھا گیا ہے کہ کیا ہوا کے ہر پرندے پر قبضہ کرنے کے لئے بھی حکومت کی اجازت درکار ہے آخر جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اراضی موات کو تمام مسلمانوں کے لئے مباح قرار دیا اور سند دے دی کہ جو اس کو آباد کرے... "اسی کی وہ زمین ہو جائے گی۔" اس کے بعد حکومت سے

اجازت حاصل کرنے کی ضرورت ہی کیا باقی رہتی ہے۔

بہرحال یہاں یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ موات کی اراضی کو احیاء کے ذریعہ سے اپنی مملوکہ بنا لینے کا اختیار صرف مسلمانوں ہی کو نہیں بلکہ اسلامی حکومت کی رعایا کے ہر فرد کو ہے مسلم ہو یا غیر مسلم اور یہ میرا صرف قیاسی نتیجہ نہیں ہے بلکہ فقہ کی کتابوں میں ہمیشہ اس کی تصریح کر دی جاتی ہے، مقدسی لکھتے ہیں۔

لا فرق بین المسلم	موات زمین کو آباد کر کے اپنی ملک بنا لینے میں
والذمی فی الاحیاء وبہ	مسلم اور ذمی (غیر مسلم رعایا) میں کوئی فرق نہیں
قال ابوحنیفۃ۔	ہے امام ابوحنیفہؒ کا بھی یہی مذہب ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ میدانی علاقہ ہو یا کوہستانی، جزیرہ ہو یا خشکی کا خطہ جنگل ہو یا بیابان، ملک کا ہر باشندہ جتنی زمین چاہے موات اراضی میں سے آباد کر کے ان کو اپنی مملوکہ جاگیر مفت بنا سکتا ہے۔

قاضی ابو یوسف کے الفاظ یہ ہیں

کل ما عالج فی اجمۃ او	اجمہ (نیستان) ہو یا تری کا علاقہ ہو یا
من بحر او من بر لعبد ان	خشکی کا، اگر کسی خاص انسان کی ملک میں
لا یکون فیہ ملک لانسان	وہ نہیں ہے اور محنت مشقت کر کے جس نے
فاستخرجہ رجل وعمرہ فہولہ	اس کو پیدا اور آباد کیا تو اس کا وہی مالک ہے
بمنزلۃ الموات۔	جیسے موات اراضی کا حال ہے۔

مثلاً دجلہ و فرات جیسے دریاؤں میں عموماً بڑی بڑی زمین باہر نکل آتی ہیں۔ اگر ان کے آباد کرنے میں کسی کا ضرر نہ ہو تو ان کا حکم بھی مثل ارض الموات ہے۔

یعنی اس جزیرہ کا آباد کرنے والا قانوناً مالک ہو جائے گا۔ یہاں یہ بھی سمجھ لینا چاہیئے کہ "احیاء" یا آباد کرنے کا لفظ جو اس سلسلہ میں برابر استعمال ہو رہا ہے اس کا کیا مطلب ہے۔ محض کھیتی کرنا یا باغ لگانا یہی مقصد نہیں ہے بلکہ جیسا کہ علامہ مقدسی نے لکھا ہے۔

احیاء کل واحدۃ من	ان میں ہر چیز کی احیاء کا مطلب یہ ہے کہ
ذلک تہیئتہا للانتفاع الذی	جو نفع اس سے مقصود ہو اس کے لئے
اریدات بہ۔	اس کو تیار کیا جائے۔

یعنی "آبادی" صرف زراعت یا باغبانی پر منحصر نہیں ہے۔ مکان بنا کر یا دوابگاہ (مویشی رکھنے کی جگہ) یا لکڑی وغیرہ جیسی چیزوں کو رکھنے کی جگہ بنانا یہ سب احیاء میں داخل ہے۔ علامہ مقدسی نے بطور مثال کے چند چیزوں کا ذکر کیا ہے مقصد کے سمجھانے کے لئے ہم بجنسہٖ نقل کرتے ہیں،

فاما الدار فبان یبنی	گھر کے احیاء کا مطلب یہ ہے کہ اس کی
حیطانہ مما جرت	دیواریں کھڑی کی جائیں، یعنی جس طرح
بہ العادۃ وتسقیفہ	اس ملک میں دیواروں کے بنانے کا دستور ہو

لانها لا تكون سكنى الا بذلك واما الحظيرة فاحياءها بحائط جرت به عادة مثلها ليس من شرطها التسقيف لان العادة ذلك من غير تسقيف سواء اراد خطيرة المواشى او الخشب

ویسی دیوار کھڑی کر دی گئی ہو اور اس کی چھت پاٹ دی گئی ہو، کیونکہ رہنے کے قابل بغیر اس کے نہیں ہو سکتا، اسی طرح خطیرہ (احاطہ) کی احیار کا مطلب یہ ہے کہ جس قسم کی دیوار گھیر کر احاطہ بندی کا طریقہ اس ملک میں جاری ہو، یعنی چھت پاٹنے کی ضرورت اس کی احیار میں نہیں ہے کیونکہ عام طریقہ یہی ہے کہ ان احاطوں کے لئے چھت نہیں پاٹ خواہ مویشی کے لئے احاطہ بنایا جائے یا لکڑی کا گودام بنایا جائے۔

الغرض آباد کرنے کی جو غرض ہے اس کا سامان مہیا کرنا ہی اس کی احیار ہے، مثلاً کھیتی ہے تو اس کا جوتنا سیرابی کا انتظام کرنا ہی اس کی احیار ہے مقدسی لکھتے ہیں کہ زراعت کی احیار کی صورت یہ ہے۔

ان يسوق اليها ماء من نهر او بئر وان كانت مما لا يمكن زرعها لكثرة احجارها كارض الحجاز فبان يقلع احجارها وينقيها حتى يصلح للزرع وان كانت غياضا واشجارا كارض الشعرى فبان يقلع اشجارها ويزيل عروقها التى تمنع الزرع.

کہ آدمی اس کی طرف کسی نہر سے یا کنوئیں سے پانی لے جائے، اور اگر زمین ایسی ہو جس میں کھیتی نہ ہو سکتی ہو، مثلاً کثرت سے اس میں پتھر ہوں، جیسے کہ حجاز کی زمینوں کا حال ہے تو اس کی احیار کے معنی یہ ہوں گے کہ پتھروں کو زمین سے باہر نکالا جائے اور زمین صاف کی جائے حتیٰ کہ کھیتی کے قابل ہو جائے اور اگر بنجر (موات) زمین میں جنگل جھاڑ ہو درخت ہوں جیسا کہ شعریٰ کی زمین کا حال ہے تو اس کی احیار کے معنی یہ ہیں کہ درخت اکھاڑے جائیں اور ان جڑوں کو کھود کھود کر نکال دیا جائے جن سے کھیتی میں رکاوٹ پیدا ہو رہی ہو۔

بہر حال ہر چیز اور ہر ضرورت کی احیار خود اس ضرورت کے حسب حال ہوتی ہے اور جیسا کہ علامہ مقدسی نے لکھا ہے کہ اس باب میں اعتبار زیادہ عرف عام اور رواج کا ہے. آباد کرنے کا اطلاق جس کاروبار پر کیا جاتا ہو وہی اس کی احیار ہے۔

رعایا کی اسلام میں تملیکی قوت

اس کے بعد خواہ اقطاعی (حکومت کی بندوبست کی ہوئی) جاگیر ہو یا خود کسی نے ارض موات پر قبضہ کر کے احیار کر لیا ہو، یہ آباد کرنے والے کی انفرادی ملک بن جاتی ہے۔ اقطاعی جاگیرات کا حکم احیار کے بعد جو ہو جاتا ہے قاضی ابو یوسف لکھتے ہیں،

فلا یحل لمن یاتی من	بعد کو جو خلفاء ہوں، ان کے لئے جائز
بعدھم من الخلفاء ان	نہ ہوگا کہ کسی امام کی عطا کی ہوئی جاگیر
یرد ذلک ولا یخرجہ من	اس شخص سے واپس لیں جس کے قبضہ میں
ید من ھو فی یدہ وارثا	وہ جاگیر خواہ بطور وراثت کے ہو یا خریداری
او مشتریا۔ (ص ۳۴)	کے ذریعہ سے اس تک پہنچی ہو۔

جس سے معلوم ہوا کہ جس نے آباد کی ہو خود اس کے یا اس آباد کرنے والے سے کسی کو وراثتاً ملی ہو یا آباد کرنے والے سے کسی نے خریدی ہو، کسی سے بھی حکومت اس کی یہ مملوکہ زمین چھین نہیں سکتی انھوں نے اس کی تصریح کر دی ہے کہ

فاما ما اخذ الولاۃ من	اور حکومت کے ولاۃ (صوبہ داروں،
ید واحد ارضا واقطعھا	گورنروں) وغیرہ کا جو یہ طریقہ ہے کہ جاگیر ہو
آخر فھذا بمنزلۃ الغاصب	ایک شخص کے قبضہ سے نکال کر دوسرے کو
غصب واحد او اعطی	جاگیریں دیتے ہیں تو اس کی صورت
آخر (کتاب الخراج ۲۴)	وہی ہے جو غاصب اور زبردستی چھیننے والوں

کی ہوتی ہے یعنی ایک شخص سے اس کی مملوکہ چیز زبردستی چھین کر دوسرے کو دیدے۔

دوسری جگہ مزید صراحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

اما من اخذ من واحد	اور وہ جو ایک شخص سے جاگیر چھین کر دوسرے
اقطاع آخر فھذا بمنزلۃ	کی جاگیریں دی جاتی ہے تو اس کی حیثیت
مال غصبہ من واحد	اس مال کی ہے جو ایک شخص سے چھین کر
واعطی واحد (ص ۲۳)	دوسرے کو دے۔

اسی طرح اراضی موات کو احیاء کر کے جس نے اپنی مملوکہ جاگیر بنالی ہے، اس کے متعلق بھی لکھتے ہیں

ولیس للامام ان یخرج	امام (حکومت) کو اس کا اختیار نہیں ہے کہ
شیئاً من ید احد (ص ۳۵)	کسی کے قبضہ اور ملک سے زمین کو چھین لے۔

اسی دفعہ کی تعبیر دوسرے الفاظ میں دوسری جگہ یوں فرماتے ہیں۔

فلا یحل للامام ولا یسعہ	امام (حکومت) کے لئے جائز نہیں ہے
ان یقطع من الناس	اور نہ قانوناً اس کے لئے اس کی گنجائش
حتی مسلم ولا معاھد	ہے کہ کسی مسلمان یا جس سے اسلامی حکومت نے
ولا یخرج من ید احد من	معاہدہ کیا ہو اس کے حق کو اس سے منقطع کر دے اور
ذلک شیئاً۔	نہ یہ کر سکتا ہے کہ اس کے قبضہ سے کوئی چیز نکالے

دوامی بندوبست | یعنی یہ حکم حکومت کی مسلم غیر مسلم ہر قوم کی رعایا کے لئے عام ہے گویا ان زمینوں کی

حیثیت بندوبست دوامی کی ہو جاتی ہے اور جاگیردار کو اختیار ہے کہ خواہ وہ خود اس کو آباد کرے یا کسی اور ذریعہ سے آباد کرائے قاضی صاحب لکھتے ہیں۔

فمن احیاءھا وھی کذلک	جس نے اس زمین کو آباد کیا ہو اور وہ
فھی لہ ویزرعھا ویزارعھا	اسی حال میں ہو تو اس زمین کا مالک
ویواجرھا ویکری منھا انھا	اس کا آباد کرنے والا ہو گا اسے حق ہے
ویعمرھا بما فیہ مصلحتھا۔	کہ اس میں خود کاشت کرے یا کسی سے
(ص ۳۷)	کاشت کرائے یا کسی کو کرایہ پر دے۔

اسے اس کا بھی حق ہے کہ اپنی زمین میں نہر کھود ے اور اس کا بھی کہ جس قسم کی عمارت اور آبادی جس میں مصلحت ہو اپنی زمین میں قائم کرے۔

البتہ اس پر حکومت کی جو مالگذاری عائد کی گئی ہو صرف اس کا ادا کرنا اس کے ذمہ واجب ہے۔

فان کانت فی ارض العشر	اگر اس کی یہ زمین عشر کی زمین ہو،
ادی عنھا العشر وان کانت	تو اس سے عشر ادا کرے گا۔ اور اگر
فی ارض الخراج ادی عنھا	خراجی زمین ہو تو اس سے خراج
الخراج۔	ادا کرے گا۔

تحجیر کا مطلب اور حکم | عشر و خراج کی عدم ادائیگی کی صورت میں حکومت اس کے ساتھ کیا معاملہ کرے اس کی تفصیل مناسب موقع پر آگے آتی ہے۔ یہاں یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ کسی غیر آباد زمین کے حدود میں صرف پتھر نصب کر کے یا کانٹوں وغیرہ سے گھیر کر اس کو اپنی مملوکہ زمین قرار دینا صحیح نہیں ہے، فقہا نے اس عمل کا نام تحجیر ہے چونکہ یہ زمین کا احیا نہیں ہے۔ اس لئے ملکیت تو پیدا نہ ہو گی البتہ بہ نسبت دوسروں کے اس کے حق کو کو نہ ترجیح ہو گی۔ مگر وہ بھی ایک خاص مدت تک جس کی تفصیل فقہ کی کتابوں میں موجود ہے۔ مندرجہ بالا بیانات سے یہ اندازہ ہو سکتا ہے کہ اسلام نے اپنی حکومت کی رعایا کی معاشی سہولتوں کے کتنے ذرائع پیدا کر دیئے ہیں۔ آج جبکہ دنیا میں کوئی ایک انچ زمین پر بھی بلا معاوضہ مفت قبضہ نہیں کر سکتا اس سے اس وقت کا اندازہ لگانا چاہیئے اور اس لئے میں نے اس سلسلہ میں تھوڑی تفصیل سے کام لیا کیونکہ اسلامی حکومت کا نظام جب سے ناپید ہو گیا ہے۔ لوگ ان واقعات کو بھول گئے ہیں ورنہ سچ یہ ہے کہ ہندوستان تک میں حکومت مغلیہ کے آخری دور تک زیادہ تر اس قسم کی معاشی سہولتیں آباد کاروں کو حاصل تھیں۔

بہر حال یہ احکام تو غیر مملوکہ امور سے متعلق تھے۔ اب بحث ان چیزوں پر کرنی چاہیئے جو کسی کی ملک میں داخل ہیں۔ میں نے کہا تھا کہ اس کی بھی دو صورتیں ہیں۔ مالک کی مرضی کے بغیر ان پر قبضہ کرنے کی اسلام اجازت دیتا ہے یا نہیں۔ پھر ایسی مملوکہ چیزیں جن پر مالک کی مرضی کے بغیر بھی قبضہ کر کے ان کو اپنا مملوک بنایا جا سکتا ہے اس کی بھی اسلام میں دو شکلیں ہیں۔

مالک کی مرضی کے بغیر کسی چیز پر قبضہ کرنا (۱) اسلامی حکومت کی رعایا کا اگر مال ہو تو مالک کی مرضی کے بغیر صرف دو شکلوں میں ان پر قبضہ کرنے کی اجازت ہے ایک کی فقہی تعبیر لقطہ ہے۔

لقطہ کا مطلب یعنی گرا پڑا ہوا مال اگر کسی کا مل جائے۔ تو بعض صورتوں میں یہ جائز ہے کہ آدمی ان پر قبضہ کرلے اور خاص شرائط و حالات میں ان کو اپنے تصرف میں بھی لا سکتا ہے۔ لیکن جب کبھی اصل مالک کا پتہ مل جائے اور وہ اس کا مطالبہ کرے تو معاوضہ ادا کرنا پڑے گا۔ چونکہ اس باب کا تعلق معاشیات سے نہیں ہے کہ یہ آمدنی کی نہایت نادر شکل ہے۔ اس لئے اس کے تفصیلات کی یہاں ضرورت نہیں۔

قانون شفعہ دوسری شکل شفعہ کی ہے یعنی مالکانہ شرکت یا پڑوس کی وجہ سے اسلام نے ملک کے باشندے کو یہ قانونی حق دیا ہے کہ آدمی دوسرے کی خریدی ہوئی چیز کو زبردستی دام ادا کرکے اپنی ملک بنالے مثلاً کسی مکان یا زمین میں دو آدمی یعنی زید و عمر شریک ہیں۔ اگر عمر کے حصہ کو خالد خریدے تو زید یہ قانونی حق ہے کہ جس دام میں خالد نے اس کے شریک کے حصہ کو خریدا ہے ادا کرکے خالد کی رضامندی ہو یا نہ ہو خرید لے قانون اس جبری خریداری کو نافذ کرائے گا، معلوم نہیں اس باب میں دنیا کے اور قوانین کا کیا حال ہے لیکن اس قانون کی وجہ سے اسلامی حکومت کی رعایا کو دکانوں، کھیتوں باغوں وغیرہ کے متعلق کتنی آسانیاں بہم پہنچتی ہیں اور پہنچ سکتی ہیں۔ اس کا اندازہ تجربہ سے ہو سکتا ہے۔ خصوصاً حنفی مذہب میں اس قانون کو ملکی شرکت سے آگے بڑھا کر مرافق (مثلاً راستہ، ذرائع آبپاشی وغیرہ) کی شرکت اور جوار (پڑوس) کی شرکت تک وسیع کر دیا گیا ہے۔ فقہ کا یہ ایک طویل باب ہے۔ میرے لئے اس سلسلہ میں صرف اتنا بیان ہی کافی ہو سکتا ہے۔

غیر اسلامی حکومتوں کی رعایا کے ساتھ مسلمانوں کے معاشی تعلقات (۲) غیر اسلامی حکومتوں کے باشندوں کے مملوکات پر مالکوں کی رضامندی کے بغیر قبضہ کرکے مسلمان ان کے قانونی مالک بن سکتے ہیں، اسی طرح غیر اسلامی حکومتوں کے باشندوں کے بھی اس حق کو اسلام نے قانونی حق قرار دیا ہے یعنی اسلامی حکومت کے باشندوں کے اموال پر العیاذ باللہ[1] اگر ان کا قبضہ ہو جائے تو مالک کی رضامندی کے بغیر وہ بھی ان کے مالک ہو جاتے ہیں۔ دراصل اس دفعہ کا تعلق قانونِ جنگ سے ہے اسی سلسلہ میں غنیمت۔ فئی۔ متعلقات فئی وغیرہ کی آمدنیاں ہیں۔ علاوہ ان عطایا و وظائف وغیرہ کے جو اسلامی فوجوں کو حکومت سے ملتے تھے۔ چونکہ لڑنے والے ہر سپاہی کو غنیمت سے بھی حصہ ملتا تھا۔ اس لئے مسلمانوں میں آمدنی پیدا کرنے کا یہ بھی ایک بڑا آسان اور قیمتی ذریعہ تھا اور ان کی معاشی فراغبالیوں پر اس قانون کا کافی اثر مرتب ہوتا تھا۔ چونکہ اس آمدنی کا تعلق معمولی کاروبار سے نہیں ہے بلکہ اس کی اکثر شکلوں کا

---

[1] العیاذ باللہ کا لفظ میں نے اپنے فتاویٰ کی تقیید میں لکھا ہے تاکہ معلوم ہو کہ مسلمانوں پر ایک وہ وقت بھی گذرا ہے جب غیر اسلامی اقوام کے تسلط کو اپنے اوپر ناقابلِ برداشت تصور کرتے تھے۔ پھر آسمان نے رخ بدلا اور جس کا سوچنا بھی ناگوار تھا اسے دیکھنا پڑا۔ اور کیسا دیکھنا؟

تعلق حکومت سے ہے۔ اس لئے اس باب کی بھی تفصیل کی یہاں حاجت نہیں۔ البتہ اسی بین الاقوامی قانون کی بنا پر کہ شریعت میں چونکہ یہ طے کر دیا گیا ہے کہ اسلامی حکومت کی رعایا کا مال غیر اسلامی حکومتوں کے باشندوں کے لئے مباح اور جائز ہے۔ یعنی قبضہ کرنے کے بعد ان کی ملک میں داخل ہو جاتا ہے اور ان سے اگر کوئی مسلمان اس مال کو خریدے تو یہ قانونی مالک سے مال کا خریدنا ہوگا۔ اسی لئے اس کا لینا جائز ہوگا۔

غنیمت وفی کی حلت کی وجہ

پھر جس طرح مسلمانوں کا مال غیر اسلامی حکومتوں کے باشندوں کی ملک میں صرف قبضہ سے داخل ہو جاتا ہے۔ اسی طرح اسلامی حکومتوں کے باشندوں کے لئے غیر اسلامی حکومتوں کے باشندوں کا بھی مال مباح و جائز ہے۔ یعنی قبضہ کے بعد مسلمان اس کے قانونی مالک بن جاتے ہیں، غنیمت (یعنی غیر اسلامی حکومت کے لوگوں سے جو مال بزور حاصل کیا جائے) اور فئی (جو مال غیر اسلامی حکومت کے غیر مسلم باشندوں کا بغیر کسی جنگ و جدال کے مسلمانوں کے قبضہ میں آجائے) ان دونوں قسم کے اموال کے قانونی مالک مسلمان اسی بنا پر ہو جاتے ہیں کہ ان لوگوں کے اموال کو اسلام نے مسلمانوں کے لئے مباح اور جائز قرار دیا ہے۔

غیر اسلامی ممالک میں سود، قمار وغیرہ کا حکم

اسی مسئلہ کی بنیاد پر ایک اور معاشی سوال پیدا ہو گیا۔ یعنی غیر اسلامی حکومت کے کسی غیر مسلم باشندے کا روپیہ کسی ایسے ذریعہ سے جو اسلامی قانون کی رو سے لین دین کا قانونی اور شرعی ذریعہ نہیں ہے مثلاً ربوا (سود) یا قمار یا از ین قبیل کسی اور غیر شرعی ذریعہ سے کسی مسلمان کے قبضہ میں آجائے تو کیا قانوناً یہ مسلمان اس کا مالک ہو سکتا ہے یا نہیں۔

چونکہ یہ ایک جائز اور مباح مال پر قبضہ ہے اور مباح و جائز مال کے مملوک ہونے کے لئے صرف قبضہ کافی ہے، مثلاً جنگل کے کسی پرندے کا شکار کر کے قبضہ کر لینا اس پرندے کے مالک ہونے کے لئے کافی ہے۔ اسی لئے امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی رائے ہے کہ اس قسم کے اموال کا مسلمان قانونی طور پر مالک ہو جاتا ہے اور یہی ان کا وہ مشہور نقطۂ نظر ہے جس کی وجہ سے حنفی فقہ کی عام کتابوں میں

لا ربوا بین الحربی والمسلم　　　الحربی (غیر اسلامی حکومت کا باشندہ)

اور المسلم (اسلامی حکومت کا باشندہ) میں ربوا (سود) نہیں ہے۔

کا ذکر پایا جاتا ہے۔ گویا یہ "بین الاقوامی قانون کا ایک دفعہ ہے۔ عوام چونکہ اس کے اصل منشا سے واقف نہیں ہیں، اس لئے ان کو حیرت ہوتی ہے کہ "ربوا (سود) جب اسلام میں حرام ہے تو ہر جگہ ہر شخص سے لینا حرام ہونا چاہئے۔ "حربی" یعنی غیر اسلامی حکومت کے غیر مسلم باشندوں کے ساتھ اس کے جائز ہونے کے کیا معنی؟ مگر سچی بات یہ ہے کہ حربی کے ساتھ یہ معاملہ ربوا کا معاملہ ہی نہیں ہے۔ بلکہ ایک مباح مال کو قبضہ کر کے اسے اپنی ملک بنانا ہے۔ اس قانون سے پہلے ایک اور قانون کا ذکر کتابوں میں عموماً کیا جاتا ہے کہ

لا ربوا بین العبد والمولیٰ یعنی درمیان غلام اور اس کے آقا کے ربوا (سود) کا معاملہ سود کا معاملہ نہیں ہے۔

یعنی شرعی غلام اور آقا کے درمیان بھی اگر ربوا کا معاملہ کیا جائے گا تو وہ ربوا نہ ہوگا یہ بھی امام ابوحنیفہؒ کا مذہب ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کا بھی یہ مطلب نہیں ہے کہ باوجود ربوا اور سود ہونے کے امام نے اس کو حرمت سے مستثنیٰ کیا ہے۔ بھلا اس کا حق ایک مجتہد کو کیا ہے۔ بلکہ بات وہی ہے کہ قانوناً غلام کا مال آقا ہی کا ہے۔ پس آقا نے غلام سے جو کچھ لیا وہ اس کا مال نہیں اپنا مال لیا اور اپنا مال کسی پر کیوں حرام ہوسکتا ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ آدمی اپنی آمدنی کے مختلف مدوں کو مختلف مصارف کے لئے معین کر دیتا ہے۔ لیکن بسا اوقات کسی ایک ضرورت کے لئے دوسری مد کی آمدنی سے قرض کے نام سے لے لیتا ہے۔ فرض کیجئے کہ اگر اس قرض میں وہ کچھ سود بھی لگا دے اس مد کی جمع کر دے جس سے اس نے قرض لیا تھا تو کیا واقعی لفظِ سود سے وہ سود ہو جائے گا۔ اس نے تو اپنے ہی روپے کو اپنے مال میں ملایا ہے۔ خواہ کسی نام سے ملائے۔ قانوناً شرعاً کوئی اس کو سود نہیں کہہ سکتا

ہندوستان میں مسئلہ ربوا (سود) کا حکم

اور یہی وجہ ہے کہ ہندوستان جہاں اس وقت اسلامی حکومت قائم نہیں ہے یہاں کے غیر مسلم باشندوں سے بعض حنفی علما[1] سودی کاروبار کے جواز کا فتویٰ دیتے ہیں۔ بعض غیر قانونی دماغوں کو یہ شبہ ہوتا ہے کہ اگر اس جواز کی بنا اس پر ہے کہ غیر اسلامی حکومت کی غیر مسلم رعایا کا مال مسلمانوں کے لئے مباح ہے تو پھر اس ملک میں فریب، چوری، ڈاکہ وغیرہ جو شرعاً لین دین کے ناجائز ذرائع ہیں کیا ان ذرائع سے بھی مسلمانوں کو غیر مسلموں کا مال لینا جائز ہوگا؟ حالانکہ جہاں یہ مسئلہ فقہ حنفی میں لکھا گیا ہے وہیں دوسرا فقرہ من غیر غدر (یعنی خلافِ معاہدہ) "لین دین نہ ہو" کی قید بھی بڑھی ہوئی ہے کہ اس وقت ہندوستان میں جو حکومت قائم ہے اس کے قانون میں فریب، چوری، ڈاکہ وغیرہ کے ذریعہ سے لین دین کو ناجائز ٹھیرایا گیا ہے اور اس ملک میں جو مسلمان آباد ہیں وہ اس معاہدے کے ساتھ ہی آباد ہیں کہ حکومتِ وقت کے قانون کی خلاف ورزی نہ کریں گے اب اگر چوری ڈاکہ یا فریب وغیرہ ذرائع سے ملک کے کسی باشندے کا روپیہ کوئی لے گا تو غدر (عہد شکنی) کے اسلامی جرم کا وہ مرتکب ہے۔ بخلاف ربوا (سود) کے کہ موجودہ حکومت نے اس ذریعہ سے لین دین کو ناجائز نہیں قرار دیا ہے۔ پس یہ حکومت وقت کے ساتھ غدر (عہد شکنی) نہیں ہے اور بغیر کسی عہد شکنی کے مسلمان کے قبضہ میں جب اس ملک کے غیر مسلم باشندے کا روپیہ آئے تو مُعا

---

[1] جس میں سب سے نمایاں شخصیت حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی ہے۔ شاہ صاحب کے فتاویٰ عزیزیہ میں یہ فتویٰ ایک سے زیادہ مقام میں موجود ہے یہاں یہ بھی غور کرنے کا مقام ہے کہ شاہ صاحب نے یہ فتوے اس وقت صادر کئے تھے جب لال قلعہ میں تیموری سلاطین نام نہاد شاہ ہند کے نام سے موجود تھے لیکن عملاً چونکہ ان کی حکومت ختم ہوچکی تھی اس لئے شاہ صاحب نے حنفی فقہ کے اس معاشی مسئلہ کا عام اعلان سرزمین ہند میں کر دیا تھا ۱۲

قبضہ کے ساتھ ہی وہ اس کا مالک ہو جاتا ہے۔ امام ابو حنیفہ کا یہ اتنا مستحکم قانونی نقطۂ نظر ہے کہ اس قسم کے اموال کی حرمت کی کوئی دلیل شرعی پیش کرنا مشکل ہے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ ہندوستان کی غیر مسلم رعایا کے اموال کے عدم اباحت کی دلیل پیش کرنا آسان نہیں ہے۔ چہ جائیکہ ان کی حرمت کا دعویٰ![1] اور یہی اس معاشی مسئلہ کی بنیاد ہے۔ افسوس کہ علمائے اسلام نے اسلام کے اس قیمتی نقطۂ نظر پر ٹھنڈے دل سے غور نہیں کیا ورنہ ادھر سوڈیڑھ سو سال میں مسلمان جن معاشی دقتوں میں مبتلا ہوگئے غالباً صورتِ حال یہ نہ ہوتی ملک کے باشندوں کا ایک طبقہ صرف لیتا رہا اور دوسرا طبقہ صرف دیتا رہا۔ اس کی وجہ سے جو معاشی عدم توازن اس ملک میں پیدا ہو گیا ہے۔ اس کی ذمہ داری اسلام پر نہیں بلکہ زیادہ تر علماء پر اس لیے ہے کہ ان کے معاشی نظام میں اس صورت حال کا علاج موجود تھا۔ لیکن انھوں نے ایک جزو پر عمل کیا اور دوسرے کو ترک کر دیا۔ اور اب تو شاید مرض لا علاج ہو چکا ہے۔

اس مسئلہ کا ذکر چاہیے تو تھا کہ میں سود کے باب میں کرتا جیسا کہ عموماً فقہ کی کتابوں میں کیا گیا ہے۔ لیکن سچی بات یہ ہے کہ اس کا تعلق ربوٰا کے باب سے نہیں ہے بلکہ بین الاقوامی معاشی تعلقات کا یہ ایک قدرتی نتیجہ ہے۔ اسی لئے یہاں یہ بات بآسانی سمجھ میں آجاتی ہے بخلاف اس باب کے جہاں خود مسلمانوں کے باہمی مالی و معاشی معاملات سے بحث کی جاتی ہے۔ غیر موزوں مقام پر درج ہونے کی وجہ سے امام صاحبؒ کا صحیح نقطۂ نظر لوگوں کے سامنے نہیں آتا۔ بہر کیف مذکورہ بالا چند استثنائی صورتوں کے سوا باہمی لین دین کو قرآن نے

عن تراض منکم — باہمی رضامندی سے لین دین ہو۔

پر مبنی کیا ہے یعنی کوئی کسی کے مال کو اس کی مرضی کے بغیر اپنی ملک نہیں بنا سکتا۔ اسی اصول کو پیش نظر رکھ کر فقہائے اسلام نے تمام معاشی ابواب کے قوانین کو مرتب کرنے کی کوشش کی ہے۔ ظاہر ہے کہ لین دین میں "باہمی مراضاۃ" کی شرط تقریباً تمام متمدن اقوام کے قوانین میں مسلم ہے چوری، ڈاکہ، فریب، دھوکا، غصب وغیرہ کو جرم اسی بنا پر قرار دیا گیا ہے کہ ان تمام شکلوں میں مالک کی مرضی کے بغیر اس کے مال پر قبضہ کیا جاتا ہے لیکن اسلام نے اس عام قانون کے سوا "مالی معاملات" اور مال کے لین دین کے متعلق چند اور امور کا اضافہ بھی کیا ہے جن میں پہلی اصل تو وہ ہے جس کا ذکر قرآن میں۔

لا تاکلوا اموالکم بینکم بالباطل۔ — "باطل" طریقے سے باہم ایک دوسرے کا مال نہ کھایا کرو۔

کے الفاظ میں کیا گیا ہے اور دوسری اصل قرآن ہی میں۔

---

[1] اسی لئے ان لوگوں سے جو اس مسئلہ میں امام ابو حنیفہؒ کے مسلک کا انکار کرنا چاہتے ہیں۔ میرا مطالبہ ہے کہ قرآن و حدیث و اجماع، قیاس الغرض کسی شرعی دلیل سے الحربی کے اموال کے عدم اباحت کا ثبوت پیش کر سکتے ہوں تو پیش کریں ۱۲

لا تَظلمون ولا تُظلمون۔ نہ تم کسی پر ظلم کرو، نہ تم پر ظلم کیا جائے

کے دو مختصر لفظوں میں مذکور ہے ہم اس وقت ان ہی دو اصول اور ان کے نتائج پر بحث کرنا چاہتے ہیں "اسلامی معاشیات" کی تصحیح وارتقا میں ان دو قاعدوں کو میرے خیال میں بہت زیادہ دخل ہے۔

اکل بالباطل کا مطلب پہلی بات یعنی باہم ایک دوسرے کا مال بالباطل نہ کھایا جائے۔ پہلے اس کے مفہوم کو سمجھ لینا چاہئے۔ مثال سے اس کو یوں ذہن نشین کیا جاسکتا ہے مثلاً ایک شخص آپ کا کوئی کام کرکے یا آپ کو اپنی کوئی چیز دے کر یا اپنی چیز سے آپ کو نفع اٹھانے کا موقع دے کر اگر آپ سے آپ کا مال لیتا ہے تو ظاہر ہے کہ آپ پر اپنا ایک حق قائم کرنے کے بعد اس کے معاوضہ میں آپ کا مال لے رہا ہے۔ لیکن اس کے مقابلہ میں کوئی حق قائم کئے بغیر اگر آپ کا مال لینا چاہتا ہے تو یہی اکل بالباطل ہے۔ یعنی بغیر کسی حق کے آپ کا مال لے رہا ہے۔ یہ تو الفاظ کا مطلب ہوا۔ اب ظاہر ہے کہ دنیا میں کاروبار کی ساری سرگرمیاں اس پر مبنی ہیں کہ ہر شخص ایک دوسرے کی ضرورت کو پوری کر رہا ہے۔ اگر اسی شکل کو یک طرفہ کر دیا جائے یعنی دینے والوں کو لینے والوں سے کچھ نہ ملے تو نہ زراعت چل سکتی ہے نہ تجارت نہ حرفت نہ صنعت۔ جب معاوضہ ادا کئے بغیر لوگوں کو زندگی کی ضروریات ملنے لگیں گی تو پھر خواہ مخواہ معاوضہ کے مہیا کرنے کی فکر میں کوئی کیوں مشغول ہوگا۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ ملک کے باشندوں کی توانائیوں کا ایک بڑا حصہ دنیا میں آ آکر اپنی قیمت حاصل کئے بغیر قبر میں دفن ہوتا چلا جائے گا نیز ان کے دل ودماغ اور عملی جدوجہد سے ملک کو اپنے معاشی ارتقاء میں جو مدد مل سکتی تھی اس سے وہ محروم ہو جائے گا۔

گداگری کے متعلق اسلام کا نقطۂ نظر یہی وہ بنیاد ہے کہ گو دنیا کے اکثر حصوں میں گداگروں اور سائلوں کو صرف یہی نہیں کہ غیر مجرم قرار دیا جاتا تھا۔ بلکہ بعض علاقوں مثلاً ہندوستان میں عظمت و احترام کی آخری بلندیوں پر وہی لوگ قابض تھے اور اب تک ہیں جن کا گذارا بھکشا اور دان پُن پر ہے۔ سمجھا جاتا ہے کہ یہ بڑی نیکی اور پُن کی بات ہے۔ لیکن معاشی نقطۂ نظر سے یہ کتنا بڑا خسارہ ہے۔ اس کا کون اندازہ کر سکتا ہے۔ اسلام نے صرف یہی نہیں کہ کھاتے پیتوں کے لئے سوال کو جرم قرار دیا ہے جیسا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ

من سال الناس عن ظھر غنی فانما یستکثر من جمر جھنم (صحاح)	باوجود غنی ہونے کے جو لوگوں سے بھیک مانگتا ہے وہ جہنم کے انگارے جمع کر رہا ہے۔

یعنی باوجود "غنا واستطاعت" کے جو بھیک مانگتا ہے وہ جہنم کے انگاروں کو اکٹھا کر رہا ہے اور غنا سے یہی مراد یہ نہیں ہے کہ کافی دولت وثروت رکھتا ہو بلکہ اسی حدیث میں ہے کہ پوچھنے والے نے دریافت کیا۔

یارسول اللہ ما ظھر غنی	غنی کا یارسول اللہ کیا مطلب ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے جواب میں جو کچھ ارشاد فرمایا وہ موجودہ زمانے کے مسلمانوں کے لئے

باعثِ عبرت ہے ارشاد ہوا،

ان یعلم ان عند اھلہ
مایغدیھم ومایعشیھم

جو یہ جانتا ہے کہ اس کے گھر میں اتنا سرمایہ ہے کہ جس کے ذریعہ سے صبح و شام کی غذا مہیا ہو سکتی ہے۔

خواہ وہ کسی شکل میں مہیا ہو سکتی ہو مثلاً جو یا جواری، باجرہ کی روٹی ہی کیوں نہ ہو، بہرحال اتنے معمولی سرمایہ رکھنے والے کے لئے بھی اسلام نے سوال کو قطعاً حرام کر دیا ہے، اور اگر کسی کے پاس مالی سرمایہ نہ ہو لیکن ہاتھ پاؤں کا سرمایہ اور اتنی قوت رکھتا ہو کہ کما سکے اس کے متعلق بھی ارشاد ہے۔

لاتحل الصدقۃ لغنی
ولالذی مرۃ سوی۔

صدقہ حلال نہیں ہے صاحب غنی کے لئے اور نہ مضبوط تاگڑے کے لئے۔

لاحق فیھا لغنی ولالقوی
مکتسب۔

صدقہ میں حق نہ کسی غنی کا ہے اور نہ کمانے والے توانا آدمی کے لئے اس میں (صدقہ میں) حصہ ہے۔

بہرحال بجز چند مخصوص صورتوں کے جن کی فقہاء نے تصریح کر دی ہے۔ ملک کے ہر باشندے پر جس میں کسی قسم کی بھی مالی یا بدنی صلاحیت ہو عموماً اسلام سے سوال کو حرام کر دیا ہے اور اس سے یہی غرض ہے کہ اس قسم کی تمام قوتیں ملک کے معاشی ارتقاء میں اپنی اپنی وسعت کی حد تک ہاتھ بٹائیں اس زمانہ میں مسلمانوں کو کون کہہ سکتا ہے۔

تندرست و توانا آدمی کو بھیک دینا بھی ناجائز ہے

ان کو شاید معلوم نہیں کہ اسلام میں لینے والوں ہی پر عموماً بھیک حرام نہیں ہے بلکہ فقہاء کی ایک بڑی جماعت کا یہ خیال ہے کہ مذکورہ بالا صفات یعنی کم از کم مالی یا بدنی صلاحیت رکھنے والوں کو بھیک دینا بھی ناجائز ہے۔ علامہ ابن نجیم حنفی نے "الاشباہ والنظائر" میں مذکورہ بالا صورتوں کے متعلق لکھا ہے،

ان السائل والمعطی
اثمان۔

بھیک مانگنے والے اور بھیک دینے والے دونوں مجرم ہیں۔

سائل اور گداگر کے مجرم ہونے کی وجہ تو ظاہر ہی ہے۔ لیکن دینے والوں کو مجرم کیوں قرار دیا جاتا ہے اس کی وجہ انھوں نے لکھی ہے،

فلکونہ معینا علی الحرام۔

اس نے ایک جرم میں مجرم کی مدد کی۔

اگرچہ بعض علماء کو اس سے اختلاف ہے۔ مولینا انور شاہ صاحب کشمیری نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ

لو علم المعطی ان السائل
لا یتخذہ کسبا فلا اثم
علیہ ولو علم انہ یتخذہ

اگر دینے والا یہ جانتا ہو کہ سوال کرنے والا اس کو پیشہ نہ بنالے گا تو ایسے دینے والے کو گناہ نہ ہوگا۔ اور اگر یہ جانتا ہو کہ

کسبا ویتعاد السوال فهو اثمه[1]	وہ بھیک کو اپنا پیشہ بنالے گا تو دینے والا
(العرف الشذی ۲۹۱)	بھی گنہگار ہوگا۔

قمار اور اس کی مختلف صورتوں کی حرمت

اکل مال بالباطل ہی کی ایک شکل وہ ہے جس میں لاکھوں اور کروڑوں کی دولت لوگوں کو اس طرح مل جاتی ہے کہ ملک کے کسی باشندے کو اس کے معاوضہ میں کچھ نہیں ملتا۔ میری مراد قمار اور اس کی مختلف شکلوں سے ہے جس کا رواج اس وقت تک دنیا کے ان علاقوں میں بھی موجود ہے جو کسی معاشی قوت کو بیکار چھوڑنا کسی طرح گوارا نہیں کرتے۔ آخر جوئے میں جو رقم جیتنے والے کو ملتی ہے اس کے معاوضہ میں ہارنے والوں کو نہ سہی کسی اور کو وہ کیا دیتا ہے صرف یہی نہیں کہ یہ اکل مال بالباطل ہے بلکہ گو بظاہر ہارنے والا اپنی مانی ہوئی شرط کی بنا پر ہارتا ہے اور اس لئے سمجھا جاتا ہے کہ رضامندی سے اس نے اپنا مال جیتنے والوں کو دیا۔ لیکن واقعہ یہ ہے جوئے میں جتنے غصہ اور غیظ وغضب میں بھرے ہوئے دل سے مال دیا جاتا ہے شاید اتنا غصہ اتنا غیظ تو چوروں اور ڈاکوؤں پر بھی ان لوگوں کو نہیں ہوتا جن کا مال چوری جاتا ہے۔ شاہ ولی اللہ نے حجۃ اللہ البالغہ میں جوا (قمار) کے متعلق جو یہ ارقام فرمایا ہے۔

لانه اختطاف لاموال الناس	کیونکہ جوئے میں لوگوں کے اموال کو
عنهم معتمد على اتباع جهل	اس طرح اچکتا (لُوٹ) ہے کہ اس میں بالکلیہ جہل
وحرص ومنية باطلة وركوب	حرص اور جھوٹی آرزوؤں کے ہاتھوں
غير تبعثه على هذا الشرط	آدمی گرفتار رہتا ہے۔ اور دھوکہ پر
وليس له دخل في التمدن	سوار ہوکر اس میدان میں کودتا ہے
والتعاون فان سكت المغبون	اور حرص غلط آرزو وغیرہ اس کو ان
سكت على غيظ وخيبة وان	شرائط کے مان لینے پر آمادہ کردیتی ہے
خاصم خاصم فيما التزمه	جنھیں نہ شہری زندگی کی تعمیر اور نہ باہمی
بنفسه اقتحم بقصده والغابن	امداد میں دخل ہے، ہارنے والا اگر
يستلذه ويدعو قليله الى	ہارنے کے بعد خاموش رہتا ہے تو
كثيره ولا يدعه حرصه ان	اس کی یہ خاموشی غصہ اور ایسی ناکامی
يقلع عنه وعما قليل يكون	ونامرادی کی جگہ پر قائم ہوتی ہے جن میں
الترة عليه۔	وہ اپنے قصد وارادہ سے گھسا تھا۔ یوں ہی

جیتنے والا اپنی جیت سے لذت گیر ہوتا ہے اور اس کی تھوڑی مقدار بڑی مقدار کو دعوت دیتی ہے اور اس کی حرص اجازت نہیں دیتی کہ اس شغل کو ترک کردے آخر تھوڑی ہی مدت کے بعد شکست وہ خود ہی اس کے سر پر مسلط ہو جاتا ہے

---

[1] گداگری کے متعلقہ مسائل کی تھوڑی سی تفصیل آئندہ بھی اپنے مقام پر آنے والی ہے فیتنظر ۱۲

شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ اگر کسی ملک کے باشندوں میں لین دین کی اس بدعادت کا رواج ہوجاتا ہے تو بالآخر اس کا نتیجہ:

افسد للاموال و مناقشات طویلة و اھمال الاکتفاقات المطلوبة والاعراض عن التعاون المبنی علیه التمدن۔	ملک کی دولت عامہ کے نظام میں بگاڑ پیدا ہوجاتا ہے اور باہمی طویل جھگڑوں کے سلسلے کی بنیاد پڑجاتی ہے اور حصولِ معاش کے جو صحیح اور مطلوب ذرائع ہیں ان کے دروازے بند ہونے لگتے ہیں، لوگ اس باہمی امداد و اعانت سے لاپروائی برتنے لگتے ہیں جس پر تمدن کی بنیاد قائم ہے۔

فرماتے ہیں۔

المعائنة یغنیک عن الخبرھل رئت من اھل القمار الا ماذکرناہ۔ (حجۃ اللہ البالغہ ص ۱۰۶)	دوسروں کی خبر سے خود معائنہ اور مشاہدہ اس باب میں تمہیں بے نیاز کرسکتا ہے آخر جواریوں میں تم نے ان امور کے سوا جن کا میں نے ذکر کیا۔ کبھی بھی کسی اور چیز کا مشاہدہ کیا ہے۔

بہرحال ملک کی معاشی قوتوں کا ایک بڑا حصہ قمار کے ذریعہ سے ضائع ہوجاتا ہے۔ اس لئے اسلام نے صرف قمار کی حقیقی شکلوں ہی کو نہیں بلکہ جن معاملات میں تھوڑا بہت بھی قماری رنگ پایا جاتا تھا ان کو ممنوع قرار دیا۔ عرب میں خرید و فروخت کی بعض صورتیں ایسی تھیں جنہیں موجودہ زمانے کا سٹہ کہہ سکتے ہیں۔ اور متمدن ممالک میں اب تک ان کا رواج ہے۔ اسلام نے ان کو غیر قانونی قرار دیا۔ مثلاً منابذہ (کپڑے کو پھینک دیا جاتا جس پر کسی کا ہاتھ پڑجاتا وہ اس کا جبری خریدار بن جاتا تھا) ملامسہ (جس کپڑے پر مثلاً ہاتھ پڑگیا جبراً خریداری اس کی ضروری تھی) ازیں قبیل اور صورتیں بھی تھیں جو اسلامی معاشیات کے باب سے خارج کردی گئیں۔ مقصود یہی ہے کہ ہر شخص ملک اور ملک کے باشندوں کی کچھ خدمت کرکے کھائے اور کمائے تاکہ ملک کی دولتِ عامہ کی پیدائش میں ہر شخص اپنی اپنی استطاعت کی حد تک حصہ دار ہو اور یہی وجہ ہے کہ ایسی چیزیں جن کا استعمال مختلف طبی، اخلاقی، اجتماعی اغراض سے اسلام نے اپنے ماننے والوں پر حرام کردی ہیں، ان چیزوں کی تجارت بھی اس نے ممنوع قرار دی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مشہور فرمان ہے۔

ان اللہ اذا حرم شیئاً حرم ثمنه۔	حق تعالیٰ نے جب کسی چیز کے استعمال کو حرام قرار دیا تو اس کے دام کو بھی حرام قرار دیا۔

کیونکہ ایسی چیزوں کے لینے والے جب اس سے نفع ہی نہیں اٹھا سکتے تو ان کا جو مال ان چیزوں کے معاوضہ میں لیا گیا وہ بالباطل ہی لیا گیا اس ذیل میں فقہاء اسلام نے بعض چیزوں کی تجارت ممنوع قرار دی ہے۔ تاہم انھوں نے کوشش کی ہے کہ ہر وہ چیز جس میں نفع کا پہلو کسی راہ سے بھی پیدا ہو سکتا ہے۔ ان کے استثناء کی بھی راہ نکالی جائے مثلاً میتہ (مردار) حرام ہے لیکن باوجود اس کے مردہ جانوروں کی کھال دباغت کے بعد بلکہ ان کی ہڈیاں، اون، کُھر، سینگ، پٹھوں وغیرہ کی تجارت جائز ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ جمادات و نباتات، حیوانات بلکہ ہر وہ چیز جس میں انتفاع کی کوئی صورت نکل سکتی ہو فقہاء نے کوشش کی ہے کہ مسلمانوں کی معاشی سہولتوں کے لئے ان کی تجارت کی اجازت دی جائے اور یہی وجہ ہے کہ بجز چند چیزوں کے جن کی حرمت قطعی ہے یا جو نجس العین ہیں یا صراحۃً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی بیع کی ممانعت فرمادی ہے۔ عموماً عام چیزوں کی خرید و فروخت جائز ہے اور تقریباً تجارت لین دین کے وہ تمام طریقے جو دنیا میں مروّج ہیں اگر اکل بالباطل اور لا تظلمون ولا تظلمون کی زد میں نہ آتے ہوں۔ اسلام نے ان کی اجازت دے رکھی ہے۔ مثلاً نقد دے کر ضرورت کی چیزیں خریدنی، چیز دے کر چیز لے لینا یا دام بعد کو دینا جسے نسئہ (ادھار) کہتے ہیں۔ یا دام پہلے دینا اور چیز بعد کو لینا جسے سَلَم کہتے ہیں[1] (بعض خاص شروط جن کے نہ ہونے کی وجہ سے کسی نہ کسی پر ظلم ہو جاتا تھا) سلم کو اسلام نے جائز قرار دیا ہے۔ فقہاء اسلام نے اسلامی اصول کو پیش نظر رکھ کر بر شکل کے احکام اپنی کتابوں میں درج کئے ہیں، پھر اس لئے تاکہ خرید و فروخت کرنے والوں کو سوچنے، غور کرنے کا، دیکھنے بھالنے کا موقعہ ملے یا عیب و نقص کی وجہ سے واپسی کا امکان پیدا ہو، تجارت میں خیار[2] کا قانون بھی رکھا گیا ہے۔ الغرض ممکن سے ممکن آسانیاں جو ہو سکتی ہیں سب فراہم کر دی گئی ہیں اور قرآن میں،

احل اللہ البیع۔ تجارت کو خدا نے حلال فرمایا ہے۔

کے ذریعے گویا مذکورہ بالا صورتوں کی حلّت کا اعلان کیا گیا ہے۔ مگر دنیا میں لین دین کی ایک خاص شکل جس کا نام ربوا یا سود ہے، اور آج تک دنیا کے بڑے بڑے معاشی اس کے متعلق حیران ہیں۔ اس کے جواز و عدم جواز کی بحث تقریباً تاریخ کے نامعلوم زمانے سے چھڑی ہوئی ہے۔ اسلام نے فیصلہ کر دیا کہ اس کو قطعی طور پر حرام کر دیا جاتا ہے۔ انسانی زندگی کے معاشی پہلو کو اسلام میں کتنی اہمیت حاصل ہے اس کا اندازہ اسی سے ہو سکتا ہے کہ اسلام میں یوں تو اخلاقی اجتماعی یا طبی یا کسی اور نقطۂ نظر سے جرائم کی ایک

---

[1] البتہ اس کی چوتھی عقلی شق یعنی دام بھی نہ دیئے جائیں، اور چیز بھی نہ خریدی جائے دونوں کی دونوں ادھار ہوں عربی میں سے بیع الکالی بالکالی کہتے ہیں، یہ بیع کی ناجائز صورت ہے کہ دونوں کے نامعلوم و مجہول ہونے سے ادائیگی کے وقت بے شمار جھگڑوں کا دروازہ کھل سکتا ہے۔ صحیح حدیثوں میں اس بیع کو ناجائز قرار دیا گیا ہے ۱۲

[2] خیار یعنی اختیار، مطلب یہ کہ خریدار کو بھی اور بیچنے والوں کو بھی چند خاص شروط کے ساتھ اس کا اختیار ہے کہ معاملہ کریں یا نہ کریں۔

تفصیلی فہرست پائی جاتی ہے۔ لیکن زندگی کے معاشی پہلو کی اہمیت ہی کا یہ نتیجہ ہے کہ صرف ایک اسی معاشی جرم پر قرآن نے بجائے کسی ایک سزا کے چار چار سزاؤں کی دھمکیاں دی ہیں۔ یعنی سود خوار آسیب زدہ مخبوط کی شکل میں کھڑا ہوگا۔ اس کی دولت کا وہ حصہ جو سود کے ذریعہ سے حاصل ہوگا محق اور برباد کردیا جائے گا۔ وہ ہمیشہ جہنم میں رہے گا۔ اور آخر میں یہ کہ سود خوار کو حکم دیا گیا کہ یا وہ اس معاشی جرم سے باز آئے ورنہ اللہ اور اس کے رسول کو اعلان جنگ دیدے۔ یہ بات کہ اسلام نے تجارت کے اس طریقہ کو کیوں جرم قرار دیا ہے اس کی توجیہہ آسان نہیں ہے بلکہ سچی بات یہی ہے کہ اگر سود کی خرابیاں اتنی واضح اور جلی ہوتیں تو قرآن میں غالباً اس کا ذکر بھی نہ ہوتا یا ہوتا تو جیسے اور جرائم مثلاً چوری، ڈاکہ، فریب، جھوٹ وغیرہ کا ذکر ہے اس کا بھی اسی نوعیت سے تذکرہ کیا جاتا۔ لیکن اتنی اہمیت جو اس کو دی گئی ہے اس کی یہی وجہ معلوم ہوتی ہے کہ عوام کیا بلکہ انسانوں کے خاص عقول کی بھی رسائی اس کے دوررس نازک خطرناک نتائج تک نہیں ہوسکتی۔ ہزارہا ہزار سال سے عقلی معاشیات والے سود کے افادہ و اضرار پر بحث کر رہے ہیں لیکن آج تک کسی قطعی فیصلہ پر نہیں پہنچے ہیں۔ اسی لئے ضرورت تھی کہ اس مسئلہ میں انسان کو عقل سے بھی کسی بالاتر ذریعہ سے اس کے متعلق آخری فیصلہ واضح لفظوں میں سنادیا جاتا اور یہی قرآن نے کیا۔

حرمت سود کی وجہ تاہم اگر لا تاکلو اموالکم بالباطل اور لا تظلمون ولا تظلمون قرآن کے ان دونوں معاشی بنیادوں کو ہم سامنے رکھ لیں تو شاید کچھ اس مسئلہ کے خطرناک پہلوؤں تک ایک حد تک پہنچ سکتے ہیں مثال سے اس کو یوں واضح کیا جاسکتا ہے کہ دنیا کے سارے کاروبار لین دین میں معاملہ کے فریقین میں ہر ایک دوسرے کے لئے کچھ نہ کچھ قربانی کرتا ہے مثلاً تاجر کپڑے دیتا ہے۔ خریدار روپیہ ادا کرتا ہے کرایہ کی شکلوں میں مثلاً موٹر کے مالک کو اگر کرایہ کا روپیہ ملتا ہے تو جس وقت تک کرایہ دار اس کی موٹر کو استعمال کرتا رہتا ہے۔ موٹر کے تمام کل پرزے اپنے صفات کارکردگی کو بتدریج کھوتے رہتے ہیں۔ یا سال بھر کے بعد مکان کو جب کرایہ دار واپس کرتا ہے تو ظاہر ہے کہ مکان اور اس کے تمام عناصر و اجزا اپنی اس حیثیت پر باقی نہیں رہتے جو کرایہ دینے کے وقت ان کی تھی۔ الغرض کرایہ کی شکلوں میں بھی اگرچہ اصل چیز یعنی موٹر، مکان وغیرہ مالک کو واپس ہوجاتی ہے۔ لیکن صفات کی قربانی[۱] ان میں بھی ضرور ہوجاتی ہے۔

---

[۱] زراعت کا مطالعہ جنھوں نے سائنس اور کیمیائی معلومات کی روشنی میں نہیں کیا ہے۔ ان کو زمین کے متعلق بظاہر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اگر کوئی کھیتی کرنے کے لئے کرایہ پر کسی کی زمین لے اور چند سال اس میں کاشت کرنے کے بعد اسے واپس کردے تو جس حال میں اس نے زمین لی تھی اسی حال میں واپس کر رہا ہے، حالانکہ یہ واقعات سے جہل کا نتیجہ ہے۔ جاننے والے جانتے ہیں کہ ایک دفعہ بھی جس زمین سے پیداوار حاصل کی جاتی ہے تو اس کے بہت سے کیمیائی مفید اجزا ضائع ہوجاتے ہیں۔ اسی لئے سائنٹفک کاشت کاری میں ہر سال کھاد وغیرہ کا دینا ضروری خیال کیا جاتا ہے۔ ہندوستان کے جاہل کسان اس راز سے ناواقف ہونے کی وجہ سے (بقیہ بر صفحہ آئندہ)

اس کے مقابلہ میں جس نے بجائے موٹر کے آپ سے دو ہزار روپے قرض لئے اور دس سال بعد واپس کے تو لینے کے وقت آپ اپنے روپوں کو اسی طرح ٹھوک بجا کر لیں گے جس طرح آج سے دس سال پہلے دیے گئے تھے۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس عرصہ میں روپے کے صفات پر کہنگی اور فرسودگی طاری ہوگئی اور اس کی وجہ روپیہ کی یہ خصوصیت ہے کہ ہر روپیہ دوسرے روپیہ کی کامل طور سے قائم مقامی کرتا ہے جس کے معنیٰ یہی ہوئے کہ قرض دینے والے کی طرف سے نہ اصل مال کی قربانی ہوتی ہے اور نہ مال کے صفات کی اب اگر دس سال تک جو روپیہ آپ کا مقروض کے پاس رہا اس کے معاوضہ میں آپ ہر مہینے اس کا کرایہ اگر وصول کریں گے تو سوال یہی ہے کہ آپ کی طرف سے کیا قربانی ہوئی، نہ روپیہ کے ذات کی نہ صفات کی، خلاصہ یہ ہے کہ قرض دینے والے کا پوزیشن بغیر کسی قربانی کے بالکل محفوظ رہتا ہے۔ بخلاف لینے والے کے کہ اگر اس نے کسی ضرورت سے قرض لیا اور اس میں خرچ کر دیا تو روپیہ اور اس کا سود یا کرایہ اس طور پر دے رہا ہے کہ اس نے اس روپے سے کچھ آمدنی نہیں پیدا کی۔ اور اگر تجارت وغیرہ کے لئے لیا تو تجارت کی کامیابی ہر حال میں ضروری نہیں۔ لیکن قرض دینے والے کا روپیہ بھی اپنی ذات وصفات کے ساتھ محفوظ اور اس کی دن دونی آمدنی بھی۔ ایسا شخص جو اپنے کاروبار میں کبھی نفع اٹھاتا ہو اور کبھی نقصان کیا اس شخص کا مقابلہ کر سکتا ہے جس پر نقصان کے تمام دروازے بند ہیں اور صرف نفع اور کیسا نفع؟ اضعافاً مضاعفۃ (دوگنے چوگنے) کے حساب سے منافع کے دروازے جس پر کھلے ہوئے ہیں، کیا دونوں برابر ہو سکتے ہیں؟ جو کبھی بیمار نہیں ہوتا اس کی صحت کا مقابلہ وہ کیسے کر سکتا ہے جو کبھی اچھا اور کبھی بیمار ہوتا ہے۔ بس چند دنوں میں تو شاید نہیں لیکن اگر کسی ملک یا قوم میں ذرا زیادہ مدت تک اس قسم کی یک طرفہ گردش دولت کی جب کبھی ہوئی ہے تو دیکھا جاتا ہے کہ ملک کا ایک قلیل گروہ یعنی ایسے

(بقیہ صفحہ گذشتہ)

آج جاپان اور یورپ وامریکہ کے کسانوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ مسٹر مسانی کی کتاب "ہمارا ہندوستان" ایک بڑی دلچسپ کتاب ہے۔ اردو میں بھی عصمت اللہ بیگ صاحب نے اس کو منتقل کر دیا ہے، اسی کتاب میں "زمین کے کھاد" کے عنوان سے جو باب لکھا گیا ہے، وہ پڑھنے کے قابل ہے۔ اس میں لکھتے ہیں کہ کھاد جو ہماری زمین میں پائے جاتے ہیں جب زمین کسی خاص حصہ میں یہ خاص کھار (نائٹروجن، پوٹاشیئم، افاسفورس، لائم) کافی مقدار اور صحیح تناسب میں پائے جاتے ہیں۔ وہاں پیداوار خوب تیزی سے ہوتی اور وہ زمین زرخیز کہلاتی ہے، مگر جہاں ان میں سے چند یا سب سے تمام کھاد غائب ہوں تو ایسی زمین کو بنجر کہتے ہیں۔" آگے اسی میں ہے کہ دوسری تمام اچھی چیزوں کی طرح زمین میں بھی قدرتی کھادوں کا ذخیرہ کم وبیش محدود ہوتا ہے۔ ابتدا میں یہ کھاد خاصی مقدار میں ہوتے ہیں اور گو ان کی کمی قدرتی طور پر تھوڑی پوری ہوتی رہتی ہے۔ لیکن جب کاشت ہونے لگے تو وہ برابر کم ہوتے جاتے ہیں۔ "چنانچہ ایک ایکڑ زمین میں معمولی فصل پر تقریباً بیس پونڈ نائٹروجن سال بھر میں خرچ ہوتی ہے۔" اور یہ ایک "کھاد" نائٹروجن کا حساب ایک ایکڑ کے لئے ہے، اس پر اب دوسرے کھاروں کو قیاس کر لیجئے اسی کتاب میں ہے جتنی زیادہ مقدار میں یہ کھاد پودوں اور [illegible] جذب ہو کر نکلتا رہتا ہے اتنی ہی مقدار میں زمین کے اندر اس کی کمی ہوتی جاتی ہے۔ (ہمارا ہندوستان)

لوگ جن کی آمدنی مصارف سے زیادہ رہی ہو اور ان کے پاس قدر حاجت سے بچ کر پس انداز بھی ہوتا ہو جو عموماً ہر ملک و قوم میں تھوڑے ہوتے ہیں۔ جب یہ اپنے روپیہ کو سود کی راہ پر ڈال دیتے ہیں تو ان کے یہی روپے ملک کے اکثر افراد کے گھروں میں پہنچ پہنچ کر آہستہ آہستہ ان کی دولت کو کھینچ کھینچ کر قرض دینے والوں کی جیبوں میں پہنچا دیتے ہیں اور صدی ڈیڑھ صدی کے بعد یہ تماشا نظر آتا ہے کہ قوم کے اکثر افراد بدترین معاشی لاغری میں مبتلا ہیں اور معدودے چند گھرانوں یا شخصوں کے پاس دولت کا ورم پیدا ہوگیا ہے۔ پھر بات اسی حد پر آکر رک نہیں جاتی۔ ان دولت مندوں کے پاس اگر دولت اور سرمایہ کی قوت ہوتی ہے تو ملک کی اکثریت اپنے پاس جسمانی قوت رکھتی ہے تنگ آکر ان سود خواروں کی مالی قوت پر جسمانی قوت کا وحشیانہ حملہ ہوجاتا ہے۔ پھر اس کے بعد ہوتا ہے جو کچھ ہوتا ہے سلطنتیں تباہ ہوجاتی ہیں، امن و امان غارت ہوجاتا ہے۔ غربا بھوکے غضبناک بھیڑیوں کی طرح دولتمندوں کو چیر پھاڑ دیتے ہیں۔ تاریخ ان نتائج کو آج یورپ میں دُہرا رہی ہے یا دُہرانے والی ہے۔ اور یہ سب کس چیز کا نتیجہ ہے یہی کہ معاشی کاروبار میں اکل بالباطل (یعنی بغیر کچھ دیئے ہوئے دوسرے کے مال سے استفادہ) اور لا تظلمون ولا تظلمون کے قانون کی پابندی سے بے اعتنائی برتی گئی۔ حافظ ابن قیم اعلام الموقعین میں فرماتے ہیں،

فیربو المال علی المحتاج	محتاج (مقروض) پر مالی بار زیادتی کے
من غیر نفع یحصل لہ	ساتھ بڑھ جاتا ہے اور اس طور پر بڑھتا
ویزید من غیر نفع	ہے کہ خود اس مال کا نفع اسے نہیں ملتا
یحصل منہ لاخیہ فیاکل	اور (قرض دینے والے) سود خوار کے
مال اخیہ بالباطل۔	مال میں اضافہ اس طور پر ہوتا ہے کہ
(ص ۲۰۰)	اس سے اس کے بھائی (مقروض) کو

کچھ نفع نہیں پہنچا یہی وجہ ہے کہ (سود) میں آدمی اپنے بھائی کا مال بغیر کسی وجہ کے باطل طور پر کھاتا ہے۔

آخر سود خوار کو جب اس کا روپیہ اپنے تمام ذاتی وصفاتی کمالات کے ساتھ بجنسہ واپس ہوجاتا ہے تو بغیر کسی قربانی کے وہ غریب قرضخواہوں سے سود کا روپیہ کس بنیاد پر لے رہا ہے۔ "تمہارے رُپے کیا بچے دیتے ہیں" ارسطو کے اس قول کا بھی یہی مطلب ہے، جس ملک میں اس قسم کے لین دین کی جب کبھی قانونی اجازت دی جائے گی اور اس کے دائرے میں وسعت پیدا ہوگی تو آمدنی کے پس انداز کرنے والوں کا قلیل گروہ اگرچہ اپنے آپ کو یا اپنے خاندان کو مالی فائدہ پہنچاتا ہے لیکن وہی ملک کے اکثر افراد کو شدید معاشی ضرر پہنچا رہا ہے۔ اس قسم کے کاروبار ان ہی ممالک میں فروغ پا سکتے ہیں جن کے باشندے اپنے آپ کو صرف اپنے لئے یا اپنے خاندان ہی کے لئے سمجھتے ہوں اور اپنے شہر یا گاؤں کے دوسرے افراد سے انھیں کچھ بحث نہ ہو، آخر یہ سارا روپیہ جو ان کی پس انداز

زائد از ضرورت رقم نے بہ شکل سود ان کے گھر پہنچائی ہے وہ عموماً اسی ملک، اسی شہر، اسی گاؤں اسی محلہ کے باشندوں کی جیبوں ہی سے تو وصول ہوتی ہے جن میں وہ رہتے بستے ہیں۔ حیرت ہے کہ یورپ آج قومیت اور (نیشن نیلٹی) کے دعوے کا اپنے آپ کو ساری دنیا میں علم بردار کہتا ہے اس نے صرف یہی نہیں کیا ہے کہ چند ساہوکاروں اور پیشہ ور سود خواروں ہی کو اس کاروبار کی اجازت دے رکھی ہے بلکہ بنکنگ سسٹم کو جاری کر کے اس نے موقع فراہم کر دیا ہے اس بات کا کہ جن پس انداز کرنے والوں کو سود خواری کی فرصت نہ تھی۔ وہ بھی اب بآسانی سود خواروں کی کمیٹی میں شریک ہو کر ملک کی اکثریت کا معاشی خون چوسنے میں مشغول ہیں اور اس لئے مغربی سود خواری نے اپنے ردعمل کو دنیا پہ بہت جلد ظاہر کیا۔ یہ ایک حیثیت سے اچھا ہوا، ہلکے بخار سے تیز بخار کا ابھر کر آجانا مریض کو چونکانے کے لئے زیادہ مفید ہے۔ آج یورپ اشتراکی حیوانوں بلکہ شیطانوں کے تھپڑوں سے مضبوط ہو رہا ہے۔ سودی کاروبار کو اختیار کر کے اس نے قدرت کو جنگ کا اعلان دیا۔ چیلنج قبول کیا گیا اسی سود کے بل بوتے پر وہ جنگ لڑی جا رہی ہے جس کی نظیر نہ دنیا کی آنکھوں نے پہلے دیکھی تھی اور کون کہہ سکتا ہے کہ آئندہ دیکھے گی۔ ماہرین کا بیان ہے کہ سود پر بآسانی حکومتوں کو روپیہ قرض اگر نہ ملتا تو یومیہ کروڑہا کروڑ روپے کی رقم موجودہ جنگوں میں جو صرف ہو رہی ہے۔ اتنی رقم کی فراہمی کا قطعاً امکان نہ تھا۔ گویا آج سود ہی اعلانِ جنگ اور اس ہولناک جنگ کا ذریعہ بنا ہوا ہے جس کی نظیر انسانیت کی تاریخ میں مفقود ہے اور پھر اسی جنگ کے ذریعہ سے انسانوں کی کمائی ہوئی آمدنی دھواں بن بن کر کچھ فضائی ہواؤں میں اور کچھ جہاز، تارپیڈو، اور خدا جانے کیا کیا بن بن کر سمندر کے پانیوں میں محق و فرسودہ ہو ہو کر برباد ہو رہی ہے آئندہ زندگی میں تو جو کچھ ہوگا وہ تو اسی وقت دیکھا جائے گا۔ لیکن شہر کے جن ڈاکٹروں وکیلوں تاجروں اور ہر پیشہ ور نے سود خواری کی انجمن (بنک) میں شرکت کی تھی۔ میدانِ جنگ بلکہ اپنے اپنے محل سراؤں اور کوٹھیوں میں، بنگلوں میں برستی ہوئی آگ اور دہکتے ہوئے انگاروں پہ لوٹ رہے ہیں نہ گھر کے اندر چین ہے اور نہ گھر کے باہر جائے پناہ، خدا سے جنگ کرنے کے بعد لوگ پناہ کہاں ڈھونڈھ رہے ہیں، سود خوار کو جن جن عذابوں کی قرآن نے دھمکی دی تھی، جن کی آنکھیں ہیں وہ دیکھیں اور جن کے کان ہیں وہ سنیں اور جن کے دل ہیں وہ پچھتائیں، ان کو کہا گیا تھا کہ نہ دوسروں پہ ظلم کرو اور نہ اپنے اوپر ظلم کرو۔ لیکن انھوں نے دوسروں پہ بھی ظلم کیا اور اپنے اوپر بھی ظلم کیا وما ظلمنا ھم ولکن کانوا انفسھم یظلمون۔

اور یہ تو ربوا کی عام صورت تھی جس کے خطرناک نتائج پر اسلام سے پہلے بھی مختلف مذاہب میں تنبیہ کی گئی تھی، بلکہ بعض عقلی معاشیوں نے بھی اس معاملہ کی شدت سے مخالفت کی تھی لیکن اسلام نے صرف ربوا کی مروجہ شکل ہی کو اکبر الکبائر اور بدترین جرائم میں شریک نہیں کیا بلکہ اگر کوئی شخص کسی کو دس روپیے دے کر کچھ دن کے بعد اس معاوضہ میں بیس روپے لے اور بجائے اس کے کہ اس کو سودی قرض کا معاملہ قرار دیتا یوں کہے کہ میں نے اس دس روپیے سے تمہارے بیس روپے خریدے ہیں یا کسی تاجر نے دس روپے کے کپڑے ایک ماہ کے لئے کسی کے ہاتھ اس شرط سے ادھار بیچے کہ ایک

ماہ کے بعد دام ادا نہ کرسکا تو نہ جرا س سے یوں کہے کہ میں ایک ماہ کی مہلت اس شرط سے دیتا ہوں کہ تم بجائے دس کے بارہ ادا کرنا۔ ظاہر ہے کہ ان تمام شکلوں میں صرف لفظوں کا ہیر پھیر ہے۔ ورنہ حاصل وہی ہے جو سودی قرض کا حاصل ہے۔ اس لئے اسلام نے قرض کے سودی کاروبار کے ساتھ بیع اور خرید و فروخت کی ان شکلوں کو بھی سود اور ربوا قرار دیا۔ نیز جو حالت روپے کی ہے بجنسہٖ یہی کیفیت اور بھی چند چیزوں میں پائی جاتی ہے۔ مثلاً اگر ایک من گیہوں قرض دے کر دو مہینہ بعد کوئی شخص بجائے ایک من کے مزید ایک من گیہوں کا اضافہ کرکے دو من لیتا ہے تو اس میں اور اس شخص میں جس نے دس روپے دے کر دو مہینے بعد بیس روپے لئے کیا فرق ہے؟ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عمیق معاشی نگاہ اس دقیق نکتہ تک پہنچی اور اسی بنا پر آپ نے اعلان فرمادیا کہ سود یا ربوا صرف روپے کے لین دین ہی تک محدود نہیں ہے بلکہ ربوا کے ذیل میں اور بھی چند چیزیں شریک ہیں اور ٹھیک جیسا کہ میں نے قمار میں عرض کیا تھا کہ جن جن معاملات میں تھوڑا بہت بھی قماری رنگ پایا جاتا تھا، اسلام نے قمار کی جڑ کاٹنے کے لئے ان کی بھی ممانعت کردی، اسی طرح ربوا کی مندرجہ بالا شکلوں کے سوا جن میں دینے کے کچھ دن بعد بطور کرایہ کے زیادتی وصول کی جاتی ہے، جسے اصطلاحاً ربوالنسیٔہ (ادھار کے معاملہ کا سود) کہتے ہیں اسلام نے ان صورتوں کو بھی جن میں ادھار نہیں بلکہ نقد مثلاً ایک تولہ چاندی لے کر کوئی دو تولہ چاندی یا نقد ایک من گیہوں دے کر اس کے معاوضہ میں دو من گیہوں دے اس کو بھی ناجائز ٹھیرادیا اور مشہور صحیح حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ربوا کی ان تمام چھوٹی بڑی واضح غیر واضح شکلوں کی ممانعت فرمادی یعنی

الذھب بالذھب والفضۃ	سونے کا معاملہ سونے سے، چاندی کا
بالفضۃ والبر بالبر والشعیر	چاندی سے، گیہوں کا گیہوں سے، جو کا
بالشعیر والتمر بالتمر والملح	جو سے، کھجور کا کھجور سے، نمک کا نمک سے
بالملح مثلاً بمثل یداً بید	(ہمیشہ) برابر برابر اور اس ہاتھ لے
فمن زاد او استزاد فقد	اس ہاتھ دے (یعنی نقداً) ہونا چاہئے
اربی الاخذ والمعطی فیہ	پھر جو بڑھائے یا بڑھوائے، اس
سواء (صحاح ستہ)	نے سود (ربوا) کا معاملہ کیا لینے والا

اور دینے والا دونوں اس میں برابر ہیں۔

حدیث میں تو صرف یہی چیزیں اموال ربویہ یعنی ایسے اموال قرار دیئے گئے ہیں جن کا باہمی تبادلہ زیادتی کے ساتھ نہ ادھار جائز ہے نہ نقد خواہ یہ تبادلہ قرض کے الفاظ سے ہو یا بیع کے لفظ کے ساتھ ہو۔ بظاہر ربوا کے تحت میں ان شکلوں کو اسلام نے غالباً پہلی دفعہ داخل کیا ہے ورنہ اس سے پہلے عموماً سود اور ربوا روپیہ اور اشرفی یعنی سکہ کے سودی کاروبار ہی تک شاید محدود تھا۔ پھر بعد کو فقہاء اسلام نے اس حدیث پر غور کیا تو جو خصوصیات ان چھ چیزوں کی تھیں اور دوسری چیزوں میں بھی انھیں محسوس ہوئیں اسی لئے

انھوں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس بیان کو ایک توضیحی بیان قرار دیتے ہوئے ان چیزوں کو
بھی اموال ربویہ یا ربائی مالوں میں شریک کر دیا جن میں ان کی نگاہ میں وہی خصوصیتیں پائی جاتی ہیں، امام شافعی
اور قریب قریب امام مالک نے سونا اور چاندی کو دیکھ کر خیال کیا کہ مراد اس سے ہر وہ چیز ہے جو لین دین
میں قیمت کا کام دیتی ہے۔ اب خواہ وہ سونا چاندی ہو یا اس کے سوا کوئی اور چیز ہو، اسی طرح گیہوں،
اور جو، نمک، کھجور کو دیکھ کر ان بزرگوں نے خیال فرمایا کہ مراد ہر وہ چیز ہے جو کھانے پینے میں کام آتی
ہو یا جن سے خورد و نوش کی چیزوں کی اصلاح کی جاتی ہو جیسے نمک۔ لیکن ربائی اموال کی یہ خصوصیت
کہ اس کا ہر فرد دوسرے فرد کا قائم مقام ہوتا ہے اور ان کی یہی خصوصیت ان نتائج کی ذمہ دار
ہے جو سودی کاروبار میں پیش آتے ہیں۔ اس نکتہ پر نظر امام ابو حنیفہؒ کی پہنچی۔ انھوں نے خیال کیا کہ
یہ خصوصیت کن کن چیزوں میں پائی جا سکتی ہے، چونکہ ہر وہ چیز جس کی خرید و فروخت کیل (پیمانہ)
یا وزن (تول) کے ذریعہ سے ہوتی ہے۔ ان میں یہ خصوصیت پائی جاتی تھی اس لئے امامؒ نے بجائے
ان خاص چیزوں کے ہر اس چیز کو جو کیل (پیمانہ) یا وزن (تول) کے ذریعہ سے بکتی ہو۔ اموال ربوی قرار دیا
اور ان کے باہمی تبادلہ میں ربوا (زیادتی) کو انھوں نے ناجائز ٹھیرایا ان اجتہادی دقیقہ سنجیوں کا نتیجہ
یہ ہوا کہ وہی ربوا جو اب تک دنیا میں صرف روپے کے قرض کے کاروبار کی ایک شکل تھی اب ہزارہا
چیزوں تک پھیل گیا۔ خصوصاً حنفی مذہب جو اسلام کے تشریحی مکاتب خیال میں سب سے زیادہ محتاط
اسکول ہے اس میں تو سود کی اتنی گوناگوں شکلیں پیدا ہو گئیں کہ اب ان کا سمیٹنا دشوار ہو گیا ہے
فقہاء نے تفصیلات میں دفتر کے دفتر تیار کر دئیے ہیں لیکن اصلی بحث کا خلاصہ صرف اسی قدر ہے جو عرض
کیا گیا۔ عموماً فقہ کی کتابوں میں سود کے مباحث کو دیکھ دیکھ کر لوگوں کو تعجب ہوتا ہے کہ عوام جسے
سود کہتے ہیں، اس کا تو اس میں گویا ذکر ہی نہیں ہے حتیٰ کہ اسی بنا پر عوام ہی کو نہیں بلکہ بعض اچھے
اچھے پڑھے لکھوں تک کو پچھلے دنوں یہ مغالطہ ہو گیا کہ اسلام نے جس سود کو حرام کیا ہے وہ قرض والا
موجودہ سود نہیں ہے بلکہ بیع اور خرید و فروخت کی چند نادر شکلیں تھیں جو ایام جاہلیت میں مروج
تھیں اور ان ہی کا ذکر فقہ کی کتابوں میں کیا گیا۔ مگر ظاہر ہے کہ اسلام نے اس سود کو اگر منع نہیں کیا تو پھر
اس نے منع کس چیز کو کیا۔ آخر یہ اس نے مذاہب بدھ مت، عیسائیت حتیٰ کہ ہندو مت تک میں جس سود کو حرام
یا گوہ کھانے کے برابر قرار دیا گیا ہے یا ارسطو نے جس سود کے متعلق یہ رائے دی تھی کہ تمہارے روپے
بچے نہیں دیتے یہ قرض والا سود نہیں ہے تو اور کیا ہے۔ کتنے تعجب کی بات ہے کہ جس "معاشی سرطان"
کی تشخیص ارسطو تک کی عقل نے کر لی تھی اسی کے متعلق کہا جائے کہ اسلام کی نگاہ معاشیات کے اس
زہریلے گھاؤ پر نہ پڑی اور پڑی بھی تو کس چیز پر جس کا نہ اب دنیا میں رواج ہے اور نہ کسی کو ان کا تجربہ ہے خیر یہ تو
ایک ضمنی بات تھی بھلا ایسے لوگوں سے کون بحث کر سکتا ہے جو قرآن کے خنزیر کو عرب کا
کوئی چوہا اور قرآن کے خمر کو عرب کے کسی درخت کا خاص رس قرار دے کر واقعی جو خنزیر و خمر
ہے اس کی حلت کا فتویٰ دیدیں۔

بہ حال فقہائے اسلام کی ان احتیاطی موشگافیوں کی وجہ سے ایک دقت اور یہ پیدا ہوئی کہ ربوا کے بعض مسائل جن کا ذکر وہ اپنی کتابوں میں کرتے ہیں، بظاہر عجیب معلوم ہوتے ہیں مثلاً اس مسئلہ کی بنا پر کہ سونے کا سونے سے، چاندی کا چاندی سے تبادلہ کسی شکل میں ہو جید ہو یا ردی، زیور کی شکل میں ہو یا سکہ کی، بہر حال جب ان کا تبادلہ کیا جائے تو دونوں کو وزناً برابر ہونا چاہیئے۔ سوال ہوتا ہے کہ چاندی کے کسی زیور یا برتن کو کوئی ایک ہی تولہ چاندی کے معاوضہ کیوں دینے لگا گویا زرگر کی کاریگری اور برتن بنانے کی محنت کی اسلام میں کوئی قیمت نہیں اسی طرح سوال ہوتا ہے کہ سونے چاندی کے تبادلہ میں یہ قید لگادی گئی ہے کہ لینے اور دینے والے کے ہاتھ میں دونوں بہ یک وقت آئیں ورنہ خالی ہاتھ والے کے مقابلہ میں بھرے ہاتھ والا گویا ایک قسم کی زیادتی یا ربوا کا مستحق ہورہا ہے خواہ یہ زیادتی غیر محسوس اور غیر مادی ہی کیوں نہ ہو، اس قسم کی بعض اور حیرت انگیز صورتیں بھی فقہ میں پیدا ہوگئی ہیں۔ پہلے مسئلہ کے متعلق تو حنفی فقہاء بیچارے یہ کہہ کر چپ ہو جاتے ہیں کہ واقعہ تو یہی ہے کہ ایک تولہ چاندی کا زیور ایک ہی تولہ چاندی کے معاوضہ میں کوئی نہ دے گا۔ لیکن ہم کیا کریں مذہب کا حکم یہی ہے، پس حکم کی تعمیل کرنے والے کو چاہئے کہ ایسی صورتوں میں چاندی کے زیور کو سونے کے سکوں سے اور سونے کے زیورات کو چاندی کے سکوں سے خریدے۔ لیکن حنبلی فقہاء نے ایک صورت یہ نکالی کہ زیور بیچنے والے سے خریدار یوں کہے کہ تمہارے زیور کی چاندی جو ایک تولہ ہے اس کے معاوضہ میں تو میں یہ ایک تولہ کا سکہ دیتا ہوں باقی زیور کی گھڑائی کی اجرت مثلاً ایک روپیہ الگ دیتا ہوں وہ کہتے ہیں کہ اگر معاملہ یوں کیا جائے تو درست ہو جائے گا۔

مقدسی لکھتے ہیں۔

ان قال الصائغ صغ لی خاتما وزنه درهم واعطيك مثل وزنه واجرتك درهما فليس هذا بيع درهم بدرهمين قال اصحابنا للصائغ اخذ الدرهمين احدهما فی مقابلة الخاتم والثانی اجرة له

(۱۳۰-المغنی ج ۴)

اگر سنار سے (زیور کا خریدار) یوں کہے کہ میرے لئے ایک انگوٹھی بنادو جس کا وزن ایک درہم کے مساوی ہو، اور میں تمہیں اس چاندی کے معاوضہ میں اس قدر چاندی دیتا ہوں (یعنی ایک درہم دیتا ہوں) اور تمہاری مزدوری ایک دام الگ ہوئی تو یہ ایک درہم کو دو درہم سے بیچنا نہ قرار پائے گا۔ ہمارے بزرگوں (فقہاء حنابلہ) فرماتے ہیں کہ سنار کے لئے ان دو درہموں کا لینا جائز ہوگا۔ جن میں ایک درہم تو انگوٹھی کے مقابلہ میں ہوگا اور دوسرا درہم سنار کی مزدوری ہوگی۔

لیکن سچی بات ہے کہ ربوا کے باب میں اس قسم کے بعض مسائل کا جو ذکر کر دیا جاتا ہے جن میں بظاہر علمی دشواریاں نظر آتی ہیں ان کی ایک وجہ تو یہی ہے کہ اسلام چونکہ قطعی طور پر بوا کی بنیاد انسانی معاشیات سے اکھاڑ کر نکال دینا چاہتا ہے اس لئے جہاں کہیں اس کی باریک رگ اور ریشے نظر آتے ہیں انھیں بھی فوراً نوچ کر پھینک دیتا ہے اور ایک ایسے خطرناک مہلک معاشی جرثومہ کے نکالنے کے لئے مسلمانوں کو اگر کچھ عملی دشواریاں پیش آجاتی ہیں تو چاہیئے کہ اپنے نقطۂ نظر کے استحکام کے لئے اسے بخوشی برداشت کر لیا جائے۔ کچھ مذہب ہی کے راہ میں نہیں بلکہ زندگی کے دوسرے پہلوؤں میں بھی اپنے آئیڈیل کی حفاظت کے لئے لوگ اس سے بھی زیادہ دشواریاں خندہ جبینی کے ساتھ برداشت کرتے ہیں۔

ماسوا اس کے ایک قصہ اور بھی ہے کہ اس قسم کے مسائل کا تعلق اگر ایک طرف ربوا سے ہے تو اسی کے ساتھ اسلام کے بعض دوسرے اصول بھی ان پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ چونکہ ان مسائل کا عموماً ذکر ربوا ہی کے باب میں کیا جاتا ہے۔ اس لئے لوگ صرف اسی نقطۂ نظر سے ان کو دیکھتے ہیں لیکن اگر ان کے سامنے ان مؤثرات کو بھی واضح کر دیا جائے تو شاید دشواری جتنی محسوس کی جاتی ہے وہ باقی نہ رہے۔

مثلاً یہی سونے چاندی کے ظروف اور زیورات وغیرہ کے خرید و فروخت کا مسئلہ ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مساوات اور تقابض (یعنی دست بدست) لینے کی دونوں قیدوں نے ان کی خرید و فروخت میں ضرور دشواری پیدا کر دی ہے۔ لیکن یہ دشواری اس میں کیوں پیدا کی گئی کیا صرف ربوا سے بچنے کیلئے؟ بظاہر یہی خیال کیا جاتا ہے لیکن کاش اسی کے ساتھ لوگوں کو اسلام کے اس نقطۂ نظر کا بھی علم ہوتا جو سونے چاندی کے ظروف اور زیورات کے متعلق وہ رکھتا ہے دنیا نے پہلے سمجھا ہو یا نہ سمجھا ہو، لیکن اب تو یہ مسئلہ تقریباً بداہت کے درجہ کو پہنچا ہوا ہے کہ سونا اور چاندی جو بنی آدم کا ایک بین الاقوامی پیمانۂ قیمت ہے ان کو مالی مبادلات کا واسطہ بنانے کی جگہ مقصود بالذات بنا کر زیوروں اور برتنوں کی شکل میں مقید کر دینا ملک کی معاشی ارتقاء میں بدترین سنگ راہ کو حائل کرنا ہے۔ ایک ہندوستانی معاشی اپنے مفلس ملک کا نوحہ ان الفاظ میں کرتا ہے۔

> "ہندوستان کی قدامت پسندی اور جہالت بھی اس ملک کی غربت کی بہت کافی حد تک ذمہ دار ہے۔ ہندوستان میں جس قدر بھی دولت موجود ہے اس ملک کے باشندے اس کا صحیح استعمال نہیں جانتے ان کی دولت یا تو زیورات کی شکل میں ان کی عورتوں کے گلے کا ہار بن گئی ہے یا دفینوں کی صورت میں زمین کے نیچے پڑی ہوئی ہے۔"

پھر اس غریب ملک میں "زیور" اور "ظروف" نے معاشی آب حیات کے اس بحر رواں کو جس مقدار میں منجمد کر کے بیکار کر دیا ہے اس کی رپورٹ دیتے ہیں۔

"اندازہ لگایا گیا ہے کہ تقریباً ۴۸ روپے فی کس اس وقت ہندوستان
میں بالکل بیکار موجود ہیں"

جس ملک میں فی کس تین پیسے بھی آمدنی کا اوسط مشکل سے ہے اس ملک پر اس معاشی فالج کا کیسا سخت اور شدید ترین حملہ ہے کہ فی کس ۴۸ روپے زیوروں اور برتنوں یا دفینوں کی شکل میں اس طرح قید ہوا کہ

این طرفہ تماشا بیں لب تشنہ بہ آب اندر

کا تماشا پیش کر رہے ہیں وہی بیچارا معاشی لکھتا ہے۔

"ہمارے ملک والوں کو ابھی معلوم ہی نہیں ہوا کہ دولت کا صحیح مصرف اسے کاروبار میں لگانا ہے۔ انھیں خبر ہی نہیں کہ دوسرے ملک ہم سے کس قدر آگے بڑھ چکے ہیں کیونکہ وہ اپنا ایک پیسہ تک بیکار رکھنا گناہ سمجھتے ہیں۔ ان کے پاس جو رقم بھی ضروریات پوری ہونے کے بعد بچتی ہے اسے سرمایہ کی صورت میں اپنے کاروبار میں لگا دیتے ہیں اس کے برعکس ہمارے بھائیوں کے پاس جب کبھی ایک آدھ پیسہ بچ جاتا ہے تو اس کا زیور بنوا کر اپنی عورتوں اور بچوں کو اس میں جکڑ دیتے ہیں"

گویا سونے چاندی کو زیورات یا برتنوں وغیرہ کی شکل میں مقید کرنا ملک کی دولت کو بیکار کرنا ہے اور معاشی مذہب میں ایک پیسہ تک کو بیکار رکھنا گناہ ہے۔ جس کے معنی یہی ہوئے کہ سونے چاندی کی ایک رتی کا بھی زیور یا ظروف وغیرہ کی شکل میں رکھنا معاشی نقطۂ نظر سے ملک اور قوم کا جرم ہے۔ لیکن دنیا کے معاشیوں کو تو شاید اس کا علم اب ہوا ہے۔ مگر دینی معاشیات کے پیغمبر اعظم صلی اللہ علیہ وسلم آج سے ساڑھے تیرہ صدی پہلے یہ اعلان فرما چکے تھے۔

لا تشربوا فی اٰنیۃ الذھب والفضۃ ولا تاکلوا فی صحافھا (صحاح ستہ)	سونے چاندی کے برتنوں میں نہ پانی پیا کرو، اور نہ ان کے بادیوں میں کھانا کھایا کرو۔

صرف ممانعت ہی پر کفایت نہیں فرمائی گئی بلکہ ملک کے اس معاشی مجرم کے متعلق یہاں تک ارشاد ہوا

الذی یاکل ویشرب فی اٰنیۃ الفضۃ انما یجرجر فی بطنہ نار جہنم۔ (بخاری)	چاندی کے برتن میں جو کھاتا پیتا ہے جہنم کی آگ ہی اس کے پیٹ میں وہ گھونٹے گا۔

اور اسی لئے بالاتفاق تمام فقہائے اسلام کا اس پر اتفاق ہے کہ سونے چاندی کے برتن کا استعمال ہر مسلمان مرد و عورت کے لئے حرام ہے اور جو حکم ظروف کا ہے مردوں کی حد تک قریب قریب یہی حکم زیورات کا بھی ہے۔ یعنی بجز خاتم (انگوٹھی) کے کہ اس کے متعلق فقہاء کا کچھ اختلاف ہے۔ ہر قسم کے زیور سونے کے ہوں یا چاندی کے مردوں پر حرام ہیں اور گو عورتوں کے خاص جذبات کے

لحاظ سے ان کو ایک گونہ اجازت دی گئی ہے لیکن رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس باب میں جو ارشادات ہیں اور مختلف اوقات میں آپ نے عورتوں کے زیور کے متعلق جو طرزِ عمل اختیار کیا ہے اس سے منشاء مبارک یہی معلوم ہوتا ہے کہ عورتیں بھی ملک کے اس سرمایہ کو اپنے گلے کا طوق یا ہاتھوں کی بیڑیاں نہ بنائیں تو بہتر تھا۔

یالیت امتی لم تحل الذھب	کاش! میری امت بھی (اور یہ عورت)
(مسند احمد)	سونے کا زیور نہ پہنتی۔

یہ آپ کی مشہور حدیث ہے جس میں مردوں ہی کے متعلق نہیں بلکہ امتی جس میں عورتیں بھی داخل ہیں، تمنا کی گئی ہے کہ سونے کا زیور استعمال نہ کریں تو اچھا تھا۔ قطع نظر اس روایت کے جس میں یہ ہے کہ ام عطیہ سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عورتوں کے لئے سونے کے زیور کی اجازت چاہی گئی تو

فابی علینا۔	حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے انکار کیا۔

ایک اور عورت نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سونے کے مختلف زیوروں کا نام لے لے کر پوچھنا شروع کیا کہ کیا اس کی اجازت ہو سکتی ہے؟ لیکن ہر ایک کے جواب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم "نار" (آگ کا زیور) ہی فرماتے رہے۔ عورت پھر بھی عورت تھیں فطری جذبہ پر اتنی سخت چوٹ برداشت نہ ہو سکی اور بولیں،

ان المرءۃ اذا لم تتزین	عورت جب اپنے شوہر کے لئے بناؤ سنگار
لزوجھا صلفت عندہ۔	نہیں کرتی تو اس کی نگاہوں سے اتر جاتی ہے

لیکن اس پر بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان بیوی صاحبہ کو جو جواب دیا تھا وہ یہ تھا۔

ما یمنع احدا کن ان تصنع	تم عورتوں کو کس چیز نے اس سے
قرطین من فضۃ ثم	روکا ہے کہ چاندی کی دو بالیاں اپنے
تصفر بزعفران او	کان میں ڈالیں اور ان کو زعفران یا
بعبیر۔	عبیر سے رنگ دیں (تاکہ سونے کی
	زردی کی جھلک پیدا ہو جائے۔

اور یہ حال تو سونے کے زیورات کا ہے چاندی کے زیوروں پر اگرچہ عام عورتوں کے متعلق زیادہ سختی نہیں فرمائی گئی۔ لیکن آپ کے منشاء مبارک کا اظہار اس مشہور واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ حضرت فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا جیسی چہیتی بیٹی کے گھر میں بھی آپ نے چاندی کے زیوروں کا رکھنا بھی پسند نہ فرمایا اور حضرت ثوبان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو حکم دیا کہ

یا ثوبان اشتر لفاطمۃ قلادۃ من	ثوبان! فاطمہ کے لئے تم پٹھوں کا ایک ہار اور
عصب وسوارین من عاج	فیل دنداں کے دو کنگن خرید کر لے آؤ۔

بہر حال اگرچہ فقہائے اسلام نے قانونی طور پر طلائی و نقرئی زیورات کی حرمت کو صرف مردوں تک محدود رکھا ہے لیکن بجائے قانون کے اگر مسلمان اپنے پیغمبر کے منشاء اور آرزو کی پیروی کرنے پر آمادہ ہوجاتے تو عورتوں سے بھی زیور کا قصہ تمام ہوجاتا مگر افسوس ایسا نہیں ہوا۔ تاہم اسلام نے صراحۃً عورتوں کے لئے اگرسونے چاندی کے زیور کو ممنوع نہیں کیا ہے۔ لیکن سونے چاندی سے سکہ کے سوا جو چیزیں بھی بنائی جاتی ہیں خواہ وہ زیور ہوں یا برتن ہوں یا کچھ اور ہوں ان کے خرید و فروخت کی شکلوں میں ایسی دشواریاں پیدا کر دی ہیں کہ اسلامی نظام معیشت رکھنے والی قوم میں آسانی کے ساتھ ان کا چلن نہیں ہو سکتا۔ مندرجۂ بالا چند فقہی صورتیں جن میں قیمتی سے قیمتی زیور کی نازک ترین حُسن کاریاں بالکل بے قیمت ہوجاتی ہیں جس کا حاصل بالآخر یہی ہوسکتا ہے کہ اس قسم کی چیزوں کا پہننا ہی رُک جائے گا اور یہی اسلام کا مقصود ہے۔ پس اصل یہ ہے کہ یہ دشواریاں جو بظاہر صرف (یعنی سونے چاندی کے تبادلہ) میں نظر آتی ہیں وہ پیدا ہوئی نہیں ہیں بلکہ میرے خیال میں قصداً پیدا کی گئی ہیں۔ جس کی بنا ربوا سے زیادہ معاشی رگوں کے اس خونِ حیات کے انجماد پر ہے اور گو بظاہر نظر میں دشواریاں ہیں۔ لیکن غور کیا جائے تو ان ہی دشواریوں میں درحقیقت عظیم الشان معاشی آسانیاں پوشیدہ ہیں۔ اسی طرح ربوا کی بعض دوسری شکلوں میں بھی جو کچھ پیچیدگی محسوس ہوتی ہے اس کا تعلق بھی ربوا سے زیادہ اسلامی تعلقات کے دوسرے ابواب سے ہے اگر ان مسائل پر غور کرتے ہوئے ان ابواب کو بھی پیش نظر رکھ لیا جائے تو پھر کوئی پیچیدگی باقی نہیں رہتی۔ مثلاً اسی سلسلہ کا ایک مسئلہ یہ ہے کہ کسی شخص کے پاس باریک چاول ایک من ہیں، وہ موٹے چاولوں کے دو من سے اسے بدلنا چاہتا ہے لیکن وہی برابر ہونا چاہیئے کہ حکم کے تحت وہ مجبور ہے کہ ایک من باریک چاول کے عوض میں ایک ہی من موٹے چاول لے۔ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ایسا کون شخص ہوگا جو اپنا ایک من باریک چاول دے کر خواہ مخواہ کسی سے موٹے چاول ایک من لے گا اسی قسم کی ایک صورت کھجور کے متعلق رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں جب پیش آئی تو آپ نے حکم دیا کہ بجائے بدلنے کے یہ کرنا چاہیئے کہ ادنیٰ قسم کے کھجور بیچ دیئے جائیں اور پھر اس کے پیسے سے عمدہ کھجور خرید لیا جائے۔ بظاہر اس میں بھی ایک طول عمل نظر آتا ہے۔ لیکن اگر ایک ہی جنس کی دو درجہ کی چیزوں کا باہمی تبادلہ بزیادتی کی اجازت دے دی جاتی تو پھر دو چاندیوں تک میں آدمی فرق با سانی نکال سکتا ہے کہ میری چاندی چونکہ اعلیٰ درجہ کی تھی اس لئے ایک تولہ سے دو تولہ لینے میں کیا حرج ہے بلکہ شاید دوربیوں میں بھی حیلہ جو چاہیں گے تو اسی قسم کی نمبر اندازی کر سکتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی لئے ایک جنس کی دو چیزوں میں نمبر کے فرق کو سود کے معاملہ میں ناقابلِ لحاظ قرار دیا اور صاف لفظوں میں اعلان کر دیا گیا کہ

جیدھا و ردیھا سواءٌ	ان کی عمدہ اور ردی قسمیں دونوں
(بخاری)	برابر ہیں۔

جس سے یہ غرض نہیں ہے کہ واقع میں ان چیزوں کے اقسام میں مدارج کا تفاوت نہیں ہوتا بلکہ مقصد یہ ہے کہ اگر اس فرق کی بنا پر زیادتی کی اجازت دیدی جائے گی تو لوگوں کے لئے سودخواری کی راہ کھل جائے گی اور اسلام اس کے چھوٹے سے چھوٹے سوراخ کو سخت ترین ڈاٹوں سے بند کرنا چاہتا ہے۔ رہا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ مشورہ

بع التمر بیعا آخر ثم اشتریہ۔	کھجور (جو ادنیٰ قسم کا ہو، اسے بیچ دو، پھر اس کی قیمت سے اچھے کھجور خریدو۔

اس میں اگرچہ بظاہر ایک گونہ دشواری ضرور ہے۔ لیکن جہاں تک میرا ذاتی خیال ہے اس میں ضمناً معاشیات کے ایک خاص پہلو کی طرف بھی لوگوں کی توجہ دلائی جا رہی تھی میرا مطلب یہ ہے کہ عموماً ایسے ممالک جن کا تمدن وحضارت سے زیادہ تعلق نہیں ہوتا ان میں چیزوں کو بجائے سکوں سے خریدنے کے چیز ہی سے چیز کے لین دین کا دستور عموماً جاری رہتا ہے۔ ابن قیم کا بیان ہے۔

لاسیما اہل العمود والبوادی فانما یتناقلون الطعام بالطعام۔ (اعلام صفحہ ۲۰۲ جلد ۱)	خصوصاً خیمہ میں رہنے والے اور صحرائی باشندے وسے لوگ غلہ کو عموماً غلوں سے بدلتے ہیں۔

اسلام سے پہلے عربوں میں بھی عام طور پر چیز ہی سے چیز خریدنے یعنی بطریقہ BARTER یا فقہ کی اصطلاح میں "مقائضہ" کا دستور تھا اسلام ان ذرائع سے بتدریج اس رواج کو بھی گھٹانا چاہتا تھا۔ علماء معاشیات جانتے ہیں کہ معاشی ارتقاء میں تبادلہ EXCHANGE کے اس طریقہ کے بدل دینے میں کتنا دخل ہے۔

چاندی کا مبادلہ چاندی سے اور سونے کا مبادلہ سونے سے برابر برابر ہو۔ اس معاشی نظریہ کا جہاں انسداد ربوا اور دولت کے انجماد سے تعلق ہے میرا یہ بھی خیال ہے کہ اس سے ایک اور بات بھی مقصود تھی جس کی طرف افسوس ہے کہ دنیا نے اب تک توجہ نہیں کی ہے۔

مقصد یہ ہے کہ حکومتوں کے مختلف سکوں میں عدم مساوات کی وجہ سے بٹاون کا جو دستور پایا جاتا ہے، مثلاً حکومت آصفیہ کے سکہ سے اگر کوئی انگریزی سکہ کو خریدنا چاہے تو سو روپے انگریزی کے معاوضہ میں سولہ روپے مزید علاوہ سو روپے کے دینے پڑتے ہیں، اور بٹاون کا یہ بھاؤ ایک حال پر بھی باقی نہیں رہتا، کبھی کبھی بجائے سولہ روپے کے سترہ سترہ اٹھارہ اٹھارہ روپے تک زیادہ دینے پڑتے ہیں۔ کبھی گھٹ کر بٹاون کا یہ قصہ پندرہ اور چودہ روپے تک اتر آتا ہے جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ بٹاون کی زیادتی اور کمی کا مدار صرف اس چاندی یا سونے کی کمی اور زیادتی پر مبنی نہیں ہے جو دو مختلف حکومتوں کے دو مختلف سکوں میں پائے جاتے ہیں۔ جہاں تک مجھے معلوم ہوا ہے دو حکومتوں کے ایسے دو سکے جن کی چاندی اور جن کا سونا برابر ہوتا ہے۔ مختلف اسباب کے زیر اثر ان میں بھی ایکسچینج (تبادلہ) کے وقت بسا اوقات بٹاون ادا کرنا پڑتا ہے۔ ایک حکومت کے قلمرو سے دوسری حکومت کے قلمرو میں آمد و رفت رکھنے والوں کو بھی اور تجارتی کاروبار کرنے والوں کو بھی بٹ

ان جھگڑوں کی وجہ سے شدید نقصانات اٹھانے پڑتے ہیں بلکہ ایک ہی حکومت کے ایسے دو علاقے جہاں دو مختلف قسم کے سکے مروج ہیں وہاں بھی تبادلہ اور ایکسچینج کی یہ دشواریاں پائی جاتی ہیں۔ مدت ہوئی یعنی ۱۹۲۵ء میں مصر کے مشہور علمی مجلہ الہلال (عربی) نے فروری کی اشاعت میں ایک مضمون شائع کیا تھا۔ مضمون نگار نے جینوا کی مرحوم لیگ آف نیشن (انجمن اقوام) کے امکانات کو پیش نظر رکھ کر یہ تجویز پیش کی تھی کہ

یمکن ایجاد اتفاق لتوحید النقد الاساسی عند الامم۔	یعنی (انجمن اقوام) کی وجہ سے اس کا امکان پیدا ہو گیا ہے کہ کوئی ایسا اساسی اور بنیادی سکہ ایجاد کیا جائے جس پر دنیا

کی قوموں کا اتفاق ہو جائے اور سارے جہاں کے باشندے اس پر متحد ہو جائیں۔

آگے چل کر اس کا مشورہ دیتے ہوئے کہ امریکہ کے ڈالر کو اس میں سکہ مان لیا جائے اسی نے لکھا تھا کہ

لکی یمنع التلاعب من حیث العیار یجب ان یسک الدولار سکۃ واحدۃ فی مصنع واحد حتی یبقی عیارہ واحدا عند الامم۔	سکوں کے معیاری اختلافات کی وجہ سے جو کھیل کھیلے جا رہے ہیں اس کے انسداد کی یہی شکل ہے کہ ڈالر کو ایک ہی سکہ جو ایک ہی ٹکسال میں ڈھالا جائے بنا دیا جائے تاکہ دنیا کی ساری قوموں

میں ایک ہی معیار کے سکہ کا چلن ہو جائے۔

اسی مضمون میں یہ بھی ہے کہ آج مختلف ممالک اور حکومتوں کے مختلف معیار والے سکوں کی وجہ سے حال یہ ہے کہ

الایدری ما فی الغد	قطعاً نہیں بتایا جا سکتا کہ کل کیا ہوگا،

یعنی بازار میں کس ملک کے سکہ کا بھاؤ کل کیا باقی رہے گا اس کا جاننا بہت دشوار ہے۔

مثال سے یوں سمجھایا ہے کہ

قد یشتری الیوم احدا السلع فرنسا و یحسب حال الفرنک والدولار فیجد انہ قد ربح الا انہ لم یشترھا من امریکا مثلا فلا یکاد یمضی علی تاریخ شرائہ اسبوع حتی یحسب حسابہ ثانیا و یجد انہ اخطاء کل الخطاء لاعتقادہ	یعنی ایک شخص کوئی مال فرانس میں مول لیتا ہے اور فرانک (سکہ فرانس) ڈالر (سکہ امریکہ) دونوں کا حساب کر کے خیال کرتا ہے کہ وہ نفع میں رہے گا کیونکہ مال اس نے امریکہ میں نہیں خریدا ہے، لیکن ایک ہفتہ بھی اس مال کی خریداری پر گذرنے نہیں پاتا کہ اب جو دوسری دفعہ حساب کرتا ہے تو پتہ چلتا ہے کہ

علی السوق الفرنسیہ بدلا
من الامریکہ۔

اس نے سخت غلطی کی کہ بجائے امریکی بازار کے فرانسیسی بازار پر اس نے اعتماد کیا۔

بہرحال سکوں کے اس اختلاف کی وجہ سے دنیا جن مصائب کو بھگت رہی ہے اس کا علاج جیسا کہ مضمون نگار نے لکھا ہے اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ تمام سکوں کا وزن و معیار سب ایک کر دیا جائے اپنی اس تجویز کا نام اس نے "نظریۂ توحید نقد اساسی" رکھا ہے، آخر میں مضمون کو ختم کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ "نقد اساسی کی توحید" کے نظریہ پر اگر اقوام عالم کا اتفاق ہو جائے تو،

وحدت فی العالم طریقۃ
التعامل وتسہلت بذلک
التجارۃ وزوال کثیر
من الخسائر التی یتحملہا
التجار وسائر الناس فی
غش السماسرۃ فی تحویل
النقود وشرائہا وبیعہا۔

دنیا میں لین دین اور کاروبار کا طریقہ عالم میں ایک ہو جائے گا اور اس کی وجہ سے تجارت میں بڑی آسانیاں پیدا ہو جائیں گی اور بہت سے سارے خسارے جو بیچارے تاجروں کو صرافہ کے دلالوں کی وجہ سے برداشت کرنے پڑتے ہیں یعنی سکوں کے ادل بدل اور ہیر اکسچیج میں جو فنی فریب چال اور دھوکہ دیتے ہیں اس سے دنیا محفوظ ہو جائے گی۔

کیا یہ سارا مشورہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ مبارک الذہب بالذہب والفضۃ بالفضۃ سواء بسواء مثلاً بمثل کا ترجمہ نہیں ہے تفصیل کے لئے دیکھئے الہلال مصر ماہ فروری ۱۹۲۵ء۔

اس کے سوا بھی سکوں کے اکسچیج سے فائدہ اٹھا کر موجودہ زمانے میں حاکم اقوام نے محکوم قوموں کے ساتھ جو مظالم جنگ عظیم کے بعد تلافی مافات کے لئے توڑے تھے ہندوستان کے بیوپاریوں اور ساہوکاروں سے درد کے اس افسانہ کی داستان سننی چاہیئے لاکھ دو لاکھ نہیں صرف اکسچیج کے مغالطے نے کروڑوں بلکہ مبالغہ نہ ہوگا اربوں کا وارا نیارا کیا ہے، جن کی تفصیلات شاید علماء معاشیات بتا سکتے ہیں۔

حالانکہ بنی آدم کے تمام افراد ایک ہی آفتاب، ایک ہی ہوا، ایک ہی پانی ایک ہی مٹی سے نفع اٹھانے میں مشترک ہیں اسی طرح چاندی سونے سے استفادہ کے حق کو بھی اگر عالمگیر کر دیا جائے تو اس میں دنیا کا کیا بگڑتا ہے۔ حکومتوں کا اپنے اپنے سکوں پر مخصوص علامات کی نمائش کے جذبہ کی اگر تسکین بھی مقصود ہو حالانکہ بجز ایک وہمی ہوسناکی کے شاید چنداں مادی نفع اس کا کیا ہے لیکن یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ ہر حکومت اپنے امتیازی نشان کو سکوں میں قائم رکھتے ہوئے ان کے اوزان اور جو کھوٹ ملایا جاتا ہے اس کو مساوی کر دے کسی زمانہ میں یہ تجویز اگرچہ ناقابل عمل نظر آتی ہو تو شاید اس کے کچھ اسباب بھی تھے لیکن اب جبکہ زمین کی طنابوں کو قدرتی قوانین کے چند نئے انکشافات نے کچھ [illegible] اس طرح ملا دیا ہے کہ اب ایک ملک ہی نہیں بلکہ کرۂ زمین کے تمام ممالک تقریباً ایک بستی یا زیادہ سے زیادہ

ایک بڑے شہر کی صورت اختیار کر چکے ہیں۔ رات کو جو واقعہ واشنگٹن میں پیش آتا ہے صبح ہوتے ہوتے
حیدرآباد میں اس کی خبر گھر گھر پھیل جاتی ہے۔ اور اب تو بات اس سے بھی کہیں آگے بڑھ گئی ہے
جو جو مہینے میں جو راستہ آج سے سو سال پہلے طے ہوتا تھا کل پندرہ گھنٹوں کا فاصلہ بن کر رہ گیا ہے
گویا ایسی صورت میں ملکوں کے ہم وزن ہونے پر اگر حکومتیں بین الاقوامی معاہدہ کے طور پر اتفاق
کر لیں تو گویا اس کے یہ معنی ہوئے کہ کسی شہر کے چند میر محلوں یا شہر کے محلے کے چند میر دل نے
کسی مسئلہ پر اتفاق کر لیا ہے۔ مواصلات کے موجودہ ذرائع سے جب دنیا محروم تھی پیغمبر صلوٰۃ اللہ
علیہ نے جب اس وقت یہ تجویز دنیا میں پیش فرمائی تو اس وقت تو اس تجویز کو عملی لباس پہنانا
پہلے کی نسبت سے آسان بلکہ آسان تر ہو چکا ہے۔ لیکن ہیومنٹی (عام انسانیت) کی خدمت آدمی کا
سب سے بڑا فریضہ ہے یا اسی قسم کے بلند بانگ دعووں کے بلند کرنے والوں کی زبانوں پر جو کچھ ہے
کاش وہ دلوں میں بھی ہوتا۔ ہونے کو سب کے سب کہتے ہیں۔ لیکن سب کو جو اپنے لئے سمجھتے ہیں
ان کے فی سدا تزاحم کیسے پورے ہو سکتے ہیں۔ جب ایکسچینج کے مغالطہ دینے کی یہ چال ان کے ہاتھوں
سے چھین جانے کی۔ ان کا فائدہ تو اسی میں ہے، اسی راہ سے تو ان بڑی مچھلیوں کو چھوٹی مچھلیوں
کے نگلنے کا موقع مل رہا ہے۔ اور ان بڑے درختوں کو چھوٹے پودوں کے چبانے کی آسانیاں
فراہم ہو رہی ہیں۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے جو دوسروں کے بھی اسی طرح پیغمبر ہیں جیسے ہمارے
بنے ہیں، انھوں نے انسانیت کی عام فلاح و بہبود کی ایک تجویز پیش کر دی ہے۔ آدم کے بچوں
میں ہمت ہو تو وہ اس تجویز کو مان کر ایکسچینج کے گرداب سے اپنے آپ کو اور اپنے ساتھ ساری
نسل انسانی کو نجات دلا سکتے ہیں، ولعل اللہ یحدث بعد ذلک امرا۔

شغل اصل

اب اس مسئلہ میں ایک آخری بات یہ رہ جاتی ہے کہ اسلام نے سودی کاروبار کو
جب اپنے معاشیاتی نظام سے قطعاً خارج کر دیا ہے تو سوال ہوتا ہے کہ ملک کے جن افراد کے
مصارف سے آمدنی کی جو رقم پس انداز ہو جاتی ہے۔ آخر وہ اس کا صحیح استعمال کیا پیدا کریں۔ ماسوا
اس کے یہ بھی مسلم ہے کہ جس طرح موجودہ زمانہ کی قارونی مصرف والی کیمیائی اور سائنسی جنگوں کی
ذمہ داری اگر ان سہولتوں پر عائد ہوتی ہے جو سود کی وجہ سے فراہمی سرمایہ میں پیدا ہو گئی ہیں تو اسی
کے ساتھ اس کا بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ آج دنیا کی ساری صنعتی ترقیاں جو کبیر پیمانے کی
پیداوار پر مبنی ہیں، بہت کچھ ان ہی آمدنیوں کی رہین منت ہیں جو سود کی بدولت آج دنیا کو
حاصل ہیں۔ سودی کاروبار کو یک قلم بند کرنے کے یہ معنیٰ ہیں کہ ساری میکانیکی اور صنعتی چہل پہل کا
بازار یکایک سرد پڑ جائے اور دنیا پھر اس عہد تاریک کی طرف واپس ہو جائے جس میں بجائے
بجلی کے قمقموں کے مٹی کا دیا اور بجائے طیاروں اور سیاروں کے بیل کی گاڑیوں پر آدمی
اسفار طے کرتا تھا۔

بلاشبہ یہ دونوں سوالات قابل غور ہیں۔ اگر اسلام کا معاشی نظام رائج یا نافذ ہوتا تو

بآسانی کہہ دیا جا سکتا تھا کہ باسی بچانے کی ضرورت ہی کیا ہے جو کتوں کے کھانے کی فکر کرنا پڑے. لیکن مصارف کے پس انداز کرنے کا اصول ہی غلط ہے. یا دنیا کو ریل و موٹر، برق و گیس ہی کی کیا، جت اور بعض جو گیانہ فطرتوں کو یہ کہتے ہوئے پایا بھی گیا ہے۔

مگر جیسا کہ میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں اور آئندہ دخل کے مرف یا خرچ کا باب جب آئے گا اس میں بھی بتایا جائے گا کہ یہ اسلامی نقطۂ نظر سے انحراف ہو گا. حقوق و مطالبات کے ادا کرنے کے بعد اسلام مال کے جمع کرنے یا رقم کے پس انداز کرنے کا مخالف نہیں ہے. بلکہ آئندہ معلوم ہو گا کہ وہ ایک حد تک اس کا ایک معاشی مشیر ہے۔ اسی طرح اسلام کی غلط ترجمانی ہو گی. اگر کائناتی اشیاء اور قدرت کے نت نئے قوانین سے استفادہ کے متعلق یہ ثابت کیا جائے کہ اسلام اس کی حوصلہ افزائی نہیں کرتا جس دین کے پیغمبر نے غیر قوموں کی ایک سائنس کو یعنی جنگی ضرورت کے لئے (خندق کھودنے کو) اپنی اور اپنے اصحاب کی سنت قرار دی ہے، جس نے منجنیق اور دبابوں کے استعمال کو عرب میں مروج کیا ہو، بجائے بے سلی لنگی (ازار) کے ایران کے سراویل (پائجامہ) کو پسند کیا ہو اور جس نے کفن اور قبر تک میں حُسن کاری کی تعلیم دی ہو، اُس کو جدید صنعتی ترقیوں کا مخالف آخر کس بنا پر قرار دیا جا سکتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ربوا کے حرام کرنے والے اسلام کے پیشِ نظر یہ دونوں سوالات تھے. اور جہاں تک میں خیال کرتا ہوں ان دونوں کا جواب اسلامی معاشیات میں موجود ہے. مطلب یہ ہے کہ اپنے مصارف سے بچے ہوئے یا بچائے ہوئے سرمایہ کو جو لوگ سود پر چلاتے ہیں عموماً وہ یہی تو کرتے ہیں کہ اپنا سرمایہ کسی دوسرے کے حوالہ کر دیتے ہیں اور اس طور پر حوالہ کرتے ہیں کہ اس سرمایہ کے منافع میں تو وہ اپنے کو شریک رکھتے ہیں، لیکن نقصان کے تمام پہلوؤں سے اپنے آپ کو محفوظ کر لیتے ہیں بلکہ جیسا کہ بیان کر چکا ہوں کہ ان کا سرمایہ بھی جوں کا توں اپنی تمام ذاتی وصفی خصوصیات کے ساتھ محفوظ رہتا ہے اور جنہیں یہ سرمایہ حوالہ کیا جاتا ہے ان کو نفع ہو یا نقصان اس سے بالکل بے تعلق ہو کر اپنے مشروط منافع کو بھی قانون کے زور سے اتنے استوار اور مضبوط طریقہ سے اس طرح پر جکڑے رہتے ہیں کہ ان کے نفع کا ایک پیسہ بھی اپنی جگہ سے ہل نہیں سکتا بلکہ سود در سود کی شکلوں میں تو صرف اصل سرمایہ کے منافع ہی نہیں بلکہ اس کے نفع کا بھی بڑھتا پیسہ اور ہر پیسہ روپیہ روپیہ اشرفیاں مسلسل بغیر کسی انقطاع کے بنتا چلا جاتا ہے، جن کے حیرت انگیز ریاضیاتی نتائج پر دنیا نے اکثر سر دھنا ہے۔ سو سو روپے کے معاوضہ میں بذریعہ سود در سود بعض اوقات لاکھ لاکھ روپے تک لوگوں نے وصول کئے ہیں. عدالتی رپورٹوں میں اس کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔

سوچنے کی بات ہے کہ ایک ہی ملک ایک ہی قوم بلکہ ایک ہی شہر میں بلکہ بسا اوقات ایک ہی محلہ اور ایک ہی گھرانے کے چند افراد کے مصارف سے بچی ہوئی رقم کی حفاظت کا قانون اتنا زبردست انتظام کرتا ہے کہ صرف اصل رقم ہی نہیں بلکہ اس رقم کے منافع اور منافع کے منافع بھی

توپ و تفنگ کے بھروسہ پر اتنی کڑی نگرانی رکھی جائے، لیکن اسی ملک اسی قوم اسی شہر اسی محلہ میں اسی گھرانے کے جس آدمی نے اس رقم کو ضرورت میں لگایا شب و روز کی مسلسل محنتوں سے اس کے ذریعہ سے کچھ نفع حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اس غریب کو یہی قانون اتنا لاوارث اور بے کسی کے حال میں چھوڑ دیتا ہے کہ خواہ اس پر آسمان ٹوٹے، پہاڑ گرے، کچھ بھی گذر جائے۔ لیکن اصل رقم کے ایک ایک پیسہ اور اس کے منافع در منافع در منافع کے ایک ایک چھدام کا اسے ذمہ دار ٹھہرایا جاتا ہے کہ جہاں سے ہو جس طرح سے ہو اپنے مصارف سے جن لوگوں نے یہ زائد رقم پس انداز کی تھی ان تک دام دام پہنچاتا چلا جائے۔

دنیا کے قانون نے اگر اس ظالمانہ بے جا طرفداری کو جائز رکھا ہو تو ظلم کو اس دنیا میں ہر ظلم کے اختیار کرنے کا اقتدار حاصل ہے، لیکن اسلام سے اس یک طرفہ، یک چشمی، جنبہ داری کی توقع فضول ہے۔ اس لئے اس نے اس راہ کو تو مسدود کر دیا، لیکن اسی کے ساتھ اپنے مصارف سے ملک کے جو باشندے کچھ سرمایہ پس انداز کر سکتے ہیں، ان کے لئے اگر محض اس راہ سے اپنے سرمایہ سے استفادہ کے طریقہ کو اس نے قانوناً جرم اور ظلم قرار دیا ہے تو کون کہتا ہے کہ پھر اس سرمایہ کے استعمال اور اس استعمال سے استفادہ کی کوئی دوسری صورت بھی باقی نہیں رہی اسلامی معاشیات کے نظام نامہ کو پڑھیے اور دیکھئے۔ اس نے ایک نہیں بلکہ بیسوں راہیں اور کھول دی ہیں جن کے ذریعہ سے اس پس انداز سرمایہ کو آمدنی کا ذریعہ بنایا جا سکتا ہے۔ شرکت ہی کے ایک باب کو فقہ میں اٹھا کر دیکھئے تو ایک نہیں، متعدد شکلیں مختلف حالات کے لحاظ سے فقہاء نے بتائی ہیں کہ ایک یا ایک سے زائد آدمیوں کے ساتھ شریک ہو کر اس سرمایہ کو مختلف کاروبار میں لگایا جا سکتا ہے۔ شرکتِ عنان، شرکتِ مفاوضہ، شرکتِ وجوہ، شرکتِ تقبل، ان کے سوا بھی اور شکلیں ہیں جن میں اپنی اپنی سہولتوں کا اندازہ کر کے آدمی اس پس انداز سرمایہ کو لگا سکتا ہے، شرکت ہی کی ایک شکل مضاربت یا قراض ہے، یعنی ملک کے بے سرمایہ افراد کو سرمایہ دار لوگ سرمایہ دے کر کاروبار کرائیں اور باہم منافع کو تقسیم کر لیا کریں، سرمایہ دار کو سرمایہ کا، اور بے سرمایہ والے شریک کو محنت کا نفع ملے گا، چونکہ یہ فقہ کے مطول ابواب ہیں، اس لئے تفصیل کا یہاں موقعہ نہیں ہے، لیکن قدر مشترک ان تمام معاملات میں وہی بات ہے کہ جب سرمایہ لگانے والے منافع میں شریک ہیں تو نقصان میں بھی ان کو شریک رہنا پڑے گا، اور چونکہ شرکت کا معاملہ بھی ایک سے زیادہ آدمی کر سکتے ہیں، اسی طرح ہو سکتا ہے کہ کوئی بے سرمایہ آدمی ایک سے زائد سرمایہ داروں سے سرمایہ لے کر کاروبار کر سکتا ہے، جس کے قیود و شروط فقہ کی کتابوں میں تفصیلاً موجود ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں پیمانۂ کبیر کی پیداواروں کی بھی کافی گنجائش نکل آتی ہے، اس ذریعہ سے بڑے سے بڑا سرمایہ جمع کیا جا سکتا ہے اور بڑے سے بڑے کاروبار کا امکان ہے اور مسلمانوں میں ہمیشہ سے بڑی بڑی تجارتوں اور صنعتوں میں یہ معاملات کروڑہا کروڑ روپے کے سرمایہ سے جاری تھے جن کے متعلق

تاریخ سے بڑا مواد فراہم کیا جا سکتا ہے[ل]۔ پس یہ کہنا کہ سود کے روک دینے سے ملک کے پس انداز سرمایہ سے استفادہ کی کوئی دوسری صورت باقی نہیں رہتی یا پیدائش پر پیمانۂ کبیر کے امکانات کا دروازہ مسدود ہو جاتا ہے، قطعاً غلط ہے۔

ماسوا اس کے ملک کی ایسی ضرورتیں جن کی تکمیل پیدائش بر پیمانۂ کبیر ہی کے ذریعہ سے ہو سکتی ہے۔ اس کے متعلق اسلام نے خود حکومت کو بھی متوجہ کیا ہے کہ رعایا کی سہولت کے لئے اس قسم کے کاموں کو خود حکومت اپنے ہاتھ میں لے اور بیت المال کی مد خراج و عشر وغیرہ سے ان کی پابجائی کی جائے، مثلاً دریاؤں سے نہروں کا نکالنا۔ سڑکوں کا بنانا، پُل باندھنا وغیرہ جس کا ذکر حکومت کی آمدنی کے سلسلے میں آئے گا۔

بہرحال پس انداز سرمایہ سے جو مادی نفع اٹھانا چاہتا ہے اس کے لئے تو اسی مرتبۂ بالا صورتیں رکھی گئی ہیں، لیکن ایسے لوگ جن کے نزدیک نفع صرف وہی نہیں ہے جو مادی شکل میں اسی زندگی میں آدمی کو مل جائے۔ بلکہ ان کی نگاہیں بلند ہیں اور اس زندگی کے سوا زندگی کے دوسرے اطوار و ادوار میں جو نفع آدمی کو پہنچ سکتا ہے۔ اسے بھی وہ نفع ہی سمجھتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ سوائے حکومت کی دوسری رعایا سے نہیں تو مسلمانوں کے ہر فرد سے تو یقیناً اسی کی توقع کرنی چاہئیے، ایسے لوگوں کے لئے پس انداز سرمایہ کے استعمال کی اسلام نے ایک اور صورت بھی نکالی ہے۔

یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ اپنے اس سرمایہ کو خیرات کر دیں اور لوگوں میں اس پس انداز سرمایہ کو بانٹ دیں، یہ تو خیر ایک عام شکل ہے اور اس کے لئے کسی خاص مشورے کی کیا حاجت ہو، بلکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ایسے اقوال جو کبھی کبھی آپ نے ارشاد فرمائے ہیں کہ

یاتی احدکم بجمیع ما یملک	تم میں کا ایک آدمی وہ سب کچھ جس کا
فیقول ھذہ صدقۃ ثم	وہ مالک ہے لے کر آتا ہے اور کہتا ہے
یقعد یستکف الناس۔	کہ یہ صدقہ ہے اس کے بعد بیٹھ جاتا ہے
(ابوداؤد)	اور لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلاتا ہے۔

اس میں تو مصارف سے بچے ہوئے کل سرمایہ کے خیرات کر دینے کی مخالفت فرمائی گئی ہے۔ اس بنا پر لئے خیرات کرنے کے سوا ایک اور صورت ایسی نکالی ہے کہ مصارف سے بچا ہوا سرمایہ لوگوں کا محفوظ بھی رہ جائے اور چاہیں تو باوجود اس کے اس سے زندگی کے دوسرے مقامات و حالات میں بھی اٹھا سکتے ہیں۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ لوگوں کا عام خیال یہی ہے کہ جس طرح خرید و فروخت کرایہ، اجارہ وغیرہ یہ سارے کاروبار دنیاوی معاملات ہیں اور ان کا شمار خیرات و صدقات کے ذیل میں نہیں کیا جاتا۔ اسی طرح سمجھا جاتا ہے کہ قرض کا لین دین بھی ایک خالص دنیوی کاروبار ہے اس لئے قرض دینے والے کو جب کہا جاتا ہے کہ تم اس پر سود نہ لو تو وہ یہی پوچھتے ہیں آخر اس روپیے پر مجھے نفع کیا ملا جیسا کہ میں نے عموماً عرض کرتا ہوں کہ قرض کے کاروبار ...

[ل] امام ابوحنیفہ [illegible]

دینے والے کی طرف سے کسی قسم کی کوئی قربانی نہیں ہوتی، اتنی بھی نہیں جو ایک جفلہ (اگہ) ہکالنے والے کی طرف سے کرایہ پر چڑھنے والوں کی راہ میں ہوتی ہے کہ جتنی دیر بھی اس کا اکہ چلتا ہے اس عرصہ میں اس کے پہیئے پرزوں کے صفات کی وہ حالت باقی نہیں رہتی جو چلنے سے پیشتر تھی اگر ایسا نہ ہوتا تو پھر دنیا میں کبھی کوئی اکہ پرانا ہوتا اور نہ خراب ہوتا۔ یقیناً مسلسل ان ہی مخفی فرسودگیوں چندسال کے بعد آخر میں یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ اکے کی عمر ختم ہو جاتی ہے۔

مگر قرض کا روپیہ اگر دس سال بعد بھی واپس ہو تو اسی حال میں واپس ہوتا ہے جس حال میں دیا گیا تھا اور روپیہ کی اس خصوصیت کو وہ لوگ بھی سمجھتے ہیں جو کسی نہ کسی طرح جواز سود کے لئے اور اس کو ظلم کے دائرہ سے نکالنے کے لئے کوشاں ہیں۔ دماغوں پر بہت زیادہ زور دینے کے بعد ان لوگوں نے ایک مفہوم پیدا کیا ہے جس کی تعبیر یہ انتظار کشی کے لفظ سے کرتے ہیں، یعنی بغیر موجودہ خواہشوں کے ملتوی کئے، زمانہ آئندہ کے لئے کوئی اپنی آمدنی سے پس انداز نہیں کر سکتا ہے۔ اب اگر آئندہ زمانے میں بھی اس غریب کو کچھ نفع اس پس اندازدالی رقم سے نہ ملا تو اتنے دن تک جو اپنی خواہش کے سینہ پر اس نے پتھر رکھا، اور انتظار کرتا رہا اس کا صلہ اس کو کیا ملا گویا التوائے خواہش اور آئندہ کے توقعات کے انتظار کی جو زحمت اس کو ہوئی، یہی سود کی قیمت ہے۔ مادی منافع کی ٹوہ میں عمریں بسر کرنے والوں کی طرف سے سود کی یہ سراسر غیرمادی اور جذباتی مبہم، مجہول قیمت پیش کرنی خود ان کے دعویٰ کی انتہائی کمزوری کی دلیل ہے لیکن اگر واقعی انتظار کشی کوئی چیز ہے اور اسی کی قیمت قرض دینے والا سود کی شکل میں چاہتا ہے تو اسلام نے اس قیمت کی پابجائی کا نظم کیا ہے کہ قرض جو اب تک ایک خالص دنیوی اور مادی کاروبار سمجھا جاتا تھا، دنیوی معاملات سے اس کو نکال کر قرآن نے نیکی اور تبرع، خیر و خیرات کی طویل فہرست کی کوئی معمولی چیز نہیں، بلکہ اہم ترین جزو کی حیثیت سے شریک کر دیا۔ شاید آسمانی کتابوں میں قرآن ہی ایک ایسی دینی کتاب ہے جو

من ذا الذی یقرض اللہ قرضاً حسنا — وہ کون ہے جو خدا کو اچھا قرض دیتا ہے

کی آواز سے گونج رہی ہے، معارف سے رقم بچانے والوں کے سامنے قرض خواہوں کو ہٹا کر خود حق تعالیٰ جل مجدہٗ نے اپنے کو لا کر کھڑا کر دیا اور اعلان عام کر دیا گیا کہ انتظار کشی کی اجرت طلب کرنے والوں کو اجرت دینے کے لئے خود ان کا مالک

فیضاعفہ اضعافاً کثیرا — اللہ تعالیٰ اس انتظار کشی کے صلہ میں، دونا دوں منافع اسے عطا فرمائے گا۔

کے وثیقہ کے ساتھ موجود ہے۔ قرآن نے خیرات کی یہ ایک نئی قسم نکالی کہ خیرات میں دی جانے والی رقم با لکلیہ محفوظ رہتے ہوئے بھی اس پر خیرات کے منافع کی توقع کی جا سکتی ہے اور توقع کیا جب قرضداروں کی طرف سے "دونا دوں" منافع کا اعلان خود خدا کر رہا ہے تو اب اس سے زیادہ یقینی

ربح اور نفع کی ضمانت اور کیا دی جا سکتی ہے۔ اسلام کی یہ ایک عجیب معاشی دقیقہ سنجی ہے کہ قرض کو اس نے صرف خیرات اور نیکی کی مد ہی میں شامل نہیں کیا ہے بلکہ قرآن کی مذکورہ بالا آیت جس کا ذکر اس کتاب میں ایک سے زیادہ جگہ میں کیا گیا ہے۔ اس کے سوا حدیثوں میں اس کی تصریح بھی آتی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا

رأیت لیلة اسری بی علی باب	جس رات میں مجھے معراج ہوئی میں نے
الجنة مکتوبا الصدقة بعشر	جنت کے دروازے پر یہ لکھا ہوا دیکھا
امثالها والقرض ثمانیة عشر۔	کہ صدقہ کا بدلہ دس گنا اور قرض کا
(ابن ماجہ)	اٹھارہ گنا ملے گا۔

اسی بنا پر بعض صحابہؓ فرمایا کرتے

لأن اقرض دینارین ثم	میں دو دینار قرض میں دوں، پھر مجھے
یردان ثم اقرضهما احب	واپس مل جائیں اور میں اسے پھر قرض میں
الی من ان اتصدق بهما	دوں، یہ مجھے اس سے زیادہ پسند ہے کہ
(مغنی)	میں ان دونوں کو خیرات کر دوں۔

صرف یہی نہیں کہ صدقہ کو قرض سے افضل قرار دیا گیا ہے، بلکہ اس سے بھی عجیب تر یہ ہے کہ خیرات میں جو ایک پہلو اس کا تھا جس کا سوال کی بحث میں ذکر گذر چکا ہے یعنی خیرات لینے اور بھیک پر زندگی گذارنے کی اسلام نے مذمت کی ہے۔ لیکن قرض کو باوجود خیرات کی مد میں شمار کرنے کے خیرات کے اس مکروہ پہلو سے اس کو مستثنیٰ کر دیا گیا ہے اور اس طور پر مستثنیٰ کیا گیا ہے کہ صرف زبان سے نہیں بلکہ کائنات کی افضل ترین ہستی جس نے خود اپنے لئے اور قیامت تک آنے والی اپنی نسل کے لئے صدقہ کو حرام فرما دیا ہے، اسی ذاتِ مبارک نے خود عمل کر کے اس میں بے عزتی یا کراہت کا جو اندیشہ تھا اس کو مٹا دیا۔ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے،

لیس القرض بسیئة وذلک لان	قرض لینا یہ بھیک مانگنا نہیں ہے اور اس
النبی صلی الله علیه وسلم کان	کی وجہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
یستقرض ولو کان مکروها کان	خود قرض لیا کرتے تھے۔ اگر قرض لینا مکروہ
ابعد الناس منه۔	ہوتا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات
(مغنی صفحہ ۳۵۲)	سب سے زیادہ اس سے دور رہتی۔

خلاصہ یہ ہے کہ مصارف سے بچا کر ملک میں جن لوگوں کے پاس پس انداز سرمایہ ہے۔ اگر وہ اس سے مادی نفع اٹھانا چاہتے ہیں تو نفع کے ساتھ نقصان میں بھی اپنے کو شریک کر کے وہ ایسا کر سکتے ہیں اور اسلام میں اس کی متعدد راہیں کھلی ہوئی ہیں اور اگر نقصان میں شریک ہونے سے ڈرتے ہیں تو ان کے سرمائے کو محفوظ کر کے انتظار کشی کے صلہ میں اسلام نے بجائے مادی نفع کے خیراتی منافع کے

کمانے کا وسیع میدان فراہم کر دیا ہے۔ قومیت اور وطنیت کے نشہ میں سرشاری کا ادعا رکھتے ہوئے جو یہ کہتے ہیں کہ اپنی انتہائی کشی کا صلہ غیر مادی منافع کی صورت میں لینے پر کتنے آدمی تیار ہو سکتے ہیں بالکل عجیب ہے۔ آخر جو رقم ضروریات سے بچ گئی ہے، ظاہر ہے کہ یہ خود دلیل ہے کہ تمہاری ضرورت سے زیادہ تھی، ورنہ بچتی کیسے۔ اپنی خواہشوں کو ملتوی کر کے پس انداز کرنا اولاً یہ ہمیشہ ضروری نہیں۔ دنیا میں ایسے دولتمندوں کی کمی نہیں ہے جن کے پاس ہر قسم کی خواہشوں کی تکمیل کے بعد بھی لاکھوں اور کروڑوں کی رقم آمدنی سے پس انداز ہو جاتی ہے، ماسوا اس کے اگر خواہشوں کو ملتوی کر کے جو پس انداز کرتے ہیں تو عموماً یہ (NASASARY) ضروری خواہش قطعاً نہیں ہوتیں۔ بلکہ (تعیشات) کی خواہشوں تک یہ التوا محدود ہو سکتا ہے اور یہ کوئی بڑا کام نہیں ہے، بہر حال کسی وجہ سے بھی ہو، اگر کسی کے پاس ضرورت سے زیادہ رقم بچ گئی ہو تو اس میں اس کا کیا بگڑتا ہے کہ اپنے ملک اور اپنی قوم کے ضرورت مندوں کو دیکر یا بلے کاروں کو کاروبار میں لگا کر اپنی رقم جوں کی توں واپس بھی لے لے اور اس حُسنِ سلوک کا خُدا کے یہاں سے صلہ کی امید اس دُنیا میں یا آئندہ زندگی میں کرے۔ آخر سوال ہوتا ہے کہ قرض نہیں بلکہ مطلق خیرات اور چیرٹی میں جو لوگ آج بھی اور ہر زمانہ، ہر ملک میں لاکھوں کروڑوں کی رقم دے ڈالتے ہیں، ان کا تو سرمایہ اور سرمایہ کے منافع ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ان کے ہاتھ سے جاتے رہتے ہیں، آخر وہ کس بات کی توقع پر ایسا کرتے ہیں، لیکن جب ان ہی لوگوں کو بجائے خیرات کے سو دو سو روپے غیر سودی قرض دینے کے لئے کہا جاتا ہے تو پوچھتے ہیں کہ میرا کیا نفع ہوگا۔ خیرات جس میں نفع ہی نہیں اصل سرمایہ بھی چلا گیا۔ اس میں تو سوال نفع کا نہیں پیدا ہوتا لیکن غیر سودی قرض میں اس سوال کو اٹھانا اس متناقض ذہنیت کا آخر کیا جواب ہو سکتا ہے۔ میرا تو خیال ہے کہ یہ محض ایک رواجی بات ہے۔ خیرات میں روپے کے لینے دینے کا چونکہ رواج ہے اس لئے لاکھوں اور کروڑوں کے دینے سے بھی لوگ دریغ نہیں کرتے۔ لیکن غیر سودی قرض کے لین دین کا خیرات سمجھ کر چونکہ عام طور سے رواج نہیں ہے، اس لئے دس بیس پر بھی لوگ مادی نفع تلاش کرنے لگتے ہیں۔ خصوصاً جن ممالک میں (نیشن نیٹی) اور قومیت و وطنیت کا صور پھونکا جاتا ہے اُن کے منہ پر تو یہ سوال کسی طرح نہیں پھبتا۔

الحاصل اسلامی معاشیات سے سودی کاروبار کو خارج کر دینے کے بعد ملک کے پس انداز سرمایہ کے استعمال اور دنیوی و دینی منافع کے حاصل کرنے کی راہیں بے روک ٹوک کھلی ہوئی ہیں اور جس طرح لین دین کے سلسلۂ سود اور سود کی مختلف چھوٹی بڑی شکلوں کو روک کر اسلام نے ملک کی اکثریت کو سرمایہ داروں کے ظلم سے نجات عطا کی ہے۔

اسی طرح لین دین کے دوسرے ابواب میں بھی جہاں معاشی مظالم نظر آئے ان کے سدِ باب کی بھی اس نے کوشش کی ہے۔ ظلم و فریب، دھوکہ، جھگڑے رگڑے کا انسداد اس نے صرف کلی قوانین ہی کے ذریعہ سے نہیں کیا ہے بلکہ بعض اہم جزئی شکلوں کو بھی قانون کی

بندش میں لاکر ان کی جڑ کاٹ دی ہے، میرا مضمون تنا طویل ہوتا جا رہا ہے کہ اب سب کا تفصیلی ذکر ناممکن ہے اس لئے مختصر اشارے کرتا ہوا اس سلسلہ کو ختم کرتا ہوں۔

حکومت اور قیمتیں | "معاشیات" کا مشہور مسئلہ ہے کہ قیمتوں کے اتار چڑھاؤ کی بنیاد طلب و رسد کی باہمی مناسبتوں پر مبنی ہے۔ طلب اور رسد میں ایک نسبت تو وہ پیدا ہوتی ہے جس میں بجائے قدرتی ذرائع کے بعض لوگوں کے اختیار کو دخل ہوتا ہے۔ مثلاً حکومتیں درآمد اور برآمد پر ڈیوٹی سے قیمت کے معیار کو گھٹاتی اور بڑھاتی رہتی ہیں، اور دوسری صورت وہ ہوتی ہے جس میں قدرتی عوامل زیادہ اثر انداز ہوتے ہیں، جہاں تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال اور عمل سے معلوم ہوتا ہے۔ آپ اس کو ناپسند کرتے تھے کہ قیمت کے مسئلہ کو اختیاری تصرفات سے متاثر کیا جائے۔ آپ سے ایک دفعہ درخواست کی گئی کہ چیزوں کا بھاؤ حکومت کی جانب سے مقرر فرما دیا جائے۔ لیکن جواب میں ارشاد ہوا

ان اللّٰه هو المسعر هو القابض	بھاؤ کا مقرر کرنے والا اللہ تعالیٰ ہے
الباسط الرزاق انی لارجو ان	وہی تنگی پیدا کرتا ہے اور وہی کشادگی۔
القی اللّٰه تعالیٰ ولیس احد	روزی پہنچانے والا ہے، میں امید ہوں
یطلبنی بظلامة فی دم ولا مال	حق تعالیٰ سے ملوں اور مجھ سے کسی کا مطالبہ
(ترمذی)	خون اور مال کے مظالم کا نہ ہو۔

جس سے معلوم ہوا کہ قیمت کے مسئلہ میں حکومت کی دراندازیوں کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ظلم قرار دیا خواہ یہ ظلم پبلک پر ہو یا تاجروں پر۔ اور حکومتوں کا پنجہ تو آہنی پنجہ ہوتا ہے، اس لئے ان کی زبردستیوں کے نتائج تو بہت سنگین ہوتے ہیں۔ لیکن ملک کے عام باشندوں تک کو آنحضرت صلی اللہ علیہ نے اس کی اجازت نہیں دی ہے کہ "بازار" کے مسئلہ کو اور قیمت کے معیار کو اپنے ہاتھ میں لیں۔ عرب میں دستور تھا کہ مال لے کر جو قافلہ اونٹوں کا کسی بازار کی طرف آتا تو چند لوگ جو پہلے سے اس کی ٹوہ میں رہتے خبر پاتے ہی سو دو سو میل آگے نکل کر مال پر قبضہ کر لیتے اور تاجروں سے کچھ بات طے کر لیتے یا جیسے اس زمانے میں کسی بازار کی "سول ایجنسی" کوئی لے لیتا ہے، یہ شکل اختیار کرتے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمان دیا کہ

لا تلقوا الرکبان ولا یبیع	شتر سواروں کے قافلے کو آگے نکل کر
حاضر لباد۔	کوئی ان سے نہ ملا کرے اور باہر کے

تاجر سے بازار کا کوئی آدمی بیع کا معاملہ نہ کرے

پھر اس فرمان کی غرض بھی بیان کر دی گئی۔

دعوا الناس یرزق اللّٰه	لوگوں کو چھوڑ دو، یوں ہی اللہ تعالیٰ بعض کو
بعضهم ببعض۔	بعض سے روزی پہنچاتا ہے۔

منشائے مبارک ان تمام ہدایتوں سے یہی تھا کہ تجارتی کاروبار میں لوگوں کو آزاد چھوڑ دیا جائے اور اس میں دخل اندازی کر کے خواہ مخواہ قیمتوں کے مسئلہ کو قبل از وقت ہاتھ میں نہ لیا جائے یہاں تک کہ جیسا کہ بخاری کی اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے

نہی ان تتلقی السلع حتی یہبط بہا الاسواق۔ | تجارتی سامان پر آگے بڑھ کر قبضہ کرنے سے حضورؐ نے منع فرمایا تاکہ مال منڈی میں گر نہ جائے۔

کہاں یہ حکم کہ منڈی میں گرنے سے پہلے کوئی تجارتی مال کے متعلق کسی قسم کی کارروائی نہ کرے کہ بازار میں گرنے کے بعد ہی طلب اور رسد کا قدرتی تناسب واضح ہو سکتا ہے اور کہاں یہ حال ہے کہ موجودہ زمانے کی حکومتیں درآمد و برآمد دونوں پر من مانے طور پر جس قسم کے تصرفات چاہتی ہیں کرتی ہیں اور غریب پبلک کچھ نہیں بول سکتی۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ جو چیزیں بغیر ان قیود کے محض تجارتی اصول پر جس قیمت پر بکتیں۔ اس سے سو سو گنا قیمت لوگوں کو ادا کرنی پڑتی ہے۔ اور صبر کئے غیظ و غصہ کے ساتھ لوگ ادا کرتے ہیں۔

اسی سلسلہ میں "احتکار" کا مسئلہ بھی ہے یعنی غلہ وغیرہ کو اس لئے روک لینا تاکہ جب اکثر تاجروں کا مال ختم ہو جائے گا اور صرف میرے پاس یا متعدد چند آدمیوں کے پاس رہ جائے گا تو من مانگے داموں پر بیچیں گے۔

احتکار کے متعلق متعدد حدیثیں پائی جاتی ہیں جن میں اس کی ممانعت کی گئی ہے مثلاً

نہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان یحتکر الطعام (صحیح) | آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے روکا ہے کہ غلہ کا کوئی احتکار کرے۔

فقہائے اسلام نے عموماً اس حکم کو صرف غذائی مواد تک محدود رکھا ہے اگرچہ بعضوں نے اور چیزوں کو بھی اس میں شامل کیا ہے نیز مختلف دوسرے قرائن اور روایات سے ہر حال میں اس فعل کو ممنوع نہیں قرار دیا گیا ہے۔ لیکن اس سے اتنا تو معلوم ہوا کہ فروشندہ کا کسی چیز پر اس طرح قبضہ کر لینا کہ گاہکوں کو "مقابلہ" کی وجہ سے جو فائدہ پہنچ سکتا تھا وہ نہ پہنچے۔ اسلام اس کو کچھ اچھی نگاہ سے نہیں دیکھتا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے بدنیت لوگوں کے متعلق ایسی پیشین گوئیاں فرمائی ہیں کہ شاید دنیا میں بھی ان کو اس عمل کی پاداش بھگتنی پڑے گی۔ کہتے ہیں حضرت عمرؓ نے ایک شخص کو احتکار سے منع کیا، لیکن وہ نہ مانا، حضرت عمرؓ نے کہہ دیا تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے آدمی کے متعلق جذام اور افلاس کا خطرہ ظاہر فرمایا ہے۔

راوی کا بیان ہے کہ اس احتکار کرنے والے کو

رأیتہ مجذوما۔ (مغنی) | میں نے دیکھا کہ وہ کوڑھی ہو گیا ہے۔

تجارتی مسلک ان جزئیات کے نقل کرنے سے میری غرض یہ ہے کہ تجارت کے متعلق اسلام کا

نقطۂ نظر معلوم ہو، اوراس کا اندازہ صرف

دعوا الناس یرزق اللہ بعضہم بعض — لوگوں کو چھوڑ دو تاکہ اللہ تعالیٰ بعض لوگوں سے بعض کو روزی پہنچاتا ہے۔

سے ہوسکتا ہے کہ اسلام آزاد تجارت کا حامی ہے، جس کا جہاں جی چاہے ایک ملک سے دوسرے ملک میں، ایک شہر سے دوسرے شہر میں، دیہات سے شہروں میں، شہروں سے دیہاتوں میں مال لے جائے، نہ باشندوں کو اس میں خلل اندازی کر کے "بھاؤ" کے طبعی معیار کو پست و بلند کرنا چاہئے اور نہ حکومت کو اس باب میں خواہ مخواہ دخل دے کر رعایا پر زندگی تنگ کرنی چاہئے۔

باقی درآمد برآمد پر جو کروڑگیری 'چنگی' لی جاتی ہے؛ اگرچہ اس زمانے میں اس کو ملک کے معاشی حالات کے "توازن" کا جو ذریعہ بنایا گیا ہے اور اس ذریعہ سے قوی ممالک ضعیف ممالک پر ظلم کر رہے ہیں، اسلام کو اس سے کوئی تعلق نہیں۔ البتہ کروڑگیری کا محصول اموالِ تجارت میں اسلام میں بھی لیا جاتا ہے، لیکن وہ حکومت کا ایک ٹیکس ہے، یعنی مسلمانوں سے تو زکوٰۃ لی جاتی ہے اور اسی مصرف میں صرف ہوتی ہے جس مصرف کے لئے زکوٰۃ وصول کی جاتی ہے۔ یوں ہی اسلامی حکومت کی دوسری رعایا بھی اس کو بطور محصول ہی ادا کرتی ہے اور اس لئے ادا کرتی ہے تاکہ جان و مال کی حفاظت کے مصارف کی پابجائی ہو ان تمام مسائل کی تفصیل حکومت کی آمدنی کے باب میں آئے گی۔ البتہ غیر ممالک کے تاجروں سے جو کروڑگیری لی جاتی ہے اس کی بنیاد بھی دوسری ہے۔ اسلام کا حکم ہے کہ جس ملک کے لوگ اسلامی حکومت کی رعایا کے اموالِ تجارت پر کوئی محصول نہ لیں گے ان سے اسلامی حکومت بھی کچھ نہ لے گی۔ ہدایہ میں ہے

ان کانوا لا یاخذون اصلا لا ناخذ۔ — اگر غیر اسلامی حکومتیں ہماری حکومت کے باشندوں سے بالکل نہ لیں گے تو ہم بھی ان سے کچھ نہ لیں گے۔

لیکن اگر وہ ہمارے یہاں کے لوگوں کے مال پر محصول لیتے ہیں تو اس وقت ہم بھی ان سے اسی قدر لیں گے جتنا ہمارے یہاں کے لوگوں سے وہ لیتے ہیں۔ پھر کوئی ظالم حکومت اگر مسلمانوں کا سب مال لے لیا کرتی ہے تو ہمیں حکم دیا گیا ہے

ان کانوا یاخذون الکل لا ناخذ الکل — اگر وہ سارا مال مسلمانوں کا لے لیتے ہوں تو ہم ان کے یہاں کے تاجروں کا سب مال نہ لیں گے۔

صاحبِ ہدایہ نے اس کی وجہ لکھتے ہوئے لکھا ہے کہ

نحن احق بمکارم الاخلاق — یعنی اخلاقی امور کی پابندی کے ہم زیادہ مستحق ہیں۔

اس تفصیل سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ کروڑ گیری کا تعلق اسلام میں معاشیات سے نہیں بلکہ سیاسیات سے ہے حتیٰ کہ دنیا کی حکومتیں اگر اسلامی حکومتوں کی رعایا سے کروڑگیری کے نہ لینے کا معاہدہ کرلیں تو سب سے پہلے بین الاقوامی تجارت کو آزاد قرار دینے پر جو دستخط کریں گے وہ مسلمان ہوں گے۔ ٹھیک جو حال غلامی میں ہوا کہ دنیا کی قومیں مسلمانوں کو غلام بنا رہی تھیں تو ہم بھی بناتے تھے۔ پھر انھوں نے مل کر خواہش کی کہ آئندہ سے مسلمانوں کو غلام نہ بنایا جائے گا۔ خلیفہ وقت نے شیخ الاسلام کے مشورہ سے وہی نحن احق بمکارم الاخلاق کہتے ہوئے اس مقدس معاہدے پر دستخط کر دیئے۔ اور آج بھی عام تجارت کو آزاد کرانے پر اگر غیر مسلم حکومتیں رضامندی ظاہر کریں تو ان کا نو ۲ لا یا خذ ون منسا لا نا خذ" پر عمل کرنے کے لئے ہمارے پاس پرانا دستور موجود ہے۔

خیر کروڑگیری کے مسئلہ کا ذکر یہاں تو ضمنی طور پر آگیا، تجارتی کاروبار کے متعلق میں نے چند تفصیلی احکام کا تذکرہ اس لئے کیا تاکہ تجارت کی آزادی و عدم آزادی کے متعلق اسلام کا نقطۂ نظر سامنے آجائے۔

اور اب اس بحث کو میں اسی پر ختم کرتا ہوں۔ یوں تجارت کے متعلق اور بھی چند قوانین ہیں جن پر بحث کی حاجت تھی، لیکن بخوف طوالت ان کو ترک کرتا ہوں، بہرحال سب میں وہی قرآنی حکم لا تظلمون ولا تظلمون" کی روح کارفرما ہے جب کوئی تفصیلی کتاب معاشیات پر لکھی جائے گی تو اس سے نفع اٹھایا جا سکتا ہے، البتہ مصارف سے بچے ہوئے سرمایہ کے متعلق ایک پہلو کا ذکر باقی رہ گیا ہے۔

سرمایہ کا استعمال و حفاظت مقصد یہ ہے کہ اس سرمایہ سے استفادہ کی جو دو شکلیں اسلام نے بتائی ہیں، یعنی اگر اس سے کوئی شخص نفع اٹھانا چاہتا ہے تو خسارہ اور خطرے کی ذمہ داریوں کو بھی قبول کر کے ایسا کر سکتا ہے اور اس کی بہت سی صورتیں ممکن ہیں، اور اگر خطرے کی ذمہ داریوں کو قبول نہیں کر سکتا تو شخصی نفع سے دست بردار ہو کر ملک کے ضرورت مندوں یا بے سرمایہ لوگوں کو قرض دے کر قومی فوائد حاصل کر سکتا ہے۔ اگرچہ اس قومی نفع کے ساتھ بالآخر اسی زندگی یا دوسری زندگی میں شخصی منافع سے بھی وہ محروم نہ رہے گا، بلکہ خیرات و صدقات سے زیادہ قرض دینے میں شخصی نفع کی توقع کی جا سکتی ہے جس کی تفصیل گذر چکی اور صرف یہی نہیں بلکہ اس قرض اور دین کی ادائیگی کی ضمانت کے لئے اسلام نے جو ممکن صورتیں اس دنیا میں ہو سکتی ہیں انھیں بھی اختیار کیا ہے۔ یعنی رہن اور رجسٹری جس کے ذریعہ سے چاہیئے تو اپنے دین کو آپ محفوظ کر سکتے ہیں رہن کا ایک مفصل باب فقہ میں موجود ہے اور رجسٹری کے اصولی قوانین مع قانون شہادت تو خود قرآن میں موجود ہیں، وہی بات کہ اسلام نے زندگی کے معاشیاتی تعلقات کو کتنی اہمیت دی ہے اس کا ایک ثبوت یہ بھی ہو سکتا ہے کہ خلاف دستور قانون رجسٹری کے لئے قرآن میں ایک پوری رکوع سورۂ بقرہ کے آخر میں مختص کر دی گئی ہے تاکہ کسی کا دین ضائع ہونے کے ممکنہ خطرات سے

محفوظ ہو جائے اور آخر میں تو

ما تبدوا ما فی انفسکم او	اپنے جی کی جو بات ظاہر کرو گے یا
تخفوہ یحاسبکم بہ اللہ۔	جسے چھپاؤ گے، اللہ تعالیٰ اس کا

حساب فرمائے گا۔

کے ذریعہ سے اس پر بھی تنبیہ کر دی گئی ہے کہ معاشیاتی ذمہ داریوں کی رتی رتی کا حساب ایک دن ہو کر رہے گا، اور جس نے جس کسی کو جو کچھ دیا ہے وہ قطعاً ضائع نہیں ہو سکتا، بلکہ مل کر رہے گا۔ مگر یہ سب سامان تو "پس ماندہ سرمایہ" کے استعمال و حفاظت کا اس وقت تک کے لئے ہے جب تک آدمی زندہ ہے، لیکن اگر کوئی اپنے بعد بھی کچھ پس انداز چھوڑ کر مرنے والا ہے تو اس سرمایہ کے متعلق بھی تقریباً اسلام نے دو ہی صورتیں مقرر کی ہیں، یعنی اگر اپنے جانشینوں میں اس کی صلاحیت نہیں پاتا کہ اس بچائی ہوئی دولت سے صحیح معنوں میں نفع نہیں اٹھا سکتے یا کم از کم اس کو محفوظ نہیں رکھ سکتے تو "وقف" خصوصاً "وقف علی الاولاد" کا عجیب و غریب قانون نافذ کر کے اسلام نے اس کی حفاظت کی ایک محکم اور استوار صورت پیدا کر دی ہے[۵] گویا جیسے قرض میں اصل سرمایہ کو محفوظ کر کے دوسروں کو نفع پہنچایا جا سکتا ہے۔ یہی حال وقف کے اس قانون کا ہے کہ بچا ہوا پس ماندہ روپیہ جوں کا توں محفوظ بھی رہ جاتا ہے اور جن جن لوگوں کو واقف نفع پہنچانا چاہتا ہے ان کو نفع بھی پہنچتا رہتا ہے "وقف علی الاولاد" کے متعلق لوگوں کو عجیب مغالطہ ہوا کہ اسے وہ خیرات کی ایک قسم قرار دے کر متحیر ہوتے اور بڑے بڑے قانونیوں نے اظہارِ تعجب کیا کہ اولاد پر "وقف" کے کیا معنی؟ قطع نظر اس کے کہ اسلام کا عام قانون صدقہ کے باب میں

وابدء بمن تعول امک واباک	جس کا بار تم پر ہو پہلے ان ہی سے شروع
ثم اختک واخاک ثم ادناک فادناک	کرو یعنی ماں باپ کو، بہن کو بھائی کو،

پھر رشتہ میں جو زیادہ قریب ہوتا جائے۔

کا ہے اور خود "صدقہ" کے مفہوم کو تو اس نے اتنا عام کیا ہے کہ بیوی کے ساتھ ہم بستری کو بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صدقہ قرار دیا ہو، اس کے "وقف" میں خیرات کے مفہوم سے زیادہ پس ماندہ جائداد کی حفاظت بھی مدنظر ہے۔ ابتدائے اسلام میں عموماً صحابہؓ نے بکثرت اپنی دولت نام اوقاف کئے۔ علامہ مقدسی لکھتے ہیں۔

---

[۵] امام شافعیؒ نے کتاب الام میں دعویٰ کیا ہے کہ وقف کی جو شکل اسلام میں پائی جاتی ہے، اس کی نظیر اسلام سے پہلے نہیں ملتی۔ لوگوں نے اس پر اعتراض کیا ہے کہ ممکن ہے کہ عرب میں رواج نہ ہو، لیکن عیسائیوں میں اوقاف بکثرت تھے، گرجوں پر مدہ کی زمینیں وقف تھیں۔ لیکن میرے نزدیک امام شافعیؒ کا مطلب مطلق وقف سے نہیں ہے۔ بلکہ وقف کے منافع کو اپنے اقرباء و اعزہ کے ساتھ مختص کرنا یہ اسلامی وقف کی خصوصیت ہے ۱۲

قال جابر لم يكن احد من اصحاب النبي صلى الله عليه وسلم ذو مقدرة الا وقف. قال الحميدي تصدق ابو بكر بداره على ولده وعمر بداره عند المروة على ولده و عثمان[1] وتصدق علي[2] بارضه

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابیوں میں کوئی مقدور والوں میں ایسا نہ تھا جس نے وقف نہ کیا ہو۔ حمیدی راوی ہیں کہ حضرت ابوبکرؓ نے اپنی اولاد پر اپنے گھر کو وقف کیا، یوں ہی عمرؓ نے بھی مروہ کے پاس جو گھر تھا اس کو اپنی اولاد پر وقف کیا حضرت عثمان نے بھی

---

[1] حضرت عثمانؓ کے وقف کی قیمت کا اندازہ کتابوں میں مائتی الف دینار کیا گیا ہے یعنی دو لاکھ اشرفی جس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ روپے کے حساب سے اس کی قیمت کتنی زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ یہی حال دوسرے اوقاف کا بھی کم و بیش تھا۔

[2] اوقاف کے سلسلہ میں ایک دلچسپ تاریخی چیز مسلمانوں کے یہاں جو ملتی ہے، وہ مصارفِ اوقاف کی گوناگونی ہے۔ امیر شکیب ارسلان جو اسلامی تاریخ کے ایک مستند اور وسیع النظر عالم ہیں، مشہور امریکی مصنف "لوتھراپ سٹوڈارڈ" نے "نیا عالم اسلام" کے نام سے کتاب لکھی ہے، اردو عربی میں اس کا ترجمہ ہو گیا ہے۔ عربی ترجمہ پر امیر کے بڑے مفید حواشی ہیں، ان ہی حاشیوں میں آپ نے ایک جگہ لکھا ہے کہ مجنونوں، مجذوبوں، بیماروں کے لئے مسلمانوں نے جو اوقاف کئے ہیں وہ تو حد شمار سے خارج ہیں، بیمار جانوروں کے لئے مسلمان وقف کرتے تھے۔ شام میں "مرج" نامی جو مرغزار ہے لکھا ہے کہ جہاد میں جو گھوڑے زخمی اور بیکار ہو جاتے تھے، ان کے لئے یہ مرغزار وقف تھا کہ کھلا چھوڑ دیا جائے، یہ گھوڑے جس طرح چاہتے چرتے رہتے، دمشق میں ایک وقف کا مصرف یہ بھی تھا کہ برتن کسی کا غلام اگر توڑ دے تو توڑنے والے غلام کو صحیح و سالم برتن دیدیا جائے تاکہ مالک اس کو مارے پیٹے نہیں۔ [illegible] ایک صاحب نے صرف اس لئے وقف کیا تھا کہ اس کی آمدنی سے کتوں کو شہر میں رہنے سے روکا جائے۔ مکہ میں ایک وقف تھا جس کا مصرف واقف نے یہ مقرر کیا تھا کہ تقریبات اور شادیوں میں فرش و فروش روشنی وغیرہ کا نظم اس کی آمدنی سے کیا جائے۔ ایک وقف تونس میں اس لئے کیا گیا تھا کہ جمعرات کے دن مدارس کے طلبہ کا امتحان لیا جائے اور بچوں کو وقف کی آمدنی سے ہر ہفتہ انعام تقسیم کئے جائیں۔ ایک وقف تونس ہی میں اس لئے کیا گیا تھا کہ حمام کی فیس اس سے ہر اس شخص کے لئے ادا کی جائے جو خود حمام کی فیس ادا کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ بعض اوقاف اس لئے تھے کہ راہ گیروں کو برف کا ٹھنڈا پانی پلایا جائے۔ بعض اوقاف اس لئے تھے کہ غرباء کے بچوں کی ختنہ کے مصارف اس سے ادا ہوں۔ تونس میں بھی برتن توڑنے والوں کے لئے ایک وقف تھا۔ بعض اوقاف اس لئے تھے کہ رمضان میں مٹھائی روزہ داروں میں اس کی آمدنی سے تقسیم کی جائے۔ ایک دلچسپ وقف کا تونس میں پتہ چلتا ہے کہ خاص قسم کی مچھلی موسم پر وہاں کے سمندر کے ساحل پر آتی ہے غرباء کے لئے ان مچھلیوں کو خرید کر تقسیم کیا جائے۔ بعض اوقاف کا مصرف یہ تھا کہ کسی کے کپڑے پر اگر داغ دھبہ لگ جائے یا ناقابل استعمال ہو جائے تو وہ اس وقف کی آمدنی سے نیا کپڑا خرید سکتا ہے۔ بعض اوقاف اس لئے تھے کہ راستوں سے پتھر کانٹے اس کی آمدنی سے ہٹائے جائیں۔ الغرض اندھوں، لنگڑوں، لولوں، اپاہجوں، کوڑھیوں وغیرہ وغیرہ کے لئے اکثر اسلامی (بقیہ بر صفحہ آئندہ)

بینبع وتصدق الزبیر بدارہ	یہی کیا، حضرت علیؓ نے اپنی اس زمین کو
بمکۃ ودارہ بمصر واموالہ	جو ینبوع میں تھی وقف کیا، حضرت زبیرؓ نے
بالمدینۃ وتصدق	اپنے اس گھر کو جو مکہ میں تھا اور جو گھر
سعد بدارہ بالمدینۃ	مصر میں تھا، اور مدینہ میں ان کا جو مال
ودارہ بمصر علی ولدہ و	(بشکل باغ و زراعت تھی) اسے اپنی
عمرو بن العاص بدارہ	اولاد پر وقف کیا، حضرت سعدؓ نے مدینے
بالوھط ودارہ بمکۃ	میں ان کا جو گھر تھا اور جو مصر میں تھا
علی ولدہ وحکیم بن حزام	اپنی اولاد پر وقف کیا۔ عمرو بن عاص نے
بدارہ بمکۃ والمدینۃ	وہط کے گھر کو اور جو مکہ میں ان کا گھر تھا اپنی
علی ولدہ کلہ الی الیوم	اولاد پر وقف کیا، یونہی حکیم بن حزام نے
(المغنی)	مکہ اور مدینہ کے گھر کو اپنی اولاد پر وقف

کیا، اور یہ سارے اوقاف اس وقت تک موجود ہیں۔

اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ "وقف" دراصل اس زمانے میں اپنی پس ماندہ جائداد کی حفاظت کا ایک محفوظ طریقہ تھا اور اس قانون کی اصلی روح یہی تھی، اگرچہ اس قانون میں تبرع اور نیکی کا مفہوم بھی شریک تھا لیکن اسی معنیٰ میں جس معنیٰ میں خود اپنے آپ کو اپنی بیوی کو کھانا کھلانا بھی اسلام میں صدقہ ہے۔ یہ ذوقِ صحابی کا اس پر عمل کرنا جیسا کہ حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے قول سے معلوم ہوتا ہے اس سے تو یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ یہ کوئی اتفاقی بات نہ تھی بلکہ پس ماندہ رہنے والی جائداد کے متعلق اسلام نے پہلے "وقف علی الاولاد" اور بعد کو وراثت کا قانون پیش کیا ہے۔ یعنی اگر جانشینوں سے جائداد کے برباد ہونے کا خطرہ ہے تو اس کو وقف کر کے محفوظ کر دینا چاہیئے اور اگر ان میں اس کی صلاحیت نظر آتی ہے کہ ان میں ہر ایک کو کچھ سرمایہ اگر دے دیا جائے گا تو اس کے الٹ پھیر اور اس کو اس بنا پر اپنی معاشی ترقیوں میں مدد حاصل کر سکتے ہیں تو ایسی صورت میں وراثت کے قانون سے نفع اٹھایا جا سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایسے ورثاء جو اپنی زندگی کی مدت ختم کر کے موت کے انتظار میں ہوں مثلاً ماں باپ وغیرہ

(بقیہ صفحہ گزشتہ)

ممالک میں اوقاف تھے۔ مراکش کے ایک اسلامی وقف کا ذکر اس نے لکھا ہے کہ ایک فرانسیسی سیاح نے ان لفظوں میں یہ لق و دق عمارت ہے جس میں چھ ہزار اندھے ہمیشہ رہتے ہیں۔ ان کے کھانے پینے رہنے سہنے کا باضابطہ نظم ہے اور تعلیم بھی دی جاتی ہے۔ ایک دلچسپ وقف یہ بھی تھا کہ جن شوہروں سے ان کی بیویاں خفا ہو جائیں تو خفگی کے دنوں میں اس وقف کی آمدنی سے استفادہ کر سکتی ہیں جب تک میاں بیوی میں صفائی نہ ہو جائے وقف کی طرف سے بیویوں کے مصارف کی کفالت کی جائے۔ ان مختلف مصارف کے علاوہ تعلیم وغیرہ کے لئے تو مسلمانوں نے ہر جگہ اوقاف کئے ہیں۔ لیکن افسوس کہ غیر ہمدرد حکومت ان کا انتظام نہیں کرتی۔ (الحاضر العالم الاسلامی ص ۲۹۲ ج ۱) ۱۲

ان کو تو میت کے مال سے بقدر گذر اوقات دلایا جاتا ہے لیکن جن کے سامنے زندگی کے آئندہ عملی مراحل پیش آنے والے ہیں، مثلاً اولاد، تو ان میں جس کو دوسرے سے بھی کچھ مدد مل سکتی ہے یعنی لڑکیاں، جو شوہر کی قوت بھی رکھتی ہیں، ان کو لڑکے کے حساب سے نصف دلایا جاتا ہے اور لڑکوں کو عموماً چونکہ کسی دوسرے سے امداد کی توقع نہیں ہوتی بلکہ مزید بیوی کا بار اس پر پڑتا ہے، اس لئے اس کو بجائے نصف کے پورا دلایا گیا اور یہ تو اس وقت ہے کہ آدمی اپنی تمام اولاد کو یک حال میں چھوڑ کر مر رہا ہو لیکن اگر بجائے اس کے یہ دیکھتا ہو کہ اس کا کوئی بیٹا یا بیٹی ایسے معذور اور بیمار یا کسی ایسی حالت میں ہیں کہ اگر ان کو صرف قانونی حصہ ملے گا تو کفایت نہ کرے گا، ایسی صورت میں اسلام اجازت دیتا ہے کہ اپنی کسی خاص اولاد کو میراثی حصہ سے زیادہ اپنی زندگی میں ہبہ کردے۔ امام احمد بن حنبل کا فتویٰ ہے کہ

لا باس اذا کان لحاجة واکرهه اذا کان علی سبیل الاثرة۔

اپنی اولاد میں کسی کو زیادہ حصہ ہبہ کر دینے میں کوئی مضائقہ نہیں اگر اس کی ضرورت ہو، مگر بغیر ضرورت یہ بات مجھے ناپسند اور میرے نزدیک مکروہ ہے، یعنی بلاوجہ ایک کو دوسرے پر ترجیح نہ دینی چاہئے۔

مقدسی نے ان حاجات کی کچھ تفصیل بھی کی ہے۔

مثل اختصاصه لحاجة او زمانة او عمی او کثرة عائلة او اشتغاله بالعلم اونحو من الفضائل۔

مثلاً کسی بچہ کو اس کی کسی ضرورت کی وجہ سے ترجیح دی جائے یا وہ کسی مزمن مرض میں بیمار ہو، یا اندھا ہو، یا اس کی اولاد زیادہ ہو، یا علم کے ساتھ مشغول ہو، یا اسی قسم کی کوئی فضیلت حاصل کر رہا ہو۔

اور اس سے ایک عام سوال کا جواب بھی سمجھا جا سکتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ وقف و ہبہ وغیرہ کے ذریعہ سے جب کوئی اپنی جائداد کا نظم کئے بغیر مرجاتا ہے تو اسلام نے میراث کا قانون اسی قسم کی جائدادوں کی تقسیم کے لئے بنایا ہے اور قانون ظاہر ہے کہ شخصی خصوصیات کو پیش نظر رکھ کر نہیں بنتا۔ عموماً کلیاتی اصول واضع قانون کے سامنے ہوتے ہیں۔ میراثی قانون کی بنیاد یہ رکھی گئی ہے کہ براہ راست قریب ترین رشتہ داروں کو ترجیح دی جائے گی اور اسی اصول کو پیش نظر رکھ کر عمل کیا جاتا ہے۔ کیونکہ اگر ایسا نہ کیا جائے اور وراثت کے لئے صرف رشتہ داری کافی ہو تو غالباً ایک ایک مورث کے سینکڑوں وارث بلکہ شاید سارے بنی آدم وارث ہو جائیں، کیونکہ بالواسطہ رشتہ دار تو تقریباً ہر آدمی کا دوسرا آدمی ہے۔ کم از کم آدم میں تو سب ہی جاکر شریک ہو جاتے ہیں، مگر اسی اصول پر کبھی براہ راست قریب ترین رشتہ داروں کے ساتھ مورث کا کوئی بالواسطہ رشتہ دار ایسا بھی پایا جاتا ہے جو واقعہ کے اعتبار سے براہ راست رشتہ داروں سے زیادہ قابل رحم اور محتاج امداد ہوتا ہے، مثلاً فرض کیجئے کہ

کبھی بیٹوں کے ساتھ کوئی یتیم پوتا کسی کا رہ جاتا ہے۔ میراثی قانون کے مذکورہ بالا نقطۂ نظر کی وجہ سے ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں پوتا محروم ہو جاتا ہے۔ کیونکہ پوتا اپنے دادا کا براہ راست نہیں بلکہ اپنے باپ کے واسطے سے رشتہ دار ہے۔ حالانکہ کبھی کبھی پوتا بوجہ یتیم اور کمسن ہونے کے امداد کا زیادہ مستحق ہوتا ہے۔ ایسے مواقع جو کبھی کبھی پیش آجاتے ہیں، ان کی وجہ سے لوگوں کو میراث کے قانون میں کچھ نقص نظر آتا ہے۔ حالانکہ یہ قانون کا نقص نہیں بلکہ قانون کے استعمال کرنے والے کا عقلی نقص ہے۔ یہ تو دادا کا فرض ہے کہ جب وہ اپنے پوتے کو اس حال میں پاتا ہے اور وہ جانتا ہے کہ براہ راست رشتہ دار نہ ہونے کی وجہ سے وہ میراثی قانون کے تحت میں نہ آئے گا تو اس کو کس نے منع کیا ہے کہ قانونِ ہبہ اور عطیہ سے اس قابلِ رحم پوتے کو نفع نہ پہنچائے۔ خصوصاً جب خاص حالات میں ایک وارث کو دوسرے وارث پر ہبہ اور عطیہ میں ترجیح دی جا سکتی ہے اور مرنے کے بعد کسی وارث کو یہ حق نہیں ہے کہ اس عطیہ کو اس سے واپس لے لے۔ مقدسی لکھتے ہیں کہ

اذا فاضل بین ولده فی العطایا او خص بعضهم بعطیة ثم مات قبل ان یسترده ثبت ذلک للموهوب له ولزم ولیس لبقیة الورثة الرجوع۔

اگر عطیہ اور ہبہ میں کوئی اپنی اولاد میں سے کسی کو کسی پر ترجیح دے یا بعضوں کو کسی خاص عطیہ کے ساتھ مختص کرے اور دینے والا اس عطیہ کو واپس کر لینے سے پہلے مر جائے تو جسے یہ چیز ہبہ کی گئی ہے اس کی ملک ثابت ہو جائے گی اور اس کا حق واجب ہو جائے گا۔ باقی وارثوں کو اس کا حق نہیں ہے کہ اس عطیہ کے متعلق اس پر دعویٰ کریں۔

اس مسئلہ کو تفصیل کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ

به قال مالک والشافعی و اصحاب الرائے واکثر اهل العلم۔

امام مالک امام شافعی اور اصحاب رائے (حنیفہ) اور اکثر اہل علم کی یہی رائے ہے۔

اور میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ آیت قرآن

فی اموالهم حق للسائل والمحروم۔

ان کے مال میں مانگنے والوں اور بوجہ ناتوانی حقوق سے محروم ہیں ان کا بھی حق ہے۔

میں "المحروم" کے تحت اس قسم کے محروموں کا حق قرآن نے سرمایہ داروں کے اموال میں اگر نہیں قائم کیا ہے تو پھر یہ اور کن کے متوقع ہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ اسلام نے اگرچہ اپنے یا اپنے بال بچوں یا اپنی آئندہ نسلوں کی رزاقیت کے سررشتہ کو تو اپنے ہاتھ میں لینے کا حکم نہیں دیا ہے اور "الرزاق ذو القوة المتین" ہی کو اس کا متکفل قرار دیا ہے۔ اسی بنا پر صرف ان ہی لوگوں کو نہیں ہے

مالتھس وغیرہ وسوامیوں کی طرح نسل انسانی اور زمین کی غذائی پیداواروں میں عدم توازن کا خطرہ محسوس کرکے خود بھی ڈرتے اور دوسروں کو ڈراتے رہتے ہیں بلکہ ایسے لوگوں کو بھی اس نے ڈانٹا ہے جنھیں اولاد کی کثرت میں معاشی تنگ حالی کا خطرہ محسوس ہوتا کہ ان میں بعضوں نے تو اتنی تنگ دلی اختیار کی کہ پیدا کرنے کے بعد اپنے ہاتھوں اپنی اولاد کی گردن تک مروڑنے پر آمادہ ہوگئے اور ایسا فعل جو سوچا بھی نہیں جا سکتا۔ ضرورت ہوئی کہ اس کے متعلق قرآن میں

ولا تقتلوا اولادکم خشیة املاق۔ — اور نہ قتل کرو اپنی اولاد کو تنگ معاشی کے خوف سے۔

کا حکم دیا جائے اور یہ تو کہا جاتا ہے کہ ایام جاہلیت کی قساوت تھی، لیکن آج بعینہ ان ہی معاشی مشکلات کے بھوت کو سامنے کھڑا کرکے نسل انسانی کے ہمدردوں کا ایک گروہ "برتھ کنٹرول" (ضبط حمل) کے ذریعہ سے پیدا ہونے سے پیشتر انسانی نسل کو تباہ کر دینے کا جو وعظ سنا رہا ہے گیا جاہلیت" کی اس سنگدلی سے "عالمیت" کی یہ رحم دلی کچھ کم ہے۔ وہی برتھ کنٹرول کا وعظ کہنے والا اگر خدانخواستہ برتھ کنٹرول کی بیٹ میں آجاتا تو آج اسٹیجوں پر جھک جھک کر یہ باتیں کیا کر سکتا تھا؟ بہر حال اسلام نے "رزاقیت" کی فکر میں شہر کے قرینوں کو گھٹنے ٹیکنے سے تو بے نیاز کر دیا ہے حتیٰ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں بھی بعض معاشیوں نے "العزل" (صحبت کا ایسا طریقہ جس سے حمل قرار نہ پائے) کی راہ سے جب برتھ کنٹرول کے متعلق منشائے مبارک دریافت کیا تو ارشاد ہوا کہ یہ (وادخفی) ہے، یعنی اولاد کو زندہ مار ڈالنے کی یہ ایک مخفی تدبیر ہے، اور اس کی واقعیت میں کون شبہ کر سکتا ہے۔

لیکن اس کے ساتھ یہ بھی نہ بھولنا چاہئے کہ خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی اجازت بھی نہیں دی ہے کہ خواہ مخواہ کوئی آدمی کوئی اس بے ترتیبی سے اڑائے یا خرچ کرے کہ نتیجۃً اس کی اولاد دوسروں کے سامنے ہاتھ پھیلانے پر مجبور ہو۔ مشہور واقعہ سعد بن ابی وقاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا حدیثوں میں آتا ہے کہ اپنی ایک سخت بیماری میں ان کو زندگی سے جب مایوسی ہوگئی تھی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم عیادت کے لئے تشریف لائے تو سعدؓ نے کہا کہ میری وارث صرف میری ایک لڑکی ہے کیا مناسب نہ ہوگا کہ میں اپنے مال کا دو تہائی حصہ خیرات کر دوں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "نہیں" سعدؓ نے کہا تو آدھا؟ پھر جواب ملا "نہیں" سعدؓ نے کہا تو ایک تہائی؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "تہائی بہت ہے"۔ اس کے بعد آپؐ کے الفاظ یہ تھے۔

انک ان تذر ورثتک اغنیاء خیر من ان تدعھم عالة یکففون الناس۔ (صحاح)	تم اپنے وارثوں کو غنی چھوڑ کر جاؤ یہ اس سے بہتر ہے کہ انھیں ایسے افلاس کی حالت میں چھوڑ دو کہ لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلاتے پھریں۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ صرف اپنی ذات ہی کے لئے نہیں بلکہ اپنی او. دکے لئے بھی اگر کسی و
پس انداز کرنے کا موقعہ ہے تو اسلام اس موقعہ سے نفع اٹھانے کا حکم دیتا ہے۔ پھر پس ماندوں کی
حالت اگر وقف کی مقتضی ہو تو منافع کو ان تک پہنچا کر اصل کو محفوظ کر دیا جائے یا اولاد میں سے کوئی
لڑکا یا لڑکی زیادہ ضرورت مند ہو یا کوئی رشتہ دار قابل امداد ہونے کے باوجود میراثی حصہ سے
محروم ہوتا ہوا نظر آرہا ہو، ان کو ہبہ کے ذریعہ سے کچھ دیدیا جا سکتا ہے اور باقی کو ارثی قانون سے
تقسیم ہونے کے لئے چھوڑ دیا جائے تاکہ ہر ایک کے پاس کچھ نہ کچھ سرمایہ پہنچ جائے جس کے ذریعہ
سے اگر کافی ہو وہ زندگی گذاریں، ناکافی ہو تو اس کو اصل بنا کر آمدنی پیدا کریں۔

مضمون گویا زندگی سے شروع ہو کر ایک حد تک موت اور موت کے بعد تک پہنچ چکا
ہے۔ اختصار کی کوشش کے باوجود بات پھیلتی جا رہی ہے اور ابھی چند اہم نقاط اور مصارف
وخرچ کا مستقل باب باقی ہے۔

محنت ومزدوری

باہمی لین دین کے سلسلہ کی ایک بڑی اہم چیز اجارہ ہے، اردو میں تو اجارہ ٹھیکہ اور کرایہ
کے معاملہ کو کہتے ہیں، لیکن فقہاء کی اصطلاح میں نوکری، مزدوری، کاریگری، کرایہ داری مکان کی ہو
یا زمین کی، سب اجارہ کا معاملہ ہے۔ حاصل اس کا یہ ہے کہ خود چیز دے کر معاوضہ لینا نہیں جیسے کہ
تجارت میں ہوتا ہے، بلکہ چیز سے استفادہ کا حق دے کر اس کے معاوضہ میں کچھ لینا یہی اجارہ کا
معاملہ ہے۔ پھر اگر مکان، گاڑی، گھوڑا وغیرہ کے متعلق یہ معاملہ کیا جائے تو کرایہ کا معاملہ ہوا اور
اگر بجائے اپنی کسی چیز کے خود آدمی اپنی خدمت اور محنت کا معاوضہ حاصل کرے تو اس کی بھی
دو صورت ہے۔ متاجر کی ماتحتی میں اگر کام نہ کرے بلکہ اپنے گھر میں مثلاً کام کرتا ہو تو یہ کاریگری
ہے۔ اور اگر متاجر کی ماتحتی میں کرتا ہے تو اس کی بعض شکلوں کو نوکری، بعضوں کو مزدوری کہتے ہیں۔ شرع
اسلام نے ہر ایک کے متعلق اپنی کتابوں میں مفصل قوانین بنائے ہیں۔ اس زمانے میں ربوا (سود) کی وجہ
سرمایہ کے ملنے میں جو آسانیاں ہوئیں تو عموماً کاریگروں کو لوگوں نے نوکر اور مزدور رکھ کر ان کی اجتماعی
محنت سے نفع حاصل کرنا شروع کیا۔ اس طریقہ سے پیداوار تو اجتماعی شکل میں ہونے لگی یعنی ایک
ایک کارخانہ میں دس دس ہزار مزدور کام کرنے لگے اور سرمایہ چونکہ ایک ہی یا چند محدود اشخاص کا ہوتا
ہے اس لئے آمدنی شخص یا چند محدود اشخاص کو ملتی رہی۔ مزدوروں اور سرمایہ داروں کا سوال اسی
شکل نے پیدا کر دیا۔ سرمایہ داروں کو ظاہر ہے بوجہ محدود افراد ہونے کے لاکھوں اور کروڑوں کی
شکل میں نفع ملتا رہا، اور مزدور جن کی اجتماعی محنت کا یہ ثمرہ ہے ان کو صرف مزدوری ملتی رہی۔ چونکہ
چونکہ انفرادی طور پر کام کرنے سے اتنا نفع بھی ان کو نہیں ملتا تھا۔ اس لئے قدرتاً کارخانوں میں کام
کرنے کو انھوں نے اپنے لئے زیادہ منفعت بخش پایا اور اس کی وجہ یہ ہے کہ انفرادی طور پر

مزدور نہ ان مشینوں کو خرید سکتے ہیں اور نہ خام مواد کا اتنا ذخیرہ فراہم کر سکتے ہیں جو سرمایہ دار خود یا اپنی ساکھ پر بنکوں سے سودی قرض لے کر مہیا کر سکتے ہیں۔ کارخانہ داروں نے چونکہ اس کا اندازہ کر لیا کہ انفرادی مزدوری سے زیادہ اگر مزدوروں کو کارخانہ میں مزدوری دے دی جائے گی تو سود کے حساب سے نقصان کیا نفع اور کافی نفع ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ موجودہ شکل میں بھی اگر غور کیا جائے تو مشکلات کی بڑی وجہ یہی سودی اور بنکنگ کا کاروبار ہے۔

اسلام نے اس کا کیا حل پیش کیا ہے، ایک مستقل مسئلہ ہے۔ پوری تفصیل کی یہاں گنجائش نہیں۔ ہم چند کلیات اجارہ کے متعلق ذیل میں پیش کرتے ہیں اور علمائے معاشیات کو توجہ دلاتے ہیں کہ سرمایہ و محنت کی جو کشتی کسی جتن سے آج تک سلجھتی نظر نہیں آرہی ہے۔ انسانی زندگی کے پہلوؤں کے پیغمبر اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات میں ان کو پیچیدگیوں کا کوئی حل کیا مل سکتا ہے یا کم از کم ان کو اس کا اندازہ ہو سکتا ہے کہ آج جو باتیں نئی خیال کی جاتی ہیں، واقع میں وہ کتنی پرانی ہیں، بہرحال بخاری شریف کی ایک حدیث ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

اخوانکم خولکم جعلہ اللہ	خول (یعنی تمہارے ہاتھ کے نیچے کام
تحت ایدیکم فمن کان	کرنے والے) تمہارے بھائی ہیں، حق
اخوہ تحت یدہ فلیطعمہ	تعالیٰ نے ان کو تمہارے ہاتھ کے نیچے
مما یاکل ولیلبسہ مما یلبس	ڈال دیا ہے، پھر جس کا بھائی کسی کے
ولا تکلفوھم ما یغلبھم	ہاتھ کے نیچے پڑ جائے تو چاہیئے کہ جو کچھ
فان کلفتموھم فاعینوھم	خود کھاتا ہو اسے کھلائے اور جو خود

پہنتا ہو اسے پہنائے اور ان پر اتنا کام نہ لادو جو ان کو مغلوب کر دے اور اگر ان پر بار ڈالو تو ان کی مدد و اعانت کرو۔

اس حدیث سے چند باتیں معلوم ہوتی ہیں۔

(۱) مزدور اور جو مزدوری پر لوگوں سے کام لیتے ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا منشا ہے کہ ان کو وہ اپنا بھائی خیال کریں، اور دونوں میں تعلقات کی نوعیت ایسی ہو جیسے بھائی بھائی میں ہوتی ہے۔

(۲) کم از کم کھانے، پہننے، رہنے سہنے کی حد تک دونوں کی معاشی سطح برابر ہو، جو خود کھائے وہ مزدور کو کھلائے اور جو خود پہنے وہ مزدور کو پہنائے۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اجرت کے معاملہ میں اسلام کا نقطۂ نظر کیا ہے۔ یعنی کم از کم اتنی اُجرت تو بہرحال ہر مزدور کو ملنی چاہیئے کہ کھانے اور پہننے کی حد تک وہ اپنے مالک کے برابر ہو جائے۔ مزدوری کی شرح اگر آج اتنی بھی بند کر دی جائے تو میں سمجھتا ہوں کہ شورش کی کمی کی بہت حد تک توقع کی جاسکتی ہے۔

(۳) وقت اور کام دونوں کے حساب سے مزدوروں پر اتنا بوجھ نہ لادا جائے جو ان ...

مغلوب کر کے تھکا دے "لا تکلفوھم ما یغلبھم" یہ ایسا فقرہ ہے جس سے موجودہ زمانے میں وقت
اور کام کی نوعیت کے مسئلہ کو طے کیا جا سکتا ہے۔

(۴) اور اگر کوئی کام ایسا پیش آ جائے جس کی انجام دہی میں مزدوروں کو دشواری
پیش آ رہی ہو تو اس کا مطلب یہ بھی نہیں ہے کہ اس کام کو نہ کرایا جائے۔ اور نہ یہ مطلب ہے کہ خواہ
مزدور پر کچھ ہی گذر جائے لیکن بہرحال اس سے وہ کام لیا ہی جائے۔ بلکہ ایسی صورت میں یہ کام
کرنا چاہیئے کہ مزدور کی اعانت مزید قوت سے کی جائے "فاعینوھم" کا یہی مطلب نہیں ہے کہ خود
اس کام میں لگ جائے، بلکہ یہ بھی ہے کہ بہرحال مزید قوت سے مزدور کی اعانت کی جائے۔ میں سمجھتا
ہوں کہ "محنت اور سرمایہ" کے جتنے جھگڑے اس زمانے میں اٹھ کھڑے ہوئے ہیں مندرجہ بالا حدیث کے
ذریعہ اس کا حل پیدا کیا جا سکتا ہے۔ اسلام کی یہ صرف کوئی خوشگوار نری تجویز ہی نہیں ہے بلکہ ایسے
عملی واقعات کی ایک فہرست پیش کی جا سکتی ہے جن میں مسلمانوں نے اسے عملاً کر کے دکھایا۔ اس
حدیث کے راوی حضرت ابوذرؓ ہی کی زندگی کا یہ دستور العمل تھا، اور حضرت عمرؓ کا سفر بیت المقدس
میں نصف راستہ خود سوار ہونا اور نصف راستہ غلام کو اونٹ پر سوار کرانے کا واقعہ تو مشہور ہی ہے
مزدوری کے متعلق دوسری حدیث بخاری کی یہ ہے۔

قال اللہ ثلثۃ انا خصمھم
یوم القیامۃ رجل اعطی
بی ثم غدر رجل باع حرا
ثم اکل ثمنہ رجل استاجر
اجیرا فاستوفی منہ ولم
یعطہ اجرہ۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ تین آدمیوں کا
قیامت کے دن میں فریقِ مخالف ہونگا
ایک شخص جس نے میرے نام سے کسی کو
کچھ دیا اور پھر عہد شکنی کی (یہ پہلا آدمی
ہی ہے) دوسرا وہ جو کسی آزاد آدمی کو
بیچ کر اس کی قیمت کھائے۔ تیسرا وہ
جس نے کسی کو مزدور رکھا اور اس سے پورا کام لیا، لیکن اس کی پوری مزدوری ادا نہ کی۔

تیسری حدیث:

ان ابی ھریرۃ قال قال رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم اعطوا الاجیر
اجرہ قبل ان یجف رشحہ۔
(رواہ ابویعلیٰ)

حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ آنحضرت
صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مزدور کو
اس کی مزدوری ادا کر دو، قبل اس کے
کہ اس کا پسینہ خشک ہو۔

ایک اور روایت مسند احمد میں یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

اعطوا العامل من عملہ
فان عامل اللہ لا یخیب۔

مزدور کو اس کے کام سے بھی حصہ دو
کیونکہ اللہ کا عامل (مزدور) نامراد
نہیں کیا جا سکتا۔

اس حدیث کا کیا مطلب ہے، کیا علاوہ مزدوری کے "منافع" میں بھی مزدور کا کچھ حصہ اسلام مقرر کرنا چاہتا ہے۔ افسوس ہے کہ فقہائے اسلام کی کتابوں میں اب تک اس کے متعلق کوئی بات نہیں ملی۔ لیکن ایک اور حدیث ہے جس سے اس کی ایک گونہ تشریح ہوتی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی کا ارشاد مبارک ہے۔

اذا صنع لاحدکم خادمه طعاما	تمہارا خادم اگر تمہارا کھانا تیار کرے
ثم جاءبه وقد ولی حره ودخانه	اور لے کر تمہارے پاس آئے اور گرمی
فلیقعده معه فلیاکل فان	دھویں کو اس نے برداشت کیا تھا تو
کان الطعام مشفوها فلیضع	چاہیئے کہ اپنے ساتھ اس کو بٹھالو اور
منه فی یده اکلة او اکلتین	کھانے پر زیادہ آدمی ہوں تو پھر خادم
(صحیح بخاری)	کے ہاتھ میں کھانے سے کچھ چیز اٹھا کر

رکھ دو ایک لقمہ یا دو لقمے۔

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ خود اس کام سے بھی جو خادم نے کیا خادم کو کچھ نہ کچھ حصہ ملنا چاہیئے۔ کیا مزدور کو اس پر قیاس کیا جا سکتا ہے؟

مزدوروں اور نوکروں کے ساتھ کس قسم کا معاملہ کرنا چاہیئے۔ ایک تو اس باب میں بخاری کی روایت گذر چکی کہ بھائی بھائی کا معاملہ کیا جائے۔ نیز اس سلسلہ میں ان کے ساتھ درگذر اور چشم پوشی کے متعلق ایک قابل ذکر حدیث وہ ہے جس میں آیا ہے کہ ایک شخص حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور اس نے دریافت کیا،

یارسول اللہ کم اعفو عن الخادم	میں اپنے نوکر کو کتنی دفعہ معاف کیا کروں

راوی کا بیان ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم خاموش ہو گئے، اس نے پھر اسی سوال کو دہرایا۔ آپؐ نے تب اس کے جواب میں جو بات کہی وہ یاد رکھنے کی ہے، ارشاد ہوا

اعف عنه کل یوم سبعین مرة	روز ستر دفعہ معاف کیا کرو۔
(ابوداؤد و ترمذی)	

اسی بنا پر فقہائے اسلام نے یہ طے کر دیا ہے کہ نوکر یعنی،

الذی یستاجر مدة فلاضمان	کسی مقررہ مدت کے لئے جو تنخواہ پر نوکر
علیه مالم یتعد۔	رکھا جائے۔ اس پر (چیزوں کے نقصان

کرنے کا تاوان قانوناً عائد نہ ہوگا، اگر اس کی طرف سے قصداً نقصان کرنے کا ارادہ نہ ہوا ہو)
مقدسی نے اس جزئیہ کو نقل کرنے کے بعد لکھا ہے،

وهذا مذهب مالک وابی	یہی امام مالک اور امام ابوحنیفہ اور
حنیفة واصحابه۔	ان کے اصحاب کا مذہب ہے۔

اس سلسلہ میں بعض ایسی حدیثیں بھی قابل ذکر ہیں جن کا تعلق اگرچہ خادموں سے ہے۔ لیکن میرے نزدیک یہ

احکام ہر شخص کے لئے عام ہیں جو کسی کی ماتحتی میں کام کرتا ہو۔

ابومسعودؓ بدری صحابی کا مشہور واقعہ ہے کہ وہ کوڑے سے اپنے غلام کو مار رہے تھے۔ پیچھے سے ایک آواز،

اعلم ابا مسعود۔ خبردار! ابومسعود۔

کی آئی۔ ابومسعودؓ کہتے ہیں غصہ میں مجھے کچھ پتہ نہ چلا کہ کون ہے کہ اتنے میں دیکھتا ہوں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہیں اور فرمارہے ہیں،

اعلم ابا مسعود ان اللہ اقدر علیک علیٰ ھذا الغلام (مسلم)	خبردار! ابومسعود حق تعالیٰ تم پر تمہارے غلام سے زیادہ قابو رکھتے ہیں۔

اور غالبًا یہ تو سب ہی جانتے ہیں کہ غلاموں اور لونڈیوں کو عبدی (میرا غلام) امتی (میری لونڈی) کہنا اور ان لوگوں کا اپنے آقاؤں کو ربّی (میرا رب اور مالک، ربتی (میری مالکہ کہنے کی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ممانعت فرمادی تھی اور حکم تھا کہ بجائے غلام کے فتائی (میرا جوان) اور آقا کو بجائے رب کے سیدی (میرے سردار) کہا کریں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب مبارک میں غریبوں کے اس طبقہ کا کتنا خیال تھا۔ اس کا اندازہ اسی سے ہو سکتا ہے کہ آخری آواز دنیا کے کانوں نے خدا کے آخری پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) کی زبانِ مبارک سے جو سُنی وہ،

الصلوٰۃ وما ملکت ایمانکم۔	نماز اور جن کے تم مالک ہوان کی خبر لیتے رہنا (یعنی ان دونوں کے حقوق کا سب سے زیادہ لحاظ رکھنا)

کی تھی صلی اللہ تعالیٰ علیٰ النبی الامی وعلیٰ آلہ وصحبہ اجمعین۔

اسی طرح قرآن کی مشہور آیت،

ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم۔	اللہ کے پاس سب سے زیادہ شریف وہی ہے جو تم میں سب سے زیادہ پرہیزگار ہو۔

میں "پیشہ ورانہ" طبقات کی جن درجہ بندیوں کو توڑ پھوڑ کر رکھ دیا گیا ہے اور بجائے پیشوں اور نسلوں کے تقویٰ کو معیارِ فضیلت قرار دیا گیا ہے اس سے مزدوری کے کسی پیشہ کو افضل اور کسی کو کمتر قرار دینے کی بنیاد ہی نکل گئی۔ اسلام اور اسلام پر صحیح معنوں میں چلنے والوں نے اس سلسلہ میں جو عملی نمونے پیش کئے ہیں تاریخ کے اوراق اس سے معمور ہیں۔ حتیٰ کہ اسی بنیاد پر ہندوستانی تمدن کے نئے ایک متوالا ابوالفضل تعریضًا کہا کرتا تھا کہ فلاں حلوائی اور فلاں کفش دوز کی باتوں کا کیا اعتبار۔

یعنی اسلام میں عموماً بڑے بڑے علماء، فقہا، جو گذرے ہیں ان میں زیادہ تر لوگوں کا تعلق مزدوری کے معمولی پیشوں سے تھا۔ افسوس کہ جو چیز اسلام میں باعثِ فخر ہے۔ اس ہندی تمدن کے مسحور کی نگاہ میں وہی باعثِ ننگ قرار پائی۔ مگر بحمد اللہ اب دنیا فہم کے جس نقطہ پر آچکی ہے وہ فیصلہ کر سکتی ہے کہ آج جس چیز کے ماننے کے لئے عالم مضطرب ہے۔ اسلام صدیوں پہلے اس نظریہ کو پیش کر چکا ہے اور عمل کر کے دکھا چکا ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ ٹھٹھیروں کو بھی اسلام نے جب تخت و تاج کا مالک بنایا تو صفاریت[1] کے لقب کو انھوں نے بطور فخر کے استعمال کیا، اور غلاموں کی جو قدر و عزت اسلام میں ہوئی دنیا کی تاریخ اپنے پاس اس کی نظیر نہ اس سے پہلے رکھتی ہے اور نہ بعد۔ تقریباً ائمہ حدیث و فقہ کی بڑی جماعت موالی ہی کے خاندان سے تعلق رکھتی تھی۔ صرف دین ہی میں نہیں، مختلف مقامات میں دنیا کے حساب سے بھی دنیوی ارتقاء کے آخری نقطہ سلطنت و بادشاہت تک غلاموں کو عروج پاتے ہوئے تم مسلمانوں میں پا سکتے ہو۔''

لیکن باوجود اس کے ذلت کی وجہ سے نہیں بلکہ بعض پیشوں کا چونکہ گندگی اور نجاست سے تعلق ہے اس لئے چند خاص پیشوں کے متعلق علمائے اسلام میں کچھ اختلاف پایا جاتا ہے جن میں ایک تو سنگھی لگانے (حجامت) کا پیشہ ہے۔ چونکہ سنگھی لگانے والے خون کو چوستے ہیں اور خون نجس چیز ہے۔ اس لئے بعض حدیثوں میں آیا ہے۔

کسب الحجام خبیث۔ — سنگھی لگانے والے کی کمائی گندی ہے۔

لیکن باوجود اس کے بھی اکثر ائمہ اسلام نے اس کی اجرت اور مزدوری کو حلال ہی قرار دیا ہے۔ علامہ مقدسی نے اجرۃ مباح یعنی "سنگھی لگانے کی مزدوری حلال ہے" لکھنے کے بعد رقم فرماتے ہیں۔

ھذا قول ابن عباس قال
انا اکلہ وبہ قال عکرمۃ
والقاسم وابوجعفر محمد بن
علی بن الحسین وربیعہ ومالک
والشافعی واصحاب الرائے۔

یہ ابن عباس کا قول ہے۔ انھوں نے
فرمایا کہ میں اس کو کھاتا ہوں اور یہی فتویٰ
عکرمہ، قاسم، ابوجعفر محمد بن علی بن الحسین
اور ربیعہ، امام مالک، امام شافعی اور
اصحاب رائے (ابوحنیفہ) کا ہے۔

اگرچہ بعضوں کو اس سے اختلاف بھی ہے۔ تاہم یہ اختلاف حجام کے صرف سنگھی لگانے کے کام کی حد تک محدود ہے، باقی عموماً حجام جو دوسرے کام کرتے ہیں ان کے جواز میں تو کسی کو کلام ہی نہیں ہے، مقدسی کا بیان ہے

استیجار الحجام بغیر الحجامۃ
کالفصد وحلق الشعر و
تقصیرہ والختان وقطع شیٔ

پچھنا لگانے کو چھوڑ کر حجاموں کے یہ
کام یعنی فصد کا کام، بال مونڈنے کا کام
یا تراشنے کا یا ختنہ کرنے کا یا جسم کے کسی

---

[1] صفار عربی میں ٹھٹھیروں کو کہتے ہیں، خاندان صفاریہ حکومت اسلامی کے خاندانوں میں مشہور تاریخی خاندان ہے ۱۲

من الجسد للحاجة فجائز۔ — حصہ کے کاٹنے کا اگر ضرورت پیش آئے تو اس کی مزدوری جائز ہے۔

اسی سلسلہ کی ایک اور چیز کا تذکرہ بھی فقہائے اسلام نے کیا ہے، یعنی خاکروبوں اور بھنگی کا کام جو ہے کہ اگرچہ یہ بھی ایک قسم کی مزدوری ہے۔ لیکن بھنگیوں کو چونکہ نجاست سے کام پڑتا ہے اس لئے بعض نے اس پیشہ کو اچھا نہیں خیال کیا ہے۔ ابن عباس کا ایک اثر بھی اس باب میں نقل کیا جاتا ہے کہ حج سے فارغ ہو کر ایک آدمی ان کے پاس آیا اور بولا کہ

أكنس فما ترى في مكسبي۔ — میں صفائی کا کام کرتا ہوں، میرے پیشہ کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے۔

ابن عباس رضؓ نے پوچھا

"اى شيئ تكنس" (کس چیز کو صاف کرتے ہو) بولا العذرة (یعنی غلاظت) کو صاف کرتا ہوں اور آگے اس پر اس نے اضافہ بھی کیا،

ومنه حججت ومنه تزوجت — اس کی مزدوری سے میں نے حج بھی کیا اور شادی بھی کی۔

یہ سن کر ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کو سخت کراہت پیدا ہوئی غصہ میں بولے۔

انت خبيث وحجك خبيث و — تو بھی گندہ تیرا حج بھی گندہ اور جو تو نے

ما تزوجت خبيث۔ — شادی کی وہ بھی گندی۔

لیکن باوجود ابن عباس کے اس سخت فتویٰ کے علماء نے اس "خبث" کا مطلب مذہبی "خبث" نہیں لیا ہے بلکہ طبعی خبث اور کراہت مراد ہے، اسی لئے عام خیال یہی ہے کہ

الاجارة جائزة لان الحاجة — غلاظت صاف کرنے کی مزدوری جائز ہے

داعية اليها ولا تندفع الا — کیونکہ ضرورت کا تقاضا ہے کہ جب تک

باباحة الاجارة فوجبت اباحتها — اس کی مزدوری حلال نہ ہوگی یہ ضرورت

كالحجامة (المغنی ص ۱۳۶) — پوری نہیں ہو سکتی، اس لئے اس کا حلال ہونا ضروری ہوا جیسے سنگی لگانے کی مزدوری حلال ہے۔

اس موقعہ پر ایک دلچسپ واقعہ کا ذکر بے محل نہ ہوگا۔

کھاد جس میں ہر طرح کی نجس چیزیں شریک ہوتی ہیں گوبر، غلاظت وغیرہ، لیکن مشہور صحابی یعنی فاتح ایران حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے متعلق کتابوں میں یہ نقل کرتے ہیں کہ

كان سعد بن ابى وقاص — حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ

رضی اللہ تعالیٰ عنہ يحمل — کھاد خود اٹھا کر اپنے کھیت میں ڈالتے

عرة الى ارض له وكان يقول — تھے جو ان کی ملکیت میں تھا اور فرماتے کہ

سعد مكتل عترة مكتل بر۔	"ایک ٹوکری کھاد کی گیہوں کی ایک ٹوکری ہے"
(بیہقی ص ۱۳۹ ج ۲)	

عترہ کی شرح اصمعی کے حوالہ سے بیہقی نے نقل کیا ہے کہ عذرۃ الناس کو کہتے ہیں، یعنی غلاظت! ظاہر ہے کہ انسانی غلاظت تو وہ نہیں لیں گے بلکہ مختلف چیزوں کو ملا کر کھاد تیار کرتے تھے، ترکاری کی کھاد کا ذکر ابن سعد میں بحوالہ ابوالعالیہ یہ ہے کہ الخرو والبول والحائض ص ۸۴ ج ۷۔ یعنی پرندوں کی بیٹ، پیشاب اور حیض کے لتے۔ اس لئے بعض صحابہؓ کھاد ڈالنے کو ناپسند کرتے تھے۔ ابوالعالیہ بھی عموماً ساگ پات ترکاری اس لئے کم کھاتے، البتہ حضرت انس رضی اللہ عنہ کا بصرہ میں جو باغ تھا اس سے تحفہ جب ترکاری آتی تو شوق سے کھاتے شاید بغیر کھاد کے اگائی جاتی ہوگی حضرت انسؓ کے اس باغ میں، لکھا ہے کہ ایک پھول تھا جس سے مشک کی بو آتی تھی (ابن سعد ص ۱۰ ج ۷)

اسی قسم کی ایک "گندہ اجرت" جس کا جاہلیت میں غالباً رواج تھا اور اسے اصطلاحاً "عسب الفحل" کہتے تھے۔ یعنی اونٹ، بکری، گھوڑے وغیرہ کا جس کے پاس نر جانور ہوتا، وہ بچہ کشی کے لئے اس نر کو کرایہ پر چلاتا تھا۔ فقہاء نے اس معاوضہ کو مکروہ لکھا ہے اگرچہ ضرورت کی وجہ سے بعضوں نے اجازت بھی دی ہے۔ بہرحال اگر معاہدہ کے طور پر نہیں بلکہ بطور ہدیہ کے نر کے مالک کو کچھ دیدیا جائے اس میں حرج نہیں ہے لکھا ہے،

ان اطرق انسان فحله	اپنے نر کو کوئی اگر بغیر کسی اجارہ اور
بغير اجارة ولا شرط فاهدى	شرط کے چھوڑے اور اس کے بعد
له هدية او اكرم بكرامة	کوئی تحفہ دیا جائے یا کوئی عزت افزائی
لذلك فلا باس به۔ (ص ۱۴۴)	ہو، تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ بجز ایسی چیزوں کے جن سے استفادہ ہی کو اسلام نے حرام قرار دیا ہے۔ مثلاً زنا، گانا بجانا، نوحہ گری، تصویر کشی وغیرہ۔ چونکہ یہ سارے کام بھی اسلامی نقطۂ نظر سے برے ہیں، اس لئے ان کو بھی حصولِ معاش کا ذریعہ بنانا جائز نہیں ہے۔ یہ خیال رکھنا چاہیئے کہ ائمہ نے اس باب میں جو کچھ کہا ہے نصوص اور اسلامی مستندات کی بنیاد ہی پر کہا ہے ورنہ جہاں کہیں تھوڑی سی بھی گنجائش نظر آئی ہے سبھوں نے نہیں تو بعض ائمہ نے معاش کی اس راہ کو بھی کھولنے کی کوشش کی ہے۔ فقہائے اسلام نے اس باب میں کس حد تک وسعت نظر سے کام لیا ہے اس کا اندازہ اس ایک مثال سے ہو سکتا ہے کہ شراب جیسی حرام چیز کے متعلق اوروں کا تو نہیں۔ لیکن امام ابوحنیفہ کا یہ فتویٰ کتابوں میں نقل کیا جاتا ہے۔

من حمل لذمی خمرا فانه يطيب	اگر کسی غیر مسلم ذمی کی شراب (مسلمان) ڈھوئے
له الاجر عند ابی حنيفه۔	تو مسلمان کے لئے اس ڈھونے کی مزدوری
(کتاب الکراہیۃ ہدایہ ص ۲۰۵ ج ۴)	امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک پاک ہے۔

امام صاحبؒ کے خیال کی توجیہ کرتے ہوئے صاحب ہدایہ نے لکھا ہے کہ شراب کا پینا حرام ہے اور پینے کی نیت سے اس کا ڈھونا بھی حرام ہے۔ لیکن اس مسلمان بیچارے کی غرض تو مزدوری ہے خواہ پانی ہو یا شراب۔ پھر اس کی مزدوری کو کس بنیاد پر ناپاک قرار دیا جائے۔ لیکن اور تو اور امام صاحب کے دونوں شاگرد ابویوسف و محمد بن حسن کا فتویٰ اس کے خلاف ہے کیونکہ حدیث میں چونکہ شراب کے سلسلہ میں جن جن لوگوں پر لعنت کی گئی ہے ان میں حاملها اس کے ڈھونے والے کا لفظ بھی ہے۔ امام صاحب کہتے ہیں کہ جو خود پینے کے لئے شراب ڈھوئے اس کے ساتھ یہ حکم مخصوص ہے۔ بہرحال مجھے اس مثال سے فقہاء کی معاشی وسعت نظری کا ثبوت پیش کرنا تھا اور یہ اس کی بہت اچھی مثال ہے۔ مگر باوجود ان وسعتوں اور اجازتوں کے دو چیزیں فقہاء کی کتابوں میں عجیب پائی جاتی ہیں، یعنی ایک تو یہ کہ مسلمان کیا کسی کافر کی ملازمت اور نوکری کر سکتا ہے؟ یہ سوال اٹھایا گیا تھا اور بدقسمت مسلمانوں کے متعلق کیا معلوم تھا کہ کبھی ایسا زمانہ بھی آئے گا کہ جواب تو جواب سوال بھی دماغوں سے نکل جائے گا۔ حتیٰ کہ بالآخر ان کی ساری قومی اور ملی کوششوں کا آخری محور یہی مسئلہ رہ جائے گا کہ غیر اسلامی حکومتوں میں ملازمت کے حقوق کی کتنی مقدار ان کو حاصل ہوئی۔ مغنی کے متن کا مسئلہ ہے۔

لا تجوز اجارة المسلم	مسلمان کو ذمی کا ذاتی خدمت کے
للذمی لخدمته نص علیه	کے لئے نوکر رکھنا یہ جائز نہیں ہے۔
احمد۔	امام احمدؒ نے اس کی تصریح کی ہے۔

دلیل یہ بیان کی ہے کہ یہ

حبس المسلم عند الکافر	یہ مسلمان کا کافر کے پاس قید ہونا بھی
و اذلاله له۔	ہے اور مسلمان کو ذلیل کرنا بھی ہے۔

مجھے مسئلہ کے ذکر سے اس وقت جواز و عدم جواز کی تحقیق مقصود نہیں ہے۔ آخر اسے اگر جائز نہ قرار دیا جائے گا تو مسلمانوں کے جینے کی شکل ہی کیا رہے گی، بلکہ دکھانا کسی قوم کے تاریخی انقلاب کا ہے۔

واذا اراد اللہ بقوم سوء	اور اللہ جب کسی قوم کے ساتھ برائی کا
فلا مرد له وما له من	ارادہ فرماتا ہے۔ تو پھر اسے کوئی
دونه من وال۔	پلٹا نہیں سکتا اور نہ اس کا کوئی
	والی و مددگار ہوتا ہے۔

اسی سلسلے کے ایک مسئلہ کا ذکر آخر میں اس لئے کر دیا جاتا ہے کہ فقہائے امت کی بلند نظری کا لوگوں کو کچھ احساس ہو اور معلوم ہو کہ اسلامی معاشیات کی تدوین میں ان بزرگوں نے کتنی بے لوثی سے کام کیا ہے۔ سب جانتے ہیں کہ ان بزرگوں کا کام ہی قرآن و حدیث کی تدریس و تعلیم یا مساجد کی امامت و خطابت وغیرہ تھا۔ اور اب بھی بیچارے مولویوں کا یہی کام ہے۔ نزہۃ

اس کے حیرت ہوتی ہے کہ چند لوگوں نے نہیں بلکہ اکثر ائمہ اسلام کا فتویٰ ان تمام امور کے متعلق یہ ہے کہ ان خدمات کا معاوضہ لینا جائز نہیں ہے۔ مقدسی لکھتے ہیں کہ جن کاموں پر معاوضہ لینا درست نہیں ہے ان میں "الامامۃ والاذان والحج وتعلیم القرآن" بھی ہے اور اس کے بعد لکھتے ہیں کہ

نص علیہ احمد وبہ قال	امام احمد نے اس کی تصریح کی ہے
عطاء والضحاک بن قیس	اور یہی فتویٰ ضحاک بن قیس، ابوحنیفہ
وابو حنیفہ والزہری۔	اور زہری کا ہے۔

فقہ کی کتابوں میں اس پر بحث کی گئی ہے اور بالآخر زمانے کے حالات کا اندازہ کرکے جواز کا فتویٰ اس بنا پر دے دیا گیا کہ چند ائمہ مثلاً شافعیؒ، مالکؒ جواز کے قائل تھے۔ آخر اگر اس کا فتویٰ نہ دیا جائے تو مفت حسبۃ للہ ان خدمات کو انجام دینے کے لئے کون آمادہ ہو سکتا ہے۔ یہ تو کچھ گذشتہ بزرگوں ہی کی ہمت تھی کہ معاش کے لئے کوئی دوسرا ذریعہ اختیار کرکے دین کی ان خدمات کو مفت انجام دیتے تھے لیکن ع

زمانہ دگر گوں آئین نہاد

مزارعت و مساقات چاہئیے تو یہی تھا کہ ان دونوں معاملات کا ذکر بھی اجارہ ہی کے ذیل بیان کر دیا جاتا۔ کیونکہ اس کا تعلق بھی محنت و مزدوری سے ہے۔ لیکن کچھ تو اس لئے کہ عموماً فقہاء اسلام ان دونوں کو الگ الگ کرکے لکھتے ہیں۔ اس لئے میں بھی ان کا علیحدہ ذکر کرتا ہوں اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ محنت و سرمایہ میں جو جھگڑا اس وقت دنیا میں جاری ہے اس سلسلہ میں جس طرح صنعتی مزدوروں اور سرمایہ داروں کے اختلاف کے حل کی ایک شکل اسلام نے پیش کی ہے جیسا کہ گذر چکا کہ مزدور اور سرمایہ دار کی معاشی زندگی کم از کھانے پینے کی حد تک ایک ہو۔ یا یوں کہئے کہ مزدوری مزدوروں کو اتنی ملنی چاہئیے جس کے ذریعہ سے ان کی خوراک اور ان کا لباس سرمایہ دار کی خوراک اور لباس کے برابر ہو جائے۔

دوسری بات یہ ہے کہ مزدور کو منافع سے بھی کچھ حصہ ملنا چاہئیے۔ تیسری بات یہ ہے کہ مزدوروں پر ان کی طاقت سے زیادہ بوجھ نہ ڈالا جائے۔ یعنی سرمایہ دار کے لئے یہ جائز نہ ہوگا کہ محض مصارف کے ڈر سے زیادہ مشقت کے کام کو چند ہی مزدوروں سے لے بلکہ ان کی اعانت کے لئے قوت کا اضافہ کرے۔ نیز اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان کے کام کا وقت اسی قدر مقرر کیا جائے جتنا کہ وہ آسانی سے کر سکتے ہیں۔

جیسا کہ عرض کر چکا ہوں کہ صحاح کی صحیح روایتوں سے یہ تینوں نتائج برآمد ہوتے ہیں قریب قریب کچھ اسی قسم کا مسئلہ زمین کے سرمایہ داروں اور مزدوروں کا بھی معلوم ہوتا ہے۔ قصہ یہ ہے کہ قبل اسلام عرب خصوصاً مدینہ و اطراف مدینہ میں زمینداروں اور کاشت کاروں کے درمیان

مختلف قسم کے معاملات جاری تھے مثلاً

(۱) زمین میں کچھ بھی پیدا ہو مگر زمیندار کو بہرحال بیس من فی بیگہ مثلاً کاشت کار ادا کرے گا اسی کو مزارعت بجزءٍ معلومٍ کہتے ہیں۔ اس کی بھی دو صورتیں تھیں، اسی کھیت سے غلّہ کی اس مقدار کو ادا کرے گا یا خود گھر سے دے گا۔

(۲) زمین کے اچھے قطعات کی پیداوار زمیندار کو ملے گی اور معمولی خراب پیداوار قطعہ کا مستحق کاشت کار ہوگا۔

(۳) جو کچھ پیدا ہو اس کا نصف یا ثلث جو بھی طے ہو جائے کاشت کار کو دے گا۔ گویا یہ ساری شکلیں بٹائی کی عرب میں مروج تھیں۔ لیکن نقدی بندوبست یعنی فی بیگہ کاشت کار سالانہ مثلاً دو روپے، چار روپے الغرض جو طے ہو جائے ادا کرے گا اور کل پیداوار کا وہ مالک ہوگا۔

نقدی کی یہ شکل بھی عرب میں مروج تھی یا نہیں، اس کا اب تک صاف صاف پتہ نہ چلا۔ رافع ابن خدیج جن کا گھرانا مدینہ کے سب سے بڑے کاشت کاروں میں تھا، ان کے ایک بیان سے تو معلوم ہوتا ہے کہ کم از کم مدینہ کے لوگ اس سے واقف نہ تھے۔ بہرحال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بٹائی کے نمبر (۱) اور نمبر (۲) دونوں طریقوں کو غیر قانونی قرار دیا۔ کیونکہ بسا اوقات ان میں سے بے چارے کاشت کار کے پلے کچھ نہیں پڑتا۔ بلکہ یہ بھی ممکن ہے کہ گھر سے تاوان ادا کرنا پڑے۔ تمام فقہاء اسلام بلا استثنا بٹائی کی ان دونوں شکلوں کے ناجائز ہونے کے قائل ہیں۔

البتہ تیسری شکل اس کے متعلق اختلاف پایا جاتا ہے۔ یہ ظاہر بات ہے کہ جو کچھ من دو من دس من کھیت میں پیدا ہو، اس کا ثلث یا نصف بانٹا جائے اس میں کاشت کار کے نقصان کی شکل نظر نہیں آتی۔ اس لئے کہ اس کو گھر سے کچھ دینا نہیں پڑتا۔ البتہ اگر کچھ پیدا نہ ہو تو تخم اور محنت دونوں اس کی ضائع ہو سکتی ہیں۔ مگر زمیندار کی زمین بھی چونکہ اس کی کاشت کی وجہ سے بے کار رہی۔ اس گونہ معاملہ برابر برابر سا ہو جاتا ہے پھر بھی ائمہ اسلام میں اکثروں کا اسی وجہ سے یہ خیال ہے کہ اس صورت میں تخم بھی زمیندار ہی کو دینا چاہیے۔ مغنی میں ہے،

ان المزارعة انما تصح اذا کان البذر من رب الارض والعمل من العامل نص علیه احمد فی روایة جماعة واختاره عامة الاصحاب وهو مذهب ابن سیرین والشافعی واسحاق۔	کھیتی کا معاملہ اسی وقت درست ہو سکتا ہے جب تخم مالکِ زمین زمیندار کا ہو، اور محنت کاشت کار کی۔ امام احمدؒ نے اسی کی تصریح فرمائی ہے جیسا کہ ایک جماعت کی ان سے روایت ہے اور عام اصحاب احمدؒ نے اسی کو اختیار کیا، یہی ابن سیرینؒ اور امام شافعیؒ اور اسحاق کا مذہب ہے۔

وجہ اس کی یہ لکھی ہے کہ:-

ان یکون راس المال کلہ من عند احدھما۔ | تا کہ کل سرمایہ (زمین و تخم) دونوں میں ایک ہی کا ہو۔

اگرچہ کچھ لوگ یہ بھی جائز قرار دیتے ہیں کہ تخم بھی کاشت کار کا ہو تو کچھ حرج نہیں۔

نقدی طریقہ زیادہ مفید ہے

بظاہر یہ صورت ہر دو فریق کے لئے نقصان دہ نہیں ہے۔ مگر عملی تجربہ بتاتا ہے کہ عموماً بٹائی کی اس شکل میں کاشت کار جی لگا کر زمین میں محنت نہیں کرتا وہ بیچارہ یہ خیال کرتا ہے کہ جوتنے، بونے، پانی دینے، گھاس اکھاڑنے، کاٹنے، دانہ نکالنے وغیرہ کا سارا کام تو میں کروں گا یا کوئی قیمتی غلہ اس میں لگاؤں گا تو اس کا بھی کیا حاصل، اس لئے کہ میری محنت کا ایک بڑا حصہ زمیندار محض اس لئے لے جائے گا کہ اس کی زمین ہے۔ اولاً یوں ہی یہ حصہ جو اس کا کمایا ہوا ہے، دیتے ہوئے جبر کرتا ہے۔ ثانیاً وہ جانتا ہے کہ میری زیادہ محنت یا زیادہ قیمتی پیداوار سے کیا نفع کہ اس محنت کا بڑا حصہ تو دوسرے کے گھر پہنچے گا۔ تجربہ بتاتا ہے کہ بٹائی کی زمینوں پر ان ہی وجوہ سے کبھی کاشت کار پوری تن دہی سے محنت نہیں کرتے۔ بلکہ ایک اور طریقہ یہ اختیار کرتے ہیں کہ بہت سی زمین مختلف زمینداروں سے لے کر کاشت کر لیتے ہیں۔ پوری توجہ کسی پر نہیں کرتے، سمجھتے ہیں کہ ہوا تو خیر ہمیں کچھ تو مل ہی جائے گا۔ اور نہ ہوا تو ہمارا کیا بگڑے گا۔ خصوصاً جب ان فقہاء کی رائے اختیار کی جائے جو تخم بھی زمیندار کے سر ڈالتے ہیں کاشت کاری کا یہ بڑا اہم راز ہے جو براہ راست اس کا تجربہ نہیں رکھتے وہ اس کو شاید سمجھ ہی نہیں سکتے۔ البتہ کاشت کاروں کے لئے بہترین اطمینان بخش شکل نقدی بندوبست کی ہے۔ یعنی فی بیگہ کوئی معین رقم طے کر کے ان کو زمین دے دی جائے۔ ایسے کھیتوں پر کاشت کار پورا زور لگا دیتا ہے کیونکہ رقم تو اس کو بہرحال دینی ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ جتنا زیادہ سے زیادہ نفع ہم زمین سے اٹھا سکتے ہوں اس میں کمی نہ کریں۔ بجائے ایک فصل کے دو دو تین تین فصل تک ایک ایک کھیت سے اٹھانے کی کوشش کرتا ہے اور یہ مشاہدہ ہے کہ جس کھیت سے بٹائی کی صورت میں کاشت کار تین چار من غلہ بھی سالانہ پیدا نہیں کرتا تھا نقدی کی صورت میں اسی کھیت سے دو دو سو تین تین سو روپے پیدا کر لیتا ہے۔ اچھی سے اچھی قیمت کی چیزوں کی کاشت کرتا ہے۔

بہرحال یہ تو کاشت اور اس کی بندوبست کے مختلف طریقے ہیں اور جیسا کہ میں نے عرض کیا۔ یوں تو بٹائی کی مذکورہ بالا شکل عام علماء اسلام کے نزدیک جائز ہے۔ مگر حدیثوں کے دیکھنے سے ایک اور بات معلوم ہوتی ہے۔

میرا مقصد یہ ہے کہ جب عموماً صحابہؓ میں بٹائی کا طریقہ مروج تھا اور بقول امام بخاری،

مابالمدینۃ اھل بیت الا و یزرعون علی الثلث والربع۔ | مدینہ میں شاید ہی کوئی گھرانا ہوگا جس میں تہائی اور چوتھائی پر کھیتی نہ ہوتی ہو۔

اور بخاری ہی میں ہے،

وزارع علی وسعد بن مالک	اور حضرت علی حضرت سعد بن مالک و
وابن مسعود وعمر بن عبد العزیز	ابن مسعود و عمر بن عبد العزیز قاسم اور
وقاسم وعروہ وال ابی بکرو	اور عروہ اور حضرت ابو بکر کے گھرانے والے
ال عمرو ال علی وابن سیرین	حضرت عمر کے گھرانے والے حضرت علی
وقال عبد الرحمٰن بن الاسود	کے گھرانے والے اور ابن سیرین سب ہی
کنت اشارک عبد الرحمٰن	کاشت بندوبست کرتے تھے عبد الرحمٰن
بن یزید فی الزرع -	بن اسود لکھتے ہیں کہ میں عبد الرحمٰن بن یزید
(البیہقی ص ۱۳۵ ج ۲)	کے ساتھ بٹائی پر کاشت کرتا تھا۔

جس سے جہاں یہ معلوم ہوا کہ عہد صحابہؓ میں کاشت کاری کا رواج کس پیمانہ پر تھا۔ وہیں اس سے بٹائی پر کاشت کاری کا بھی ثبوت فراہم ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں اس کو ناجائز کہنے کی کوئی وجہ نہیں ہو سکتی۔ لیکن اسی کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک مخفی منشا کا بھی پتہ چلتا ہے۔ تفصیل اس کی یہ ہے کہ وہی رافع ابن خدیج جن کا ذکر پہلے آچکا ہے اور جن کا گھرانا مدینے کے سب سے بڑے کاشت کاروں کا تھا ان سے ایک روایت عہد صحابہؓ میں مشہور ہوئی جس کے الفاظ مختلف ہیں۔ ایک طریقہ اس کا درج کرتا ہوں، وہ فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

انما یزرع ثلاثة رجل له ارض	کھیتی تین ہی قسم کے آدمی کر سکتے ہیں
فهو یزارعها ورجل منح اخاه	ایک تو وہ جس کی زمین ہو اور اس میں
ارضا فهو یزرع ورجل اکتری	کھیتی کرے، دوسرا وہ جسے اس کے
بذهب وفضة (الطحاوی)	بھائی نے زمین دی ہو اور وہ اس میں کھیتی

کرے، تیسرا وہ آدمی جو زمین کو سونے یا چاندی کے معاوضہ میں کرایہ پر لے۔

حضرت رافع نیز حضرت جابر بن عبد اللہ دونوں صحابیوں سے اس باب میں اس قسم کے الفاظ مروی ہیں جنمیں ان سب کا یہ ہے کہ اگر کسی کے پاس زمین ہو تو یا اس میں خود کاشت کرے اور اگر خود نہیں کرتا تو پھر اس کے لئے کل دو صورتیں ہیں، یا تو اپنے کسی بھائی کو مفت کاشت کرنے کے لئے دیدے، ورنہ بھی پسند نہ ہو تو سونے چاندی کی شکل میں اس کا کرایہ لے۔ یعنی نقدی بندوبست کردے۔ جس کے معنی یہی ہوئے کہ بٹائی کی مذکورہ بالا شکل کو بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم باقی رکھنا نہیں چاہتے تھے بلکہ جس طرح پس ماندہ سرمایہ کو قرض میں ڈال کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خیرات کی مدوں میں ایک جدید مد کا اضافہ فرمایا ہے۔ اسی طرح زائد زمین کے متعلق بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نیکی کے ایک نئے باب کو کھولا ہے جس سے شاید دنیا اب تک ناواقف ہے ٹھیک جس طرح قرض کی صورت میں مقروض سے کسی قسم کے نفع اٹھانے کی ممانعت کردی گئی ہے۔ اسی طرح زائد زمین جو بطور حسن سوک

دی گئی ہو، اس سے نفع اٹھانے کی ممانعت ہے۔ ان ہی رافع سے کسی نے پوچھا تھا کہ اگر ہم زمین میں کچھ نہ بوئیں اور نہ کسی کے ساتھ نقدی بندوبست کریں اور کسی دوسرے نے اس میں کاشت کی پھر اگر

وھب لی من نباتہا شیئا اخذہ	اس کی روئیدگی سے مجھے کچھ جز دے کیا
قال لا (احمد)	میں اسے لے سکتا ہوں بولے نہیں۔

جابر بن عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ والی حدیث کے الفاظ یہ ہیں،

قال کان لرجال من فضول	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے
ارضین علی عہد	زمانے میں بعض لوگوں کے پاس
رسول اللہ صلی اللہ	زائد از ضرورت زمینیں تھیں، عموماً
علیہ وسلم فکانوا	لوگ نصف یا تہائی چوتھائی پر
یواجرونہا علی النصف	اپنی زمینوں کو بندوبست کردیا کرتے
والثلث والربع فقال	تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم	فرمایا جس کے پاس زمین ہو اس میں
من کان لہ ارض فلیزرعہا او	وہ خود کاشت کرے ورنہ پھر اپنے کسی
لیمنحہا اخاہ فان ابی فلیمسک[۱]	بھائی کو دیدے اور اگر اس سے وہ انکار
(طحاوی)	کرتا ہے تو پھر رک جائے۔

(فضول ارضین) یعنی زائد از کاشت زمین اگر زمیندار کے پاس ہو تو ایک صورت یہ ہے کہ آخرت کے لئے اس میں کاشت کرائے اور ثواب کی خدا سے توقع کرے، اور یہ نہ ہوسکے تو جیسا کہ حضرت رافع سے مروی ہے زمین کو نقدی بندوبست کردے۔

مساقات اور یہ حال تو زراعت یعنی کاشت کا ہے، قریب قریب یہی نقطۂ نظر اسلام میں "مساقات" یعنی باغات اور تاکستانوں کے متعلق ہے کہ گو عموماً فقہاء یہ جائز قرار دیتے ہیں کہ مالک باغ کسی کو اپنا باغ اس شرط سے بندوبست کرے کہ جو کچھ پھل آئے نصف و ثلث کے حساب سے تقسیم کرلیا جائے گا۔ البتہ مالک باغ کے لئے یہ جائز نہ ہوگا کہ کوئی متعین حصہ پھلوں کا مثلاً یہ کہ چار سو آم یا دو ہزار جام[۲] اس معاملے میں

---

[۱] ان دونوں حدیثوں کے سوا حدیث کی کتابوں سے اور بھی مواد فراہم کیا جاسکتا ہے جن سے معلوم ہوسکتا ہے کہ زمین کو آدمی خود جوتے یا بلا کرایہ کسی کو دیدے۔ یعنی یہ بات کی نقدی بھی کچھ نہ لے بعض حدیثوں میں اس پر "ربوا" کے لفظ کا اطلاق کیا گیا ہے۔ کیا اس سے یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ زمینداروں کے اس طبقہ کو جو نہ خود کاشت کرتے ہیں اور نہ مفت دوسروں کو دیتے ہیں، بلکہ زمین کا کرایہ بشکل نقد یا غلہ کھاتے ہیں۔ کیا اسلام اس طبقے کو ختم کردینا چاہتا ہے۔ یہ ایک اہم معاشی سوال ہے اور اس پر بحث کی کافی گنجائش ہے ۱۲

[۲] جام حیدرآباد میں امرود کو کہتے ہیں ۱۲

مستثنیٰ رہیں گے۔ اس لئے کہ ہوسکتا ہے باغ میں اسی قدر پھل آئے۔ پھر بیچارے باغ لینے والے کو اپنی محنت کا کیا صلہ ملے گا۔ وہ سال بھر اس میں پانی دے گا، درختوں کو چھانٹے گا، حفاظت کرے گا اور مالک باغ اس ناجائز شرط کی بنا پر پوری آمدنی اس کی لے لے گا۔

لیکن باوجود اس عمومی جواز کے خصوصیت کے ساتھ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ مشہور اماموں میں ایک ایسے امام گذرے ہیں جو کاشت ہو یا باغ یعنی زراعت ہو یا مساقات دونوں صورتوں میں بٹائی کے طریقہ کو ناجائز قرار دینے پر مصر ہیں۔ ان کا مذہب اس باب میں نہایت تعجب سے یہ نقل کیا جاتا ہے۔

ان لا یجوز المساقاۃ ولا المزارعۃ الا بالدراھم والدنانیر وما اشبھاھا۔ (طحاوی)

باغبانی کا معاملہ اور کاشت کاری کا معاملہ ہر دو صورت کے جواز کی شکل اس کے سوا نہیں ہے کہ ان کو درہم و دینار وغیرہ (نقدی) کی شکل میں بندوبست کیا جائے۔

اب تک تو دنیا نے امام کے اس خیال پر حیرت کا اظہار کیا ہے حتیٰ کہ ان کے دونوں مشہور شاگرد محمد بن حسن و قاضی ابو یوسف تک کے متعلق طحاوی کو لکھنا پڑا کہ

واما ابو یوسف ومحمد بن الحسن رحمھما اللہ قد ذھبا الی جوازھا جمیعا۔

لیکن ابو یوسف اور محمد بن حسن دونوں کے دونوں (غیر نقدی شکل) کے سوا بھی ان معاملات کے جواز کے قائل ہیں۔ یعنی بٹائی پر بھی معاملہ ہوسکتا ہے۔

مگر اب شاید دنیا کی آنکھیں کھل رہی ہیں۔ بٹائی سسٹم نے کتنی زمینوں کی زرخیزیوں کو روک رکھا ہے۔ اس اندیشے سے جو کچھ بویا جائے گا اس کے ایک بڑے حصے کا مالک زمیندار ہو جاتا ہے جو لوگ زمینداری اور کاشت کاری کے معاملات سے کچھ بھی لگاؤ رکھتے ہیں، جانتے ہیں کہ کسانوں کی ہمتوں کو اس چیز نے کتنا پست کر رکھا ہے کہ مذکورہ بالا خوف سے نہ کھیتوں پر پوری محنت کرتے ہیں نہ قیمتی پیداواروں کے لگانے کی ان میں جرات[1] ہوتی ہے۔

---

[1] موجودہ زمانے میں اس صورت حال کو دیکھ کر زمیندار جب چاہتا تھا کسان کو بے دخل بھی کر سکتا تھا اور اس پر لگان بھی بڑھا سکتا تھا۔ ایک تجویز سوچی گئی اور کچھ دن سے ہندوستان کے مختلف صوبوں میں اس پر عمل ہو رہا ہے کہ کم از کم کسانوں کو بے دخل کرنے کا اختیار زمین دار کو نہیں ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ اب کسان جو یہ کرنے لگے ہیں کہ کچھ خود جوتتے ہیں اور کچھ دوسروں کو نفع کی شرکت کی شرط پر بندوبست کر دیتے ہیں یا بعض تو باوجود کاشت کار ہونے کے کچھ زمین دوسرے کسانوں سے آبادی (باقی بصفحہ آئندہ)

خدا کی زمین اپنی سرسبزی و شادابی اور اپنی نفع بخشی میں بہت آگے بڑھی ہوتی اگر امام کے اصول کو مان لیا جاتا۔ تاہم جیسے جیسے صنعتی کارخانوں سے مزدور و سرمایہ کا سوال آگے بڑھ کر اب زراعتی مزدور و سرمایہ داروں کے درمیان اہمیت حاصل کر رہا ہے۔ اسلام کے معاشی اصول بھی اپنے مقاصد سے نقاب الٹ رہے ہیں، اور کون کہہ سکتا ہے کہ آئندہ چل کر دنیا کو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس مشورے پر یعنی،

من کانت لہ ارض فلیزرعہا	جس کے پاس زمین ہو وہ اس میں
او لیمنح اخاہ فان ابی	خود کھیتی کرے یا اپنے بھائی کو جوتنے
فلیمسک۔	کے لئے دے دے اور اگر وہ

اس سے بھی انکار کرے تو پھر چاہئے کہ روک رکھے۔

یہ بھی غور کرنا پڑے گا کہ بے ضرورت جو لوگ زمینوں پر قبضہ کئے بیٹھے ہیں نہ خود اسے آباد کرتے ہیں نہ ملک کے دوسرے ضرورت مند افراد کو ان سے استفادہ کا موقعہ دیتے ہیں۔ آخر یہ سوال کب تک متحابا رہیگا اس مسئلہ کے متعلق ابھی اور بھی کچھ کہا جا سکتا ہے۔ لیکن میں بالفعل اسی پر بس کرتا ہوں ممکن ہے کہ اس کے متعلق بعض اجزاء کا ذکر حکومت کی آمدنی کے ذیل میں بھی آئے۔

(بقیہ صفحہ گذشتہ)

کراتے ہیں، جو خوف بے دخلی کا زمیندار سے کسان کو رہتا تھا۔ وہی دھندغہ اب کسان کے کسان کو اصلی کسان سے رہتا ہے۔ پس اگر یہ حل زمینداروں کے تباہ کرنے کے لئے سوچا گیا تو ٹھیک ہے۔ لیکن اگر کسانوں کی ہمدردی میں ایسا کیا گیا ہے تو آخر اس ہمدردی کا مستحق کسان کا کسان کیوں نہیں ہے۔ بالفرض وہی حق کسان کے کسان کو بھی دے دیا جائے جو آج زمیندار کے مقابلے میں کسان کو بعض صوبوں میں حاصل ہے تو اگر یہی حرکت کسان کے کسان بھی کرنے لگیں۔ یعنی دوسروں سے کھیت آباد کرائیں، اس وقت کیا ہوگا۔ آخر دور و تسلسل کے قصہ کو کہاں ختم کیا جائے گا۔ نیز مختلف افراد میں زمینوں کی مختلف مقدار کے آباد کرنے کی صلاحیت مختلف وجوہ سے مختلف ہوتی ہے۔ مثلاً روپیہ کی زیادتی یا خاندان کا بڑا ہونا، اس لئے ہر کسان کے لئے کھیت کی مقدار کا معین کرنا بھی مشکل ہے۔ میرے خیال میں تسلسل کے اس قصے کو چھیڑنا ہی غلط تھا۔

حکومت کی آمدنی

اور

اس کے مصارف و اغراض

حکومت کی آمدنی پر بحث کرنے سے پہلے دراصل غور کرنے کی بات یہ ہے کہ حکومت کے زور سے سرکاری خزانوں میں جو روپیہ جمع کیا جاتا ہے اس کے اغراض کیا ہیں یا کیا ہونا چاہئیں۔

جہاں تک تاریخ اور مشاہدے سے معلوم ہوتا ہے کبھی تو یہ آمدنی محض اس لئے جمع کی جاتی ہے کہ جن لوگوں نے زمین کے کسی حصہ پر کسی ذریعہ سے اپنا ایسا اقتدار قائم کر لیا کہ عام باشندوں سے ان کے مطالبوں کا انکار جان و مال کے لئے خطرہ بن جاتا ہے۔ اب ان کا نام خواہ کچھ رکھ لیا جائے راجہ یا بادشاہ یا کنگ یا کچھ اور۔ بہر حال محض ان کے اور ان کے اعزہ و اقربا، حوالی و موالی کے عیش و آرام کا مہیا کرنا یہی ان کی حکومت کی آمدنی کی غرض ہوتی ہے۔ حکومتی آمدنی کے متعلق تنگ ترین نقطۂ نظر جو ہو سکتا ہے وہ یہی ہے لیکن کیا کیا جائے کہ دنیا نے اس کا تماشا اکثر دیکھا ہے۔

اس سے آگے بڑھ کر جو نصب العین اس آمدنی کا ہو سکتا ہے وہ یہ ہے کہ اس آمدنی کو دشمنوں کے خطرات سے محفوظ رکھنے اور آمدنی پیدا کرنے والوں کو اطمینان و فراغت کے ساتھ دولت کی پیدائش میں مشغول رکھنے کے لئے جس ساز و سامان کی ضرورت ہے وہ بھی اس آمدنی سے پوری کی جائے۔ مختصر لفظوں میں یوں کہئے کہ شاہی مصارف کے سوا کشوری (مثلاً عدالت پولیس) اور فوجی مدات پر خزانہ کا روپیہ صرف کیا جائے۔ پہلی غرض سے ظاہر ہے کہ یہ دوسری غرض اپنے اندر ذرا زیادہ وسعت رکھتی ہے۔ اگرچہ اس وسعت کی بھی آخری غرض وہی ہوتی ہے کہ راجہ یا بادشاہ اور ان کے خاندان کے افراد کے عیش و آرام میں خلل واقع نہ ہو۔

اس سے بھی چند قدم آگے بڑھ کر تیسرا نصب العین یہ ہے کہ علاوہ مذکورہ بالا اغراض کے تمام باشندوں کی مشترک ضروریات مثلاً صحت و تعلیم طریقۂ مواصلات (سڑکیں، ریلوے، پوسٹ ٹیلی گرام) وغیرہ اغراض پر بھی حکومت کی قوت سے جمع کردہ رقم صرف کی جائے۔ غالباً اس زمانہ کی

مہذب ترین حکومتوں کی آمدنی کا یہ بلند ترین نصب العین ہے جو قائم کیا جا سکتا ہے یا جیسا کہ کہا جاتا ہے بعض حکومتیں عملاً بھی حاکمانہ اغراض کی تکمیل کے لئے نہیں بلکہ محض محکوموں کی رفاہیت اور خیر اندیشی کے لئے اپنی آمدنی کا ایک بڑا مصرف اسی کو خیال کرتی ہیں۔ جہاں تک میں سمجھتا ہوں عام طور پر حکومتوں کی آمدنیوں کے اغراض اس زمانہ تک عموماً مذکورہ بالا نصب العینوں سے آگے نہیں بڑھے ہیں۔ خواہ وہ حکومت قومی ہو یعنی اپنی قوم پر ہو یا کسی دوسری قوم پر۔

کیا حکومت کی آمدنی کے اغراض اس سے آگے بھی کسی وسعت نظری کو مقتضی ہیں۔ یہ ایک سوال پیدا ہوتا ہے مطلب یہ ہے کہ مندرجہ بالا اغراض کے سوا جب یہ واقعہ ہے کہ ہر حکومت اپنے محروسہ و مقبوضہ علاقہ میں انسانوں کی ایک بڑی آبادی کو بسائے رکھتی ہے۔ اور ان ہی آباد کاروں کی محنت و جانفشانی کی بدولت ایک ایک پیسہ دو دو پیسے اکٹھا کر کے کروڑں روپیہ کا خزانہ جمع کر لیا جاتا ہے اور جب اس زمانے میں کم از کم یہ مان لیا گیا ہے کہ اقتداری قوت خواہ شخصی یا خاندانی رنگ میں ہو یا کسی جتھے اور ٹولی کی شکل میں ہو ان کے عیش و آرام بنگلے دگلے کے سوا حکومت کی آمدنی کا مصرف رعایا کی سہولتوں کا بھی بہم پہنچانا ہے۔ اسی لئے تعلیم و صحت وغیرہ کو بھی اب حکومتوں نے اپنے موازنوں کا جز بنا لیا ہے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ سرکاری خزانے جن غریبوں کی پیشانیوں کے پسینے کے قطرے قطرے سے سمندر بنتے ہیں کیا ان کی ضرورتیں ان ہی عام پبلک ضرورتوں تک محدود ہیں جن سے محکوموں کے ساتھ ساتھ حاکموں کو بھی نفع پہنچتا ہے سڑکوں پر اگر غریبوں کے جھٹکے اور بنڈیاں چلتی ہیں تو اقتداری قوتوں کی موٹریں اور جوڑیاں بھی تو آخر ان ہی سے گذرتی ہیں۔ جن ہسپتالوں سے غریبوں کو دوائیں ملتی ہیں ان ہی کے سرجنوں اور نائب سرجنوں سے حاکمانہ دائروں کو بھی تو مڈیکل ایڈ وقت پر میسر آتا ہے اور جن کالجوں اور اسکولوں میں ملک کے عام رعایا کے بچے خواہ کسی قیمت پر بھی ہو علم حاصل کرتے ہیں۔ ان ہی سے حکومت کو اپنی مختلف مشنری کے لئے پرزے بھی مہیا ہوتے ہیں۔ یقیناً ملک کے آباد کاروں کی ضرورتیں ان ہی مشترک اور عام ضرورتوں تک محدود نہیں ہیں۔

آخر ان ہی میں آئے دن کتنے بچے یتیم ہوتے ہیں۔ کتنے جوان بوڑھے ہو کر بیکار ہوتے رہتے ہیں۔ کتنی عورتیں بیوہ ہوتی ہیں۔ کتنے تاجر نقصان اور خساروں میں مبتلا ہو کر دیوالیہ بنتے رہتے ہیں اور سب سے آخر میں یہ کہ کتنے کاشتکار غریب کاشتکار آفاتِ ارضی و سماوی میں شکار ہو کر قرض و دام کے بوجھ کے نیچے دب دب کر کراہتے رہتے ہیں۔ کتنے جوان باوجود تلاش معاش کے بیروزگار پڑے پھرتے ہیں۔

کیا ان غریبوں کی یہ ضرورتیں ضرورتیں نہیں ہیں یا ان کا حال قابلِ رحم نہیں ہے۔ وہی اپنی کمائی سے حکومت کے خالی خزانوں کو معمور کرتے ہیں۔ لیکن جب یہ بیچارے خالی ہوتے ہیں تو ان پر ترس کھانے والا کوئی نہ ہو۔

واقعہ یہ ہے کہ ملک کی یہ ایسی ناگزیر ضرورتیں ہیں جو (محکوم و حاکم کی) ان مشترک ضرورتوں سے بھی زیادہ اہمیت رکھتی ہیں جن کا نام آج رفاہات عامہ وغیرہ ہے۔

لیکن عجیب بات ہے کہ بڑے بڑے بلند بانگ دعووں والی حکومتوں نے بھی کھل کر اس سوال کی طرف توجہ نہیں کی اور واقعہ بھی یہی ہے کہ حکومتوں کی موجودہ آمدنیاں اتنی کافی بھی نہیں ہوتیں جو حاکمانہ قوتوں کے محکموں اور تیگلوں کی تکمیل کے بعد اتنا بچا سکتی ہوں جس سے مشترک ضرورتوں کے سوا ملک کی ان شدید ضرورتوں پر بھی باضابطہ منظم شکل میں کچھ خرچ کر سکتی ہوں۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ کبھی کبھی انجمن ہائے امداد باہمی کی تجویزیں سوچی جاتی ہیں تاکہ ملک کے مقروضوں کا کچھ بوجھ ہلکا ہو۔ کبھی سرکاری سرپرستی میں بیمہ کمپنیوں کی ہمت افزائی کی جاتی ہے اور بیمہ کے ایجنٹ شہر بہ شہر گاؤں گاؤں میں پھر پھر کر مرے ہوئے باپوں کی لاشوں کے سامنے یتیموں اور بیواؤں کی تصویریں کھنچوا کھنچوا کر ہر شخص کو ہول دل میں مبتلا کرتے پھرتے ہیں، کبھی مسئلہ بیروزگاری پر میدانوں میں یا پہاڑوں پر کمیٹیوں پر کمیٹیاں منعقد ہوتی رہتی ہیں۔ سوچا جارہا ہے کہ آخر اس کا حل کیا ہے۔ کبھی سرکاری ملازمتوں کی نشان دہی کے لئے دفتر قائم کر کے حکومت کے مصارف میں ایک اور جدید مصرف کا اضافہ کر دیا جاتا ہے۔

سردست مجھے اس سے بحث نہیں کہ یہ تدبیریں واقعی مفید ہیں یا بے حاصل اور نہ ان کی بعض شکلوں مثلاً بیمہ یا انجمن ہائے اتحاد باہمی میں جو سودی کاروبار لین دین جاری ہے اس کے متعلق اسلامی نقطۂ نظر سے بحث کرنا چاہتا ہوں بلکہ دکھانا صرف اس قدر ہے کہ ان ساری کوششوں سے اتنا بہر حال ثابت ہوتا ہے کہ ملک کی ضرورتوں کا انحصار صرف ان ہی مشترک ضرورتوں میں نہیں ہے جنھیں آج "پبلک ورکس" کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اور اگر ایسا نہ ہوتا تو انجمن ہائے اتحاد باہمی کا جال بیمہ اور انشورنس والوں کی نوحہ خوانیوں ماتم سرائیوں، بے روزگاری اور ... کے ڈھنڈوروں کی آخر توجیہ کیا ہوگی۔

الحمد للہ کہ اسلام نے جس وقت حکومت اور حکومت کے خزانے کی بنیاد ڈالی۔ بنیاد ہی کے وقت ملک کی ضرورتوں کا یہ سب سے آخری سوال اس کے سامنے پہلے آیا اور اس سوال کا حل بھی اس نے سب سے پہلے نکال لیا۔

میرا مطلب یہ ہے کہ مدینہ منورہ میں جب اسلامی دعوت نے مذہبی دعوت کے ساتھ ساتھ ایک سیاسی تنظیم کی شکل بھی اختیار کی تو ظاہر ہے کہ نہ اس وقت ملک تھا نہ خزانہ صرف چند اللہ کے بندے تھے جو اپنے ذاتی مصارف پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ میدان جنگ میں اترے (۳۱۳) سپاہیوں کو جو پہلی فتح بدر میں ہوئی اور خواہ جنگ کی تاریخ میں یہ کتنی ہی چھوٹی جنگ کیوں نہ ہو لیکن عالم کی تاریخ کے جتنے انقلابی فیصلہ کن معرکے ہیں ان میں یقیناً سب سے بڑا انقلابی معرکہ یہی تھا۔ اسی جنگ نے وہ فیصلہ کیا جو بالآخر تاریخ کا ایک اہم فیصلہ بن گیا اور اب تک بنا ہوا ہے۔

اس جنگ میں سب سے پہلے ایک نو سپاہی اور وہ بھی غریب عرب کے بھاگے ہوئے سپاہیوں کا مسلمانوں کو کچھ سامان ہاتھ آیا اور یہی اسلامی حکومت کی پہلی آمدنی تھی۔ حکومت کی آمدنی کے متعلق مسلمانوں کا نقطہ نظر آئندہ کیا ہونا چاہئیے کیا اقتدار حاصل کرنے والوں کے عیش و آرام کا وہ ذریعہ ہے یا اور کچھ ہے حالانکہ ابھی حاصل ہی کیا ہوا تھا لیکن "کرہ ارض" اور ہا یہ کشت "قرآن" نے نازل ہو کر اعلان کیا

یسئلونک عن الانفال	لوگ انفال (جنگ کے حاصل شدہ مال)
قل الانفال للہ والرسول۔	کے متعلق پوچھتے ہیں، کہہ دو کہ یہ اللہ کا
	اور رسول کا ہے۔

کسی کا کچھ نہیں ہے صرف اللہ کا ہے اور اللہ کی مرضی کی نمائندگی چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کریں گے اس لئے رسول کا ہے اب تک جو دنیا کا نقطہ نظر اموال مفتوحہ یا حکومت کی آمدنی کے متعلق تھا۔ اب تک بدل گیا جب وہ بدل چکا تب اس اجمال کی تفصیل کی گئی،

واعلموا انما غنمتم من شیئ	اس کو جان لو کہ تم نے جو کچھ غنیمت
فان للہ خمسہ وللرسول	میں حاصل کیا تو اللہ اور رسول اور
ولذی القربی والیتامی	قرابتمندوں یتیموں مسکین مسافر کے لئے
والمسٰکین وابن السبیل۔	اس میں پانچواں حصہ ہے۔

یعنی جنھوں نے لڑائی میں کام کیا ہے ان کو بھی ان کا خدائی حصہ دے گا لیکن آئندہ سے قانون بن گیا کہ اس راہ سے جو آمدنی ہوگی اس میں سے پانچواں حصہ حکومت لے لیگی باقی سپاہیوں پر تقسیم کردی جائے گی۔

حکومت کے خزانے میں جو یہ پانچواں حصہ جمع ہوگا اس کا مصرف کیا ہوگا۔ حالانکہ شدید ضرورتیں تھیں۔ تنہا اسلام مٹھی بھر مددگاروں کے ساتھ دشمنوں کے نرغہ میں گھرا ہوا تھا سارا عرب مشرکین یہود نصاریٰ حتیٰ کہ رومی اور ایرانی حکومتیں جو کرۂ زمین کے اقتدار اعلیٰ کی حیثیت اس وقت رکھتی تھیں سب کی نگاہیں مدینہ کی اس دعوت وتنظیم پر لگی ہوئی تھیں۔ مگر دنیا کی حکومتیں جس مسئلہ کو اب تک سوچ ہی نہیں سکی ہیں یا سوچ رہی ہیں تو عمل نہیں کر سکتی ہیں۔

تمام خطرات سے بے پرواہ ہو کر اسلامی خزانہ کی اس پہلی آمدنی کو پھر پانچ حصوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ پانچوں میں صرف ایک حصہ اس قوت کے ذاتی مصارف کے لئے مختص کیا گیا جس کے ذریعہ سے یہ اقتدار حاصل ہوا تھا۔ یعنی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے اور ایک حصہ آپ کے جاں نثار رشتہ داروں کے لئے جنھوں نے مکہ سے مدینہ تک آپ کا ہر حال میں ساتھ دیا تھا، باقی تین حصوں کو بجائے کشوری وفوجی مصارف کے ملک کے الیتامیٰ والمساکین وابن السبیل (مسافروں) کے لئے چھوڑ دیا گیا اور یہ تو شروع میں ہوا، پھر جب کل پندرہ بیس سال کے قلیل عرصہ میں

اسی تین سو تیرہ آدمیوں والی جنگ کے فتح کا دائرہ اتنا وسیع ہوگیا کہ اس میں ساری ایرانی حکومت بازنطینی حکومت کا اکثر حصہ سماگیا تو فرعون بنانے والی زمین کے محاصل اور کلاہ کو کج کر دینے والی دولت مدینہ والی حکومت کے خزانے میں سمٹ سمٹ کر آنے لگی تو کیا اس وقت بھی یہ اصول فراموش کر دیا گیا۔

واقعہ یہ ہے کہ جب بہ تدریج رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا سیاسی اقتدار عرب میں بڑھنے لگا اور عرب کے قبائل مختلف طریقوں سے آپ کے زیر اثر آگئے۔ مدینے کے اطراف کے یہود اور خیبر کے یہود کی زمینوں پر خدا نے آپ کو قبضہ دلا دیا اور یوں مختلف ذرائع سے آمدنی کا امکان پیدا ہوا تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے عہد مبارک ہی میں ایسی صورتیں اختیار فرمائیں جن کے ذریعہ سے اسلامی خزانہ میں دو قسم کی آمدنیاں آنے لگیں۔

(۱) ایک آمدنی تو وہ ہوئی جس کا نام خراج رکھا جا سکتا تھا اور یہی بعد کو اس کا نام ہوا اور ایک آمدنی کی مد وہ تھی جس کا نام "الصدقات" تھا۔

غیر مسلم اقوام کی زمینوں (یعنی کھیتوں اور باغوں) سے جو آمدنی آتی تھی یا جزیہ کے نام سے جو محصول ان سے وصول ہوتا تھا اس کا شمار تو خراج میں تھا۔ اس کے سوا مسلمانوں کی زمین مسلمانوں کی تجارت مسلمانوں کے مویشی (جو بطور کاروبار کے پالے جاتے تھے اور اکثر زمانہ ان کا جنگلوں میں گزرتا تھا) مسلمانوں کی اندوختہ دولت بہ شکل سونا چاندی ان چار ذرائع سے جو آمدنی ہوتی تھی اسی کا نام "الصدقات" تھا۔ پھر اسی میں غنیمت کے خمس (پانچویں) حصہ سے تین حصہ بھی جو الیتامیٰ والمساکین وابن السبیل کے لئے مخصوص تھا وہ بھی "الصدقات" میں شریک کر دیا جاتا تھا۔

خراج کی آمدنی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں تو تھوڑی تھی لیکن حضرت عمرؓ کے زمانے میں خراجی آمدنیوں کا کون اندازہ کر سکتا ہے۔ حالانکہ گذشتہ حکومتوں کے تمام ظالمانہ مطالبات کو حذف کر دیا گیا تھا۔ اسلامی قانون ہے کہ کسی زمین پر زیادہ سے زیادہ خراج نصف پیداوار سے زیادہ نہ لگایا جائے نیز

ان غلب علی ارض الخراج الماء او انقطع الماء او اصطلم الزرع آفۃ فلا خراج علیہ (ھدایہ)	اگر خراجی زمین کو پانی سے نقصان پہنچے یا آب پاشی کے ذرائع منقطع ہو جائیں، یا کھیتی برباد ہو جائے تو ایسی زمینوں سے خراج وصول نہ ہوگا۔

نیز اسی طرح جزیہ سے ظاہر ہے کہ عورت بچے بیمار معذور بڈھے بیروزگار مذہبی طبقہ (مثلاً پادری جوگی) غلام وغیرہ مستثنیٰ تھے صرف کاروباری آدمیوں پر لگایا جاتا تھا۔ وہ بھی اگر صلحی جزیہ ہے تو اس کی کوئی مقدار معین نہیں ورنہ یوں معمولاً امراء سے تقریباً ایک روپیہ ماہوار یعنی بارہ روپے سالانہ متوسط طبقہ والوں سے آٹھ آنہ ماہوار یا چھ روپے سالانہ ادنیٰ طبقہ سے ۴؍ ماہوار یا تین روپے سالانہ اور درمیانی سال میں اگر کوئی مر جاتا تو اس سے جزیہ ساقط ہو جاتا۔ پھر جزیہ کے صلہ میں غیر مسلم رعایا کو

فوجی خدمت سے معاف کر دیا جاتا تھا، ہدایہ میں ہے۔

لانہ وجب لنصرۃ للمقاتلۃ	کیونکہ جزیہ اس لئے واجب کیا گیا ہے تاکہ جنگ کرنے والوں کی باشندوں کی طرف سے امداد ہو۔

ابن ہمام اس کی شرح میں لکھتے ہیں،

ای خلفا عن نصرۃ مقاتلۃ اھل الدار لان من ھو من اھل دار الاسلام علیہ نصرتھم وقد فاتت۔	یعنی اسلامی قلمرو میں جو جماعت جنگی خدمات انجام دیتی ہے ان کی امداد کا کام (چونکہ غیر مسلم لوگوں سے نہ لیا جاتا تھا) اس لئے اس کے قائم مقام جزیہ کا محصول ان پر عائد کیا گیا کیونکہ جو بھی اسلامی قلمرو کا باشندہ ہے اس پر واجب تھا کہ جنگ کرنے والوں کی امداد کرے اور یہ بات چونکہ ذمیوں کے حق میں باقی نہ رہی اس لئے ان سے بجائے جنگی امداد کے جزیہ لیا جاتا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ الخراج (یعنی جزیہ اور غیر مسلم رعایا کی زمین کی آمدنی خواہ اس زمین کو مسلمانوں ہی نے کیوں خرید نہ لیا ہو) یہ حکومت کی آمدنی کی ایک علیحدہ مستقل مد تھی اور اس کے مالک نہ خلفاء تھے نہ سلاطین نہ مسلمانوں کا کوئی خاص طبقہ بلکہ جیسا کہ قاضی ابو یوسف لکھتے ہیں

الخراج[1] فیئ لجمیع المسلمین۔ (کتاب الخراج ۲۶)	خراج تمام مسلمانوں کی مشترکہ آمدنی ہے۔

یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ کتاب الخراج قاضی ابو یوسف کی کوئی ذاتی کتاب نہیں ہے بلکہ خلیفہ ہارون الرشید نے جو دستورِ حکومت اپنے لئے اُن سے لکھوایا تھا یہ وہی کتاب ہے جس کے یہ معنیٰ ہیں کہ اس کتاب میں جو کچھ لکھا گیا ہے کم از کم خلفاء بنی عباس تک وہ مسلم تھا اور حکومت میں اس کی حیثیت قانون کی تھی بہر حال خراج سارے مسلمانوں کا مال تھا البتہ خلفاء اس کی آمدنی کے نگران تھے۔

اور اپنے صوابدید پر جس کے وہ خُدا کے پاس ذمہ دار تھے خرچ کرنے کا اقتدار رکھتے تھے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں جیسا کہ کہہ چکا ہوں خراجی آمدنی تھوڑی تھی اس لئے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں تو ہر سال اس خراج کے تقسیم ہونے کی نوبت نہ آتی تھی بلکہ

---

[1] فتح کے بعد جن ممالک کی غیر مسلم رعایا کا قبضہ ان کی زمینوں پر بحال رکھا گیا ہو، خواہ لڑائی سے ملک فتح ہوا ہو یا صلح و آشتی سے اس ملک کے لوگوں نے مسلمانوں کی حکومت تسلیم کر لی ہو، ان زمینوں کے مالک وہی غیر مسلم لوگ رہتے ہیں۔ حکومت کو صرف خراج لینے کا حق ہے۔ البتہ اگر مسلمانوں میں کوئی ان سے زمین خریدے گا تو یوں وہ اس کا مالک ہو سکتا ہے لیکن اس کو بھی وہی خراج ادا کرنا پڑے گا۔ حضرت حسنؓ و حسینؓ و عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہم نے خراجی زمینیں خریدی تھیں لیکن ان کو بھی خراج ہی ادا کرنا پڑا ۱۲

جب کہیں سے خراج آ گیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے صوابدید سے مسلمانوں میں اس کو تقسیم کر دیتے تھے۔ اس تقسیم میں غریب امیر معذور و غیر معذور سے بحث نہ ہوتی تھی بلکہ استحقاق کے لئے صرف مسلمان ہونا کافی تھا۔

عہدِ نبویؐ میں خراج کی سب سے بڑی آمدنی (ایک لاکھ درہم) بحرین سے آئی تھی اب تک کوئی باضابطہ خزانہ کا مکان بھی نہ تھا مسجد نبویؐ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے مال ڈال دیا گیا نمازِ صبح سے فارغ ہونے کے بعد اپنے صوابدید سے لوگوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے تقسیم فرما دیا اور

فما قام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وثم منہا درہم (بخاری)	اور نہ کھڑے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس مقام سے اس وقت تک جب تک وہاں ایک درہم بھی باقی رہ گیا ہو۔

اس تقسیم میں امیر و غریب کی خصوصیت نہ تھی حتیٰ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا حضرت عباس کو بھی اس میں حصہ ملا تھا۔ حالانکہ صدقہ کا مال بنی ہاشم پر حرام ہے۔ حضرت عمرؓ کو بھی ایک دفعہ اس کا شبہ ہوا، جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو آمدنی کی اس مد سے کچھ دیا حضرت عمرؓ نے عرض کیا،

اعطہ من ہو افقر منی	جو مجھ سے زیادہ محتاج ہو اسے دیجئے۔

انھوں نے خیال کیا کہ شاید یہ غریبوں کا حق ہے لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرما کر،

خذہ فتمولہ فما جاءک من ہذا المال وانت غیر مشرف ولا سائل فخذہ ومالا فلا تتبعہ نفسک۔ (طحاوی)	اسے لو اور اپنا مال بناؤ کیونکہ یہ مال تمہارے پاس اس طریقہ سے اگر آئے کہ تمہارے دل میں اس کی طرف لو لگی نہ ہو اور نہ اس کے متعلق تم نے سوال کیا ہو، تو اسے لے لیا کرو اور جو ایسا نہ ہو تو اپنے جی کو ادھر نہ لگاؤ۔

امام ابو جعفر طحاوی اس روایت کو بیان کر کے لکھتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی غرض یہ تھی۔

انی لم اعطک ذلک لانک فقیر انما اعطیتک لمعنی آخر غیر الفقر۔	میں نے تم کو یہ اس لئے نہیں دیا ہے کہ تم فقیر اور محتاج ہو، بلکہ تم کو میں نے کسی اور وجہ سے جو فقیری اور محتاجی کے سوا ہے یہ عطیہ عطا کیا ہے۔

پھر اس مد کی شرح یہ کرتے ہیں کہ،

لیس ہذا علی اموال الصدقۃ انما ہذا علی الاموال التی	اس کا شمار صدقات کے مال میں نہیں ہے بلکہ اس مد کا شمار ان اموال میں ہے

یقسمہا الامام علی الناس فیقسمہا	جنھیں امام لوگوں میں بانٹ دیا کرتا
علی اغنیائہم و فقرائہم۔	ہی دیتا ہے امیروں کو بھی۔

طحاوی نے لکھا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنے عہد میں جو عطیہ وظائف تقسیم فرمایا کرتے تھے وہ بھی اسی مد کی چیز تھی فرماتے ہیں،

کما فرض عمر لاصحاب رسول	جیسا کہ حضرت عمرؓ نے رسول اللہ صلی اللہ
اللہ صلی اللہ علیہ وسلم	علیہ وسلم کے صحابیوں میں اسی آمدنی کو
حین دوّن الدواوین فرض	اس وقت تقسیم کیا جب دیوان مرتب
للاغنیاء منہم و للفقراء	فرمایا، حضرت عمرؓ نے اس وقت ان
فکانت تلک الاموال یعطاہا	کے لئے بھی وظیفہ جاری کیا جو غنی
الاغنیاء للناس لا من	تھے اور ان کے لئے بھی جو فقیر تھے غرض
جہۃ الفقر۔	یہ ایسی آمدنی تھی جو لوگوں کو اس لئے

نہیں دی جاتی تھی کہ وہ فقیر اور محتاج ہیں۔

بہرحال خراج کی آمدنی چونکہ ''فیٔ لجمیع المسلمین'' ہے اس لئے ہر مسلمان کا اس میں حق ہے البتہ اب یہ امام کے اختیار تمیزی پر موقوف ہے کہ جب مال ناکافی ہو تو کن مسلمانوں کو پہلے ترجیح دی جائے اس کا فیصلہ ان کی خدمات یا دوسری خصوصیات کو پیش نظر رکھ کر وہ کر سکتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد جب حضرت ابوبکر کا زمانہ آیا تو آپؓ نے پہلے ان لوگوں کو ترجیح دی جن سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خراجی آمدنی سے کچھ دینے کا وعدہ فرمایا تھا اور باقی کو،

قسمہا بالسویہ علی الصغیر	پھر سب میں برابر بانٹ دیا چھوٹے
والکبیر والحر والمملوک والذکر	ہوں یا بڑے، غلام ہوں یا آزاد
والانثیٰ (الخراج لابی یوسف)	مرد ہوں یا عورت۔

کہا جاتا ہے کہ فی کس شاید سات سات درہم اور کچھ یعنی پونے دو دو روپے کے قریب حصّہ پہنچا۔ دوسرے سال خراج کی آمدنی میں فتوحات کی وسعت کے حساب سے اضافہ ہوا۔ اس سال بھی انھوں نے سب کو برابر برابر طریقہ ہی سے بانٹ دیا۔ اب کے بیس بیس درہم یا فی کس تقریباً پانچ پانچ روپے پڑے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اس دفعہ لوگوں نے کہا بھی کہ آپ سب کو ایک ہی لاٹھی سے ہانک رہے ہیں، آخر جن کے اسلام میں بڑے بڑے کارنامے ہیں ان کے حقوق کا بھی تو لحاظ کرنا چاہیے۔ فرمایا خدمات اور حقوق کا واقف کار مجھ سے زیادہ کون ہو سکتا ہے لیکن ان خدمات کا صلہ خدا کے یہاں ملے گا باقی یہ آمدنی،

فہذا معاش فالاسوۃ فیہ خیر من الاثرۃ	یہ تو (دنیاوی زندگی گذارنے کا ذریعہ ہے)

اس میں برابر برابر تقسیم اس سے بہتر ہے کہ کسی کو کسی پر ترجیح دی جائے۔

معاشیات میں جو مساوات کے حامی ہیں شاید ان کو خبر نہیں ہے کہ ابھی جو بات سوچی جا رہی ہے کچھ لوگ اسے کر بھی گذرے ہیں۔ لیکن عہدِ صدیقی کے بعد جب حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا زمانہ آیا تو انھوں نے مساوات کے اصول کو بدل دیا اور فرمایا کہ

لا اجعل من قاتل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کمن قاتل معہ۔	جس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلہ میں جنگ کی اور آپ سے لڑے ان کو میں ان لوگوں کے برابر نہیں قرار دے سکتا جنھوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہو کر جنگ کی۔

پھر انھوں نے خدمات وحقوق وغیرہ کے لحاظ سے ایک فہرست مرتب کی جو مشہور ہے۔ بدر میں جو شریک تھے اُن کا سالانہ وظیفہ پانچ پانچ ہزار درہم یا ایک ہزار ڈھائی سو روپے سالانہ، جو بدری نہ تھے ان کو چار چار ہزار درہم سالانہ اور اسی طریقہ سے مختلف جہات اور حیثیتوں سے انھوں نے بعضوں کا زیادہ اور بعضوں کا کم وظیفہ مقرر کیا۔ سب سے بڑا حصہ امہات المومنین کا تھا۔ یعنی بارہ بارہ ہزار درہم سالانہ۔ اس سلسلہ میں حضرت عمرؓ نے اپنے بیٹے عبداللہ بن عمرؓ کا عطیہ اسامہ ابن زید (جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آزاد کردہ غلام تھے) سے کم مقرر کیا۔ حضرت عبداللہ نے باپ سے شکایت بھی کی، جواب میں حضرت عمرؓ نے فرمایا۔

ان ابا اسامۃ کان احب الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من ابیک وکان اسامۃ احب الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم منک۔	اسامہ کا باپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تیرے باپ سے زیادہ محبوب تھا، اور اسامہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تجھ سے زیادہ محبوب تھے۔

الغرض آنحضرت کی ذات مبارک کو مرکز قرار دے کر جو آپ سے جتنا جس حیثیت سے زیادہ قریب تھا اسی قدر آپ نے اس کو ترجیح دی۔ پھر شہروں میں مدینہ سب سے زیادہ قریب تھا کہ وہی نبی کا مدینہ (شہر) تھا۔ اس لئے اس کو سب پر مقدم کیا گیا۔ مدینہ کے بعد مکہ کی باری آئی۔ آٹھ آٹھ سو درم سالانہ وہاں کے باشندوں کے نام بھی جاری ہوئے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا خیال تھا کہ آمدنی جیسے جیسے بڑھتی جائے گی عطایا کے دائرے کو وسیع سے وسیع تر کیا جائے گا۔

مثلاً ابتدا میں مدینہ کے صرف بالغ مردوں اور عورتوں کے نام وظائف مقرر ہوئے مگر جب وسعت پیدا ہوئی تو

للمنفوس اذا طرحتہ امہ مائۃ درہم واذا ترعرع بمائتین۔	زندہ لڑکے کا بھی وظیفہ سو درہم اسی وقت سے مقرر کر دیا جاتا تھا جوں ہی ماں کے پیٹ سے جدا ہوتا، اور جب جوان ہو جاتا، وظیفہ دو سو درم کر دیا جاتا تھا۔

اور یہ طرزِ عمل تو خراج کی اس آمدنی میں اختیار کیا گیا تھا جو روپے کی شکل میں ہوتی تھی چونکہ بعض علاقوں سے غلہ بھی لیا جاتا تھا اس لئے مدینہ والوں کے نام سالانہ غلہ کی مقدار بھی مقرر کر دی گئی یعنی فی کس ساڑھے بارہ سو گز مربع زمین کی پیداوار (گیہوں) دی جاتی تھی۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے نقطۂ نظر کا اندازہ اس مشہور واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ ابو موسیٰ اشعریؓ ایک دفعہ خراج لائے۔ حضرت عمرؓ نے پوچھا کتنی رقم ہے۔ بولے اَلْفُ اَلْفُ اس عدد کو سن کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو حیرت ہوئی اور فرمایا

هل تدری ما تقول۔ — تم سمجھ بھی رہے ہو کیا کہہ رہے ہو۔

ابو موسیٰ نے کہا

نعم قد مت بمائة الف ومائة الف حتی عد عشر مرات۔ — جی ہاں میں ایک لاکھ اور ایک لاکھ پھر دس تک اسی کو شمار کرتے گئے اپنے ساتھ لایا ہوں۔

حضرت عمرؓ نے یہ سن کر ارشاد فرمایا

ان كنت صادقا ليوتين الراعی نصيبه من هذا المال وهو باليمن ودمه فی وجهه — اگر تم سچے ہو، تو اس چرواہے کو بھی اس مال سے حصہ پہنچایا جائے گا جو یمن میں ہوگا اور اس کا پسینہ ابھی چہرے ہی پر ہو۔

جس کا مطلب یہی ہوا کہ وہ چند شہروں یعنی مدینہ یا مکہ یا فوجی چھاؤنیوں کوفہ و بصرہ وغیرہ تک اس تقسیم کو محدود نہیں رکھنا چاہتے تھے بلکہ ہر مسلمان تک اگر یہ پہنچ سکتی تو آپ کا خیال تھا کہ اسے پہنچایا جائے کیونکہ اسلامی نقطۂ نظر سے خراج کی ساری آمدنی مسلمانوں کا مشترکہ سرمایہ تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس نقطۂ نظر کا اعادہ بار بار اپنے خطبوں میں بایں الفاظ فرماتے،

والله الذی لا اله الا هو ما احد الا وله فی هذا المال حق (الخراج لابی یوسف) — قسم ہے اس ذات کی جس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے کہ ایسا کوئی نہیں ہے جس کا اس آمدنی میں حق نہ ہو۔

یعنی بات تو یہی ہے لیکن بعض خاص خصوصیات کی بنا پر پہلے اُن لوگوں تک پہنچایا جا رہا ہے جو اس کے زیادہ مستحق ہیں۔ ان توضیحی خصوصیات کا اظہار بھی آپ نے بایں الفاظ خود فرمایا ہے۔

ولكنا على منازلنا من كتاب الله عز وجل وقسمنا من رسول الله صلى الله عليه وسلم فالرجل وتلاده فی الاسلام والرجل — یعنی قرآن نے جو مدارج مقرر کئے ہیں پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارک سے قرب و بعد کے حساب سے جو حصہ لوگوں کو پہنچ سکتا ہو، اس لئے

قدمه فی الاسلام والرجل	تقسیم کے باب میں آدمی کو دیکھا جائے کہ
غناءه فی الاسلام والرجل	اسلام میں اس کی قدامت کیا ہے۔ اسلام
حاجته فی الاسلام۔	میں اس کی مالی وسعت کا کیا حال ہے

اسلام میں اس کی مالی ضرورت کا حال کیا ہے۔

مطلب وہی تھا کہ قرآن مجید نے خود یہ فیصلہ کر دیا ہے کہ

لا یستوی منکم من انفق	فتح مکہ سے پہلے جن لوگوں نے خرچ کیا
من قبل الفتح وقاتل اولئک	اور جنگ کی ان کے برابر وہ نہیں ہو سکتے
اعظم درجة من الذین	جنھوں نے فتح کے بعد خرچ کیا اور
انفقوا من بعد وقاتلوا	جنگ کی۔ وہ لوگ درجہ کے حساب سے
وکلا وعد الله الحسنیٰ۔	زیادہ بڑے ہیں بہ نسبت ان کے

جنھوں نے بعد کو خرچ کیا اور لڑے۔ باقی ہر ایک سے خدا نے اچھی باتوں کا وعدہ فرمایا ہے۔

یہ فرقِ مراتب تو ان لوگوں میں تھا جنھوں نے فتح مکہ سے پہلے اور اس کے بعد اسلام کی راہ میں جانی و مالی قربانیاں پیش کی تھیں۔ پھر جن لوگوں نے یہ قربانیاں کی تھیں اور جنھوں نے نہیں کی تھیں ان میں بھی قرآن نے مدارج قائم کر دیئے تھے یعنی،

لا یستوی القاعدون من	ایمان والوں میں جو لوگ (جہاد) سے
المومنین غیر اولی الضرر	بیٹھنے والے ہیں، یعنی ان کو کچھ عذر اور
والمجاهدون فی سبیل الله	دکھ نہ تھا (اور پھر بھی جنگ میں شریک
باموالهم وانفسهم فضل	نہ ہوئے) یہ لوگ ان کے برابر نہیں
المجاهدین باموالهم و	ہو سکتے جنھوں نے اپنے مال اور اپنی
انفسهم علی القاعدین	جانوں کے ساتھ اللہ کی راہ میں مالی
درجة وکلا وعد الله	جانی جہاد کیا ہے۔ جہاد کرنے والوں کو
الحسنیٰ وفضل الله المجاهدین	خدا نے جہاد سے بیٹھنے والوں پر فضیلت
علی القاعدین اجرا عظیما۔	عطا کی ہے اور اچھا وعدہ تو خدا کا

سب ہی سے ہے اور جہاد کرنے والوں کو بیٹھنے والوں پر خدا نے بڑے اجر کے ساتھ فضیلت عطا کی ہے۔

پھر اسی کے ساتھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے تعلق کی بنا پر بھی قرآن کہتا ہے،

یا نساء النبی لستن کاحد	اے نبی کی بیبیو! تمہاری حیثیت عام
من النساء۔	عورتوں جیسی نہیں ہے۔

وغیرہ آیات میں اس کی جانب اشارہ تھا۔ اور احسان مندی کا تقاضا بھی یہی تھا۔ اگرچہ حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان سارے فضائل کے ثمرات کو آخرت پر قرار دے کر معاشی لحاظ سے سب کو مساوی کر دیا تھا۔ لیکن حضرت عمرؓ نے معاشیاتی استحقاق میں بھی اس کا خیال کیا بہر حال دونوں ہی کے اجتہاد کی صحیح بنیاد اسلام میں موجود تھی مگر یہ روایت اگر صحیح ہے کہ آخر عمر میں حضرت عمرؓ

لما رأى المال قد كثر	جب انھوں نے دیکھا کہ آمدنی بہت زیادہ بڑھ گئی ہے۔

تو یہ آرزو ظاہر کی کہ

لئن عشت من هذه الليلة من قابل لالحقن اخرى الناس باولهم حتى يكونوا في العطاء سواء ولكن توفي رحمه الله قبل ذلك۔	اگر آئندہ سال اسی رات تک میں زندہ رہا، تو پچھلے لوگوں کو پہلے لوگوں کے ساتھ ملا دوں گا، تا آنکہ وظیفہ میں سب برابر ہو جائیں (راوی کا بیان ہے کہ) لیکن حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی وفات اس سے پہلے ہو گئی۔

(الخراج لابی یوسف ص ۴۷)

اس روایت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کثرتِ آمدنی کی شکل میں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی مساوات ہی کے قائل تھے یعنی اگر آمدنی اتنی ہو کہ سب پر تقسیم کرنے کی صورت میں ناکافی ہو، اس وقت تو ترجیح وتفضیل پر عمل کرنا چاہئے، لیکن اگر سب کو کافی ہو سکتی ہو تو اس وقت حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی مساوات ہی کے قائل تھے گویا ان کا خیال تھا کہ کما وکیفاً مسلمانوں کا یہ مال ہر مستحق تک پہنچا دیا جائے۔ آخر جب یمن کے چرواہے تک اس مال کو وہ پہنچانا چاہتے تھے تو اس کا مطلب اور کیا ہو سکتا ہے کہ ہر مسلمان کو خراج کی آمدنی کا وہ حصہ دینا چاہتے تھے نیز اگر وہ دوسرے سال تک زندہ رہتے تو سب کو برابر حصہ دیدیتے لیکن افسوس کہ ایسا نہ ہوا۔

سنن بیہقی اور دوسری کتابوں میں حضرت عمرؓ کی ایک اور تقریر کا بھی ذکر ہے۔ لکھا ہے کہ حضرت عمرؓ نے صحابہؓ کو جمع ہونے کا اس لئے حکم دیا کہ اجتمعوا لهذا المال فانظروا لمن ترونه (اس مال (یعنی بیت المال میں جو آمدنی جمع ہوئی ہے) اس کے متعلق طے کریں کہ آخر اس کے مالک کون لوگ ہیں۔ لوگ جب جمع ہو گئے تو کھڑے ہو کر آپ نے تقریر فرمائی۔

انى امرتكم ان تجتمعوا لهذا المال فتنظروا لمن ترونه وانى قد قرأت آيات من كتاب الله يقول ما افاء الله على رسوله الخ	میں نے آپ لوگوں کو اس لئے اکٹھا کیا ہے تاکہ غور کریں کہ یہ مال کس کا ہے تو میں نے قرآن کی ان آیتوں کو جو پڑھا ہے یعنی اللہ نے جن بستیوں والوں کو اپنے رسولؐ کی طرف پلٹایا ہے الخ

اس کے بعد حضرت عمرؓ آیتوں کو تلاوت کرتے جاتے اور فرماتے کہ صرف ان ہی لوگوں کا نہیں ہے۔ آخر میں فرمایا والذین جاؤامن بعدھم (اور جو لوگ آئے مہاجرین و انصار کے بعد) اس کے بعد آپؓ نے فرمایا واللہ مامن احد من المسلمین الا ولہ حق فی ھذا المال اعطی منہ او منع حتیٰ راع بعدن (خدا کی قسم کوئی ایسا مسلمان نہیں ہے جس کا حق اس مال میں نہ ہو، خواہ اسے دیا جائے یا نہ دیا جائے۔ حتیٰ کہ عدن میں جو چرواہا ہے اس کا بھی (البیہقی ص ۳۵۱ ج ۶)

خراج کے دوسرے مصارف خراج کی آمدنی کے متعلق جو تفصیل اوپر پیش کی گئی اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اس آمدنی کا صرف یہی ایک مصرف تھا کہ مال جمع کیا جائے۔ اور بہ قاعدہ صدیقی (یعنی مساوات) یا بہ قاعدہ فاروقی (یعنی تفضیل و ترجیح) مسلمانوں میں تقسیم کردی جائے بلکہ اس آمدنی کا پہلا مقصد یہ ہے کہ مسلمانوں کے عام کشوری و فوجی ضروریات پر خرچ کیا جائے۔ بالاتفاق تمام فقہار کا اس پر اجماع ہے کہ

ماجباہ الامام من الخراج	امام (حکومت) کو جو آمدنی خراج سے ہو
ومن اموال بنی تغلب وما	اور بنی تغلب کے مال سے جو لے اور
اھداہ اھل الحرب الیٰ	اہل حرب سے جو کچھ بطور ہدیہ و تحفہ کے
الامام وبالجزیۃ یصرف	اسلامی حکومت کو دیں اور جزیہ کے ذریعہ
فی مصالح المسلمین کالثغور	سے جو آمدنی ہو، یہ ساری آمدنیاں
وبناء القناطر والجسو	مسلمانوں کی عام ضرورتوں پر خرچ
ویعطی قضاۃ المسلمین	کی جائیں، مثلاً سرحدوں کی حفاظت
وعمالھم وعلماءھم منہ	دریاؤں پر پل بنایا جائے اور مسلمانوں
مایکفیھم منہ ویدفع منہ	کے قاضیوں کو ان کے عمال اور حکام
ارزاق المقاتلہ وذراریھم	وعلمار کو دیا جائے جو ان کے لئے
(ہدایہ)	کافی ہو، اور فوجیوں کے بال بچوں

کی تنخواہوں پر یہ آمدنی صرف کی جائے۔

جس سے معلوم ہوا کہ عدالت و فوج پبلک ورکس (مواصلات مثل پل سڑک) وغیرہ یہ تمام مصارف، خراج اور متعلقاتِ خراج کی آمدنی سے پورے کئے جائیں گے صرف یہی نہیں بلکہ تعلیمات کے مصارف کی پابجائی بھی اسی آمدنی سے ہونی چاہیے، ابن ہمام لکھتے ہیں،

ویعطی ایضاً للمعلمین والمتعلمین	نیز پڑھنے پڑھانے والوں کو بھی س آمدنی سے دیا جائے۔

نیز ہمیشہ اسلامی حکومتوں نے عہدِ خلافت راشدہ سے آخر زمانہ تک صحت عامہ کے لئے دواخانے اور شفاخانے بھی جاری رکھے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس مد پر بھی اس روپے کو خرچ ہونا چاہیے

ان مشترک ضرورتوں کے بعد جو روپیہ بچ جائے وہ مسلمانوں میں خواہ صدیقی خواہ فاروقی اصول سے بانٹ دیا جائے۔ ممکن ہے کہ اس زمانے میں لوگوں کو اس پر حیرت ہو لیکن جب مسلمانوں کا امیر اپنے کو

ما انا فیہ الا کاحد کم — میں تم میں نہیں لیکن تم ہی میں کسی ایک کے جیسا (حضرت عمرؓ)

(الخراج)

قرار دیتا ہو اور اپنے بیٹے کو مسلمانوں کے آزاد شدہ غلاموں کے خاندان والوں سے کم حصہ دینے کی اپنے اندر قوت اور ہمت رکھتا ہو تو جو کچھ کرکے دکھایا جا چکا تھا صرف وہی نہیں بلکہ جس کا آئندہ قصد تھا وہ بھی ہو کر رہتا لیکن کان امر اللہ قدرا مقدورا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف طریقوں سے آنے والے حادثہ کی طرف اشارہ فرما دیا تھا کہ

انکم ستلقون بعدی اثرۃ۔ — تم لوگ میرے بعد پھر ترجیحی سلوک کا مشاہدہ کرو گے۔

(بخاری)

بُخاری ہی کی بعض روایتوں میں اثرۃ شدیدۃ کے الفاظ بھی آئے ہیں سو دیکھ گیا اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھیوں نے (رضی اللہ تعالیٰ عنہم) اپنے محبوب پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے اس حکم کی تعمیل فرماتے ہوئے کہ

فاصبروا حتی تلقونی علی الحوض (بخاری) — پھر صبر کرنا حتیٰ کہ حوض پر مجھ سے آکر مل جاؤ۔

جو کچھ ہوتا رہا دیکھتے رہے اور جن سے اسی حال میں "حوض" پر ملنے کا وعدہ کیا تھا ان سے اسی حال میں حوض پر،

غداً نلقی الاحبہ[۱] محمداً وحزبہ

کہتے ہوئے مل گئے فانا للہ وانا الیہ راجعون۔

بہ حال خراج و متعلقاتِ خراج کے نام سے جو سرمایہ اسلامی حکومت کے خزانے میں جمع ہوتا تھا مجھے اس کے متعلق سچ پوچھیئے تو خاص بات کہنی بھی نہ تھی۔ تقریباً اس کے اغراض وہی تھے جو عام طور پر مہذب حکومتوں کے خراج کی غرض ہوتی ہے۔ البتہ اس آمدنی کا ایک بڑا حصّہ علاوہ رفاہیات عامہ کے جو اقتداری حاکمانہ قوتوں کے رنگ رلیوں طمطراق پر خرچ کیا جاتا ہے اسلام نے بجائے اس کے اس کا مصرف خود مسلمانوں کو قرار دیا تھا کیونکہ وہ ان ہی کا مال ہے۔ حتیٰ کہ کشوری و فوجی ملازمین کو جو تنخواہیں ملتی تھیں بے جھجک اس کی توجیہ ہمارے فقہا یہی کرتے تھے مثلاً ہدایہ میں ہے کہ یہ خرچ اس لئے ہے کہ

ھولاء عملتھم ونفقۃ الذراری — یعنی (سیول اور ملٹری) دونوں محکموں کے

---

[۱] کل اپنے دوستوں سے ملوں گا، محمد سے اور ان کی جماعت سے۔ صحابہ کرامؓ عموماً موت سے پہلے اس شعر کو زبان پر جاری فرماتے تھے۔ ۱۲

على الأباء فلو لم يعطوا
كفايتهم لاحتاجوا إلى
الاكتساب فلا يتفرغون
للقتال.

ملازمین چونکہ مسلمانوں کے عمل اور نوکر
ہیں اس لئے ان کو تنخواہ مسلمانوں
کے مال سے ہی ملنی چاہیئے اسی طرح
ان کی عورتوں اور بچوں کو جو ملتا ہے
تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اولاد کے مصارف باپ پر عائد ہوتے ہیں۔ اگر ان کی اولاد کو
اتنا نہ دیا جائے جو ان کے لئے کافی ہو سکے تو پھر ان کو مزید کمانے کی ضرورت باقی
رہ جائے گی، پھر جنگ کے لئے فارغ البال ہو کر اپنے آپ کو ہمیشہ تیار نہیں رکھ سکتے۔

جب "اثرہ" کا دور نہیں آیا تھا اس وقت حکومت کے ان ملازمین کو کیا ملتا تھا۔ قاضی ابو یوسف
راوی ہیں کہ کوفہ

بعث عمر بن الخطاب رضي الله
تعالىٰ عنه عمار بن ياسر على
الصلاة والحراب و بعث
عبد الله بن مسعود على القضا
وبيت المال وبعث عثمان بن
حنيف على مساحة الارضين
وجعل بينهم شاة كل يوم شطرها
وبطنها لعمار بن ياسر وربعها
لعبد الله بن مسعود والثالث
لعثمان بن حنيف وقال اني
انزلت نفسي واياكم من
هذا المال بمنزلة والي
اليتيم فان الله تبارك وتعالىٰ
قال من كان غنيا فليستعفف
ومن كان فقيرا فليأكل
بالمعروف.

عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے
عمار بن یاسر کو بھیجا کہ نماز اور جنگ
کی نگرانی ان کے سپرد ہے اور عبداللہ
بن مسعود کو قضا (عدالت) اور بیت المال
(خزانہ) پر مقرر کر کے بھیجا۔ عثمان بن
حنیف کو زمین کی پیمائش کے لئے مقرر
کر کے روانہ کیا، ان سب کے لئے
روزانہ ایک بکری (کھانے کے لئے مقرر
ہوئی) عمار بن یاسر شکم اور چوتھائی
اس کا عبداللہ بن مسعود کے لئے اور
چوتھائی عثمان بن حنیف کے لئے اور
کہا کہ میں اپنے کو اور تم کو اس مال کے
حساب سے وہی خیال کرتا ہوں جو
یتیم کے مال کا حال اس کے ولی کے
ساتھ ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا
ہے کہ جو امیر ہو وہ یتیم کے مال سے پرہیز
کرے اور جو غریب ہو وہ دستور کے مطابق کھائے۔

ظاہر ہے کہ یہ عمل (وظیفہ بیت المال) کے سوا ان بزرگوں کا یومیہ (راشن) تھا۔ لیکن فوج، خزانہ،
پیمائش و بندوبست تینوں محکموں کے اعلیٰ ترین افسروں کے راشن میں بھی کل ایک بکری روزانہ،
اس پر بھی حضرت عمرؓ کا یہ فرمانا،

ما أرى أرضاً يؤخذ منها شاة في كل يوم إلا استسرع خرابها۔

ایسی زمین (ملک) جس میں روزانہ ایک بکری (حکام) کے لئے لی جائے، میں نہیں خیال کرتا کہ اس کی بربادی جلد کیوں نہ آئے۔

بلکہ اسی سے حضرت عمرؓ کے طریقہ

كان عمر يرزق العامل بحسب حاجته وبلده۔ (الاسلام والحضارة العربیہ ص ۱۲۱)

حضرت عمرؓ اپنے عامل (ملازم حکومت) کی تنخواہ اس کی حاجت اور جس شہر میں رہتا ہو اس کے حساب سے دیا کرتے تھے۔

کی شرح ہو سکتی ہے۔

اور سچ تو یہ ہے کہ مسلمانوں نے جب اپنے خلیفۂ اعظم تک کے لئے یہ طے کر دیا تھا کہ بیت المال میں ان کا حق بھی،

قوته وقوت عياله لا وكس ولا شطط وكسوتهم وكسوة عياله للشتاء والصيف ودابتان الى جهاده وحوائجه وصدقته وحجه وعمرته۔ (الاسلام والحضارة العربیہ)

صرف ان کی خوراک اور ان کے بال بچوں کی خوراک نہ زیادہ نہ کم، خلیفہ کا لباس جاڑے اور گرمی کے لئے، دو سواری کے جانور جہاد اور عام ضرورتوں نیز زکوٰۃ اور حج و عمرہ کے لئے (بس کرتا ہے)

سے زیادہ نہیں ہے تو اس کی ماتحت قوتوں تک یہ رسد۔ ایک دلچسپ واقعہ اسی سلسلہ میں قابلِ ذکر یہ ہے جسے مشہور راوی حدیث حضرت سعید المقبری خود اپنے متعلق بیان کرتے تھے۔ کہتے ہیں کہ میں پہلے بنی جندع جو مدینہ میں ایک خاندان تھا، اسی خاندان کے ایک آدمی کا غلام تھا۔ میرے اور میرے آقا کے درمیان طے ہوا کہ اگر چالیس ہزار درم اور ہر بقرعید کے موقع پر ایک بکرا دینے کا وعدہ کروں تو مجھے وہ آزاد کر دیں گے، سعید کہتے ہیں کہ یہ رقم جمع ہو گئی، یعنی چالیس ہزار درم کی کر اُنھوں نے اکٹھے کر لئے اور اپنے آقا کو کہا کہ لیجئے رقم حاضر ہے آزادی کا سرخط عطا ہو، اس شخص نے کہا کہ میں ایک ہی دفعہ سب رقم نہیں لوں گا، بلکہ تھوڑا تھوڑا کر کے قسط وار لوں گا۔ سعید کہتے ہیں کہ میں حضرت عمرؓ کی خدمت میں چلا گیا جو اس وقت خلیفہ تھے، حال عرض کیا، آپ نے اپنے غلام یرفا کو آواز دی کہ سعید کی رقم کو خزانہ میں جمع کر دو اور سعید سے فرمایا کہ پچھلے پہر آنا، میں تمہارے آقا کو بلاتا ہوں، اگر یکمشت رقم لینے پر وہ تیار ہو گیا تو خیر ورنہ میں خود تم کو آزادی کا سرخط لکھ دوں گا۔ سعید نے حسبِ حکم خزانہ میں چالیس ہزار کی رقم جمع کرا دی، سعید کے آقا کو خبر ہوئی تو خود دوڑے ہوئے آئے اور اپنی

رقم شمار ان مجھے آزاد کر دیا۔ سعید فرماتے ہیں کہ چند دن کے بعد اپنے مال کی زکوٰۃ لے کر میں حضرت عمرؓ کے پاس حاضر ہوا آپ نے فرمایا کہ ہمارے خزانے سے تم نے کچھ لیا بھی ہے۔ میں نے عرض کیا کہ جی نہیں ابھی تو مجھے کچھ نہیں ملا ہے، تب آپؓ نے فرمایا کہ

فارجع به حتی تاخذ منا شیئا ثم اتنا بعد۔

(ابن سعد ص ۲۱۲ ج ۵)

تو ابھی واپس لے جا، اپنی زکوٰۃ کی رقم، پھر جب ہمارے خزانے سے تمہیں مل چکے تب اسے لے کر آنا۔

اس سے بیت المال کی فیاضی کا پتہ چلتا ہے جس نے ابھی بیت المال سے فائدہ نہیں اٹھایا ہے بیت المال بھی اس سے مستفید ہونا نہیں چاہتا تھا۔

زائد محصول کے عائد کرنے کا حکومت کو اختیار

ایسی صورت میں اگر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو یہ حوصلہ پیدا ہو گیا تھا کہ آئندہ ہر مسلمان کو بیت المال سے وظائف برابر برابر مساوی مقدار میں تقسیم کر دوں گا تو کیا تعجب ہے۔ خصوصاً جب ہمارے فقہاء یہ بھی لکھتے ہیں کہ مسلمانوں کے عام مصالح یا مشترکہ ضرورتوں کے لئے حکومت باشندوں پر حسبِ صوابدید زائد ٹیکس بھی عائد کر سکتی ہے جسے اصطلاح "النوائب" کہتے ہیں، النوائب کی تعریف ہدایہ باب الکفالہ میں یہ کی گئی ہے۔

مایکون بحق کری النھر المشترک واجرۃ الحارس للمحلۃ والموظف لتجھیز الجیش وفداء الاساری۔

یعنی جو محصول (واقعی ضرورت کے لئے) عائد کیا جائے، مثلاً ایسی نہر کھود نے کے لئے جو عام مشترک ضرورت کی ہو پہرہ دینے والوں کی تنخواہ کے لئے جو محلہ کی حفاظت کرتے ہوں اور وہ محصول جو فوج کی تیاری کے لئے عائد کیا جائے یا قیدیوں کا فدیہ ادا کرنے کے لئے حکومت کو ضرورت ہو۔

مطلب یہ ہے کہ اگر واقعی اور صحیح ضرورت پڑ جائے تو اس وقت حکومت باشندوں پر جدید ٹیکس خواہ ایک دفعہ وصول کیا جائے یا قسطوں پر تقسیم کر دیا جائے جائز ہے۔ اور عام پبلک پر اس قسم کے محصول کا ادا کرنا واجب ہے جس کی وجہ ابن ہمام نے یہ لکھی ہے کہ

لانھا واجبۃ علی کل مسلم موسر بایجاب طاعۃ اولی الامر فیما فیہ مصلحۃ المسلمین

(ص ۳۲۲)

ہر مستطیع مسلمان پر اس محصول کا ادا کرنا اس لئے واجب ہے کہ اولو الامر کی اطاعت ان امور میں ضروری ہے جس میں مسلمانوں کی بھلائی ہو۔

غلط فہمی نہ ہونی چاہئیے کہ حکومت کے ہر مطالبہ کی ادائیگی کو فقہاء واجب نہیں کہتے بلکہ یہ وجوب ان ہی مطالبوں تک محدود ہے جن کا تعلق مسلمانوں کی عام واقعی ضرورتوں اور ملک کے ضروری مصالح سے ہو، ورنہ ہدایہ اور اس کی شرح میں اس کے بعد تصریح کر دی گئی ہے کہ حکومت کے ایسے مطالبات جو

ليس بحق كالجبايات في زماننا ببلاد فارس على الخياط والصباغ وغيرهم للسلطان في كل يوم او الشهر او ثلاثة اشهر فانها ظلم۔

حق نہ ہوں۔ مثلاً جو محصول ہمارے زمانے میں فارسی ممالک میں درزیوں اور رنگ ریزوں وغیرہ پر بادشاہ کی طرف سے ہر روز یا ہر مہینہ یا ہر تین مہینے میں وصول کئے جاتے ہیں تو اس کا ادا کرنا ضروری نہیں ہے) کہ یہ ظلم ہے۔

شمس الائمہ سے ابن ہمام نے نقل کیا ہے کہ ایسے مطالبات کا نہ ادا کرنا ثواب ہے ان کے الفاظ یہ ہیں۔

اما في زماننا اكثر النوائب تؤخذ ظلما ومن تمكن من دفع الظلم عن نفسه فهو خير له۔
(فتح قدیر ص ۳۳۴ ج ۵)

ہمارے زمانے میں یہ عموماً جو محصول وصول کئے جاتے ہیں چونکہ یہ ظلماً وصول کئے جاتے ہیں اور ظلم کے ازالہ کا جس کو جتنا موقع ملے وہ اس کے لئے بہتر ہے۔

یہ تو ایک ضمنی بات آگئی ہیں یہ کہہ رہا تھا کہ خراج اور خراج کے مصارف بجز اس نقطہ نظر کے کہ وہ حکومت کی نہیں بلکہ عام مسلمانوں کی ملکیت ہے اور اس لئے مسلمانوں کی عام ضرورتوں سے جب بچ جائے تو قدرتاً بچی ہوئی رقم کو ان ہی میں بانٹ دی جائے اس کے سوا اور کوئی اہم خصوصیت حکومت کی اس آمد کی نہیں ہے یا جی چاہے تو پیداوار کے نصف سے خراج کا تجاوز نہ ہونا وصول کرنے میں حتی الوسع نرمی اختیار کرنا سیلاب یا خشکی یا کسی دوسری وجہ سے اگر فصل خراب ہو جائے تو خراج کا کم کر دینا یا معاف کر دینا ان باتوں کا بھی اسلامی خراج کے خصوصیات میں کوئی چاہے تو اضافہ کر سکتا ہے مگر مشکل تو یہ ہے کہ زبان سے تو آج تقریباً دنیا کی اکثر حکومتیں اس کی بلکہ اس سے بھی زیادہ مراعات کی مدعی ہیں۔ پھر ایسی باتوں کے ذکر میں وقت کیوں ضائع کیا جائے یا ان معاملات میں دنیا اگر اسلامی اصلاحات کی منت شناسی سے انکار کرنا چاہتی ہے تو اب ان سے خواہ مخواہ لڑنے کی کیا حاجت ہے۔ روم اور ایران کی حکومتوں کا کسانوں کے ساتھ کیا برتاؤ تھا اور اسلام نے اس میں کیا ترمیم کی ایک طویل مقالہ کا مضمون ہے اسی سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ جرجی زیدان جیسی "حق پوش" ہستی جسے اسلام کی ہر بڑی بات کو چھوٹی ثابت کرنے میں معصومانہ کمال حاصل ہے اس کا قلم بھی زمین کے خراج کے متعلق نہیں بلکہ اسلامی خراج کے مشہور بدنام دوسرے جز یعنی "جزیہ" تک کے متعلق اضطراراً اس اعتراف پر مجبور ہوا۔

والجزية التي كانوا يتكلفون دفعها الى المسلمين اقل كثير عن مجموع الضرائب التي كانوا يودونها الى الروم

مسلمانوں کو جزیہ کے نام سے جو رقم (رومی و ایرانی رعایا) کو ادا کرنی پڑتی تھی۔ ان محصولوں کی مجموعی مقدار سے وہ بہت ہی کم تھی جو یہی لوگ روم

(۱) والفرس (تاریخ تمدن اسلامی ج ۱ ص ...) اور ایران کی حکومت وصول کیا کرتے تھے۔

بہ حال حکومت کے خزانے میں جو روپیہ جمع کیا جاتا ہے موجودہ زمانے تک اس کے اغراض اس سے زیادہ نہیں بڑھے ہیں کہ ملک کے باشندوں کی مشترکہ اور عام ضرورتوں یا مصالح کے لئے اس آمدنی کے ایک حصہ کو مخصوص کرنا چاہئے۔ میں بتا چکا ہوں کہ خراجی آمدنی کا ایک بڑا مصرف اسلام نے بھی یہی مقرر کیا ہے۔ پہلے بھی اس کے متعلق ہدایہ سے ایک عبارت پیش کی جا چکی ہے۔ ابن ہمام لکھتے ہیں کہ جو مصارف خراج کے ہیں اسی طرح،

کذا الجزیة فی عمارة القناطر والجسور وسد الثغور وکری الانهار العظام التی لا ملک لاحد فیها کجیحون والفرات ودجلة والی ارزاق القضاة والمحتسبین والمعلمین والمقاتلة وحفظ الطریق من اللصوص (باب الجزیہ ص ۲۵۴)

اسی طرح جزیہ کی آمدنی پلوں اور گذرگاہوں کی تعمیر، سرحدوں کے استحکام، بڑی بڑی نہریں جو کسی کی ملک میں نہیں ہیں مثلاً جیحون، فرات، دجلہ نہر کھودنے، قاضیوں کی تنخواہوں، محتسبوں، معلموں، فوجیوں کی تنخواہ، راستے کی حفاظت چوروں سے وغیرہ ان سب مصارف میں یہ آمدنی خرچ ہوگی۔

گویا مواصلات (پل سڑک) محکمہ آبپاشی عدالت پولیس تعلیمات وغیرہ اور فوجی شعبوں پر ان کو خرچ ہونا چاہئے اور عام طور پر دنیا کی مہذب حکومتیں یہی کرتی ہیں البتہ جو رقم اس کے خزانے میں بچ جائے اس کو پھر اس کے حقیقی مالک کو یعنی عام مسلمانوں میں امام اپنے صوابدید سے تقسیم کر دے بس یہی ایک بات اسلام میں نئی ہے۔ لیکن جیسا کہ میں نے عرض کیا ملک کی ایک اور بڑی ضرورت ہے جس سے کسی حال میں بھی قطع نظر نہیں کیا جا سکتا۔ یعنی معذوروں، بے روزگاروں، یتیموں، بیواؤں کا مسئلہ جس کے حل کے لئے آج دنیا مختلف شکلیں بیمہ انشورنش انجمن ہائے اتحاد باہمی وغیرہ کی صورتیں اختیار کر رہی ہے اور حکومتیں بھی کچھ ان کے ساتھ نیم دلچسپی لے رہی ہیں لیکن ابھی باضابطہ اس مسئلہ کو کسی حکومت نے براہ راست ہاتھ میں لینے کی جرأت نہیں کی ہے ان کو اندیشہ ہے کہ اگر اس مسئلہ کو چھوڑا گیا تو حکومت کی موجودہ آمدنی اس کے لئے کافی نہیں ہو سکتی اور محصولات کے بڑھانے میں ملک کی عام ناراضی کا خطرہ ہے لیکن اسلام نے ٹھیک اسی وقت جس وقت پہلی آمدنی بروئے حکومت اس کے خزانہ میں آئی اسی مسئلہ کو سب سے پہلے اس نے اپنے سامنے رکھ لیا اور جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں بدر کی فتح سے غنیمت کے خمس (پانچویں حصہ) کی صورت میں جو پہلی آمدنی ہاتھ آئی اس بڑی آمدنی کے تین حصوں کو ملک کے اسی طبقہ کے لئے مخصوص کر دیا جن کے مسئلہ کو باوجود شدید احساس کے اس وقت تک حکومتیں اپنے ہاتھوں میں لینے سے ہچکچا رہی ہیں لیکن قرآن میں اس وقت جو آیت ان لوگوں کے متعلق نازل ہوئی وہ مجمل تھی یعنی الیتامیٰ والمساکین وابن السبیل محض ان تین قسم کے

لوگوں کا نام تھا لیکن جوں ہی اسلام کا قدم آگے بڑھنے لگا اور حکومتی اقتدار میں دن بدن اضافہ شروع ہوا تو قرآن مجید میں حکومت کے ذریعہ سے اس حاصل شدہ اقتدار و قوت کے استعمال کا مسلمانوں کو ایک ایسے طریقہ سے روشناس کیا گیا جس سے شاید اس وقت تک دنیا کی حکومتیں ناواقف تھیں اور اب تک ان میں سے کسی کو حکومت کی قوت کو اس راہ میں استعمال کرنے کی ہمت نہیں ہوئی تفصیل[1] اس اجمال کی یہ ہے کہ گو ملک کے غرباء و فقراء و معذوروں کا مسئلہ اسلامی حکومت کی نگاہ میں شروع سے تھا۔ لیکن ابتداء میں (خمس غنیمت) یعنی غنیمت کے پانچویں حصہ سے جو حصہ ان لوگوں کے لئے مختص کیا گیا تھا اس وقت اجمالاً محض اس گروہ کے تین ہی طبقہ تک بات محدود تھی لیکن اب قرآن میں باضابطہ ملک کے ان معاشی حاجتمندوں کی ایک تفصیلی فہرست[2] نازل ہوگئی جس کا دائرہ علاوہ ان تین جماعتوں کے چند ایسے طبقات کو محیط تھا جن کی طرف شاید حاجت مندوں کے لفظ سے بھی لوگوں کا اکثر ذہن منتقل نہیں ہوتا۔ میرا مطلب یہ ہے کہ ایسے لوگ جن میں معاشی جد وجہد کی قوت ہی گویا ساکن اور بجھی ہوئی ہو، مثلاً جو یتیموں کا حال ہے کہ معاش حاصل کرنے کے لئے جن جسمانی اور عقلی قوتوں کی ضرورت ہے ابھی ان کا نشو و نما بھی ان میں صحیح طور پر ہونے نہیں پاتا اور جس طاقت کے وہ زیر پرورش تھے اس سے بھی وہ محروم رہ جاتے ہیں۔ اسی طرح ایسے لوگ جن میں یہ قوتیں ابھری ہوں لیکن بوڑھاپے یا کسی اور وجہ سے جد وجہد کی صلاحیت ساکن ہوگئی ہو، خلاصہ یہ ہے کہ حصول معاش کی قوتیں جن کی متحرک نہ رہی ہوں۔ اب خواہ یہ سکون اس لئے ہو کہ ابھی ان کی حرکت کا وقت نہیں آیا یا متحرک ہو کر ساکن ہوگئی ہوں۔ بہر حال ان سب پر "المسکین" کا لفظ بولا جاتا ہے جو سکون سے ماخوذ ہے اور مبالغہ کا صیغہ ہے یعنی انتہائی سکون کی حالت میں جس کی معاشی قوتیں ہوں، المسکین کے ذیل میں قاضی بیضاوی لکھتے ہیں،

من السکون کان العجز اسکنہ۔	المسکین کا لفظ "اسکون" سے ماخوذ ہے گویا یوں سمجھنا چاہیئے کہ عجز و بیچارگی نے اس کو ٹھنڈا اور غیر متحرک ساکن بنا دیا۔

یا حصولِ معاش کی قوتیں اور ذرائع بالکل ساکن یا مفقود تو نہ ہوں۔ لیکن کچھ حالات اتفاقی کے شکار ہو کر

---

[1] آگے جو کچھ بیان کیا جائے گا دراصل وہ قرآن کی مشہور آیۃ صدقہ کی تفسیر ہوگی۔ یعنی انما الصدقات للفقراء والمساکین والعاملین علیہا والمؤلفۃ قلوبہم وفی الرقاب والغارمین وفی سبیل اللہ وابن السبیل (نہیں ہے۔ مں کے سوا الصدقت کا مصرف کہ وہ فقراء و مساکین کو دیا جائے اور ان لوگوں کو جو تحصیل صدقات میں کام کریں اور جنکے قلوب کی تالیف مقصود ہو یز الرقاب (غلاموں کے آزاد کرانے میں) اور غارمین (تاوان زدہ) لوگوں پر اور اللہ کی راہ میں اور مسافر پر ان ہی کا فقہ میں اصطلاحی نام مصارف زکوٰۃ و صدقات ہے آئندہ اگرچہ اسی آیت کی تفصیل کی گئی ہے لیکن بیان میں ترتیب وہ نہیں ہے جو قرآن میں آپ پارہے ہیں ۱۲

[2] یہ فہرست یہی آیت ہے ۱۲

معاشی ذرائع سے وہ محروم ہو گئے ہوں۔ مثلاً ناگہانی طور پر کسی بیماری کا حملہ ہوا اور علاج و معالجہ میں کسی کا سارا سرمایہ ختم ہو جائے یا بیوپار کھیتی میں اسے نقصان پہنچا ہو یا اسی قسم کے دوسرے حوادث کے جو شکار ہوئے ہوں جیسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ان صحابیوں کا حال تھا جو مہاجرین کے نام سے موسوم ہیں کہ گھر بار جائداد چھوڑنے پر اُن کو مکہ معظمہ کے حالات نے مجبور کیا اور مدینہ منورہ میں آکر انھوں نے پناہ لی۔ حوادث روزگار میں ان ہی مبتلا ہونے والے ناداروں کو "الفقراء" کہتے ہیں۔ اسی لئے قرآن مجید میں "مہاجرین" کے ساتھ فقراء کی صفت کا استعمال کیا گیا ہے حالانکہ حصول معاش کے لئے جن جسمانی وعقلی قوتوں کی ضرورت ہے وہ سب ان میں موجود تھیں خلاصہ یہ ہے کہ ہر ملک ہر سوسائٹی میں کچھ لوگ ایسے چکروں میں آجاتے ہیں کہ باوجود عدم معذوری کے کچھ کرنا بھی چاہیں تو کرنے کی ساری راہیں اپنے اوپر مسدود پاتے ہیں۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ موجودہ زمانے کے بیروزگار تعلیم یافتوں کی نوعیت بھی شاید اسی کے قریب قریب ہے دوسروں کو حیرت ہوتی ہے کہ ہاتھ پاؤں رکھتے ہوئے چاق چوبند ہوتے ہوئے یہ لکھنے پڑھنے والوں کا گروہ آخر معاشی پریشانیوں میں کیوں مبتلا ہے کہ معمولی اَن پڑھ جاہلوں سے زیادہ روٹی کا مسئلہ ان کے لئے پیچیدہ بنا ہوا ہے۔ مجھے اس وقت تعلیم یافتوں کے اس قابل رحم گروہ سے بحث نہیں اور نہ اس سے ان کی شکایت بیجا ہے یا بجا۔ بلکہ صرف ایک واقعہ کو بتانا ہے کہ باوجود سب کچھ ہونے اور سب کچھ رکھنے کے معاشی ذرائع ان پر بند ہیں۔ یہ سب کا مشاہدہ ہے جس سے معلوم ہوا کہ بظاہر حالات کسی کے کیسے کچھ بھی ہوں۔ لیکن اس کے واقعی حال کا وہ کوئی صحیح معیار نہیں ہو سکتا۔ حضرت اکبر مرحوم کا شعر اس موقعہ پر یاد آتا ہے فرماتے ہیں ؎

یہ دُنیا رنج و راحت کا غلط اندازہ کرتی ہے
خدُا ہی خوب واقف ہے کسی پر کیا گذرتی ہے

اسی لئے اسلام نے جہاں ایک طرف مانگنے والوں کے لئے سوال کو اس وقت تک حرام قرار دیا جب تک بالکل مخمصہ اور اضطرار کی حالت نہ پیدا ہو جائے۔ لیکن اسی کے ساتھ دینے والوں کو حکم دیا گیا ہے جیسا کہ فاطمہ بنت حسین بن علی رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے مروی ہے کہ

قال النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا
للسائل حق وان جاء علی فرس	کہ مانگنے والے کا حق ہے خواہ وہ گھوڑے
(بیہقی فی سننہ)	ہی پر کیوں مانگنے نہ آیا ہو۔

کیا معلوم کہ گھوڑے سوار کی حالت کیا ہے اور وہ بیچارہ کس حال میں مبتلا ہے جب کہ اس زمانے کے زیادہ تر سائیکل سواروں کے حالات سے اس امر کی تصدیق ہوتی ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ اس فہرست میں قرآن نے پہلے تو "الفقراء والمساکین" کا ذکر کیا اور دونوں الفاظ ان تمام لوگوں کو عام ہیں جو مندرجہ بالا صفات سے موصوف ہوں۔ عمر بن عاص فاتح مصر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے کسی نے ان

الفاظ کی تفسیر پوچھی بطور مثال کے ان چند طبقات،

العمیان والعرجان والکسیح وَالیتامیٰ — اندھے، لنگڑے، اپاہج اور یتیموں۔

کا ذکر کر کے فرمایا[۱]

کل منقطع بہ۔ — ہر وہ شخص (جو وجوہ معاش) سے جدا ہو گیا ہو۔

اور واقعہ یہ ہے کہ حاجتمندوں کے ان طبقات پر تو یوں بھی لوگوں کی نظر پڑتی ہے۔ ہر قوم اور ملک کے ارباب ثروت وحیثیت ان کی امداد اپنا ایک اخلاقی اور دینی فرض سمجھتے ہیں۔ اگرچہ حکومتوں نے اپنی آمدنی میں ان کا کوئی مستقل حصہ نہیں رکھا ہے۔ لیکن یوں بے قاعدہ طور پر غیر منظم شکلوں میں مختلف تقریبات کے سلسلہ میں یا یوں بھی ان لوگوں کے ساتھ نیک سلوک کیا جاتا ہے۔ خوشی اور مسرت کے مواقع میں اندھوں لنگڑوں غریبوں کو جمع کر کے کھانا کھلا دیا جاتا ہے یا کچھ پیسے بانٹ دیئے جاتے ہیں۔ مگر اسلام کی نظر اس سے بھی آگے پہنچی، آج ابراہیم لنکن اور ان جیسوں کا نام غلاموں کے آزاد کرانے میں بڑی عزت سے لیا جاتا ہے۔ حالانکہ یورپ کے راجواڑوں نے غلاموں کے آزاد کرنے یا کرانے کا بیڑہ اس وقت اٹھایا جب ترکوں اور عربوں اور دیگر مسلمان قوموں کے مقابلہ میں ان کو اس کے سوا اور کوئی چارہ نہ نظر آیا کہ جب تک ہم ہی لوگ غلامی کے انسداد پر رضامند نہ ہوں گے بری اور بحری راستوں سے یورپ کے بچوں اور عورتوں کو غلام اور لونڈی بنانے کے طریقہ کو مسلمان نہ چھوڑیں گے۔ آخر اس پر اتفاق ہوا مسلمانوں کے خلیفہ کے سامنے مسئلہ پیش ہوا شیخ الاسلام نے نحن احق بمکارم الاخلاق کے ساتھ اس نیک کام میں لبیک کہا۔ خلیفہ کے دستخط ہو گئے۔ کیونکہ ظاہر ہے غلام بنانا اسلام میں نہ فرض تھا نہ واجب نہ سنت نہ مستحب بلکہ دنیا کی قوموں نے جنگی تجربات کی[۲]

---

[۱] سنن بیہقی ص ۱۳ ج ۷، کتاب الصدقات ۱۲

[۲] واقعہ یہ ہے کہ ہر بڑی جنگ میں قیدیوں کی ہزاروں بلکہ لاکھوں تعداد گرفتار ہوتی ہے۔ ان کو چھوڑا بھی نہیں جا سکتا کہ دشمن کی قوت میں اضافہ ہوتا ہے۔ ورنہ قید کرنے کی حاجت ہی کیا تھی۔ جنگ کے زمانے میں خود اپنی فوجوں کے مصارف میں جب دشواری ہوتی ہو تو ان ہزاروں اور لاکھوں قیدیوں کا رکھنا آسان نہیں ہے قتل کر دینا بے رحمی ہے بس اسی قتل کا بدل غلامی ہے گویا ایک طرح کا احسان ہے کہ جو مستحق قتل تھے ان پر من واحسان کر کے جان بخشی کر دی گئی، اور سچ پوچھئے تو بجائے قتل کے ان قیدیوں کے زندہ رہنے کی غلامی کی صورت میں ایک صورت تو نکل آتی ہے آج جبکہ سمجھا جاتا ہے کہ دنیا سے غلامی کا رواج اٹھا دیا گیا ہے جنگ کے قیدیوں کا مسئلہ اسی طرح پیچیدہ بنا ہوا ہے جیسے پہلے تھا۔ دشمن کی فوج کے قیدیوں سے جس قسم کے ناقابل برداشت کام لئے جاتے ہیں، ایا اندرونی طور پر ان قیدیوں کے لئے ان الطاف راجیب کرنا جاتا ہے، مخفی طور پر جو سلوک ان کے ساتھ کرتے ہیں اگر واقعی وہ صحیح ہیں تو میرے نزدیک ان قیدیوں کی حالت غلامی کے عہد کے قیدیوں سے بھی زیادہ قابل رحم ہے مسئلہ غلامی کی تفصیل میری کتاب "الدین القیم" کے حصہ دوم میں پڑھنا چاہئے جو عنقریب انشاء اللہ تعالیٰ شائع ہونے والی ہے ۱۲

بنا پر قیدیوں کے قتل کرنے سے ان کو غلام بنا لینا نسبتاً آسان خیال کیا تھا۔ البتہ چونکہ غلام ہمیشہ دشمن قوموں کے افراد ہوتے تھے ان کے ساتھ اچھا برتاؤ طبعاً نہ کیا جاتا تھا جس کی داستان درد سے تاریخ بھری پڑی ہے۔ اس جنگی صورت کی بنا پر اسلام نے بھی دیکھا کہ جب دنیا کی ساری قومیں مسلمانوں کو غلام بناتی ہیں تو اس نے بھی دشمن کے جنگی قیدیوں کو غلام بنانا جائز قرار دیتے ہوئے اتنی ترمیم کر دی کہ جب تک ان کو غلام بنا کر رکھا جائے ان کے ساتھ اچھا سلوک کیا جائے حتیٰ کہ کھانے پینے کی حد تک برابر رکھا جائے اور جب امن کا زمانہ آجائے تو اسلام میں صرف یہی نہیں کہ بیسیوں شکلیں قانونی اور مذہبی۔ مثلاً کفارات وغیرہ کے ذریعے سے غلام آزاد کرائے جاتے ہیں بلکہ قرآن نے نیکی کی ایک بڑی اہم مد فَكُّ رَقَبَةٍ (غلام کا آزاد کرنا) بھی قرار دیا۔ پھر معاوضہ لے کر بھی غلاموں کے آزاد کرنے کی ایک صورت جو عرب میں جاری تھی یعنی کتابت اس کی بھی اسلام نے ہمت افزائی کی اور عام مسلمانوں کو ان مکاتب غلاموں کی امداد پر ابھارا۔ خیر یہ سب تو غلامی کی راہ میں اسلام کی غیر متعین کوششیں ہیں لیکن آخر میں تو وہ یہ بھی کر گذرا کہ جس فہرست میں اس نے "الفقراء والمساکین" کو رکھا تھا باضابطہ اسی فہرست میں "فی الرقاب" کا بھی اضافہ کر دیا۔ اس پر تو سب کا اتفاق ہے کہ "الرقاب" کے نیچے ایسے غلام داخل ہیں جن کے آقاؤں نے معاوضہ لے کر ان کے آزاد کرنے کا معاہدہ کیا ہو۔ اور جس وقت قرآن میں یہ فہرست نازل ہوئی اس وقت نہ صرف عرب بلکہ دنیا کے ہر حصہ میں آبادکاروں کے ساتھ انسانوں کا یہ گروہ بہ تعداد کثیر پایا جاتا تھا جن کے مالکوں نے کہہ رکھا تھا کہ اتنی رقم اگر تم ادا کر دو تو تمہاری گلو خلاصی ہو جائے گی۔ مگر ان بیکسوں کے مددگار بہت کم تھے تا آنکہ اسلامی حکومت نے ان کے مسئلہ کو بھی اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ بہرحال "الرقاب" کا لفظ اگرچہ ہر قسم کے غلاموں کے لئے عام ہے۔ لیکن عموماً فقہاء امت نے "مکاتب" والی قسم ہی مراد لی ہے مگر امام مالکؒ کا خیال ہے کہ

انها الرقاب يبتاعون من الزكوٰة فيعتقون۔	"الرقاب" سے وہ غلام مراد ہیں جنھیں الزکوٰۃ کی مد سے خریدا جاتا ہے اور اس کے بعد آزاد کئے جاتے ہیں۔

گویا غیر مکاتب "غلام" بھی اس کے نیچے داخل ہیں جس کے معنیٰ یہ ہوئے کہ صرف مکاتب غلاموں کے مسئلہ کو نہیں بلکہ اس عہد کے اس پورے طبقہ کو جو "غلام" طبقہ خیال کیا جاتا تھا قرآن نے اپنی اس مہم میں داخل کر لیا ہے اور اس وقت داخل کیا جب ابراہیم لنکن جیسوں کے باپ دادا غلاموں کو درندوں سے پھڑوا کر اور ان کی جوڑیوں کو لڑا لڑا کر تڑپتی ہوئی لاشوں سے اپنی دعوتوں کی رونق بڑھاتے تھے (تفصیل کے لئے دیکھئے تاریخ اخلاق یورپ اڈورڈ ہارٹ لیکی)

خیر اس وقت نہ سہی بعد ہی کو سہی ترکوں کے دباؤ کی وجہ سے یا واقعی انسانی ہمدردی کے تحت غلاموں کی طرف حکومتوں کی توجہ منعطف ہوئی لیکن ہر ملک اور ہر آبادی میں غلاموں سے بھی

بہر حال میں ایک اور طبقہ رہتا ہے، یہ اس لئے زیادہ قابلِ رحم ہے کہ دوسروں کے ساتھ حکومت نہیں عوام انفرادی طور پر حسن سلوک کچھ نہ کچھ کرتے رہتے ہیں لیکن اب میں نے جس طبقہ کا ذکر کرنا چاہتا ہوں یہ وہ بیکس محروم طبقہ ہے جس کو کسی زمانہ میں حکومتی یا انفرادی ہمدردی کا مستحق نہیں ٹھہرایا گیا اور نہ ان کے ساتھ نیکی کرنی نیکی سمجھی گئی۔ میری مراد مقروضوں سے ہے۔ یہ دنیا کا وہ مظلوم گروہ ہے جس کے ساتھ نیکی اور حسن سلوک تو بڑی بات ہے اس وقت تک دنیا کی حکومتوں نے ان کے ستانے والوں اور ان پر ظلم و تشدد کے پہاڑ توڑنے والوں کی صرف زبانی نہیں بلکہ قانونی امداد و اعانت کو اپنا فریضہ قرار دے رکھا ہے۔ ہر حکومت کی فوجی اور عسکری قوت اس لئے تیار رہتی ہے کہ مقروضوں کے ذمہ قرض خواہوں کا جو دین اور مطالبہ ہے صرف اصل ہی نہیں بلکہ سود در سود کے ساتھ اس سے وصول کرا دیا جائے خواہ اس راہ میں اس کی ساری جائداد گھر کا سارا اثاثہ ہی کیوں نہ نیلام ہو جائے۔ یہ ایک واقعہ ہے اور تمدن و تہذیب کی ترقی اور روشنیوں میں یہ اندھیر گھپ گھپا اودھم مچائے ہوئے ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ مذکورہ بالا فہرست کی تو تمام مدوں کے ساتھ دنیا کی حکومتوں نے اب تک کسی باضابطہ نیکی کا ارادہ نہیں کیا لیکن باضابطہ ظلم بھی ان حکومتوں نے روا نہ رکھا تھا۔ لیکن ایک یہ بیچارہ مقروضوں کا طبقہ ہے کہ خدا جانے کن مشکلات میں مبتلا ہو کر قرض کے بوجھ کو لادنے پر یہ آمادہ ہوتا ہے اور پھر ان مشکلات سے نجات تو کوئی کیا دلاتا۔ سود در سود کی زنجیروں میں ساہوکار اس کو جکڑتا چلا جاتا ہے اور حکومتوں کے سارے سوار و پیادے توپ و بندوق سے اس زنجیر کے جکڑنے میں اس کے معاون و مددگار بنے ہوتے ہیں۔ حکومت پبلک کے لئے ہے بلکہ پبلک ہی کے لئے ہے۔ اس دعوی کے مدعیوں کا پبلک ہی کے ایک طبقہ کے ساتھ یہ طرزِ عمل قابلِ غور ہے۔

بہر حال جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا ہے قرآن نے قرض کو دنیاوی کاروبار یا معاملہ کی مد سے نکال کر ایک تو یوں بھی اس کو ایک اہم ترین انسانی ہمدردی کا مظہر قرار دیا اور بجائے مقروض کے قرض دینے والے کے سامنے خدا نے خود اپنا ہاتھ پیش کیا جس سے اس نیکی کی بلندی کا اندازہ ہوتا ہے اور اس سے بھی عجیب تر یہ ہے کہ بالآخر اسی فہرست میں "الغارمین" کے لفظ کے ساتھ ملک کے قرضدار طبقہ کے مسئلہ کو حکومت نے اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

اہلِ فقہ کا اتفاق ہے کہ "الغارمین" سے مراد وہ لوگ ہیں جو مقروض ہوں یا زراعت و تجارت یا اسی قسم کے کاروبار میں ان کو نقصان پہنچ گیا ہو۔ بیت المال میں ایک مد بیت المال الغارمین کی بھی رکھی جاتی تھی، خصوصاً مقروضوں کے متعلق تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اپنی زندگی ہی میں یہ اعلان فرما دیا تھا،

من ترک مالا — یعنی مرنے کے بعد جو کوئی مال

فلورثتہ — چھوڑ کر مرے وہ تو اس کے

(یعنی پانچویں حصہ کا پانچواں حصہ) صرف یہ "صرفِ خاص مبارک" کے لئے مخصوص تھا۔ لیکن اس کا حال بھی یہ تھا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتی ضروریات سے جو کچھ بچ جاتا تھا اور آپ کی ذاتی ضرورتوں کا معیار ہی کیا تھا جو نہ بچتا اس کو بھی آپ مسلمانوں ہی کے عام مصالح میں صرف فرما دیا کرتے تھے۔ علانیہ بھرے مجمعوں میں اعلان فرماتے کہ

مایحل لی مما افاء اللہ علیکم مثل ھذہ الا الخمس۔ — خدا نے جو آمدنی اے مسلمانوں تم پر واپس کی ہے (یعنی جن کا دروازہ تم پر کھولا ہے) اس میں خود میرے لئے بجز اس خمس (پانچویں حصہ) کے اور کچھ لینا جائز نہیں۔

جب پیغمبر کے لئے "خمس" کے سوا کچھ حلال نہ تھا تو اس سے دوسرے امراء کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ پھر اس کے بعد فرماتے اور

والخمس مردود فیکم۔ — اور پھر یہ خمس (پانچواں حصہ) بھی تم ہی لوگوں پر واپس کر دیا جاتا ہے۔

مطلب یہ تھا کہ اس پانچویں حصہ کی بڑی مقدار مسلمانوں کی عام ضرورتوں میں صرف ہو جاتی ہے۔ اس فقرہ کی شرح امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ سے یہ منقول ہے،

یعنی بالخمس حقہ من الخمس — یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مراد اس سے آپ کا وہ حصہ تھا جو خمس سے آپ کو ملتا تھا۔

بعد کو آپ کے راشدین خلفاء نے جو عملی ثبوت خود اپنی اور اپنے عمال کی زندگی کی مثالوں سے پیش کی ہیں، تاریخ کے اوراق ان واقعات سے لبریز ہیں اور اجمالاً بعض چیزوں کا ذکر آچکا ہے اور اسی کو میں اسلام کا ایک جدید اقدامی کارنامہ خیال کرتا ہوں بنی آدم کے اس کس مپرس پسماندہ طبقے جو ہمیشہ دوسروں کے سینہ کے بوجھ بنے رہے بلکہ مختلف زمانوں میں متمدن اقوام میں عملاً حتیٰ کہ کہیں کہیں قانوناً بھی افلاس و غربت مقروضیت دائم المریضی غلامی وغیرہ اتفاقی غیر اختیاری مصائب کو جرم اور سرمایۂ رسوائی و خواری قرار دیا گیا[1] حقارت و ذلت کے بدترین سلوکوں کے جو ہمیشہ مستحق ٹھہرائے گئے ان کی باضابطہ منظم شکل میں صرف زبان ہی سے نہیں بلکہ واقعی مالی اعانت کے لئے حکومت کا اپنی تمام عسکری اور فوجی قوتوں کے ساتھ کمربستہ ہو جانا اور اس کو عملاً کر گذرنا غالباً انسانیت کی تاریخ میں دنیا کی حکومتیں اس کی نظیر نہیں پیش کر سکتیں۔

اور صرف یہی نہیں بلکہ اسلامی بجٹ (موازنہ) میں جدید مصارف کی ان غیر معمولی مدوں کی تکمیل و پابجائی کے لئے علاوہ خمس کے حصول کے آمدنی کے جو ذرائع اسلام نے اختیار کئے اور

---

[1] جیسے کہ اسپارٹا، یونان وغیرہ دونوں کے قانون کے متعلق مؤرخین ذکر کرتے ہیں ۱۲

محصول اندازی کے اس سلسلہ میں جن حکیمانہ نزاکتوں کو پیش نظر رکھا گیا ہے وہ بھی بجائے خود کچھ کم
تعجب انگیز نہیں بلکہ اسلام کی صداقت یا قدرتی قانون ہونے کی وہ ایک بین دلیل ہو سکتی ہے۔ میرا
مطلب یہ ہے کہ موازنہ میں مصارف کی متعدد مدوں کا جو اضافہ کیا گیا یہ معمولی مد نہیں ہے۔ مذکورہ بالا
طبقات میں سے تقریباً ہر ملک میں ہر طبقہ کے ہزاروں اور لاکھوں افراد رہتے بستے ہیں ان کی انفرادی
مالی اعانت کا بیڑہ اٹھانا کچھ آسان کام نہ تھا معمولی رقوم سے یہ مسئلہ حل نہیں ہو سکتا تھا ضرورت وافر
آمدنی کی تھی۔ اسلام نے اس سلسلہ میں جو کچھ کیا ہے یوں تو سب ہی جانتے ہیں لیکن شاید ان کی حکمتوں پر
غور نہیں کیا گیا میں ان میں سے بعض نکات اور مصالح کو نمبروار بیان کرتا ہوں۔

(۱) سب سے پہلی بات یہ ہے کہ موازنہ کے ان مصارف کی تکمیل کے لئے اسلام جن
لوگوں پر محصول عائد کرنا چاہتا تھا ان کے لئے اس نے اس عجیب و غریب رعایت کا اعلان کیا۔
جو لوگ اس محصول کے ادا کرنے کی ذمہ داری اپنے اوپر لیں گے ان کو ان تمام مالی مطالبات سے
سبکدوش کر دیا جائے گا جو عموماً دنیا کی حکومتیں اپنی رعایا پر عائد کرتی ہیں۔ ایک تو اسلام نے یوں بھی
اپنی رعایا کو رومی و عجمی سلاطین کے ناجائز مطالبات سے سبکدوش کر ہی دیا تھا۔ لیکن ان لوگوں
کے ساتھ رعایت کی حد کر دی گئی یعنی زمین کا خراج جو ہر حکومت کا ایک قانونی اور فطری حق ہے
اس سے بھی اس مد کے محصول ادا کرنے والوں کو مستثنیٰ کر دیا جائے گا۔

(۲) حکم دیا گیا کہ جس طرح ہر قوم و ملک کے لوگ خصوصاً جو کسی نہ کسی قسم کا مذہب رکھتے
ہیں، منجملہ دیگر مذہبی امور کے آخر خیر و خیرات بھی ضرور کرتے ہیں، بس خیر و خیرات کی یہی مد جسے ہر حال
ہر مذہبی زندگی رکھنے والا آدمی اپنی آمدنی سے ضرور نکالتا ہے۔ لیکن اب تک اس کو لوگوں نے مبہم
غیر متعین شکل میں رکھا ہے۔ آمدنی سے نکالی ہوئی اسی رقم کو اسلام ذرا متعین و مشخص شکل دے کر
لوگوں سے وصول کرے گا اور بجائے اس کے کہ حاجتمندوں تک اپنی آمدنی سے بچائی ہوئی اس
رقم کو لوگ انفرادی طریقہ سے پہنچاتے تھے۔ حکومت اس کام کو اپنے ہاتھ میں لے لیتی ہے اور اپنے
صوابدید سے مستحقین تک پہنچا دے گی، جس کے معنی یہی ہوئے کہ ایک طرف حکومت کے تمام مطالبوں
سے سبکدوشی بھی ہوئی اور لوگوں کی مالیات اور آمدنی پر مزید کوئی بار بھی نہ پڑا۔ بلکہ وہی چیز جسے
غیر منظم شکلوں میں لوگ ادھر ادھر بانٹ دیا کرتے تھے اب منظم شکل میں تقسیم ہو گی۔

(۳) آمدنیوں سے پس انداز ہونے والی اس رقم سے چونکہ ملک کے مذکورہ بالا اتفاقی
آفات و مصائب کے شکار طبقات کی امداد کی جائے گی۔ اس لئے یہ ہو سکتا ہے کہ خود ان رقوم کے
جمع کرنے والے یا ان کے خاندان میں سے کوئی آدمی کسی وقت خدانخواستہ ان مصائب و آفات کا
شکار ہو تو وہ بھی اس سے فائدہ اٹھا سکتا ہے گویا جن اتفاقی مصائب و آفات کی تصویر کھینچ کھینچ کر
بیمہ کمپنی والوں کے ایجنٹ آج یہ حکم دیتے ہیں کہ ان کا خیال کر کے اپنی آمدنی سے فی صدی کچھ رقم
ان کی کمپنیوں میں جمع کی جائے یا انجمن ہائے اتحاد باہمی کے مبلغین جن اتفاقی ضرورتوں کے لئے

عرب میں زیادہ تر مذکورہ بالا جانوروں ہی کی پرورش بطور ذریعہ معاش کے گلوں اور ریوڑوں کی شکل میں کی جاتی تھی۔ لیکن جب ایسے ممالک فتح ہوئے جہاں یہی کاروبار گھوڑوں کا بھی جاری تھا جیساکہ ابن ہمام لکھتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں،

لم یکن اصحاب الخیل السائمۃ
من المسلمین بل اھل الابل
وما نقد: اذ اصحاب ھذہ
انما ھم اھل المدائن والدشت
والترکہ وانما فتحت
بلادھم فی زمن عمر وعثمان۔
(ص ۵۰۴ ج ۱)

(عہد نبوت میں) مسلمانوں کے کسی طبقہ
میں گھوڑوں کی پرورش کا افزائش
نسل کی غرض سے عموماً رواج نہ تھا،
بلکہ اونٹوں اور جن کا ذکر ہوا ان
ہی کی پرورش کا رواج تھا کیونکہ گھوڑوں
کی پرورش کرنے والے تو زیادہ تر
یا مدائن کے لوگ ہیں یا دشت کے
یا ترکمانی خرگاہوں والوں میں اس کا رواج ہے اور ان علاقوں پر مسلمانوں کا
قبضہ حضرت عمر و عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے عہد میں ہوا۔

بہرحال جب گھوڑوں والی رعایا بھی اسلامی محروسہ میں داخل ہوئی تو سوال پیدا ہوا کہ ان گھوڑوں پر بھی محصول عائد کیا جائے جیساکہ دوسرے جانوروں پر ہے۔ لیکن محصول کی مقدار کیا ہو تو حنفی فقہاء لکھتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے فیصلہ کیا۔

صاحبہا بالخیار ان شاء
اعطی من کل فرس دینارا
وان شاء قومہا واعطی من
کل مائتی درھم خمسۃ
دراھم۔ (ہدایہ)

اس قسم کے گھوڑوں کے پالنے والوں کو
اختیار ہے چاہیں ہر گھوڑے کی زکوٰۃ
ایک دینار (اشرفی) ادا کریں اور چاہیں
تو یہ بھی کرسکتے ہیں کہ گھوڑے کی قیمت
لگا کر ہر دو سو درہم پر پانچ درہم
زکوٰۃ ادا کریں۔

جب دو سو درہم کی قیمت سے پانچ درہم کا یہاں بھی حضرت عمرؓ نے حکم دیا تو وہی چالیسواں حصہ یہاں بھی ہوا، اس لئے قیاس کیا جاتا ہے کہ غالباً مویشیوں میں بھی چالیسویں حصہ کے اصول کو محفوظ رکھا گیا ہو۔ واللہ اعلم بالصواب۔

(۷) عام طور سے جن اموال پر محصول عائد کیا جاتا ہے۔ عموماً محصول اسی وقت ان کا وصول نہیں کیا جاتا جس وقت مالک کی ملک میں وہ چیز آئی ہو بلکہ مالک ہونے کے کامل ایک سال (حولانِ حول) گذرنے کی ضرورت ہے یہ عام دستور ہے۔ زراعت میں کچھ ترمیم بھی ہوئی ہے۔

(۸) نہایت شدید تاکیدی احکام اس باب میں بھی ہیں کہ حکومت کی خراجی وغیرہ مدوں کی آمدنیوں کو اس آمدنی سے بالکل الگ رکھا جائے یعنی مذکورہ بالا مصیبت زدہ طبقات کی امداد

تؤخذ من اغنیائھم وترد علیٰ فقرائھم۔
(بخاری ومسلم)

جس علاقہ کے تونگروں اور سرمایہ داروں سے الصدقات وصول کئے جائیں، اسی علاقہ کے فقراء میں وہ تقسیم کی جائے۔

حضرت عمران ابن حصین صحابی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ کسی جگہ وہ الصدقات کے تحصیلدار بنا کر بھیجے گئے، کچھ دن کے بعد جب واپس ہوئے تو لوگوں نے پوچھا این المال (مال کہاں ہے) بولے

للمال ارسلتمونی اخذناھا من حیث کنا ناخذھا علیٰ عھد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ووضعناھا حیث کنا نضعھا۔
(سنن بیہقی)

کیا آمدنی لانے کے لئے تم نے ہمیں بھیجا تھا، ہم نے اس کو ان ہی مقامات سے وصول کیا جہاں سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں وصول کرتے تھے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں جہاں اس کو تقسیم کرتے تھے وہیں ہم نے اسے بانٹ دیا۔

البتہ اگر وہاں کی ضروریات سے بچ جائے تو پھر باقی ماندہ حصہ کو "مرکز" کے خزانے میں جمع کر دیا جائے اس سلسلہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں یمن اور قبیلۂ طے تمیم تک کے صدقات آتے تھے، بہر حال کلیہ یہی ہے کہ "الصدقات" پہلے اس مقام کے مستحقین میں تقسیم کیا جائے جہاں کے ارباب حیثیت سے وصول کیا گیا ہو خواہ وہ کسی شکل میں ہو بعض فقہاء نے تو مختلف اصولی حدیثوں کی بنا پر اس قانون میں یہاں تک تفصیل کی ہے کہ

الافضل ان یصرفھا الیٰ اخوتہ الفقراء ثم الیٰ اولادھم ثم اعمامہ الفقراء ثم اخوالہ ثم ذوی ارحامہ ثم جیرانہ ثم اھل سکۃ ثم اھل مصرہ
(فتح القدیر ص ۲۹ ج ۲)

یہ زیادہ بہتر ہے کہ "الصدقات" کی آمدنی صدقہ ادا کرنے والوں کے محتاج بھائیوں میں تقسیم کی جائے، پھر ان کے بعد اس کا استحقاق بھائی کی اولاد کو ہے پھر محتاج چچاؤں کا حق ہے پھر ماموؤں پھر عام رشتہ دار، پھر پڑوسی پھر جو لوگ اس سڑک پر رہتے ہوں جس پر صدقہ ادا کرنے والا رہتا ہو، پھر اس کے شہر والے۔

جس کے یہ معنی ہوئے کہ صرف مقام ہی کو ترجیح حاصل نہیں ہے بلکہ دینے والوں کے رشتہ داروں کو غیر رشتہ داروں پر اور رشتہ داروں میں بھی جو جتنا زیادہ رشتہ میں قریب ہو وہ اگر مذکورہ بالا مصائب و آفات میں گرفتار ہو گیا ہے تو اس مال کا وہ زیادہ مستحق ہے۔

"الصدقات" کے متعلق ان نازک حکیمانہ اصولوں کے ساتھ یہ اعلان کہ جو مسلمان اس

محصول کو ادا کرے گا، اس کو دوسرے حکومتی مطالبات سے سبکدوش کر دیا جائے گا۔ اس کا قدرتی اثر یہ تھا کہ برضا و رغبت لوگ اسی الصدقاتی مطالبہ کو قبول کر رہے تھے یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کبھی کبھی عربوں کو مخاطب فرما کر ارشاد فرماتے

یا معشر العرب احمدوا اللّٰہ	عرب کے لوگو خدا کا شکر کرو کہ تم
اذ رفع عنکم العشور۔	سے اس نے حکومتی عشور (ٹیکس)
(الطحاوی ص ۳۱۲)	کو اٹھوا دیا۔

لوگوں کو اس حدیث کے سمجھنے میں دشواری پیش آئی۔ حالانکہ صاف مطلب یہی تھا کہ حکومتیں اپنی رعایا پر جو ٹیکس اعشر، وغیرہ کے نام سے ٹیکس اور رینٹ عائد کرتی تھیں۔ حق تعالیٰ نے مسلمانوں کو اس سے معاف فرما دیا ہے۔ اس لئے آپ کبھی یہ فرماتے کہ

لیس علی المسلمین عشور	اہل اسلام پر العشور (حکومتی ٹیکس)
انما العشور علی اھل الذمۃ۔	نہیں ہیں، بلکہ العشور صرف اہل
(الطحاوی ص ۳۱۲)	ذمہ پر ہے۔

مطلب یہ ہے کہ اہل اسلام چونکہ "الصدقات" ادا کرتے ہیں اس لئے حکومتی ٹیکس باج و خراج وغیرہ سے وہ مستثنیٰ ہیں اور اب خراجی آمدنی صرف اہل ذمہ پر رہ جاتی ہے۔ حکومتی ٹیکسوں سے استثنا ہی کا شرف تھا جسے بعض مسلمان کھونا نہیں چاہتے تھے اور اسلام کے اس قانون کی بنیاد پر یعنی غیر مسلم رعایا کی مملوکہ خراجی زمین اگر مسلمان بھی خریدے گا تو اس سے بھی خراج ہی لیا جائے گا۔ بہت سے مسلمان ابتدا میں خراج کی اس ذلت کو برداشت کرنا پسند نہیں کرتے تھے۔ یحییٰ ابن آدم القرشی نے اپنی کتاب الخراج میں یہ سوال اٹھا کر کہ خراجی زمین خرید کر کیا اس کا خراج اپنے ذمہ کوئی مسلمان لے سکتا ہے۔ مختلف اکابر اسلام کا یہ فتویٰ جواب میں نقل کیا ہے۔

لا تجعل فی عنقک صغارا۔	اپنی گردن میں ذلت کا طوق کیوں ڈالتے
(کتاب الخراج قرشی ص ۵۴)	ہو (یعنی بلا وجہ خراج) کی ذلت کیوں
	برداشت کرتے ہو۔

الغرض الصدقات کے خفیف محصول کو قبول کر لینے کے بعد اتنی قیمتی آزادی کا حصول، پھر "الصدقات" کے نام سے مسلمانوں کے مال و جائداد مویشی پر جو محصول عائد کیا گیا وہ کوئی نئی چیز کبھی بھی نہیں ہے۔ ہر مذہب والے اپنی آمدنی کا ایک حصہ خیر و خیرات میں صرف ہی کیا کرتے تھے۔ اسلام نے اسی مبہم غیر منظم خیرات کو صرف منظم اور باقاعدہ شکل میں تبدیل کر دیا اور واقعہ تو یہ ہے کہ اس تنظیم کی وجہ سے اگر نسبتاً عام خیرات سے کچھ رقم بڑھ بھی گئی ہو، جب بھی ہر قسم کے مطالبات سے مستثنیٰ کرنے کی وجہ سے الصدقات کے فنڈ میں شریک ہونے والے قطعاً نفع ہی میں رہتے ہیں۔ کہاں پیداوار کا نصف حصہ کہاں دسواں اور بیسواں حصہ دونوں میں کوئی نسبت بھی ہے اور اس پر لطف یہ ہے کہ جس

علاقوں کے لوگوں سے لیا جاتا تھا زیادہ تر اس کی کوشش کی جاتی تھی کہ اسی علاقہ کے حاجتمندوں میں تقسیم کر دیا جائے جو ان اتفاقی مصائب کے شکار ہو گئے ہوں، بلکہ ان کے اعزہ اقربا خاندان والوں کو جب ترجیح دی جاتی تھی تو گویا قریب قریب صدقات میں شریک ہونے سے وہی خوشی حاصل ہوتی جیسی لوگوں سے آدمی آج کل بیمہ کمپنیوں یا انجمن ہائے اتحاد باہمی میں شریک ہوتا ہے پھر عنوان غلط کرنے میں اتنی نرمیاں کہ اپنے اور خاندان بھر کے روزمرہ مصارف سے بچانے اور فارغ بالی کے ایک خاص معیار کے بعد اس محصول کا مطالبہ کیا جاتا ہے. وقت رسی کے تمام اصولوں محنت و جانکاہی کی تمام زحمتوں رعایتیں کرتے ہوئے سالانہ بچت سے استفادہ کا موقع دینے کے بعد ان کو وصول کرنا اور صرف یہی نہیں بلکہ اس خوشحالی خوشنودی کا یہ بہترین ذریعہ قرار دینا قرآن و حدیث جن کے فضائل سے معمور ہیں. اس کے بعد ملک کے ان وقتی حاجتمندوں کی امانت ادا کرکے حکومت کا اس مسئلہ کو اپنے ہاتھ میں لینا اور اپنی تمام فوجی و عسکری قوتوں کو اس کی وصولی کے لئے مختص کر دینا حتیٰ کہ ایسے خطرناک وقت میں جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد عرب کے ایک بڑے حصہ میں بغاوت پھیل گئی ہو، لیکن حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا حکومت کے خراج کے لئے نہیں جیسا کہ اکثر مغربی مؤرخین کو دھوکا ہوا ہے بلکہ غریبوں کے ان حقوق کی حفاظت کے لئے اپنی آخری قوت تک مقابلہ کا چیلنج دینا کہ

لو منعونی عقالا مما	اگر صدقات کے سلسلہ میں رسی ایسی
اعطوه رسول الله صلی الله	ڈوری کے ادا کرنے سے انکار کریں گے
علیه وسلم لجاهدتهم	جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ

میں ادا کرتے تھے تو ان سے میں جہاد کروں گا۔

جیسا کہ صحاح کی ہر کتاب میں مذکور ہے. حضرت عمرؓ کی مخالفت کے باوجود اس پر اصرار کرنا اس سے سمجھا جا سکتا ہے کہ اسلام نے حکومت کے موازنہ میں جہاں ان جدید مصارف کا اضافہ کیا تھا وہیں اس کی وصولی کی کتنی آسان اور کتنی قطعی و یقینی راہیں اس نے اختیار کی تھی خود الصدقات کا ایک مذہبی فریضہ ہونا اور کیسا مذہبی فریضہ کہ صحابہ میں بعضوں کا خیال تھا۔

ما مانع الزكوة بمسلم ومن	زکوٰۃ کا نہ ادا کرنے والا مسلمان ہی
لم يؤدها فلا صلوة له.	نہیں ہے اور جو زکوٰۃ ادا نہیں کرتا
(خراج ابی یوسف ص ۴۵)	اس کی نماز بھی نہیں ہوتی۔

قرآن اور صحیح حدیثوں میں اس مطالبہ کے نہ ادا کرنے والوں کے متعلق اتنی شدید تاکید میں مثلاً ان کی پیشانی اس کے پہلو اور پشت میں داغ دیے جائیں گے (قرآن) قیامت کے دن اس کا مال جس کی زکوٰۃ نہ ادا ہوئی ہو اس شخص کے سر پر بشکل اژدہا پھنکتے ہوئے، اونٹ اور بکریوں کی شکل میں آنا اور ان سب پر مزید برآں حکومت کی تلوار کا اس کی وصولی کی ضمانت بننا وغیرہ

کہہ سکتا ہے کہ دینے والے کے پاس اس مد کا ایک پیسہ بھی باقی رہ سکتا ہوگا۔ پھر سوچنا چاہیئے کہ جس حکومت کے خزانے میں ملک کے ان پریشان حال طبقات کے لئے ایسا انتظام کیا گیا ہو اس ملک کی امن و عافیت کا کیا حال ہو سکتا ہے۔ نہ کوئی باپ اپنے مرنے سے اس لئے خوفزدہ رہ سکتا ہے کہ اس کے بچے یتیم ہو جائیں گے۔ بیوی بیوہ ہو کر لاوارث ہو جائے گی۔ نہ کسی کو اس کا خطرہ رہ سکتا ہے کہ میں اگر اتفاقی طور پر کسی مصیبت یا مرض کا شکار ہوا، اور میرا ہاتھ خالی ہو گیا تو علاج کون کرائے گا۔ میرے بچے کیا کھائیں گے۔ اگر کسی تاجر کو تجارت میں خسارہ آ جائے۔ کسان کو زراعت میں نقصان پہنچے کوئی لنگڑا ہو جائے، اندھا ہو جائے، بڈھا ہو جائے سب کو اطمینان ہے کہ میری امداد کے لئے سرکاری خزانہ میں مستقل کافی رقم موجود ہے جس ملک کے مقروضوں کو قرض توڑنے کے لئے نہ سودی قرض کی حاجت نہ جائیداد بیچنے کی ضرورت کہ ان کے قرض کی ادائی کا سامان حکومت کے خزانے میں موجود ہے۔ بیوپار کاروبار کرنے والے مسافر جو ایک جگہ سے دوسری جگہ آتے جاتے رہتے ہیں نہ ان کو اس کی فکر کہ کسی جگہ جا کر میرا ہاتھ خالی ہو جائے گا کہ ہر ضلع ہر تعلقہ کے مقامی خزانہ میں اس کی امداد کا فنڈ موجود ہے۔ شاید صاحب حیثیت مسافروں کو شبہ ہو کہ اس مد کا تعلق ہم سے نہیں ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرما کر مطمئن کر دیا کہ

لا تحل صدقة الا فی سبیل اللہ
وابن السبیل (سنن بیہقی)

صدقہ کا مال جائز نہیں مستطیع لوگوں کیلئے، لیکن جہاد اور مسافر کے لئے۔

بلکہ مسافروں کے لئے تو اسلام نے ایک جدید سہولت کا بھی اضافہ کر دیا ہے کہ یوں تو ہر مسلمان پر واجب قرار دیا کہ

ان نزلتم بقوم فان امروا لکم
بما ینبغی للضیف فاقبلوا فان لم
یفعلوا فخذوا منهم حق الضیف
الذی ینبغی لهم۔
(رواہ بخاری)

تم کسی کے یہاں مہمان بن کر جب اترو اور میزبان اگر مہمان کے لئے مناسب انتظام کرے تو اس کی مہمانی کو قبول کر لیا کرو، اور اگر میزبان ایسا نہ کرے تو پھر ان سے مہمانی کا حق جو میزبان کی آمدنی کے مناسب حال ہو وصول کر لیا کرو۔

اسی طرح غیر اقوام جب اسلامی حکومت کی رعایا بننے پر آمادہ ہوتی تھیں تو اس وقت ان سے جو معاہدہ لیا جاتا تھا اس میں یہ بھی ہوتا تھا کہ

ضیافة من مر بهم من
المسلمین (بیہقی)

مسلمانوں کا جو آدمی ان پر گذرے اس کی مہمانی کریں گے۔

اگرچہ فقہاء نے اب "ضیافت" کے مسئلہ کو بجائے واجب کے مستحب قرار دیا ہے۔ لیکن جب بہ کثرت حدیثوں میں،

من اصبح الضیف بفنائہ فہو علیہ حق او قال دین ان شاء اقتضاہ ان شاء ترکہ۔ (بیہقی)	جس کے گھر کی انگنائی میں مہمان پہنچے تو مہمان کا اس پر حق قائم ہو جاتا ہے بعض روایتوں میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میزبان پر وہ دین ہے، چاہے اس دین کو مہمان وصول کرے چاہے چھوڑ دے۔

وغیرہ الفاظ میں آئے ہیں تو مسافروں کے لئے اسلام کی مہیا کردہ سہولت کو آسان کیوں نہ کیا جائے۔ گھر میں رہنے والے کے لئے کسی باہر سے آنے والے مسافر کا کھانا غالباً باعثِ مشقت نہیں ہو سکتا۔

واقعہ یہ ہے کہ اسلام نے ابتدا میں جو نقشہ قائم کیا تھا کاش کچھ دن بھی مسلمان اس نقشہ کو باقی رکھتے تو آج گھبرا گھبرا کر زندگی بیمہ اور انشورنس کے دامن میں پناہ ڈھونڈتی نہ غریب مخلوق اور کاشتکاروں کی مشکلات کا حل باہمی اتحاد والی سودخوار انجمنوں میں سوچا جاتا، گویا "پنجۂ کرگ" (ساہوکار) سے نکال کر اس کے حلق پر ان انجمنوں کی چھری چلائی جاتی ہے۔ مسلمان علماء کو مجبور کیا جا رہا ہے کہ سود اور بیمہ وغیرہ کی شکلوں کے جواز کی صورت پیدا کریں۔ سمجھا جاتا ہے کہ اسلام کے نظام میں ان مشکلات کے حل کی کوئی تدبیر نہ تھی اور گویا اب یورپ کا ذہن پہلی دفعہ ان مسائل کی طرف منتقل ہوا۔ لیکن کیا کیجئے کہ کسی تصویر کے کسی ایک حصہ کے دیکھنے سے پوری تصویر کا حال معلوم نہیں ہو سکتا۔ صرف زندگی کا یہی ایک شعبہ ہے جس میں اسلام کی ان نکتہ نوازیوں کا کوئی ٹھکانہ ہے۔ ابھی یورپ اور اس قسم کے دوسرے مفکروں کو مدت چاہیئے جو اللہ کے بنائے ہوئے نظامِ حیات کو خود تو کیا بنا سکیں گے سمجھ لیں تو غنیمت ہے۔

الصدقات کے متعلق ایک تاریخی تغیر اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس جدید اسلامی نظامِ زندگی کی جوش دلی و تازگی عہدِ نبوت اور عہدِ صحابہ میں تھی وہ بعد کو باقی نہ رہی۔ لیکن اس معاشی نظام کی پہلی اینٹ خدا جانے کن اسباب کے تحت کہتے ہیں کہ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہی کے زمانے میں اپنی جگہ سے سرک گئی آپ نے "الصدقات" کی اور تمام مدوان یعنی مویشی کاشت کی پیداوار کی شکل میں جو وصول ہوتی تھی ان کو تو باقی رکھا۔ لیکن روپیہ اور اشرفی سونا چاندی کی شکل میں جو اندوختہ مسلمانوں کے پاس تھا اس کی زکوٰۃ کو بجائے حکومت کے پھر انفرادی طور پر دینے کی اجازت دیدی۔ امام ابوبکر جصاص رازی اپنی تفسیر میں ناقل ہیں،

اما زکوٰۃ الاموال فقد کانت تحمل الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم و ابی بکر و عمر و عثمان ثم خطب عثمان فقال ھذا	اموال (سونا چاندی) کی زکوٰۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ابوبکر و عمر و عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے عہد تک ان ہی بزرگوں تک پہنچائی جاتی تھی۔ یعنی (حکومت میں یہ آمدنی داخل ہوتی تھی)

شهر زکوتکم فمن کان علیه دین فلیؤده ثم لیترک بقیة ماله۔
(احکام القرآن جصاص ص ۱۵۵ ج ۲)

پھر حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایک دن خطبہ دیا اور فرمایا کہ رمضان کا یہ مہینہ تمہاری زکوٰۃ ادا کرنے کا مہینہ ہے۔ پھر جس پر کچھ دین (باقی ہو) وہ ادا کر دے اور اپنے باقی مال کو چھوڑ دے۔

جصاص لکھتے ہیں کہ اس دن کے بعد سے،

فجعل لهم اداءها الی المساکین وسقط من اجل ذالک حق الامام فی اخذها

حضرت عثمان نے (زکوٰۃ دینے والوں کو) اختیار دے دیا کہ خود براہِ راست مسکینوں کو دے دیا کریں۔ اس وجہ سے امام (حکومت) کا جو حق اس کی وصولی کا تھا وہ ساقط ہو گیا۔

حالانکہ چند سطر پہلے جصاص ہی نے آیت قرآنی،

خذ من اموالهم صدقة

ان کے مال سے اے پیغمبر صدقہ لیا کرو۔

کے تحت یہ لکھا تھا کہ،

یدل علی ان اخذ الصدقات الی الامام وانه متی اداها من وجبت علیه المساکین لم یجزه لان حق الامام قائم فی اخذها فلا سبیل الی اسقاطه۔

یہ آیت دلالت کرتی ہے کہ الصدقات کی وصولی امام (حکومت) کے سپرد ہے اور وہ شخص جس پر زکوٰۃ واجب ہے اگر خود مسکین کو (براہِ راست) ادا کر دے گا تو زکوٰۃ ادا نہ ہوگی۔ کیونکہ زکوٰۃ کی وصولی کا جو حق امام (حکومت) کو حاصل تھا وہ اب تک باقی ہے اور اس کے ساقط ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔

جب یہ قرآنی قانون ہے اور تنظیم جس کا قرآن نے ارادہ کیا تھا اس کا اقتضا بھی یہی ہے تو سمجھ میں نہیں آتا کہ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اس قول سے یہ کیسے اخذ کر لیا گیا کہ آئندہ ہمیشہ کے لئے مالی زکوٰۃ کی حد تک یہ قانون منسوخ ہو گیا۔ حضرت عثمانؓ کے قول سے زیادہ سے زیادہ یہ ثابت ہوتا ہے کہ خصوصیت کے ساتھ اس سال حضرت نے کسی خاص وجہ سے اموال کی زکوٰۃ کا اختیار خود مالکوں کو عطا کر دیا تھا اور یہ ہو سکتا ہے کہ امام کسی سال اپنی مرضی سے اپنے کسی اختیار کو دوسرے کے سپرد کر دے لیکن اس کو دوامی قانون بنا دینا اور حضرت عثمانؓ کے بعد ہر امام سے اس حق کو چھین لینا جو قرآن کا عطا کیا ہوا حق بلکہ سپرد کی ہوئی خدمت ہے۔ آخر کس بنا پر جائز ہو سکتا ہے۔ مگر باوجود اس ایک مد کے انفرادی ہونے کے "الصدقات" کی اور دوسری مدیں جو کم نہ تھیں اور بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ خلافت عباسیہ تک ان مدوں کی آمدنی کروڑوں سے متجاوز ہو گی

موجودہ مؤرخوں کی تحقیقات کی بناء پر لکھا ہے کہ

ان متوسط جباية الدولة فی	کہ عباسی عہد کی ابتداء میں دولت کی
العصر العباسی الاولی بلغ ۳۶۰	آمدنی تین سو ساٹھ ملین درہم
مليون درهم فی العام (ص ۶۰ ج ۲)	سالانہ آمدنی تھی

جرجی زیدان ہی کا بیان ہے کہ خراج کی آمدنی جو حکومت کے مصارف پر خرچ ہوتی تھی۔

لا ینفق منها علی مصالح الدولة	ہوتی تھی وہ روپیہ میں خرچ نہیں ہوتی تھی
اکثر من ۵۰ مليون والباقی نحو	سے زیادہ پچاس ملین خرچ ہوتا تھا
۳۰۰۰۰۰۰۰ درهم تبقی فی بيت	تیس کروڑ درہم بیت المال میں باقی
المال (ص ۶۰ ج ۲)	رہ جاتا تھا۔

بظاہر یہ تیس کروڑ درہم والی آمدنی یہی "الصدقات" کی آمدنی تھی جن کے مصارف "مصالح الدولۃ" کے سوا وہی تھے جن کی فہرست حق تعالیٰ نے قرآن میں نازل کی تھی۔ اور جہاں تک میرا خیال ہے اکثر و بیشتر ان میں بے نقائص کم برتی جاتی تھی آخر کتاب الخراج امام ابو یوسف ہارون الرشید کے زمانے کی کتاب ہے جس کو بادشاہ نے فرمائش کر کے لکھوایا ہے کہ حکومت کے دستور العمل کی حیثیت سے وہ کام آئے اس کتاب میں الصدقات کے متعلق جو قوانین درج ہیں ان کے بعض اجزاء گذر چکے اس کا نتیجہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ گو مسلمان غیر سبیلوں کے تحت تک پہنچتے ہوئے بہت کچھ اصل راہ سے ہٹ گئے تھے لیکن پھر بھی عام مسلمانوں کی فراغبالیاں ایسی تھیں جنھیں تاریخ کی زبان باوجود چھپانے کی انتہائی کوششوں کے اب بھی چھپا نہ سکی جرجی زیدان جیسے آدمی کے قلم سے بھی یہ الفاظ نکل پڑے کہ حکومت کے خزانے میں ملک کا جو کچھ روپیہ جاتا تھا۔

فيعود الی العامة کافة	وہ بالآخر عام اہل ملک کے تمام باشندوں
لم یحرم منهم وهی سنة	کی طرف واپس آ جاتا تھا ایسا معلوم
الاسترزاق[1] تظهر لاول	ہوتا تھا کہ گویا لوگوں سے کچھ لیا ہی نہیں۔

---

[1] الاسترزاق دراصل ہمارے یہاں کے "وظائف" کے نظام کی ترجمانی ہے اسلامی حکومتوں کے بیت المال و خزانے کی یہ ایسی خصوصیت ہے جس کی یادگار بحمد اللہ کسی نہ کسی شکل میں اب تک ان ممالک میں پائی جاتی ہے جہاں اسلامی حکومت قائم ہے خصوصاً سلطنت آصفیہ کا خزانہ عامرہ اس زمانے میں نہ صرف ہندوستان بلکہ یورپ وغیرہ میں بھی اس خاص معاملہ میں کافی شہرت رکھتا ہے۔ ... نقل ہے کہ اب تک وظائف کے نام سے ہر سال بیش قرار رقم کا ایک معتد بہ حصہ ارباب استحقاق میں تقسیم ہوتی رہتی ہیں۔ جن لوگوں کو اسلامی بیت المال کی اس خصوصیت ... حیرت کا اظہار کرتے ہیں ... لکھے ہیں ... کوئی جنسیت نہیں ہے ۱۲

وهلة انها من خصائص التمدن الاسلامی۔	اور یہ نتیجہ اس خاص رواج کا تھا جسے الارتزاق (وظائف حکومت) کہتے

ہیں یہی نہیں معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی حکومتوں کی یہ خاص خصوصیت تھی۔

جرجی زیدان اگرچہ اس ہنر پر عیب کی چادر اڑھانے کے لئے اس پر اضافہ بھی کرتا ہے۔ یعنی شاید یہ کوئی نئی بات نہ تھی قدیم زمانے میں۔

فاهل اثینیا خاصة الیونانیو	ایتھنز کے باشندوں میں جو یونانیوں میں سے
کانوا لا یعملون عملا ولا	[illegible] یونانیوں [illegible] تھے
یحترفون حرفة فی سبیل	کوئی کاروبار کرتے تھے اور نہ کوئی پیشہ
الرزق وانما کانت ارزاقهم	روزی حاصل کرنے کی راہ میں اختیار
من خزینة الدولة یتناولونها	کرتے تھے، ان کے مصارف حکومت کے
رواتب فی اوقات معینة	خزانے سے جاری تھے [illegible]
اوهبات فی اوقات غیر	مقررہ اوقات میں وصول کرتے تھے یا
معینة ولم یکن لهم شغل	غیر معین طور پر بطور ہبہ اور بخشش کے
غیر سماع الخطب السیاسیة	ان کو ملا کرتا تھا اس کا نتیجہ تھا کہ ایتھنز
او العلمیة او التمشی فی	والوں کا کام اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ
حدائق المدینة وحضور	سیاسی یا علمی لکچروں کو جھوم جھوم کر
الاحتفالات الرسمیة ونحوها	سنا کریں یا باغوں اور بازاروں میں

گھوما کریں یا سرکاری جلسوں میں شرکت کیا کریں۔

مگر اس بندۂ خدا کو پھر خیال آیا کہ آخر یہ وہ کیا چیز ہے جو اسلامی تمدن دنیا کے سارے تمدنوں سے بالکل جدا نظر آتا ہے پھر خود جواب دیتا ہے کہ یونانیوں کی یہ خصوصیت،

کانت محصورا فی اثینیا او	یونانیوں کی یہ خصوصیت صرف ایتھنز
غیرها من العواصم الکبری	شہر یا چند دوسرے مرکزی شہروں تک
اما المسلمون فتوسعوا فیه	محدود تھی، لیکن مسلمانوں نے اس
حتی شمل کل مدینه و کل	میں وسعت پیدا کی حتیٰ کہ ہر شہر اور ہر
طبقه (ص ۲۷)	طبقہ تک اس کو عام کر دیا۔

پھر اس کی توجیہہ و تاویل میں حسب عادت آسمان و زمین کے قلابے ملانے کی بیکار کوشش کی ہے بیچارے جرجی کی کوشش یہاں تک پہنچتی ہے یعنی زیدان نے دعویٰ کیا ہے کہ اسلام سے پہلے سلاطین عرب کا بھی یہی دستور تھا۔ غریب عرب بھلا سلاطین سے اتنا آشنا ہی کب تھا اور کچھ تھا بھی تو عرب کو اس سرسبزی و شادابی اس امن و عافیت سے قبل از اسلام کیا تعلق تھا جس کا نظارہ عرب اور عجم کی آنکھوں نے اسلامی

دور میں دیکھا کہ ہر یتیم، ہر بیوہ، ہر معذور، ہر مقروض، ہر نادار، رسیدہ تاجر، مصیبت زدہ کسان سب اپنی جگہ مطمئن ہیں کہ ان کے انجمن اتحاد باہمی اور بیمہ کمپنی میں ان کا اکثر سرمایہ جمع شدہ ہے۔ خصوصاً کاشتکاروں کے ساتھ حکومت کی دلچسپیاں اس حد تک بڑھی ہوئی تھیں کہ زمین اور آبپاشی کے انتظامات کے ساتھ مسلم ہی نہیں بلکہ غیر مسلم کاشتکاروں تک کے لئے یہ حکم تھا کہ اگر تخم اور بل بیل وغیرہ کے لئے ان کے پاس سرمایہ نہ ہو تو

ان یدفع للعاجز کفائتہ من	جو کسان تخم وغیرہ کے مہیا کرنے سے
بیت المال قرضا لیعمل فیھا	معذور ہو ان سے سرکاری خزانے سے
(فتح القدیر ص ۳۶۲ ج ۳)	بطور قرض کے تب روپیہ دیا جائے

جس سے اپنے کاروبار کو جاری کر سکے۔

کون کہہ سکتا ہے کہ تقاوی کی رقم مسلمانوں ہی کی نکالی ہوئی ہے، یہ ہندوستان میں اب تک اس کا رواج ان ہی کی بدولت باقی ہے۔

کاشتکاروں اور کسانوں کے ساتھ کس حد تک خراج کے لینے میں نرمی اختیار کرنی چاہئے۔ اس کا اندازہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے اس اثر سے ہو سکتا ہے، ایک صاحب جنہیں اپنی خلافت کے عہد میں مالگذاری کی تحصیل کے لئے حضرت والا نے روانہ کیا تھا ان ہی کا بیان ہے کہ

استعملنی علی بن ابی طالب علی	مجھے حضرت علی بن ابی طالب نے بزرج سابور
بزرج سابور فقال لا تقربن	(نامی تحصیل) کا تحصیلدار مقرر فرمایا جب
رجلا سوطا فی جبایۃ درھم	روانہ کرنے لگے تو فرمایا کہ دیکھو روپے
ولا تبیعن رزقا ولا کسوۃ شتاء	درہم کی تحصیل میں کسی کو کوڑے سے
ولا صیف ولا دابۃ یعملون	نہ مارنا اور نہ کسی کی خوراک کو بیچنا اور
علیھا ولا تقم رجلا قائما فی	نہ موسم سرما کے کپڑے ان کے نیلام کرنا
طلب درھم قال قلت یا امیر	اور نہ ان کے ان جانوروں (بیل وغیرہ) کو
المومنین اذا ارجع الیک	نیلام کرنا جس سے وہ کام کرتے ہیں
کما ذھبت من عندک قال	اور روپے کی تحصیل میں کسی کو ایک پیر
ویحک انما امرنا ان ناخذ منھم	کھڑا بھی نہ کرنا (تحصیلدار نے کہا) کہ ایسی
العفو یعنی الفضل۔	صورت میں تو حضور میں اسی طرح واپس
(سنن بیہقی ص ۲۰۵ ج ۹)	آجاؤں گا جیسے گیا تھا یعنی خالی ہاتھ آنا

پڑے گا، تب حضرت علیؓ نے فرمایا تجھ پر افسوس ہے ہمیں حکم ہی یہ دیا گیا ہے کہ العفو سے وصول کریں، یعنی جو ضرورت سے زائد بچا ہوا ہو۔

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ کسانوں کے ساتھ اسلام کا صحیح نقطۂ نظر کیا تھا! العفو کی شرح میں نے کسی . .

موقع پر بھی کی ہے جس کا مطلب یہی ہے کہ ان کے ذرائع آمدنی پر دست اندازی نہیں کرنا چاہیے بلکہ آمدنی سے مال گزاری وصول کرنا چاہیے۔ جب بیل وغیرہ تک کو نیلام کرنے کی اجازت حضرت نہیں دیتے تھے۔ تو اس سے اندازہ کرنا چاہیے، اور چیزوں کے متعلق ان کا کیا خیال ہوگا اس سلسلہ میں خیال کرنے کی ایک بات یہ بھی ہے کہ معاہدے کے بعد کسانوں کو جو زمین اسلامی حکومت بندوبست کر دیتی تھی تو جو مالگذاری معاہدے کے وقت طے ہو جاتی تھی اس پر اضافہ کا مستحق بھی آئندہ حکومت کو نہیں رہتا تھا۔ اس باب میں متعدد روایتیں ہیں، جن میں ایک روایت حضرت عمرؓ کی ہے ابراہیم نخعی اس کے راوی ہیں وہ کہتے ہیں:

جاء رجل الی عمر فقال ان ارض کذا وکذا یطیقون من الخراج اکثر مما علیہم فقال لا سبیل الیہم انما صالحناہم صلحا۔ (البیہقی ص ۱۴۲ ج ۹)

ایک آدمی حضرت عمرؓ کے پاس آیا اور اس نے خبر دی کہ فلاں فلاں اراضی کو جتنا اس وقت وصول ہوتا ہے اس کو زیادہ مالگذاری ادا کرنے کی اس میں صلاحیت ہے، تب حضرت عمرؓ نے فرمایا ان لوگوں پر اضافہ کی راہ بند ہے جو مالگذاری اس وقت لی جا رہی ہے اسی پر ان سے صلح ہوئی ہے۔

بہرحال اسلامی حکومت کے خزانے میں جو روپیہ جمع کیا جاتا ہے اس کے جو اغراض تھے یا ان کو ہونا چاہیے غالباً اس کے متعلق کافی بحث ہو چکی جن لوگوں کے سامنے معاش کا یہ نظام پیش کیا گیا ہے وہ اب فیصلہ کر سکتے ہیں کہ بیت المال کے اس عجیب و غریب نظام کے بعد پھر کیا دنیا کو بیمہ انشورنس انجمن ہائے اتحاد باہمی جیسی سطحی اور وقتی معالجوں کی ضرورت باقی رہتی ہے۔ بے روزگاری کی جو عام شکایت پھیل گئی ہے کیا اس کا احتمال اس وقت بھی باقی رہ سکتا ہے جب حکومت اپنی رعایا کے بے سرمایوں کو سرمایہ دینے کے لئے اپنے پاس مستقل بیش قرار رقم رکھتی ہو ہبۃً بھی دینے کے لئے تیار ہو اور قرضہ بھی۔

"الصدقات" کی "وصولی" اور "صرف" کے متعلق اسلام نے جن نکات کو اپنے پیش نظر رکھا ہے، اگرچہ موٹی موٹی باتیں اس سلسلے میں جو یہاں قابل اندراج ہو سکتی تھیں ان کا بیان گذر چکا۔ لیکن اسی ذیل کی دو چیزیں چھوٹ گئی تھیں مناسب ہے کہ آخر میں ان کا بھی اضافہ کر دیا جائے میرا مطلب یہ ہے کہ منجملہ گذشتہ بالا امور کے "الصدقات" کے متعلق اسلام نے ان دو شرطوں کا بھی اضافہ کیا ہے۔

(ا) ایک تو یہ ہے کہ جس طرح الصدقات کے مد کی آمدنی کو الخراج والجزیہ وغیرہ کی آمدنیوں سے بالکلیہ جدا رکھنے کا حکم ہے اسی طرح یہ بھی حکم دیا گیا ہے کہ اس مد کی آمدنی کا کوئی حبہ کسی ایسے آدمی کو نہیں مل سکتا جو اسلامی نقطۂ نظر سے غنی اور صاحب حیثیت ہو۔ اس

"غنی" سے مراد یہ نہیں ہے کہ وہ ہزاروں اور لاکھوں کا مالک ہو، بلکہ ملک کا ہر ایسا باشندہ جو اپنی اور اپنے اہل و عیال کے روزمرہ مصارف کے سوا دو سو درہم یا ساڑھے باون تولہ[1] چاندی یا اس کے مساوی کسی سرمایہ کا مالک ہو اس کے لئے اس آمدنی کا ایک حبہ تک حرام ہے اس معاملہ میں کتنی شدید احتیاط کی ضرورت ہے۔ اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ حضرت عمرؓ کے سامنے ایک آدمی آیا جس کے مشکیزے میں دودھ تھا۔ حضرت عمرؓ کو بھی ایک پیالہ اس دودھ کا ملا دودھ کچھ مزیدار تھا آپ نے دریافت فرمایا کہ کہاں سے لائے ہو بولا کہ فلاں گاؤں کی چراگاہ پر میرا گذر ہوا وہاں "الصدقات" کے اونٹ چر رہے تھے ایک اونٹنی کا لوگ دودھ دوہ رہے تھے میں نے بھی تھوڑا سا مانگ کر اپنے چھاگل میں رکھ لیا۔ یہ سننا تھا کہ حضرت عمرؓ پر عجب حالت طاری ہو گئی، راوی کا بیان ہے،

فدخل اصبعه فی فیه واستقاء ۔ اپنی انگلی منہ میں ڈالی اور قے کرتے جاتے تھے۔ (بیہقی)

یہ حال قانونی "الغنی" کے لئے تو قطعاً اس مال کا ایک ایک پیسہ حرام ہے لیکن جو قانونی غنا نہ رکھتا ہو بلکہ شب و روز کی خوراک سے زیادہ اس کے پاس سامان ہو، ایسے آدمیوں کے لئے یہ حرام تو نہیں ہے۔ لیکن "الصدقات" کے شعبہ سے مانگنا اس کے لئے بھی ناجائز ہے۔ اس سے سمجھا جا سکتا ہے کہ ایک طرف ملک کے ان مصیبت زدہ طبقات کے لئے اسلامی حکومت نے اپنے خزانے میں اگرچہ یہ سارا انتظام بڑی طاقت سے کر رکھا تھا۔ لیکن اسی کے ساتھ اس کی نظر اس پر بھی تھی کہ کہیں خزانے کی اس مد پر بھروسہ کر کے ایتھنز کے خوش باشوں کی طرح بے کاری اور بیکار وقت گذاری کے لوگ عادی نہ ہو جائیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس پر خاص نظر تھی۔ جب کوئی اس مد سے مانگنے والا آتا تو آپ ایک خاص نظر سے اس کو دیکھتے اور نرمی سے مختلف الفاظ میں ان کو سمجھاتے جس کا مطلب یہی ہوتا تھا کہ حتیٰ الوسع "الصدقات" کے مال سے صاحب استطاعت لوگوں کو پرہیز ہی کرنا چاہئے۔ حضرت ابو سعید خدری فرماتے ہیں کہ مجھ پر اور میرے اہل و عیال پر ایک وقت میں بڑی تنگی پیدا ہو گئی گھبرا کر میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اس لئے حاضر ہوا کہ الصدقات کی رقم سے کچھ میری مدد فرمائی جائے۔ کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے عرض کرنے پر ارشاد فرمایا،

من استغنیٰ اغناه الله من استعف اعفه الله۔ ۔ جو بے نیازی کا رویہ اختیار کرے گا، خدا اسے بے نیاز رکھے گا اور جو دوسروں سے لینے میں احتیاط برتے گا، خدا بھی اس کی آبرو کی حفاظت کرے گا۔

---

[1] یہ ہندوستان کے قدیم فقہاء کے حساب کا نتیجہ ہے۔ اس زمانے میں ساڑھے چھتیس تولہ ہی کو غنی کا نصاب قرار دیا جا رہا ہے۔ میرے نزدیک پہلی صورت زیادہ درست ہے ۱۲

حضرت ابوسعید پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس نصیحت کا یہ اثر ہوا کہ

لا استعف فیعفنی اللہ و	میں دوسروں سے مانگنے میں احتیاط
استغنی فیغنی اللہ۔	کروں گا تاکہ میری آبرو بچائے گا۔

اور میں اپنے کو مخلوقوں سے بے نیاز رکھوں گا تو خدا مجھے بے نیاز رکھے گا۔

کہتے ہوئے واپس ہوئے ان کا بیان ہے کہ اپنے اس استعفاف و استغناء کے نتائج کو بالآخر میں نے اپنی آنکھوں سے اس شکل میں دیکھا کہ

مالت علینا الدنیا فغرقتنا	ہم پر دنیا کا سیلاب چھا گیا اور
الا من عصمہ اللہ۔	اور ہمیں اس نے ڈبو دیا۔ لیکن وہی
(طحاوی)	جنہیں اللہ نے محفوظ رکھا ہو۔

اس کاہلی اور بے عملی کے خطرے کے انسداد کے لئے تقریباً عام مجلسوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جہاں چند اور باتیں فرماتے ان میں ایک فقرہ عموماً یہ بھی ہوتا تھا،

الید العلیا خیر من الید	اوپر والا ہاتھ (دینے والا ہاتھ) نیچے والے
السفلی (صحاح)	ہاتھ سے بہتر ہے۔

یہ بھی ارشاد ہوتا

الایدی ثلٰث فید اللہ العلیا	ہاتھ تین ہیں، تو سب سے اونچا ہاتھ
وید المعطی التی تلیہا وید	خدا کا ہے اور دینے والے کا ہاتھ
السائل السفلی الیٰ یوم القیمۃ	(خدا کے ہاتھ کے بعد ہے) اور مانگنے والے کا
فاستعفف ما استطعت	ہاتھ سب سے نچلا ہاتھ ہے (اور یہ
ولا تعجز عن نفسک ولا تلام	نسبت قیامت تک قائم رہے گی) پس
علی کفاف واذا اتاک اللہ	جہاں تک مانگنے سے بچ سکتے ہو، بچو، اور
خیرا فلیر علیک۔ (الطحاوی)	خود کمانے سے نہ تھکو اور بقدر کفایت

اگر تمہارے پاس ہو تو پھر تم قابل ملامت نہ ہو اور خدا تمہیں جب کچھ خیر (مال) دے تو چاہیئے کہ اس کو اپنے اوپر نمایاں کرو)

حتی الوسع لوگوں کو واقعی مستحقین کے اس "حق" سے بچنے اور کنارہ کش رہنے کا حکم دیا جاتا تھا اور اس پر زور دیا جاتا تھا کہ جہاں تک ممکن ہو اپنی خدا داد قوتوں سے روزی حاصل کرنے میں کوشش کی جائے (لا تعجز عن نفسک کا یہی مطلب ہے) اور زیادہ امیر نہ ہونے کو کوئی جرم نہ خیال کرے اور اس جرم سے بری ہونے کے لئے "الصدقات" کی رقم سے امیری نہ پیدا کی جائے (مثلاً عموماً اپنی لڑکیوں کی شادی میں نمائشی مصارف کے لئے لوگ کنیا دان مانگا کرتے ہیں کہ سوسائٹی میں ورنہ بے عزتی ہوگی)

(۲) دوسری بات اس سلسلہ میں جو یہاں قابلِ ذکر ہے وہ "الصدقات" کی ایک خصوصیت بھی ہے

مقصد یہ ہے کہ جس وقت مسلمانوں سے "الصدقات" کا مطالبہ کیا گیا، بدگمانوں کو شاید اندیشہ ہوسکتا تھا کہ کہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے العیاذ باللہ، خود اپنی اور اپنے اہل خاندان کی معاشی مشکلات کے حل کی یہ راہ تو نہیں بنائی ہے۔ خصوصاً جب اس زمانے میں بھی اکثر ممالک میں اس وقت تک خیر و خیرات کی رقوم یا مصارف دعوت وغیرہ کا استحقاق انھیں لوگوں کے ساتھ زیادہ مخصوص سمجھا جاتا ہے جن کی زندگی مذہبی ہو اور جو مذہب کی نمائندگی کرتے ہوں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مذہبی نمائندہ ہونا اس بنا پر آپ کے بعد مسلمانوں میں مذہبی نمائندگی کا قدرتاً زیادہ استحقاق آپ کی آل اور آپ کے خاندان والوں ہی کو ہوسکتا تھا۔ خصوصاً اس لئے بھی کہ عموماً اسلام سے پہلے مذہبی نمائندگی کے لئے صفات سے زیادہ ذاتی و نسبی خصوصیات کو عموماً دخیل سمجھا جاتا تھا۔ ہندوستان میں بھی یہ عہدہ صرف ان لوگوں کے لئے مخصوص ہے جو برہمنوں کی نسل سے ہوں اور یہی حال تقریباً اکثر غیر اسلامی سوسائٹیوں کا ہے میرا خیال ہے کہ غالباً یہ بھی ایک علت تھی جس کی وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے خاندان والوں پر خواہ وہ غربت و فقر کے کسی حال میں ہوں "الصدقات" کی آمدنی کو قطعی طور پر حرام فرما دیا۔ اس سلسلہ میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم اتنا نازک احساس رکھتے تھے کہ حضرت امام حسن علیہ السلام بچے تھے سامنے "الصدقات" کے مد کی کھجوروں کا ایک ڈھیر پڑا ہوا تھا۔ سرکتے ہوئے ڈھیر کے پاس پہنچ گئے اور صرف ایک کھجور منہ میں اٹھا کر ڈال دیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نگاہ پڑ گئی جھپٹ کر دوڑے اور بے قرار ہو کر فرمانے لگے۔

کخ کخ ارم بها۔ — تھو تھو اسے پھینک دو۔

اور فرمانے لگے۔

اما شعرت انا لا ناكل الصدقة (رواه البخاری) — تم نہیں سمجھتے کہ ہم لوگ صدقہ نہیں کھاتے۔

بعض روایتوں کے الفاظ ہیں،

انا لا تحل لنا الصدقة — ہم لوگوں کے لئے صدقہ کا مال جائز نہیں ہے،

اسی بنا پر فقہاء اسلام نے بھی بالاتفاق اپنی قانونی کتابوں میں اس دفعہ کو قانون کی شکل میں داخل فرمایا اور اب تک اس پر مسلمانوں کا اتفاق ہے کہ سادات اور آل فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب ترین رشتہ داروں پر الصدقات کی آمدنی حرام ہے۔

آخر میں ایک شبہ کا ازالہ باقی رہ جاتا ہے میں نے کہا تھا کہ "الصدقات" کے مطالبوں کو ادا کرنے والوں کو اسلام ہر قسم کے حکومتی مطالبات سے مستثنیٰ کر دیتا ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر اسلامی حکومت کی رعایا مسلمان ہو کر اس طرح اپنے آپ کو حکومتی مطالبات سے مستثنیٰ کراتے رہے تو پھر حکومت کی کشوری و لشکری و رفاہیات عامہ کے مصارف کے لئے کہاں سے رقم آئے گی۔

لیکن اس کا پہلا جواب تو یہی ہے جو گذر چکا کہ اسلامی حکومت کی ہر وہ اراضی جو غیر مسلم رعایا کے قبضہ میں ہو خراجی ہوتی ہے۔ اگر کوئی مسلمان اس کو خرید بھی لے اور اس کے سوا اس زمین پر قبضہ کرنے کی کوئی دوسری قانونی شکل نہیں جب بھی وہ خراجی ہی باقی رہتی ہے البتہ جزیہ کی آمدنی مسلمان ہونے سے ساقط ہو جاتی ہے اگرچہ بنی امیہ کے حریص امراء نے مسلموں پر جزیہ باقی رکھا تھا لیکن بہت جلد حضرت عمر بن عبدالعزیز کے زمانے میں اس غلط قانون کی اصلاح ہوئی۔

بہر حال خراج کی وصولی کے لئے خراجی زمینیں پہلے تو کافی ہیں نیز "الصدقات" کے مصارف جہاں مذکورہ بالا طبقات کے لوگ قرآن نے بتائے ہیں ان ہی کے ساتھ اس آمدنی کو خود مکتفی بنانے کے لئے شروع سے ایک اور مد کا "الصدقات" کے مصارف میں قرآن ہی نے اضافہ کر دیا ہے یعنی العاملین علیہا یعنی جو لوگ صدقات کے تحصیل وصول کا کام کرتے ہیں وہ بھی خواہ امیر ہوں یا غریب اپنی تنخواہ "الصدقات" کے مد سے بخوشی لے سکتے ہیں اس لئے محکمہ مال کے مصارف کی ادائیگی کی گنجائش تو خود "الصدقات" میں ہے۔ نیز ایک مد اس میں "فی سبیل اللہ" کی بھی ہے یعنی تبلیغی و دفاعی قوتوں پر بھی یہ آمدنی خرچ ہو سکتی ہے۔ رہ گیا محکمہ عدلیہ سو اسلام میں قضا کا کام دراصل ایک قسم کی عبادت ہے اگر قاضی غیر مستطیع ہے تو اس کو بھی تنخواہ اس مد سے دلائی جا سکتی ہے اور محکمہ تعلیمات کے لوگوں کو بھی فقہاء نے بصورت احتیاج اس آمدنی کے مصارف میں شریک کیا ہے۔ بیضاوی نے سبیل اللہ کے ذیل میں القناطر والمصانع بھی لکھا ہے گویا اس بنا پر مواصلات پر جو مصالح مسلمین ہی کی ایک چیز ہے یہ آمدنی خرچ ہو سکتی ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ قرآن مجید نے "الصدقات" کے مصارف ایک تو وہ رکھے ہیں جن کا تعلق مصیبت زدہ طبقات سے ہے۔ لیکن اس لئے کہ اگر کسی وقت اسلامی حکومت کے پاس بجز "الصدقات" کی مد کے اور کوئی آمدنی نہ رہ جائے تو چند ایسے مصارف کا اس کی ذیل میں اضافہ کیا ہے جن کے بعد ایک حکومت کے قیام کے لئے جن امور کی ضرورت ہے سب کی تکمیل ہو جاتی ہے حتیٰ کہ ان ہی مصارف میں ایک مد ان لوگوں کی بھی ہے جو محض مالی کمزوریوں کی وجہ سے اسلامی حکومت اور اسلام کی مخالفت کرتے ہیں جیسا کہ اس زمانے میں سیاسی شورش پسندوں کے ایک گروہ کی یہی حالت ہے۔ ان لوگوں کو چپ کرنے کے لئے بھی "الصدقات" کے مصارف میں قرآن نے "مؤلفۃ القلوب" کی ایک مد رکھی ہے۔ اگرچہ عام طور پر فقہاء کہتے ہیں کہ یہ مصرف صرف ابتداء اسلام کی حد تک محدود تھا اور اب ساقط ہو گیا۔ دلیل میں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا یہ اثر پیش کیا جاتا ہے کہ آپ نے مؤلفۃ القلوب کے بعض افراد کو دینے سے اس بنا پر انکار کر دیا کہ اب اسلام اتنا قوی ہو چکا ہے کہ ان لوگوں کی تالیف قلب کی ضرورت نہ رہی۔ حالانکہ قصہ صرف اس قدر ہے کہ چند خاص لوگوں کو حضرت عمرؓ نے دینے سے یہ فرماتے ہوئے انکار کر دیا تھا کہ

ان اللہ اعز الاسلام فاذہبا — اب خدا اسلام کو عزت و شوکت عطا کر چکا

پس تم دونوں جاؤ کچھ نہ ملے گا۔

لیکن اس کا یہ مطلب قرار دینا کہ ہر شخص کے لئے حضرت عمرؓ نے اس مد کو ساقط کر دیا۔ میری کچھ سمجھ میں نہیں آیا قرآن نے جس مصرف کو منصوص کیا ہے اس کو اولاً حضرت عمرؓ منسوخ ہی کیسے کر سکتے ہیں نیز ایک ایسی واحد خبر سے قرآن کے ایک قانون پر خط نسخ نہیں کھینچا جا سکتا بلکہ اس کا صاف مطلب یہی ہے کہ یہ امام اور حکومت وقت کے صوابدید پر ہے جس وقت جن لوگوں کے لئے اس کی ضرورت سمجھے دے جن کے لئے ضرورت نہ سمجھے نہ دے۔ آخر میں اس سلسلہ میں تقبار کے اس مذکورہ بالا مسئلہ کو بھی یاد دلانا چاہتا ہوں کہ واقعی ضرورتوں کے لئے اسلامی حکومت رعایا پر بقدر ضرورت جدید محصول عائد کرنے کا بھی اختیار رکھتی ہے جس کا ذکر پہلے آ چکا ہے۔ میں نہیں خیال کرتا کہ ان امور کے ہوتے ہوئے اسلامی حکومت کو کبھی دشواری کا سامنا ہو گا۔ لے

قبل اس کے کہ اسلام کے معاشی "داخل آمدنیوں" کا باب ختم کیا جائے چند اور ذیلی امور کا تذکرہ بھی کم از کم اجمالی طور پر مناسب معلوم ہوتا ہے۔ ان میں ایک مسئلہ "زر" یا "سکہ" کا بھی ہے۔

واقعہ تو یہ ہے کہ اسلامی قانون میں اس مسئلہ کی جو اہم ترین امتیازی چیز ہے وہ "وحدت سکہ" کا مسئلہ ہے جس کا ذکر "ربوا سود" کے باب میں گذر چکا ہے۔ بتایا گیا تھا کہ مختلف ممالک و اقالیم کے مختلف سکوں کے مبادلہ میں جو بٹاون کا رواج ہے یہ اسلام کے اس قانون کی بنا پر کہ چاندی کا چاندی سے اور سونے کا سونے سے جب تبادلہ کیا جائے خواہ سکہ کی شکل میں ہو یا زیور یا تبر (بھرت) کی شکل میں ہو، برابر برابر ہونا چاہئے اور بٹاون لگانے کی صورت میں چونکہ یہ مدعا فوت ہو جاتا ہے جس کے حل کی راہ اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ بین الاقوامی طور پر تمام حکومتیں اپنے اپنے نقرئی اور طلائی سکوں کو ہم وزن کر دیں اور جیسے سال و ہفتہ کے ایام تقریباً تمام ممالک میں یکساں ہیں، ہر جگہ

لے۔ مضمون پریس میں چھپ رہا تھا۔ ۲۔ دسمبر ۱۹۴۲ء کو جو ایک برقی پیام لندن سے ہندوستان وصول ہوا ہے یہ بتاتا ہے کہ قارئین کرام کے لئے اس کو یہاں نقل کردوں۔ اخبار مدینہ بجنور مؤرخہ ۴۔ دسمبر میں اس تار کا ترجمہ ان الفاظ میں درج کیا گیا:۔

لندن ۲۔ دسمبر۔ سر ولیم بیورج (مشہور ماہر معاشیات) نے برطانیہ میں غربت کا خاتمہ کرنے کے لئے جو نظام عمل پیش کیا ہے اس کو انگلستان اور امریکہ دونوں جگہ اخبارات میں صفحۂ اول پر شائع کیا گیا ہے "ڈیلی ہیرالڈ" کہتا ہے کہ نظام عمل کا اساسی نقطۂ نظر یہ ہے کہ اس میں معیشت کی ایک قومی اقل سطح مقرر کی گئی ہے جسے نیچے کرنے کی اجازت نہیں دی جائے گی اس اخبار کے پیش نظر وظائف (جو شوہر اور بیوی کے لئے دو دو پونڈ تک ہوں گے) ہر شخص کے لئے طبی معالجہ بچوں کے لئے فی ہفتہ آٹھ شلنگ کا الاؤنس۔ بیواؤں کے لئے فی ہفتہ دو پونڈ اور ازدواج و مادری کے فیاضانہ عطیے ہیں جبکہ سر ولیم نے جتنی یہ لائحۂ عمل ایک ہمہ گیر بیمہ ہے جس سے آجروں اور مزدوروں کی یکساں بہبودی کی گہوارہ سے گور تک نگہداشت ہو گی تدفین کے مصارف تک کی گنجائش رکھی گئی ہے اور بیروزگاری برسر روزگار ہو یا بے روزگار جوانی ہو یا بوڑھاپا کسی کو اس معینہ سطح سے پست تر ہونے نہیں دیا جائے گا۔" عجب ہے جو لائحۂ عمل صدیوں پہلے خدا کی طرف سے بنی آدم کو دیا گیا ۱۹۴۲ء کی تیسری دسمبر کے تاریخ میں دیکھئے کہ اس کی ضرورت عقل بھی پانے لگی فہل من مدکر؟ ۱۲

سات دن ہی کا ہفتہ اور بارہ مہینے ہی کا سال ہوتا ہے جس سے بین الاقوامی تعلقات میں بیشمار سہولتیں ہیں، اسی طرح کچھ حرج نہ ہوگا اگر سکوں کے وزن کو بھی ساری دنیا میں برابر کر دیا جائے۔ اور بٹاون کے رواج کو مسدود کر دیا جائے۔ ایکسچینج کے مغالطوں سے جو نتائج کاروباری دنیا کو آئے دن بھگتنے پڑتے ہیں خصوصاً محکوم قوموں کے ساتھ حاکم قومیں اس باب میں جو سلوک کر رہی ہیں وہ علماء معاشیات سے مخفی نہیں ہے اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا بہ حیثیت پیغمبر عالم ہونے کے دنیا سے آپ کا یہ مطالبہ اس کا مستحق ہے کہ علماء معاشیات اس کے فوائد و ثمرات اور اس کی منافی موجودہ شکل کے نقصانات واضح کریں۔

اس مسئلہ کے سوا بھی فقہاء اسلام کو تجارت، اجارہ وغیرہ کے ابواب میں اس مسئلہ کے مختلف پہلوؤں پر بحث کرنے کا موقع ملا ہے۔ لیکن چونکہ ان میں کوئی خاص ندرت نہیں ہے اور اور اسلامی قانون کے بعض دقیق پہلوؤں سے ان کا تعلق ہے۔ اگر تفصیل کی جائیگی تو پھر ایک مستقل کتاب اس کے لئے درکار ہوگی۔ اس لئے چند اشارات پر کفایت کی جاتی ہے۔ مندرجہ ذیل سوالات کے ذیل میں زر کے متعلق آپ کو اسلامی قانون کے مباحث ملیں گے

(۱) فطری اور مصنوعی سکوں میں کیا فرق ہے۔ یہ مانا گیا ہے کہ سونا اور چاندی یہ ایسی دھات ہے جسے قدرت نے اس لئے پیدا کیا ہے تاکہ مبادلات کے معیار کو قائم رکھے بعض حدیثیں بھی اس باب میں پیش کی جاتی ہیں۔ ان دونوں دھاتوں کے سوا اور بھی دوسری چیزوں کو بطور سکہ کے استعمال کیا جا سکتا ہے مثلاً فلوس یعنی تانبے کے پیسے لیکن ان کے سکہ ہونے کی حیثیت آیا پبلک کے ہاتھ میں ہے یا معاملہ کے فریقین پر اس کا دارومدار ہے۔ امام ابوحنیفہ اور ان کے شاگردوں میں اختلاف ہے۔ اس کی بحث کچھ آئندہ بھی آرہی ہے۔

(۲) ہر وہ چیز جو بطور سکہ استعمال ہوتی ہو غیر معین ہو جاتی ہے یعنی معاملہ میں اگر خاص سکہ کو دکھا کر معاملہ کیا جائے لیکن ادا کرنے کے وقت بجائے اس کے دوسرا سکہ دیدیا جائے۔ تو یہ جائز ہے۔ اس کلیہ کا یعنی سکہ غیر معین ہوتا ہے۔ بے شمار تجارتی مسائل پر ان کا اثر پڑتا ہے جن کی تفصیل فقہ کی کتابوں میں موجود ہے۔

(۳) سکوں کے مقطعات (یعنی اٹھنی، چونی، دونی) جس کو اصطلاحاً دراہم "غلہ" کہتے ہیں، اُن کی بھی ایک مستقل بحث ہے۔ چیز کا دام مثلاً سو روپیہ طے ہوا اور کوئی بجائے اسکے سو روپے کے پیسے یا اکنیاں دونیاں دے تو کیا یہ جائز ہو سکتا ہے۔

(۴) چاندی سونے کے ایسے سکے جن میں کسی دوسری دھات کی آمیزش ہو ان کے احکام کا بھی ایک سلسلہ ان کتابوں میں پایا جاتا ہے۔ الغطارفہ والعدالیہ اسی قسم کے سکوں کے نام ہیں۔ سود کے باب میں بعض عجیب نتائج ان سکوں کی بناء پر پیدا ہوتے ہیں۔ صاحب ہدایہ نے اس کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے۔

ومشائخنا رحمہم اللہ لم یفتوا بجواز ذلک (کتاب الصرف)	ہمارے بزرگوں نے اس کے جواز کا فتویٰ نہیں دیا۔

وجہ یہ لکھی ہے کہ

فلو ابیح التفاضل فیہ ینفتح باب الربوا۔ (کتاب الصرف)	اگر ان معاملات میں زیادہ گیری کی اجازت دیدی جائے گی تو سود کا دروازہ کھل جائے گا۔

ایک وہ زمانہ تھا کہ "جواز" کی بعض قانونی شکلیں پیدا ہو رہی ہیں۔ لیکن اس خوف سے کہ سود کا دروازہ کھل جائے گا۔ علماء ان سوراخوں کو بھی بند کرتے تھے، جن سے معاشی بنکوں میں ایسے زہریلے خون کے داخل ہو جانے کا اندیشہ ہوتا، آج یہ حال ہے کہ "ربوا" کی صریح اور واضح بلکہ بین الاقوامی شکلوں تک کے متعلق بعض علماء نے جواز کی کوشش کی حد یہ ہوئی کہ قرض ہی نے سود کے متعلق ایک بڑے عالم صاحب نے فتویٰ دیا کہ قرآن نے اس کو حرام نہیں کیا ہے بلکہ عرب کے سسی تمام مبادلہ سے اس حکم کا تعلق ہے۔ عربی میں کتاب لکھی گئی اور علماء کی خدمت میں پیش ہوئی۔ فانا للہ وانا الیہ راجعون۔

(۵) کھوٹے کھرے اور آمیزش کے اعتبار سے سکوں کے متعلق ایک اور اصطلاح بھی ہے یعنی بعضوں کو زیوف (یہ خاص کر ان کھوٹے سکوں کو کہتے ہیں جنھیں حکومت کا خزانہ مسترد کرے) البنہرجہ[۵] (ایسے سکے جنھیں کاروباری لوگ بیوپار میں لینے سے انکار کرتے ہوں) اسی نوعیت کے سکوں میں ایک قسم کا سکہ "الستوقہ" بھی تھا۔ ابن ہمام نے لکھا ہے کہ یہ فارسی کے "سہ تہ" کا معرب ہے، جس کے اوپر نیچے تو چاندی کا پتر چڑھا جاتا تھا اور بیچ میں تانبا بھر دیا جاتا تھا۔ یہ المموہہ (قلعی کئے ہوئے سکوں) سے ایک الگ چیز تھی۔ مختلف قانونی ابواب میں ان کے نام آتے ہیں اور حالات کے لحاظ سے ان پر حکم لگایا گیا ہے۔

باقی اس زمانے میں مصنوعی زر کی ایک شکل جو نوٹ کی پیدا ہو گئی ہے۔ اگرچہ عام طور پر تو یہی سمجھا جاتا ہے کہ یہ مغربی تمدن کی خصوصیات میں سے ایک خصوصیت ہے لیکن جہاں تک تاریخوں سے معلوم ہوتا ہے یہ کوئی نئی چیز نہیں ہے، ابن بطوطہ نے

---

[۵] جیسے ستوقہ کو سہ تہ کا معرب کہتے ہیں "نبہرجہ" بھی یہ ہندوستان کے "نبھرہ" لفظ کی کوئی بگڑی ہوئی صورت ہے کیونکہ "بھٹہ" کی اصلی ہندی شکل "بھٹا" اور "بھوٹا" ہے۔ "بھنجبت" کے لفظ میں اس وقت اصل ہندی مادہ اب تک باقی ہے، ہندستان اور قدیم عرب کے تجارتی تعلقات پر مولانا سید سلیمان ندوی کی کتاب موجود ہے۔ اسلام کے بعد بصرہ کی بندرگاہ کا نام ہی باب الہند تھا اور دارمی جو حدیث کی معتبر کتاب ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سوق میں ایک بازار دارالہند کے نام سے موسوم تھا۔ ۱۲

لکھا ہے[۱] ہیں بجنسہٖ اس کے الفاظ ترجمہ کے ساتھ نقل کرتا ہوں،

واهل الصين لايتبايعون بدينار ولا درهم وجميع ما يتحصل لبلادهم من ذلك يسكونه قطعا كما ذكرنا وانما بيعهم وشراهم بقطع كاغذ كل قطعة منها بقدر الكف مطبوعة بطابع السلطان وتسمى الخمس والعشرون منها "بالشت" وهي بمعنى الدينار عندنا واذا تمزقت تلك الكواغذ في يد انسان حملها الى دار كدار السكة عندنا فاخذ عوضها جددا ودفع تلك ولا يعطي على ذلك اجرة ولا سواها لان الذين يتولون عملها لهم الارزاق الجارية من السلطان وقد وكل بتلك الدار امير من كبار الامراء واذا مضى الانسان الى السوق بدرهم فضة او دينار شراء شيئ لم يوخذ منه ولا يلتفت اليه حتى يصرفه

اور چین کے لوگ خرید و فروخت نہ اشرفیوں سے کرتے ہیں اور نہ درہم سے اور اس ملک میں جب یہ چیزیں آتی ہیں (یعنی درہم یا اشرفیاں) تو اسے پگھلا کر ٹکڑے ٹکڑے بنا لیتے ہیں، ان لوگوں میں باہم خرید و فروخت کا ذریعہ کاغذ کے ٹکڑے ہیں ہر ٹکڑا اس کاغذ کا کفِ دست کے برابر ہوتا ہے اور اس پر حکومت کی مہر ہوتی ہے۔ ان ٹکڑوں کے پچیس کاغذوں کے مجموعہ کو "بالشت" کہتے ہیں۔ بالشت ہمارے یہاں کی اشرفی کے برابر ہے۔ جب یہ کاغذ پھٹ جاتے ہیں تو جس کے ہاتھ میں یہ پھٹا ہوا کاغذ ہوتا ہے اسے لیکر وہ ایک کوٹھی میں لے جاتا ہے یہ اسی قسم کی کوٹھی ہوتی ہے۔ جیسے ٹکسال ہمارے یہاں ہے اور ان پھٹے ہوئے کاغذوں کو داخل کر دیتا ہے۔ معاوضہ میں اس کو نئے کاغذ مل جاتے ہیں۔ اور اس کی کوئی اجرت اسے نہیں ادا کرنی پڑتی ہے۔ کیونکہ جن لوگوں کے ہاتھ میں اس کا انتظام ہے وہ حکومت سے تنخواہ پاتے ہیں۔ ان مقامات کا

---

[۱] چین کے متعلق اسی موقعہ پر ابن بطوطہ نے یہ بھی لکھا ہے کہ عموماً ختا اور چین والے ایندھن کا کام ایک خاص قسم کی مٹی سے لیتے ہیں، ہاتھیوں پر لاد لاد کر شہر میں وہ لائی جاتی ہے، اسے توڑ توڑ کر کوئلے کے برابر کر دیتے ہیں اور چولھے میں جھونکتے ہیں، اتنی تیز آگ اس سے پیدا ہوتی ہے کہ کوئلے کی آگ کی اس کے سامنے کوئی حقیقت نہیں پھر جل جانے کے بعد بھی ... کو جلاتے ہیں لکھا ہے کہ اس کی راکھ میں بعض دوسرے پتھروں کا سفوف ملا کر جو مواد تیار کرتے ہیں اسی سے چینی برتن بنتے ہیں، دیکھو ص ۲۹۵ ج ۲، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ پتھر کے کوئلے کا رواج چینیوں میں عام تھا بعض کتابوں میں لکھا ہے کہ اسی راکھ سے کپڑے بھی دھوتے ہیں ۱۲

"بالشت" ویشتری به ماامراد۔	جہاں یہ کاغذ بنتا ہے اور بدلا جاتا ہے، تعلق بڑے بڑے امراء حکومت سے ہے
(سفرنامہ ص ۱۹۵ ج ۲)	آدمی اگر چین کے بازار میں چاندی یا

سونے کے سکے سے کچھ خریدنا چاہے تو لوگ ان سکوں کو نہیں لیتے ہیں، نہ ان کی طرف توجہ کرتے ہیں جب تک کہ "بالشت" سے ان کو بھنا نہ لے۔ تب جس چیز کے خریدنے کا ارادہ کرے خرید سکتا ہے۔

ظاہر ہے کہ ابن بطوطہ نے جو کچھ بیان کیا ہے اس میں اور آج کل کے نوٹوں میں کسی قسم کا فرق نہیں ہے ابن بطوطہ جس زمانے کا حال چین کے متعلق بیان کر رہا ہے۔ اس وقت وہاں چنگیز خاں کی اولاد کی حکومت تھی۔ تاتاریوں کی تمام تاریخوں میں اسی بالشت کا ذکر آتا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مغل اور تاتاریوں میں زیادہ تر اسی کاغذی سکے کا رواج تھا۔

محمد تغلق کے متعلق بھی جیسا کہ عام طور پر مشہور ہے چرمی سکے کو ہندوستان میں اس بادشاہ نے مروج کیا تھا۔ کیا تعجب ہے کہ مغلوں اور تاتاریوں ہی سے اس خیال کو اس نے اخذ کیا ہو،

لیکن اس سے بھی عجیب تر بات یہ ہے جسے الکتانی نے بعض کتابوں سے نقل کیا ہے۔

ان عمر بن الخطابؓ کان یستعمل	حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ
الورق والجلود مکان النقود	ورق اور چمڑے کو نقود کی بجائے ضرورت کے
للحاجة (التراتیب الاداریہ ص ۴۲۴ ج ۱)	وقت استعمال کرتے تھے۔

پھر مشہور اسلامی شاعر ابو تمام کا ایک شعر بھی اس کے ثبوت میں پیش کیا ہے جو یہ ہے۔

[illegible]

واللہ اعلم یہ روایت کہاں تک صحیح ہے۔ لیکن درایۃ میرے نزدیک یہ بات محل تعجب نہیں ہو سکتی۔ چین میں جب اس کا رواج عام طور پر پایا جاتا ہے اور عرب و چین میں جو تجارتی تعلقات تھے۔ کیا بعید ہے ان ہی تاجروں سے یہ خبر حضرت عمرؓ تک پہنچی ہو اور بضرورت آپ نے کسی وقت اس طریقہ کو اختیار کیا ہو۔ ابو تمام کے شعر سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ ضرورت ہی کے موقع پر حضرت عمرؓ نے اس کو اختیار فرمایا تھا۔ بہرحال چونکہ اس کی تفصیلات کا علم نہ ہو سکا اور نہ اس عبارت کے سوا دوسری چیز سے اس کی تائید ہوتی ہے ہم اس پر زیادہ بحث نہیں کر سکتے۔

چیک کا رواج البتہ نوٹ ہی کے قریب قریب بنکوں کے چک کی جو کیفیت ہے یہ تو ابتدا اسلام یعنی عہد صحابہ و تابعین کی عام بات معلوم ہوتی ہے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ چک دکھا کر عام بنکوں

سرکاری خزانے سے روپیہ برآمد کرانے کا عام رواج معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں جاری تھا بلکہ خود چیک کا یہ لفظ عربی کے صک کے لفظ ہی سے بنا ہے۔ اس موقعہ پر البیہقی کی ایک دلچسپ روایت کا تذکرہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔ مشہور وجلیل القدر تابعی حضرت ابو وائل اس قصہ کے راوی ہیں، فرماتے ہیں۔

استعملنی ابن زیاد علی بیت	مجھے بیت المال پر ابن زیاد ابنِ امیہ کا
المال فاتانی رجل بصک فیه	کوفی گورنر حضرت امام حسین علیہ السلام
أعطه حب المطبخ ثمانمائة	کی شہادت میں مشہور بدنام آدمی، اسی
درهم فقلت مكانك	نے مقرر کیا تو میرے پاس ایک آدمی
ودخلت علی ابن زیاد	چک لے کر پہنچا جس میں تھا "دو بی خانے
فحدثته۔	کے داروغہ کو آٹھ سو درم ادا کردو"

میں نے اس شخص سے کہا ذرا اپنی جگہ ٹھہر جا اور میں ابن زیاد کے پاس پہنچا اس سے گفتگو کی۔

اس کے بعد اپنی پوری گفتگو انھوں نے نقل کی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے عہد میں تین تین افسروں کے درمیان روزانہ نصف ایک بکرے کا راشن مقرر تھا اس پر بھی حضرت عمرؓ فرماتے تھے کہ جس مال سے روزانہ ایک بکرا لیا جائے گا وہ جلد ختم ہو جائے گا۔ ابو وائل کا مطلب یہ تھا کہ تم آٹھ آٹھ سو روپے خزانے سے صرف مطبخ کے داروغہ کو دلاؤ گے تو بیت المال کا آخر انجام کیا ہوگا۔ ابو وائل فرماتے ہیں میں جب یہ کہہ چکا تو دیکھا کہ ابن زیاد مجھ سے کہہ رہا ہے۔

ضع المفتاح واذهب حیث	خزانے کی کنجی رکھ دو اور جہاں جی
شئت (سنن البیہقی ص ۳۵۹ ج ۶)	چاہے چلے جاؤ۔

میری غرض اس قصے کے نقل کرنے سے "چک" کے رواج کو بتانا تھا۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ موجودہ زمانے کے چکوں اور اس زمانے کے "چک" میں کسی قسم کا کوئی فرق نظر آتا ہے۔

(۶) جیسا کہ میں نے عرض کیا زر خلقی و فطری اور زر مصنوعی کی اصطلاح تو ہمارے فقہاء کے ہاں بھی مروج ہے، ہدایہ وغیرہ عام فقہ کی کتابوں میں سونے اور چاندی کے متعلق یہ الفاظ ملتے ہیں یعنی لکونه ثمنا خلقة (فتح القدیر ص ۳۰ ج ۵ کتاب الصرف) جس کا مطلب یہی ہے کہ دھات کی ان دونوں قسموں کے متعلق یہی طے کیا گیا ہے کہ پیدا کرنے والے نے ان کو ثمن (دام اور قیمت ہی) بننے کے لئے پیدا کیا ہے۔ ابن ہمام اسی کتاب الصرف میں ایک موقعہ پر لکھتے ہیں،

واعلم ان الاموال انقسم الی ثمن علی	معلوم ہونا چاہئے کہ اموال کی چند قسمیں ہیں،
کل حال وهی الدراهم والدنانیر ص ۲۶۸ ج ۵	جن میں ایک قسم تو مال کی وہ ہے جو ہر حال میں ثمن

(یعنی دام) ہی ہونے کی حیثیت رکھتی ہے اور یہ دراہم و دنانیر ہیں۔

الدراہم سے مراد چاندی کے سکے ہیں اور الدنانیر سے سونے کے، پھر آگے چل کر چند سطروں کے بعد لکھتے ہیں۔

وینقسم باعتبار الاصطلاح علی الثمنیة وھو فی الاصل سلعة فان کانت رائجة فھی ثمن لا تتعین بالتعیین وان کانت کاسدة فھی سلعة کالفلوس۔ (ص ۱۱)	پھر مال کی وہی قسم جو ثمن (یعنی دام اور قیمت) کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کی یک قسم وہ بھی ہے کہ فی الحقیقت ہے تو وہ سلعہ[۱] لیکن لوگوں نے بطور ثمن اور دام کے اس کو چلانا شروع کیا ہے، جب تک وہ رائج رہتا ہے تو اس وقت وہ ثمن ہی سمجھا جائے گا یعنی معین کرنے سے معین نہ ہوگا۔ لیکن اگر رواج پذیر نہ ہو تو پھر وہ معمولی سلعہ کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے مثلاً الفلوس (یعنی پیسوں کا) یہی حال ہے۔

جس سے معلوم ہوا کہ الدراہم والدنانیر کے سوا اور جن چیزوں کو بطور سکہ کے لوگ چلاتے ہیں ان کی حیثیت مصنوعی زر کی ہے۔ البتہ ایک سوال ہو سکتا ہے کہ بعض چیزوں کو تو پبلک بطور سکے کے چلا دیتی ہے مثلاً کوڑیوں کا رواج ہندوستان میں کچھ دن پہلے اسی حیثیت سے تھا یعنی حکومت کی طرف سے یہ مقررہ سکے کی حیثیت کوڑیوں کو نہیں دی گئی تھی اور غالباً تانبے کے جو کور ٹکڑے جو ان ہی کوڑیوں کے ساتھ ہندوستان میں مروج تھے۔ ان کی حیثیت بھی یہی تھی یعنی حکومت سے ان کا تعلق نہیں تھا ہے۔ فقہاء بھی ان کو پبلک ہی کی چلائی ہوئی چیز سمجھتے ہیں۔ شرح ہدایہ ہی میں ایک موقعہ پر الفلوس کے بعض احکام کا ذکر کرتے ہوئے امام محمدؒ کی طرف ان الفاظ کو منسوب کیا گیا ہے۔

الثمنیة فی الفلس ثبت باصطلاح الکل۔ (ص ۲۸۷)	پیسے میں ثمن (دام) ہونے کی حیثیت کل (عام مخلوق) کی اصطلاح سے پیدا ہوتی ہے۔

لیکن حکومت اگر کسی سکے کو الدراہم والدنانیر کے سوا مروج کر دے تو یہ تیسری قسم سکے کی ہوگی، گویا زر مصنوعی و وضعی کی ۲ قسمیں ہوئیں۔ ایک تو وہ جنہیں لوگ باخود بطور سکے کے چلاتے ہوں۔ اور دوسری قسم ان سکوں کی ہوئی جو سونے چاندی کے تو نہ ہوں لیکن حکومت نے ان کو چلایا ہو۔ بہرحال ان کی حیثیت وضعی اور مصنوعی سکے ہی کی ہوگی۔ ابن ہمام نے الفلوس کا ذکر کرتے ہوئے ایک موقعہ پر لکھا ہے کہ

---

[۱] سکے سے جو چیزیں خریدی جاتی ہیں، عربی میں ان کو سلعہ کہتے ہیں۔ مثلاً کپڑے گھوڑے وغیرہ۔ اردو میں کوئی خاص لفظ اس کے لئے نہیں ملا۔ اپنے درس میں طلبہ کو اس کا ترجمہ سودا بتایا کرتا ہوں۔ یعنی جو چیز بطور سودے کے بکتی ہے لیکن پھر بھی دل اس ترجمہ سے مطمئن نہیں ہے۔ اسی لئے اصل عربی لفظ ترجمہ میں رکھ دیا گیا۔ سلعہ ہی کو فقہاء کبھی عروض بھی کہتے ہیں یعنی علاوہ سکے کے عام طور پر استعمال اور برتنے کی چیزیں ۱۲

الفلوس فی الاصل عروض۔ (فتح القدیر ص ۲۹۹)	پیسے اپنی اصل حقیقت کے اعتبار سے عروض ہی ہیں (یعنی سکے ہونے کی حیثیت نہیں رکھتے ہیں)

اسی سلسلہ میں ایک اور چیز کا پتہ جرجی زیدان نے اپنی کتاب تاریخ التمدن الاسلامی میں دیا ہے یعنی لکھتا ہے

وکثیراً ما لیستعد مون جواھرلہ من الکثیرۃ فاذعزم احدھم علی سفرطویل لیستغرق نفقتہ عشرۃ الاف دینار مثلاً فبدلاً من ان یحمل ذلک ذھبا او فضۃ استبدلہ بجوھرۃ او عدۃ جواھر لیسہل حملھا فی الجیب فاذا وصل الی البلد المقصود باع الجواھر وانفق ثمنھا	بسا اوقات بڑی رقموں کی جگہ لوگ جواہرات سے کام لیتے تھے مثلاً کسی طویل سفر پر جانا ہے جہاں دس ہزار رقم کے مصارف کی ضرورت ہوتی تو سونا یا چاندی کی جگہ ایک یا چند عدد جواہرات رکھ لیتے اور مقام مقصود پر پہنچ کر اسے فروخت کرکے پھر اسی رقم کو صرف کرتے۔

مسلمانوں کے اس طرز عمل کو بیان کرنے کے بعد پھر خود لکھتا ہے کہ

کما یفعل الناس الیوم بتحاویل المالیۃ او البنک نوط (التمدن الاسلامی ص ۶ ات ۵)	جیسا کہ اس زمانے میں لوگ مالی کاروبار میں چیکوں اور بنک کے نوٹوں سے کام چلاتے ہیں۔

لیکن اس تدبیر کے سوا بھی ایک اور طریقہ مسلمانوں میں جاری تھا جو دوسری قوموں کے میل و جول سے انھوں نے بھی قبول کرلیا تھا۔ فقہ کی اصطلاح میں اس کو "سفتجہ" کہتے ہیں، جس کی جمع "السفاتج" ہے۔ غالباً یہ کسی فارسی لفظ کا معرب ہے۔ چونکہ یہ تجارتی کاروبار کی چیز تھی۔ اس لئے "سفاتج التجار" کے نام سے بھی اس کو موسوم کرتے ہیں اور یہ وہی "ہنڈی" ہے جو اب بھی دنیا میں اس لئے مروج ہے کہ روپیہ کی منتقلی میں اس سے آسانی بھی ہوتی ہے۔ نیز راستہ کے خطرات سے بھی مال محفوظ ہوجاتا ہے۔ روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ عہد صحابہ ہی میں اس کا رواج ہوگیا تھا۔ بیہقی نے حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے یہ اثر نقل کیا ہے کہ

ان عبداللہ بن الزبیر کان یاخذ من قوم بمکۃ دراھم ثم یکتب بھا الی مصعب بن الزبیر بالعراق فیاخذ منہ	عبداللہ بن زبیر لوگوں سے مکہ میں درہم لیتے اور مصعب بن الزبیر کے نام اس کی ہنڈی لکھ کر دیتے جو عراق کے گورنر تھے اور وہ شخص اپنی رقم مصعب سے عراق پہنچ کر وصول کرلیا کرتا تھا۔

---

[۱] سفتہ (سیامو) فارسی لفظ ہے۔ شاید ہنڈی کے کاغذ وغیرہ کو بھی کہتے ہوں اس لئے سفتجہ نام ہوا۔

اسی طرح ایک روایت ابن عباسؓ کے متعلق بھی یہ درج کی ہے کہ

سئل ابن عباس عن ذلک	ابن عباس سے ہنڈی کے متعلق پوچھا
فلم یریہ باس۔	گیا تو انھوں نے فرمایا کہ اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔

بیہقی نے یہ بھی لکھا ہے کہ

وروی فی ذلک ایضاً عن علی رضی اللہ تعالی عنہ (سنن بیہقی کتاب البیوع)	ہنڈی کے متعلق حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بعض روایت بیان کی گئی ہے۔

مگر باوجود ان تمام باتوں کے فقہاء عموماً اور حنفی فقہاء خصوصاً کچھ اس شکل کے متعلق تذبذب کا اظہار کرتے رہے "تذبذب" کے اسباب کیا تھے کیا ان کو اس کا اندیشہ تھا کہ بتدریج ہنڈی کی یہ شکل نوٹ کی صورت شاید نہ اختیار کرلے اور نوٹ کے جن نقصانات کو باوجود منافع کے آج دنیا اپنی آنکھوں سے دیکھ رہی ہے کیا یہ خطرات ان کے سامنے آگئے تھے۔ یہ کہنا مشکل ہے۔ جہاں تک کتابوں کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے ہنڈی میں ان کو گونہ "ربوا" کی بو آتی تھی، کیونکہ پہلے زمانے میں بلکہ شاید اب بھی اس میں زیادہ تر یہ کیا جاتا تھا کہ لوگ ایک شہر میں روپیہ بطور قرض کے لیتے تھے اور ہنڈی لکھ کر قرض خواہ کو دیدیتے تھے کہ وہ دوسرے شہر میں ان کے نمائندے سے وصول کرلے۔ قرض دینے والا اس ذریعہ سے اپنے روپیوں کو راہ کے خطرات اور باربرداری کے مصارف سے محفوظ کر لیتا تھا۔ گویا قرض دے کر مقروض سے نفع اٹھاتا تھا۔ گو حقیقی سود کی تو یہ شکل نہیں ہے لیکن ایک قسم کا غیرمادی نفع قرض دینے والے کو ضرور پہنچتا ہے۔ چونکہ فقہاء میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث مشہور ہے کہ

کل قرض جر نفعا فھو ربوا	ہر وہ قرض جس سے نفع حاصل کیا جائے وہ سود ہے۔

اس حدیث کی بناء پر "سفتجہ" کو بھی انھوں نے مکروہ قرار دیا تھا۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ مندرجہ بالا حدیث خواہ فقہاء میں جس درجہ بھی مشہور ہو مگر محدثین کے اصول سے صحیح نہیں ہے۔ اس کے راویوں میں سوار بن مصعب ایک ایسا شخص ہے جس سے حدیث روایت کرنی محدثین نے ترک کر دیا تھا۔ اسی طرح ایک اور روایت بھی ہے جسے مشہور صحابی حضرت سمرہ بن جندب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے واسطے سے بیان کیا جاتا ہے یعنی حضرت سمرہ بن جندب کہتے تھے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

السفتجات حرام۔	ہنڈیاں حرام ہیں۔

ابن جوزی نے اس روایت کا شمار "موضوعات" میں کیا ہے اور واقعہ بھی کچھ یہی معلوم ہوتا ہے کہ عہد نبوت میں "سفتجہ" کے لفظ کا سراغ نہیں ملتا۔ نیز اس کے راویوں میں عمر بن موسیٰ انتہا درجہ کا غیر معتبر آدمی ہے اور یہ کرامت ان ہی کی معلوم ہوتی ہے۔ بہرحال روایات کی بنیاد پر "سفتجہ" کی حرمت

کراہیت تک کا فیصلہ مشکل ہے البتہ ربوا کے کلی قواعد کے تحت یہ کہ "کل قرض جر نفعا فهو حرام" کے اصول کو عہدِ تابعین میں تسلیم کر لیا گیا تھا۔ جیسا کہ مشہور تابعی حضرت عطاء سے مصنف ابن ابی شیبہ میں منقول ہے۔ اس لئے ایسے "سفتجے" جو قرض لینے کے بعد کسی کو دیئے گئے ہوں ان کو مکروہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ لیکن اگر کوئی اپنا روپیہ کسی بنک یا سیٹھ ساہوکار کی دوکان میں جمع کر دے اور بنک سے چک لے کر یا ساہوکار سے ہنڈی لے کر دوسرے شہر میں وصول کرے یا جیسے آج کل منی آرڈر کا اصول ہے کہ آدمی ڈاکخانے میں روپیہ جمع کرا دیتا ہے ڈاک والے اس کے اس "منی آرڈر" کو مقام مطلوب میں بھیج دیتے ہیں۔ وہاں کا ڈاک خانہ روپیہ ادا کر دیتا ہے۔ بظاہر اس کے ناجائز ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہو سکتی۔

فقہاء حتی کہ حنفی فقہاء نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ قرض ہی روپیہ دیا جائے لیکن قرض دینے میں ہنڈی کی شرط نہ ہو اور بعد کو ہنڈی لکھ دی جائے کہ اس قرض کو فلاں شہر میں فلاں شخص کو دکھا کر وصول کر لینا تو جائز ہے۔

ابن ہمام نے الواقعات وغیرہ فتاوی سے نقل کیا ہے کہ

ان اقرضه بغير شرط وكتب جاز (فتح القدير ص ۳۵۲ ج ۵)

اگر بغیر کسی شرط کے قرض دے پھر ہنڈی لکھ دی جائے تو جائز ہے۔

کفایۃ البیہقی سے ابن ہمام ہی نے یہ جزئیہ بھی نقل کیا ہے۔

ان يقرض مطلقا ثم يكتب السفتجه فلا باس به۔

اگر مطلق قرض دے پھر ہنڈی لکھ کر دے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔

اور جب قرض کی صورت میں بھی غیر مشروط ہونے کے بعد "سفتجہ" جائز ہے تو جہاں قرض نہ ہو وہاں اسے بدرجہ اولی جائز ہونا چاہیئے۔

⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂

ذیلی مباحث میں جس کا میں ذکر کرنا چاہتا ہوں وہ "عشر" یا "چنگی" یا ہماری حکومت کی اصطلاح میں جس کا نام "کروڑ گیری" ہے۔ اگرچہ اس مسئلہ کا ذکر پہلے بھی آ چکا ہے لیکن جرجی زیدان نے اپنی کتاب التمدن الاسلامی میں اس سلسلہ میں ایسا طرزِ تعبیر اختیار کیا ہے جس سے مغالطہ کا اندیشہ ہے مسئلہ کو صاف کرنے کے لئے اس کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے۔

جرجی زیدان نے اسلامی حکومتوں کی آمدنیوں کا ذکر کرتے ہوئے مذکورہ بالا مداخل کے سوا چند جدید چیزوں کا اضافہ "توابع الخراج" کے عنوان سے کیا ہے۔ جس میں اس نے معدنیات اجمات (نیستان) وغیرہ کے محصولوں کے ساتھ جن کا ذکر اپنے اپنے موقعہ پر میں کر چکا ہوں عشار السفن (جہازوں کی چنگی) اعشار المراسد (ناکوں کی چنگی) کو بھی درج کیا ہے۔ بظاہر خیال گذرتا ہے کہ عام عشر کے سوا شائد مسافروں پر اسلامی حکومتیں کوئی جدید قسم کے ٹکس

عائد کرتی تھیں۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ یہ وہی عشر ہے جس کا ذکر میں پہلے کر آیا ہوں۔ مسلمانوں سے دوسری چیزیں یعنی مویشی و کاشت سے "الصدقات" کے مد کا محصول بنام زکوۃ و عشر لیا جاتا تھا۔ اسی طرح تجارتی اموال سے زکوٰۃ بحساب چالیس فی صدی وصول کی جاتی تھی پھر کبھی یہ زکوٰۃ دکانوں سے وصول ہوتی تھی اور کبھی بری یا بحری گذرگاہوں سے۔ جب کوئی تجارتی مال گذرگاہوں سے چالیسواں حصہ لیا جاتا تھا۔ اور پھر سال بھر تک اس مال سے کوئی جدید محصول وصول کرنا ناجائز تھا۔ اسی طرح غیر مسلم کی دوکانوں کے تجارتی اموال تو محصول سے مستثنیٰ تھے لیکن باہر سے جب وہ اسلامی ملک میں مال لاتے تھے تو ان سے بجائے زکوٰۃ کے چالیس فی صدی کے حساب سے خراج کے طور پر محصول لیا جاتا تھا۔ اسی طرح غیر ممالک کے غیر مسلم تاجر جب اسلامی علاقہ میں تجارتی مال لے کر آتے تھے تو قاعدہ یہ مقرر تھا جیسا کہ پہلے بھی کہا گیا کہ جس ملک کے وہ باشندے ہوتے اس ملک کی حکومت مسلمانوں کے تجارتی مال پر جتنا محصول عائد کرتی تھی اسی قدر اسلامی حکومت بھی ان سے وصول کرتی۔ اگر مسلمانوں کے تجارتی مال کو محصول سے مستثنیٰ کر دیا جاتا تو اس ملک والوں سے اسلامی حکومت بھی کچھ نہیں لیتی ہے۔ البتہ اگر ان کی حکومت کا طرزِ عمل معلوم نہ ہوتا تھا۔ مثلاً وہاں مسلمان تجارت کے لئے کبھی نہ گئے ہوں تو ان کے تجارتی اموال سے خواہ کسی نوعیت کے ہوں، دس فی صدی کے حساب سے محصول کیا جاتا تھا لیکن غیر مسلموں سے جو یہ آمدنی ہوتی تھی اس کو خزانے میں خراج کے فنڈ میں جمع کیا جاتا تھا۔ بخلاف مسلمانوں کے تجارتی اموال کی آمدنی "الصدقات" کے مد جمع ہوتی تھی کیونکہ یہ دراصل ان کے تجارتی مال کی زکوٰۃ ہوتی تھی قاضی ابو یوسف کتاب الخراج میں لکھتے ہیں۔

وكل ما اخذ من المسلمين	مسلمانوں سے العشور (کروڑگیری)
من العشور فسبيله سبيل	کے نام سے جو محصول وصول کیا جاتا ہے
الصدقة وسبيل	اس کا شمار زکوٰۃ کی مد میں ہوگا اور
ما يوخذ من اهل الذمة	اسلامی حکومت کی غیر مسلم ذمی رعایا کے
واهل الحرب جميعا سبيل	مال سے العشور جو وصول کیا جاتا ہے
الخراج (ص ۸۰)	یا غیر اسلامی حکومت کی غیر مسلم رعایا

یعنی حربیوں سے جو العشور وصول ہو ان سب کا شمار خراج کی مد میں ہوگا۔

ظاہر یہ ہے کہ اموالِ تجارت اسلامی ملک میں کبھی اتنے نہ آئیں گے کہ ان سے ... عشر وصول کا محصول سال بھر میں ایک دفعہ وصول کیا جاتا جو جیسا کہ ان کا عشر السفن، عشر المعد وغیرہ کو الگ الگ کر کے بیان کرنا ایک قسم کا مغالطہ ہے نہ صرف مسلمانوں بلکہ غیر مسلموں کے ساتھ بھی اس کا خاص طور پر خیال کیا جاتا تھا کہ سال بھر میں ایک ہی مال پر دو دفعہ قطعاً محصول وصول نہ کیا جائے مشہور ہے کہ ایک عیسائی تاجر سے کروڑگیری کے عامل نے دو دفعہ محصول وصول کرنا

عیسائی حضرت عمرؓ کے پاس مدینہ دوڑا ہوا پہنچا۔ آپ اس وقت بقریب تر مدینہ تھے، جا کر شکایت کی۔ اس وقت آپ نے [illegible] کو سخت ڈانٹ کہا بھیجی [illegible] اس کا مال [illegible] کے بعد یہی عیسائی حضرت عمرؓ کی خدمت میں پھر آیا اور اپنا تعارف کرتے ہوئے بولا۔

انا الشیخ النصرانی الذی	میں وہی بوڑھا [illegible]
کلمتک فی زیاد۔	[illegible]

حضرت عمرؓ نے اسی لہجہ میں جواب دیتے ہوئے فرمایا۔

وانا الشیخ الحنیفی الذی	میں بھی تو وہی حنیفی بوڑھا ہوں جس نے
قضیت حاجتک (کتاب الخراج)	تیری ضرورت پوری کی تھی۔

واقعہ یہ ہے کہ غیر ممالک کے تاجروں کے ساتھ اسلامی حکومت رواداری اور انصاف کا ایسا برتاؤ کرتی تھی کہ دور دراز ممالک کے باشندے خصوصاً سمندر پار ممالک جانتے ہوئے [illegible] تھے، عدلِ فاروقی کا شہرہ سن کر انھوں نے اسلامی ممالک میں پہنچ کر تجارت کرنے کی خود درخواست کی۔ قاضی ابو یوسف نے کتاب الخراج میں لکھا ہے کہ

ان اهل منبج قوم من اهل	منبج کے لوگ جو غیر اسلامی قلمرو کے
الحرب وراء البحر کتبوا الی عمر	باشندے تھے انھوں نے سمندر پار سے
بن الخطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ	حضرت عمرؓ کے پاس درخواست بھیجی کہ [illegible]
دعنا ندخل ارضک تجارا	دیجئے کہ آپ کے ملک میں سوداگر بن کر ہم
وتعشرنا۔	داخل ہوں اور ہم سے چنگی (عشر) وصول کیجئے

جرجی زیدان نے لکھا ہے کہ

فقد کان عمال الیمن یاخذون	یمن کے عمال (آزو ریزی والے) اس
هذه الضریبة من السفن التی	محصول کو ان جہازوں سے وصول کرتے
تمر بسواحلهم قادمة من الهند	جو ان کے سواحل پر ہندوستان سے
تحمل الاعواد المختلفة والمسک	آتے ہوئے گزرتے جن پر مختلف عود،
والکافور والعنبر والصندل	لکڑیاں مختلف قسم کی مشک کافور
والصینی (۲۱۲ ج ۱)	عنبر صندل چینی وغیرہ ہوتے۔

میرا خیال ہے کہ جرجی زیدان کو جو یہ مغالطہ ہوا کہ معمولی "محصول" جو تجارتی اموال پر مسلم و غیر مسلم [illegible] کے سوداگروں سے لیا جاتا تھا، اس سے "عشر السفن" کوئی الگ چیز تھی اس کا منشاء یہ ہے کہ اسلامی ممالک میں امن و امان کی فراوانی، عام فراغبالی و ثروت کی وجہ سے ہر قسم کے اموال کے طلب کا یہ نتیجہ تھا کہ بکثرت غیر ممالک کے تجار مسلمانوں کے ملکوں میں تجارت کے لئے آتے جاتے رہتے تھے اور اس سلسلہ میں بڑی کافی آمدنی حکومت کو ہو جاتی تھی۔ جرجی زیدان ہی کا بیان ہے کہ

قد بلغت اعشار السفن فی ایام الواثق باللہ مالا کثیرا۔	واثق باللہ کے زمانے میں جہازوں کے محصول کی مقدار بہت بڑھ گئی تھی۔

بلکہ زیدان کا خیال تو یہ ہے کہ یورپین ممالک کے تجار ابنائے جبل الطارق پر بکثرت اس محصول کے ادا کرنے کے اتنے عادی ہو گئے تھے کہ موجودہ زمانے میں TAREF کا جو لفظ مغربی زبانوں میں تجارتی محصول کے لئے مستعمل ہے یہ عربی کے لفظ "طریف" جو جبل الطارق کے کسی کروڑ گیری کی چوکی کا نام تھا۔ اس کی بگڑی ہوئی شکل ہے یا "تعریفہ" سے ٹیرف بنا ہے۔ بہرحال "عشور" کے متعلق اس غلط فہمی کا مجھے ازالہ مقصود تھا۔ البتہ اس سلسلہ میں جرجی زیدان نے بعض نئے ناموں کے محاصل کا بھی ذکر کیا ہے جن میں ایک کا نام "غلہ دار لضرب" ہے یعنی سرکاری ٹکسالوں میں لوگ اپنی اپنی چاندی یا سونا بھیج کر سکوں کی شکل میں ڈھلواتے تھے اور لکڑی آگ محنت وغیرہ کے معاوضہ میں فی صد ایک درہم دیا جاتا تھا۔ جرجی زیدان کا بیان ہے کہ یہ بھی اسلامی حکومتوں کے مداخل کا ایک اچھا ذریعہ تھا۔ ہر ہر صوبہ جاتی اضلاعی مرکزوں میں ٹکسال بنے ہوئے تھے مخلوق ان میں اپنے سکے ڈھلواتی تھی۔ چونکہ بمقدار کثیر سکے ڈھلتے تھے حتیٰ کہ صرف ایک شہر اندلس کے متعلق اس نے لکھا ہے کہ کسی کسی سال میں ایک ایک کروڑ طلائی گنی ڈھالی جاتی تھی۔ جرجی کے قلم سے اضطراراً یہاں پر یہ الفاظ ٹپک پڑے ہیں،

وذلک نحو ضعفی ما تضربہ دولۃ الانکلیزۃ الیوم وھی فی ابان مجدھا۔	انگریزی حکومت جو اس وقت اپنی عنفوان شباب میں ہے وہ سالانہ جتنے سکے ڈھالتی ہے یہ اس کی دُگنی رقم ہے

اور پھر حیرت سے پوچھتا ہے کہ جب ایک اندلس کا یہ حال تھا تو مصر و بغداد وغیرہا من المدن الاسلامیۃ کا اس باب میں کیا حال ہوگا۔

ظاہر ہے کہ دار الضرب کی بنیاد خلافت بنی امیہ کے زمانے میں باضابطہ شکل میں قائم ہوئی ورنہ اس سے پہلے عموماً اسلامی ممالک میں رومی و ایرانی سکے چلتے تھے جنھیں دنانیر ہرقلہ اور دراہم کسریٰ بھی کہتے تھے۔ اس لئے رعایا پر اس مزید محصول کا اضافہ عہد نبوت اور عہد خلافت راشدہ کی بات تو نہیں ہو سکتی۔

اب تک اس محصول کے متعلق کوئی تصریح مجھے اسلام کی قانونی کتابوں میں نہیں ملی البتہ امام ابو یوسف نے کتاب الخراج میں حضرت عمر بن عبد العزیز خلیفہ کا ایک مکتوب نقل کیا ہے۔ جس میں انھوں نے اپنے والی (گورنر) عبد الحمید بن عبد الرحمٰن کو خراج کے وصول کرنے میں نرمی کے ساتھ ملائمت و نرمی کی تاکید کرتے ہوئے، رقام فرمایا ہے کہ خراج کی مد میں مندرجہ ذیل مدوں کو ہرگز رعایا سے نہ لو یعنی

اجور الضرابین و ہدیۃ النیروز	سکہ ڈھالنے والوں اور چاندی کے

ولاهدیة النیروز والمهرجان	نیروز کے دن کی نذر نہ لی جائے اور نیروز
ولا ثمن الصحف ولا اجور	و مہرجان (فارسی اسلامی تہواروں) کا ہدیہ
الفتوح ولا اجور البیوت ولا	بھی نہ لیا جائے اور نہ کاغذ کے دام
دراهم النکاح والخراج علی	لئے جائیں اور نہ گھروں کا ٹیکس اور نہ نکاح کا
علی من اسلم من اهل الارض	ٹیکس لیا جائے اسی طرح باشندوں میں جو مسلمان
(کتاب الخراج ص ۱۹)	ہوں ان پر بھی خراج نہ عائد ہوگا۔

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان سے بیشتر کے خلفاء بنی امیہ کے زمانے میں کچھ اس قسم کے نئے محصولوں کا گذشتہ حکومتوں کی تقلید میں اضافہ ہو گیا تھا بلکہ "ثمن الصحف" کے مستثنیٰ کرنے کا کچھ واضح مطلب سمجھ میں نہیں آتا۔ کیا اس کا یہ مطلب تھا کہ کتابوں کی درآمد برآمد پر محصول نہ لیا جائے جیسا کہ ہماری حکومت آصفیہ میں اس کا اب تک رواج ہے کہ کروڑ گیری سے احتراماً للعلم کتابوں کی درآمد برآمد پر محصول معاف ہے یا حکومت میں بسلسلہ مقدمات کاغذی مصارف کا صرفہ رعایا سے وصول کیا جاتا تھا جیسا کہ اس زمانہ میں عدالت کے محکموں میں کورٹ فیس بیچارے بردادخواہ سے وصول کی جاتی ہے اور حضرت عمر بن عبدالعزیز نے اس محصول کو معاف کر دیا تھا۔

بہر حال حضرت عمر بن عبدالعزیز کے اس مکتوب سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ ناجائز ابواب میں "اجور الضرابین واجور اذابۃ الفضۃ" بھی ہے۔ اگرچہ کوئی کہہ سکتا ہے کہ آخر سکہ بنا کر تو لنے کی بار بار جھنجھٹ سے اور کاٹنے گھٹانے بدلنے وغیرہ کے دغل و فصل سے حکومت لوگوں کو مطمئن کر دیتی ہے اور اس کے صلہ میں ایک فی صدی اگر اجرت لیتی ہے تو اس کو بجائے جبایات الظلم کے "النوائب" میں کیوں شریک نہ کیا جائے جس کے عائد کرنے کا ذکر گذر چکا کہ حکومت کو قانوناً اختیار ہے

———+———

صرفِ دولت

حدیث من این اکتسبه کی تفصیل کے بعد فیما انفقہ کے ٹکڑے کی اب توضیح باقی رہ جاتی ہے اور اب آئندہ صفحات میں ہم اسی کے متعلق مختصر الفاظ میں اسلام کے نقاط نظر کو پیش کرنا چاہتے ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ گو عام مذاہب وادیان میں مال و دولت کی بہت کچھ مذمت کی گئی ہے حتی کہ اسی بنیاد پر مذہب اور دنیا کی نفرت دونوں قریب قریب ایک دوسرے کے مرادف ہو گئے ہیں اور اسلامی مستندات میں بھی اس قسم کی چیزیں پائی جاتی ہیں۔ لیکن مولینا روم کے مشہور شعر چیست دنیا وا لے نے تقریباً ہر پڑھے لکھے مسلمان تک اس دنیا کا صحیح مطلب پہنچا دیا ہے جس کی اسلام نے مذمت کی ہے، ورنہ سچ یہ ہے کہ اگر دولت کمانے میں آدمی خدا سے غافل نہ ہو اور اکتساب دولت کے جن قوانین کا تذکرہ گذشتہ اوراق میں کیا گیا ہے اگر ان قانونی جائز ذرائع سے مال حاصل کیا جائے اور خدا کے قائم کئے ہوئے حدود سے لاپروائی نہ برتی جائے تو صرف حدیثوں میں نہیں بلکہ قرآن میں بھی

اموالکم التی جعل اللہ لکم قیاما۔	تمہارا مال جسے خدا نے تمہارے ٹھہراؤ اور قیام کا ذریعہ بنایا ہے۔

کے عجیب و غریب جامع مانع الفاظ میں "مالی قوت" کی حقیقت بیان کی گئی ہے گویا حق تعالیٰ کی ذات جس طرح سموات وارض کی قیوم ہے اسی "قیومیت" او ر ٹھہراؤ کا ایک حصہ اس عالم مجاز میں "اموال" و دیا گیا ہے یعنی بنی آدم کے ٹھہراؤ اور قیام کا ذریعہ مال ہے یہ قرآن کا نظریہ ہے۔

انسانیت کی ہر آرزو اور اس کی تمنائیں زیادہ تر مالی قوت ہی کے ساتھ وابستہ ہیں اس لئے بعض روایتوں میں آیا ہے کہ

الدراھم والدنانیر خواتم اللہ فی ارضہ من جاء بخاتم مولاہ قضیت حاجتہ۔	درہم و دنانیر اردو پیہ اشرفی، اللہ کی مہریں ہیں، جو اپنے مالک کی مہر لے کر آئے گا اس کی حاجت پوری ہوگی۔

(طبرانی فی الاوسط)

قدرت کی ایک ایسی نعمت جس کے ساتھ ہمارا قیام وابستہ ہے ضرورت ہے کہ ہم اس کے صرف کرنے میں پوری احتیاط اور بیداری سے کام لیں، اگرچہ یوں بھی قدرت نے انسانی فطرت میں مال کی حفاظت و صیانت کا جذبہ محفوظ کر دیا ہے قرآن ہی میں ہے،

واحضرت الانفس الشح — نفوس انسانی لالچ کے سامنے حاضر کی گئی ہیں۔

انسان کا یہی فطری شح (اور دولت کی لو) ہے جس کا یہ نتیجہ ہے کہ صرفِ دولت میں لوگ اتنی لاپروائی نہیں برتتے جتنی حصولِ دولت میں عموماً برتی جاتی ہے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ صرف دولت پر اسلام نے اتنی پابندیاں نہیں عائد کی ہیں جتنی حصول دولت میں عائد کی گئی ہیں۔ مگر پھر بھی صرف دولت کے سلسلے میں اسلام کا جو "ہدایت نامہ" ہے گو وہ مختصر ہی سہی۔ تاہم جو کچھ بھی اس باب میں ہدایتیں دی گئی ہیں دیکھنے سے معلوم ہوگا کہ عقل کی راہ سے آدمی اس وقت تک ان نکات تک نہیں پہنچا ہے۔

"صرفِ دولت" کے متعلق اسلامی نقطۂ نظر کو سمجھنے کے لئے ہمیں اپنے سامنے چند سوالات کو رکھ لینا چاہئیے۔ مطلب یہ ہے کہ کسی کے پاس جب جائز اور قانونی ذریعے سے دولت جمع ہوگئی تو قدرتاً اس کے سامنے دو سوالات آتے ہیں یا ان کو آنا چاہئیے۔

کن کن چیزوں پر اس دولت کو نہ صرف ہونا چاہئیے۔ جب اس سوال کا جواب معلوم ہو جائے تب اس کے بعد دوسرا سوال یہ پیدا ہوگا کہ پھر کن چیزوں پر اس کو صرف کرنا چاہئیے، اور یہی دوسرا سوال ہے گویا پہلے سلب پھر ایجاب کی تحقیق ہونی چاہئیے۔

پہلے ہم سوالِ اول کو لیتے ہیں یعنی اسلام کن چیزوں پر صرفِ دولت سے آدمی کو منع کرتا ہے

تبذیر | ظاہر ہے کہ جب ہر جائز و ناجائز ذرائع سے اسلام دولت کمانے کی اجازت نہیں دیتا تو پھر ہر جائز و ناجائز خواہش کی تکمیل میں بھی صرفِ دولت کی وہ کیسے اجازت دے سکتا ہے الغرض قانونی افعال و اعمال سے اسلام نے روکا ہے۔ ان راہوں پر صرفِ دولت کا نام قرآن کی اصطلاح میں تبذیر ہے، قرآنی آیت،

ولا تبذر تبذیرا۔ — اور غلط مصرف پر ہرگز خرچ نہ کرو۔

میں صرفِ دولت کے اساسی منافی قانون کا اعلان کیا گیا ہے؛ اگرچہ عام طور پر "تبذیرا" اور "اسراف" کو لوگ ہم معنی خیال کر کے دونوں کا ترجمہ فضول خرچی کر دیتے ہیں لیکن جیسا کہ آئندہ معلوم ہوگا کہ صرفِ دولت کے یہ دو مستقل دفعات ہیں فضول خرچی کے معنی تو یہ ہیں کہ ضرورت سے زیادہ خرچ کیا جائے مثلاً اگر کسی کا پیٹ جو کی روٹی سے بھر سکتا ہے گیہوں کی روٹی کھانا اس کے لئے بایں معنی فضول خرچی ہوئی۔ پھر کیا اسلام میں یہ جرم ہے؟ گذر چکا کہ اسلام جب زیب و زینت و آرائش تک کی ممانعت نہیں کرتا تو بھلا بجائے جو کے جو گیہوں کی روٹی کھاتا ہے اس کو "مبذر" کیسے اسلام میں قرار دیا جا سکتا ہے خصوصاً جب ہم اسی آیت کے بعد یہ دیکھتے ہیں کہ حق تعالیٰ نے تبذیر کرنے والوں کو

ان المبذرین کانوا اخوان الشیاطین وکان الشیطان لربہ کفورا۔	تبذیر کرنے والے شیاطین کے بھائی ہیں اور شیطان تو اپنے رب کا ناشکرا ہے۔

قرار دیا ہے۔ "شیطان کا بھائی ہونا" اور اس کی صفت "کفوریت" میں مبذرین کو شریک کرنا یہ سزا کیا اس شخص کی قرآن مقرر کرسکتا ہے جو بجائے جو کے باوجود قدرت کے گیہوں کی روٹی کھاتا ہے۔

اصل یہ ہے کہ "تبذیر" کا مادہ "بذر" ہے، بذر کے معنی تخم کے ہیں، تبذیر تخم چھڑکنے کو کہتے ہیں پھر جیسے کسان اپنے کھیت میں دانے ڈالتا ہے اور بغیر اس خیال کے چھڑکتا چلا جاتا ہے کہ دانے کہاں گریں گے کہاں نہ گریں گے، یہی حال اس شخص کا ہے جو اپنی دولت خرچ کرتا چلا جاتا ہے لیکن اس صرف میں اس کو اس کی پروا نہیں ہوتی کہ جائز خواہشوں پر خرچ کر رہا ہے یا ان خواہشوں پر خرچ کر رہا ہے جن کی تکمیل قانوناً جرم ہے یہاں تک تو مبذر کسان کے مشابہ ہے لیکن آگے کسان کے دانے تو ایک سے سو پیدا کرتے ہیں اس معاملہ میں مبذر اس سے جُدا ہو جاتا ہے بلکہ ٹھیک جو حال شیطان کا ہے وہی حالت اس کی ہوتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ شیطان جیسا کہ اس قوت کا نام ہے جو بجائے خیر کے ہمیشہ شر اور بُرائی پر صرف ہوتی ہے۔ یہی حال مبذر کا ہے کہ خُدا کی دی ہوئی مالی طاقت کو وہ بھی بُرائی اور شر کے حصول میں صرف کرتا ہے اسی لئے اس کا بھائی ہے اور جس طرح شیطان اپنی قوت کے غلط استعمال سے خُدا کا ناشکرا قرار پایا، یہی حال اس کی ناشکری کا ہے۔ الحاصل "تبذیر" کے صحیح معنی جو خود قرآن سے پیدا ہوتے ہیں وہ یہی ہیں کہ مال جو جائز خواہشوں کی تکمیل کے لئے انسان کو دیا گیا ہے اسے ناجائز خواہشوں اور غیر قانونی اعمال و افعال پر خرچ کرنا، مثلاً شاہد بازی، حرام کاری، شراب خواری وغیرہ قانونی جرائم پر جو دولت کو صرف کرتا ہے وہ مبذر ہے۔ پس "تبذیر" کے حقیقی معنیٰ یہی ہیں، رہا اسراف وہ اس سے بالکل جداگانہ چیز ہے، اپنے محل پر اس کا ذکر آئے گا تعجب ہے کہ سورۂ بنی اسرائیل میں جہاں تبذیر کی یہ آیت ہے اسی کے بعد اسراف کے قانون کا بھی تذکرہ کیا گیا ہے۔ اگر دونوں ایک ہی چیزیں ہوتیں تو پھر اس کو دہرانے کی کیا ضرورت ہوتی۔ جب "تبذیر" کی حقیقت واضح ہوگئی تو اب اس کا پتہ چلانا کہ مصارف کا کون سا سلسلہ تبذیر کے تحت میں داخل ہے، اس کے لئے اسلامی جرائم کی فہرست اپنے سامنے رکھ لینا چاہیئے اور سمجھ لینا چاہیئے کہ ان جرائم میں سے ہر چیز پر دولت کا صرف کرنا تبذیر ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے تبذیر کی یہی تفسیر فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے

ولو دانقا[۱]	اگرچہ ایک پیسہ ہی کیوں نہ ہو۔

ظاہر ہے کہ جرائم پر ایک پیسہ بھی خرچ کرنا ایسا ہے جیسے کوئی ایک روپیہ خرچ کرے اور اس سے بھی

---

[۱] تنویر المقیاس ص ۱۲۵ جلد ۳ بر حاشیہ در منثور ۱۲

یہی معلوم ہوتا ہے کہ تبذیر کے معنی فضول خرچی کے نہیں ہیں ورنہ لازم آئے گا کہ ضرورت سے زیادہ ایک حبہ بھی خرچ کرنا شیطان کا بھائی بننا اور خدا کے کفور بندوں میں شریک ہونا ہے۔ حالانکہ ایسا دنیا میں کون ہے۔

"تبذیر" کے بعد صرفِ دولت کے متعلق اسلام میں اور بھی دو امتناعی قانون ہیں جن میں ایک کی تعبیر اسراف سے اور دوسری کی تعبیر ریاءالناس سے کی جاتی ہے۔ طبعی ترتیب کا اقتضاء تو یہی ہے کہ ان دونوں قانون کی تشریح بھی اسی وقت کر دی جائے۔ لیکن جہاں تک میں نے غور کیا ان دونوں قانونوں کی صحیح حقیقت جیسی کہ وہ ہے اسی وقت سمجھ میں آسکتی ہے جب ہم پہلے صرفِ دولت کے ایجابی سوال کے جواب کو سمجھ لیں۔ اس لئے خلافِ ترتیب میں اس وقت ان دونوں سے الگ ہو کر دوسرے سوال کو چھیڑ دیتا ہوں جیسا کہ میں نے کہا تھا سلبی سوال کے بعد دوسرا مرتبہ ایجابی سوال کا ہے۔

کن چیزوں پر دولت کو صرف کرنا چاہیئے

اسلام کے لئے یہ بڑا دلچسپ سوال ہے یعنی اس باب میں دنیا کے دیگر مذاہب کے مقابلہ میں اسلام نے اپنے خاص نقاط نظر پیش کئے ہیں پہلی خصوصیت تو اسلام کی اس باب میں وہی ہے جس کا ذکر مختلف طریقوں سے پہلے بھی ہو چکا ہے یعنی اس نے فقط ضرورت کی حد تک مصارف کو محدود کرنے کا حکم نہیں دیا ہے جیسا کہ عموماً دنیا کے تمام مذاہب کے عام رجحانات ہیں کہ جہاں تک ممکن ہو ضرورت میں بھی کمی کی جائے حتیٰ کہ کھانا جتنے دن آدمی چھوڑ سکتا ہو چھوڑ دے، پانی ترک کر دے اسا لنس تک نہ لے، کپڑے بھی جہاں تک بدن سے اتار سکتا ہو اتار دے گویا ان ہی چیزوں کو مذہبی جذبے کے افراط کا ثبوت قرار دیا گیا ہے لیکن جیسا کہ میں بار بار دہراتا چلا آرہا ہوں کہ ضرورت تو بہرحال ضرورت ہے اسلام زینت و آرائش کے حدود تک بھی جانے والوں کو مذہبی دائرے میں بلند سے بلند مقام عطا کرنے کے لئے تیار ہے، سلیمانی تخت پر بھی مذہبی مدارج کا سب سے بلند ترین درجہ یعنی نبوت تک ل سکتی ہے۔ رسول علیہ السلام کے خلیفہ برحق بھی "الغنی" کے لقب کو اپنے لئے باعثِ فخر قرار دیسکتے ہیں اور یہ بات اسلام کی ایسی خصوصیت ہے جس پر بحث کرنے کی بھی چنداں ضرورت نہیں۔ جو کچھ اب تک اس سلسلے میں کہا جا چکا ہے وہی کافی ہے۔

دوسری خصوصیت اس سے بھی عجیب تر یہ ہے کہ عموماً مذاہب نے دولت کے جائز مصارف کے بھی دو حصے کر دیئے ہیں، ایک دینی مصارف دوسرے دنیوی مصارف۔ لیکن اسلام نے اس تقسیم ہی کو حذف کر دیا۔ اسلامی نقطہ نظر سے دولت کے سارے ایسے مصارف جنھیں عام طور پر دنیوی مصارف میں شمار کیا جاتا ہے وہ دینی مصارف بن سکتے ہیں، اسی طرح ایسے تمام مصارف جنھیں عام طور پر دینی مصارف خیال کیا جاتا ہے دنیوی بن سکتے ہیں۔

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ صرفِ دولت یا خرچ کے متعلق قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ

لوگوں نے دو دفعہ ماذا ینفقون (کیا خرچ کریں) کے الفاظ میں استفسار کیا۔ اس سوال کے جواب میں جو پہلا جواب قرآن نے دیا ہے وہ یہ ہے

قل ما انفقتم من خیر۔ کہہ "خیر" سے جو کچھ تم خرچ کرو۔

یعنی "خیر" اور "نیکی" کی راہ جسے عموماً دینی مصارف بھی کہتے ہیں اگر اس کے متعلق تمہارا سوال ہے تو اب تک جو یہ سمجھا جاتا تھا کہ صرف غریبوں اور مسکینوں کو دینا یہ "خیر" اور خیرات ہے۔ قرآن کہتا ہے یہ صحیح نہیں ہے، بلکہ یتیموں اور مسکینوں کو دینا یہ بھی دینی خرچ ہے اور اپنے خاندان والوں مثلاً والدین یا اقربا و اعزا پر خرچ کرنا یہ بھی "خیر" ہے۔ "خیر" کے معنی عربی میں "مال" کے بھی آتے ہیں، اور عموماً لوگوں کا ذہن اس آیت میں بھی اسی معنی کی طرف منتقل ہو جاتا ہے، حالانکہ آیت کو ختم کرتے ہوئے،

وما تنفقوا من خیر فان اللہ بہ علیم۔ اور نیکی کی راہ سے جو کچھ تم خرچ کرو گے تو خدا اس سے باخبر ہے۔

میں "خیر" کے جو معنی یہاں مراد ہیں اس کو متعین کر دیا گیا ہے کہ "خیریت" اور "نیکی" کا مدار اس پر ہے کہ حق تعالیٰ تمہارے اس خرچ کے متعلق کیا جانتے ہیں، یعنی اگر تم نے اپنے اقربا اور خاندان والوں اس لئے خرچ کیا ہے کہ حق تعالیٰ کا یہ حکم ہے تو تمہارا یہ خرچ جو بظاہر دنیوی خرچ سمجھا جاتا ہے دینی خرچ ہے اور یتامیٰ و مساکین پر جو تم صرف کر رہے ہو اگر اس سے خدا کی مرضی کا اتباع مقصود نہیں ہے تو گو بظاہر وہ کتنا ہی بڑا دینی صرف سمجھا جائے لیکن پھر بھی وہ دنیوی خرچ ہی ہے۔ قرآن میں تو اس کی طرف کلیاتی رنگ میں اشارہ کیا گیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کے اسی اصول کو پیش نظر رکھ کر جو تفصیلات اس باب میں ارشاد فرمائے ہیں حدیث کی کتابوں میں ان کا ایک ذخیرہ پایا جاتا ہے۔

اس اصول کی تشریح میں کہ عام طور پر جسے دنیوی خرچ سمجھا جاتا ہے صرف نیت اور نقطۂ نظر کی تصحیح سے وہ بھی دینی خرچ بن جاتا ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں۔

ان المسلم اذا انفق علی اھلہ نفقۃ وھو یحتسبھا کانت لہ صدقۃ (بخاری مسلم) اپنی بیوی پر آدمی جو خدا کو سامنے رکھ کر خرچ کرتا ہے یہ اس کی طرف سے صدقہ ہے۔

صرف یہی نہیں کہ وہ دینی خرچ بن جاتا ہے بلکہ تمام دینی مصارف میں اس دنیوی خرچ کو برتری حاصل ہے، فرمایا جاتا ہے،

دینار انفقتہ فی سبیل اللہ دینار انفقتہ فی رقبۃ دینار تصدقت بہ علی وہ اشرفی جسے اللہ کی راہ میں تم نے خرچ کیا اور وہ اشرفی جو غلام آزاد کرانے میں صرف کی

مسکین، دینار انفقت،	اور وہ اشرفی جو کسی مسکین پر تم نے
علی اھلک اعظمہا اجرا الذی	صدقہ کیا اور وہ اشرفی جو تم نے اپنی
انفقت علی اھلک۔ (مسلم)	بیوی پر خرچ کی، ان تمام اشرفیوں

میں ثواب اور اجر کے حساب سے سب سے بڑی وہ ہے جسے تم نے اپنی بیوی پر خرچ کیا

اور بیوی بچوں کو تو خیر ایک حد تک غیر بھی قرار دیا جا سکتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے بھی آگے بڑھ کر ارشاد فرمایا۔ آدمی خود اپنی ذات پر جو دولت صرف کرتا ہے یہ بھی صدقہ ہے۔ مسند احمد کی حدیث ہے،

ما اطعمت نفسک فھو لک	تم نے خود اپنے کو جو کھلایا یہ بھی
صدقۃ ما اطعمت ولدک	تمہاری طرف سے صدقہ ہے جو اپنی
فھو لک صدقۃ ما اطعمت	اولاد کو کھلایا یہ بھی تمہاری طرف سے
زوجک فھو لک صدقۃ	صدقہ ہے اور اپنی بیوی کو جو کھلایا؛
ما اطعمت خادمک فھو لک	بھی تمہاری طرف سے صدقہ ہے اور
صدقۃ۔	اپنے نوکر کو جو کھلایا وہ بھی تمہاری

طرف سے صدقہ ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ "احتساب" (یعنی حق تعالیٰ کی مرضی مبارک کو اپنے دھیان میں سامنے رکھ کر) تبذیر کے سوا دولت کے تمام "مصارف صدقہ" اور دینی خرچ ہیں، گویا مشہور حدیث "انما الاعمال بالنیات" کا ایک مصداق یہ بھی ہے لیکن "صدقہ" کے باب میں "احتساب" کا مفہوم کتنا وسیع ہے اس کے سمجھنے کے لئے ہمیں اپنے سامنے مسند احمد کی اس حدیث کو رکھ لینا چاہیئے جس میں حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دن ارشاد فرمایا کہ

مباضعتک اھلک صدقۃ	تیرا اپنی بیوی کے ساتھ ہم بستر ہونا

یہ بھی صدقہ ہے۔

حضرت ابوذرؓ نے اس پر سوال کیا کہ

انصیب شھوتنا ونوجر۔	ہم اپنی خواہش بھی پوری کرتے ہیں

اور ثواب بھی دیا جائے؟

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جواباً ارشاد فرمایا

لو وضعتہ فی غیر حقہ	تم سمجھتے ہو کہ اگر اس خواہش کو
کان علیہ وزر۔	بے موقعہ تم پوری کرتے تو کیا اس کا

گناہ تم کو نہ ہوتا۔

ابوذرؓ نے فرمایا بلی (کیوں نہیں) اس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے "احتساب" کے اس

معنیٰ کو بیان فرمایا جس کے بعد تقریباً ہر مسلمان کا جائز فعل صدقہ بن جاتا ہے ارشاد ہوا کہ

تحتسبون بالسیئۃ ولا تحتسبون بالخیر۔	تم لوگ برائی کا احتساب کرتے ہو اور نیکی کا احتساب نہیں کرتے۔

"الغرض" اپنے مال کو جرائم میں نہ استعمال کر کے جو خود اپنے اوپر اپنے عیال پر خاندان پر خرچ کرے گا یہ سارے مصارف "صدقہ" اور دینی مصارف میں شمار ہوں گے۔

ریاء الناس لیکن ٹھیک جس طرح دنیوی مصارف "احتساب" کے قانون کی بنا پر دینی مصارف بن جاتے ہیں۔ بجنسہ ہمارے تمام دینی مصارف دنیوی بلکہ شاید اس سے بھی زیادہ یعنی "تبذیر" کے تحت داخل ہو جاتے ہیں، یہ کیسے ہوتا ہے؟ قرآن ہی نے اس کو ان الفاظ میں ادا فرمایا ہے۔

الذین ینفقون اموالھم رئاء الناس ولا یؤمنون باللہ ولا بالیوم الاخر ومن یکن الشیطان لہ قرینا فساء قرینا۔	جو خرچ کرتے ہیں اپنے مال کو لوگوں کو دکھا کر اور اللہ اور قیامت کے دن پر ایمان نہیں لاتے اور جس کا ساتھی شیطان ہو، اس کا بہت برا ساتھی ہے۔

مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی نیکی کے بہترین کام ہی میں کیوں نہ خرچ کرے۔ لیکن اگر اس نے یہ سارا خرچ "الناس" (لوگوں) کو دکھانے کے لئے کیا ہے اور اس کے سامنے نہ خدا ہے اور نہ روزِ جزا ہے بلکہ صرف چند لوگوں پر اپنی دولت کی دھونس جمانا، محلہ، ٹولے، بستی یا شہر، ملک یا دُنیا میں نام آوری حاصل کرنا، اپنی بڑائی اور کبریائی کا اعلان مقصود ہے تو جیسا کہ قرآن میں فرمایا گیا اس شخص کے ساتھ وہی بدخو، غلط طاقت یعنی شیطانی قوت ساتھ لگ گئی ہے، اپنی مالی طاقت کو غلط محل پر اسی طریقے سے خرچ کر رہا ہے جیسے شیطان نے اپنا استعمال غلط کر دیا۔ دوسری جگہ اسی ریاء ان ی والے خرچ کے متعلق ارشاد ہے کہ

مثلہ کمثل صفوان علیہ تراب فاصابہ وابل فترکہ صلدا لا یقدرون علی شیئ مما کسبوا واللہ لا یھدی القوم الکافرین (آلِ عمران)	اس شخص کی مثال ایسی ہے کہ چٹان پر گرد ہو۔ اور اس پر بارش برسے پھر اسے سپاٹ بنا چھوڑے ایسے لوگ جو کچھ کماتے ہیں اس کے کسی حصہ پر قابو نہیں رکھتے اور ناشکروں کی خدا رہنمائی نہیں کرتا

ظاہر ہے کہ حق تعالیٰ اور اس کے انعام کے دن کو چھوڑ کر جو شخص لوگوں کو دکھانے کے لئے خرچ کرتا ہے وہ یہی کرتا ہے کہ اپنی امیری اور دولت مندی کے نشانات لوگوں کے حافظوں اور دلوں پر قائم کرنا چاہتا ہے، اپنے بچوں کی شادیوں میں دھوم مچانے والے تقریبات پر روپے لٹانے والوں کا مقصد اس کے سوا اور کیا ہوتا ہے لیکن تجربہ شاہد ہے کہ ان لوگوں کی یہ ساری مالی زندگیوں کا

اثر عوام کے قلوب پر چند دنوں سے زائد قائم نہیں رہتا۔ ٹھیک اس کی مثال وہی ہے جو قرآن نے بیان کی ہے کہ چٹان پر گرد بیٹھی، پانی کا ایک چھینٹا آیا اور سب صاف، اور واقعہ بھی یہی ہے کہ چاندی اور سونے کے گرزوں اور لاٹھیوں سے یہ لوگ عوام کے دل و دماغ میں جو اپنے لڑکے کی ختنہ یا شادی کی یاد ٹھونسنا چاہتے ہیں خواہ مخواہ کسی کے پاس اتنا وقت کہاں ہے جو اپنے حافظوں کو ان بوالفضولوں کے مصارف کی یاد کے لئے ہمیشہ بیدار رکھے، تماشا ہوا، دیکھ لیا گیا اور لوگ بھول گئے۔

الحاصل "الناس" کو پیش نظر رکھ کر جو دکھاوے کا خرچ کرتے ہیں یہ اپنے تمام مصارف خواہ بظاہر وہ کتنے ہی دینی نظر آتے ہوں، مثلاً کسی مدرسہ کو دیں، مسجد بنائیں، پبلک ورکس میں دیں، ہسپتالوں پر خرچ کریں، کچھ بھی کریں، قرآن کی رو سے یہ سب دنیوی، بلکہ شیطانی خرچ بن جاتا ہے۔

اور یہی میرا دعویٰ تھا کہ اسلام نے دینی اور دنیوی مصارف کی ان دو قسموں کو ختم کر کے صرف دینی یا صرف دنیوی خرچ میں دولت کے مصارف کو منحصر کر دیا ہے۔

یہاں ایک نکتہ کا ذکر ضروری ہے، اسلام نے جہاں اس قسم کے عجیب قوانین پیش کئے ہیں ان ہی میں اس کی ایک خاص خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ انسانی فطرت کے طبعی رجحانات اور جبلی عواطف و میلانات کی بھی ساتھ ساتھ رعایت کرتا جاتا ہے اور کوئی ایسی تدبیر نکال لیتا ہے جس کے ذریعہ سے اصل مقصد جو اس کا ہے وہ بھی فوت نہ ہو اور عام انسانی کمزوریوں کا بھی نباہ ہو جائے

یہی "ریاء الناس" والا قانون ہے۔ عقلاً اس کے بے نتیجہ ہونے اور غلط مصرف ہونے میں کیا شبہ ہے جس کی طرف قرآن نے اشارہ کیا۔ مگر کیجئے کہ انسان میں، دولت کی نمائش کا جذبہ بھی تقریباً فطری ہے۔ دولت کمانے والے بہر حال کچھ اس کی نمائش بھی چاہتے ہیں، اسی جذبہ کی رعایت ہے جس کا سراغ ان حدیثوں سے ملتا ہے جن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض دولت مندوں کو پھٹے اور برے حال میں دیکھ کر دریافت فرمایا کہ

الک مال (کیا تمہارے پاس مال ہے) جواب میں کہا گیا نعم (ہاں) آپ نے فرمایا من ای المال (کس قسم کے اموال تمہارے پاس) جواب ملا من کل المال (ہر قسم کا مال، مثلاً اونٹ، گھوڑے، بکریاں، غلام سب ہی کچھ ہیں، یہ اس شخص نے کہا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تب اس سے مخاطب ہو کر ارشاد فرمایا

فاذا اتاک اللہ مالاً فلیر اثر نعمۃ اللہ علیک وکرامتہ (نسائی)	جب خدا نے تمہیں مال دیا ہے تو چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ کی نعمت اور جو تمہیں سرفراز کیا ہے وہ دکھایا جائے۔

ظاہر ہے کہ دکھایا جائے گا تو الناس ہی کو دکھایا جائے گا جس کے معنیٰ یہی ہوئے کہ لوگوں کو اپنی مالی حیثیت دکھانی چاہیئے اس کا حکم ہے، لیکن برائی کی تصحیح کے لئے احتساب کا ایک پہلو جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نکال لیا وہ یہ ہے کہ اپنی دولت و نعمت کو خدا کا عطیہ قرار دے کر اور اس نیت کو پیش نظر رکھتے ہوئے اگر دولت کی نمائش کی جائے گی تو یہ دکھانا اور "ریا الناس" بھی حق تعالیٰ ہی کے لئے ہوا۔ اس لئے جس بربادی یا دولت کے غلط استعمال کا جو خطرہ تھا وہ جاتا رہا۔ اسی نقطۂ نظر کو ایک اور حدیث میں اور زیادہ واضح الفاظ میں ظاہر فرمایا گیا ہے کہ

ان اللہ یحب ان یری اثر نعمتہ علی عبدہٖ۔ (ترمذی)	اللہ تعالیٰ اس کو پسند فرماتے ہیں کہ اپنی نعمت کے نشانات کو اپنے بندے پر دیکھیں۔

گویا "الناس" کو یہ دکھانا، الناس کو دکھانا نہیں ہے بلکہ اپنے مالک ہی کو دکھانا ہے کہ وہی اس کو پسند فرماتا ہے کہ جن پر اپنی نعمتیں نازل کروں وہ دوسروں کو یہ دکھائیں کہ ہمارے خدا کی یہ نعمتیں ہم پر ہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ وہی انما الاعمال بالنیات کے قانون سے "ریا الناس" جیسا مکروہ شیطانی فعل بھی ملکوتی صفت بن جاتا ہے اور ان سارے معاملات کا تعلق باطن اور "اندر" سے ہے۔ کون کس لئے کیا کر رہا ہے۔ اس کا فیصلہ یوم تبلی السرائر[1] ہی کے دن ہوگا کہ اب تک سائنس کسی ایسے آلہ کی ایجاد میں کامیاب نہیں ہوئی ہے جس کے ذریعے سے لوگوں کی نیتوں کا حال معلوم ہو سکے۔

خیرات اور صدقات بہرحال دولت کے مصارف میں اسلام کی دوسری خصوصیت یہی ہے کہ اس نے دینی و دنیوی دو قسم کے مصارف کا باب حذف کر دیا۔ اور اب باب صرف دنیوی مصرفِ دولت کا رہ گیا ہے یا صرف دینی کا اور "صدقہ" کی وسعت دامانی کا حال جب یہ ہے کہ ناجائز مصارف سے بچا کر جائز مصارف میں خرچ کرنا بھی اسلام میں خیرات اور صدقہ ہے تو ظاہر ہے کہ مسلمان کا شاید کوئی جائز خرچ ایسا نہیں نکل سکتا جو خیرات اور صدقہ کی مد میں داخل ہو کر دینی خدمت نہ بن جاتا ہو البتہ ان دینی مصارف میں پھر اسلام نے ایک ترتیب قائم کی ہے۔

سب سے پہلا حق تو آدمی کا خود اپنا ہے اور اس لئے اسلام نے یہ ناجائز قرار دیا ہے کہ کوئی اپنے کو قتل کر دے یا اپنے کسی عضو کو ضائع کرے یا بگاڑ دے حتیٰ کہ اسلامی قانون کی رو سے کسی کو اس کا بھی حق نہیں ہے کہ کھانا پینا اس حد تک چھوڑ بیٹھے کہ اس کی جان باقی نہ رہے یا اس کا کوئی عضو خراب ہو جائے زیلعی میں ہے،

ھلاک النفس او العضو	جائز اور حلال چیز کو چھوڑ کر اپنی

---

[1] جس دن دلوں کے بھید نمایاں کئے جائیں گے ۱۲

بالامتناع عن المباح حرام۔	بار منافع ترقی یا کسی منقولات سے
(شامی ص۲۹۲ ج ۵)	پہنچانا حرام ہے۔

بہرحال دولت کا سب سے پہلا مصرف خود کمانے والے کی ذات ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے صحیح حدیث مروی ہے۔

اذا کان احدکم فقیرا	تم میں جو کوئی نادار شخص ہو تو چاہیئے
فلیبدأ بنفسه (مغنی ص۲۵۸)	کہ خرچ کی ابتدا خود اپنی ذات سے کرے۔

دوسری حدیث ہے۔

ابدء بنفسک ثم من تعول۔	پہلے اپنی ذات سے شروع کرو، پھر ان پر
(المغنی صہ)	جو تمہارے زیر پرورش ہیں۔

ابو داؤد میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک شخص نے آکر پوچھا کہ میرے پاس ایک اشرفی ہے کیا کروں۔ پہلا جواب اس کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی دیا کہ

تصدق به علی نفسک۔	اپنی ذات پر اسے خیرات کرو یعنی خرچ کرو۔

اور اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اپنے اوپر خرچ کرنا بھی صدقہ ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ پہلا مصرف اسلام نے خود کمانے والے کی ذات کو قرار دیا ہے اس کے بعد ان لوگوں کے مصارف کا درجہ ہے جن کی پرورش کا وہ قانوناً ذمہ دار ہے مشہور حدیث ہے

وابدء بمن تعول۔	شروع کرو خرچ کرنا ان لوگوں سے جو
(صحاح ستہ)	تمہارے زیر پرورش ہیں۔

فقہاء نے اس سلسلہ میں بیوی بچے اور ان کے مختلف قانونی حالات کو تفصیل کے ساتھ طویل دفعات کے تحت بیان کیا ہے جن کی تفصیل کا یہاں موقعہ نہیں ہے۔

ان لوگوں کے بعد پھر ایسے ماں باپ کے مصارف واجب ہیں جو فقیر ہوں۔ ابن قدامہ لکھتے ہیں کہ

اجمع اهل العلم علی ان	علم والوں کا اس پر اتفاق ہے کہ ایسے
نفقة الوالدین الفقیرین الذین	نادار والدین جن کی نہ کمائی ہو اور
لا کسب لهما ولا مال واجبة	نہ ان کے پاس مال ہو، ان کا خرچہ
فی مال الولد۔	اولاد کے مال پر واجب ہے۔

والدین کے مصارف قانونی طور پر تو اسی وقت واجب ہوتے ہیں جب وہ واقعی محتاج ہوں یعنی حکومت مجبور کرکے لڑکے کے مال سے والدین کے مصارف کی پابجائی کرے گی۔

لیکن غیر قانونی طور پر یعنی حکومت جبر تو نہیں کر سکتی لیکن اخلاقاً والدین کی خدمت اپنے مال کا سب سے بڑا مصرف ہے۔ خصوصاً اس سلسلہ میں "ماں" کے حق کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے

جتنی اہمیت دی ہے اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ جب آپ سے دریافت کیا گیا کہ کس کے ساتھ حسن سلوک کروں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

امک امک امک ثم الاقرب	ماں کے ساتھ ماں کے ساتھ ماں کے ساتھ
فالاقرب۔	پھر جو قریب تر رشتہ دار ہو اور
(ابوداؤد)	جو اس کے بعد،

پھر آپؐ نے خود ہی تشریح بھی فرمائی

امک وا باک اختک واخاک	ماں کو دو، باپ کو، بہن کو، بھائی کو
ادناک فادناک (صحاح)	قریبی رشتہ دار کو پھر جو ان کے بعد قریب ہوں

رشتہ داروں کو غیروں پر اسلام نے کیوں ترجیح دی، اس کی وجہ خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف مواقع پر بیان فرمائی کہ ایسی صورت میں

له اجران اجر القرابة واجر	دینے والے کو دو ثواب حاصل ہوتے ہیں
الصدقة۔ (بخاری ومسلم)	رشتہ داری کا ثواب اور صدقہ کا ثواب۔

الغرض یوں ہی درجہ بدرجہ مصارف کا استحقاق آگے بڑھتا چلا گیا ہے۔ سچی بات یہ ہے کہ اس میں بھی اسلام نے انسان کی فطرت کے ایک خاص میلان کا لحاظ رکھا ہے۔ یوں تو لوگ دوسروں پر بھی خرچ کرتے ہیں۔ لیکن مختلف تعلقات اور مؤثرات کے تحت آدمی کا میلان زیادہ تر اپنے رشتہ داروں ہی کی طرف ہوتا ہے۔ مگر خدا جانے دنیا والوں نے یہ کیسے سمجھ رکھا تھا کہ اپنوں پر خرچ کرنا تو خود غرضی ہوئی اور خود غرضی کے بعد نیکی کہاں؟

اسلام نے صلہ رحمی کو نیکی کا ایک باب قرار دے کر اس فعل کو جسے فطرتاً آدمی کا جی چاہتا تھا۔ نقطۂ نظر کی تھوڑی سی تبدیلی سے خیرات وصدقات میں شریک کر دیا۔ اور یہ ایک ایسا نظم ہے کہ ہر شخص بآسانی اس کو انجام دے سکتا ہے۔ لوگ اپنے رشتہ داروں کے ان اسلامی ذمہ داریوں کا احساس اگر کرنے لگیں تو بے روزگاری، محتاجی کے نالوں کی آواز کچھ دھیمی پڑ سکتی ہے۔

بہر کیف یہ تو صرف دولت کی ایک تنظیمی ترتیب ہے۔ اس سلسلہ میں بعض مصارف تو فرض ہیں جیسے اپنے بیوی بچوں اور والدین کے مصارف جب وہ فقیر ہوں، ازیں قبیل بھائی بہن وغیرہ بلکہ دور کے رشتہ داروں کے مصارف بھی بعض حالات میں آدمی پر فرض ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح اگر نصاب کا آدمی مالک ہو تو پھر اسلام نے ہر شخص کے مال میں فقرار، غربار، غارمین، مقروضین وغیرہ کا جو حق قائم کیا ہے جس کی تفصیل حکومت کی آمدنی میں گذر چکی ہے۔ ان مصارف کا شمار بھی فرائض میں ہے، فرائض کے ادا کرنے کے بعد اسلام نے آدمی کو اختیار دیا ہے کہ وہ چاہے تو اپنے مال سے اور بھی خرچ کر سکتا ہے، یہی مقام ہے جہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ کہاں تک خرچ کر سکتا ہے۔ اس کے دہرانے کی ضرورت نہیں کہ اسلام نے آدمی کو اس معاملہ میں بہت

دور تک آزادی دے رکھی ہے بلکہ قرآن مجید نے یہ اصول مقرر کر کے

لینفق ذو سعة من سعته	وسعت وگنجائش والوں کو چاہیئے کہ
ومن قدر علیه رزقه	اپنی گنجائش کے لحاظ سے خرچ کریں،
فلینفق مما اتاه الله.	اور جن کی روزی تنگ کر دی گئی ہے

چاہیئے کہ جو کچھ اسے خدا نے دے رکھا ہے اسی سے وہ خرچ کرے۔

گویا اس اصول کی طرف راہنمائی کی گئی ہے کہ اپنے مصارف کے مدارج آمدنی کی حیثیت سے رکھنی چاہیئے یہی بات ہے جس کی طرف ان حدیثوں میں اشارہ کیا گیا ہے کہ جب خدا کی نعمت کسی پر ہو تو چاہیئے کہ نعمت کے اثر کو اپنے اوپر دکھائے (جیسا کہ گذر چکا) لیکن کیا اس سلسلہ میں اسلام نے کوئی حد مقرر نہیں کی ہے کہ کیا ایک مسلمان کے لئے یہ جائز ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے سارے مال و منال زمین و جائداد کو کھا پی کر برابر کر دے۔ گذشتہ ابواب میں اس حدیث کے ایک ٹکڑے کا ذکر آچکا ہے جس میں آیا ہے کہ ایک شخص نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سونے کا ٹکڑا یہ کہتے ہوئے پیش کیا کہ میری طرف سے صدقہ ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص کی جانب سے منہ پھیر لیا۔ اس نے پھر توجہ دلائی، بار بار وہ توجہ دلاتا تھا اور آپ بے رخی برتتے تھے تاآنکہ جب اس کا اصرار حد سے گذر گیا تب مجبوراً حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس ٹکڑے کو ہاتھ میں لے لیا اور اس کے بعد اس زور سے اس شخص کی طرف پھینکا کہ راوی کا بیان ہے،

لو اصابته لاوجعته اولعقرته	اگر اس پر پڑ جاتا تو اسے دکھ پہنچتا

یا زخمی ہو جاتا۔

اس کے بعد ارشاد ہوا کہ تم میں ایک شخص اپنا سارا مال اٹھا کر لے آتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ صدقہ ہے اس کے بعد خالی ہاتھ ہو کر گھر میں بیٹھ جاتا ہے پھر لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلاتا پھرتا ہے۔ اس کے بعد آپ نے وہ مشہور فقرہ استعمال فرمایا

خیر صدقة ما کان عن	سب سے اچھا صدقہ وہ ہے جو تونگری
ظهر غنی۔	کی پشت پناہی میں ہو،

اس حدیث سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے لئے اس کی اجازت نہیں ہے کہ وہ اپنا سارا مال خرچ کر ڈالیں اور دراصل یہی وہ مسئلہ ہے جس کا ذکر قرآن مجید میں متعدد مقامات میں کیا گیا ہے۔

میں اپنی اس بحث کو اسی مسئلہ پر ختم کرنا چاہتا ہوں، بات یہ ہے کہ قرآن مجید میں جیسا کہ میں نے پہلے بھی عرض کیا

ماذا ینفقون	کتنا خرچ کریں مسلمان

کا سوال پوچھا گیا۔ اس کے جواب میں ارشاد ہوا

قل العفو	کہہ کہ "العفو"۔

یعنی "عفو" خرچ کریں، یہ "عفو" کیا چیز ہے؟ اس کا جواب بعد کو دیا جائے گا۔ پہلے دوسری آیتوں کو بھی نقل کر لوں۔ سورۂ اسرائیل میں ارشاد ہے

ولا تجعل یدک مغلولة الی	اور تم اپنے ہاتھ کو اپنی گردن میں نہ ڈالو
عنقک ولا تبسطها کل البسط	اور نہ اس کو اتنا کھولو کہ بالکل کھل جائے
فتقعد ملوما محسورا۔	(کیونکہ اگر ایسا کروگے) تو بیٹھ جاؤ گے اس

حال میں کہ لوگوں کی ملامت کے نشانہ بنے ہوئے ہو اور درماندہ ہو۔

پھر سورۃ الفرقان میں ہے

الذین اذا انفقوا لم یسرفوا	جو لوگ خرچ کرتے ہیں تو نہ حد سے گذرتے
ولم یقتروا وکان بین	ہیں اور نہ تنگی پیدا کرتے ہیں بلکہ ہوتا ہے
ذلک قواما۔	خرچ ان کا درمیان ان دونوں راہوں

کے اندازہ کے ساتھ۔

عموماً سمجھا جاتا ہے کہ تینوں آیتوں میں قریب قریب ایک ہی مضمون بیان کیا گیا ہے۔ "العفو" کا عام طور پر مطلب یہ لیا گیا ہے کہ جو بآسانی ہو سکے اور پچھلی دو آیتوں میں تو ظاہر ہی ہے کہ خرچ کے باب میں "اعتدال" کی فہمائش کی گئی ہے۔ امام رازی اور ان کے سوا بھی عموماً العفو کا مطلب یہی کہتے ہیں کہ اس کا تعلق

فما یفضل عن حاجة الانسان	آدمی کی ذات اور اہل و عیال کی ضرورت
فی نفسه و عیاله۔	سے جو بچ جائے۔

یعنی اپنے اور اپنے اہل و عیال و زیر پرورش لوگوں کے مصارف سے جو بچ جائے قرآن حکم دیتا ہے کہ ان سب کو خرچ کر دو۔

مگر ابھی حدیث گذر چکی جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے شدت کے ساتھ سونے کے ڈلے والے آدمی کو ڈانٹتے ہوئے فرمایا کہ

خیر الصدقة ما کان عن	بہترین صدقہ وہ ہے جو تونگری کی
ظهر غنی (البخاری)	پشت پناہی میں ہو۔

مشہور شارح حدیث امام خطابی "ظھر غنی" کا یہ مطلب بیان فرماتے ہیں۔

ای عن غنی یعتمد علیه و	یعنی ایسی تونگری جس پر بھروسہ
یستظهر به علی النوائب التی	کر سکتا ہو، اور جس کی پشت پناہی
تنوبه۔	حاصل کر سکتا ہو اس وقت جب

مصائب اور حوادث کا وہ شکار رہے۔

خطابی نے اس مطلب کو بیان کرتے ہوئے اپنی تائید میں دوسری حدیث پیش کی ہے جس میں

خیر الصدقۃ ما ابقت غنی۔ — بہترین صدقہ وہ ہے جو آدمی کی تونگری کو باقی رکھے۔

جس کا صاف مطلب یہی ہوا کہ "صدقہ" یا "انفاق" یا "خرچ" کرتے ہوئے اس کا خیال رکھنا چاہیئے کہ اتنا سرمایہ آدمی کے پاس رہ جائے جس سے وہ آئندہ آمدنی حاصل کرنے یا پیش آنے میں مدد لے۔ خطابی کے الفاظ یستظہر بہ (یعنی جس سے پشت پناہی حاصل کرے) کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔

ماسوا اس کے سمجھ میں نہیں آتا کہ خود قرآن نے جب یہ ممانعت کی ہے کہ آدمی کل سرمایہ کے طور پر یوں خرچ نہ کرے کہ گھر میں جا کر ذلیل و رسوا تھکا ماندہ بن کر اسے بیٹھنا پڑے۔ حدیث میں بھی حضور نے یہی فرمایا کہ لوگوں کے سامنے اس کے بعد ہاتھ پھیلاتا پھرے۔

سعد بن ابی وقاص کی حدیث بھی گذر چکی جس میں رسول اللہ نے کل مال کے صدقہ دینے سے منع فرمایا کہ کیا تم اس کو پسند کرتے ہو کہ تمہاری اولاد تمہارے بعد ہاتھ پھیلاتی پھرے۔

علی الخصوص جب ہم دیکھتے ہیں کہ بعضوں کا ذریعہ معاش کوئی سرمایہ مثلاً تجارت کی پونجی یا زمین یا باغ یا مکان وغیرہ ہوتا ہے اور بعض لوگ محنت و مزدوری نوکری کر کے زندگی گذارتے ہیں۔ ثانی الذکر طبقہ اگر روز جو کچھ کمائے خرچ کر دے تو چونکہ دوسرے دن یا دوسرے مہینہ اس کو پھر آمدنی کی توقع ہے اس لئے اس کو تو شاید کسی کا دست نگر نہ ہونا پڑے لیکن اول الذکر طبقہ اگر "العفو" کا وہی مطلب سمجھ کر جو عام طور پر سمجھا گیا ہے اپنی پونجی یا زمین و مکان و باغ کو بھی ختم کر دے۔ کیونکہ بال بچوں کے کھلانے پلانے کے بعد اس کا سرمایہ تو باقی ہی رہ جاتا ہے تو کیا اس کو دوسرے دن ملوم و محسور ہو کر اسے بیٹھنا پڑے گا۔

میرے خیال میں اسی لئے "العفو" کا مطلب یہی ہے جو واحدی نے امام رازی نے نقل کیا ہے

اصل العفو فی اللغۃ الزیادۃ	"العفو کے معنی لغت میں زیادتی کے ہیں"
قال اللہ تعالیٰ خذ العفو	اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ لوگوں سے عفو
ای الزیادۃ قال الفحتی	یعنی زیادتی لے، فراء نے کہا ہے حتی عفوا
عفوا ای کثروا	یعنی اس قوم کے لوگ جب بڑھ گئے زیادہ ہو گئے

مطلب یہ ہے کہ گذشتہ بالا طبقوں میں سے وہ طبقہ جس کی گذر بسر کسی سرمایہ یا جائداد زمین مکان وغیرہ کی آمدنی پر ہے یا معاشی اصطلاح میں یوں کہئے جو شغل اصل کے منافع سے اپنی معاشی ضرورتیں پوری کرتا ہے ان کے متعلق تو اس آیت میں حکم دیا گیا ہے کہ وہ العفو یا الزیادۃ کی حد سے آگے نہ بڑھیں یعنی اصل کو محفوظ رکھتے ہوئے جو زائد آمدنی ہو اس کو خرچ کرتے رہیں کہ ان کا یہی خرچ عن ظہر غنی ہو سکتا ہے۔

مشہور امام لغت الفراء سے منقول ہے،

قولہ تعالیٰ قل العفو وھو فضل المال۔ (لسان العرب)	اللہ تعالیٰ کا ارشاد جو قل العفو ہے۔اس سے مراد المال (سرمایہ) کا فضل یا بڑھوتری ہے۔

جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ "العفو" مال کی زیادتی اور آمدنی کو کہتے ہیں۔ پھر صاحب لسان العرب ہی نے ایک حدیث نقل کی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

لا اعفی قتل بعد اخذ الدیۃ	دیت (خون بہا) لینے کے بعد لینے والوں نے عفو نہ کیا۔

پھر "اعفی" کے لفظ کا ترجمہ کرتے ہیں،

ای لا اکثر مالہ ولا استغنی	یعنی اس کا مال نہ بڑھے اور نہ وہ خوشحال ہو

اس سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ "سرمایہ" کی آمدنی یا "اصل" کے "منافع" کو "العفو" کہتے ہیں پس اس قسم کے لوگوں کے لئے میرے خیال میں ادائے فرائض کے بعد عام مصارف و انفاق میں اس کا خیال رکھنا چاہیئے کہ حتیٰ الوسع اصل کو ضائع نہ کریں۔

یہ حدیث جو مسند احمد ابن ماجہ وغیرہ میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

لا یبارک فی ثمن ارض ولا دار لا یجعل فی ارض ولا دار (مسند احمد)	نہ برکت دے اللہ اس زمین اور اس گھر کی قیمت میں جو پھر زمین ہی یا گھر ہی میں نہ لگا دی جائے۔

ابن ماجہ کے الفاظ یہ ہیں،

من باع دارا وعقارا فلم یجعل ثمنہ فی مثلہ کان قمنا ان لا یبارک فیہ۔	جو شخص کوئی گھر یا جائداد جب فروخت کرے اور پھر اسے اسی جیسی چیز یعنی گھر یا جائداد کے خریدنے میں نہ لگا دے تو وہ اس کا مستحق ہے کہ اس کے مال میں برکت نہ دی جائے۔

یحییٰ ابن آدم القرشی نے اپنی مشہور مستند کتاب "الخراج" میں بھی اس حدیث کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے۔

لا یبارک فی ثمن ارض او دار الا ان یجعل فی ارض او دار۔	نہیں برکت دی جاتی زمین اور گھر کی قیمت میں مگر یہ کہ پھر اس قیمت کو زمین یا گھر ہی میں لگا دیا جائے۔

اس سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ ایسی چیزیں جو "اصل" کی حیثیت سے کام کرتی ہیں اولاً ان کو الگ ہی نہ کرنا چاہئے اور اگر کسی ضرورت (مثلاً تبدیل مقام یا اور کسی وجہ سے) آدمی ان کو الگ کرے بھی تو چاہیئے کہ ان کے روپے کو پھر کسی ایسی چیز میں لگا دے جو "اصل" کا کام دے سکیں۔

یہ حکم تو ان لوگوں کے لئے ہوا جن کے مال میں "الاصل" اور "العفو" کی صورت بھی پیدا ہوگے

باقی جن کی گذر اوقات کسی "اصل" کی آمدنی پر نہیں ہے مثلاً ملازم پیشہ لوگ جیا مزدوری وغیرہ کرتے ہیں ان کو اپنے مصارف میں کس قانون کی پابندی کرنی چاہیئے اسی کا جواب سورۂ بنی اسرائیل کی آیت

لا تجعل یدک الیٰ عنقک ولا تبسطھا کل البسط۔	نہ ڈالو اپنے ہاتھ کو اپنی گردن اور نہ کھولو اس کو پورے طور پر کھول دینا

اور سورۂ "الفرقان" کی آیت

الذین اذا انفقوا لم یسرفوا ولم یقتروا وکان بین ذالک قواما۔	جو لوگ کہ جب خرچ کرتے ہیں تو نہ اسراف کرتے ہیں اور نہ تنگی کرتے ہیں اور ہوتی ہے راہ ان کی ان کے درمیان "قوام"۔

"قواما" کی تفسیر کرتے ہوئے بیضاوی نے قوام یعنی قاف کے زبر کی صورت میں اس کا ترجمہ "وسطا عدلا"[۱] کیا ہے۔ وجہ یہ لکھی ہے کہ

لاستقامة الطرفین۔	چونکہ دونوں پہلو اس میں سیدھے ہوتے ہیں

اور "قوام" قاف کے زیر سے اس کا ترجمہ

مایقام بہ الحاجة لایفضل عنھا۔	جس سے ضرورت پوری ہو جائے اور قدر حاجت سے نہ بڑھے۔

خلاصہ یہی ہے کہ درمیانی حالت اختیار کرنی چاہیئے۔ لیکن ظاہر ہے کہ یہ کوئی معین بات نہ ہوئی جس کا مطلب یہی ہوا کہ یہ ہر شخص کے اختیار تمیزی کے سپرد ہے کہ اپنے مصارف کو حد اعتدال سے متجاوز نہ ہونے دے نہ روکنے میں نہ خرچ کرنے میں اور واقعہ یہی ہے کہ جن لوگوں کی آمدنی کا ذریعہ کوئی "اصل" نہیں ہے۔ بجز ان کے اختیار تمیزی کے اور اس کے سوا چارہ کار ہی کیا ہے کہ خود ان ہی کے سپرد ان کا معاملہ کیا جائے اور یہی کیا گیا ہے۔

---

[۱] بیچ اور معتدل ۱۲